کراچی

فاران

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸

ماہنامہ

فاران

اپریل ۱۹۵۶ء ــــ ایڈیٹر ــــ ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

شبِ تیرہ و تار، مہیب ظلمت، بھیانک سناٹا۔ ہر آن خطرہ لگا ہوا کہ نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ اور یہ خطرہ بے بنیاد نہ تھا۔ کچھ لوگ شب خوں مار چکے تھے، اسی غارت گری کا پھر اندیشہ تھا۔ ایسے نازک اور خطرناک حالات میں پاکستان کے افق پر سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور تہنیت و تبریک کے نعروں سے فضا گونج اٹھی! مانا کہ صبح اتنی روشن نہیں ہے جتنی ہونی چاہیئے تھی، افق پر اُجالے کے ساتھ دھندلکا بھی باقی ہے، جمہوریت کا آفتاب طلوع ہوا لیکن اس کے اِرد گرد بدلیاں بھی ہیں مگر مسرت اس کی ہے کہ شبِ انتظار ختم تو ہوئی۔ یہ بدلیاں اور یہ دھندلکا بھی انشاء اللہ چھٹ جائے گا۔ پہلا سا گھٹا ٹوپ اندھیرا تو نہیں رہا کہ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ سحر کے اس دھندلکے میں نشانِ منزل تو نظر آرہے ہیں۔ قافلہ کے لئے ایک راہ تو متعین ہوئی۔ اس صبحِ نو کے جھٹ پٹے کو دیکھ کر لوگ کتنے مطمئن اور مسرور ہیں اور ملک کے مشرق و مغرب میں اس سرے سے لے کر اُس سرے تک مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ پژمردہ اُمنگوں میں کتنی زندگی پیدا ہو چلی ہے اور ولولے کس قدر پُرجوش ہو گئے ہیں۔

لیاقت علی خاں مرحوم نے جب قرار دادِ مقاصد دستور ساز اسمبلی میں پیش فرمائی تھی تو اُس وقت بھی بعض بڑے لوگوں نے ناخوشی کا اظہار کیا تھا کہ اس طرح تو یہاں مُلّاؤں کی حکومت قائم ہو جائیگی اور خواجہ ناظم الدین کے زمانہ میں بھی بعض "صاحب لوگوں" کے کہے ہوئے یہ جملے ہمارے کانوں تک پہنچے تھے کہ "پاکستان میں اگر اسلامی نظام نافذ کر دیا گیا تو مُلّاؤں کی حکومت قائم ہوئی تو ہم پاکستان چھوڑ کر یورپ چلے جائیں گے"۔ ان لوگوں کی خواہشوں کے علی الرغم "اسلامی نظام کی جمہوریہ" بن کر رہا۔ اور اللہ کی کتاب اور رسُول کی سُنت کو قانون کی اساس قرار دیا گیا۔ نہ جانے یہ "صاحب لوگ" اب کو سدھار گئے یا جانے کی فکر میں ہیں۔ بہر حال اُنھیں اگر پاکستان ہی میں رہنا ہے تو اسلام کا وفادار ہو کر رہنا پڑے گا۔ طوعاً یا کرہاً یہ نظام تو اُنھیں قبول ہی کرنا پڑیگا۔

اسلام، اخلاق اور جمہوریت کا نام سُن کر اور اس کے مظاہر دیکھ کر اگر اُن کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہیں تو اس سے اب مفر نہیں یہاں تک کہ "موتوا بغیظکم" کی وعید کا وہ خود ہی مصداق بن جائیں۔

دستور سازی کے اس آخری مرحلے نے نہ جانے کتنی زندگیوں کو بے نقاب کر دیا اور کتنی شخصیتوں کو لوگوں نے اپنے اصلی روپ میں دیکھ لیا۔ غیروں کی شکایت ہم کس منہ سے کریں جب کہ "اپنوں" (؟) نے وہ وہ سفاکیاں کی ہیں کہ خدا کی پناہ! مسٹر سہروردی اور اُن کی ذریات نے اسلامی دستور کی راہ روکنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس "اسلام دشمنی" کا نام اُن کے حواریوں نے "افضل الجہاد" اور "اعلاء کلمۃ الحق" رکھا ہے۔ جہاد اور کلمۂ حق کی ایسی معنوی توہین شاید ہی کبھی کی گئی ہو!

"عوام کے لئے روٹی کپڑا اور روزگار مہیا کرنے کے مطالبے" اور "پاکستان کے قانون کی اساس کتاب و سنت ہونے" کے درمیان آخر کیا وجہ اختلاف ہے۔ جس کا اس شد و مد کیساتھ اعلان کیا جا رہا ہے! اگر پاکستان کا نام "اسلامی جمہوریہ" نہ رکھا جاتا اور اسے سیکولر اسٹیٹ قرار دے دیا جاتا۔ صدر مملکت کے لئے مسلمان ہونے کی قید نہ لگائی جاتی اور کتاب و سنت کی جگہ برطانیہ اور امریکہ کا قانون اساس قرار پاتا تو کیا اس سے عوام کیلئے روٹی کپڑے اور روزگار کا مسئلہ آناً فاناً حل ہو جاتا۔ دستور میں ساری خرابی بس اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ اسے اسلامی رنگ کیوں دیا گیا ہے! اسلام کے خلاف بُغض و نفاق ظاہر کرنے کا یہ عجیب انداز ہے!

ہندو ممبروں کیساتھ عوامی لیگ کے ارکان نے جو آخری دن دستور ساز اسمبلی سے واک آؤٹ کیا تھا تو کیا وہ اس "[illegible]" پر کیا تھا کہ دستور ساز اسمبلی نے اُن کی کسی ایسی تجویز یا ترمیم کو نہیں مانا جس میں عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا؟ یا یہ دستور کے صرف "اسلامی" ہونے کے خلاف احتجاج تھا؟ اسمبلی میں سہروردی صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں دستور سے سارا اختلاف اس لئے ہے کہ اُسے اسلامی رنگ کیوں دیا گیا۔ عوام کے فلاح و بہبود کے نام پر جو دستور کی مخالفت کی جا رہی ہے یہ ایک سیاسی اسٹنٹ ہے۔ سہروردی صاحب انگریز کے زمانہ میں بنگال کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں اور پاکستان میں بھی منصب وزارت پر وہ فائز رہے ہیں۔ وہ بتائیں اپنے اختیار کو انہوں نے عوام کے فلاح و بہبود میں کہاں صرف کیا اور کس طرح صرف کیا؟

مسٹر سہروردی جب وزیر قانون تھے تو انہوں نے بار بار مارشل لاء کی دھمکیاں دی ہیں اور آرڈی ننس کے ذریعہ اپنے تصنیف کردہ دستور کو نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود سازباز کے ذریعہ کرسئ وزارت پر آئے تھے اور اپنے عہد وزارت میں انہوں نے ایک قدم بھی ایسا نہیں اُٹھایا جو عوام کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کے مطابق ہو، اُن کی روش انتہائی مستبد اور غیر جمہوری رہی ہے۔ اگر خدا نخواستہ پاکستان میں وہ سب کچھ ہو جاتا جو سہروردی صاحب چاہتے تھے تو پاکستان بدترین قسم کی ڈکٹیٹر شپ کا جہنم بن کر رہ جاتا۔

سہروردی صاحب اگر اپنے دعوے میں سچے ہیں اور اُن میں ذرا سی بھی اخلاقی جرأت ہے تو وہ اپنے بنائے ہوئے دستور کو منظر عام پر لے آئیں تاکہ عوام سہروردی صاحب کے مُرتبہ دستوری خاکہ اور دستور ساز اسمبلی کے منظور کردہ دستور میں مقابلہ کر سکیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے، ایسا کرنے میں اُن کی پول کھلتی ہے اور اُن کی آمرانہ ذہنیت اور غیر جمہوری منصوبوں کا راز فاش ہوتا ہے!

سہروردی صاحب اور اُن کے حواریین نے دستور سازی کے دوران میں جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اس سے پاکستان کو بڑے خطرے لاحق ہو گئے ہیں۔ پہلی دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے میں انہوں نے اقتدار سے سازباز کیا اور اس نوبت

پر جب کہ نئی اسمبلی نے دستور کا کام مکمل کر لیا تھا انہوں نے گڑبڑ پھیلانے کے لئے مہا سبھائی ذہنیت کے ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ توڑ جوڑ کا فن انھیں خوب آتا ہے اور تعمیر کے خلاف سازش شاید اُن کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ ہے! مغربی پاکستان سے تو وہ قریب قریب مایوس ہو چکے ہیں کہ یہاں اُن کے سیاسی عزائم کی تگ و دو کیلئے کوئی میدان نہیں ہے! مگر وہ نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر وہ فضا کو مکدر بنانے کی کوشش کریں گے، اس قسم کی حرکتیں پاکستان کے حق میں سو فیصدی خطرناک ہیں اور خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ پاکستان کے بورڈر پر ہندوستان جان کر چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے، سہروردی جیسے لوگوں کا نفاق پاکستان کے لئے بہت بڑی مصیبت کا سبب بن سکتا ہے۔ ہم نہ کسی کی وفاداری کو چیلنج کرنا چاہتے ہیں اور نہ کسی کے حقِ شہریت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، ہماری گزارش صرف یہ ہے کہ خطروں کی روک تھام خطروں کے ظہور سے پہلے ہونی ضروری ہے!

نشانِ راہ!

دستور کی تشکیل نے اس حقیقت کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا کہ عوام جس چیز پر جم جائیں اور جس بات کا تہیہ کر لیں اُس کو کسی طاقت کے ذریعہ تھوڑے دن کے لئے ٹالا تو جا سکتا ہے مگر بدلا نہیں جا سکتا۔ کسی ملک کی سب سے بڑی طاقت اس کے عوام ہی ہیں۔ عوام کے اتحاد و یک جہتی اور عزم و حوصلہ کے آگے بڑے بڑوں کو جھکنا پڑتا ہے۔ دستور سازی کی راہ روکنے کے لئے پاکستان میں کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ حالات کو جان کر کس کس طرح سے بگاڑا گیا ہے، کیسی کیسی خطرناک چالیں چلی گئی ہیں اور کیا کیا پینترے بدلے گئے ہیں مگر اس راہ میں جو بھی رکاوٹ بنا اُسے مُنہ کی کھانی پڑی، یہ کاروانِ انقلاب کسی کے روکے رُک نہیں سکا۔ بعض مفسدوں نے کوشش کی کہ کاروان تو کاروان سرے سے جادہ و منزل ہی غائب ہو جائیں اور نشانِ راہ کا ہی پتہ نہ رہے مگر اللہ کے فضل سے قافلہ بھی پراگندہ نہیں ہوا اور نشانِ راہ بھی چمکتا ہی رہا!

آٹھ سال کی اس مدت میں اس کا بھی تجربہ ہوا کہ کسی مشن کو، ادارے یا مُلک کو سب سے زیادہ نقصان اُن "جی حضوریوں" سے پہنچتا ہے جو اُوپر کے لوگوں کی ہر جائز و ناجائز بات کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں! بُزدلوں، ہوا کے ساتھیوں اور نفس کے بندوں کا یہ وہ گروہ ہے جس نے تاریخ کے ہر دور میں جبر و ظلم کی ہمتیں بڑھائی ہیں اور ظالموں کو انسانیت کا نجات دہندہ اور ملتوں کا محافظ کہہ کر پکارا ہے، ان لوگوں کی موقعہ شناسی اور زمانہ سازی ہر رُوپ دھار سکتی ہے۔ اور اُن سے کسی بُری سے بُری بات کا ظہور بھی خلافِ توقع نہیں ہے، یہ جو بھی کر گزریں تھوڑا ہے۔ ان "مرغانِ باد نما" میں ہر طبقہ کے اہلِ غرض شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بے ضمیر صاحبانِ جبہ و دستار بھی اس ٹولی میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی نہ دوستی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور نہ دشمنی پر! ان کے نہ تو احتجاج میں خلوص ہوتا ہے اور نہ تبریک و تہنیت میں سچائی شامل ہوتی ہے، یہ تو ہوا کے ساتھی اور اقتدار کے پجاری ہیں! یہ دُنیا میں اپنے نفس کے سوا اور کسی کے وفادار نہیں۔ ایسے لوگ تاریخ کے ہر دور میں ملکوں اور قوموں کے زوال کے نقیب ثابت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے شر سے پاکستان کو محفوظ رکھے۔

پاکستان کا دستور اس سے بہتر بھی بن سکتا تھا اور بننا چاہیئے تھا۔ اس کے وہ تمام رخنے بند ہو سکتے تھے اور وہ کمزوریاں دُور ہو سکتی تھیں جن کی اہلِ فکر علماء نے بروقت نشاندہی فرمائی تھی۔ مگر دستور سازی کے دوران میں یہ ذہنیت کار فرما رہی ہے کہ اگر کسی دفعہ میں اسلام اور جمہوریت کی روح کو سمو لیا گیا ہے تو کوشش کی گئی ہے کہ کسی دُوسری دفعہ

(clauses) ہیں جمہوریت اور اسلام کے تقاضوں کی کاٹ چھانٹ کر دی جائے - اس میں کوئی شک نہیں کہ دستور میں بعض ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جو کتاب و سنت اور جمہوریت کے تقاضوں سے خاطر خواہ میل نہیں کھاتیں! کاش! اس آب صافی میں گرد و غبار نہ رہتا۔ مگر موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ اسے گوارا کر لیا جائے اور رفتہ رفتہ گرد و غبار کو دُور کر دیا جائے!

دستور سازی میں پاکستان کی تمام دینی جماعتوں نے جدوجہد کی ہے اور سب کی کوششوں ہی سے یہ مہم سر ہوئی ہے۔ مگر یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جماعتِ اسلامی نے دستور سازی کی مہم کو جس ثبات و استقلال اور نظم و ضبط کے ساتھ چلایا ہے اس کے لئے وہ تبریک و تحسین کی مستحق ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلامی دستور سازی کے محاذ پر جماعت اسلامی نے عوام کو جمع کیا ہے، جلوس، جلسے، احتجاج اور مطالبہ سے لے کر دستور کے موضوع پر گرانقدر لٹریچر کی فراہمی تک کے ہر مرحلہ پر جماعتِ اسلامی نمایاں نظر آتی ہے!

اس مہم میں جماعتِ اسلامی پر جو سخت وقت اور نازک گھڑیاں آئی ہیں وہ عالم آشکارا ہیں۔ اربابِ اقتدار سے زیادہ گلہ اُن مدعیانِ علم و تقویٰ سے ہے جنہوں نے جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر داد دیجئے خدا کے ان وفادار بندوں کی ہمتوں اور جراتوں کو کہ مخالفتوں کے ان طوفانوں میں بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور دستور سازی کی مہم کو ذرا سا بھی ڈھیلا نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر چوٹ اور ہر زخم نے اُن کی رفتار کو تیز تر کر دیا ہے!

دستور سازی کے آخری بلکہ فیصلہ کن مرحلہ میں اسلامی مطالبات، جمہوری اور دینی رجحانات کو سب سے زیادہ تقویت اُس مردِ مجاہد کے طوفانی دورے نے پہنچائی ہے جس نے مشرقی پاکستان میں پہنچکر وہاں کی فضا کو بدل دیا — کمیونسٹوں اور ہندوؤں کا مشرقی پاکستان میں کیا غلغلہ سُنتے تھے، ان لوگوں نے کیا زور باندھا تھا، کیسی کیسی وحشتناک افواہیں گرم تھیں مگر جماعتِ اسلامی کے امیر نے وہاں پہنچکر سچ مچ ماحول کو دگرگوں کر دیا۔ تاریخ کے سینہ میں یہ واقعات ہمیشہ محفوظ رہیں گے، ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور کوئی مفسد تاریخ کو بھی مسخ کر دے تو اللہ کی کتاب جس میں ایک ایک قول و عمل جُوں کا تُوں لکھا جا رہا ہے، اُس میں تو کوئی ردو بدل نہیں کر سکتا۔ صحیح واقعات ایک نہ ایک دن منظرِ عام پر آکر رہیں گے!

ذمہ داریاں ایک دو نہیں ساڑھے آٹھ سال کی مدّت "بے دستور" کے گزری ہے، یہ زمانہ جو پاکستان کی تعمیر میں پُورے کا پُورا صرف ہونا چاہیئے تھا اور جس کی ایک ایک گھڑی قیمتی تھی، اُوپر کے لوگوں کی کشمکشِ اقتدار میں صرف ہوا، اب تک کرسیوں کی جنگ ہی ہوتی رہی۔ پاکستان کے بہی خواہوں اور درد مندوں نے ہوسِ اقتدار کی اس رسّہ کشی کو لہو کے گھونٹ پی پی کر دیکھا ہے!

دستور میں یقیناً کچھ خامیاں بھی ہیں مگر موجودہ حالات میں اس دستور کو قبول کرنے ہی میں ملک و ملّت اور عوام کی بھلائی ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ خامیاں بھی دُور ہو جائیں گی کہ جن عوام کی جدوجہد سے دستور بنا ہے اُنہی کی آئینی کوششیں اس کی خامیوں کو بھی باقی نہ رہنے دیں گی۔ بہرحال دستور نے مملکتِ پاکستان کی شیرازہ بندی کا فرض انجام دیا ہے۔ اس نے تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور وہ قافلہ جو ابھی تک ڈانوا ڈول تھا اس کے لئے منزل اور راہ متعین کی ہے۔

دستور سازی کے بعد پاکستان کے عوام اور خواص کی ذمہ داریاں کم نہیں ہوئیں بلکہ اور بڑھ گئی ہیں۔ کام کرنے کا وقت تو اب آیا ہے! دستور نشانِ راہ ہے منزلِ مقصود نہیں ہے۔ سفر تو درحقیقت اب شروع ہوا ہے۔ اب تک تو مسافر تتر بتر تھے۔ قافلہ تو اب بنا ہے۔ اہلِ کارواں اب دوش بدوش گامزن ہوں گے۔ یہ سفر جتنا مبارک ہے اتنی ہی اس کی رفاقت بھی مبارک ہے! کوئی چاہے پیادہ پا ہو یا سوار ہو۔ ساربان ہو یا حُدی خواں، مسافر ہو یا نقیب۔ سب کو اپنا فرض پہچاننا ہے!

سب سے پہلے ہمیں اربابِ اقتدار کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے یا جو کچھ کرتے رہے ہیں، اُس روش، انداز، طرزِ حکومت بلکہ طرزِ زندگی کو یکسر بدلنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان اسلامی حکومت ہے اور اسلام کا ایک ضابطۂ اخلاق ہے، اس لئے حکومتِ پاکستان کے اربابِ حل و عقد اور صاحبانِ اختیار کی زندگیاں اسلامی اخلاق کے معیار کے مطابق ہونی چاہئیں!

اعیانِ سلطنت اور حکومت کے کارندے اگر اپنے قول و عمل اور گفتار و کردار سے اخلاقی فضا پیدا نہ کریں گے تو دستور کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ خالی الفاظ چاہے وہ کتنے ہی شاندار کیوں نہ ہوں کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک اُن کو عملی قالب میں نہ ڈھالا جائے!

اسلامی اخلاق کے لئے کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں ہے نہ اس کی جانچ پڑتال کے لئے کوئی کمیشن مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ اسلام کے معروف کیا ہیں اور منکر کیا ہیں؟ سرکاری سرپرستی میں اب تک جن منکرات کو سہارا ملتا رہا ہے اُن کو یک قلم موقوف ہو جانا چاہیئے۔ اس انقلاب کا آغاز سرکار دربار سے ہوگا تو نیچے کے لوگ اُس کا اثر قبول کریں گے۔ اصلاحِ معاشرہ کی پہل اُوپر کے لوگوں کو کرنی چاہیئے کہ اُن پر دوہری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ایک اس کی کہ وہ پاکستان کے ایک فرد ہیں اور دوسری یہ کہ حکومت کی سربراہی اُن کے سپرد ہے۔ سرکاری تقریبات اب بالکل پاکیزہ، صاف ستھری اور اسلامی اخلاق کے مطابق ہونی چاہئیں!

ہم کسی رمز و ایہام کے بغیر دو ٹوک انداز میں یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی اخلاق پاکستان کے ہر منصب اور عہدے کی لازمی شرط اور ضروری qualification ہے۔ جس کسی کی زندگی اس معیار سے متضاد اور مخالف ہوگی، وہ پاکستان کے منصب پر ممکن ہو تو قوم کے حق کو ضائع کر دے گا!

عوام سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ اُن کے اندر کوئی شک نہیں کہ اسلام کی تڑپ پائی جاتی ہے۔ مگر اُن کی عام زندگیوں میں یہ تڑپ، تمنا اور بے چینی کچھ یوں ہی سی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اسلامی دستور انہی کے مطالبہ پر بنا ہے۔ یہ مطالبہ بڑی حد تک پورا ہو گیا۔ مگر اپنے اس "مطلوب" کے تقاضوں کا پورا کرنا اُن کا کام ہے۔ عوام نے اگر دستور کے تقاضوں اور اس کی اسپرٹ سے پُورا پُورا تعاون نہ کیا تو یہ ابرِ رحمت دو چار پھواریں برسا کر رہ جائے گا۔ اور زمین پیاسی کی پیاسی ہی رہیگی آج دنیا کی نگاہیں پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کا نام سُن سُن کر لوگ چونک رہے ہیں بلکہ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے ہیں کہ اس افق سے نور کی کرن کب پھوٹتی ہے؟

بعض لوگوں کو حیرت ہے کہ اس زمانہ میں "اسلامی نظام" بھلا چل بھی سکے گا؟ پاکستان کے عوام اس حیرت اور تذبذب کو حقیقت سے بدل سکتے ہیں۔ وہ کمرِ ہمت باندھ لیں تو دنیا کو وہ ایک اسلامی حکومت چلا کر دکھا سکتے ہیں۔ جس حکومت کے

عوام اچھے نہ ہوں، وہ حکومت چاہے کتنے ہی اچھے اصول و آئین کیوں نہ رکھتی ہو، کامیاب نہیں ہو سکتی، دستور و آئین چڑیوں اور مچھلیوں پر نہیں انسانوں پر چلتے ہیں، اگر کسی ملک کے باشندے اپنے دستور و آئین کا احترام نہ کریں، تو وہ آئین بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، پاکستانی عوام اگر اسلام کی سربلندی، پاکستان کی بقاء اور خود اپنی نجات چاہتے ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ وہ دستور کی اسپرٹ سے تعاون کریں اور اس تعاون کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اپنے معاشرے کو پاکیزہ اور باوقار بنائیں!

ہمارے معاشرے میں بداخلاقیاں آسمان سے نازل نہیں ہوئیں اور نہ زمین سے اُگی ہیں، یہ تمام بلائیں اور مصیبتیں خود ہماری لائی ہوئی اور یہ گندگیاں ہماری پیدا کی ہوئی ہیں۔ اپنے دامنوں کو خود ہم نے آلودہ کیا ہے، اس آلودگی کو ہمارے ہی ہاتھ دھو سکتے ہیں، اپنے چہروں پر گناہوں کی کالک ہم نے لگائی ہے۔ اسے ہمیں چھڑائیں گے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور جاہل سے لے کر عالم تک معاشرے کی خرابی کے سب ذمہ دار ہیں! وہ پاکیزہ زندگی جو اسلام کو مطلوب ہے اُس کی جھلکیاں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ نفس کی خواہشوں کی طرف عام میلان پایا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے تو ان سطروں کا لکھنے والا اپنی اخلاقی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے!

جب ہم پاکستان میں خلافتِ راشدہ کی بہارِ رفتہ کے لوٹ آنے کی تمنا رکھتے ہیں تو پھر اُس دورِ سعید کے عوام کی طرح ہمیں بننا بھی تو ہوگا۔ خلافتِ راشدہ کی حکومت بھی مثالی تھی اور اُس کا معاشرہ بھی مثالی تھا۔ اور وہ اس لئے کہ وہاں عوام سے لے کر خواص تک سب کے سب اسلامی اخلاق کے چلتے پھرتے مجسمے تھے۔ اُن میں حیا تھی، شرم تھی، غیرت تھی، خوفِ خدا اور محبتِ رسولؐ تھی۔ سرفروش اور جانباز ایسے کہ اُن کے تنہا ایک سپاہی نے دشمن کے لشکر میں کھلبلی ڈال دی۔ عبادتِ خدا میں استغراق کی یہ کیفیت کہ جسم میں تیر پیوست ہو گیا مگر نمازی کے جسم کو ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوتی۔ رواداری کا یہ عالم کہ امیرالمومنین عیسائیوں کے گرجا میں اس اندیشہ کے سبب نماز نہیں پڑھتے کہ آنے والے اسے مسجد نہ بنالیں۔ وفائے عہد کی یہ حالت کہ جنگی خطرات کی نزاکت کے سبب ایک مفتوحہ علاقہ کو چھوڑنا پڑا تو وہاں کے ذمیوں سے لیا ہوا خراج واپس کر دیا۔ انصاف اس قدر بے لاگ کہ کافر کا حق ثابت ہونے پر مسلمان کے خلاف قاضی ڈگری دیتا ہے۔ خدمتِ خلق کا یہ جذبہ کہ امیرالمومنین اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد کر ایک گھرانے کی طرف رات کی تاریکی میں جا رہے ہیں۔ جہانبانی اور فرمانروائی کا وہ انداز کہ یونان کی جمہوریت اور نوشیرواں کے عدل و انصاف کے وارث انگشت بدنداں تھے۔ کہ اونٹ چرانے والوں میں یہ تہذیب و تمدن اور فہم و فراست آ کہاں سے گئی؟ اُن میں غریب بھی تھے مگر وہ خود فروش نہ تھے۔ اُن میں امیر بھی تھے مگر وہ خود نمانہ تھے۔ اور چشمِ فلک نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لے کر سائلوں اور ضرورت مندوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ عورتوں کی شرم و حیا کا یہ عالم کہ بیٹوں اور بھائیوں کے مارے جانے کی خبریں سُن سُن کر بھی فرطِ غم اُن کے چہروں سے نقاب کا گوشہ تک سرکنے نہیں دیتا تھا!

ہمیں نہیں معلوم کہ "آرٹ" کے کیا تقاضے ہیں اور ماڈرن سویلزیشن کیا چاہتا ہے؟ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ کتاب و سنت کے کیا تقاضے ہیں، ایمان کیا چاہتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ کیا ہے؟ انہی مطالبوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پاکستان قائم ہوا ہے اور اُس کا نظم و نسق چلانے کے لئے دستور وجود میں آیا ہے! جس دورِ سعید

کی چند جھلکیاں اوپر پیش کی گئی ہیں - اسی کو واپس لانا مقصود ہے - ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہم ہو بہو صحابہ کرام جیسے ہو جائیں گے اور پاکستان کی حکومت بعینہٖ خلافتِ راشدہ بن جائے گی - اس اعتراف کے باوجود ہم حکومتِ پاکستان کو خلافتِ راشدہ کے مقدس خطوط پر ہی چلانا چاہتے ہیں - ہم عزم بلند رکھتے ہیں اگر مہ و مہر پر کمندیں نہ ڈال سکے تو کم سے کم ستاروں کو تو ضرور چھو لیں گے !

رائے عامہ میں بڑی طاقت ہے، عوام کی پسند اور ناپسند بڑی چیز ہے - ایک مثال :-

عوام چونکہ خود ستر پوشی کرتے ہیں اور عریانی کو پسند نہیں کرتے اس لئے کسی شخص کو سر بازار ننگا پھرنے کی جرأت نہیں ہوتی - بالکل اسی طرح عوام اگر خود بھی نیک بن جائیں اور برائی سے نفرت بھی کرنے لگیں اور سوسائٹی میں برے آدمی کے لئے کوئی عزت کا مقام نہ رہے تو پھر کس مائی کے لال میں یہ طاقت اور ہمت ہے کہ وہ حکومتِ پاکستان کی کرسئ اقتدار پر بیٹھنے کی تمنا بھی کرے اور اس کی زندگی اسلامی اخلاق سے عاری ہو! عوام اگر نیک اور اسلامی اخلاق سے مزین ہوں تو کوئی ناپسندیدہ کردار کا شخص چند گھنٹوں کے لئے بھی حکومتِ پاکستان کے کسی منصب پر فائز نہیں رہ سکتا !

عوام نے جس زور شور سے دستور کا خیر مقدم کیا ہے اور پاکستان کے اسلامی جمہوریہ بننے پر خوشی منائی ہے اس جوش و خروش اور اظہارِ مسرت کو عمل و کردار کے قالب میں ڈھل جانا چاہیئے - پاکستان تاریک رہے گا جب تک یہاں نیکیوں کے چراغ روشن نہ ہوں، یہ بزم ویران رہے گی تاوقتیکہ یہاں بھلائیوں کے پرچم نصب نہ کئے جائیں ماحول بجلی کے قمقموں سے روشن نہیں ہوا کرتا - اس کے لئے عزم و عمل کے فانوس درکار ہیں !!

اسلامی دستور اپنے بنانے والوں اور مطالبہ کرنے والوں کو آواز دے رہا ہے کہ مجھ سے کام لے کر خاطر خواہ فائدہ اٹھاؤ، میرے لئے فضا اور ماحول کو سازگار بناؤ، میرے لفظوں کے قالب میں عمل کی روح پیدا کرو اور میری معنویت کو اپنی زندگیوں میں جذب کر لو !

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ع

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اسلامی جمہوریہ پاکستان پائندہ باد - فرخندہ باد - تابندہ باد !

ماہر القادری

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء

سید محمد عبدالرشید فاضل
(ایم اے)

اقبال کی فارسی شاعری

(۱)

سر عبدالقادر صاحب "بانگِ درا" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے اُن کی فارسی گوئی کی ابتداء ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ (لندن میں) ایک دوست کے ہاں مدعو تھے، جہاں اُن سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں؟ انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی کہنے کی کوشش نہیں کی، مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک اُن کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے۔ صبح اُٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں، جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔"

اس واقعہ کی صحت سے انکار نہیں اور نہ اس بات سے انکار ہے کہ اُس فرمائش سے متاثر ہو کر انہوں نے فارسی کی دو غزلیں اسی رات کہہ لیں مگر اس بات میں تامل ہے کہ اُن کی فارسی شاعری کا آغاز ان غزلوں سے کیا جائے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے جو متفرق فارسی اشعار اُن کے ہاں ملتے ہیں اُن میں بھی روانی، برجستگی اور صفائی کم نہیں ہے۔ مثلاً سنہ ۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر آرنلڈ صاحب کی یاد میں "نالۂ فراق" کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اُس میں یہ فارسی اشعار ہیں ؎

تازہ آغوشِ وداعش داغِ حیرت چیدہ است — ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است
ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت — اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت
شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند — خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند

اسی طرح نظم "بلال" (سنہ ۱۹۰۶ء) میں یہ فارسی مصرعے شامل ہیں ؎

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید — خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
تپش ز شعلہ گرفتند و در دلِ تو زدند — چہ برقِ جلوہ بہ خاشاکِ حاصلِ تو زدند

"التجائے مسافر" (سنہ ۱۹۰۵ء) کے پہلے بند کی ٹیپ یہ ہے ؎

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زارِ توام — وگر کشادہ جبینم گلِ بہارِ توام

اس کے علاوہ سر عبدالقادر صاحب غزلوں کا ذکر ہی کر کے رہ گئے۔ وہ غزلیں کون سی ہیں۔ یہ نہیں بتلایا۔ تا کہ غزلوں کی

زبان اور طرزِ بیان کا ان اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ثابت نہیں کہ اُس دن سے جو انہوں نے فارسی میں کہنا شروع کیا تو برابر فارسی ہی میں کہتے رہے۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اُردو میں شعر کہتے رہے اور شکوہ، جوابِ شکوہ اور خضرِ راہ وغیرہ سب ولایت سے آنے کے بعد کی نظمیں ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں اُس زمانہ کی فارسی غزلوں اور نظموں کا پتہ نہیں چلتا۔ ہاں نظموں میں اُن کی پہلی فارسی کتاب "مثنوی اسرارِ خودی" شائع ہوئی۔ نیز اقبال جیسی بلند مرتبہ شخصیت کے بارے میں یہ بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اُس وقتی فرمائش سے ایسے متاثر ہوئے کہ بغیر کسی تعین مقصد کے محض اُس خفت کے اثر سے جو اُس دن اُن کو اُٹھانی پڑی فارسی میں شعر کہنے لگ گئے۔

اسی طرح یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ "ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا" اس لئے کہ اس سے پہلے کے فارسی اشعار کی روانی و شگفتگی بتاتی ہے کہ ان اشعار کے کہنے کے بعد بھی اُن کو اپنی فارسی گوئی کی صلاحیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ فارسی گوئی کا باعث محض مذکورۂ صدر واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ جیسا کہ خود عبدالقادر صاحب نے مقدمہ میں ہی لکھا ہے کہ "فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب "حالاتِ تصوف" کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیرِ مذاق میں دخل ہوگا۔ اس کے علاوہ جوں جوں اُن کا مطالعہ علمِ فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اُردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں بعض فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اُردو میں فقرے اور جملے ڈھالنا آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔"

سر عبدالقادر صاحب کے اس بیان کی تائید میں اقبال کے اشعار بھی موجود ہیں۔ "اسرارِ خودی" کی تمہید میں فرماتے ہیں ؎

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت — خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام — در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

مگر ان اسباب کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں۔ جن میں بعض فطری، بعض اکتسابی اور بعض وقتی ضرورت کے اہم تقاضوں سے متعلق ہیں۔ فطری اسباب یہ ہیں:۔

اقبال چونکہ نسلاً کشمیری تھے اور کشمیریوں کو فارسی کے ساتھ فطری تعلق رہا ہے۔ اس لئے کہ شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں کشمیر بھی فارسی شاعری کا اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ غنی کشمیری، علی قلی سلیم اور ملا غنیمت جو اپنی شہرت و مقبولیت میں اُس زمانہ کے کسی ایرانی شاعر سے کم نہیں۔ کشمیر ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُس وقت بھی جبکہ وہ اسلامی حکومت ختم ہوئے مدت ہو گئی اور انگریزوں نے بھی ہماری زبانوں اور ہماری تہذیب کو مٹانے کی کافی کوشش کر لی۔ کشمیری مسلمانوں ہی کو نہیں کشمیری ہندوؤں کو بھی فارسی سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا۔ یہاں تک کہ جو گھرانے صدیوں سے کشمیر سے باہر آباد ہیں۔ وہ بھی فارسی سے تعلق رکھنا اپنی قومی روایات میں داخل سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ فارسی ہی کی نسبت سے اُردو کو بھی اپنانے

رہے ہیں۔ یہی فطری تعلق ہے جس کی وجہ سے اقبال کو بھی ابتدا ہی سے فارسی کی طرف رغبت رہی اور انہوں نے بڑے شوق سے اس زبان کو سیکھا اور بڑے انہماک کے ساتھ فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا۔

اکتسابی اسباب:-

(۱) آج سے چالیس پچاس برس پہلے تک ہندوستان میں مکتبوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور بعض مکتبوں میں اچھے اچھے صاحبانِ کمال محض اپنے ذوقِ علمی کے تقاضے سے درس دیا کرتے تھے اور ان مکتبوں میں عربی اور فارسی ہی کی تعلیم ہوتی تھی۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم بھی مکتب میں ہوئی اور اُن کو بھی قدیم وضع کے ایسے ہی اُستادوں سے پڑھنے کا موقع ملا جو عربی کے ساتھ ساتھ فارسی ادبیات کے بھی کامل تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ:-

"لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آگئی جبکہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لئے اسکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا۔"

(ماخوذ از اقبال نامہ)

(۲) شمس العلماء مولوی سید میر حسن صاحب جو اُن کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ عربی علوم کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی کمال رکھتے تھے اور اُن کو فارسی زبان کے اساتذہ کا کلام بھی بہت یاد تھا۔ اقبال نے اُن سے سیالکوٹ مشن کالج میں پڑھا تھا۔ مگر کالج کے اوقات کے علاوہ بھی اُن کو مولوی صاحب کی صحبت میں رہنے کا کافی موقع ملا۔ بلکہ وہ اپنا کلام بھی بغرضِ اصلاح ان کو دکھلاتے تھے۔

(۳) انگلستان کے زمانۂ قیام میں ڈاکٹر نکلسن اور مسٹر براؤن سے بہت زیادہ تعلق بڑھ گیا۔ اور یہ دونوں اصحاب فارسی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ لہذا اُن کے اثرِ صحبت سے بھی اقبال کے فارسی زبان کے میلان میں اضافہ ہوا۔

(۴) جب اُن کو یورپ میں اپنی کتاب "الہیات ایران" کے لئے فارسی ادب کا مطالعہ کرنا پڑا۔ تو اس مطالعہ سے اس مذاق میں اور اضافہ ہوا اور اس تحقیقی مطالعہ سے جیسا کہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی لکھتے ہیں:-

"اُن کو معلوم ہوا کہ فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے لئے دُنیا کی زبانوں میں فارسی زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے اور عربی شعراء کی کثرت کا شمار نہیں بایں ہمہ عربی شاعری فلسفہ و تصوف سے بالکل تہی دامن ہے۔"

غرضکہ یہی وہ فطری و اکتسابی اثرات ہیں جو اُن کے کلام میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہے۔ کہیں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی شکل میں، کہیں فارسی مصرعوں اور اشعار کے روپ میں اور کہیں فارسی اشعار کی تضمینوں کے لباس میں اور کہیں فارسی شعراء کے قطعات اور غزلوں کے اتباع میں قطعات اور غزلیں لکھنے کے پیرایہ میں۔ مگر ان اسباب میں سے کسی بھی سبب کو اُن کی فارسی گوئی کے آغاز کا اصل سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سر عبدالقادر صاحب اور دوسرے حضرات کا یہ کہنا کہ دقیق خیالات کا اظہار اُردو کے ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اُردو کا سرمایہ فارسی کے مقابلہ میں کم ہے۔ اس لئے انہوں نے فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ کیونکر درست ہو سکتا ہے جبکہ اقبال انگلستان سے واپس آنے کے بعد بھی اُردو سے دست بردار نہیں ہوئے۔ بلکہ اُردو میں یکے بعد دیگرے اُن کی کئی کتابیں شائع ہوئیں اور ان کتابوں میں تقریباً وہ تمام فلسفیانہ اور عارفانہ خیالات موجود ہیں جو فارسی میں

کسی قدر تفصیل و ترتیب کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ یعنی اُن کے موضوعات میں سے کوئی موضوع ایسا نہیں جو بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز (اُردو حصّہ) میں متعدد اسالیب کے ساتھ بیان نہ ہوگیا۔

فارسی گوئی کا حقیقی سبب:۔

اصل بات یہ ہے کہ یورپ جانے سے پہلے وہ ایک شاعر تھے اور جس طرح شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے وہ بھی متاثر ہوتے رہے اور دوسرے شعراء کی طرح انہوں نے بھی اوّل غزلیں کہیں۔ پھر متفرق موضوعات پر نظمیں لکھیں اور جب ہندوستان میں تحریکِ وطنیت کا زور ہوا اور آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی تو وہ بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی قومی و وطنی جذبات سے سرشار ہوکر پُرجوش نظمیں لکھیں اور ہندو مسلم اتحاد کے ترانے گائے اور چونکہ ملک کی زبان اُردو تھی اور تمام شعراء اُردو ہی کے ذریعہ اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اور وہ خیالات بھی ملک اور وطن ہی سے متعلق تھے۔ اس لئے وہ بھی اُردو ہی میں شعر کہتے رہے۔ لیکن جب انگلستان گئے اور وہاں مسلسل تین سال تحقیقِ علمی میں بسر کئے اور یورپ کے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو ایک طرف ان کو ادبیاتِ ایران کے مطالعہ سے مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی کے اسباب معلوم ہوئے، اور دوسری طرف انگریزی ادب اور فلسفہ کے مطالعہ اور یورپ کی مادّی ترقیات کو دیکھنے کے بعد وہاں کی تعلیم و تہذیب کے محاسن و معائب بھی اُن پر منکشف ہوگئے تو اب وہ بجائے شاعر کے ایک "پیغام گو" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور پیغام گو بھی ملّتِ اسلامیہ کا جو تنگنائے وطن سے گزر کر انسانیت کی لامحدود فضا میں پرواز کرتا ہے۔ نیز وطن کے دیوتا کی خوں آشامیاں بھی یورپ میں اچھی طرح دیکھ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کا رُخ بدل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کام کے لئے اُن کے پاس تین زبانیں تھیں۔ عربی۔ فارسی اور اُردو۔ اُردو میں اوّل اور بعد میں بھی کہتے رہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ دوسرے جس ملک کی یہ زبان تھی وہ ایک جابر و مستبد قوم کے پنجۂ اقتدار میں پھنسا ہوا تھا اس وجہ سے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ پھر اُردو کا دائرۂ عمل بھی محدود تھا۔ عربی زبان میں شاید اُن کو اتنی قدرت نہ تھی کہ اس زبان میں اہلِ زبان کی طرح شعر کہہ سکتے۔ اس لئے صرف ایک فارسی زبان ایسی تھی جس کو وہ اپنے پیغام کی اشاعت کا ذریعہ بنا سکتے تھے۔ اسی کے ذریعہ وہ اثرات بھی دُور ہو سکتے تھے جو عجمی تصرف اور افلاطونی نظریۂ اعیان کی وجہ سے تمام ممالکِ عجم میں پھیل کر مسلمانوں کی قوتِ عمل کو مفلوج کر رہے تھے۔ اور اسی کے ذریعہ وہ ان اسلامی ممالک تک اپنا پیغام پہنچا سکتے تھے۔ جن میں بعض آزاد اور بعض نیم آزاد تھے اور اس لئے وہ اس پیغام پر عمل کر سکتے تھے اور ان کے اندر ایک صالح انقلاب آجانے سے ہندوستان کے دورِ غلامی کا ختم ہونا بھی متوقع تھا جیسا کہ انہوں نے اپنی نظم "طلوعِ اسلام" میں فرمایا ہے ؎

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتہ سے اب تک بے خبر

اور ایسے ممالک کی تعداد بھی زیادہ ہے جہاں فارسی زبان بولی جاتی ہے۔ مثلاً صوبۂ سرحد۔ بلوچستان۔ افغانستان، روسی ترکستان ماوراء النہر، ایران، عراقِ عرب اور ترکی کے بعض علاقے۔ بلکہ ترکی میں تو سنہ ۱۹۱۲ء تک فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے رہی۔ نیز اُن ممالک میں بھی جہاں کی زبان عربی ہے یا جہاں عربی بولی جاتی ہے فارسی بھی بڑی حد تک سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً حجاز، یمن، شام، فلسطین، مصر، سوڈان، لیبیا، تونس اور مراکش وغیرہ۔ صرف انڈونیشیا ایک ایسا ملک ہے جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے مگر فارسی سمجھی نہیں جاتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام ممالکِ عرب سوائے انڈونیشیا کے، فارسی سلطنت کے ماتحت رہ چکے ہیں۔ اسی لئے وہاں آج تک فارسی زبان کا کم و بیش رواج موجود ہے۔ مصر سے فارسی کے مستند رسالے اب بھی نکل رہے ہیں۔ اور ماہنامہ "چہرہ نما" تو سنہ ۱۹۰۴ء سے برابر جاری ہے۔ اسی طرح استنبول (ترکی) سے بھی فارسی کے متعدد رسالے نکل رہے ہیں۔ غرضکہ یہ ہے اقبال

کے فارسی میں شعر کہنے کے متعلق صحیح خیال اور اس خیال کی تائید ان اشعار سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے مختلف ممالکِ اسلامیہ کے بارے میں کہے ہیں۔ مثلاً افغانوں کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است — ملتِ افغاں دراں پیکر دل است
از فسادِ او فسادِ آسیا است — در کشادِ او کشادِ آسیا است
تا دل آزاد است آزاد است تن — ورنہ کاہے در رہِ باد است تن
ہمچو تن پابندِ آئین است دل — مردہ از کیں زندہ از دیں است دل
قوّتِ دیں از مقامِ وحدت است — وحدت از مشہود گردد ملت است

ایران کے متعلق ؎

آنچہ بر تقدیرِ مشرق قادر است — عزم و حزمِ پہلوی و نادر است
پہلوی آں وارثِ تختِ قباد — ناخنِ او عقدۂ ایراں کشاد
نادر آں سرمایۂ دُرانیاں — آں نظامِ ملتِ افغانیاں

لیکن ایران نے آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید اختیار کر لی اور اپنی قومی روایات کو خیرباد کہہ دیا۔ اس لئے اقبال ایران کو خبردار کرتے ہیں ؎

من فدائے او کہ خود را دیدہ است — عصرِ حاضر را نکو سنجیدہ است
غربیاں را شیوہ ہائے ساحری است — تکیہ جز بر خویش کردن کافری است

عرب کے متعلق فرماتے ہیں ؎

با تو می گویم ز ایامِ عرب ! — تا بدانی پختہ و خامِ عرب
ریزہ ریزہ از ضربِ او لات و منات — در جہات آزاد از بندِ جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او — قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او
گاہ دشت از برق و بارانش بدرد — گاہ بحر از روزِ طوفانش بدرد
عالمے در آتشِ او مثلِ خس ! — ایں ہمہ ہنگامۂ "لا" بود و بس !
اندریں دیرِ کہن بیہم تپید ! — تا جہانے تازہ آمد پدید ! !
بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست — ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست
ایں کہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند — از کنارِ جوئے او آوردہ اند !

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

لیکن عربوں نے اس شاندار ماضی کو فراموش کر دیا اور تہذیبِ حجازی کے بجائے مغربی تہذیب کو اپنا قبلۂ مقصود بنا لیا۔ خودی رخصت ہوئی، غیرت و حمیت باقی نہ رہی اور وحدتِ قومی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ نتیجہ وہی ہوا جو اس خود فراموشی کا ہونا چاہیئے تھا کہ وہی قوم جس نے ایک عالم کو تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا تھا خود اپنے علوم و کمالات سے

محروم ہو کر نکبت و ادبار کی نذر ہو گئی۔ اور ذلت و خواری کے کنویں میں گر کر دوسروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اور اپنی جہالت و نادانی کے سبب دشمن کو دوست سمجھ بیٹھی ہے۔ اقبال اُن کی زبوں حالی پر اس طرح خون کے آنسو روتے ہیں ؎

اُمتے بودی اُمم گردیدۂ ! بزمِ خود را خود زہم پاشیدۂ
ہر کہ از بندِ خودی وارست مُرد ہر کہ با بیگانگاں پیوست مُرد
آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد روحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد
اے ز افسونِ فرنگی بے خبر! فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں اشترانش را ز حوضِ خود بران
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد آسماں یک دم اماں او را نداد

ترکوں سے خطاب فرماتے ہیں ؎

اُمتی بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او ! واقف از سرِ نہانخانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بود است نظرے کرد کہ خورشیدِ جہاں گیر شدیم
بادِ صحراست کہ با فطرتِ ما در سازد از نفس ہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم
آہ آں غلغلہ کز گنبدِ افلاک گزشت نالہ گردید چو پابندِ یم و زیر شدیم
ہر کجا راہ دہد اسپ براں تاز کہ ما ! بارہا ماتِ دریں عرصہ بتدبیر شدیم

لیکن ترکوں نے اہلِ مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اُنہی کی تہذیب کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اپنی تہذیب، اپنی روایات اور اپنے ماضی کو قابلِ نفرت قرار دے دیا۔ حتیٰ کہ اُس دین کو بھی جس کی بدولت وہ خاک سے اُٹھ کر افلاک پر پہنچے تھے اور تخت و تاج کے ساتھ ساتھ روحانی امامت کا مقامِ بلند بھی حاصل کیا تھا۔ دَورِ حاضرہ کی ترقیوں کی راہ میں حائل سمجھ کر سیاست ہی سے الگ نہیں کر دیا۔ بلکہ قریب قریب زندگی کے کسی شعبہ میں بھی نہیں رہنے دیا۔ اور مصطفےٰ کمال نے فوجی قوت کے زور سے ملک میں ایسی اصلاحات نافذ کیں کہ شیدائیانِ اسلام کے دل خون ہو کر رہ گئے۔ اقبال کو ترکوں کی اس غلط روی سے بڑا صدمہ پہنچا اور پہنچنا بھی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ جو قوم کل تک شکوہِ اسلام کا باعث تھی وہی آج اسلام سے دُور اور تقلیدِ یورپ پر نازاں ہے۔ جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبانی فرماتے ہیں ؎

مصطفےٰ[۵] کو از تجدد می سرود گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
نو نگردد کعبہ را رختِ حیات گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
طرفگیہا در نہادِ کائنات ! نیست از تقلیدِ تقویمِ حیات
زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور جانش از تقلید گردد بے حضور
چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

---

۵ مصطفےٰ کمال۔

یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

مگر اقبال کا پیغام کسی ایک فرد کا پیغام نہ تھا۔ پوری ملتِ اسلامیہ کا پیغام تھا۔ اس ملت کا جس کو قرآن نے "شہداء علی الناس" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اور جس کی تعریف "کُنتم خیرَ اُمّةٍ اُخرِجت للنّاس تامرُون بالمعروف وتنهون عن المنکر" سے کی ہے اور پیغام بھی وہ تھا جس کو "ھدیً وذکریٰ للعالمین" کہا گیا تھا۔ اس لئے اسلامی ممالک تک محدود نہیں رہ سکتا تھا۔ اہلِ مشرق بھی اس کے مخاطب بنے۔ اور اہلِ مغرب بھی۔ اور روس اور امریکہ والے بھی۔ اگر مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" اور "زبورِ عجم" کے ذریعہ اہلِ مشرق کے سست اعصاب کو سخت کرنے اور اُن کی خشک رگوں میں خونِ حیات دوڑانے کی کوشش کی ہے تو "پیامِ مشرق" کے ذریعہ اہلِ مغرب کی ٹھنڈی رگوں میں بھی حرارتِ عشق پہنچانے کا سامان کیا ہے۔ اور "جاوید نامہ" کے ذریعہ دُنیا کے تمام ممالک کے حالات کو زیرِ بحث لاکر ایک عالمگیر اصلاح کی راہ نکالی ہے!

غرضکہ اقبال نے اپنا پیغام اوّل مسلمانانِ عالم اور پھر دوسری تمام اقوام کو پہنچانے کے لئے فارسی گوئی اختیار کی۔ اور اس کام میں اُن کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ آج فارسی کی وجہ سے اُن کا پیغام اسلامی ممالک سے نکل کر تمام دُنیا میں پہنچ چکا ہے اور دُنیا کی مشہور زبانوں میں اُن کے کلام کا اکثر وبیشتر حصّہ ترجمہ ہو کر خراجِ تحسین بھی حاصل کر رہا ہے اور اُدباء وفلاسفہ اور مفکرین کو دعوتِ تحقیق وتدقیق بھی دے رہا ہے۔ چنانچہ آئے دن اُن کے کلام پر تحقیقی مقالے اور علمی وادبی تبصرے دُنیا کے گوشہ گوشہ سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اس بارے میں ملک کے دوسرے مبصرین کی بھی یہی رائے ہے۔ مولانا اسلم جے راج پوری فرماتے ہیں کہ:۔

"ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنایا ہے تو حقیقت میں انہوں نے کوہ کنی کی زحمت گوارا کر کے ایشیائی اقوامِ مسلمہ کے لئے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں، اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہے۔ ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے کہ ؎

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت ! — عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم فرماتے ہیں:۔

بعض دفعہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر مثنویوں کو اُردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوگا؟ اقبال اُن لوگوں میں سے ہے جو گاہے گاہے ایک مقصد کے ساتھ منصّۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس کا پیغام تمام اسلامی دُنیا کے لئے ہے۔ اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدیؒ کی گلستاں اور دہلی، کابل، طہران، قاہرہ، قازان، استنبول، مدینہ اور مکہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنوی مولانا رومؒ کی طرح پڑھنے کے لئے ہیں"

مولانا محمد علی جوہر مرحوم فرماتے ہیں کہ:۔

"اقبال کی یہ مثنویاں (اسرار و رموز) اُن کے گزشتہ کلام سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں اور ان کے ذریعہ وہ دُنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں جو اُردو کے ذریعہ ممکن نہ تھا؟"

خود اقبال بھی اپنی کامیابی کے بارے میں ایسا ہی تصور رکھتے ہیں ؎

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد   ز سودایم متاعِ او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت   ز آوازِ درایم کارواں شد

عجم از نغمہ ام آتش بجان است   صدائے من درائے کاروان است
حُدی را تیز تر خوانم چو عُرفی   کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

زجانِ بے قرار آتش کشادم   دلے در سینۂ مشرق نہادم
بگِل او شعلہ زار از نالۂ من   چو برق اندر نہادِ او فتادم

اب یہ دیکھنا ہے کہ فارسی شعراء میں سے اقبال نے کس شاعر کا اتباع کیا ہے۔ لوگوں نے اُن کے کلام میں مختلف شعراء کے نام یا اُن کے اشعار یا اشعار کی تضمینات دیکھ کر کہہ دیا کہ اقبال نے ان شعراء کا اتباع کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں انہوں نے صوفی شعراء مثلاً حکیم سنائی۔ خواجہ عطار۔ مولانا روم، شیخ سعدی اور عراقی کا اتباع کیا ہے۔ اور اُن میں بھی سب سے زیادہ مولانا روم کا، جن کو وہ اپنا مرشد بھی کہتے ہیں۔ مگر غزل میں خواجہ حافظ کا اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ اور صوفی شعراء کے بعد اُن شعراء سے استفادہ کیا ہے جن کے کلام میں زندگی، جوش، غیرت اور خودداری پائی جاتی ہے۔ جیسے عرفی شیرازی اور غنی کاشمیری نیز ایسے شعراء سے بھی مستفید ہوئے ہیں جو نعت گوئی میں کمال رکھتے ہیں، جیسے خاقانی، جامی اور قدسی وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی جس کسی کا کوئی شعر، قطعہ یا نظم اُن کو پسند آ گئی۔ اور جس کو اپنے مقصد کے لئے مفید سمجھا۔ اپنے کلام میں شامل کر کے اس کی تعریف و تشریح کی ہے یا تضمین کے ذریعہ اُسکی قدر دانی کا حق ادا کیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اپنے رنگ میں کیا ہے۔ یہاں تک کہ مولانا محمود شبستریؒ کی مثنوی "گلشنِ راز" سے نو سوال لے کر اُن کا جواب بھی اپنے رنگ میں دیا ہے اور اس کا نام "گلشنِ رازِ جدید" رکھا ہے۔ اسی طرح خواجہ حافظ کی اُن غزلوں پر غزلیں کہی ہیں جن کی زمین اور قوافی اُن کو پسند آئے اور ان غزلوں کے مجموعہ کو "مے باقی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جو حافظ ہی کے شعر ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنارِ آب رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ را

سے ماخوذ ہے۔

مولانا نظامی گنجویؒ کا ایک قطعہ اس قدر مقبول ہوا کہ اکثر ایرانی شعراء نے اس کے جواب میں قطعے لکھے، اگرچہ جواب کسی سے نہ بن پڑا تاہم ان جوابی قطعوں میں عصمت بخاری کا قطعہ سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ مولانا نظامی کا قطعہ یہ ہے ؎

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نہ بود　　می زدم نالہ و فریاد، کس از من نشنود
یا نہ بُد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار　　یا کہ من ہیچ کسم، ہیچ کسم در نہ کشود
پاسے از شب بگزشت بیشترک یا کمتر　　رندے از غرفہ بروں کرد سورخ بہ نمود
گفت خیراست! دریں وقت کرامی خواہی　　بے محل آمدنت بردرِ ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگوے　　کاندریں وقت کسے بہرِ کسے در نہ کشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند　　کہ تو دیر آئی واندر صفِ پیش استی زود
ایں خراباتِ مغان است، درو رندانند　　شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق، دریں جا حاضر　　مومن و برہمن و گبر و نصاریٰ و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبتِ ایشاں بزنی　　خاکِ پائے ہمہ شو، تا کہ بیابی مقصود

عصمت بخاری کا قطعہ یہ ہے ؎

سرخوش از کوئے خرابات گزر کردم دوش　　بہ طلب گاریِ ترسا بچۂ بادہ فروش
پیشم آمد بہ سرِ کوچہ پری رخسارے　　کافرے، عشوہ گرے، زلف چو زنار بدوش
گفتم ایں کوچہ چہ کوے است و ترا خانہ کجاست　　اے مہِ نو خمِ ابروئے ترا حلقہ بگوش
گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند　　سنگ بر شیشۂ تقویٰ زن و پیمانہ بنوش
بعد ازاں پیشِ من آ، تا بتو گویم سخنے　　راہ بنمایم، اگر بر سخنم داری گوش
دیں برافگندہ و مدہوش دویدم در پیش　　تا رسیدم بہ مقامے کہ نہ دیں ماند و نہ ہوش
دیدم از دور گروہے، ہمہ دیوانہ و مست　　از خُمِ بادۂ عشق آمدہ در جوش و خروش
بے نَے و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرود　　بے مے و جام و صراحی ہمہ در نوشا نوش
چوں سرِ رشتۂ ناموس برفت از دستم　　خواستم تا سخنے پرسم از و گفت خموش
ایں نہ کعبہ است کہ بے پا و سرآئی بہ طواف　　ایں نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بہ خروش
ایں خراباتِ مغان است، درو رندانند　　از دمِ صبحِ ازل تا بہ قیامت مدہوش

اقبال نے بھی اس انداز کا ایک قطعہ "خراباتِ فرنگ" کے عنوان سے لکھا ہے ؎

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ　　شوخ گفتاریِ رندے دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے　　صحبتِ دخترکِ زہرہ وش و نائے و سرود
ایں خراباتِ فرنگ است و ز تاثیرِ مے اش　　آنچہ مذموم شمارند نماید محمود
نیک و بد را بہ ترازوے دگر سنجیدیم　　چشمۂ داشت ترازوے نصاریٰ و یہود
خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست　　زشت خوب است اگر تابِ توانِ تو فزود
تو اگر در نگری جز بہ ریا نیست حیات　　ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود، نبود
دعویِ صدق و صفا پردۂ ناموسِ ریاست　　پیرِ ما گفت مس از سیم بباید اندود

فاش گفتم بتو اسرارِ نہانخانۂ زیست — بہ کسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

وحشی یزدی کا قطعہ "برادر و تقسیمِ نابرابر" مشہور ہے ؎

زیبا ترانچہ ماندہ ز بابا ازانِ تو — ہدا ے برادر از من و اعلیٰ ازانِ تو
ایں طاسِ خالی از من و آں کوزۂ ربود — پارینہ پُر ز شہد مصفّا ازانِ تو
یا بوے ریسماں گسل و بیخ کن ز من — ہمیز کلہ تیز مطلاّ ازانِ تو
ایں دیگِ لب شکستہ صابوں پُز ے زمن — واں چمچۂ حریرہ و حلوی ازانِ تو
ایں اشترِ خموشِ لگدزن ازانِ من — واں گربۂ مصاحبِ بابا ازانِ تو
از صحنِ خانہ تا بہ لبِ بام ازانِ من — وز بام تا بہ سقفِ ثریا ازانِ تو

اسی کے جواب میں اقبال کا وہ قطعہ ہے جس کا عنوان ہے "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" ؎

غوغائے کارخانہ آہنگری زمن — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ازانِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد ازانِ من — صہبائے پاکِ آدم و حوّا ازانِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر ازانِ من — ظلِّ ہما و شہپرِ عنقا ازانِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ آں ازانِ من — وز خاک تا بہ عرشِ معلّےٰ ازانِ تو

اب ہم اُن اشعار میں سے بعض کو نقل کرتے ہیں جو انہوں نے دوسرے شعراء کے کلام سے اصلاً یا بہ تغیرِ الفاظ اپنی تصانیف میں شامل کئے ہیں۔ تاکہ معلوم ہوسکے کہ انہوں نے کس قسم کے اشعار اور کس مقصد سے شامل کئے ہیں۔ "اسرارِ خودی" بطور سرنامہ کے اوّل مولانا رومؒ کے یہ اشعار نقل کئے ہیں ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس کے بعد نظیری کا یہ شعر لکھا ہے ؎

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی — شاخِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

مولانا جامیؒ کا ایک شعر اس طرح تحسین و ستایش کے ساتھ نقل کیا ہے ؎

کشتۂ اندازِ ملاّ جامی ام — نظم و نثرِ او علاجِ خامی ام
شعرِ لبریزِ معانی گفتہ است — در ثنائے خواجہ گوہر سُفتہ است

وہ شعر یہ ہے ؎

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست — ہر دو عالم بندگان و خواجہ اوست

"رموزِ بے خودی" میں اوّل مولانا رومؒ کا یہ شعر بطور سرنامہ کے لکھا ہے ؎

جہد کن در بے خودی خود را بیاب — زود تر، واللہ اعلم بالصواب

اور پھر کتاب کے آغاز سے پہلے عرفی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق — ایں نشہ بمن نیست اگر، با دگرے ہست

پھر ایک جگہ مولانا روم کا یہ شعر ؎

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است تیز — گر نمی فہمی ز پیشِ ما گریز !!

ملک قمی کے شعر ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

کو اس طرح داد و تحسین کے بعد بہ تغیّر الفاظ لے لیا ہے ؎

خوش نوائے نغمہ ساز قم زد است — زخمۂ معنی برابریشم زد است

تا کشد خار از کفِ پارہ سپر — می شود پوشیدہ محمل از نظر

حضرت بوعلی شاہ قلندر کا یہ شعر ؎

پُشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را — سر بدہ از کف مدہ ناموس را

حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اشعار جو انہوں نے اپنے بھائی کے مرثیہ میں کہے ہیں۔ اس طرح منظوم ترجمہ کر کے شاملِ کتاب کئے ہیں ؎

اے دریغا آں سبق خوانِ نیاز — یارِ من اندر دبستانِ نیاز

آہ آں سروِ سہی بالائے من — در رہِ عشقِ نبیؐ ہم پائے من

حیف او محرم بہ دربارِ نبیؐ ! — چشمِ من روشن ز دیدارِ نبیؐ

"پیامِ مشرق" میں مولانا روم کے ایک شعر کو اس طرح نذرانۂ داد و تحسین پیش کرنے کے بعد نقل کیا ہے ؎

مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد — سرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد

"ہر ہلاکِ اُمّتِ پیشیں کہ بود — زانکہ بر جندل گماں کردند عود"

عرفی کے شعر کو بہ تغیّر الفاظ اس طرح اپنایا ہے ؎

حُدی را تیز تر خوانم چو عرفی — کہ رہ خوابیدہ و محمل گراں است

شیخ سعدیؒ کے اشعار ؎

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید

کہ جائے کہ دریاست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم (سعدی)

کو نقل کر کے دریا کی طرف سے یہ جواب دیا ہے ؎

ولیکن ز دریا بر آمد خروش — ز شرمِ تنک مایگی رو مپوش

تماشائے شام و سحر دیدہ ! — چمن دیدہ و دشت و در دیدہ

بہ برگِ گیاہے بدوش سحاب — درخشیدی از پرتوِ آفتاب

گہے ہم دمِ تشنہ کامانِ باغ — گہے محرمِ سینہ چاکانِ باغ

گہے خفتہ در تاک و طاقت گداز　　　گہے خفتہ در خاک و بے سوز و ساز
زموج سبک سیر من زادہ !　　　زمن زادہ، درمن افتادہ
بیا سائے در خلوتِ سینہ ام　　　چو جوہر درخش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوشِ قلزم بزی　　　فروزاں تر از ماہ و انجم بزی　(اقبال)

"خطاب بہ مصطفےٰ کمال پاشا" والی نظم میں نظیری کا یہ شعر ؎

"ہر کجا راہ دہد اسپ براں تازکہ ما　　　بارہا مات دریں عرصہ بتدبیر شدیم"

غالب کا یہ شعر ؎

"تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر　　　بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

"جلال اور گوئٹے" والی نظم میں مولانا رومؔ کا یہ شعر ؎

داند آں کو نیک بخت و محرم است　　　زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

نظیری کے ایک مصرعہ کو اس طرح داد دی ہے ؎

بملکِ جم ندہم مصرعہ نظیری را　　　"کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست"

جاوید نامہ میں مولانا رومؔ کی ایک پوری غزل "بکشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزو ست" نقل کی ہے۔

غنی کا یہ شعر ؎

جمع کردم مشتِ خاشاکے کہ سوزم خویش را　　　گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں

غرضکہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں ایسے اشعار نقل کئے ہیں کہ جن میں اُن کی گوں کی بات کہی گئی ہے۔ ان اشعار میں کوئی بھی شعر ایسا نہیں جو پڑھنے والے پر نیند کی کیفیت طاری کرنے، گرتوں کو گرا دینے اور اونگھتوں کو خواب راحت میں سُلا دینے کا کام کرے۔ بلکہ ہر شعر میں حیات بخشی کا ایسا جوہر موجود ہے جو قوم میں زندگی پیدا کرکے اُس کو پستی سے بلندی کی طرف مائل کرتا ہے اور اقبال نے ایسے حیات آفریں اشعار کو یونہی نقل نہیں کر دیا بلکہ اُن اشعار کے لکھنے والوں کو بہترین الفاظ میں خراجِ تحسین بھی ادا کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک ادب کا مقصد قوم کو زندہ کرنا اور اُن میں بہترین اخلاق کا پیدا کرنا ہے اور جو ادب اس مقصد کو پورا کرتا ہے وہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اُن کے اس طرز عمل پر ایک واقعہ یاد آیا۔ جو خود انہیں نے آج سے ۳۳ سال قبل اپنے اُس مضمون میں نقل کیا ہے جو "جناب رسالت مآبؐ کا ایک ادبی تبصرہ" کے عنوان سے رسالہ "ترقی" حیدرآباد دکن بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوا تھا۔ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنایا گیا ؎

ولقد ابیت علی الطوی واظلہٗ　　　حتیٰ انال بہٖ کریم الماکل

(ترجمہ) مَیں نے بہت سی راتیں محنت اور مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ مَیں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کرکے دکھائیں۔ اس شعر کو سُنکر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں:-

"اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دینوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا۔ خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس نے اپنے شعر میں اس کی گوں کی بات کہی تھی"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اُن کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دوجہاںؐ (بابی انت وامی فداہ) نے جس قدر اس شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی"

اس سے معلوم ہوا کہ اسی طرح اقبال نے بھی اپنے مطلب کے اشعار کو جہاں بھی دیکھا ہے، لے لیا ہے۔ اور اپنے مقصد کی اشاعت میں اُن سے کام لیا ہے۔ نیز اس طرح اپنے آقا و مولا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر بھی عمل کیا ہے جن کی ذات سے اُن کو والہانہ محبت تھی!

اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا روم کا اتباع انہوں نے کن امور میں کیا ہے۔ دوسرے صوفی شعراء کا ذکر اس سلسلہ میں اس لئے نہیں کیا جائے گا کہ اقبال نے اُن سے انہی خیالات میں استفادہ کیا ہے جو مولانا روم اور دوسرے صوفی شعراء میں مشترک ہیں۔ رہا حافظِ شیراز کا معاملہ تو ان کا محض زبان اور طرزِ بیان سے تعلق ہے نہ کہ معانی و مطالب سے۔ لہذا اس کے لئے حافظ کے کلام اور اقبال کی ان غزلوں کا مطالعہ کافی ہوگا جو پیامِ مشرق میں "مے باقی" کے عنوان سے لکھی ہیں۔

مولانا روم اور اقبال

مولانا رومؒ نے عشق کی تعریف میں اتنا لکھا ہے۔ اور ایسے وجد آفریں انداز میں لکھا ہے کہ پوری فارسی شاعری میں اس کی مثال نہیں۔ ان کی تعریف و تصریح سے عشق کی حقیقت واضح ہو گئی۔ اور اُن پست و لایعنی خیالات کے گرد و غبار چھٹ گئے جن میں چہرۂ عشق کو چھپا دیا گیا تھا۔ کائنات کی ہر شئے عشق سے ہے، عشق، روحِ روانِ کائنات ہے۔ وہی ایک چیز ہے جو کہیں سوز ہے اور کہیں ساز۔ کہیں زہر ہے اور کہیں تریاق۔ ستاروں کی رفتار میں، آسمانوں کی گردش میں، عناصر کے اتحاد اور ذرات کی کشش باہم میں کارفرما ہے۔ ادنی کو اعلی اور پست کو بلند کرنا۔ گداؤں کو بادشاہ بنا دینا اس کا کام ہے۔ اخلاقی اور روحانی امراض کا مسیحا اور ناپسندیدہ خصائل کا طبیب ہے۔ اس کی فطرت میں رفعت ہے، پاکیزگی اور بے باکی ہے۔ زندگی، جذبۂ عمل اور قوتِ تسخیر ہے۔ صاحب عشق کے عزائم بلند، دل پاک اور اعمال پسندیدہ ہوتے ہیں۔ وجود و عدم، خدا و ماسوی کے اسرار اُس پر کھلتے ہیں۔ اور اس مے مردافگن کا حریف وہی ہوتا ہے ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد　　او ز حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

ملتِ عاشق ز ملتہا جدا است　　عشق اصطرلابِ اسرارِ خدا است
جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق کی تعریف الفاظ کے ذریعہ نہیں ہو سکتی - اس شراب کی لذت چکھنے سے ہی معلوم ہوتی ہے ؎

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں　　چوں بہ عشق آیم خجل باشم ازاں

عشق موت سے نہیں ڈرتا، معشوق کی راہ میں، معشوق کی طلب میں مرنا سب سے بڑی کامیابی ہے - اور عشق مرتا کب ہے! عشق تو غیر فانی ہے، اس موت کے پردے میں تو زندگی کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے - عشق کیا ہے؟ رضائے حق میں فنا ہو جانا - جب عاشق رضائے حق میں فنا ہو گیا تو اُس کی قوت کا کیا ٹھکانا! ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

کا مصداق بن جاتا ہے۔

عشق کے ذریعہ تمام عالم پر فرماں روائی کی جا سکتی ہے ؎

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را　　اوست سید جملہ موجودات را

ایسے اشعار سے مولانا کا دیوان اور اُن کی مثنوی کا ہر دفتر بھرا پڑا ہے ؎

ہر نفس آوازِ عشق می رسد از چپ و راست　　ما بہ فلک می رویم عزمِ تماشا کراست

ایک مسلسل غزل توحید کی حقیقت میں کہی ہے اور بتلایا ہے کہ حقیقی توحید (یعنی پوری ملت بلکہ تمام نوعِ انسانی کا ایک نفسِ واحد بن جانا) عشق ہی سے حاصل ہو سکتی ہے - ایک شعر میں فرمایا ہے کہ عشق ایک چشمۂ علم اور منبعِ انوار ہے - اس کیلئے کوئی چیز نامعلوم نہیں ؎

کشتۂ اللہ و پس اعلم شدم　　رو نمود اللہ اعلم مر مرا

اقبال کے ہاں بھی بہترین اشعار عشق کی تعریف میں ہیں - اور بڑی کثرت سے ہیں - بلکہ ان کے ہاں اس بیان میں اور بھی زیادہ تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ عشق کہیں ولولہ و شوق ہے اور کہیں جوشِ نمود - کہیں ذوقِ عمل اور جذبۂ تخلیق کا نام عشق ہے - خیبر شکنی اس کا کام ہے اور سومنات بر افگنی اس کا مشغلہ - وہی حیات ہے - وہی مقصدِ حیات - کہیں نور ہے اور کہیں نار - کہیں وجدان ہے اور کہیں دید - مثنوی "اسرارِ خودی" میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے "خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد" اس کے بعد ایک دوسرے باب کا عنوان ہے "چوں خودی از عشق و محبت محکم گردد قوائے ظاہر و مخفیۂ عالم را مسخر می سازد"۔ اس کے بعد حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے قوتِ عشق پر استدلال کیا ہے - اسی طرح دوسری تصنیفات اور بالخصوص پیامِ مشرق میں جو اشعار عشق کی تعریف میں ہیں ان کی وجد انگیزی اور جوشِ بیان کا اندازہ نہیں ہو سکتا ؎

بباغاں بادِ فروردیں دہد عشق! براغاں غنچہ چوں پروین دہد عشق
شعاعِ مہر او قلزم شگاف است بہ ماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

عقاباں را بہائے کم نہد عشق تدرواں را بباز اں سر دہد عشق
نگہ دارد دلِ ماخویشتن را ولیکن از کمینش بر جہد عشق

دلِ من روشن از سوزِ درون است جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد کسے کو عشق را گوید فسون است

عقل کی ہرزہ گردی و کفر سامانی کا علاج عشق کے سوا اور کسی سے ممکن نہیں ؎

خرد اندر سرم بتخانہ ریخت خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

عشق کے مظاہر لا متناہی ہیں۔ اس لئے اس کا کما حقہ بیان کسی سے نہیں ہو سکتا۔ عشق سب کچھ ہے۔ عشق ہی سے انسان، انسان بنتا ہے۔ ورنہ ایک مشتِ گِل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جس میں جیسی استعداد ہوتی ہے اسی کے مطابق وہ عشق سے بہرہ یاب ہوتا ہے ؎

بہ ہر دل عشق رنگِ تازہ برکرد گہے با سنگ گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشمِ تر داد مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

عشق کی باتیں عقل کی سمجھ میں نہیں آسکتیں ؎

عقل در شرحِ جنوں چو خرِ در گِل بخفت شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

عشق اور سوزِ عشق ہی کا نام دل ہے ؎

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن چو یک دم از تپش افتاد گِل شد

ہر جگہ عشق ہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ انسان بھی اسرارِ عشق میں سے ایک سِر ہے ؎

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

اپنے وجود کا یقین بھی عشق ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ورنہ عقل اس معاملہ میں بھی بدگمانیاں پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی ؎

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

عقل بھی عشق کے بغیر بیکار ہے ؎

نقشے کہ بستہ ہمہ او ہام باطل است عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

علم بھی بغیر عشق کے گمراہ کرتا ہے ؎

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں

قوم کی حالت بھی اس لئے خراب ہے کہ مسلمان دل رکھتے ہوئے عشق نہیں رکھتے۔ یعنی کوئی مقصد اور مقصد کی تڑپ دل میں نہیں ہے

شبے پیشِ خدا بگریستم زار | مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم | دلے دارند و محبوبے ندارند

عشق ہی سے تسخیرِ عالم ہوتی ہے ؎

بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

عشق ہی سے شاعری "جزوِ پیغمبری" بنتی ہے ؎

حق اگر سوزے ندارد حکمت است | شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

عقل کے بارے میں مولانا روم کا مسلک یہ ہے کہ عقلِ استدلالی کے ذریعہ حریم ذات تک نہیں پہنچ سکتے۔ اوّل تو استدلال میں غلطی کا امکان موجود ہے اور اگر نہ بھی ہو تو یقین کی کیفیت عقل سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ عقل اپنے قیاسات سے خود مطمئن نہیں۔ خود ہی قیاس بناتی اور خود ہی توڑتی رہتی ہے اور اس شکست و ریخت میں عمر گزر جاتی ہے۔ مگر یقین کا سررشتہ ہاتھ نہیں آتا۔ بلکہ تردد و تذبذب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر عقل اشیاء کے ظواہر سے بات کرتی ہے۔ حقائق اشیاء تک پہنچنے کا ذریعہ عشق اور صرف عشق ہے۔ خود مولانا نے اپنے وقت کے تمام متداول علوم میں کمال پیدا کیا تھا۔ اور ایک مدت تک ان علوم کا درس بھی دیا۔ اور علم و حکمت میں اُن کا مقام اُس وقت کے کسی بڑے سے بڑے عالمِ معقول و منقول سے نہ تھا۔ مگر ان کو ان علوم سے کیا حاصل ہوا ؎

پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل | کشتیش طوفانیِ ظلماتِ عقل
موسیِٔ بیگانۂ سینائے عشق | بے خبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت | وز حکم صد گوہرِ تابندہ سفت
عقدہ ہائے قولِ مشائیں کشود | نورِ فکرش ہر خفی را وا نمود!

(اسرارِ خودی)

مگر زندگی کا رُخ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد بدلا۔ حکمتِ ایمانی کی شعاعوں کا دل کے ظلمت خانے پر پڑنا تھا کہ حجابات اُٹھ گئے۔ اب معلوم ہوا کہ حقیقی علم کتابوں میں نہیں ہے اور یہ دولت مدرسوں میں نہیں ملتی۔ یہ حواس اور عقل جن پر بھروسہ تھا علم کا ذریعہ نہ تھے بلکہ اور جہل میں مبتلا کرنے والے اور حقیقی علم سے دُور رکھنے والے تھے۔ مولانا نے جابجا فرمایا ہے کہ حقیقی علم کا ذریعہ وہ حاسّۂ باطن ہے جس کا تعلق دل سے ہے۔ اور جو تزکیۂ باطن اور صفائے دل سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایمان و یقین کا سرچشمہ دل ہے عقل نہیں ہے۔ اب مولانا علومِ ظاہر و عقلِ استدلالی کو بیکار بلکہ نقصان رساں بتلاتے ہیں۔ اور عشق کے کمالات کی قصیدہ خوانی بڑے جوش کے ساتھ شروع کر دیتے ہیں اور اسی ایک مضمون کو سینکڑوں نئے نئے اسالیب کے ساتھ بیان کر کے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ عقل و استدلال کا غلبہ دلوں سے دُور ہو کر عشق کی طرف عام رجحان ہو جائے۔ استدلال میں کوئی قوت نہیں ہے۔ الفاظ اور قیاسات کے کھلونے بھلا کسی ماورائے مسئلہ کا حل کیا کر سکتے ہیں۔ یہ استدلال اپنے پیروں پر خود ہی کھڑے نہیں رہ سکتے۔ آج جو باتیں استدلال سے ثابت ہوئیں۔ کل

استدلال ہی کے ذریعہ غلط اور بے سر و پا ہو کر رہ گئیں۔ اور یہ سلسلہ ہزاروں سال سے اسی طرح چلا آرہا ہے اور اسی طرح جاری رہے گا ؎

"پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

حسِ ابداں قوتِ ظلمت می خورد حسِ جاں از آفتابے می چرد
آئینہ دل چوں شود صافی و پاک نقشہا بینی بروں از آب و خاک
پس بدانی چونکہ رستی از بدن گوش و بینی چشم می داند شدن
منطقی کو منکرِ حنانہ است از حواسِ انبیاء بیگانہ است

پس محلِ وحی گردد گوشِ جاں وحی چہ بود؟ گفتنِ از حسِ جاں
باز نورِ نورِ دل نورِ خدا است کہ ز نورِ عقل و حس پاک وجدا است

بحثِ عقل است ایں چہ عقل آں حیلہ گر تا ضعیفے رہ برد آنجا مگر
بحثِ عقلی گر دُر و مرجاں بود آں دگر باشد کہ بحثِ جاں بود
بحثِ عقل و حسِ اثر داں یا سبب بحثِ جانی یا عجب یا بوالعجب
ضوءِ جاں آمد نماند اے مستقی لازم و ملزوم و نافی منتقی
زانکہ بینا را کہ نورش بازغ است از عصا و از عصاکش فارغ است

زیرکی بفروش و حیرانی بخر زیرکی ظن است و حیرانی نظر (مولانا روم)

مولانا عقل کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حکمت و فلسفہ سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری وہ جو علمِ وحی کا نتیجہ ہے دوسری عقل انسان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور پہلی ظن و تخمین کے اندھیرے میں لے جاکر چھوڑ دیتی ہے۔ جہاں وہ حیرتِ مذموم کی فراوانی میں کھو جاتا ہے۔

اقبال نے بھی علومِ جدیدہ میں کمال پیدا کیا۔ اور بالخصوص فلسفہ میں تو اُن کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔ اور پھر فلسفۂ قدیم نہیں، فلسفۂ جدید میں بھی مغرب کے فلاسفہ نے اُن کے کمالِ فلسفہ دانی کو تسلیم کیا ہے۔ مگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی اور وہ فلسفہ کے مُضر اثرات سے محفوظ ہی نہ رہے بلکہ اس کی حقیقت سے واقف ہو کر مولانا روم کی طرح عقل کی خرابیوں کو نہایت وثوق و یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں ؎

آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجو کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجو

اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر فرماتے ہیں ؎

مدتے محو تگ و دَو بودہ ام ! | رازدانِ دانشِ نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند ! | محرم ایں گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زارے عبرتے | چوں گلِ کاغذ سرابِ نکہتے
تا ز بندِ ایں گلستاں رستہ ام | آشیاں بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است | بت پرست و بت فروش و بتگر است
پا بزندانِ مظاہر بستہ است | از حدودِ حس بروں ناجستہ است
در صراطِ زندگی از پا فتاد | بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد
فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند | در میانِ جستجو ناشاد ماند
عشق افلاطونِ علت ہائے عقل | بہ شود از نشترش سودائے عقل
جملہ عالم ساجد و مسجودِ عشق | سومناتِ عقل را محمودِ عشق
ایں مئے دیرینہ در میناش نیست | شورِ یاربِ قسمتِ شبہاش نیست

قرآن کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اصل علم قرآن ہے۔ فلسفہ، منطق اور الٰہیات سے ایمان و یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ علومِ عقلی ایمان و یقین سے محروم کر کے شکوک و شبہات میں ڈالتے ہیں۔ معرفت بغیر عشق کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے ان خیالات کو نہایت آزادی و بے باکی سے ظاہر کیا۔ اور اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے مؤثر سے مؤثر طرزِ بیان اختیار کیا۔ اقبال عقل و حکمت کے مخالف نہیں ہیں۔ مگر عقل و حکمت کو سوزِ دل کے بغیر مفید نہیں سمجھتے۔ عقل و عشق کے اتحاد و اشتراک پر زور دیتے اور اس کو نوعِ انسانی کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیتے ہیں۔ "رموزِ بے خودی" میں ایک باب اسی بیان میں ہے جس کا عنوان ہے "در معنیٔ حریتِ اسلامیہ سرِّ حادثہ کربلا"۔ اس باب میں عقل و عشق کا مقابلہ کر کے دونوں کے خصائص بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

عقل در پیچاکِ اسباب و علل | عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند | عقل مکار است دامے می نہد
عقل را سرمایہ از بیم و شک است | عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آں کند تعمیر تا ویراں کند | ایں کند ویراں کہ آباداں کند
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں | عشق کم یاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند | عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن | عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل گوید شاد شو آباد شو | عشق گوید بندہ شو آزاد شو

اس کے بعد معرکۂ کربلا کا بیان ہے اور سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے حضور میں نذرانۂ عقیدت ؎

سُرخ رو عشقِ غیور از خونِ او — شوخیِ ایں مصرع از مضمونِ او
زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است

ایسے مضامین کے لئے جن میں عقل کی درماندگی یا حقیقت سے بے خبری کا بیان ہو یا اس کی گمراہی، کفرسامانی اور فساد انگیزی سے متنبہ کیا گیا ہے " پیامِ مشرق " کا مطالعہ ضروری ہے - یہاں چند قطعات پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

خرد زنجیرے امروز و دوش است — پرستارِ بتانِ چشم و گوش است
صنم در آستیں پوشیدہ دارد — برہمن زادۂ زنّار پوش است

زرآزری معنیِ قرآں چہ پرسی — ضمیرِ ما بآیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد دل بسوزد — ہمیں تفسیرِ نمرود و خلیل است

من اے دانشوراں در پیچ و تابم — خرد را فہم ایں معنی محال است
چساں در مشتِ خاکے تن زند عشق — کہ دل دشتِ غزالانِ خیال است

حکیماں گرچہ صد پیکر شکستند — مقیمِ سومنات بودہ ہستند
چساں افرشتہ و یزداں بگیرد — ہنوز کم دم بہ فتراکے نہ بستند

بوعلی اندرِ غبارِ ناقہ گم — دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

پیامِ مشرق کا حصہ " نقشِ فرنگ " اہلِ یورپ کو پیغام ہے کہ پرستارانِ عقل کو مکتبِ عشق کا سبق بھی پڑھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ بھی تباہی و بربادی سے محفوظ رہ سکیں۔ دُنیا کے مفاسد کا بھی سدّ باب ہو سکے اور نوعِ انسانی جن مصائب و آلام میں گرفتار رہی ہے اس کو بھی اپنے مصائب و آلام سے نجات مل سکے۔

مولانا رومؒ نے تقدیر کا مضمون بالکل نئے انداز سے سمجھایا ہے۔ " جفّ القلم بما ھو کائن " - کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ :-

" یہ غلط ہے کہ خیر و شر جو انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مفہوم اُن لوگوں نے لیا ہے جو اخلاقی ذمہ داریوں سے دامن کشاں گزر جانا چاہتے ہیں۔ تقدیر تو قوانینِ حیات کا نام ہے - وہ قوانین بیشک غیرِ متبدل ہیں - مگر قوانین یہ ہیں کہ جھوٹ بولنے کی یہ سزا ہے اور سچ بولنے کا یہ صلہ۔ بُرائی کا نتیجہ بُرا ہے اور نیکی کا ثمر اچھا (وغیرہ) اب انہی قوانین کے مطابق نتائج مترتب ہوں گے "

مولانا نے اس مسئلہ کا اوّل ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد جبریہ و قدریہ دونوں کے دلائل کو غلط قرار دیتے

ہوئے ایک متوسط مسلک اختیار کیا ہے۔ جو اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے ایسا ایمان افزاء اور بصیرت افروز لکھا ہے کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد نا ممکن ہے کہ انسان اپنے آپ کو مجبورِ محض سمجھتا رہے اور اس کے دل میں کوشش اور عمل کا شوق پیدا نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بے شمار قوتیں اور استعدادیں عطا فرما کر اُن کے استعمال کا اختیار دے دیا ہے۔ اب نتائجِ اعمال استعمال پر موقوف ہیں۔ اس لئے ہم ان کے ذمہ دار ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

بال بازاں راسوئے سلطاں برد بال زاغاں را بگورستاں برد

مولانا شبلی نعمانی مرحوم لکھتے ہیں :-

"مولانا روم کے زمانے میں جو عقیدہ تمام اسلامی ممالک میں پھیلا ہوا تھا وہ "جبریہ" تھا۔ امام رازی کا بھی یہی مسلک تھا۔ باوجود اس کے مولانا کا عام عقیدہ سے الگ روش اختیار کرنا اُن کے کمالِ اجتہاد بلکہ قوتِ قدسیہ کی دلیل ہے۔ مولانا نے اختیار کو متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ مثلاً منکرینِ اختیار جو دلائل پیش کرتے ہیں اُن میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں اور اس کو سب سے بڑی دلیل جبر کی قرار دیتے ہیں ——

"ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن" خدا جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ قولِ نبوی تحریصِ عمل کے لئے ہے نہ کہ ترکِ عمل کے لئے۔ کیونکہ اگر وہ یہ کہتا کہ تمہاری کامیابی اور حصولِ مقصد تمہارے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہو گے اور جس طرح چاہو گے حاصل ہو جائے گا۔ تو ایسی صورت میں اگر تم کوشش نہ کرتے اور اطمینان سے بیٹھے رہتے تو درست تھا مگر جبکہ کامیابی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس کا سررشتہ دوسرے کے ہاتھ میں ہے تو سعی و کوشش کے بغیر کیونکر کام چل سکتا ہے ؎

گر بگوید آنچہ می خواہی تو راد کار کارِ تست بر حسبِ مُراد
آنگہ ار تنبل شوی جائز شود کانچہ خواہی کانچہ جوئی آں شود
چوں بگفت اندیش شاء اللہ کان حکم حکمِ اوست مطلق جاوداں
پس چرا صد مردہ اندر وردِ او بر نگردی بندگانہ گردِ او

"جف القلم" اور "ماشاء اللہ کان" کی تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں اختیار کا یقین ہے اور گو بحث پروری کے موقع پر کوئی اس سے انکار کرے لیکن اس کے تمام افعال اور اقوال سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اختیار کا معترف ہے مثلاً اگر کسی کے سر پر چھت ٹوٹ پڑے تو اس کو چھت پر مطلق غصّہ نہیں آتا۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کو پتھر کھینچ مارے تو اُس شخص پر اس کو سخت غصّہ آئے گا۔ کیوں ؟ صرف اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ چھت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں اور آدمی جس نے پتھر کھینچ مارا تھا۔ وہ فاعلِ مختار ہے۔

ایک لطیف استدلال مولانا نے یہ کیا ہے کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے واقف ہیں۔ کوئی شخص اگر ایک کتے کو دُور سے پتھر کھینچ مارے تو گو چوٹ پتھر کے ذریعہ سے لگی لیکن کتا پتھر سے معترض نہیں ہوتا بلکہ اس شخص پر حملہ کرے گا۔ اس سے

ثابت ہوتا ہے کہ کتا بھی سمجھتا ہے کہ پتھر مجبور تھا اس لئے وہ قابلِ الزام نہیں۔ جس نے باختیار اذیت دی وہ مواخذہ کے قابل ہے۔"

انسان کے تمام افعال و اقوال سے اختیار کا ثبوت ہوتا ہے۔ ہم کسی کو کسی بات کا حکم دیتے ہیں، کسی کام سے روکتے ہیں۔ کسی پر غصہ ظاہر کرتے ہیں۔ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں۔ کسی فعل پر نادم ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور اس امر کی دلیل ہیں کہ ہم مخاطب کو اور اپنے آپ کو فاعلِ مختار خیال کرتے ہیں ؎

ایں کہ فردا آں کنم یا ایں کنم	ایں دلیلِ اختیار است اے صنم
واں پشیمانی کہ خوردی از بدی	زاختیارِ خویش گشتی مہتدی
جملہ قرآں امر و نہی است و وعید	امر کردن سنگِ مرمر را کہ دید
غیر حق را گر نباشد اختیار	خشم چوں می آیدت بر جرم دار
چوں ہمی خائی تو دنداں بر عدو	چوں ہمی بینی گناہ و جرمِ او (مولانا روم رح)

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے نوکر یا غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دیدے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی ہو تو اس کا صرف یہی مقصد ہو سکتا ہے کہ ہم اُن سے کام لیں اور اپنے ارادے اور اختیار کو عمل میں لائیں۔" (ماخوذ از سوانح مولانا روم مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی رح)

اقبال نے بھی تقدیر کے بارے میں ایسا ہی مسلک اختیار کیا ہے۔ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے "اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔" ؎

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر	تہِ ایں گنبدِ گرداں رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب !	کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست

اے کہ گوئی بودنی ایں بود، شد	کارِ ما پابندِ آئیں بود، شد
معنیِ تقدیر کم فہمیدۂ	نے خودی را نے خدا را دیدۂ

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر　　　خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست　　　زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست
رمز باریکش بہ حرفے مضمر است　　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است

مردِ مومن با خدا دارد نیاز　　　باتو ما سازیم تو با ما بساز
عزمِ او خلاقِ تقدیرِ حق است　　　روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است

اقبال ایسے انسانوں کے ظہور میں آنے کی توقع رکھتے ہیں جو اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے کی بہترین صلاحیتوں سے بہر
ہوں گے۔ اُن کے نزدیک تقلید بھی موت کا نشان ہے۔ جو انسان کی تعمیری صلاحیتوں کو برباد کرکے اس کو بے جان آلے کی طرح دوسر
کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ تقلید بھی تقدیر کے غلط تصورات کی طرح ایک زندان خانہ ہے۔ جس میں مقید ہو کر انسان اپنے
آپ سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو برباد کر دیتا ہے۔ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے میں
اگرچہ آسانی ہے مگر یہ آسان پسندی زندگی کا ثبوت نہیں ہے۔ جو قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں، ان کے اندر یہ بات راسخ ہو ج
ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ازل میں مقدر ہو چکا ہے۔ صدور و عدمِ صدورِ واقعات میں ہم کو دخل نہیں۔ لہٰذا اس کے لئے
کوشش کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ ایسی قومیں اس بات کو بھول جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بے شمار قوتیں اور لامتناہی صلاحیت
عطا فرمائی ہیں آخر اُن کا مصرف کیا ہے۔ کیا ان صلاحیتوں کا عطا کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم کو اُن کے استعمال کا اختی
دیا گیا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو اُن کو فعل میں لاکر دُنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔ قرآن میں جو "فتبارک اللہ احسن الخال
فرمایا ہے۔ جس سے خدا کے سوا تخلیق میں دوسرے خالقوں کا اثبات ہوتا ہے وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ پس جوں ج
جوں انسان اپنے امکانات کو بروئے کار لاتا ہے تخلیق و تعمیر میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کو پورا کرتا ہے۔ اور تہذیب و تمد
کے قافلہ کو ترقی کی شاہراہ پر تیز سے تیز کرنے کا اہتمام بالشان فرض انجام دیتا ہے۔

حیات وجود کو مستلزم ہے، جہاں وجود ہے وہاں حیات، قدرت اور علم بھی ہے۔ اور جس مرتبہ میں وجود ہے۔ حیات
قدرت اور علم بھی اسی مرتبہ میں حاصل ہیں۔ انسان ساری کائنات میں افضل اور وجودِ مطلق کا مظہرِ اتم ہے۔ اس لئے زندگ
قدرت اور علم سے بھی دوسری موجودات کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ بہرہ ور ہوا ہے۔ اگر وہ ان قوتوں کو اُبھرنے اور تخلیق
حصہ لینے کا موقع نہیں دیتا تو اپنے ہاتھوں اُن کو موت کی نذر کرکے اپنے روزگار کو خود تیرہ و تار بناتا ہے۔ حیات اپنی نمود کے
لئے قوت اور علم کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرنا چاہتی ہے۔ اگر اس کو نمایاں ہونے کے مواقع بہم نہ پہنچائے جائیں تو دُنیا میں
حیرت انگیز انقلابات ظہور میں نہیں آسکتے۔ اور دُنیا کا امروز اس کے دوش سے ہرگز ممتاز نہیں ہو سکتا۔ ممکناتِ خودی مسلسل
جدوجہد اور ناسازگار ماحول سے پیہم جنگ کرنے ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اسی اظہار سے اس میں یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا
جذبہ پوری قوت کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ جس سے فطرت کے قوائے ظاہر و مخفی کی تسخیر عمل میں آتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش　　　یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے　　　شبِ خود را برافروز از یمِ خویش

اگر تقلید اچھی چیز ہوتی تو پیغمبر بھی اجداد کے طریقے پر چلتے ؎

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے   زبند پاستان آزاد بودے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب   پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

مولانا روم نے بھی جہاد کی تعلیم دی ہے اور اقبال نے بھی جہاد پر اس قدر زور دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، جہاد اُن کو اتنا ہی محبوب ہے جتنا خود اسلام۔ زندگی ایک نعمت ہے ایسی نعمت جس کی حفاظت کرنا فرض ہو اور جس کی خوبیوں اور کامیابیوں سے متمتع ہونا خوش نصیبی اور سعادت۔ مگر اس کی خوبیاں اسی وقت خوبیاں ہیں کہ جب ان کو جہاد کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لیا جائے۔ بلکہ زندگی کی حفاظت ہی اس لئے ہے کہ اس کو کسی دن ایک مقصدِ عظیم کے لئے وقف کرنا ہے۔ اس لئے اسلام نے جہاد کو ایمان کی کسوٹی بتلایا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

نقشِ حق را ہم بامرِ حق شکن   بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

باقضا پنجہ زدن نبود جہاد   زانکہ ایں را ہم قضا بر ما نہاد

اقبال کے نزدیک جہاد کے مخالفین اسلام کے مارِ آستین ہیں جو اس طرح در پردہ اسلام کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است   جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست   ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت   جنگ را رہبانیِ اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را   کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

صلح شر گردد چو مقصود است غیر   گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

فلسفۂ خودی جو اقبال کا خاص موضوع ہے، مولانا کے ہاں بھی موجود ہے۔ اگرچہ اقبال نے جس تشریح و توضیح کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے وہ ان کا خاص موضوع بن گیا ہے۔ اور وہ اس کے عارف تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ تاہم اس کے ابتدائی نقوش میں مولانا کا اتباع پایا جاتا ہے۔ بالِ جبریل میں مریدِ ہندی اور پیرِ رومی کا مکالمہ لکھا ہے۔ مریدِ ہندی سوال کرتا ہے ؎

سِرّ آدم سے مجھے آگاہ کر   خاک کے ذرّہ کو مہر و ماہ کر

پیرِ رومی جواب دیتے ہیں ؎

ظاہرش را پشۂ آرد بہ چرخ   باطنش آمد محیطِ ہفت چرخ

مریدِ ہندی ؎

تجھ پہ روشن ہو ضمیرِ کائنات   کس طرح محکم ہو ملت کی حیات

پیر رومی ؎

دانہ باشی مرغکانت برچنند ‌ ‌ ‌ غنچہ باشی کودکانت برکنند
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو ‌ ‌ ‌ غنچہ پنہاں کن گیاہِ بام شو

مرید ہندی ؎

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی ‌ ‌ ‌ صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی
بے حضور و با فروغ و بے فراغ ‌ ‌ ‌ اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ

پیر رومی ؎

آنکہ ارزد صید را عشق است و بس ‌ ‌ ‌ لیکن او کے گنجد اندر دام کس

مولوی عبد السلام صاحب ندوی لکھتے ہیں :-

"جہاں تک معانی و مطالب کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے فلسفۂ خودی کے ایک اہم جزو یعنی عشق کو مولانا روم سے اخذ کیا ہے۔ بلکہ خود فلسفۂ خودی کا تخیل بھی انہی سے ماخوذ ہے۔ مثلاً مولانا روم کی ایک غزل کا مشہور شعر ہے ؎

ما ز فلک برتریم از ملک افزوں تریم ‌ ‌ ‌ زیں دو چرا نگذریم منزلِ ما کبریاست

اور ڈاکٹر صاحب اسی شعر سے جو فلسفۂ خودی کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور اس زمین میں ایک مستقل غزل کہی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من ‌ ‌ ‌ مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ ما کبریاست"

خود اقبال نے اسرارِ خودی میں مولانا سے مستفید ہونے کا اس طرح اعتراف کیا ہے ؎

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد ‌ ‌ ‌ از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
ذرّہ از خاکِ بیاباں رخت بست ‌ ‌ ‌ تا شعاعِ آفتاب آرد بدست
موجم و در بحرِ او منزل کنم ‌ ‌ ‌ تا درِ تابندۂ حاصل کنم

پروفیسر اسرار احمد سہاوری

قرآن کریم کے مغربی ناقدین

قرآن کریم ایک ابدی معجزہ ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند تعالیٰ نے عطا فرمایا اور جو رہتی دُنیا تک باقی رہیگا۔ اس کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت عرب اپنی طلاقتِ لسانی، فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے دُنیا میں مشہور تھے۔ اپنی زبان آوری کے زعم میں عرب کے علاوہ ساری دُنیا کو عجم کہتے تھے۔ ایسی حالت میں قرآن مجید فصاحت و بلاغت کا ایک معجزہ بن کر آیا اور اُن فصاحت کے دعویداروں کو عاجز کردیا۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں۔ اور قرآن میں پُرانی کہانیاں درج ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اس کو خدا کا کلام نہیں سمجھتے ہو تو ایسی چند آیتیں ہی لکھ کر لے آؤ۔ لیکن یہ عرب باوجود اپنے بلند بانگ دعووں کے عاجز ہوگئے اور قرآن کے مقابلہ میں ایک جملہ بھی پیش نہ کرسکے۔ قرآن کی معجز نما فصاحت و روانی کے سامنے اُن کی زبانیں گنگ ہوکر رہ گئیں۔

> "یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم انسانی روح کی ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت و رہنمائی درجہ بدرجہ فرماتی ہے۔ ہدایت کا پہلا درجہ ہدایتِ جبلت و فطرت ہے۔ یہ آنکھ۔ کان۔ دماغ و دل کی رہنمائی اور وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کی ہدایت ہے۔ یہ فطرت کی وہ عام بخشش ہے کہ جس میں بنی آدم تمام برابر کے شریک ہیں۔ اس مرحلہ کے بعد ہدایت و رہنمائی کا دوسرا درجہ ہے جو انبیاء اور رسل کی بعثت سے وجود میں آیا ہے۔ اس مرحلہ میں انسان کو جو کچھ ملا وہ تمام تر انہی کلیات و مبادی پر مبنی تھا جن سے وہ ہدایت کے پہلے درجہ پر سرفراز ہوا۔ اس آخری مرحلہ کا مکمل اور جامع نقشہ ہمارے ہاتھوں میں قرآن مجید ہے" *

قرآن پاک کسی کی مدح و تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ میں نے یہ مضمون اس لئے لکھا ہے کہ ایک منکرِ خدا و رسول اور دشمن اسلام کے یہ الفاظ میں نے کسی مضمون میں پڑھے تھے:۔

> "قرآن کی مداحی وہی لوگ کرتے ہیں جو اس سے آبائی طور پر متاثر اور اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ ان کے ذہن میں پہلے سے ہی یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اس لئے وہ اس پر جرأت مندانہ تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتے۔ ورنہ اگر اس قسم کے تعصب کو دُور کرکے نظر ڈالی جائے تو قرآن میں کہیں کوئی معجزہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایک پریشان خیالی کا مجموعہ نظر آتا ہے جب لوگوں نے اس کو پہلے ہی معیار بنا لیا ہے تو اس میں غلطیاں کون نکالے حال یہ ہے کہ جو بات اس کے موافق ہے وہ صحیح ہے اور جو بات اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ پھر یہ کہ صدیوں سے لوگ اس کی حقیقی اور مصنوعی خوبیوں کا پروپیگنڈا کررہے ہیں۔ اس قدر طویل

اور شدید تشہیر سے تو دشمن بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ اُس زمانے میں اور اس کے بعد بھی اس کا کوئی جواب نہ لکھ سکا یہ بھی کوئی مناسب بات نہیں اس لئے کہ کسی کی کتاب کا بجنسہٖ اسی قسم کا جواب لکھنا ممکن نہیں۔ ہر شخص کی انفرادیت اپنی تحریر میں نمایاں ہوتی ہے اور یہ انفرادیت اسی شخص کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ مثلاً شیکسپیئر کے ڈراموں کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یا ملٹن کی "فردوس گم شدہ" کا بھی جواب نہیں لکھا جا سکتا۔ اس لئے قرآن کا جواب نہ لکھا جانا اس کا معجزہ ہونے کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے"۔

میں نے سوچا کہ یہ عبارت بڑی گمراہ کن ہے۔ اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اس قسم کے خیالات بہت سے ذہنوں میں پیدا ہو کر گمراہی کا باعث بن سکتے ہیں۔ میں اس عبارت کا جواب دو طریقوں سے دینا چاہتا ہوں۔ ایک تو میں خود جو کچھ اس کے جواب میں کہہ سکتا ہوں پیش کروں گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ بعض مغربی نقادوں کی آراء نقل کر کے پیش کروں گا۔ تاکہ یہ الزام دور کیا جا سکے کہ قرآن کے مداح صرف اُس کے پیرو اور حلقہ بگوش ہی ہیں۔

جہاں تک قرآن کریم کے دشمنوں کی زبان وقلم سے تعریف کا تعلق ہے۔ یہ بات ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے قرآن کریم کی تاریخ نزول ذرا بھی توجہ سے پڑھی ہے۔ سینکڑوں شہادتیں ایسی بیان کی جا سکتی ہیں کہ قرآن کے دشمنوں نے اس کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ جب لوگ اس کو سنتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ شاعری ہے، جادو ہے۔ کسی مافوق الفطرت طاقت کی سحر کاری ہے۔ کسی دیوتا کی جادو طرازی ہے۔ قریشِ مکہ فصاحت وبلاغت اور خطابت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں۔ اور اُس وقت یہ تمام لوگ، اسلام کے، نبی کریمؐ کے اور قرآن مجید کے بدترین دشمن تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب پہلی مرتبہ قرآن کی آیت سنی تو غصہ سے بیتاب ہو گئے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ اُن کی بہن اور بہنوئی بھی اس کلام کو پڑھتے ہیں تو اُن کا غصہ اور بڑھ گیا اور وہ اُن کو قتل کر دینے کو چل پڑے۔ لیکن جب قرآن کی آیات سنیں تو اُن کے دل ودماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے ایک ایک لفظ پر انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی آنکھوں کے سامنے سے باریک پردے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کے معجز نما اندازِ بیان نے عمرؓ ابن خطاب کو دنگ کر دیا۔ اسی طرح عرب کے بہت سے فصحا اور وہ لوگ جو شعر وادب کو پہچانتے تھے قرآن پاک کی حکمت سچائی اور فصاحت وبلاغت سے متاثر ہو کر ایمان لے آئے۔ اور یہ وہ دور تھا کہ قرآن نجماً نجماً ابھی نازل ہی ہو رہا تھا اور قرآن خود ہی اپنا تعارف تھا!

یہ جو قرآن پر پریشانیٔ مضامین کا الزام لگایا گیا ہے تو یہ ایک وہم ہے جو قرآن کی ایک بنیادی خوبی کو نہ سمجھنے کے سبب پیدا ہو گیا ہے۔ معترض کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ قرآن کا انداز خطابیہ ہے۔ قرآن کو اس معنی میں ایک تصنیف سمجھنا جس معنی میں ہم اپنی کتابوں کو لیتے ہیں ایک اہم غلطی ہے۔ قرآن انسان کی اصلاح کے لئے آہستہ آہستہ موقع محل اور ضرورت کے لحاظ سے ایک طویل مدت میں نازل ہوا ہے اور نازل بھی ایک خطاب کے طور پر ہوا ہے اور اس خطاب کے مخاطب مختلف لوگ ہیں۔ اور یہ انداز وہی انداز ہے جو ایک بہترین خطیب کا انداز ہو سکتا ہے۔ ایک خطیب کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے ذہن کو پڑھ لے اور اس کو اپنے مقصد کی طرف لانے کے لئے اس کے ذہن کے مطابق طرزِ تخاطب اختیار کر کے اس کو اپنا ہم خیال بنا لے۔ قرآن کا مقصد انسانیت کی اصلاح ہے، کوئی باب وار تصنیف پیش کرنا نہیں ہے۔ اس لئے

ایک ایسا شخص جو قرآن کو ایک مستقل تصنیف کے معیار پر جانچے گا تو اس کو یہی دھوکا ہوگا کہ اس میں مضامین پریشان سے ہیں حالانکہ یہ اُس کی اپنی کوتاہ بینی، کم نظری اور کم علمی کی دلیل ہوگی اس میں قرآن کا کوئی قصور نہ ہوگا۔ جو کوئی اس نکتہ کو سمجھے گا کہ قرآن ایک صحیفہ ہدایت و حکمت ہے اور انسانی فکر کی تربیت و ہدایت سے سروکار رکھتا ہے تو پھر قرآن میں اُس کو کمال درجہ کا ربط و نظم نظر آئے گا کہ اس کی ایک آیت بھی اپنے سلسلہ اور موضوع سے غیر متعلق نہیں ہے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آیا کسی کی تحریر کی کامیابی سے نقل کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ تو جو شخص دنیا کے ادب پر نظر رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ بعض مشہور ادبی کتابوں کی نہایت کامیابی کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اور ایسی نقل کہ اصل اور نقل میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر فارسی کا شاہنامہ فردوسی نے لکھا ہے۔ لیکن اس کے شروع کے دو ہزار اشعار ایک دوسرے شاعر دقیقی نے لکھے ہیں۔ لیکن دونوں کے طرز میں اس قدر مماثلت ہے کہ اگر فردوسی نے خود اس کا اعتراف نہ کیا ہوتا تو آج یہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ فردوسی کے اشعار کون سے ہیں اور دقیقی کے کون سے ہیں! پھر شاہنامہ میں جو اشعار محمود غزنوی کی ہجو میں لکھے گئے ہیں اُن کا آج تک یقینی طور پر فیصلہ نہ ہو سکا کہ وہ اشعار فردوسی نے خود لکھے ہیں یا کسی اور نے بعد میں اپنی طرف سے شامل کر دیئے ہیں۔ مولانا محمود شیرانی مرحوم نے شاہنامہ کی اندرونی شہادتوں سے اور بعض دیگر قرائن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجو کے اشعار فردوسی کے نہیں ہیں۔ حالانکہ آج تک ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ فردوسی ہی کی تصنیف ہیں۔

دنیائے ادب میں ایک دو نہیں ایسی سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ عمر خیام کی رباعیات کے متعلق بھی یہ مشہور ہے کہ بہت سی رباعیات جو اُس کے نام سے مشہور ہیں وہ دوسرے شعراء کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ اور ان کا آج تک فیصلہ نہ ہو سکا کہ وہ خیام کی رباعیاں ہیں یا کسی دوسرے شاعر کی ہیں۔ اور ان رباعیات میں اور خیام کی رباعیات میں ایسی مماثلت ہے کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ خیام کی نہیں ہوں گی۔ طوالت کا خوف ہے ورنہ بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ کسی شخص کی کسی تحریر کی نقل نہیں کی جاسکتی اسی لئے قرآن کریم کی بھی نقل نہیں کی جاسکتی، غلط ہے۔ بات یہی ہے کہ جو چیز قابل نقل نہ ہو اُس کی نقل کیسے کی جائے۔ دوسری چیزیں انسانوں کا کلام ہیں انسان اس کی نقل کامیابی سے کر لیتے ہیں لیکن جو چیز انسان کا کلام ہی نہ ہو اُس کی نقل انسانوں سے کیونکر ممکن ہو!

اب میں چاہتا ہوں کہ چند مغربی علماء کی قرآن کریم کے متعلق آراء یہاں پیش کر دوں تاکہ یہ اعتراض بھی صاف ہو جائے کہ قرآن کریم کے مداح صرف اس کے پیرو اور حلقہ بگوش ہیں۔ اغیار پر اس کی معجز نمائی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک عالمگیر شہرت کا مالک مغربی شاعر گوئٹے قرآن کریم کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے:-

> "ہم چاہے جتنی دفعہ قرآن کی طرف متوجہ ہوں، پہلے پہل نفرت سی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد ہر مرتبہ ایک تازہ کیفیت نظر آتی ہے، یہ بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ پھر اپنی معجز نمائی سے حیران کر دیتا ہے۔ اور آخرکار اپنی عزت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کا طرز بیان اس کے مشمولات کے عین مطابق ہے۔ اس کا مقصد مضبوط اور مستقل ہے، اس کی نمود شاندار، مرعوب کن، اور بلاشبہ انتہائی بلند ہے۔ اس لئے یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کو متاثر کرتی رہے گی"

ڈاکٹر ہبیو اپنے قرآن کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:-

"قرآن کا طرزِ بیان آپ کو عموماً روانی اور حُسنِ ادا سے معمور نظر آئے گا۔ یہ ایجاز، تشبیہ و استعارات، حُسنِ تراکیب اور جزالتِ عبارت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اور خصوصاً جس جگہ خدا کی صفات اور عظمت کا ذکر کیا گیا ہے الفاظ کا شکوہ اور بندش کی چُستی معجز نما ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ نثر میں لکھا گیا ہے لیکن عبارت عموماً مقفیٰ ہے۔ عرب لوگ قرآن کی روانی اور سلاست سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ کی خط و کتابت اور مضمون نویسی میں قرآنی آیات کا استعمال لازمی طور پر کرتے ہیں۔ یہ شاید طریقہ اظہار کا توازن ہے۔ اور عبارت کی ہم آہنگی جس نے عربوں کو اس قدر مسحور کر لیا ہے اور باوجود فصیح العصر ہونے کا دعویٰ کرنے کے وہ پکار اُٹھتے تھے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ جادو ہے۔ یا کسی جن کی روح محمدؐ کے جسم میں حلول کر گئی ہے۔ قرآن کی عبارت میں ایک لطیف سا ترنم پیدا ہو گیا ہے اور اس ترنم سے لطف اٹھانے کے لئے زبان کی مہارت کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایک عامی اور ابجد سے ناآشنائے محض آدمی بھی اس کے زیر و بم سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ قرآن اس ادبی و لسانی رفعت و عظمت کو محفوظ کر دیتا ہے جس کو اگر کلامِ خداوندی سے موسوم کر دیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہ کلام اس صفت کا بدرجہ اتم مستحق معلوم ہوتا ہے۔ آخر اس کلام بلاغت نظام کی سحرکاری ہی تو تھی جس نے اس کے شدید ترین دشمنوں کو پانی پانی کر دیا تھا۔ یہ قرآن کی سحر بیانی ہی تھی کہ لوگ تلوار سونت کر محمدؐ کا سر قلم کر دینے کے لئے نکلتے تھے۔ لیکن جب ایک آیت اس کتاب کی سُن پاتے تھے تو بے اختیار کلمۂ شہادت پڑھ لیتے تھے۔ یہ کلام اللہ ہی کی معجز بیانی ہو سکتی ہے کہ لوگ سخت سے سخت امتحان لینے کے ارادے سے آتے لیکن دو بول سُن کر مبہوت ہو جاتے اور مخالفت کو یک قلم فراموش کر کے اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے۔ ہمیں کسی دوسرے مذہب کی تاریخ میں ایسی مثالیں نظر نہیں آتیں۔"

دُنیا کا مشہور مؤرخ اور ایک صاحب طرز ادیب اسٹینلی لین پول اپنی کتاب "انتخاباتِ قرآن" کے دیباچہ میں لکھتا ہے:-

"مکی آیات کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ عربوں کو بُت پرستی سے تائب کر کے خدائے واحد کے سنگِ آستاں پر جبیں سائی کا شوق اور ولولہ پیدا کر دیا جائے۔ مکی آیات میں خدا کا ذکر نہایت شاندار اور باوقار الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان آیات میں حُسنِ فطرت کی طرف بھی جا بجا نہایت سلیقہ سے اشارے کئے گئے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ روشن سورج، چمکدار ستارے، حسین چاند، نیلا آسمان، قرمزی افق، نظر کش قوسِ قزح، شفاف پانی کے چشمے، دیدہ زیب سبزہ، بلند و بالا پہاڑ، کفِ دست میدان، غرضکہ فضائے عالم میں

جو کچھ ہے اُسی خدائے واحد کا آفریدہ ہے۔ وہی مدبّرِ اعظم کی حیثیت سے اس دنیائے آب و گل کی تدبیر کرتا ہے۔ وہی منعمِ حقیقی ہے جس کو چاہتا ہے نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نانِ شبینہ سے محتاج کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مکّی آیات نہایت مختصر ہیں لیکن ترنّم اور لطافت سے بھرے ہوئے کوزے ہیں۔ کہ آدمی اُن کی روحانی لذّت سے سیراب نہیں ہو پاتا۔ جملے مختصر ہیں لیکن نہایت زوردار اور مقفّیٰ ہیں اور یہ آیات باوجود اشعار نہ ہونے کے من کل الوجوہ شعر کی سحر طرازی سے بھرپور ہیں۔ ابتدائی سورتوں کا آتشیں لہجہ آہستہ آہستہ ناصحانہ طرز، مشفقانہ تیور، مصلحانہ انداز اور واعظانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ شاعرانہ جزالت اور خطیبانہ شعلہ مقالی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ مدبّرانہ تقریر، سیاسی آموزش، معاشرتی اصول و ضوابط، معیشتی نظریات ایک سادہ اور پُرسکون نثر میں بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن فصاحت و بلاغت کا دامن کسی جگہ ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔"

مسٹر روڈول اپنے دیباچۂ قرآن میں فرماتے ہیں:۔

"قرآن کی تمام سورتیں مجموعی طور پر مجھ پر ایک عجیب اثر پیدا کر دیتی ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جس نے اپنی زندگی کو حق کی تلاش سے شروع کیا ہے اور اس تلاش و جستجو کے نتائج کو اس قدر عظیم الشان شاعرانہ دلکشی، واعظانہ عظمت، خطیبانہ مکرمت اور مصلحانہ شفقت سے پیش کیا کہ دنیا اس کی جاذبیت اور دامن کشی سے پہلوتہی نہ کر سکی۔ اور جو مذہبی تلقین سے شروع کر کے ایک ایسی عظیم اور سیاسی قوت و اقتدار کا بانی بن گیا جس کے لئے حسبِ ضرورت قوانین کا مہیّا کرنا لابدی ہو گیا اور ان ضروریات کو اس نے بوجہ احسن پورا کیا۔"

کارلائل کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ذرا قرآن شریف کے متعلق اس کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ قرآن ان تمام کتابوں میں سے بہترین کتاب ہے جو آج تک دنیا کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ یہ ایک عظیم الشان شخصیت کے کردار کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ ایسا شخص جس کو ہم دنیا کا عظیم ترین انسان کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک اس کا خلوص ہے۔ یہ خلوص مجھے دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتا۔ ایسا خلوص۔ یہ زبردست مقصد کی لگن، مقصد سے یہ انتہائی وابستگی، حق کی ہمہ گیر جستجو۔ یہ صبر آزما سعی و مجاہدہ۔ اور حق کو پا لینے کے بعد اس کو دوسروں تک پہنچانے کی تڑپ۔ اور اس ابلاغ کی اثراندازی کی آرزو۔ اپنے بھائیوں کے لئے اثر پذیری کی دعائیں اور صبر و شکیب کے ساتھ ان تمام مصائب و آلام کا برداشت کرنا جو اس راہ میں آئے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو محمد کی مُہرِ نبوت

کا مجھ کو قائل کر دیتی ہیں"۔

روڈلف کریل نے قرآنِ کریم کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"قرآن ایک جامع و مانع کتابِ قانون ہے - یہ ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جس میں دنیاوی اور دینوی دونوں قسم کے قوانین کو نہایت متوازن طریقہ پر جمع کر دیا گیا ہے - اس میں ایک وسیع جمہوریت کے لئے اور اس کے ہر شعبہ کے لئے ضروری اور بنیادی قوانین مہیا کر دیئے گئے ہیں - اس میں غریبوں اور مفلسوں کے لئے ایسے اصول و قوانین مہیا کئے گئے ہیں کہ اگر ان پر کماحقہٗ عمل کیا جائے تو شاید معاشرے میں کوئی فاقہ کش اور محتاج نظر نہ آئے - یہ قرآن ہی کا اعجاز تھا کہ وہ مختلف قبیلے جو کہ ہر وقت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے - ذرا ذرا سی بات پر لڑ جاتے تو برسوں لڑتے رہتے تھے - اور انتقاموں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا - جو لوٹ مار، ڈاکہ زنی، عیاشی، شراب خوری، کو باعثِ صد فخر و مباہات سمجھتے تھے - جو قمار بازی کو سخاوت و دریادلی کی علامت سمجھ کر اختیار کرتے - صرف چند آیاتِ قرآنی کے اعجاز سے متحد ہو کر تنِ واحد بن گئے - اور اُن تمام خرابیوں کو ترک کر دیا - اور اب خاندانی وجاہت کی بجائے اتقا و زہد معیارِ شرافت بن گیا - اثر اور نتائج کے لحاظ سے ہمیں کسی کلام کی تاثیر کے اتنے دُور رس، مستقل اور زود اثر نتائج کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے - کلام کی تاثیر کا یہ ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے جو دُنیا کو دکھا یا گیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن ہی تھا جس نے عربی کو ایک بہترین ادبی زبان بھی بنا دیا - اس کتاب نے ہی عربوں کو ایک متحدہ قومی نظریہ دیا - یہ قوم اپنی مرکزیت قائم کرنے کے لئے، اظہارِ خیال کی تاثیر کے لئے، اسی ایک کتاب کی مرہونِ منت ہے، بقول پامر کے یہ خطیبانہ اور مرصع زبان کے لئے ایک مقبول ترین نمونہ بن گئی ہے - نہ صرف عربوں کے لئے بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں کے لئے، قرآن نماز و دعا کی تمام مسلمانوں کی زبان ہے - اور اس طرح یہ ان کو آپس میں یک جہت اور متحد کرنے کے لئے، ان میں قومی محبت، خلوص پیدا کرنے کے لئے اور ادبی رجحانات میں ترقی کے لئے ایک واحد اور بے مثال ذریعہ بن گیا ہے"۔

ان شہادتوں کے بعد اس اعتراض کا کیا وزن رہ جاتا ہے - جو اس مضمون کے آغاز میں درج کیا گیا ہے - غیر مسلم علماء اور اربابِ دانش پر قرآن پڑھ کر اس قدر اثر ہوا ہے کہ وہ اُسے خدا کا کلام تک کہنے میں تامل نہیں کرتے - قرآن کی معجز نمائی کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے؟ قرآن ہی وہ صحیفۂ آسمانی اور کتابِ الٰہی ہے کہ جو لاکھوں سینوں میں من وعن محفوظ ہے - اور جسے کروڑوں آدمی دن رات میں کم سے کم پانچ وقت ضرور پڑھتے ہیں - اور اس تکرار کے باوجود تلاوتِ قرآن کے لُطف میں کمی نہیں آتی - اور اس کا بار بار کا پڑھنا اور سُننا لوگوں میں اکتاہٹ کی کیفیت پیدا نہیں کرتا -

مولانا عبدالحمید ارشد

عہدِ توحید

(اجمال و تفصیل)

اجمال ——

عہدِ توحید را نشانِ راہ — کلمۂ لا الٰہ الا اللہ

تفصیل ——

حامدِ حق تعالیٰ جلّ مجدہٗ

حضرتِ حق یگانہ و یکتا است — مالکِ ملک، داورِ اعلا است

ذاتِ او مجمعِ کمالات است — خالق الارض و السمٰوات است

حسنِ رویش چو پرتوے انگند — زو، دو عالم شدہ است بہرہ مند

ذاتِ پاکش نہ مستعدِ فنا ست — ہر کجا جلوہ از و پیدا ست

نعمتش را چو نیست پایانے — کے توانیم مدحِ شایانے؟

ہیچ کارے زغیرِ او ناید — جبہ سائی بہ پیشِ او شاید

عہدِ توحید را نشانِ راہ

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ

جودِ عام ——

جود فرمود بر ہمہ عالم — ہم رہانید او ز رنج و الم

بہرِ تبلیغ حکمِ ربانی — او فرستاد شاہِ حقانی

یعنی آں سرورِ رسولِ کریم — مومناں را کہ گشت رؤف رحیم

باد بر او ز ما درود و سلام — نیز بر آلؑ، ہم صحابہ کرامؓ

آں غزاۃ و مجاہدینِ حق — سینۂ کفر شد کز ایشاں شق

آں فدایانِ دینِ قرآنی — آں محبانِ وجہِ سبحانی

آں نجومِ ہدایتِ اسلام — جاں نثارانِ ربِ ذی اکرام

پیروانِ رسولِ ربِ انام — باد بر روحِ شاں ہزار سلام

عہدِ توحید را نشانِ راہ — کلمۂ لا الٰہ الا اللہ

عرضِ مدعا۔ استدعا بجنابِ کبریا عزّ شانہ

اے خدائے کریم! اے ارحم!

بطفیلِ حبیبک الاکرم!

برہاں ما ز سطوتِ اغیار — خوار و رسوا کن ایں ہمہ اشرار

برہاں ما ز پنجۂ اغیار — از نصاریٰ، یہود، از اشرار

حسنِ کردار دہ مسلماں را — تا کند زیر فوجِ شیطاں را

دینِ حق را علم برافرازیم — کفر و باطل ز پا در اندازیم

عہدِ توحید را نشانِ راہ

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ

کتاب و سنّت۔

یک بنائے خجستہ برداریم عَلَمِ حق بعالَم افرازیم
عَلَمِ کُفر را نگوں سازیم شرک و بدعت زبُن براندازیم
باز سازیم رہنما قرآں برفروزندہ مشعلِ تاباں
عدل را برنہیم یک میزاں خوب سنجیم عدل با فرقاں
ظلم را برکنیم بیخ و بُن تازہ سازیم درسِ لَاتَمنُن
مشعلِ راہِ ما بود سنّت تا کہ باشیم موردِ رحمت

عہدِ توحید را نشانِ راہ
کلمۂ لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ

عزم و نصرت۔

چوں برائیم ما بعزمِ جہاد نصرت آید زسوئے ربِّ عباد
می دوانیم اسپ و سیّارات می پرانیم تیر و طیّارات
می شگافیم سنگِ خارا را زیر آریم کوہ و صحرا را
ظلم و طغیاں برہم اندازیم بازوئے ظلم خوب برتابیم
بہرِ تائیدِ حق بروں آئیم سطوتِ دینِ حق بیفزائیم
ظالماں را بہ تیغِ عدل کُشیم زیر دستاں زدست برگیریم
در جہاں دینِ حق برافرازیم معرکہ بعدِ معرکہ سازیم

عہدِ توحید را نشانِ راہ
کلمۂ لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ

رایتِ اسلام۔

ما بتائیدِ ربِّ سُبحانی نصرت و فضلِ خاص ربّانی
بر فرازیم رایتِ اسلام زندہ پایندہ دینِ خیرِ انام
زیرِ آں پرچمِ صداقت ما جمع آریم باز جملہ قویٰ
دشنہ دوزیم در رگِ باطل (رگشاہ) عضو ہالیش کنیم تا عاطل (بیکار)
از جہاں برکنیم شر و فساد پے بہ پے می کنیم رزمِ جہاد
کُفر را تا شود ہزیمت ہا فوجِ ابلیس را فضیحت ہا
تا شود عام امنِ اسلامی جا بگیرد نظامِ قرآنی

ارکانِ دین۔

دینِ حق را بلند تر داریم ملّتِ کُفر برہم اندازیم
باز قائم کنیم ارکاں را حرمتِ اہلِ دین و ایماں را
باز قائم بود صلوٰۃ و زکوٰۃ باعثِ رونقِ حیات و ممات
امرِ معروف را فروغ دہیم منکرِ شرع را زبیخ کَنیم
تا کہ ہر کس بحقِ خویش رسد نیک و بد را جزائے پیش رسد
تخت آریم نیز بحر و بر زیرِ قرآں شوند خشک و تر

شادمانی۔

ارشد آنگاہ شادماں گردد دینِ حق را لوا چو افرازد

عہدِ توحید را نشانِ راہ
کلمۂ لا الٰہ الاَّ اللّٰہ

عبدالکریم ثمر

عظمتِ انسان

یہ شرحِ صدرِ سرورِ عالم کا ہے کمال
کون و مکاں میں ہو گئی آرائشِ جمال

جبریل ہم صفیر ہیں قدسی ہیں ہم خیال
تکمیلِ کائنات تھی منشائے ذوالجلال

وہ التفات و رحمت و بخشش کا ایک باب
جس کا تمام ارض و سما میں نہیں جواب

فیضِ نگاہِ لطف سے ذرّے ہیں آفتاب
اس کی نظر میں ایک ہیں صدیقؓ اور بلالؓ

اسلام ہے مروّت و شفقت کا شاہکار
خدمت گزارِ محملِ شاہی میں ہو سوار

فاروقؓ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے مہار
پیدا نہ ایسی کر سکی تاریخ پھر مثال

یہ ارتباطِ اسود و احمر کا اہتمام
صف بستہ اک قطار میں ہیں خواجہ و غلام

لب پر دعائے خیر، مساوات کا پیام
یہ احترامِ عظمتِ انساں کا ہے کمال

ماہرالقادری

......جنابِ بوترابؓ آئے!

کہا صلِ علیٰ سب نے، فلک سے بھی خطاب آئے
قدمبوسی کی خاطر آفتاب و ماہتاب آئے

جلو میں دین و ایماں، علم و دانش ہم رکاب آئے
زمیں کی جاگ اٹھی قسمت جنابِ بوتراب آئے

بابِ مدینۃ العلوم، صاحبِ ذوالفقار بھی
شاملِ پنجتنؑ بھی ہیں۔ شاملِ چار یارؓ بھی

نانِ جویں غذا مگر فاتحِ خیبر و حنین
علم کے شہریار بھی، فقر کے تاجدار بھی

زوجِ بتولِ فاطمہؓ، صاحبِ تاجِ لافتیٰ
باعثِ فخرِ کائنات، نازشِ روزگار بھی

نامِ خدا حسنؓ حسینؓ، دونوں علیؓ کے نورِ عین
باغِ نبیؐ کے پھول ہیں، پھول نہیں بہار بھی

یادِ نجف میں آنکھ سے اشک رواں جو ہو گئے
آئینۂ خیال سے دھلنے لگا غبار بھی

قدر شناسِ مرتبت، زمزمہ سنجِ منقبت
قمری و صلصل و ہزار، موجۂ آبشار بھی

روحِ انتخاب

سعدؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون لوگ سخت بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا انبیاءؑ پھر وہ لوگ جو انبیاء سے مشابہ ہوں، پھر وہ لوگ جو انبیاء سے زیادہ مشابہ ہوں۔ پھر انسان جس قدر دین میں زیادہ سخت ہوتا ہے اسی قدر اُس کی مصیبت سخت ہوتی ہے۔ جس قدر دین میں نرم ہوتا ہے اُسی قدر اس کی مصیبت ہلکی ہوتی ہے۔ بس ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ دین میں سخت انسان زمین پر چلتا ہے اس حال میں کہ گناہ سے پاک ہوتا ہے!

حضورؐ نے فرمایا کہ جب تم کسی مریض کی مزاج پرسی کو جاؤ تو اُس کو تسکین دو اور اُس کے رنج و غم کو دور کر دو۔ یہ تسکین دلشفی اگرچہ حکمِ الٰہی کو نہیں روکتی لیکن مریض کے دل کو ضرور خوش کر دیتی ہے!

سہیل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک کا نام باب الریان ہے۔ اس دروازہ میں سے جنت کے اندر (صرف) روزہ رکھنے والے داخل ہوں گے۔

عمروؓ بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اشعار پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور خرید و فروخت سے بھی اور جمعے کے دن نماز سے پہلے حلقہ باندھ کر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو مسجد بنا لینے والوں پر اور چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے!

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہایت سچا اور دیانت دار تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سُود کے گناہ کے ستر حصے ہیں ایک معمولی سا حصہ یہ ہے کہ اس کا گناہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے جماع کرے!

حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے مگر قرض معاف نہیں کیا جائے گا۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت پردہ میں رکھنے کی چیز ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو مرد کی نگاہ میں بہت بہتر صورت میں دکھاتا ہے!

عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک بہترین اعمال میں سے وہ عمل ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو!

عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ نے تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک پورا مومن نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اُس کی خواہشات اُس چیز کے تابع نہیں ہوتیں جس کو میں (خدا کی طرف سے) لایا ہوں!

حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے میری امت کے بگڑنے کے وقت میری سنّت کو اپنا رہنما بنایا اُس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

م۔نسیم

ایک دن پہلے

چار دن باہر رہنے کے بعد جب میں واپس آیا تو گھر پہنچتے ہی پتہ لگا کہ صاحبزادہ وحید الزماں کا فون آیا تھا۔ پیغام میز پر لکھا رکھا تھا۔ یہ کہ "پہلی فرصت میں آنے کی زحمت کریں۔"

میں نے غسل کیا، کپڑے بدلے، تھوڑی دیر سفر کی تکان اُتارنے کے لئے لیٹ گیا۔ پھر وقت سے کچھ پہلے ہی دن کا کھانا کھا کر اُن کے بنگلہ روانہ ہو گیا۔

صاحبزادہ وحید الزماں میرے سب سے امیر مؤکلوں میں سے تھے۔ ویسے تو میں اُن کا مستقل وکیل تھا مگر وہ ہر قانونی مشورہ کی فیس تک الگ دیتے تھے۔ دولت والے قاعدے قانون کے کم ہی پابند ہوتے ہیں۔ مگر وہ بڑے ضابطہ بند قسم کے آدمی تھے۔ اکلوتی اولاد تھے۔ ابھی حال ہی میں باپ کے بعد سب کچھ اُن کے ہی حصہ میں آیا تھا۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ مگر شادی نہیں کی تھی قریب تینتیس برس کے اچھے وجیہ آدمی تھے۔ بڑی تندہی اور تدبّر سے سارا کام کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ پہلے کسی اعصابی گڑبڑ کے سبب ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ لہذا پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ اور اسی تین چار دن کے بیچ میں واپس آئے تھے۔ جب میں باہر گیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ اب صحت مند ہو چکے تھے۔

کار، پورٹیکو میں روک کر میں اُترا۔ اور اپنے آنے کی اطلاع کرائی۔ فوراً ہی بلا لیا۔ دیکھتے ہی اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ علیک سلیک ہوئی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے دیکھا اُن کا چہرہ بُجھا بُجھا سا تھا۔ غالباً ابھی بیماری کا اثر باقی تھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"اب تو بالکل ٹھیک ہے شیخ صاحب! خدا کا شکر ہے۔"

اُن کا لہجہ اور خاص کر آخری جُملہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ میں نے پوچھا:۔

"آپ کچھ مضمحل سے نظر آتے ہیں؟"

"اوہ! جی ہاں۔ مگر اس کی وجہ، طبیعت نہیں ہے۔" نوکر کی طرف دیکھ کر وہ بولے۔ "چائے لاؤ۔"

"میں ابھی کھانا کھا کر آیا ہوں۔"

"کوئی ہرج نہیں۔" کہہ کر انہوں نے سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ نکالا اور سلگا لیا۔ انھیں معلوم تھا میں سگریٹ نہیں پیتا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سگریٹ بھی وہ خلافِ معمول کسی قدر بے چینی سے جلد جلد پی رہے تھے۔ آخر کار سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر وہ کھڑے ہو گئے۔ کمرے کے سرے تک جا کر میز کی دراز سے ایک فائل اور ایک بڑا لفافہ نکالا۔ اور واپس آ کر بیٹھ گئے۔ اب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے:۔

"شیخ صاحب! ایک ضروری کام کیلئے اس وقت آپ کو زحمت دی ہے۔ براہ کرم اسے جلد ہی کرا دیجئے گا۔ لیکن کام بتانے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ دو لفظوں میں اس کی کچھ تفصیل بتا دوں" وہ کچھ رُکے۔ "والد صاحب کی وفات کے بعد میری طبیعت خراب ہونے سے کچھ پہلے ایک دن ایک عورت میرے پاس آئی اور اُس نے مجھے یہ دیا۔" انہوں نے لفافے سے ایک پرانا تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو وہ قدیم طرز پر لکھا ہوا ایک نکاح نامہ تھا جس میں ایک لاکھ پچیس ۲۵ ہزار زرِ سفید کا مہر درج تھا۔ "آپ کو سُنکر حیرت ہو گی مگر مجھے بتانے میں کوئی تامل نہیں۔ اُس عورت سے والد صاحب نے ہم لوگوں کی بے خبری میں شادی کی تھی۔ نکاح کے سلسلہ میں صرف اُس عورت کے قریبی رشتہ داروں اور گواہوں کو خبر ہے۔ غالباً والد صاحب کے دو تین مرحوم دوست بھی اس سے آگاہ تھے۔ اُس عورت نے کہا کہ والد صاحب کی وفات کے بعد ایک تو وہ عدت کے سبب نہیں آئی۔ دوسرے ایسے غم کے موقع پر اس طرح آنا بُرا لگتا تھا۔ اُسے امید تھی کہ میں خود اُس کے پاس پہنچوں گا۔ اُسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ والد صاحب نے مجھ سے یا کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ برابر اُن سے کہتی رہی تھی۔ مگر والد صاحب کسی اچھے وقت کا انتظار کرتے رہے بہرحال وہ عورت مجھے یہ دے کر چلی گئی۔ کہ میں جیسا مناسب سمجھوں، کروں"

اُنہوں نے اضطراب کے ساتھ پھر ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ مجھے یہ سوچ کر کچھ حیرت ہوئی کہ ایسا باتدبیر آدمی اس سیدھی سی بات کے سلسلہ میں اتنا پریشان ہے۔ نکاح نامہ کو آتشدان میں ڈال کر وہ ایک منٹ میں یہ قصہ ختم کر سکتے تھے۔ وہ اب تک بہت کچھ کر چکے تھے۔ میں نے انھیں بتایا نہیں تھا کہ میں یہ بات جانتا ہوں۔ ہم وکیل لوگ بتایا بھی نہیں کرتے۔ مگر یہ واقعہ تھا، وہ قانون کی باریکیاں اور اُس کی دلیلیں اتنی خوبی سے جان لیتے تھے کہ کئی بار مجھے مضمون ڈرافٹ کر دینے کے علاوہ کچھ نہیں کرنا پڑا۔ لیکن اس بار وہ یوں بیٹھے تھے جیسے تدبیریں اپنی جان چھڑا کر بھاگ گئی ہوں، پھر بھی میں نے کہا:۔

"ممکن ہے یہ نکاح نامہ نقلی ہو۔ آپ صرف اس کے ہونے سے ...."

"آپ کا قطع کلام ہوا۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں۔ وہ خاتون مجھے کچھ خطوط بھی دے گئی ہیں۔ جو والد صاحب نے انھیں لکھے تھے۔ ہاتھ والد صاحب ہی کا ہے۔ اُن کو دیکھ کر مجھے والد صاحب کی بعض باتیں یاد آگئیں۔ بعض دفعہ بڑے اہتمام سے وہ مجھے کچھ بتانے کیلئے بلاتے مگر پھر بات ٹال دیتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن میں کچھ ایسی بھی باتوں کی طرف اشارہ ہے جو میرے اور والد صاحب کے علاوہ کسی کے علم میں بھی نہ تھیں۔ نقلی ہونے کی صورت میں یہ سب کیسے ہو سکتا تھا"

"تو اس میں فکر مند کیوں ہو رہے ہیں آپ۔ سب کچھ تو آپ کے پاس ہی ہے۔ ختم کیجئے"

صاحبزادہ وحید الزماں نے اس کے جواب میں مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن کو شاید میں کبھی نہ بھول سکوں۔ اُن میں فکر بھی تھی۔ ملامت بھی، اور کچھ حیرت بھی۔ میں ایسی نظروں کو پہچانتا ہوں۔ میرے مخالف وکیل کے مؤکل عام طور پر مجھے ایسی ہی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اُس وقت پہلی بار خود میرے سب سے بڑے مؤکل کی نظریں ایسی تھیں۔ مؤکل بھی ایسا جس کے لئے ایسی باتوں کی کبھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کم از کم میں نے اپنے زمانے میں برابر یہی دیکھا۔ وہ ایسی باتوں کو ہمیشہ بالکل معمولی سمجھ کر روزمرہ کے کاموں کی طرح کر ڈالتے تھے!

صاحبزادہ وحید الزماں نے نظروں کو جھکا لیا۔ "نہیں شیخ صاحب" وہ بولے۔ "اگر یہی کرنا تھا تو میں آپ کو ہرگز زحمت نہ دیتا۔ مجھے جب سے اس کا خیال آ رہا ہے کہ اتنے بڑے معاملہ میں اب تک کسی نے بھی اس قدر بے جھجک ہو کر مجھ پر اعتبار نہیں کیا ہے، جتنا اس خاتون نے۔ وہ صرف چند باتیں کر کے یہ سب کاغذات اور خطوط میرے پاس چھوڑ گئیں۔ یہ میرے لئے خود ایک عجیب بات ہے۔ بہرحال میں چاہتا ہوں وہ یہ ہے۔" انہوں نے میز پر رکھی ہوئی فائل میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اسے کھولا۔ وہ بولے۔ "آپ کی غیر موجودگی میں میں نے آپ کے مختار اور ایک اور وکیل کو بلا کر یہ کاغذات تیار کرائے ہیں۔ مگر ابھی رجسٹری وغیرہ باقی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ آخری کام آپ کے ہاتھ سے انجام پائے۔"

انہوں نے پھر ایک سگریٹ سلگا لیا۔

پہلا صفحہ ختم کرتے کرتے مجھے احساس ہو گیا کہ میں کیسی عجیب فائل اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہوں۔ یہ ساری جائداد کا اور اس سارے نقد روپے کا ہبہ نامہ تھا جو کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ یعنی وہ سب کچھ جو صاحبزادہ وحید الزماں نے اپنے والد سے پایا تھا، اسی عورت کے نام منتقل کر دیا تھا۔ جس کا نکاح نامہ میں ابھی دیکھ چکا تھا۔

دوسرا صفحہ پلٹتے ہوئے میں نے نگاہ اٹھا کر انھیں دیکھا۔ وہ میری نظروں کی حیرانی کو دیکھ کر مسکرائے۔

"یہ تو کوئی عجیب بات نہیں شیخ صاحب! ایسے معاملے تو روز ہی عدالت کے روبرو فیصل ہوتے ہیں۔ کیا میں کر رہا ہوں ایسا۔ اس لئے تعجب ہے؟" اُن کی مسکراہٹ میں عجیب حسرت سی پیدا ہو گئی۔ جیسے کوئی مظلوم کہہ رہا ہو۔ کیا آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے۔ "بہرحال آپ اسے دیکھ لیں۔ نکاح نامہ میں اس کا حوالہ دینا یا مہر اور ورثہ کی تقسیم کی صورت میں اس کا دینا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ گو یہ سب ہے در اصل اسی مد میں۔ آپ کے مختار یا دوسرے وکیل صاحب کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس چیز پر والد صاحب نے پردہ پڑا رہنے دیا تھا اُسے یونہی چھوڑ دیا جائے۔"

میں فائل کے کاغذات اُلٹتا پلٹتا رہا اور باتیں سنتا رہا۔ جب وہ چپ ہو گئے تو میں نے کچھ دیر تامل کیا۔ پھر وہ بات اُن سے کہہ ہی دی جو مجھے اپنے منصب کے لحاظ سے کہہ دینی چاہیئے تھی۔

"میں، بحیثیت آپ کے قانونی مشیر کے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے فیصلے بعض جلدی میں اور جذبات کی رو میں ہو جاتے ہیں۔ آپ ان پر اچھی طرح غور فرما لیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ دانش مندی کا تقاضا کیا ہے؟ آپ کو بہرحال اپنے مستقبل سے اس قدر بے توجہی مناسب نہیں۔ اب رہا اس عورت کو مطمئن کرنے کا سوال... " میں کچھ اور کہتے کہتے رُک گیا۔ اُن کی آنکھوں میں ایسی ہلکی ہلکی چمک تھی جیسے عدالت میں کسی تقریر سے کوئی جج لطف لے رہا ہو۔ آخری جملہ کوشش کرنے پر بھی میں پورا نہیں کر سکا۔

"میں آپ کی خیر خواہی کی قدر کرتا ہوں شیخ صاحب! اور اس کے لئے ممنون ہوں۔ مگر...." انہوں نے راکھ دان میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ "میں اس کا فیصلہ کافی دن پہلے کر چکا ہوں۔ آرام کرنے کے پورے عرصہ میں میں نے اس پر خوب غور کیا ہے۔ پھر بھی میرا ارادہ یہی تھا کہ طبیعت بحال ہونے پر پہلا کام یہی کرنا ہے۔ یہ ارادہ کیسے ہو گیا، اب یہ ذکر ضروری نہیں۔ لیکن تقریباً ایک مہینہ کا عرصہ، کیا آپ کے خیال میں اچھی طرح غور کرنے کے لئے کافی نہیں۔" مسکراہٹ اُن کے لبوں پر آ گئی۔

میں مطمئن تو اب بھی نہیں تھا۔ مگر ایک ایسے شخص کو اور کچھ سمجھانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جو خود ہی تدبر کیسا تھ
تمام کام انجام دیتا رہا ہے۔ ممکن ہو کہ بیماری کے دوران، کسی رقت انگیز لمحہ میں انہوں نے اپنے پچھلے کاموں کی تلافی کے
طور پر یہ قدم اٹھانا طے کیا ہو۔ انہوں نے بہت سے کام ایسے کئے تھے۔ بہت سے لوگ بہت سے اس طرح کے کام کرتے
ہیں جس کا انھیں صرف پچھتاوا ہوتا ہے۔ تلافی کا خیال نہیں آتا۔ ہم وکیل بہت سی ایسی باتیں جانتے ہیں۔ مگر میری
طرح شاید ہی کسی وکیل کو ایسا شخص ملا ہو۔ جو اُن باتوں کی تلافی بھی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے آخری حجت کے انداز
میں کہا:۔

"پھر بھی کم از کم آپ کو اپنی آئندہ زندگی کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد تو درکار ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ سب
کچھ ختم کرکے پھر نئے سرے سے سب کچھ بنا سکیں گے؟" میں کیا کہنا چاہتا تھا، اور وہ بھی باپ کی دولت سے مدد لئے
بغیر؟ مگر میں نے یہ نہیں کہا۔ ہم وکیل، یہ بات بھی جانتے ہیں کہ کونسی بات حق ہوتے ہوئے بھی، کہنی مناسب نہیں۔
"اس کا انتظام تو ہے شیخ صاحب! اس فائل کے آخر میں حسابات کی تفصیل ہے۔ سب کچھ کرنے کے بعد قریب
سوا یا ساڑھے چار ہزار روپیہ باقی بچتا ہے۔ میں اُسے اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"
میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ "جی ہاں۔ اس صورت میں تو توقع ہے کہ آپ دس بارہ سالوں میں اتنا ہی کچھ بنالیں گے
مگر کیا یہ ممکن ہوگا؟ میں نے پھر یہ آخری بات صرف دل میں کہی۔ ویسے مجھے واقعی یہ یقین تھا کہ اگر اُن کو اتنا موقع
مل جائے تو وہ بالکل کر سکتے ہیں۔ پھر یہ بات سوچکر میں دل میں ہنسا۔ کہ تب، ایسے فضول قسم کے کارخیر کی کیا ضرورت
تھی۔ اس سے جتنی پچھلی باتوں کا کفارہ ہوگا۔ اس سے زیادہ تو آئندہ کی باتوں کا بوجھ پیدا ہوجائے گا۔ اس بوجھ کے
لئے تو آئندہ کے دس کیا، بیس سال بھی کافی نہ ہوں گے۔ صاحبزادہ وحیدالزماں کو جو کاروبار باپ سے ملا تھا۔ وہ تھا ہی ایس
کہ اس کا دارومدار ذخیرہ اندوزی اور سٹہ پر تھا۔ جب صرف ایک عورت کے ساتھ اپنے باپ کی زیادتی کی، سب کچھ دے ک
تلافی ہوئی ہو۔ تو پھر اگلی ہزاروں زیادتیوں کے بدلے میں تو قارون کا خزانہ بھی کام نہ دے گا۔ میں یہ سوچکر مسکرایا کہ
آدمی اپنے آپ کو کیسا ہی عقلمند خیال کرے مگر اس کو چند قدم چلتے ہی ٹھوکر لگتی ہے۔ مگر میں وکیل تھا اور ایسی بات ک
اظہار نہ صرف ہمارے پیشہ بلکہ وقار کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"اچھا۔ بہر حال جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے فائل بند کر دیا۔ "مگر ایسی جلدی کیا ہے۔ آپ نے طبیعت بحال ہونے
کے بعد ابھی تو آکر کام سنبھالا ہے۔ دو چار دن بعد اطمینان سے طے کر لیجئے گا۔"

"نہیں شیخ صاحب! اب طے کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جلد سے جلد باقی کارروائی ختم کرا لیجئے۔۔۔
ہو سکے تو کل ہی۔ میں نے اسی واسطے آپ کے نام مختارنامہ بھی لکھ دیا ہے۔ تاکہ میری وجہ سے کوئی کام رُکے نہیں۔
فائل کے آخر میں وہ بھی ہے۔"

"کیوں۔ کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"نہیں جا تو نہیں رہا۔ پھر بھی ۔۔۔" وہ کچھ رُکے، "میں نے احتیاطاً اتنا کچھ کر دیا ہے کہ کسی قسم کی تاخیر نہ ہو
ایسے کام میں دیر مناسب نہیں۔"

صاف ظاہر تھا کہ اب میرا کچھ کہنا بالکل مناسب نہ تھا۔ ایک ذمہ دار شخص اپنی مرضی سے ایک فیصلہ کرکے اس پر

قائم ہے تو اب مجھے اعتراض کی کیا ضرورت ہے۔ فائل کو اُلٹتے پلٹتے ہوئے میں نے اپنی فیس کا چیک بھی منسلک دیکھا تھا۔ میں فائل اور لفافہ لے کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"آپ کہتے ہیں تو میں کل ہی کرا دوں گا۔ اچھا۔ اجازت چاہتا ہوں"

دروازے تک وہ مجھے چھوڑنے آئے اور ہاتھ ملا کر میں کار میں بیٹھ گیا۔

راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ آخر وہ کونسی بات ہو گی جس نے صاحبزادہ وحید الزماں جیسے مضبوط قسم کے انسان کو پگھلا کر موم کر دیا تھا۔ واقعہ عجیب تھا۔ مگر جس سبب سے یہ واقعہ ہوا تھا وہ یقیناً اس سے بھی عجیب ہو گا۔

گھر آ کر سفر کی رہی سہی تکان اتارنے کے لئے میں کچھ دیر اور لیٹ گیا۔ نیند آ گئی۔ سہ پہر کو اٹھ کر چائے پینے کے بعد میں اپنے آفس گیا۔ منشی جی اور مختار صاحب کے ساتھ پچھلی مسلیں دیکھیں۔ بیچ میں جو کام اکٹھا ہو گیا تھا اس کا جائزہ لیا۔ اور صاحبزادہ وحید الزماں کی فائل مختار صاحب کے حوالے کر کے کہا کہ فی الحال اسے رکھیں۔ نہ معلوم کیوں مجھے اب بھی یہی امید تھی کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کا خیال کر کے اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ ہو ہی جائیں گے۔

دوسرے دن میں آ کر ناشتہ کی میز پر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہلو۔ میں اے ایم شیخ ایڈووکیٹ بول رہا ہوں"

"میں ہوں سول سرجن ڈاکٹر ماتھر۔ صاحبزادہ وحید الزماں کے بنگلے سے، میں بڑے دکھ کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دیتا ہوں کہ صبح تقریباً ساڑھے چھ بجے صاحبزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے"

"کیا!"

"جی ہاں۔ ہیمریج کے سبب۔ اعصابی تکلیف کے اثر سے دماغ کی اندرونی رگوں کے پھٹ جانے سے۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ میری تمام کوششیں بیکار گئیں۔ میرے آنے سے پہلے ہی کیس بالکل بگڑ چکا تھا۔ آپ چونکہ اُن کے قانونی مشیر۔۔۔۔۔ ہلو!"

"جی ــــ جی ہاں"

"میں کہہ رہا تھا کہ اُن کے قانونی مشیر ہونے کے سبب آپ ہی مرحوم کے دور یا قریب کے کسی رشتہ دار سے واقف ہوں گے ہم یہاں کسی نوکر وغیرہ سے اور کچھ معلوم نہ کر سکے۔ مہربانی سے، جو صاحب بھی مرحوم سے متعلق ہوں، آپ اُن کو صاحبزادہ صاحب کی اچانک موت کی غمناک اطلاع پہنچا دیں ــــ ہلو؟"

"جی ــــ میں سن رہا ہوں۔ میں ۔ میں ابھی پہنچتا ہوں"

"بہتر ہے"

ریسیور رکھ کر میں تھوڑی دیر اسی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ کچھ معاملے پرانے سے پرانے وکیل کے لئے بھی حیران کن ہوتے ہیں۔ مگر یہ واقعہ تو ان سب سے بڑھ گیا تھا۔ میں چپکا بیٹھا اپنے آپ پر سے اس فوری حادثہ کا اثر ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوکر کو ناشتہ اٹھا لے جانے کا اشارہ کر کے میں نے ٹرے میں سے اخبار اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر تک خبروں پر نگاہیں دوڑتی رہیں۔ مگر دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر میں نے اضطراب کے ساتھ فون اٹھایا۔ اور اپنے دفتر سے نمبر ملایا۔

"ہلو، منشی جی! میں بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے، صاحبزادہ وحیدالزماں کا انتقال ہو گیا ہے!"

"ہیں! .... یہ کب؟ کیسے؟"

"دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ ابھی صبح چھ ہی بجے۔"

"اِنَّا للہ .... بڑا دردناک حادثہ ہے شیخ صاحب!"

"ہاں منشی .... دیکھئے۔ وہ مختار صاحب کے آتے ہی صاحبزادہ صاحب کے کاغذات فوراً رجسٹری کرانے بھیجدیں۔ سمجھے آپ؟ فوراً .... میں مرحوم کے بنگلہ جا رہا ہوں۔"

"جی ہاں۔ سمجھ گیا۔ جی بہتر ہے — افسوس ابھی تو بالکل جوان ہی تھے۔ شادی بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ کیا ناوقت موت پائی ہے۔"

"ناوقت نہیں منشی جی!"

"جی، کیا فرمایا آپ نے۔"

"کچھ نہیں۔"

بڑی دیر تک میں میز پر رکھے ہوئے اخبار کو اِدھر اُدھر سے دیکھتا رہا۔ مرنے کے بعد ہر ایک کی ساری پونجی دوسروں ہی کے پاس جاتی ہے۔ چاہے وہ وصیت کر کے دے یا دوسرے دھوکہ بازی سے ہتھیالیں۔ مگر اس پونجی کے حساب کی ذمہ داری اُسی پر رہتی ہے۔ یہ سب کچھ جمع کیسے کیا — کہاں سے آیا — لیکن اس شخص کی تو ساری زندگی کا حساب آن کی آن ایسے بیباق ہوا ہے کہ کوڑی کوڑی ادا ہو گئی!

اس اطلاع کے بعد سے اب تک میں صرف یہی بات سوچ رہا تھا۔ اگر صاحبزادہ وحیدالزماں نے کل یعنی صرف ایک دن پہلے اپنا فیصلہ بدل دیا ہوتا، تو؟

ہماری نظر میں

کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟

"کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟" مرتبہ۔ حکیم عبد الرحیم اشرف۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تہذیب ملت۔ لائلپور۔

جماعتِ اسلامی کے خلاف طنز و دشنام، الزام تراشیوں اور مخالفتوں کا ایک طوفان برپا ہے۔ جن علماء سے اور جن اداروں اور مذہبی گروہوں سے جماعتِ اسلامی کی تائید کی توقع تھی، انھوں نے جماعتِ اسلامی کی اندھادھند مخالفت کو شاید "جہادِ اکبر" سمجھ رکھا ہے۔ یہ طوفان بظاہر تھمتا دکھائی نہیں دیتا!

دستور جماعتِ اسلامی کے اس بنیادی عقیدہ سے:۔

"رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیارِ کامل کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اُس کو اسی درجہ میں رکھے"۔

مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالمِ دین نے، جن کو لوگ "شیخ العرب والعجم" کہتے ہیں، ایسے ایسے نکتے پیدا کئے ہیں اور وہ وہ باریکیاں نکالی ہیں کہ ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

یہ کتاب اسی موضوع پر مرتب کی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں بتایا گیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت کس کس حلقہ سے ہوئی ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے! پھر تکفیر مسلم کے سلسلہ میں قرآن، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں کہ اس میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ کفر اور بے دینی کا فتویٰ بچوں کا طمنچہ نہیں ہے کہ جب جی میں آیا داغ دیا۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کے دینی موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ پھر فلسطین، مصر، نجد اور پاکستان و ہندوستان کے فقہا اور علماء کے فتاویٰ درج ہیں جن میں جماعتِ اسلامی کے متذکرہ بالا بنیادی عقیدہ کو درست بتایا گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ کا عنوان "اتمامِ حجت" ہے، جس میں جماعتِ اسلامی کے اکابر کے جوابات درج ہیں۔ جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے دستور کی مندرجہ بالا دفعہ سے جو عجیب و غریب معنی نکالے گئے ہیں وہ اُس کے واضعین اور مصنفین کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے!

جناب حکیم عبد الرحیم اشرف نے یہ کتاب ترتیب دے کر حجت کو واقعی تمام کر دیا ہے اور مخالفین کے لئے چون وچرا کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑی۔

حسرت کی سیاسی زندگی "حسرت کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں"۔ از۔ عبدالقوی دیسنوی۔ ضخامت ۲۷ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ رائٹرس امپوریم لمیٹڈ۔ پیو پلس بلڈنگ۔ فیروز شاہ مہتا روڈ۔ بمبئی ۱۔

اس کتاب میں مولانا فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ جن کو حسرت کے واقعاتی شعروں نے اور زیادہ دل چسپ بلکہ تابناک بنا دیا ہے۔ حسرت موہانی کے اس قسم کے شعروں سے ؎

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا اہلِ سوویت نے
دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوف دیں ہو کر

پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی شدید مذہبیت کے باوجود اشتراکیت سے کس قدر متاثر تھے۔ اس تضاد میں بظاہر تطابق کی کوئی صورت ہماری تو سمجھ میں نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ انگریز کی دشمنی نے کمیونزم کو ان کی نگاہ میں پسندیدہ بنا دیا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کو بھی کیمونزم سے خاص لگاؤ ہے۔ اس لئے اُن اشعار کو چُن چُن کر کتاب میں درج کیا گیا ہے، جن میں حسرت مرحوم نے اشتراکیت کی مداح سرائی کی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے، کہیں کہیں :۔

"فرنگیوں کے عتاب میں پڑکر آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیئے جاتے ہیں۔"

جیسی زبان کی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔

OUR CONSTITUTIONAL PROBLEM از :۔ محمد ظفر احمد انصاری (ایم اے، بی اے آنرز۔ ایل ایل بی) ضخامت ۲۷ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ آفاق پبلیکیشنز ۱۸/۱۲ بندر روڈ۔ کراچی۔

جناب ظفر احمد انصاری تقسیم ہند سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے ذمہ دار مرکزی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ پاکستان میں وہ تعلیماتِ اسلامی بورڈ کے سیکرٹری رہے ہیں۔ دستور سازی کے سلسلہ میں صاحب موصوف نے جس حکمت و فراست اور ایثار و خلوص کے ساتھ دینی خدمت انجام دی ہے وہ اپنا آپ ہی جواب ہے۔ جناب ظفر احمد انصاری کی کوششوں نے نہ جانے کتنے متضاد عناصر کو دستور سازی کے دینی محاذ پر جمع کیا ہے۔

جس زمانہ میں دستور سازی کا کام ہو رہا تھا اور بعض اچھے خاصے لکھے پڑھے ذمہ دار لوگ اس تذبذب میں تھے کہ پاکستان کا نام "اسلامی جمہوریہ" رکھیں کہ نہ رکھیں، صدرِ مملکت کے مسلمان ہونے کی شرط کو حذف کر دیں یا باقی رہنے دیں۔ تو انصاری صاحب نے اُن دنوں ایک معرکہ آرا مقالہ انگریزی میں لکھا جو روزنامہ "ڈان" نے پانچ قسطوں میں شائع کیا۔ اس مقالہ کی علمی اور سیاسی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ یہی مقالہ انگریزی میں اور ساتھ ہی اس کا اردو ترجمہ بھی کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

دستور بننے کے بعد بھی اس مقالہ کی افادیت اپنی جگہ باقی ہے۔ وہ لوگ جو اب تک سیاست اور دین کے بارے میں واضح تصور نہیں رکھتے اس مقالہ کو پڑھ کر کم سے کم اس حد تک تو ضرور مطمئن ہو جائیں گے کہ پاکستان کے علاوہ یورپ کی بہت سی متمدن حکومتوں کے دستور و آئین میں بھی مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور پاکستان کا

"اسلامی جمہوریہ" بننا، قدامت پرستی، تاریک خیالی اور تنگ نظری کی دلیل ہرگز نہیں ہے۔
اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دلائل و مندرجات نے دستور سازی پر اثر ڈالا ہے۔ اور اسلام پسند طبقہ کو بروقت کمک پہنچائی ہے۔

تاریخ بالکنڈہ

"تاریخ بالکنڈہ"۔ از:۔ منشی محمد فیض الدین صدیقی دکھنی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات (بڑا سائز)۔ قیمت دو روپے آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد، رفعت منزل، حیدرآباد دکن۔

کوئی صاحب منشی محمد فیض الدین صدیقی ہیں جن کو اپنے وطن بالکنڈہ سے محبت ہے۔ اسی محبت نے اُن سے یہ کتاب تالیف کرائی ہے، کتاب کی تاریخی اہمیت (؟) کا اندازہ اس قسم کے واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

"حاجی سید حمید الدین صاحب منشی دفتر کو نیابت کا عہدہ دیا گیا اور جاگیر کے مالی کاروبار کا اُن کو ذمہ دار قرار دیا گیا اور اُن کی تنخواہ تیس روپے ماہوار مقرر کردی گئی۔"

بالکنڈہ کے مشاہیر (؟) کی بھی ایک جھلک دیکھتے ہی چلئے:۔

"ذکا رام مرہٹا ایک مالدار شخص تھا اور سُودی کا روبار کیا کرتا تھا۔ یہ بے فیض آدمی تھا۔ ضعیف ہو کر لاولد فوت ہوا اور دولت بھی لاپتہ ہو گئی۔"

حیدرآباد کے ایک نواب صاحب کے کمالات کا ایک باب ملاحظہ ہو:۔

"نواب کو آموں کا بڑا شوق تھا، دور دراز مقامات سے آم منگوائے جاتے تھے اور غیر موسم میں بھی آم استعمال کرتے تھے۔ حیدرآباد میں آم خوری میں بھی یہ مشہور امیر گزرے ہیں۔"

زبان و بیان کا یہ رنگ ہے:۔

"تقاریب ہائے شادی" (صفحہ ۱۸) "اکابرین و مشاہیرین" (صفحہ ۵۴) "شریف الخاندان (صفحہ ۵۵) "بر قفا لکل جگی پھر واپس نہیں ہو سکتی"۔ (صفحہ ۸۷)، "آپ کی مزار بھی چلہ کے سامنے بنائی گئی" (صفحہ ۹۶)

بزرگانِ دین کے حالات کے ضمن میں مزاروں پر صندل مالی، چادروں کے چڑھانے اور جھنڈوں اور منڈپ لے جانے کی بدعات و خرافات کا بھی ذکر کیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات (مولوی عبدالمجید صدیقی) کا لکھا ہوا ہے۔ اُس کا رنگ یہ ہے:۔

"دکن ایک مربوط تاریخی خطہ ہے۔ اس میں صدیوں کی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ خود قومی تاریخ بھی ابھی تشنہ ہے۔۔۔۔۔۔"

ادارہ ادبیات اُردو نے اس کتاب کو چھاپ کر اپنے ذوقِ انتخاب کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔

تعارفی کیلنڈر

"تعارفی کیلنڈر"۔ مرتبہ:۔ اسعد گیلانی۔ شائع کردہ۔ مکتبہ تعمیر انسانیت، گجر گلی موچی دروازہ لاہور۔ قیمت بارہ آنہ۔

جماعتِ اسلامی کا یہ تعارفی کیلنڈر مکتبہ تعمیر انسانیت نے خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے، انگریزی اور اسلامی مہینوں کی تاریخیں اردو جلی حروف میں درج ہیں۔ کیلنڈر کے اوپر نہایت ہی خوبصورت رنگین طغرا ہے

جس پر اللہ اور رسولؐ کے نام بہت ہی خوشخط لکھے ہوئے ہیں۔ یہ کیلنڈر کا کیلنڈر ہے اور جماعت اسلامی کا تعارف نامہ بھی ہے۔ عنوانات:۔

تحریک اسلامی کا داعی۔ تحریک اسلامی کی دعوت، تحریک اسلامی کا طریق کار۔ حلقہ ہائے متفقین کا پروگرام۔ تنظیمی شعبے تحریک اسلامی کی تاریخ۔ تحریک اسلامی کا لٹریچر اور جرائد۔

اس کیلنڈر سے گھروں کی زینت بھی ہوگی اور دینی فائدہ بھی حاصل ہوگا۔

یوم اسلامی جمہوریۂ پاکستان پر ملت کے نام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا پیغام

"یوم دستور ہماری قومی تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ اس دن سے ہم اپنی زندگی کی ابتداء ایک ایسی آزاد قوم کی حیثیت سے کر رہے ہیں جس نے آئینی طور پر خداوند تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کیا ہے، اقتدار کو اس کی طرف سے ایک مقدس امانت جان کر استعمال اقتدار کیلئے اس کے مقرر کردہ حدود کی پابندی قبول کی ہے، آج دنیا کی تمام قوموں کے درمیان ہم وہ تنہا قوم ہیں جس نے اپنے دستور مملکت کے سرنامہ پر یہ اعلان ثبت کیا ہے کہ ہم جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی انصاف کے اس تصور پر عمل کریں گے جو اسلام نے ہم کو دیا ہے، اس لحاظ سے آج کا دن ہمارے لئے صرف ایک مبارک دور کا آغاز ہی نہیں ہے بلکہ ایک سخت آزمائش کے دور کی ابتداء بھی ہے۔ ہم نے خلق اور خدا دونوں کے سامنے اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹی پر رکھ دیا ہے۔ اب دنیا بھی یہ دیکھے گی اور دنیا کا مالک بھی یہ دیکھے گا کہ ہم اپنے اس قول میں کہاں تک صادق اور مخلص ہیں۔

میں اس یوم اسلامی جمہوریہ پر اپنی قوم کو مبارکباد بھی دیتا ہوں اور اس کے ساتھ ساری قوم سے اور اس کے ہر عنصر اور گروہ سے یہ اپیل بھی کرتا ہوں کہ وہ تمام چھوٹے چھوٹے مفادات، تعصبات اور اختلافات کو نظر انداز کر کے اپنی توجہات اس ملک میں ایک مثالی اسلامی نظام قائم کرنے پر مرکوز کر دے۔ ہم سب کی دنیا اور آخرت کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور کردار کو درست کریں، اپنے فرض کو پہچانیں اور نیک نیتی کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کریں جس کو ہم اپنے ایمان اور ضمیر کے مطابق حق جانتے ہوں، ہمارے حکام کو، ہماری سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کو، ہمارے علماء، ہمارے تاجروں اور صنعت کاروں کو، ہمارے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو، ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں اور عوام کو اور ہمارے مردوں اور عورتوں سب کو یہ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ ان کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور پاکستان کا مستقبل اہل پاکستان کی سیرت وکردار سے وابستہ ہے۔ اگر ہم خدا ترسی، دیانت، انصاف، فرض شناسی، منظم محنت اور جفاکشی اور اسلام کے اصولوں کی مخلصانہ پیروی اختیار کریں تو ہماری یہ مملکت تھوڑی ہی مدت میں دنیا کی امامت اور رہنمائی کے مقام پر پہنچ سکتی ہے لیکن اس کے برعکس صفات اختیار کر کے ہم ذلت اور کمزوری کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں دیکھ سکتے، لہذا دستور کے نفاذ کی مسرت میں ہم اسی وقت حق بجانب ہوں گے جبکہ آج کے دن ہماری قوم کا ہر فرد یہ عزم کر لے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عمارت پاکیزہ اور مضبوط سیرت کی چٹان پر تعمیر کرے گا۔"

"الاعتصام" کا

حجیت حدیث نمبر

۱۷- فروری سنہ ۱۹۵۶ء کو شائع ہو گیا ہے

حجیت حدیث نمبر کے مضامین میں اُن تمام اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ جو منکرین حدیث کی طرف سے حدیث، ائمہ حدیث، تدوین حدیث اور حجیت حدیث پر کئے جاتے ہیں۔

حجیت حدیث نمبر پاک و ہند کے مشہور اہل علم کے مستند مضامین کا دل آویز مرقع ہے۔

حجیت حدیث نمبر معلومات، استدلال اور انداز کے اعتبار سے نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

حجیت حدیث نمبر تحقیق و استناد کے ساتھ ساتھ اسلوب و زبان کی تمام دلچسپیوں کا جامع ہے۔

حجیت حدیث نمبر میں پاکستان و ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے اہل علم و اصحاب قلم حضرات نے بھی حصہ لیا ہے

حجیت حدیث نمبر کے مضامین اس نوعیت کے حامل ہیں کہ اس کے مطالعہ سے مخالفین و موافقین میں سے کوئی بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔

حجیت حدیث کی حیثیت اپنے موضوع میں ایک مستقل علمی و فنی دستاویز ہے۔

حجیت حدیث نمبر الاعتصام کے موجودہ سائز ۲۰×۳۰/۴ کے سو صفحات کا ضخیم مجموعہ ہے۔

سرورق خوبصورت و مزین

چند لکھنے والے:- مولانا سید داؤد غزنوی- مولانا محمد حنیف ندوی- ڈاکٹر عبدالحمید ایم اے پی ایچ ڈی پیرس یونیورسٹی-
علامہ محمد اسد جرمن- مولانا محمد اسمٰعیل- مولانا رئیس احمد جعفری- پروفیسر عبدالقیوم ایم اے-
مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب- مولانا محی الدین احمد قصوری- مولانا محمد ادریس کاندھلوی-
پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایم اے- اور دوسرے-

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

منیجر الاعتصام شیش محل روڈ لاہور

ہندوستانی حضرات اس پتہ پر اپنی رقوم بھیجکر دفتر الاعتصام کو مطلع فرمائیں۔
منیجر "اہل حدیث" باڑہ ہندو راؤ- صدر بازار- دہلی۔

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ نمبر ۲

ماہنامہ

فاران

مئی ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جب کسی شخص کے دل میں کسی فرد یا جماعت کی دشمنی گھر کر جاتی ہے تو اُس کی ہر بات اور ہر حرکت پر عیب بینی اور عیب جوئی لگا پڑتی ہے اور اُس کے ہر بناؤ میں بگاڑ کا اور اُس کی ہر خوبی میں بُرائی کا پہلو نظر آتا ہے۔ اُس فرد اور جماعت کے محاسن کے روشن و تابناک ورق شخص معاند کی نظر میں مثالب کے سیاہ نوشتے بن جاتے ہیں۔ معمولی معمولی لغزشوں کو نمک مرچ لگا کر انتہائی مبالغہ کے ساتھ اُبھارا جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی کمزوریوں پر خوب حاشیہ آرائی کی جاتی ہے مگر اچھائیاں اور خوبیاں جان بُوجھ کر چھپائی جاتی ہیں اور اُن کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو اُس میں طنز و بدگمانی کا پہلو غالب رہتا ہے۔

اس ذہنیت کے معاندین کے سامنے دُوسری طرف سے جتنی زیادہ دلیلیں پیش کی جاتی ہیں اور افہام و تفہیم کے ذریعہ غلط فہمیاں دُور کرنے اور معاملہ کو سُلجھانے کی جس قدر کوشش کی جاتی ہے اسی قدر فریق معاند کے عداوت و عناد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے! عداوت و عناد اور بغض و عصبیت کی یہ وہ حالت ہے جب عدل و توازن، علم و بصیرت اور اخلاق و اخوت کی بساطیں تہ کر کے رکھ دی جاتی ہیں اور اپنے مخالف فرد یا جماعت کو نیچا دکھانے، بدنام کرنے اور لوگوں کی نگاہ میں ذلیل اور مطعون ٹھہرانے کے لئے ہر طرح کا حیلہ اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے!

جماعتِ اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ کے ساتھ بعض مدعیانِ علم و تقویٰ یہی سلوک کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جن کے قامت پر اس شعر ؎

دو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز تا داد زہر کہتر و بہتر بستانی

کی قبا راست آتی ہے اور جن کا زندگی بھر پیشہ ہی یہ رہا ہے کہ اپنی خوش الحانی، ایکٹنگ اور لطیفہ گوئی کے ذریعہ عوام کو اکٹھا کرو اور بڑے بڑے مجمعوں، جلسوں اور اجتماعات میں اپنے مخالفوں کو — جنہیں بعض اغراض و مصالح کی بنا پر

خواہ مخواہ "مخالف" فرض کر لیا گیا ہے ـــــ بے نقط گالیاں سناؤ۔ بازاری قسم کی پھبتیاں چست کرو اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑو! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زندگی بھر کوئی تعمیری کام نہیں کیا۔ اور ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق!

ہی جن کا رول (Role) رہا ہے۔ یہ لوگ برسوں سے جیسی تقریریں کرتے رہے ہیں، اگر وہ کسی آلہ کے ذریعہ جمع کرکے دُہرادی جائیں تو شریف لوگ پناہ مانگنے لگیں اور سنجیدگی و متانت چیخ اٹھیں کہ آدمی کیا اتنا پست بھی ہو سکتا ہے؟

مانا کہ افراد اور جماعتوں کے درمیان مخالفتیں اور چشمکیں بھی ہوا کرتی ہیں مگر مخالفت کی بھی کچھ حدود ہیں۔ مثلاً خدا کا خوف، بندوں کی شرم و لحاظ، آدمیت کا پاس اور عام اخلاق کا تقاضا! مگر جب عداوت و عناد ان آخری حدود کو بھی پھلانگ جائیں تو پھر سوائے اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ خامہ انگشت بدنداں اور ناطقہ سر بگریباں ہو کر رہ جائے! اس معاملہ کی تلخی اور بدمزگی الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہی نہیں کی جا سکتی!

جو لوگ قرآن کریم کی مقدس آیتیں تلاوت کرکے اور نبی آخر (ارواحنا لهم الفداء) پر درود و سلام بھیج بھیج کر بھرے مجمعوں میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر بے سروپا تہمتیں تراشیں اور بے بنیاد الزام لگائیں۔ اُن کو ہم کیا کہیں مگر ہاں، اپنے اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ بارِ الٰہا! اُمتِ مسلمہ میں ایسی مثالیں پھر کبھی پیدا نہ ہوں!

ہمیں اس گروہ سے کچھ زیادہ شکایت نہیں ہے کہ ان حضرات کی یہ حرکتیں خلافِ توقع نہیں ہیں اس لئے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں مگر انسان کی جبلّت نہیں بدل سکتی۔ جو لوگ ساری زندگی اسی قسم کے کھیل کھیلتے رہے ہوں۔ وہ اپنی برسوں کی رچی ہوئی اس عادت کو چھوڑ کیسے سکتے ہیں ـــــ ہمیں سب سے زیادہ شکوہ اُن بزرگوں سے ہے۔ جن کی زندگیاں علم و تقویٰ کے سایہ میں بسر ہوئی ہیں۔ جو سالہا سال سے نفس کے مجاہدہ اور تزکیہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ جو مفسر بھی ہیں۔ محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں اور ساتھ ہی اہلِ نسبت اور صاحبِ دلق و سجادہ بھی! اتنے اونچے لوگ جب غرض پرستوں کا آلہ کار بن کر اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مقابلہ میں خواہ مخواہ فریقِ مخالف بن کر میدان میں آجائیں تو پھر کوئی دردمندِ دل اگر یہ کہہ کر چیخ اُٹھے ؎

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری!

تو اُس کے اس اضطراب کو معاف کر دیا جائے!

مسلمانوں کو ذکرِ خدا و رسول کے نام پر اکٹھا کرکے مودودی صاحب کو ملاجیاں سُنانا۔ اُن کے دین و ایمان کو مشتبہ ثابت کرنا، اُن کو گمراہ اور گمراہی کا پھیلانے والا بتانا۔ اُن کی کتابوں کی مربوط اور مسلسل عبارت سے ادھ کٹے جملے پڑھ کر سُنا دینا اور اتنا سب کچھ کرکے یہ ارشاد فرمانا۔

"یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ میرا اللہ[1] مجھ سے کہلوا رہا ہے"!

---

[1] یا الٰہ العالمین! تیری صفتِ حلم کو بے شمار سجدے کہ تُو اپنے بندوں کی ایسی جسارتوں پر بھی ڈھیل دیتا ہے۔ نحمدہ و نثنی علیک الخیر۔!

اگر مولانا مودودی کے زبان و قلم سے اس سے ملتا جلتا کوئی جملہ نکل جاتا تو یہ صوفیانِ کرام اور مفتیانِ عظام آسمان سر پر اُٹھا لیتے کہ اس گردن زدنی مودودی کو پکڑو۔ یہ تو اس کا مدعی ہے کہ اُس پر وحی آتی ہے۔ یہ نبوت کے دعوے کیلئے زمین تیار کی جارہی ہے...... اور ...... وھلم جراً! مگر یہ صاحبانِ ارشاد و ہدایت جو چاہے دعویٰ کر دیں اُن پر کوئی حرف گیری نہیں کرتا۔

کسے خبر تھی کہ بیسویں صدی میں علم و تقویٰ (؟) اور تقشف و تصوف یہ کارنامہ بھی انجام دیں گے۔ بہت بڑی ٹریجڈی! مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ ٹریجڈی واقع ہو کر رہی۔ نہ جانے حق و صداقت اور دین و اخلاق کو اس دور میں ابھی اور کیا کیا دیکھنا باقی ہے!

طوفانِ مخالفت

مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف کتنے محاذ کھل گئے ہیں، ہر امام کی۔ فقیہہ کی۔ محدث اور مفتی کی غلطی اور بھول چوک سے صرفِ نظر ممکن ہے اور ہر شخص کے قول کی تاویل ہو سکتی ہے۔ مگر شاید پوری تاریخ میں مودودی ہی ایک ایسا شخص ہے جس کے نہ تو کسی قول کی تاویل ہو سکتی ہے اور نہ اُس کی بھول چوک قابلِ درگزر ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ مودودی صاحب اپنے قول کی خود وضاحت اور صراحت کر دیں تو اُسے بھی قبول نہیں کیا جاتا۔ مولانا مودودی کے قلم نے "حدیث" کی کتنی حمایت کی ہے۔ حضور کی سُنتِ مطہرہ کو وہ دین میں حجت سمجھتے ہیں اور اتباعِ رسولؐ کا منصوص ہونا اُن کے نزدیک ایمان کا لازمی تقاضا بلکہ عینِ ایمان ہے مگر صرف اس بنا پر کہ وہ قرآن مجید کی طرح احادیث کے کسی مجموعہ کو "لاریب فیہ" نہیں سمجھتے کہ کسی حدیث پر گفتگو ہی نہ کی جا سکے۔ اُن کو "منکرینِ حدیث" کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کیا ذمہ دار اہلِ علم کا یہی اندازِ فکر ہوتا ہے؟

جماعتِ اسلامی پر "خارجیت" کی پھبتی بھی ان آنکھوں نے کاغذ پر مشاہدہ کی ہے۔ "قیاس مع الفارق" کی اصطلاح کتابوں میں پڑھی تھی مگر اُس کو واقعہ کی صورت میں دورِ حاضر کے ان عجیب و غریب تاریخ دانوں نے دکھا بھی دیا کتنی سنگین تہمت، کس قدر غلط نسبت! مگر یہ ظلم و زیادتی کر گزرنے کے بعد یہ حضرات اُلٹا اپنے ہی کو مظلوم سمجھتے ہیں!

یہ ظلم اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتا۔ کچھ لوگوں نے "مودودیت" کا جوڑ "قادیانیت" کے ساتھ ملانے کی سعی کی ہے۔ اس موضوع پر کتابچے بھی لکھے ہیں اور یہ وہ کم سواد لوگ ہیں جن سے اُردو کی دو سطریں بھی ٹھیک طرح لکھی نہیں آتیں۔ "قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ" (ان کے دل کا بغض اُن کے مُنہ سے نکلا پڑتا ہے) میں اسی قسم کے لوگوں کی ذہنیت کو بے نقاب کیا گیا ہے!

عیسائیوں، ہندوؤں، پارسیوں اور سکھوں نے جو رفاہِ عامہ کے کام کئے ہیں تو لوگ اُن تک کو سراہتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر عناد و تعصب کی انتہا ہے کہ جماعتِ اسلامی نے پاکستان میں مریضوں کے لئے جو شفاخانے قائم کئے ہیں۔ جس سے پچھلے چند برسوں میں لاکھوں مریض فائدہ اُٹھا چکے ہیں، اُن پر بھی معاندین طنز کرنے سے نہیں چُوکے اور زبان و قلم نے کوشش کی ہے کہ لوگ جماعتِ اسلامی کے اس کام (خدمتِ خلق) کو شبہ اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔

کوئی کہتا ہے "ابوالاعلیٰ" کُنیتؔ[1] کیوں رکھی گئی۔ اس کو ترک کر دینا چاہیئے۔ کسی کو "جماعتِ اسلامی" کے نام ہی پر اعتراض ہے۔

---

[1] جس طرح مولانا آزاد نے جن کا نام "محی الدین" ہے، اپنی کنیت "ابوالکلام" خود رکھی بر عکس اس طرح مودودی صاحب نے اپنی کنیت نہیں رکھی، اُن کے والد نے اپنے بیٹوں کے نام۔ ابو محمد۔ ابو الخیر۔ اور ابوالاعلیٰ رکھے تھے، یہ مودودی صاحب کا نام ہے اُن کی خود تراشیدہ کنیت نہیں ہے۔

بعض لوگ جماعتِ اسلامی کو "مودودی جماعت" سے اور اُن کے دینی عقائد کو "مودودی اسلام" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب سے چند سال پہلے مفسدین نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ مولانا مودودی اپنے مجدّد ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں۔ مگر چودہ پندرہ سال ہونے کو آئے مودودی صاحب نے مجدد تو کیا اپنے فقیہہ، مُفتی اور عالمِ دین ہونے تک کا دعویٰ نہیں کیا۔

مخالفتوں کا ایک طوفان ہے جو یمین و یسار سے اور فوق و تحت سے اُٹھ رہا ہے۔ جماعتِ اسلامی سچ مچ بتیس دانتوں میں زبان بنی ہوئی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جماعتِ اسلامی کے مخالفین میں سے کسی کے پاس اخلاص ہے ہی نہیں اور وہ اس معنی میں گمراہ اور دشمنِ دین ہیں، جن معنی میں جماعتِ اسلامی کے مخالفین ارکانِ جماعت اور مولانا مودودی کو گمراہ اور دشمنِ دین سمجھتے ہیں۔ ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرنا ہمارا کبھی شیوہ نہیں رہا۔ مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کی اندھا دُھند مخالفت کرکے اُس کے معاندین اقامتِ دین کی تحریک کو بہت بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اُن کی یہ زیادتیاں اور رخنہ اندازیاں خیر و فلاح کی راہ میں دیواریں کھڑی کر رہی ہیں!

ہم نے بہت سی مذہبی جماعتوں اور اداروں کو دُور سے اور قریب سے دیکھا ہے، اُن کا لٹریچر بھی پڑھا ہے۔ اُن کے اکابر و اصاغر کی زندگیوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ کوئی شک نہیں اُن میں بڑے مخلص اور نیک لوگ بھی ہیں اور تمام دینی جماعتیں دین کی سربلندی ہی چاہتی ہیں۔ اس اعتراف کے بعد اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی کے پاس اقامتِ دین کا جتنا مکمل، ہمہ جہتی اور عالمگیر پروگرام ہے وہ اپنی شانِ تکمیل میں منفرد ہے۔ جماعتِ اسلامی کی اسی صفت کی مقبولیت اور دل کشی نے بعض افراد اور گروہوں کی نگاہ میں اُسے محسود اور مبغوض بنا دیا ہے اور یہ نہ مولانا مودودی کے بس کی بات ہے نہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ لوگوں کی مخالفت اور طنز و تشنیع سے بچنے کے لئے "اقامتِ دین" کے مکمل پروگرام میں کانٹ چھانٹ کرکے دین کے چند ارکان و معروف پر قانع ہو کر بیٹھ جائیں!

جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے اس عزم کے ساتھ اُٹھے ہیں کہ حالات چاہے کتنے ہی نامساعد اور ناسازگار کیوں نہ ہوں۔ وہ آخری دم تک اللہ کے دین کو پورے کا پورا قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ اس راہ کے مصائب کا بھی انہیں ایک حد تک اندازہ ہے۔ اسلام کی پچھلی تاریخ اُن کے سامنے ہے کہ راہِ حق کے مسافروں کو غیروں کے تیروں اور اپنوں کی برچھیوں کے گھاؤ بیک وقت کھانے پڑے ہیں۔ مگر پھر بھی دمِ واپسیں زبان سے "فزت برب الکعبہ" ہی کا زمزمہ بلند ہوا ہے!

مولانا مودودی اُن احادیث کو جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کی تفصیل آئی ہے، صحیح مانتے ہوئے اپنے مضمون میں دُہرا دیں تو منکرینِ حدیث کی طرف سے اُن پر "ماڈرن ملّا" کی پھبتی چُست کی جاتی ہے۔ اگر وہ قرآن کی طرح احادیث کے کسی مجموعہ کو بھی "لاریب فیہ" نہ مانیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ "منکرینِ حدیث" کے بھائی بند ہیں۔ کسی فقیہہ کے قیاس و رائے پر نقد و جرح کر دیں یا ائمہ فقہاء کی آراء میں کسی ایک کی رائے کو مرجح قرار دے دیں تو اُن پر غیر مقلد ہونے کی طنز اور اپنے کو مجتہد سمجھنے کی طعن فرمائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں جو مشرکانہ رسوم رائج ہیں اور جن بدعات کا زور ہے اُن پر حرف گیری کریں تو ایک گروہ پکار اُٹھتا ہے کہ "مودودی وہابیت کی تبلیغ کرتا ہے"۔ "قتلِ مرتد" کی حمایت اور تصویب میں رسالہ لکھ دیں تو اُن کو قدامت پرست اور تنگ نظر بتایا جاتا ہے۔ بینک کے سودی کاروبار کو ناجائز قرار دیں تو مغرب زدہ اربابِ فکر چیخ اُٹھتے ہیں کہ اس طرح مسلمانوں پر معیشت کی راہیں بند کی جا رہی ہیں۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں مودودی صاحب

یہ ثابت کردیں کہ شخصی ملکیت کسی اکراہ کے بغیر جائز ہے اور تمام انفرادی اور شخصی کاروبار اور صنعت و تجارت کو آنکھ بند کر کے نیشنلائز (Nationalise) کر دینا اسلامی اصولِ معاشیات کے عین مطابق نہیں ہے۔ تو اس پر انھیں زمینداری، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا حامی اور نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب یہ کہہ دیں کہ حکومت اور سلطنت "اقامتِ دین" کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے اور زمامِ حکومت کے اصل حقدار اہلِ تقویٰ اور صالحین ہیں، تو اس پر ایک جماعت کی طرف سے نعرہ بلند ہوتا ہے کہ یہ تو دنیا داری کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اور سیاست کے "شجرِ ممنوعہ" کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ تصوف کے کسی عجمی تخیل پر تنقید کی جاتی ہے تو خانقاہوں سے شور بلند ہوتا ہے کہ یہ مودودی تزکیۂ نفس ہی کا سرے سے منکر ہے اور اولیاء اللہ سے کد رکھتا ہے!

عناد و اختلاف، طعن و طنز بلکہ سب و شتم کے ان فوج در فوج حملوں کے درمیان یہ تنہا شخص (مودودی) ہے۔ جو گھرا ہوا ہے۔ کتنی بہت سی کمانیں ہیں جن کے تیروں کا رخ اس ایک کلیجہ کی طرف ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس وقت روئے زمین پر حق و صداقت کی دعوت دینے والوں اور دین کے خدمت گزاروں میں مودودی سے زیادہ مظلوم اور کوئی نہیں ہے! اور کچھ ظالم اور سنگدل ایسے بھی ہیں جو محض جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے جوش میں مصر کے داعیانِ حق، علمبردارانِ صداقت اور مجاہد سرفروشوں (اخوان المسلمون) پر بھی طنز کرنے سے نہیں چوکے۔ قیامت کے دن عبد القادر عودہ اور یوسف طلعت کا خونِ ناحق اور ہضیبی، سید قطب اور ان کے ساتھ ہزاروں مظلوم مجاہدوں کے جسموں کے زخم ان سنگدل طنازوں سے اس بیداد کی داد چاہیں گے۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ضبط و احتیاط کے باوجود ہمارے لہجہ میں تلخی پیدا ہوگئی۔ مگر جب ایک خادمِ دین کو دین کے ستون گرانے والا کہا جائے، اس کے ضال و مضل ہونے پر فتوے صادر کیے جائیں۔ اس کے عقائد کا خارجیت اور قادیانیت سے پیوند جوڑا جائے۔ "محمدی اسلام" اور "مودودی اسلام" کی تفریق کر کے مسلمانوں کو اشتعال دلایا جائے۔ جماعتِ اسلامی کے ارکان کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگوں کو روکا جائے۔ "مودودیت" کو دین کا سب سے بڑا فتنہ کہا جائے ـــ ان دل شکن باتوں کو پڑھ کر اور سن کر اگر ہمارے کلام میں گرمی پیدا ہو جائے تو ہم معذور ہیں! ان لوگوں کو کیا کہیئے جو مظلوم کی چیخیں سن کر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں مگر ظالم کے ظلم کو نہیں دیکھتے ـــ فریاد!

ایں چہ بوالعجبی است! اگر کسی کو چودھویں صدی کے علم و تقویٰ کے کارناموں (؟) کو دیکھنا ہو تو وہ دارالعلوم دیوبند کے بعض مشاہیر و اکابر کی ان تحریروں کو ایک نظر دیکھ لے۔ جن میں مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف فراست و حکمت اور علم و تفقہ کو صرف فرمایا گیا ہے!

جماعتِ اسلامی کے دستور کا بنیادی عقیدہ یہ ہے:۔

> "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بتائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیارِ کامل کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔"

دنیا کے کسی خطہ اور ملک بلکہ شہر اور قریہ کے کسی بھی عالمِ دین اور فقیہ کے پاس اس عبارت کو لے کر جاؤ اور اس کی رائے دریافت کرو۔ اگر اس عبارت کی تصویب و تائید کے علاوہ کوئی اور بات کہہ دے تو ہم مجرم اور مستحقِ عقوبت! چنانچہ یہی ہوا کہ ہندوستان کے

ان چند علماء کے علاوہ جو جماعتِ اسلامی کی مخالفت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں، خود ہندوستان اور پاکستان کے متعدد صاحبانِ علم وتفقہ اور فلسطین، مصر اور نجد کے علماء نے جماعتِ اسلامی کے اس بنیادی عقیدہ کو درست بتایا ہے اور انہوں نے اس عقیدے کی عبارت، اس کی معنویت اور اس کے مضمرات و مکنونات میں ذرا سی بھی کھٹک محسوس نہیں کی۔ اور ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک اوسط درجہ کی فہم کے کسی دین دار مسلمان کے سامنے اس عبارت کو پیش کر کے اس کی رائے معلوم کرو۔ ہم پوری ذمہ داری اور وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ بعض ضرورت سے زیادہ حساس اور ذہین علماء نے اس تحریر سے انبیاء کرام کی عصمت اور صحابہ کرام کی معدلت وثقاہت پر حرف گیری کا جو عجیب وغریب مفہوم پیدا کیا ہے۔ اس کا وہم بھی اس دین دار مسلمان کے ذہن میں نہیں گزر سکتا۔

اور اب تو یہ گنہگار آنکھیں یہ تماشا بھی دیکھ رہی ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے اس بنیادی عقیدہ کی پہلے تو تصویب کی جاتی ہے اور پھر کسی دباؤ میں آکر اور گردوپیش سے متاثر ہو کر اپنی کہی ہوئی بات پر عجیب وغریب حاشیے چڑھائے جاتے ہیں۔ علم وتقوی جب ایسا کمزور موقف اختیار کرلیں تو ع

پھر کسے رہنما کرے کوئی!

حیرت ہی کا نہیں انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ دیوبند کا وہ مرکزِ علوم و معارف جو خدمتِ دین اور اشاعتِ حق کیلئے قائم ہوا تھا آج اس میں "مودودیت" کے نام سے ایک شعبہ قائم ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکائے اور مولانا مودودی کی کتابوں سے ردبینوں کے ذریعہ بھول چوک اور لغزشوں کے کچھ جراثیم کا پتہ لگائے اور پھر انھیں عوام کے سامنے "سی مرغ" بنا کر پیش کرے!

انبیاء کرام کے سوا معصوم کون ہے، غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ کیا دیوبند کے موجودہ اکابر اور اُن کے اسلاف سے غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں یا اُن کا کہا ہوا اور قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عینِ حق ہے اور اُس میں ذرا سی بھی کور کسر نہیں رہ گئی۔ اگر یہ تمام حضرات بھول چوک اور غلطیوں کے باوجود (معاذ اللہ) "گمراہ" نہیں ٹھہرائے جاسکتے، اُن کا احترام کیا جاتا ہے بلکہ اُن کے اقوال سے سند لی جاتی ہے تو مودودی صاحب کے خلاف یہ عناد و عصبیت کیوں، کہ اُن کی بھول چوک اور غلطی لازمی طور پر "گمراہی" کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی!

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے "وحدۃ الوجود" کے نظریہ کو غلط ٹھہرا کر صحیفۂ تصوف کے نہ جانے کتنے بہت سے اوراق پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اُس پر بھی وہ لائقِ احترام (اور یقیناً حضرت مجدد قدس سرہٗ قابلِ احترام ہی ہیں) اور اُن کے قول کی اس حد تک تاویل کی گئی کہ لفظوں کا ہیر پھیر ہے ورنہ "توحیدِ شہودی" اور "توحیدِ وجودی" میں کوئی فرق نہیں ہے! مگر مودودی صاحب تصوف کے کسی جزو اور فرع پر تنقید کردیں تو اُن سے اولیاء اللہ کی دشمنی منسوب کی جائے۔ یہ کیا اندازِ فکر ہے۔ یہ کیا انصاف ہے۔ یہ کہاں کی دانش خیالی اور حکمت آرائی ہے!

اربابِ بدعت نے اکابرِ دیوبند کی تحریروں کیساتھ جو سلوک کیا تھا۔ ٹھیک وہی سلوک دیوبند کے بعض علماء مولانا مودودی کی تحریروں کیساتھ کر رہے ہیں۔ اور بڑا ظلم بھی آپ نے کہیں دیکھا اور سُنا ہے کہ کسی بات کا قایل اور کسی عبارت کا محرر اپنے قول اور تحریر کی خود وضاحت کرے میرا عقیدہ اور مفہوم یہ ہے اور دیوبند کے بعض فقیہانِ کرام اس کی اس صراحت کے باوجود اس پر اصرار کریں کہ اے شخص! تیری وضاحت وصراحت سے کیا ہوتا ہے ہم تو اس بات کا وہی مفہوم نکالیں گے جو ہم متعین کر چکے ہیں! ہائے! علم و تفقہ اور منصب افتاء کی یہ پستی بھی ان آنکھوں نے دیکھ لی!

وحی اُن پر بھی نہیں آتی جنہیں اپنے کشف و وجدان اور شرحِ صدر پر اعتماد ہے۔ ہم بھی اپنے وجدانِ مومن اور ضمیرِ حق پسند کی بنا پر اللہ بارگاہ میں اپنا عجز و نیاز پیش کرتے ہوئے ان مفتیانِ کرام اور صاحبانِ علم و تقوی کی خدمت میں بصد ادب و احترام عرض پرداز ہیں کہ آپ نے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی مخالفت کو جو توشۂ آخرت سمجھ رکھا ہے تو یہ کوئی اچھا توشہ اور مبارک زادِ راہ نہیں ہے۔

سلکم تندمون!

جماعتِ اسلامی کے دستور کی جو عبارت اوپر پیش کی گئی ہے کہ "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے اور کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے" اس سے دیوبند کے سب سے بڑے مرشد نے یہ باریکی ریسرچ کرکے نکالی ہے کہ اس میں صحابہ کرام کی (معاذ اللہ) منقصت کا پہلو نکلتا ہے۔ اپنے ذہن و فکر کے اس پیدا کئے ہوئے وہم کی تائید میں پوری ایک کتاب صاحب موصوف نے تصنیف کرڈالی ہے کہ پڑھیئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نے مظلومیت کی مدافعت اور حق کی حمایت کیلئے خود دیوبند میں ایک فاضل[1] اہلِ قلم کو کھڑا کردیا ہے جس کا یہ جملہ شاید دین و دانش کی زبان میں ضرب المثل بن جائے:- "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زرِ خالص تھے، خود کسوٹی نہ تھے۔"

صحابہ کرام بلاشبہ حق پرست، حق شعار، حق گو اور داعیِ حق تھے مگر "معیارِ حق" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی تھی۔ اور یہی وہ حدِ فاصل ہے جو نبوت اور صحابیت میں امتیاز اور فرقِ مراتب قائم کرتی ہے۔ اگر صحابہ کرام کو "معیارِ حق" نہ ماننا اُن کی منقصت کے مرادف ہے تو پھر تابعین، ائمہ فقہا اور محدثین سے لے کر اس دور تک کی اکثریت کو اس گناہ کا مرتکب ماننا پڑے گا!

گزارش! آخر میں ہم عوام سے خطاب کرنا چاہتے ہیں، اُن سے ہماری یہ دردمندانہ گزارش ہے کہ وہ مفتیانِ کرام کے فتاویٰ اور علماء کی تنقیدیں پڑھ کر کوئی رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں۔ مولانا مودودی کی کتابوں کو وہ خود پڑھیں اور ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر پڑھیں:-

(۱) کیا مودودی صاحب کسی ایسے عقیدے کی تعلیم دیتے ہیں جو دین و ایمان کے بنیادی تقاضوں کے خلاف ہے اور جس کے ماننے سے ایک مسلمان کے دین و ایمان پر حرف آتا ہے۔ (۲) کیا مولانا مودودی نے کسی ایسی چیز کو حلال کہا ہے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اور اُس چیز کو حرام ٹھہرایا ہے جو کتاب و سنت کی رُو سے حلال ہے۔ اگر ان دو باتوں میں سے ایک بات بھی ثابت ہو جائے تو مودودی صاحب کی کتابوں کو وہ بے دریغ چولھے میں جھونک دیں اور اگر ایسی کوئی بات تو کیا اس کا شائبہ تک نہ ملے تو پھر اس پر غور کریں کہ مولانا مودودی صاحب سے علماء کا اختلاف اصل میں ہے یا فرع میں ہے اور کیا ایسے فروعی اختلافات ہر دور کے علماء اور فقہا میں نہیں پائے جاتے؟

پھر وہ ان لوگوں کی زندگیوں کا قریب سے مطالعہ کریں جو مولانا مودودی کے لٹریچر سے متاثر ہیں کہ وہ پہلے کیا تھے اور اب ان کی زندگیوں کا کیا رنگ ہے؟ اور یہ ہزاروں نوجوان جو الحاد، اشتراکیت، مغرب زدگی اور تشکیک و تذبذب کی آغوش سے نکل کر یقین و اخلاق اور ایمان و پاکیزگی کی طرف آئے ہیں تو کیا ان کی زندگیوں کا یہ انقلاب دین و ملت کے لئے وجہ فساد و ضرر ہے یا باعثِ رحمت ہے!

پھر وہ یہ بھی دیکھیں کہ اس دور کی ملحدانہ تحریکوں نے جتنے گمراہ کن موضوعات (مثلاً بے پردگی، ضبطِ ولادت، سود...... وغیرہ) چھیڑ رکھے ہیں۔ اُن کے جواب میں مولانا مودودی کے قلم نے کتنی عظیم خدمت انجام دی ہے! یہ مدعیانِ علم و تقویٰ جو مولانا مودودی کی گمراہی پر بے سر و پا دلیلیں لاتے ہیں، اُن کی تحریروں کا مودودی صاحب کی تحریروں سے مقابلہ کرکے دیکھیں کہ فکر و حکمت، استدلال، سلجھاؤ، توازن، پیرایہ بیان، اسلوبِ اظہار اور وقار و دلنشینی میں کس کا پلہ کتنا بھاری ہے؟

اس تحقیق و جستجو، توازن و تقابل اور مطالعہ و مشاہدہ کے بعد حقیقت چھپی نہ رہے گی۔ واقعہ کی پوری اصلیت کھل کر سامنے آجائیگی۔ کہ بعض عباؤں کی سلوٹیں اور عماموں کے پیچ جب کھلتے ہیں تو ان میں سے کیا نکلتا ہے؟ خلاصہ گزارش یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ صرف مدعی کا بیان سُن کر نہ کیجئے، پوری مسل پڑھیئے کہ دعویٰ کیا ہے اور جواب دعویٰ کیا پیش کیا گیا ہے۔ فریق ثانی کیا کہتا ہے؟ گواہوں کا کیا بیان ہے؟ قانون کی روح کا اور نظائر کا کیا تقاضا ہے؟ ان مراحل سے گزرنے کے بعد آپ کو اختیار ہے کہ جو فیصلہ چاہیں صادر فرمائیں!

به جرمِ عشقِ توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست!

ماہر القادری ۲۱ اپریل ۵۶

---

[1] مولانا عامر عثمانی دیوبند کے فاضل ہیں، اونچے درجہ کے انشاء پرداز، سنجیدہ مفکر اور اچھے اسلامی شاعر ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے برادرزادہ اور حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن مدظلہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ عثمانی خانوادے کے اس چشم و چراغ کی ادارت میں دیوبند سے "تجلی" نام کا ایک بلند پایہ ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کے ماہ اپریل کے شمارہ میں مولانا حسین احمد مدنی کی تازہ کتاب "مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت" پر فاضل مدیر نے فیصلہ کن تنقید فرمائی ہے۔ بحث کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو بیان میں آنے سے رہ گیا ہو۔ ماہنامہ تجلی (دیوبند) کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے۔ پاکستان میں

سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے

اقبال کی فارسی شاعری

(۲)

تسخیرِ کائنات اور عروجِ آدمِ خاکی کے مضامین بھی رومی اور اقبال دونوں کے ہاں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے خودی کی تربیت کے سلسلہ میں جو تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی کا قرار دیا ہے۔ وہ انسان کی معراجِ کمال ہے۔ اسی مقام پر پہنچکر انسان کامل ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اس کی آمد کے لئے بے قرار ہیں۔ اس لئے کہ اسی کی آمد پر کلفتیں دور ہوں گی اور عدل و انصاف اور حقیقی خوش حالی کا دور دورہ ہوگا ؎

نائبِ حق ہمچو جانِ آدم است — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود ! — در جہاں قائم بامر اللہ بود

ایسا انسان جب اس بزمِ ایجاد میں قدم رکھتا ہے تو بساطِ کہنہ کو لپیٹ کر رکھ دیتا ہے اور اپنی فطرت کی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ایک دوسرا ہی عالم وجود میں لے آتا ہے۔ بلکہ ؎

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کل — روید از کشتِ خیالِ او چو گل

وہ خام کاروں کو پختہ کرتا ہے۔ ہوا و ہوس کے اصنام سے دلوں کو پاک کرتا ہے۔ اس کی آواز پر دل رقص کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی آواز حق کی آواز ہوتی ہے۔ اِنّ صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین اس کا شعار ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز میں اس کی جودت طرازیاں بخشِ فطرت کے تقاضوں سے شباب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ؎

شیب را آموزد آہنگِ شباب — می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

مگر انسان اس مقام پر آسانی سے نہیں پہنچتا ؎

طبعِ مضموں بندِ فطرت خوں شود — تا دو بیتِ ذاتِ او موزوں شود

غرضکہ اقبال نے عروجِ آدمِ خاکی کا جو تصور پیش کیا ہے اور ایسے کامل انسان کی ذات سے جو توقعات وابستہ کی ہیں۔ وہ کوئی شاعرانہ تخیل یا سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اس لئے فرطِ شوق میں ایسے یکتائے روزگار انسان کی آمد کا اس طرح خیر مقدم کرتے ہیں ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر چوں بہاراں بر ریاضِ ما گزر

مشو نومید ازیں مشتِ غبارے پریشاں جلوۂ ناپائدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را تمامش می کند در روزگارے

مثنوی "رموزِ بے خودی" میں ایک باب ہے: "معنی ایں کہ توسیعِ حیاتِ ملیہ از تسخیرِ قوائے نظامِ عالم است" ؎

ماسوی از بہرِ تسخیر است و بس سینۂ او عرصۂ تیر است و بس
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر

مولانا رومؒ کے اشعار جو اقبال نے اسرارِ خودی کے شروع میں نقل کئے ہیں ایسے ہی انسان کی تلاش کا پتہ دیتے ہیں ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اور اسی لئے مولانا اور اقبال دونوں موجودہ طرز کی جمہوریت کو پسند نہیں کرتے کہ عوام کالانعام کی رائے کا اعتبار نہیں۔ عوام کی رائے سے بالعموم ایسے جاہل پست اخلاق بشرپر النفس آدمی منتخب ہوسکتے ہیں جو اپنی ثروت و شرارت کے زور سے عوام میں سکہ جمائے ہوئے ہوتے ہیں مگر عقل و فہم سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ جب ایسے لوگ کسی سوسائٹی میں اثر انداز ہو جاتے ہیں اور زمامِ اقتدار بھی انہی کے ہاتھوں میں آجاتی ہے تو پھر ان بلند نظر افراد کا زندہ رہنا بھی دشوار کر دیتے ہیں جو تقلیدِ جامد سے آزاد ہو کر تخلیق و تعمیر کے ذریعہ نیا عالم وجود میں لانا چاہتے ہیں اور ایسے نیک نفس، شریف الطبع اشخاص کو بھی قدم قدم پر مشکلات کے پہاڑوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو فساد فی الارض کو بدترین گناہ سمجھتے ہوئے اس کا استیصال کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مولانا کے ہاں جمہوریت یا جمہور کا لفظ نہ سہی مگر وہ تمام باتیں موجود ہیں جو جمہوریت کے عناصر ہیں۔ اور مولانا نے ان سے اظہارِ برأت کیا ہے۔ بخلاف اس کے اقبال نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

اگر تاجِ کئی جمہور پوشد ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست

تصوّف:-

مولانا رومؒ کے زمانہ میں جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں فساد پیدا ہوا۔ وہاں تصوف کا چشمۂ صافی بھی گدلا ہونے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ زندگی سے فرار کا میلان یہاں تک بڑھا کہ دنیا کو ترک کر دینے کی تعلیم دیتے دیتے سرے سے دنیا ہی کے وجود سے انکار کر دیا گیا۔ کسی نے بہت بڑی رعایت کی تب بھی اس کو ایک نمودِ سیمیا اور کرشمۂ وہم و خیال یا ایک خواب سے زیادہ وقعت نہ دی۔ علم و حکمت کی مذمت اور جہل و نادانی کی تعریف ہونے لگی۔ سعی و عمل کو بے سود اور بے فکری و بیکاری کو سرمایۂ زندگی کہنا شروع کر دیا۔ غرضکہ "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" کی تعلیم سے آنکھیں بند کر کے ترکِ دنیا کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ قرار دے دیا گیا۔ طریقت و شریعت ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اسلاف کا

تصوف کیا تھا اور کس مقصد کے لئے تھا۔ یہ بات کسی کو یاد نہ رہی۔ اِلّا ماشاء اللہ!

مولانا نے یہ نہیں کیا کہ اس عام روش سے بیزار ہو کر بیٹھ رہے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا۔ اور کسی کی خوشی و ناخوشی کی پروا نہ کرتے ہوئے حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھایا اور ایسے خلوص و دل سوزی کے ساتھ اصلاح کا کام کیا کہ نظریات کی دنیا میں انقلاب آ گیا اور عقائد کی فضا سے تیرہ و تار روش ہونی شروع ہو گئی۔ دنیا کی حقیقت انہیں سمجھائی کہ ؎

چیست دُنیا از خدا غافل بُدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

علم کی تعریف کی اور محمود و مذموم علم میں فرق کر کے دکھلایا ؎

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود

عقل کی تعریف کی اور اس عقل کو جو مظاہرِ عالم کے مشاہدے، عناصر کی تسخیر اور کائناتِ ارضی و سماوی کے تصرف سے انسانیت کے انفرادی و اجتماعی ارتقاء میں رہنمائی کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تعبیر کیا۔ علم و حکمت کو قرآن نے خیرِ کثیر کہا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی متاعِ گم شدہ فرمایا ہے۔ مولانا نے اس حقیقت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی مگر ساتھ ہی اس عقل و حکمت کی مذمت بھی کی جو انسان کو آزاد، مطلق العنان بنا کر حدود اللہ سے نکل بھاگنے پر آمادہ کرتی ہے۔

مال کی تعریف کی مگر یہ بھی بتلا دیا کہ کونسا مال تعریف کے قابل ہے ؎

مال را گر بہرِ دیں باشی حمول — نِعمَ مالٌ صالحٌ خواندش رسول
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است — آب اندر زیرِ کشتی پشتی است
چونکہ مال و ملک را از دل براند — زاں سلیماں خویش جز مسکیں نخواند

سعی و عمل اور کسب کی ترغیب دی ؎

کسب کن، سعی نما و جہد کن — تا بدانی سرِ علمِ مِن لَدُن
رمزِ الکاسب حبیب اللہ شنو — از توکل در عمل غافل مشو
در توکل کسب و جہد اولیٰ تر است — تا حبیبِ حق شوی ایں بہتر است

ترکِ مقاصد اور نفیِ آرزو کی بجائے آرزو کو سعی و عمل کا وسیلہ اور فلاح و بہبود کا سبب قرار دیا اس لئے کہ آرزو پر تحریکِ عمل کا انحصار اور عمل پر زندگی موقوف ہے۔

اپنے وجود کو بُرا کہنے کی سختی سے مذمت کی بلکہ وجود کو اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ بتلایا۔ اور اس کو آئندہ زندگی کے بہتر و کامیاب بنانے کے لئے وقف کر دینے کی تعلیم دی۔ خودی کے استحکام اور تسخیرِ عالم کو اس کی غایت قرار دیا۔

اقبال نے جس زمانہ میں آنکھیں کھولیں اس کا حال اور بھی خراب تھا۔ اب، تصوف اچھا خاصا ویدانت، بدھ دھرم اور افلاطونیت کا چربہ بن چکا تھا۔ اور پھر بھی تصوف ہی کے نام سے موسوم تھا۔ اور چونکہ عوام میں اصل تصوف اور اس موجودہ نام نہاد تصوف کے درمیان امتیاز کرنے کی قابلیت نہ تھی اس لئے وہ تصوف کے نام سے فریب کھا رہے تھے۔ اقبال نے اپنی خداداد فراست اور علمی بصیرت سے حقیقتِ حال کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور مولانا رومؒ کی طرح اس کی

اصلاح کی طرف توجہ کی اور اس جرأت اور بے باکی اور اسی خلوص سے کام لیا جس کا مظاہرہ مولانا روم نے اپنے زمانہ میں کیا تھا۔ اور فوراً سمجھ لیا کہ سب سے زیادہ مہلک مرض جو قوم میں پیدا ہو چکا ہے۔ وہ نفیِ خودی کا فلسفہ ہے۔ جس نے قوائے عمل کو بیکار کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا علاج بالضد کے اصول پر اثباتِ خودی کا نغمہ اس قوت سے بلند کیا کہ زمین و آسمان اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے۔ ترکِ دنیا کی بجائے حصولِ دنیا کے محاسن بیان کئے۔ تسخیرِ عالم کو کمالِ انسانی قرار دیا۔ نفیِ مقاصد اور ترکِ آرزو کو موت کا مترادف اور تولیدِ مقاصد و بقائے آرزو کو دوامِ زندگی کا باعث بتلایا ہے ؂

آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

لیکن مقصدِ اعلیٰ اور آرزو پاکیزہ ہونی چاہیئے۔ "اسرارِ خودی" میں ایک باب لکھا ہے جس کا عنوان ہے "حیاتِ خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است" ؂

زندگانی را بقا از مدعاست کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

اور اس مضمون کو اتنے اسالیب اور ایسے عجیب و غریب طریقوں سے بیان کیا کہ فارسی ادب اس کی مثال سے خالی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؂

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجو دیگر دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است

ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں ؂

جہاں یک نغمہ زارِ آرزوئے بم و زیرش ز تارِ آرزوئے
بچشمم ہر چہ ہست و بود و باشد دمے از روزگارِ آرزوئے

ایک جگہ یہ مضمون ہے ؂

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

ایک اسلوب یہ ہے ؂

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

فرماتے ہیں کہ یہ دیکھنے کی خواہش ہی تو ہے جس نے آنکھ پیدا کی ہے اور چلنے کی خواہش نے پاؤں اور ذوقِ نوا سنجی نے منقار، حتیٰ کہ عقل بھی بطنِ آرزو ہی سے پیدا ہوئی ہے ؂

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما؟ بست صورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت بلبل از سعیِ نوا منقار یافت
عقل ندرت کوش و گردوں تاز چیست؟ ہیچ می دانی کہ ایں اعجاز چیست؟
زندگی سرمایہ دار از آرزوست عقل از زائیدگانِ آرزوست

اسی طرح وحدت الوجود کی غلط تعبیرات کی نشاندہی کی اور عقیدۂ توحید کی حقیقی غرض و غایت یہ بتائی کہ دنیا کے

مسلمانوں میں عملی یک رنگی و یکجہتی اتحاد پیدا کرنا چاہیئے ۔ اور جب تک توحید کا یہ مقصد قوم کے پیش نظر رہا ۔ ہماری قوت کا بھی کوئی اندازہ نہ تھا ۔ اور جب سے اس عملی چیز کو علمی و عقلی قرار دے کر عرصۂ بحث و استدلال بنادیا ۔ ہماری پستی و انحطاط کا بھی آغاز ہوگیا ۔ دوسرے الفاظ میں ہماری موجودہ پستی و انتشار اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہمارا عقیدۂ توحید تنزل پذیر ہوچکا ہے ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے فقط اک مسئلۂ علم کلام

عقل کی تعریف کی ؎

با نوریاں بگو کہ زعقلِ بلند بال — ما خاکیاں بدوشِ ثریا سوارہ ایم

مگر ایسی عقل کی سخت مذمت کی جو عمل کی بجائے مایوسی و نامرادی کی طرف رہنمائی کرتی ہے ؎

حذر از خرد کہ بندد ہمہ نقشِ نامرادی — دلِ ما برد بساز ے کہ گسستہ تار بادا

نیز عقل عشق کے بغیر بیکار ہے ؏

ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

علم کی تعریف اس طرح کی ؎

گفت حکمت را خدا خیر کثیر — ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

سیّدِ کل صاحبِ اُمّ الکتاب — پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب

گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید — ربِّ زدنی از زبانِ او چکید

علم اشیاء علم الاسماستے — ہم عصا و ہم یدِ بیضاستے

مگر ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں جو الحاد و بے دینی کی طرف لے جاتا ہے ؎

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن — اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

جس علم سے یقین پیدا نہ ہو اس سے جہل بہتر ہے ؎

ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری — ز دانشے کہ دل او را نمی کند تصدیق

وہ علم بھی کسی کام کا نہیں جو انسان سے اس کے شجاعانہ جوہر سلب کرتا ہے ؎

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم — کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

جس علم سے جذبۂ تحقیق و تلاش کی بجائے جمود کی کیفیت طاری ہوجائے وہ بھی بیکار ہے ؎

علمے کہ تو آموزی مشتاق نگاہے نیست — واماندۂ راہے ہست آوارۂ راہے نیست

علم کے ساتھ سوزِ دل بھی ہونا چاہیئے ورنہ ایسا علم جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر شر و فساد کا باعث ہوگا ؎

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است — نورِ او تاریکیٔ بحر و بر است

بلکہ ؎

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں

حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس آساں می نمود اولِ غمِ دریا بہ بوئے سود
غلط گفتم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد

برو گنجے قناعت جوئے و کنجِ عافیت بنشیں
کہ یک دم تنگ دل بودن بہ بحر و بر نمی ارزد

قریب قریب تمام صوفیہ نے ایسا ہی عافیت پسند مسلک اختیار کر لیا ہے۔ بخلاف اس کے اقبال فرماتے ہیں ؎

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

بلکہ بلاؤں میں پڑ کر انسان پختہ ہوتا ہے ؎

از بلا پختہ تر گردد خودی
تا خدا را پردہ در گردد خودی

اور دلیل میں ارشادِ نبوی پیش کرتے ہیں ؎

از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰ است
مرد را روزِ بلا روزِ صفا است

صوفیہ نے جہاں کو معدوم یا خواب و خیال کہا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

جہانِ رنگ و بو فہمیدنی ہست
دریں وادی بسے گل چیدنی ہست

جہانِ رنگ و بو پیدا تو می گوئی کہ راز است ایں
یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است ایں

مرا ایں خاکدانِ من ز فردوسِ بریں خوشتر
مقامِ ذوق و شوق است ایں، حریمِ سوز و ساز است ایں

اقبال کے ہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو گستاخی[1] و سوءِ ادبی پر محمول کیا جاتا ہے۔ مثلاً ؎

در سینۂ من دمے بیاسائے
از محنت و کلفتِ خدائی

یا
چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

یا
شرار از خاکِ من خیزد کجا ریزم کرا سوزم
غلط کردی کہ در جانم فگندی سوزِ مشتاقی

یا
ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو ست

یا
در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ان مضامین کو بھی صوفی شعراء اور خصوصاً مولانا رومؒ کے اتباع میں سمجھنا چاہیئے۔ آخری شعر تو بالکل ہی مولانا کے شعر کا چربہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

---

[1] بعض مقامات پر تو اس قسم کے اشعار کی حیثیت "نازِ عبدیت" جیسی ہے اور کہیں اس کی صورت "بچوں کی ہٹ" کی سی ہے مگر جہاں یہ رنگ ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

تو بے شبہ "شاعرانہ شطحیات" ہیں اور توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ حلم و عفو ان شطحیات سے چشم پوشی اختیار کرے گی۔ جگر مرادآبادی نے اقبال کے اس شعر کا کس قدر بلیغ انداز میں جواب دیا ہے ؎

نظر کم، جستجو کم، تشنگی کم
نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم

(ایڈیٹر)

بزیر کنگرهٔ کبریاش مردانند فرشته صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

مگر ان اشعار کو گستاخی پر محمول وہی لوگ کرتے ہیں جو مقامِ بندگی اور تخلقوا باخلاق اللہ کے مفہوم حقیقی سے ناآشنا ہونے کے باعث انسان کے مقامِ جذب و تسخیر کی غایت الغایات تک نہیں پہنچے ہیں اور جنہوں نے قربِ نوافل والی حدیث کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھا جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:-

"میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور پھر اس کا کان جس سے وہ سُنتا ہے اور آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ جس سے وہ چھُوتا ہے۔ زبان جس سے وہ بولتا ہے اور پاؤں جس سے وہ چلتا ہے سب میں ہی بن جاتا ہوں۔ پس وہ مجھ سے ہی سُنتا ہے، مجھ سے ہی دیکھتا ہے اور مجھ سے چھُوتا اور مجھ سے ہی چلتا بولتا ہے۔"

اسی مضمون کو اقبال نے اردو میں اس طرح نظم کیا ہے مسلمان سے خطاب کرتے ہیں ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

یعنی "عشق کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمتِ مردانہ کے سامنے جبریل کو "صیدِ زبوں" سمجھنے لگتا ہے اور اپنے وجدان کی کمند سے ذاتِ یزداں پر قابو پانے کے منصوبے سوچتا ہے۔" (روحِ اقبال)

اسی طرح اشعار ما از خود لئے گم شدہ ایم۔۔۔۔۔۔۔ الخ کا یہ مطلب ہے کہ "ذاتِ باری تعالیٰ اپنے اسماء صفات میں متعین ہو کر عالمِ شہادت میں ظہور فرماتی ہے" کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اُعرفَ فخلقتُ الخلق و تعرّفت الیہم فعرفونی" کی توجیہ نہایت لطیف انداز میں "زبورِ عجم" میں کی ہے۔ وہ کہتا ہے ذاتِ باری خود گوہرِ زندگی کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہے۔ اس لئے کہ یہ اسی کُل کا جزو اور اسی شعلہ کا شرارہ ہے۔ پھر وہ شاعرانہ استعجاب میں پوچھتا ہے کہ یہ گوہرِ زندگی خدا ہے یا خودی؟" (روحِ اقبال)

مولانا رومؒ نے "مثنوی" کے آغاز میں نے (بانسری) کے پردے میں ایک ایسے رفیق کے نہ ملنے پر نالہ و شیون کیا ہے جو اس قابل ہو کہ اس سے حالِ دل کہا جا سکے۔ اقبال نے بھی "اسرارِ خودی" کے شروع میں اسی حسرت کا اظہار کیا ہے۔ مولانا ؎

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق
من بہر جمعیتے نالاں شدم جفتِ خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من وز درونِ من نجست اسرارِ من

اقبال ؎

باغم از جفا و رسید و شب شکست شبنم نو برگلِ عالم نشست
انتظارِ صبحِ خیزاں می کشم اے خوشا زرتشتیانِ آتشم
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم من نوائے شاعرِ فرداستم

اور اسی مثنوی (اسرارِ خودی) کے آخر میں شکایتِ زمانہ کے بعد اللہ سے ایسے رفیق کے لئے دعا کی ہے ؎

سینۂ عصرِ من از دل خالی است — می تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارِ غمگسارے تا کجا! — جستجوئے رازدارے تا کجا!
اے ز رویت ماہ و انجم مستنیر — آتشِ خود را ز جانم باز گیر
ایں امانت باز گیر از سینہ ام — خارِ جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدمِ دیرینہ دہ — عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ
من مثالِ لالۂ صحراستم — در میانِ محفلے تنہاستم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ — از خیالِ این و آں بیگانۂ
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش — باز بینم در دلِ او روئے خویش
سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش — ہم صنم او را شوم ہم آزرش

پیامِ مشرق کا آغاز تو "مثنوی" ہی کے انداز پر کرتے ہیں اور وہی مولانا کی طرح رفیق و محرمِ راز کے نہ ملنے کا رونا روتے ہیں۔ ؎

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ — ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش — نالہ ہائے دلنواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گِل است — کے تواں گفتن کہ دارائے دل است

مولانا رومؒ نے مثنوی میں جابجا ضرورتِ پیر پر زور دیا ہے اور پیر کے بغیر راہِ سلوک کا طے ہونا دشوار بتلایا ہے۔ اقبال نے بھی مردانِ کامل کے فیضانِ صحبت کو تکمیلِ خودی کے لئے ضروری قرار دیا ہے مگر مولانا کی طرح "مکّار پیروں" سے بچنے کی ہدایت بھی اُسی شدّت کے ساتھ کی ہے۔ اور مردِ کامل سے مُراد ایسا شخص لیا ہے جو مقاماتِ خودی سے واقف ہو تاکہ اس کی صحبت کے فیض سے معرفتِ ذات وار تقائے نفس کے مراحل بآسانی طے ہو سکیں۔ مولاناؒ ؎

سایۂ یزداں بود بندہ خدا — مُردۂ ایں عالم و زندہ خدا
دامنِ او گیر زوتر بے گماں — تا رہی از آفتِ آخر زماں

اندریں وادی مرو بے ایں دلیل — لا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْن گو چوں خلیل
خاک شو مردانِ حق را زیرِ پا — خاک بر سرکن حسد را ہمچو ما

یک زمانے صحبتِ با اولیا — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگِ خارہ و مرمر شوی — چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

دست زن در ذیل صاحب دولتے | تا ز افضالش بیابی رفعتے
صحبت صالح ترا صالح کند | صحبت طالح ترا طالح کند

مگر فرماتے ہیں کہ اُن شیطانوں سے پُرحذر رہنا چاہیئے جو انسان کی شکل میں متاعِ دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں ؎

چوں بسے ابلیس آدم روئے ہست | پس بہر دستے نشاید داد دست
حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں | تا بخواند بر سلیمے زاں فسوں
کارِ مرداں روشنی و گرمی است | کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

اقبال ؎

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے | بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را ہمچو رومی بر فروز | روم را در آتشِ تبریز سوز

مگر اُس کامل کی تعریف یہ ہے ؎

ز من گو صوفیانِ با صفا را | خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم | کہ با نورِ خودی بیند خدا را

بعشوۂ لمے جوانانِ ماہ سیما چیست | در آ بہ حلقۂ پیرے کہ دلبری داند

بیکے بدا ہن مردانِ آشنا آویز | زیار اگر نگہ محرمانہ می خواہی

مگر ساتھ ہی تنبیہ فرماتے ہیں کہ ؎

اے بسا آدم کہ ابلیسی کند | اے بسا شیطاں کہ ادریسی کند
رنگِ او نیرنگ و بودِ او نمود | اندرونِ او چو داغِ لالہ دود
پاکباز و کعبتینِ او دغل | ایمن و غدر و نفاق اندر بغل

مثنوی اسرارِ خودی میں اپنے مکار پیروں کی اس طرح تعریف کرتے ہیں ؎

پیرہا پیر از بیاضِ مو شدند | مسخرہ بہرِ کودکانِ کو شدند
دل ز نقشِ لا الٰہ بیگانۂ ! | از صنم ہائے ہوس بتخانۂ
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش | آہ ازیں سوداگرانِ دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر | از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند | سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند

بلکہ یہ عارفِ خودی تو اعتمادِ نفس و یقینِ کامل کے ساتھ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ لوگ خود اس کی طرف رجوع کریں اور رموزِ عشق و اسرارِ خودی اس سے سیکھیں۔ اس لئے کہ وہ میخانۂ رومی سے سرخوش و سرشار ہو کر آیا ہے ؎

بیا کہ من زخمِ پیرِ روم آوردم | مۓ سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبیست

رات کا

یکے بغم کدۂ من گزر کن و بنگر — ستارہ سوختۂ کیمیا گری داند

اور یہ بات اس سے بھی ضروری ہے کہ اب پیمانے اس شراب سے خالی ہو چکے ہیں۔ اگر یہ شراب مل سکتی ہے تو اسی ستیاسے خودی کے پیمانے سے مل سکتی ہے ؎

ز درد من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست — پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

ذیل کے شعر میں بھی اسی ہی طرف لطیف اشارہ کیا ہے ؎

بایں بہانہ بہ دشت طلب زپا منشیں — کہ در زمانۂ ما آشنائے راہے نیست

مولانا روم نے بھی ایک جگہ ایسا لطیف اشارہ کیا تھا ؎

کوئے نومیدی مرو امیدہا ست — سوئے تاریکی مرو خورشیدہا ست

مولانا روم نے رسمی و فنی شاعری سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے حقیقی شاعری پر فخر کیا ہے۔ اس شاعری پر جس کو "جزوے از پیغمبری" کہا گیا ہے ؎

من ندانم فاعلاتن فاعلات — شعر می گویم بہ از قند و نبات

اقبال نے بھی رسمی شاعری کے اعتبار سے اپنے ساتھ شاعری کی نسبت کو پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست — کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

مگر جہاں تک شعر کی تاثیر اور افادی حیثیت کا تعلق ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

چشمۂ حیواں براتم کردہ اند — محرم راز حیاتم کردہ اند
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت — ہمچو فکر من دُر معنی نسفت
سر عیش جاوداں خواہی بیا — ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

غرضکہ مولانا روم اور اقبال میں فطری و طبعی مناسبت کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ اسی فطری مناسبت اور روحانی اتحاد نے ان کو مولانا کے اتباع کی طرف مائل کیا۔ اور بالآخر وہ اکثر احوالِ زندگی میں مولانا کا اتباع کرکے "مثیلِ رومی" کے قابلِ رشک خطاب کے مستحق بن گئے ہیں۔ اور جیسا کہ حضرت نظامی گنجوی نے مثنوی مولانا روم کے متعلق فرمایا تھا کہ ؎

مثنوی مولوی معنوی !! — ہست قرآں در زبان پہلوی

اقبال کے بارے میں بھی ان کے ایک بلند مرتبہ معاصر مولانا عبد القادر گرامی مرحوم کو لکھنا پڑا کہ ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال — پیغمبرے کرد و پیمبر نتواں گفت

مولانا روم نے قیاس تمثیلی کو اختیار کرکے بڑے بڑے ادق مسائل کو ایسی ایسی عجیب و غریب تمثیلوں سے سمجھایا ہے کہ وہ مسائل سمجھ ہی میں نہیں آجاتے بلکہ ایک وجدانی کیفیت بھی دل میں پیدا ہو کر رہتی ہے۔ اقبال نے بھی اپنے کلام اور بالخصوص مثنوی اسرارِ خودی میں تمثیلی طریق[illegible] اختیار کیا ہے۔

خودی

اگر مولانا نے بعض موقعوں پر با وجود اختلاف بحر کے اپنی مثنوی میں حکیم سنائی کی مثنوی حدیقہ کے اشعار نقل کر کے اُن کی شرح لکھی ہے تو اقبال نے بھی اس بات کو روا رکھ کر "اسرارِ خودی" "پیامِ مشرق" اور "جاوید نامہ" میں دوسرے شعراء کے وہ اشعار نقل کر لئے ہیں جن کی بحر ان کتابوں کی بحروں سے مختلف ہے۔

مولانا اگر بقائے روح کے مضامین لکھ کر حیات بعد الممات کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں تو اقبال کو بھی اس موضوع سے اس قدر دلچسپی ہوتی ہے اور وہ اس کو ایسے ایسے عجیب اسلوبوں سے نظم کرتے ہیں کہ یہ اُن کا خاص فلسفہ بن جاتا ہے۔

مگر اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جن باتوں میں اتباع کیا ہے اُن کو ایسے عجیب و غریب اسالیب کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اتباع نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ حقائقِ کائنات و رموزِ حیات کی توضیح مزید سے تعبیر کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض امور میں تو توضیح سے گزر کر ترقی کے معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ غرضکہ اتباع کی نوعیت تقلیدی نہیں تخلیقی و ارتقائی ہے۔ جس کے بغیر کوئی فن ترقی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر رضی الدین تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ امر مسلّم ہے کہ ایک غیر معمولی ذہین اور بڑا مصنف کسر اپنے خاص غور و فکر کے علاوہ ہر مبداءِ علم و فضل سے خیالات اور تصورات حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے ذاتی اصول اور ایقان کی روشنی میں ایک جامع اور مرتب نظام دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے بالکل یہی کیفیت اقبال کی ہے۔" (مقدمہ روحِ اقبال)

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہیں:-

"شعر میں اقبال نے حکمت کے جو موتی پروئے ہیں اُن کے متعلق یہ کہہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ موتی اس نے دوسرے جوہریوں سے لئے ہیں۔ ہیرا جب تک تراشا نہ جائے اور موتی جب تک مالا میں پرویا نہ جائے اور جواہرات جب تک زیور میں جڑے نہ جائیں اُن کا جمال معمولی سنگ ریزوں اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اقبال نے شاعری پر جو احسان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مشرق و مغرب اور ماضی و حال کے وہ جواہر پارے جو نفسِ انسانی کے آسمان کے تارے ہیں۔ کمالِ شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں کہ نوعِ انسان کے واسطے ہمیشہ کے لئے بصیرت افروز ہو گئے ہیں۔ شعر کی دُنیا جو انسانی قلب کی دُنیا ہے اس ثروت سے مالا مال ہو گئی اور اُردو اور فارسی کی شاعری پر جو یہ تہمت تھی کہ اس کا دائرۂ تصورات بہت محدود ہے اور شعراء بار بار ایک ہی قسم کے خیالات کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ وہ تہمت رفع ہو گئی ہے۔ بڑے سے بڑے متفکر نے بھی خواہ وہ رومی ہوں یا عطار یا سنائی یا گوئٹے یا ٹینی سن یا براؤننگ، اس سے زیادہ کوئی کام نہیں کیا۔ اقبال کی حکیمانہ شاعری کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو دوسرے متفکر شعراء میں بہت کمیاب بلکہ نایاب ہے جہاں تک افکار کا تعلق ہے۔ اس نے رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ نطشے کا نہ برگساں کا اور نہ کارل مارکس یا لینن کا۔ اپنے تصورات کا تابع بنتے بنتے اس نے رنگین رہ گئے

اور بعض خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں لیکن اس کے مکمل قالبین کا نقشہ کسی دوسرے کے
نقشے کی ہوبہو نقل نہیں ہے۔ اپنی تعبیر کے لئے اُس نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح
استعمال کیا ہے۔" (رسالہ اردو۔ اقبال نمبر)

حقیقت یہ ہے کہ رومی کا مقصد شاعری تھا نہ اقبال کا۔ بلکہ دونوں کے پیش نظر ایسا اہم کام تھا جس سے زیادہ اہم کوئی اور کام نہیں ہو سکتا۔ زمینِ دل کو ظن و تخمین کے خس و خاشاک سے پاک کر کے یقین و ایمان کے گل و ریحان سے آراستہ کرنا اور نوعِ انسانی کو عروجِ کمال کے اس نقطۂ آخر تک پہنچا دینا جو ازل میں اس کے لئے مقدر ہوا ہے۔

اقبال کی زبان

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ اقبال نے فارسی زبان کے سیکھنے میں بڑی محنت اور کوشش کی۔ قابل زبان داں اساتذہ سے پڑھا۔ باذاق محققینِ زبان کی صحبت سے استفادہ کیا اور خود فارسی زبان کا ہمہ گیر مطالعہ کر کے فارسی زبان و ادب پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ تاہم وہ اہلِ زبان نہ تھے اور اس لئے وہ باریک فرق جو زبان داں اور اہلِ زبان کے تحاوریں ہوتا ہے وہ اُن کی زبان میں بھی موجود تھا۔ اور یہ ایک فطری اور قدرتی بات ہے۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ان کی زبان زیادہ تر محاورۂ قدیم کے مطابق اور جدید لہجہ سے مختلف ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسرارِ خودی کی تمہید میں اپنی زبان کے بارے میں خود فرما دیا ہے کہ ؎

ہندیم از فارسی بیگانہ ام	ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسنِ اندازِ بیاں از من مجو	خوانسار و اصفہاں از من مجو

اگرچہ ان اشعار میں بہت کچھ اُن کی طبیعت کا انکسار شامل ہے تاہم کسی قدر حقیقت بھی موجود ہے۔ مولانا اسلم جے راج پوری مرحوم فرماتے ہیں :-

"ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی تو شروع شروع میں اُن کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کئے۔ (پیامِ مشرق کی تصنیف مراد ہے) لیکن اب انہوں نے اپنے ذہنِ وقاد اور طبعِ نقاد سے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی ہے کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آ گئے ہیں۔ اس تمام مجموعہ میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں اُنگلی رکھی جا سکتی ہے اور "مئے باقی" کی غزلوں میں تو زبان کی سلاست کے ساتھ ترنم ریزی اور معنوی لطافت بھی درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔"

اسی طرح مولانائے موصوف جاوید نامہ کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستانِ سعدی، اور دیوانِ حافظ۔ لیکن اب جاوید نامہ کو پانچویں کتاب سمجھنا چاہیئے۔"

مولانا عبدالسلام ندوی فرماتے ہیں کہ :-

"جہاں تک الفاظ و طرزِ بیان کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے متاخرین شعرائے ایران کی

شستہ زبان اور خواجہ حافظ کا پُرجوش اندازِ بیان اختیار کیا ہے اور اس لئے اُن کے لہجہ میں مولانا روم سے زیادہ مستی اور رنگینی پیدا کردی ہے۔ خود اقبال کے بعض اشعار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

نغمہ گئے زخیابانِ جنتِ کشمیر | دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است"

جناب ممتاز حسن صاحب نے اپنے سفرِ ایران کا حال ایک مضمون "اقبال ایران میں" کے عنوان سے لکھا ہے۔ جو رسالہ ماہِ نو بابت اپریل ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اقبال کی زبان پر ایک زمانہ میں ایرانی ادیب اعتراض کیا کرتے تھے کہ وہ موجودہ فارسی سے مختلف ہے۔ مَیں نے ایسے اعتراضات کسی قابلِ ذکر شخص سے نہیں سُنے۔ اس کے برعکس ملک الشعراء بہار کا خیال ہو کہ جو لوگ اقبال کی زبان کو نامانوس قرار دیتے ہیں وہ خود فارسی اور اس کی وسعت سے بے خبر ہیں۔ ان (ملک الشعراء بہار) کے نزدیک اقبال ایک مخصوص "سبک" (اسلوب) کے مالک ہیں۔ جو فارسی میں بہت بلند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال پر وہی ایرانی اعتراض کرسکتا ہے جو سعدی اور حافظ کی زبان پر بھی اعتراض کرنے کو تیار ہو۔"

ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے فرماتے ہیں کہ:۔

انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم کی واقفیت نے مختلف اسالیب پر عبور حاصل کرنے میں اُن کی مدد کی تھی۔ جرمن کی واقفیت کے سبب جرمن ادب کے شاہکاروں پر براہِ راست اُنھیں عبور حاصل تھا۔ سنسکرت زبان بھی جانتے تھے۔ اور اس طرح سنسکرت لٹریچر کا بھی اچھا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی کا تو پوچھنا کیا! "بیاوم بدگرا اینجا بود زباں دانے" کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ کر دکھایا کہ ایک معروف ایرانی بھی اُن کا نام ادب سے لیتا ہے۔"

عبدالقادر سروری ایم اے صدر شعبۂ اُردو و فارسی میسور یونیورسٹی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اقبال کا پورا فارسی کلام سلاست اور روانی کے ایک ہی اعلیٰ معیار پر نہ ہو یا اس کے ہر شعر میں حافظ کی سی شیرینی اور سعدی کی سادگی اور صفائی موجود نہ ہو لیکن اس سے ان کی عظمت پر کیا حرف آسکتا ہے جبکہ خود مولانا رومی کو بھی بعض جگہ محاورے اور روزمرّہ کی پابندی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔" آگے چل کر اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ "فارسی زبان میں اقبال نے اپنے زمانہ کی ضروریات سے متعلق بہت سی اہم اصطلاحات، الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اس زمانہ میں جبکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی شاعری قدما کے معیار سے بالکل مختلف اور جدید الفاظ اور ترکیبوں کا مرکب بن گئی ہے۔ اقبال نے معیاری زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے کلام کو پڑھ کر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہو اور یہی چیز ہے جو اقبال کو اپنے زمانہ کا بڑا فارسی شاعر بنا رہی ہے۔" (آثارِ اقبال)

اقبال کی زبان اور شاعری کے بارے میں یہ غیر ایرانی ادبا کی رائیں تھیں۔ اب اہلِ زبان کی رائے بھی سن لیجئے۔ تہران یونیورسٹی کے فارسی ادبیات کے پروفیسر ڈاکٹر حسین خطیبی نے اقبال کی فارسی زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"مرحوم اقبال با آنکہ زبانِ فارسی را بدرس خواندہ و در طولِ عمرِ خویش فرصت آنکہ با اہلِ ایں زباں معاشرت داشتہ باشد نیافتہ بود۔ بر اثرِ ہمیں ممارست و تتبع چناں در زبانِ فارسی مہارت یافت کہ بتوانست دقیق ترین افکارِ عرفانی و مشکل ترین معانی فلسفی و علمی و اخلاقی را در قالبِ فصیح ترین الفاظ و کامل ترین ترکیباتِ زبانِ فارسی بریزد و باسانی و روانی بیان کند و نہ تنہا از ایرادِ مضامینِ دشوار و لغاتِ سست و کلماتِ نادرست احتراز جوید بلکہ باستثنائے مواردے محدودے از جنبۂ لفظی ہم سبکِ خود را بپایۂ اشعارِ قدیم فارسی استوار ساز و ونگاہ دارد و باکمالِ استادی از مضامینِ سخن و دشواری ہائے کلام بیروں آورد۔ در اشعارِ او لغت یا ترکیبے یا نحوہ استعمالے کہ از نظرِ اصول و قواعدِ زبانِ فارسی بتواں آں را موردِ ایراد و انتقاد قرار داد کمتر بتوان دیدہ نہ شود۔"

یہی خیال اقبال کی زبان کے متعلق ڈاکٹر خطیبی نے ۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اردو کالج میں ظاہر کیا تھا۔ جبکہ وہ ایرانی خیرسگالی وفد کے ہمراہ پاکستان آئے تھے۔ اور انہیں نے وفد کے دوسرے ارکان تہرید اور صورت گر کے ساتھ کالج کی طرف سے دیئے گئے عصرانہ میں تشریف لاکر اپنا مقالہ "حافظ اور اقبال" پڑھا تھا۔ جس میں حافظ کے کلام اور اقبال کی ان غزلیات کا موازنہ کیا تھا جو "مے باقی" کے عنوان سے پیامِ مشرق کا ایک حصہ ہیں۔

لیکن ان تمام شواہد و اسناد کے باوجود بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اقبال کی زبان اور لب و لہجہ کے متعلق غلط فہمیاں موجود ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان کی تراکیب خود ساختہ ہیں۔ وہ زبان کے روزمرہ کی پابندی نہیں کرتے۔ اور اپنے لئے محاورات خود گھڑ لیتے ہیں۔ اور ان کے کلام میں صرفی و نحوی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ وغیرہ۔ لفظی و ترکیبی غلطی کی ایک مثال آقائی مجتبےٰ مینوی نے اپنی کتاب "اقبال لاہوری" میں نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

"روزے با یکے از دوستاں از محمد اقبال و اشعارِ او سخن می گفتیم۔ یکے از آں آقایانِ محترم کہ جز عیب گرفتن از غالب مردم ہنرے و کارے ندانند و در کلیۂ امورِ عالم ہم خود را خبیر و ذی رائے می دانند در میانِ سخن دوید و گفت "بلی می دانم ہماں کسے است کہ کتابِ "راحۃ الصدور" را چاپ کردہ است" با وے توضیح دادیم کہ آں محمد اقبال کہ شاعر و فیلسوف بود با آں محمد اقبال کہ "راحۃ الصدور" محمد راوندی را در لیدن و "اخبار الدولۃ السلجوقیہ" صدر الدین حسینی را در لاہور بطبع رسانید و در دانشگاہِ پنجاب استادِ زبانِ فارسی است تفاوت دارد۔ بعد آں دوستِ من از اشعارِ اقبال ایں قطعہ را خواند ؎

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم، گر نروم نیستم

دوستِ من گفت "بہ بیں چہ مضمونِ خوبے است، ساحل چوں ساکن و بیکارہ است، ہیچ است و موج چوں دائم در

جنب وجوش است بوده است۔ اگر ترکیب الفاظش قدرے محکم تر وجمیل تر بود شعر بسیار بلند می شد۔" آں آقائی محترم و صاحب ادعا باز ہم در بیان کلامے کہ مربوط باشد و دوید و گفت " بجز خرامیدن بمعنی راہ رفتن بآہستگی و آہستگی است و تیز خرامید اجتماع ضدین است و غلط است۔"

مجتبیٰ مینوی کا منشاء اس دل چسپ حکایت کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اعتراض اس قسم کے لوگ کرتے ہیں جن کو اقبال کے متعلق صحیح معلومات بھی نہیں ہیں بلکہ جو آداب مجلس سے بھی واقف نہیں۔ گفتگو کس سے اور کس موضوع پر ہو رہی ہے مگر ان کو دخل در معقولات سے کام۔ پھر اعتراض کس قدر مضحکہ انگیز کہ:۔

(۱) اگر الفاظ کی ترکیب کسی قدر زیادہ منضبط اور حسین ہوتی تو اشعار بلند ہو جاتے۔ گویا ترکیب بھدی اور کمزور ہے اور اس وجہ سے اشعار میں بلندی نہیں ہے۔

(۲) چونکہ خرامیدن کے معنی آہستہ چلنا ہیں اور شعر میں لفظ خرامید کے ساتھ تیز بھی اس لئے تیزی اور آہستگی کی وجہ سے اجتماع ضدین واقع ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ اعتراض محض ناواقفیت کا نتیجہ ہے ورنہ اس قسم کی بے شمار مثالیں اہل زبان کے کلام میں موجود ہیں اور ہر قد اور ہر درجہ کے شعراء کے کلام میں موجود ہیں۔ اس اعتراض کو نقل کر کے سید عبد اللہ اپنے مضمون "اقبال کی زبان" میں لکھتے ہیں کہ:

"معترض کو لفظ خرام کے ساتھ "تیز" کو جمع کرنے میں قباحت نظر آتی ہے اور ہم تسلیم بھی کر لیتے مگر شیخ سعدی کے اس ارشاد کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا؟ ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام زیر قدمت ہزار جاں است

جب خرام کے معنی ہی آہستہ چلنا قرار پایا تو پھر سعدی کے کلام میں خرام کے ساتھ آہستہ کی تکرار کیا معنی؟ معترض کی رائے کے مطابق تو لفظ خرام ہی کافی تھا۔ مگر ہم نہ تو سعدی پر معترض ہیں نہ اقبال پر۔ کیونکہ دونوں نے اپنے مفہوم کے کامل اظہار اور خرام کی توضیح کے لئے ایک ایک لفظ کا اضافہ کرنا مناسب خیال کیا جو بالکل بجا اور برمحل ہے۔"

اسی طرح مجتبیٰ مینوی نے اقبال کے مصرع "سر آمد روزگار ایں فقیرے" کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"من جملہ شبیہ باین در یکے از اشعار آقائی ملک الشعراء بہار نیز دیدہ ام۔ و لے معمولاً ہر گاہ کلمۂ "یا" یائے وحدت بعد از "آں" یا "ایں" بیاوریم بعد از آں یک جملۂ توصیفی بباید کہ با حرف "کہ" بموصوف مربوط شدہ باشد مثلاً ایں فقیرے کہ دست بجانب راد دراز کردہ است۔"

غرضیکہ نئے الفاظ، نئی تراکیب اور مقامی تصرفات اسی وقت قابل اعتراض ہوں نہ ہوں کہ جب زبان کی توسیع مطلوب نہ ہو۔ ورنہ اگر زبان کی توسیع ضروری ہے تو زمانہ اور حالات کے ساتھ ساتھ اظہار خیال کے طریقوں اور بیان کے اسلوبوں میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے اور ایسی صورت میں اگر شاعر اپنے مشاہدات اور جذبات کے اظہار کے لئے زبان کے موجودہ ذخیرے کو ناکافی سمجھتا ہے تو وہ نئی ترکیبوں اور جدید اسلوبوں کے ایجاد و اختراع کے لئے مجبور ہے تاکہ اپنے تجربات اور ما فی الضمیر کی صحیح ترجمانی کر سکے جیسا کہ مجتبیٰ مینوی نے لکھا ہے کہ:۔

"ازیں گزشتہ اقبال برائے بیان معانی و مقاصد خود گاہے محتاج الفاظے شدہ است کہ

در فارسی وجود ندارند و یا اینکہ او پیدا نکردہ است"

اور نئی تراکیب کا ایجاد کرنا آسان بات نہیں ہے، اس کے لئے غیر معمولی ذہانت، طبیعت میں اعلیٰ درجہ کی اپج، وسیع مطالعہ اور زبان اور اس کے اسالیب پر نکتہ دانہ نظر کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس کی روشنی میں نئی ترکیبیں ایجاد کی جاسکیں ورنہ ایسی ایجاد کردہ ترکیبیں مبہم اور مغلق ہوکر نامانوس ہو جائیں گی اور اس طرح شاعر اور ادیب کی تمام کوشش "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق بن کر رہ جائیں گی۔ اس اعتبار سے اگر اقبال کی ایجاد کردہ تراکیب کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی تراکیب عرفی، خاقانی اور غالب وغیرہ کی ترکیبوں سے کہیں زیادہ عام فہم اور آسان ثابت ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود نئی ترکیبوں کے اُن کا کوئی بھی شعر نامانوس نہیں۔ بلکہ وہ اشعار بھی جن میں اس قسم کی ترکیبیں پائی جاتی ہیں، ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے دوسرے اشعار۔ رہیں صرفی ونحوی غلطیاں تو شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا جس کے کلام میں اس قسم کی غلطیاں نہ ہوں۔ حتیٰ کہ حکیم سنائی، خواجہ عطار اور مولانا روم کا کلام بھی اس سے پاک نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ غیر معمولی شخصیتیں اس سے کہیں بلند تھیں کہ چند وضع کیے ہوئے صرفی ونحوی اصول کی رسمی طور پر پابندی کو وہ اپنے جذبات واحساسات کو مقید ومحدود کر کے رکھ دیں اور سید عبد اللہ کی رائے ہیں:-

"اقبال کی بعض فروگزاشتیں تو اُن کی ذاتی فروگزاشتیں بھی نہیں بلکہ اس معاملہ میں فارسی کے "پاک ہندی دبستانِ ادب" کے بڑے بڑے نمائندے بھی اُن کے شریک حال ہیں۔ اقبال نے زبان کی یہ خصوصیات ہندوستان کے ممتاز ادیبوں اور انشاپردازوں سے ورثے میں پائی ہیں۔ اور ہندی ادیبوں اور شاعروں کی زبان کی یہ خصوصیات اتنی پختہ اور اتنی عام ہیں کہ اس کے لئے علمائے زبان کو ایک خاص اصطلاح "استعمالِ ہندی" وضع کرنی پڑی۔ جو عبارت ہے ان امتیازاتِ خاص سے جو مقامی اور محلّی اثرات کے ماتحت ہندوستانی فارسی سے مخصوص اور وابستہ ہیں"

الحاصل نئے الفاظ، نئی تراکیب اور مقامی تصرفات کی بنا پر کسی کلام کو غیر فصیح نہیں کہا جاسکتا۔ ورنہ بڑے بڑے اہل زبان شعراء کے کلام کو بھی پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھنا پڑے گا۔ حالانکہ وہ ان تمام باتوں کے باوجود بھی آج تک فصاحت کے دربار میں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ مثلاً خاقانی، جس کی فارسی میں ارمنیوں کی زبان کے الفاظ ہونے ہوئے بے شمار نئی تراکیب اور نئی نئی علمی اصطلاحات بھی موجود ہیں اور اکثر بہت مشکل بھی ہیں۔ اسی طرح باباطاہر عریاں کی رباعیات شہری اور شستہ ادبی فارسی سے مختلف ہے اور ایک خاقانی اور باباطاہر ہی پر کیا موقوف ہے، حضرت نظامی گنجوی نے کتنی تراکیب ایجاد کیں۔ منوچہر دامغانی اور انوری سے لے کر عرفی اور نظیری تک ہر ایک نے حسب ضرورت نئی تراکیب اور تصرفات سے کام لیا ہے۔ مگر ان میں سے کونسا شاعر نامقبول ہے اور بازار سخن میں کس کا کلام متاع کس مپرساں کی حیثیت رکھتا ہے اس کے علاوہ ملک الشعراء بہار نے اپنی کتاب "سبک شناسی" میں اسی بحث کے ضمن میں لکھا ہے کہ:-

"زبان کے "لہجے" بدلتے رہتے ہیں اور زبان آب وہوا اور مقام ومحل کے اثرات سے متاثر ہوکر نئے نئے روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی ایک بولی (لہجہ) اصلاً و نظراً دوسری بولی سے فصیح تر ہے۔ کیونکہ فصاحت کا فیصلہ کرنے والے عناصر محض اضافی،

زمانی اور محلی ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب خراسان ادب و شعر کا مرکز تھا۔ اُس وقت اس لہجہ کو فصیح ترین لہجہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب سلجوقیوں کے زمانہ میں تبریز و عراق کو سیاسی اثرات کے ماتحت اہمیت ہوئی تو عراق و فارس کی زبان کو صحیح اور فصیح قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک اصفہان اور کاشان میں علم و شعر کی محفل قائم رہی۔ اس کے سبب ان خطوں کا رنگ مقبول ترین رنگ قرار دیا گیا۔ غرض دربار اور سرکار کے بدل جانے سے نئے نئے مقامات اور شہر ادبی اہمیت اختیار کرتے گئے۔ جس کے زیر اثر ان جگہوں کی زبان ٹکسالی زبان قرار پائی۔ چنانچہ آج طہران اسی قاعدے کے ماتحت زبان و ادب کی ٹکسال کا درجہ رکھتا ہے۔"

زبان کے بارے میں آج سے بہت پہلے ایسا ہی بیان خان آرزو بھی دے چکے ہیں۔ خان آرزو اور ملک الشعراء بہار کے بیانات نقل کرنے کے بعد سید عبداللہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں جس کی صداقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ:-

(۱) ہندوستانی فارسی مثل اور لہجوں کے ایک مقامی لہجہ ہے۔ جس کا اپنا روزمرّہ، اپنا محاورہ اور اپنا استعمال ہے اور اس میں ایران کے جدید محاورے و روزمرّہ کے تتبع کی ضرورت نہیں۔

(۲) اقبال کی زبان وہی ہے جو صدیوں تک ہندوستان میں رائج رہی جس کو اہلِ ہند اپنی زبان سمجھ کر مدتوں استعمال کرتے رہے ہندوستان کا وسیع ادبی ذخیرہ بھی اسی زبان میں ہے۔ جس کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع ہو کر ہمارے زمانہ تک جاری ہے۔ امیر خسرو، حسن دہلوی، ابوالفضل، فیضی، شیدا ہندی، منیر لاہوری، بیدل، ناصر علی، اورنگ زیب، خان آرزو، غالب اور ان کے ساتھ ساتھ واقف اور گرامی وغیرہ سب اسی سلسلہ کے لوگ ہیں اور زبان و بیان کے اعتبار سے اقبال ان ہی کے وارث ہیں۔

(۳) ایران میں جدید اثرات کے ماتحت مغربی زبانوں کے الفاظ و محاورات ترجمہ ہو کر بڑی کثرت سے زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح جدید محاورات نے نئی نئی صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ مگر اقبال ان نئی صورتوں سے ناآشنا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فارسی میں جدید الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مگر انہوں نے زبان کی قدیم ادبی روایت کو بہرحال قائم رکھا ہے۔ جس کی مصلحتیں علمی، تہذیبی اور ثقافتی نوعیت کی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے مخصوص پیغام کے لئے وہ زبان اختیار کی ہے جو ایران کے علاوہ ہند، افغانستان، ترکی اور ماوراء النہر میں بھی سمجھی جاتی ہے۔"

سید عبداللہ نے اقبال کی بعض ایجاد کردہ تراکیب کی فہرست بھی دی ہے، مثلاً آرہ خانہ زاد۔ گرہ خوردہ نگاہ۔ (زبور ۱۱۶) حاضر آرائی و آئندہ نگاری (زبور ۱۴۳) طائر پیش رس، حوصلہ، زمزمہ پرداز، زادۂ باغ و راغ، شرر پریدہ رنگ، شعلۂ نمناک، تہی ادراکی، چمن کدہ۔ تازہ کاری۔ افسونِ فرنگ، گراں رکابی وغیرہ (ماہِ نو۔ اپریل ۵۴ء)

اس سلسلہ میں اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہوئے یہ گزارش کی جاتی ہے کہ سید عبداللہ کے دو مضامین (۱) "اقبال اور زبان"۔ اور (۲) "اقبال کے محبوب شعراء" کا مکمل مطالعہ کرنا بہت زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔

اقبال کی زبان کا معاملہ معمولی سے فرق کے ساتھ بڑی حد تک مرزا غالب سے مشابہت رکھتا ہے۔ غالب ہمیشہ اپنی فارسی پر فخر کرتے اور اُردو کو حقیر سمجھتے رہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگِ من است

مگر ان کو قبولِ عام اور شہرتِ دوام کے دربار میں جو ممتاز جگہ ملی وہ اُردو ہی کے ذریعہ ملی۔ اسی طرح اقبال نے رجحانِ طبع سے اُردو کا انتخاب کیا اور ۱۹۰۸ء تک اُردو ہی میں شعر کہتے رہے۔ لیکن بضرورت فارسی میں کہنے پر مجبور رہے تو جس طرح غالب اپنی اُردو کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ اقبال بھی انکسار کے ساتھ اپنی فارسی گوئی کے بارے میں اظہار کمتری ہی کرتے رہے۔ ؎

ھندیم از فارسی بیگانہ ام   بادۂ باشم، تہی پیمانہ ام

لیکن جس طرح غالب کو اُردو نے اُچھال کر آسمانِ شہرت پر پہنچایا اقبال کو بھی فارسی ہی کی بدولت عالمگیر مقبولیت اور بین الاقوامی شہرت کا تخت و تاج ملا۔ یہاں تک کہ آج ایران میں بھی اُن کی زبان دانی کا سکّہ چل رہا ہے اور ایرانی شعرا بھی اُن کی تعریف میں قصیدہ خواں ہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

غرضکہ یہ ہے اقبال کی فارسی شاعری کا مختصر جائزہ۔ اُس شاعری کا جو ایک زندہ جاوید پیغام کی ترجمانی کے لئے اختیار کی گئی۔ جس کے لئے مبدءِ فیاض سے اُن کو ایسا پاکیزہ طرز اور ایسی اعلیٰ درجہ کی زبان اور ایسا مؤثر لب و لہجہ ملا جو سننے والوں کے دلوں میں اُترتا اور پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جس کا اثر وقتی و سرسری نہیں بلکہ بڑا گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ دل کو گرماتا اور جگر کو برماتا رہتا ہے۔ فارسی شاعری کو لوگوں نے مرزا غالب پر ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اور خود غالب بھی ایسا دعویٰ کرتے تھے۔ ناظم ہروی کا ایک مشہور قطعہ ہے۔ جس میں اُس نے خسرو سے لے کر جامی تک ہر زمانے کے ممتاز شاعر کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا تھا ؎

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید
زجامی سخن را تمامی رسید

مگر جب مرزا غالب کا زمانہ آیا تو انہوں نے اس سلسلہ کو اپنی ذات سے اس طرح ملا دیا ؎

زجامی بہ عرفی و طالب رسید
زعرفی و طالب بہ غالب رسید

بلکہ عوام میں ایک پُر لطف بات یہ بھی مشہور ہو گئی تھی کہ:-

"ہندوستان میں فارسی شاعری ایک تُرکِ لاچین (امیر خسروؒ) سے شروع ہوئی اور ایک تُرک ایبک (مرزا غالب) پر ختم ہو گئی"۔

لیکن قدرت نے غالب کے بعد اقبال کو پیدا کر کے ان تمام دعاوی کو باطل کر دیا۔ اور فارسی شاعری کا خاتمہ اُن کی ذات پر کیا۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ خسرو کی شاعری اخلاقی اور صوفیانہ شاعری تھی۔ جس کو گرمیٔ عشقِ حقیقی نے حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ اس لئے وہ ایسے شخص پر ختم ہوئی جس کی شاعری نے اخلاقی اقدار کو پھر سے زندہ کیا۔ انسان کو اس کے مقام سے واقف کیا۔ جس نے قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑا دیا۔ اور یاس و ناامیدی کی بجائے ترقی کی دُنیائے نو کا راستہ دکھلایا۔ جو ادب برائے ادب کی پیداوار نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کا بہترین نمونہ ہے اور جب اُن کی

ابتدائی شاعری میں تصوف کی چاشنی اور اخلاق کا مزا دیکھتے ہیں تو ہندوستان کی اس بلند مرتبہ شاعری کا خاتمہ اقبال ہی کی ذات پر ہونا قانونِ فطرت کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ فقصہ مختصر ہندوستان کی فارسی شاعری غالب پر نہیں اقبال پر ختم ہوئی ہے۔ چنانچہ سید محمد علی داعی الاسلام پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن نے غالب کے مذکورہ صدر شعر پر یہ اضافہ کیا ؎

چو غالب زہندوستاں رخت بست — بجائے وے اقبالِ دانا نشست

یقیں داں سخن دانیِ پاستاں — بماند بہ ہندوستاں جاوداں

اور یوں جس طرح خسرو سے پہلے بھی شاعر تھے اقبال کے بعد بھی ہوتے رہیں گے۔ مگر جس طرح وہ آغاز (خسرو کی شاعری) اپنی جگہ بے مثال تھا یہ انجام (اقبال کی شاعری) بھی ہمیشہ بے مثل رہے گا۔ اور خود اقبال بھی ایسا ہی فرما گئے ہیں ؎

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعدِ من ناید چو من مردِ فقیر!

عبد الحکیم ایم اے (علیگ)
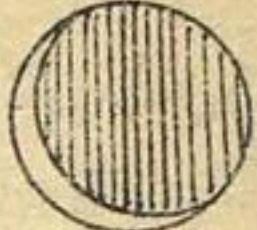
چاند

تمام اجرام فلکی میں سورج کے بعد ہم ساکنانِ زمین کے لئے چاند سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، جوار بھاٹا پر اسی کے اثرات پوری نوعِ انسانیت کے لئے خصوصی طور پر نہایت اہم ہیں۔ پھر اس کی شفاف سیمیں چاندنی ہماری راتوں کو کس درجہ پُر کیف بنا جاتی ہے فضائے آسمانی میں وہ ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے اور اسی لئے وہ ہمیشہ سے ہماری توجہات کا مرکز رہا ہے ورنہ محض جسامت کے نقطۂ نظر سے وہ اس درجہ قابلِ لحاظ نہ تھا۔ فلکیات کی نشو و ارتقا سے چاند کا خصوصی تعلق رہا ہے، زمین کے گرد اس کی گردش کو نیوٹن نے اپنے اصول کشش کی صحت کو جانچنے کے لئے معیار کے طور پر استعمال کیا۔ چاند کی حرکات کے تفصیلی مطالعہ نے اس اصول کی صحت کو پورے طور پر ثابت کر دیا۔ ماہرینِ فلکیات نے پوری پوری عمریں اس کے مطالعہ و مشاہدہ میں صرف کر دی ہیں۔ کسوف و خسوف کے مناظر اور مدوجزر کے مسائل پر اتنا سارا لٹریچر تیار ہو چکا ہے کہ فلکیات جدید کے یہ مستقل شعبے بن چکے ہیں۔ پھر چاند اور زمین کے تکوینی نظریئے تکوینِ عالم کے عام نظریوں سے بڑی حد تک مشابہ ہیں۔

چاند کی حرکت ظاہری

چاند کی حرکتِ ظاہری کا مشاہدہ سورج کے مقابلہ میں زیادہ سہولت سے کیا جا سکتا ہے، ہلال جب اوّل اوّل نمودار ہوتا ہے تو آفتاب اگرچہ مغربی افق میں ڈوب چکا ہوتا ہے مگر چاند کا فاصلہ اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ تھوڑی ہی دیر میں چاند بھی غروب ہو جاتا ہے۔ دوسرے روز شام کو غروب آفتاب کے وقت چاند مغربی افق پر اوّل دن سے کچھ زیادہ بلند ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ چوبیس گھنٹے میں وہ سمت مشرق کی طرف حرکت کر گیا ہے۔ اس طرح اگر ہم چند روز تک برابر مشاہدہ کرتے رہیں تو ہم پائیں گے کہ چاند برابر مشرق کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور سورج سے اس کا فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ چودہ روز بعد جب سورج مغرب میں ڈوبتا ہے تو چاند مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اس طرح چاند نے ان چودہ دنوں میں سورج سے ۱۸۰ درجہ کا فاصلہ طے کیا ہے۔ اگر چند روز تک اور ہم اپنا مشاہدہ جاری رکھیں تو دیکھیں گے کہ اب سورج ڈوبنے کے وقت چاند مشرقی افق کے نیچے ہوتا ہے اور ابھی اس کے طلوع ہونے میں دیر ہوتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ چاند ایک ماہ میں زمین کے گرد اپنی گردش تمام کر لیتا ہے۔ اگر اس گردش کی ابتداء اس وقت سے فرض کی جائے جب چاند سورج کے قریب ہوتا ہے تو ابتدائی چودہ دنوں میں یعنی نصف ماہ تک سورج سے اس کا فاصلہ برابر بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن مہینہ کے آخری نصف میں وہ روزانہ سورج سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مہینہ ختم ہوتے ہوتے وہ بالکل سورج کے قریب پہنچ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہینہ کے آخری ایام میں (قمری مہینے مراد ہیں) وہ سورج سے کچھ ہی پہلے طلوع ہوتا ہے اور پھر دو تین روز کے لئے بالکل ہی غائب ہو جاتا ہے۔ اور کسی دن شام کو غروب آفتاب کے بعد مغربی افق پر دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔

یہ دو تین روز تک وہ غائب کیوں ہو گیا تھا اور اس درمیان میں وہ کہاں تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ غائب نہیں ہوا تھا۔

جینے کے نصف ثانی کے آخری ایام میں وہ زمین کے گرد اپنی مسافت طے کرتے کرتے بالکل سورج کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس لئے نظر نہیں آرہا تھا۔ دو تین روز میں جب سورج سے آگے بڑھ گیا تو دوبارہ مشرقی افق کی بجائے مغربی افق پر نمودار ہوا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ جب تک چاند سورج کے پیچھے یعنی اس کے مغرب میں تھا اُس وقت وہ طلوع آفتاب سے کچھ پہلے ہی طلوع ہوتا تھا۔ لیکن جب آگے بڑھ کر سورج کے مشرق میں پہنچ گیا تو اب سورج سے پہلے طلوع ناممکن ہوگیا۔ اب تو سورج کے طلوع ہونے کے بعد ہی طلوع ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہوتا یہی ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد چاند بھی مشرقی افق سے طلوع ہوجاتا ہے مگر سورج کی تیز روشنی میں نظر نہیں آتا۔ نظر اُس وقت آتا ہے جب شام کو سورج ڈوب چکا ہوتا ہے، اسی کو لوگ نیا چاند کہتے ہیں۔ ذیل کے خاکوں کا مطالعہ اس مطلب کی وضاحت کے سلسلہ میں مفید ہوگا۔

ماہتاب طلوع آفتاب سے ذرا پہلے۔

مشرقی افق

آفتاب قبل طلوع

ماہتاب غروب آفتاب کے بعد

مغربی افق

آفتاب بعد غروب

وہ تمام جاندار جنہیں سانس کیلئے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے چاند میں چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اِلّا یہ کہ وہ اپنے پاس آکسیجن اور ہوا کے ذخائر بھی موجود رکھیں۔ جہاں تک ہم معلوم کر سکے ہیں چاند اُس فضا سے یکسر محروم ہے جو کرۂ زمین کو ہر چہار طرف سے غلاف کی طرح لپیٹے ہوئے ہے۔ براہ راست بھی مشاہدہ سے یہ حقیقت صاف طور پر عیاں ہے۔ کامل سورج گرہن کے وقت بھی چاند کے اردگرد روشنی کا کوئی حلقہ دکھائی نہیں دیتا۔ کسی طرح کے بادل یا دُھند کا مطلق پتہ نہیں چلتا۔ چاند کا مرکزی حصہ اور کنارے سب صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ہوائی فضا کا غلاف چاند کے گرد ہوتا، ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ستارہ چاند کے پاس پہنچکر اچانک غائب ہوجاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ چاند کی اوٹ میں آجاتا ہے پھر یکایک دوسرے کنارے پر نمودار ہوتا ہے اگر کوئی ہوائی فضا ہوتی تو ستارہ ایکا ایکی غائب نہ ہوتا آہستہ آہستہ دھندلا اور مختصر ہوتے ہوتے بتدریج غائب ہوتا اور دوسری طرف دوبارہ ظہور کے وقت بھی یہ ساری کیفیتیں از سر نو رونما ہوتیں۔

چاند پر سیارات صغیر، کہکشاں اور طریق الشمس کی روشنی کے مناظر زمین کے مقابلہ میں زیادہ روشن اور واضح ہوتے ہیں۔ سورج کی آتشیں زبانوں کا مشاہدہ بھی وہاں بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہاں نہ تو گرد و غبار سے معمور کوئی فضا ہے، نہ دھند، دھواں، بادل اور کہر ہی ہیں۔ ہوا، شہاب ثاقب۔ ارورا۔ قوس قزح۔ ہالہ۔ شفق یکسر ناپید ہیں۔ فضائے ہوائی کے موجود نہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ چاند کے درجات حرارت کا تفاوت نہایت زبردست ہوتا ہے۔ جب سورج سمت الرأس میں ہو تو درجہ حرارت °15 درجہ فارن ہائٹ ہوتا ہے اور رات میں یہ حرارت کم ہوتے ہوتے صفر سے بھی °65 درجہ نیچے پہنچ جاتی ہے۔ چاند میں کہیں بھی پانی کے ذخائر نہیں اس لئے کہ سورج کی روشنی کسی مقام پر منعکس ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہوا اور پانی کے سبب سے سطح زمین پر جو تغیرات رونما ہوتے ہیں چاند ان سے بالکل محفوظ ہے۔ ایک ویران، سنسان ہُو کا مقام ہے۔ جہاں کسی طرح کی آبادی کا نشان سرے سے نہیں ملتا۔

چاند کا تفصیلی مشاہدہ

۱۶۱۰ء میں گیلیلیو نے سب سے پہلے دوربین کے ذریعہ چاند کا مشاہدہ کیا اور اُس وقت سے آج تک برابر کرۂ قمر تمام دوربین استعمال کرنے والوں کا مرکز توجہ بنا رہا ہے۔ چاند کے اولین طالب علموں میں سے سب سے پہلے ہیویلیس (Hevelius) نے سطح قمر کا ایک مکمل خاکہ شائع کیا۔ کامل ایک صدی تک یہ چاند کا بہترین خاکہ شمار ہوتا رہا۔ وادیوں اور پہاڑوں کے بیشتر مروجہ نام بھی ہیویلیس ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ ۱۶۵۱ء میں ریسیاولی (Riccioli) نے ایک دوسرا نقشہ شائع کیا اور پرانے ناموں کے بجائے وادیوں اور پہاڑوں کے نام حکماء اور سائینسدانوں کے نام پر رکھ دیئے۔ اس طرح کے تقریباً دو سو نام اب بھی استعمال میں ہیں۔ اس کے بعد سے متعدد نقشے شائع ہوئے۔

بالائے قمر بھورے میدان، پہاڑی سلسلے، چوٹیاں، ٹیلے، پہاڑیاں، کوہستانی فصیلوں اور بلند پہاڑوں سے گھرے ہوئے میدانات، کوہ آتش فشاں کے دہانوں کے حلقے، تاریک اور گہرے غار اور معمولی گڑھے۔ شگاف اور دراڑیں۔ خالی نالے۔ وادیاں اور روشن کرنیں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ روئے زمین کے مشاہد کی نظر سب سے پہلے سمندروں پر پڑتی ہے، پھر براعظموں پر۔ لیکن روئے قمر کی سب سے زیادہ نمایاں چیزیں اس کے میدان ہیں جنہیں قدماء سمندر کہا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ میدان پانی یا پگھلے ہوئے لاوا سے پُر تھے۔ اسی بناء پر شاید پچھلے لوگ انہیں سمندر کہتے تھے۔ ان میدانوں کے قدیم لاطینی ناموں میں سمندر کا تصور ہر جگہ موجود ہے۔ ماہرین فلکیات اب بھی جدید انگریزی مترادفات کے باوجود وہی قدیم لاطینی نام زیادہ تر استعمال کرتے ہیں۔ چھوٹی دوربینوں میں تو یہ میدان مسطح نظر آتے ہیں۔ لیکن زیادہ قوی دوربینوں میں دیکھنے سے نشیب و فراز۔ ٹیلوں، گڑھوں اور نالوں سے پُر نظر آتے ہیں۔ چاند میں جو دھبے دکھائی دیتے ہیں وہ انہیں نشیب و فراز کے سائے اور تاریکیاں ہیں۔

یہ بات کہ یہ میدانات کسی زمانہ میں سمندر تھے محتاج ثبوت ہے۔ البتہ اس قدر قطعی ہے کہ آج جس صورت میں یہ ہمیں دکھائی دیتے ہیں لاکھوں سال سے ایسے ہی چلے آ رہے ہیں۔ ویران، سنسان اور وحشت انگیز۔ درجات حرارت کا تفاوت یہاں اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ہم باشندگان زمین کو اس سے کہیں سابقہ نہیں پڑتا۔ پھر یہاں نشیب و فراز کی اتنی بہتات ہے کہ مجموعی سطح کا رقبہ معلوم کرنا دشوار ہے۔ البتہ اس قدر معلوم ہے کہ چاند کی کُل سطح کے نصف پر اسی طرح کے میدانات ملتے ہیں۔

بحرامبریم (Mare Imbrium) ایک عظیم الشان بیضوی میدان ہے۔ جس کا طول ۷۵۰ میل ہے، تین طرف یہ پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن مشرقی جانب بالکل کھلا ہوا ہے۔ بے شمار میدان چھوٹے بڑے رقبہ کے گنائے جاسکتے ہیں۔ یہاں ان سب کی تفصیل مقصود نہیں۔ اسٹریٹ (straight) ایک نہایت خوش منظر سلسلہ ہے۔ جس میں بارہ یا زیادہ بلند چوٹیاں ایک سیدھی قطار میں واقع ہیں۔ جس کا طول ۴۵ میل ہے۔ چاند کے پہاڑی سلسلوں کی چوٹیوں کی اوسط اونچائی پانچ ہزار سے بارہ ہزار فٹ تک ہے بعض کی اونچائی اٹھارہ ہزار فٹ بھی ہے۔ روئے قمر کے جملہ مناظر میں سب سے زیادہ حیرت انگیز روشن شعاعوں کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل ابھی تک سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ اگرچہ معمولی دوربینوں میں بھی یہ صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کی ماہیت یکسر پردۂ راز میں ہے۔ یہ شعاعیں روشن، سفید اور پتلی دھاریوں کی شکل میں آتش فشانی دہانوں سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ تقریباً سو دھاریاں اس طرح کی معلوم ہیں۔ بعض بعض تو روئے قمر پر سو سو میل دور نکل جاتی ہیں اور تب جاکر کہیں ختم ہوتی ہیں۔ بلندیوں پر یہ نہیں ملتیں صرف میدانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے اندر کسی قسم کا تغیر بھی نہیں محسوس کیا جاسکا ہے ٹائکو، کوپرنیکس، کیپلر، ارسٹارکس (Kepler - Copernicus - Tycho) کے دہانوں سے نکلنے والی شعاعیں سب سے زیادہ طویل اور خوش منظر ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ٹائکو کی شعاعیں طویل ترین اور حسین ترین ہیں۔ ان درخشاں شعاعوں کی اصلیت کسی کو نہیں معلوم۔ ممکن ہے روئے قمر کے شگافوں اور درازوں میں درخشاں ذرات کے ذخائر موجود ہوں۔ مگر بہرحال یہ محض ایک طرح کی قیاس آرائی ہے۔

قدرتی ساخت ماہرین فلکیات اس بارے میں متفق نہیں کہ چاند کی موجودہ قدرتی ساخت میں کن کن اسباب کی کارفرمائی رہی ہے۔ اس باب میں ایک نظریہ تو وہی ہے جسے آتش فشانی نظریہ سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے چاند کے کوہستانی دہانے craters آتش فشاں پہاڑوں کے مرکز قرار پاتے ہیں اور بھورے میدانات انہی دہانوں سے نکلے ہوئے مادے، لاوا، راکھ اور پگھلی ہوئی چٹانوں کے مجموعہ سے مرکب ہیں۔ دوسرا مشہور نظریہ شہابی نظریہ ہے۔ اس کی رو سے چاند کی ساخت کے ابتدائی دور میں یعنی اب سے اربوں سال پہلے بکثرت شہاب ثاقب ٹوٹ پھوٹ کر چاند میں گرے اور چاند کی صورت ویسی بنادی جیسی کہ وہ آج ہم کو نظر آرہی ہے۔ ابتداء میں لوگ شہابی نظریہ کے زیادہ قائل تھے۔ لیکن پروکٹر (Proctor) نے شہابی نظریہ کے حق میں متعدد دلائل پیش کئے۔ اس وقت ہر دو نظریوں کے مویدین کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ ہر دو جانب سے بحث و نظر کے پورے پورے انبار پیش کئے جاتے ہیں۔ آتش فشانی نظریہ کے خلاف یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ چاند کے مبینہ آتش فشانی دہانے ہونے کے لئے اُن کے اِرد گرد کا لاوا اور ملبہ مخروطی وضع کا ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ سطح قمر کا اتنا بڑا حصہ آتش فشاں پہاڑوں ہی سے ڈھکا ہوا ہے۔ زمین کے رُخ پر تقریباً تیس ہزار دہانے craters دیکھے جاچکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تمام میدانوں کا اپنی ساخت کے لئے ان آتش فشانوں کا مرہونِ منت ہونا اور زیادہ ناقابلِ فہم ہے۔ ایک تیسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ آتش فشانی دہانے روئے قمر پر ہر چہار طرف بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں۔ روئے زمین کی طرح سے اُن کی ترتیب کسی خاص پرت کی کمزوری کا پتہ نہیں دیتی۔

آتش فشانی نظریہ کے مویدین میں سے گڈ ایکر Goodacre نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ روئے قمر پر روشن دہانوں کی موجودگی اس نظریہ کی تائید میں سب سے بڑا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مرکزی علاقہ میں ایک مختصر سا دہانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سفید مادہ جس سے کہ روشنی کی دھاریاں پیدا ہوتی ہیں اسی سے نکل کر پھیلا ہے۔ بعض ٹیلوں اور پشتوں میں سے

نکلنے والی روشنی اس نظریہ کے حق میں مزید ثبوت مہیا کرتی ہے۔ شہابی نظریہ کے خلاف سب سے اہم دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ زمین اور چاند غالباً ابتداء ہی سے سورج کے گرد گردش کرتے چلے آرہے ہیں۔ بس جتنے شہاب ثاقب کرۂ قمر پر گرے ہوں گے اُتنے ہی یا کچھ زیادہ ہی کرۂ ارض پر گرنے چاہئیں۔ اس لئے کہ زمین کی جسامت زیادہ ہے۔ لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ چاند کے مقابلہ میں زمین پر اُن کی تعداد اور مقدار تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ چاند میں گرنے والے شہاب کی تعداد اور مقدار زمین سے بھی زیادہ فرض کی جائے اور پھر اُن کے اثرات اتنے دُور رس اور عظیم الشان فرض کئے جائیں کہ چاند کا پُورا وجود انہی کا رہین منت بن کے رہ جائے۔

جدید شہابی نظریہ

نظریہ شہابی کی ایک جدید ترقی یافتہ شکل وہ ہے جسے Explosive Meteric Theory کہتے ہیں اور غالباً تمام نظریوں میں یہ سب سے زیادہ قابل قبول بھی ہے۔ طبیعات کی رُو سے شہاب ثاقب اپنی پوری رفتار کے چلنے کے دوران میں جب اچانک رُکتا ہے تو اس کے اندر اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ ناقابل بیان زور کے دھماکے کے ساتھ وہ پھٹ پڑتا ہے۔ شہاب جو ۴۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اُڑ رہا ہو ڈائنا میٹ کے مقابلہ میں چار سو گنا زیادہ توانائی رکھتا ہے اور یہ واضح رہے کہ بیشتر شہاب اس سے کہیں زیادہ رفتار کے ساتھ پرواز کرتے ہیں۔ ۴۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اُڑتا ہوا شہاب اگر چاند سے متصادم ہو اور اس تصادم کے نتیجہ میں ½ سیکنڈ میں اس کی پرواز اچانک ختم ہو جائے تو اس کے اندر اتنی قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اسی ½ سیکنڈ کے وقفہ میں چاند کے اندر دو میل کی گہرائی تک گھس جائے گا۔ اس پارہ شہاب کو غبار کی طرح اُڑا دینے کے لئے جتنی قوت کی ضرورت ہوگی اُسے نظر انداز کر دینے کے بعد بھی جو قوت بچتی ہے ڈائنا میٹ کے مقابلہ میں چار سو گنا زائد ہوتی ہے۔ جو ایک بے پناہ دھماکے کا موجب بنتی ہے جو ارد گرد کی ہر چیز کو چکنا چور کر کے ریزہ ریزہ کر ڈالتا ہے۔ کشش قمر چونکہ زمین کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس لئے معمولی جسامت اور رفتار کے شہاب بھی حیرت انگیز طور پر بڑے دہانوں کا سبب بن سکتے ہیں۔ چاند میں چونکہ ہوائی فضا نہیں ہے اس لئے شہابوں کے چاند سے تصادم کی راہ میں سرے سے کوئی روک نہیں۔ بخلاف اس کے یہی شہاب جب فضائے زمین میں پہنچتے ہیں تو ان کی تیز رفتاری اوّل ہوا کے آکسیجن کو جلا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں یہ خود جل کر راکھ کی طرح فضا میں اُڑ جاتے ہیں۔ اب یہ غبار ...... جب سطح زمین پر پہنچتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ بے ضرر ہوتے ہیں بلکہ گوناگوں فوائد کے حامل ہوتے ہیں۔ جدید شہابی نظریہ چاند کے میدانوں کی اطمینان بخش توجیہ کرتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ میرا امبریم (Mare Imbrium) کم از کم چار میل کے قطر کے کسی شہاب کے تصادم کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ جو ۴۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے مصروف پرواز تھا۔ یہ نظریہ "قمری سمندروں" کے سیاہ رنگ کی بھی بہتر توجیہ پیش کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر درخشاں شعاعوں کے مسئلہ کا حل ہی جو اسی نظریہ کی روشنی میں قابل قبول ٹھہرتا ہے۔ کوئی شہاب جب سطح قمر سے متصادم ہو کر گہرائی میں گھستا ہے تو اندرون قمر کے رقیق ذخائر اچھل کر سطح قمر میں شگاف ڈال دیتے ہیں۔ جن میں یہ رقیق مادے بھر کر رفتہ رفتہ منجمد ہو جاتے ہوں گے جہاں سے روشنی کی شعاعیں نکل نکل کر سطح قمر پر دُور تک پھیل جاتی ہیں۔

فاصلہ، رفتار، مسیر اور روشنی

تمام اجرام سماوی میں چاند ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے۔ زمین سے وہ ایک مخصوص فاصلہ پر ہے۔ مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ زمین سے اس کا اوسط فاصلہ دو لاکھ اڑتیس ہزار آٹھ سو ستاون میل ہے۔ کرۂ ارض کے گرد چونکہ وہ ایک بیضوی دائرہ میں گردش کرتا ہے

اس لئے انحراف (eccentricity) کی بدولت یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ترپن ہزار میل اور کم سے کم دو لاکھ بائیس ہزار میل ہو سکتا ہے۔ ان اعداد پر نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ چاند کا فاصلہ زمین کے نصف قطر کا ساٹھ گنا ہے۔ عام طور پر خاکوں اور نقشوں میں چاند کو زمین سے بالکل قریب دکھایا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے بجائے صحیح فاصلہ زمین کے نصف قطر کا ساٹھ گنا یاد رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اب کہ ہم چاند کا فاصلہ اور اس کا مسیر جان گئے ہیں۔ اس لئے اس دائرے میں اس کی رفتار فی گھنٹہ معلوم کرنا آسان ہوگا۔ یہ رفتار تقریباً دو ہزار تین سو میل فی گھنٹہ یعنی ایک عمدہ بندوق (high power gun) کی گولی کی رفتار کے برابر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنے دائرۂ گردش میں چاند فی گھنٹہ ۳۳ دقیقہ فی گھنٹہ (اپنے قطر سے کچھ زیادہ) کی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔ دُور بینی مشاہدہ کے ذریعہ چاند کا قطر نکالا جا سکتا ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ معلوم ہے۔ اس لئے جسامت کا مسئلہ آسان ہے۔ قطر تقریباً ۲۱۶۰ میل یا زمین کے قطر کا چوتھائی ہے۔ اور بیرونی سطح کا رقبہ زمین کی سطح کا ۱/۱۴ (چودھواں حصہ) اور حجم زمین کے حجم کا ۱/۴۹ (اُنچاسواں حصہ) ہے۔ نظام شمسی میں بعض توابع چاند سے بڑے بھی ہیں۔ لیکن مرکزی سیارے کی نسبت کے لحاظ سے چاند سے بڑا کوئی نہیں۔ چاند کا ثقل (density) زمین کے ثقل کا ۰،۶ ہے اور پانی کے ثقل کا ۳ ۱/۲ گنا ہے۔ اور سطح پر کی کشش زمین کی کشش کی ۱/۶ ہے۔ ایک آدمی جس کا وزن ۱۷۵ پونڈ ہو چاند پر ۲۹ ۱/۶ پونڈ کا رہ جائے گا۔ پتھر کا ایک ٹکڑا یا ڈھیلا زمین پر جتنی دُور پھینکا جا سکتا ہے چاند پر اس سے چھ گنے فاصلہ پر پھینکا جا سکے گا۔ ثقل کی کمی کے سبب اس طرح کے بہت سے عجائبات پیش آئیں گے۔ چاند کی روشنی سورج سے مستعار ہے۔ چاند کا کوئی مقام ایسا نہیں جو از خود روشن ہو۔ دُور بینی مشاہدے کے ذریعہ یہ حقیقت پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ پھر چاند کی روشنی کا تجزیہ بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ فی الواقع سورج ہی کی روشنی ہے۔ علمائے فلکیات سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ سورج کے مقابلہ میں چاند کی روشنی کا کیا درجہ ہے۔ اتنا جان لینا چاہیئے کہ اس نسبت کو صحیح طور مشخص کرنا آسان نہیں ہے۔ البتہ چاند کی روشنی اس اندازے سے کہیں کم ہے جو عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں۔ ماہ کامل سورج کے مقابلہ میں صرف ۱/۴۶۵۰۰۰ حصہ روشنی دیتا ہے۔ سال بھر میں جس قدر چاندنی ہم تک پہنچتی ہے اس سے کہیں زیادہ روشنی سورج سے ہمیں چند سیکنڈ میں مل جاتی ہے۔ چاند جب تربیع میں ہوتا ہے (ایک ہفتہ کا چاند) تو اس کی روشنی سورج کی روشنی کا ۱/۱۰۰۰۰۰ حصہ ہوتی ہے۔ فوٹوگراف کے مشاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند سورج کی روشنی کے مقابلہ میں زرد ہے۔ ماہ کامل سے معمور اگر پانچ آسمان لائے جا سکیں تو مقابلہ میں سورج کی روشنی کے برابر ہو سکیں گے۔

مہینے کی مقدار کا تصور

چاند کی رفتار کے مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مہینہ میں زمین کے گرد اپنا ایک چکر تمام کر لیتا ہے۔ جب چاند اپنا سفر کسی مخصوص ستارے سے شروع کر کے اور زمین کے گرد اپنی گردش تمام کر کے دوبارہ اس کے پاس پہنچ جاتا ہے تو اسے دَورِ نجومی (Sidereal Periods) کہتے ہیں۔ اس کی اوسط مقدار ۲۷ دن ۷ گھنٹے ۴۳ منٹ ۱۱،۵ سیکنڈ ہے۔ اسے ماہ نجومی بھی کہتے ہیں۔ چاند کی روزانہ کی اوسط رفتار ۱۳ درجہ ۱۰،۵۸ منٹ ہے۔ دَورِ نجومی کے علاوہ اقترانی دَور (Synodic Periods) بھی ہوتا ہے۔ جب چاند کی گردش کی ابتدا سورج سے یا سورج کے مشرق و مغرب کے کسی مخصوص فاصلے سے ہوتی ہے اور گردش تمام ہونے کے بعد چاند پھر سورج کے پاس پہنچ جاتا ہے یا چاند سورج کا درمیانی فاصلہ وہی ہو جاتا ہے جو ابتدا میں تھا۔ تو یہ

دَور اقترانی دَور Synodic Period کہلاتا ہے۔ یہ دَور ۲۹ دن ۱۲ گھنٹے ۴۴ منٹ ۲.۸ سیکنڈ کا ہوتا ہے اور اسی سے ہم نے ایک مہینہ کی مقدار کا تصور حاصل کیا ہے۔ قمری مہینے ۳۰ یا ۲۹ دن کے ہوتے ہیں اور شمسی مہینے بھی انہی مہینوں میں خفیف سی ترمیم کے ساتھ مرتب کر لئے گئے ہیں۔

چاند کے طلوع و غروب کے اوقات ہم سب کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر اس کا سمجھنا خاصا پیچیدہ ہے۔ یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہے کہ چاند روزانہ بڑی سرعت کے ساتھ بجانب مشرق حرکت کرتا رہتا ہے۔ آسمان میں روز اس کی جگہ ستاروں اور برجوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ طریق الشمس سے اس کا بُعد بھی برابر بدلتا رہتا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر طلوع و غروب کے اوقات میں قدرے پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ماہ کے دوران میں چاند طریق الشمس سے کبھی بجانب شمال اور کبھی جنوب میں ہوتا ہے۔ دو دن میں ایک برج کا فاصلہ طے کرتا ہوا وہ پورے آسمان کا ایک دور مکمل کر لیتا ہے۔

خاتمہ ہم کرۂ زمین پر بسنے والوں کے لئے چاند کے فوائد بے شمار ہیں۔ اس کی خنک اور شفاف چاندنی سے تقریباً سبھی عرض البلاد روشن رہتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ہم قطبین کی طرف بڑھتے ہیں اس کے فوائد اور اثرات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ قطبین کے قریبی عرض البلاد میں جبکہ سورج ایک بار غروب ہونے کے بعد عرصہ دراز تک نظر نہیں آتا، چاند ہی لمبی اور تاریک راتوں کو روشن رکھتا ہے۔ سورج ہی کی طرح وہ مسلسل ہفتوں چمکتا رہتا ہے۔ پھر چاند کی ایک پوری گردش مہینے کی مقدار کو متعین کرتی ہے۔ چاند کا سب سے بڑا فائدہ مد و جزر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ سمندر میں پانی روزانہ دو بار چڑھتا اترتا ہے۔ کرۂ ارض کی گردش یومی کے سبب سمندر مسلسل چاند کے مقابل آتے جاتے ہیں۔ اور کشش قمر کے سبب پانی کئی کئی گز چڑھ جاتا ہے۔ چاند فضائے آسمانی میں اگر کہیں گم ہو جائے تو سب سے پہلی زد جہازرانی پر پڑے گی کیونکہ جہاز اگر بندرگاہوں میں یا تو داخل نہ ہو سکیں گے یا پھر وہاں سے نکل نہ پائیں گے۔ مسافروں اور تجارت کے نقصانات بے اندازہ و بے قیاس ہوں گے۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین!

محمد عبد اللہ ایم اے
(گورنمنٹ مدرسہ سلہٹ)

اُردو زبان و ادب کی دینی و اخلاقی خدمات

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بعض فساد پسند عناصر نے اس مملکت میں جان کر صوبائی عصبیتوں کو اُبھارا ہے۔ مثال کے طور پر اُردو زبان ہی کو لے لیجئے تقسیم ہند سے پہلے مہاسبھائی ہندوؤں کے سوا کوئی فرد، گروہ، جماعت یا صوبہ، اُردو کا مخالف نہ تھا۔ بلکہ اس حقیقت کا کھُل کر اعتراف کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں جو زبان سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ اُردو اور صرف اُردو ہی! مگر پاکستان بننے کے بعد اُردو کے مقابلہ میں اُن زبانوں کو لایا گیا جو نہ پہلے کبھی اُردو کی حریف تھیں اور نہ اب ہیں۔ زبانیں اور علم و ادب ایک دوسرے کے حریف نہیں ہوا کرتے۔ مگر یار لوگوں نے یہ حریفانہ کشمکش پیدا کردی!

پاکستان کے بعض صوبوں کے شاعروں کو علامہ اقبال کے مقابلہ میں لایا جا رہا ہے۔ اگر یہ شعراء واقعی اتنے ہی عظیم شاعر تھے تو پاکستان بننے سے پہلے ان شاعروں کے قدردان اور عقیدت مند کس گوشہ میں سوئے ہوئے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد وہ ایکا ایکی جاگ پڑے اور اب انھیں اپنے شاعروں کی عظمت و مرتبت کا احساس ہوا۔

پاکستان وحدتِ اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اور یہی وحدت پاکستان کی شیرازہ بندی کا سبب ہے۔ اس اعتراف کے بعد یہ بھی واقعہ ہے کہ وحدتِ اسلام کے بعد جو چیز پاکستان کی شیرازہ بندی میں سب سے زیادہ مفید و معاون ثابت ہوسکتی ہے وہ "اُردو زبان" ہے۔

مشرقی پاکستان میں کمیونسٹوں اور مہاسبھائی ہندوؤں نے اُردو کے خلاف بنگلہ زبان کا محاذ قائم کیا ہے اور ان لوگوں نے اس عصبیت اور حریفانہ کشمکش کو آخری نقطہ پر پہنچادیا ہے! زبانوں کے درمیان یہ پیدا کی ہوئی رقابت کوئی اچھے نتائج پیدا نہیں کرسکتی!

ہم یہ مضمون جو ایک خالص بنگالی تعلیم یافتہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے، اس غرض سے پیش کر رہے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ مشرقی پاکستان میں اُردو زبان کے بہت سے چاہنے والے موجود ہیں!

صوبائی عصبیتوں کا نشہ انشاءاللہ ایک نہ ایک دن اُتر کر رہے گا اور پھر ہر چیز اپنا وہی مقام حاصل کرے گی جس کی وہ مستحق ہے!

(م ۔ ق)

اُردو زبان و ادب نے ہندو پاک میں وہ دینی و مذہبی خدمات انجام دی ہیں جو یہاں کی کسی اور زبان و ادب کو نصیب نہیں ہوئیں۔ اُردو زبان نے تجوید، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، کلام، تصوف، پند و نصائح۔ غرض اخلاق و اسلام کا وہ ذخیرہ اپنے اندر جمع کیا ہے کہ ہندو پاک کی اور زبانیں تو ایک طرف رہیں۔ خود فارسی زبان بھی جو اُردو کی ماں ہے، اس عز و شرف سے محروم ہے۔ اس نے اہل عرب و فارس کے پودے اسلامی ادب کو اپنے میں سمونے کے بعد بھی بس نہیں کیا۔

بلکہ اپنی فطری صلاحیت کے بل پر اسلام کے مختلف گوشوں کے لئے ایسی نادر چیزوں کو بھی پیش کیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اولیت کا حکم رکھتی ہیں۔ بعض بعض کا معیار تو اتنا بلند ہے کہ ان کی مقبولیت و شہرت ہند و پاک تک محدود نہیں رہی بلکہ بیرونی ممالک تک اُن کا ڈنکا بجا۔ بعض بعض ترجمے ایسے بھی ہیں کہ اُن پر اصل کتاب کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس زبان میں پیغمبرانِ دین کی سیرتیں، صحابۂ کرام اور بزرگانِ دین کے تفصیلی حالات۔ تاریخ اسلام کے دوسرے تمام واقعات۔ غرض مذہب اسلام کے تمام پہلوؤں پر کم و بیش تصنیفات و تالیفات ملتی ہیں۔

یوں تو ہند و پاک میں دین و مذہب پر عربی و فارسی کی تصنیفات و تالیفات کی ہمیشہ بہتات رہی۔ اور بیرونی ملکوں سے بھی علوم دینی اور مسائل شرعی کا مواد اور مسالہ یہاں پہنچتا رہا۔ پھر بھی جہاں تک افادیت کا تعلق ہے۔ اُردو زبان کی خدمات تمام زبانوں سے آگے ہی رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی اور عربی کی کتابیں طبقۂ علماء کے لئے تو مفید ہیں مگر عربی و فارسی سے ناواقفیت کی بناء پر عوام اُن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اُردو ایسی زبان ہے جو ہند و پاک کے گوشہ گوشہ میں کم و بیش سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں غیر اُردو زبانوں میں اب تک اس قدر مذہبی سرمایہ نہیں ہے جو دین و مذہب کے ہر پہلو پر ہر حیثیت سے حاوی ہو۔ اسی لئے عوام کو دینی مسائل و موضوعات سے واقف ہونے کے لئے اُردو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلوب بیان اور طرز کلام کا تعلق ہے۔ اردو کی کتابیں ایک حد تک عربی و فارسی کی کتابوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ اس لئے کہ اُردو والوں نے عربی اور فارسی سے مواد لے کر جوں کا توں اُردو کا لباس نہیں پہنادیا ہے۔ بلکہ حذف و اضافہ کے بعد انھیں حکیمانہ نقش و نگار اور بناؤ سنگھار کے ساتھ پیش کیا۔ اُردو کی دینی خدمت کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی مذہبی درسگاہوں میں اُردو ہی کے ذریعہ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ اسلام۔ غرض تمام دینی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ علماء کرام اور بزرگانِ دین زیادہ تر اسی میں وعظ و نصیحت کیا کرتے ہیں۔ میلاد خوانی اسی میں ہوتی ہے۔ اسی میں فتوے شائع کئے جاتے ہیں۔ مناجاتوں میں زیادہ تر اسی کی دعائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اُردو غزل اور نعتیہ اشعار کے بغیر محفلوں اور جلسوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔

خدمتِ دین زبانِ اُردو کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ہند و پاک میں اشاعت اسلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت بلکہ اس سے بھی قبل یہاں عربی نسل کے واعظ، مبلغ، صوفی اور علمائے کرام ملک کے مختلف حصوں میں آتے رہے۔ ان بزرگانِ دین کا مقصد تعلیم دین اور تلقین اخلاق تھا۔ اس بات کو سب جانتے ہیں کہ علمائے کرام اور بزرگانِ دین کا عوام سے کس قدر گہرا لگاؤ رہتا ہے۔ عوام اپنی عقیدت مندی سے اُن کے پاس کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اور وہ بھی عوام کے دل موہ لینے کے لئے اُنہی کی بول چال اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ بزرگانِ کرام اور اکابر دین جو وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے۔ اپنی اشاعت دین میں اُردو زبان ہی کو جو اب تک بالکل ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ استعمال کرتے رہے۔ اور عوام بھی اُن کے اخلاقی نکات، صوفیانہ اسرار، عاشقانہ راز و نیاز سے متاثر ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کے گاؤں، اطراف کے اطراف مسلمان ہوتے گئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ زبانِ اُردو مذہبی اور صوفیانہ اصطلاحات و روایات سے مالا مال ہونے لگی۔ بابا فرید شکر گنج، امیر خسروؒ، قطب عالم، شاہ عالم۔ سید محمد جونپوری، شیخ بہاؤالدین باجن۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ شاہ محمد غوث گوالیاری وغیرہ انہی بزرگوں میں سے

ہیں۔ ان صوفیائے کرام میں بعض ہستیاں ایسی بھی گزری ہیں جن کی اُردو میں مستقل تصانیف پائی جاتی ہیں۔ شیخ عین الدین گنج العلم کے مذہبی رسالے۔ خواجہ گیسو دراز کی "معراج العاشقین" سید محمد عبدالحسین کا ترجمہ "نشاط العشق" شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری کی "شرح مرغوب القلوب" میران یعقوب کا ترجمہ "شمائل الاتقیاء اور دلائل الاتقیاء" اس سلسلہ کی قابلِ ذکر یادگاریں ہیں۔ ان تمام کتابوں نے جو اسلام کے مختلف عنوانات کا مرقع ہیں۔ تبلیغ و اشاعت کا بہت ہی مفید کام انجام دیا۔

اُردو شاعری نے تثبیت حق اور توثیق دین میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اصول دین سے لے کر مسائل شرعی تک کو اپنے اندر جگہ دی ہے۔ قدیم شعراء پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعری کا آغاز مذہبی افکار سے ہوتا ہے۔ اُن کی اخلاقی اور صوفیانہ شاعری دین و مذہب کے لئے بڑی حد تک معین و مددگار ثابت ہوئی۔ اُردو کے سب سے پہلے شاعر ولی دکنی ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ اُن کی شاعری کا خاصہ حصہ مناجات، اوراد اور مناقب پر مشتمل ہے۔ دور اول کے اکثر شعراء مثلاً شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں قابل ذکر صوفی صاحب وجد و حال تھے۔ اُن کی شاعری اخلاق و اسلام ہی کے اردگرد گھومتی تھی۔

دورِ متوسط کے شاعر میر اور سودا تک کے یہاں بھی اخلاق و تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ خواجہ میر درد کا نام نہ لیا جائے تو بڑی ناانصافی ہوگی۔ ان کی شاعری اخلاق و تصوف، پند و نصائح کی آئینہ دار ہے۔ انشاء و سودا کے قصائد جو حمد و نعت اور منقبت پر مشتمل ہیں ادب میں ایک وزن رکھتے ہیں۔ انیس و دبیر کے مرثیوں میں ایثار نفسی اور حق پرستی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ منشی امیر مینائی کی نظمیں جو انہوں نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نعت میں کہی ہیں، حقیقت میں گراں مایہ مذہبی قدریں ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری اسلامی معاشرت و روایات اور اسلامی تہذیب و تمدن کے زندہ کرنے کی ایک زبردست کوشش تھی۔ اقبال کی اسلامی شاعری "شاعری جزویست از پیغمبری" کا مصداق، حدیث و قرآن کا مرقع، اور آثار و روایات کا خلاصہ ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے اسلامی ادب کا وہ ذخیرہ چھوڑا ہے جو ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دے گا۔ دُوسرے شاعروں نے بھی اسلام و اخلاق کے موضوعات پر بلند پایہ نظمیں کہی ہیں۔ حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" اسلامی تاریخ کا ایک گلدستہ ہے۔ اردو نظم کی دینی و مذہبی خدمت یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ قرآن مجید اور حدیثوں کا ترجمہ بھی نظم اُردو میں ہو چکا ہے۔ نواب وحید الزماں حیدرآبادی کا منظوم ترجمہ "وحید التفسیر" احمد کبیر الدین حیدرآبادی کا منظوم ترجمہ "شمائل ترمذی" اس سلسلہ کی قابل ذکر یادگاریں ہیں۔

اُردو نثر نے نظم سے کہیں زیادہ اسلام و اخلاق کی خدمات انجام دی ہیں۔ دین اسلام کا ایسا کوئی رُخ نہیں جس پر اُردو میں قلم نہ اٹھایا گیا ہو۔ اُردو نے اپنے ترجموں سے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا۔ جس وقت ہند و پاک میں غیر اُردو زبانوں میں قرآن و حدیث کا کوئی مکمل ترجمہ وجود میں نہیں آیا تھا اسی وقت اُردو نے مذہب کی وہ خدمت انجام دی کہ ہند و پاک کے مسلمان اس کے بار احسان سے گردن اُٹھا نہیں سکتے۔ یوں تو قرآن مجید کے متعدد ترجمے وجود میں آئے ہیں مگر مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی۔ مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسین دیوبندی۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا فتح محمد جالندھری۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور مولانا احمد علی لاہوری کے تراجم قرآن شاہ پاروں کے حکم رکھتے ہیں۔ ان ترجموں کو ارتقائے فن تفسیر کا سنگِ نشان سمجھنا چاہیے۔

ان ترجموں نے بے حد فائدے پہنچائے۔ جن کو عربی زبان پر پوری قدرت نہیں ہے یا جو اس سے بالکل ناآشنا ہیں۔ وہ ان ترجموں سے متن قرآن کو ایک حد تک سمجھ لیتے ہیں۔

علم تفسیر میں بھی درجنوں کتابیں زبان اردو میں تصنیف کی گئیں۔ مولانا عبد القادر دہلوی کی "موضح القرآن" مولانا عبد الحق حقانی کی "تفسیر حقانی" مولانا ابو الکلام آزاد کا "ترجمان القرآن"، مولانا اشرف علی تھانوی کا "بیان القرآن" ادب اور فن کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ تفسیر و حدیث کا ہر طالب علم ان کتابوں سے واقف ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ علم حدیث میں مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ترجمہ "مشکوٰۃ"، مولانا قطب الدین صاحب کے "مظاہر حق" نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ "مظاہر حق" کی شہرت و مقبولیت ہند و پاک کے گوشہ گوشہ میں ہے۔ شروح حدیث میں اسی کتاب نے سب سے زیادہ قبول عام کی سند حاصل کی ہے۔

اُردو زبان کے اس دور ترجمہ میں مختلف مذہبی مناظرے اور مباحثے یہ چاہے وہ مسلمانوں کے آپس کے ہوں یا مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان ہوئے ہوں، کتابی شکل میں وجود میں آئے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی، مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی اور مولانا قاسم صاحب نانوتوی جیسے بزرگ زبان اُردو میں ردِ مخالفین و معاندین پر مختلف کتابیں لکھ کر انھیں حقیقتِ اسلام سے روشناس کراتے رہے۔ مولوی چراغ علی صاحب کے اکثر مضامین مذہبی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اُن کے ساتھ عیسائیوں کے مناظرے ہوتے رہے اور اسی سلسلہ میں انہوں نے زبان اُردو میں کافی مضامین لکھے ہیں۔ سر سید احمد نے بھی علاوہ تفسیر قرآن کے بہت سے اخلاقی مضامین لکھ کر مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

یوں تو علم کلام پر اُردو میں مختلف کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مگر مولانا شبلی کا "الکلام"، مولانا عبد الحی صاحب کی خلاصۃ العقائد، مولانا خلیل احمد صاحب کی "آیات اللہ الکاملہ" (ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ) مولانا سید اسحاق علی صاحب کا "جدید علم کلام یعنی سائنس اور اسلام"، خاص درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا اسحاق صاحب نے "جدید علم کلام" کے ذریعہ موجودہ سائنس کی روشنی میں مسائل عقائد کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسائل شرعیہ کو جاننے کے لئے مسلمانوں کو فقہ کی سخت ضرورت ہے۔ عربی و فارسی میں فقہ کی سینکڑوں کتابیں وجود میں آئی ہیں۔ مگر فارسی اور عربی سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے عوام اُن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اُردو زبان نے ان کی اس مانگ کو اُس وقت پورا کیا جب ہند و پاک کی کسی اور زبان میں کوئی جامع و مانع کتاب وجود میں نہیں آئی تھی۔ آج کل بھی قرآن و حدیث، سیرت و تاریخ وغیرہ پر غیر اُردو زبانوں میں بہت سی کتابیں ملتی ہیں مگر فقہی سرمایہ کا دامن بہت تنگ ہے۔ اُردو اس فن میں بھی کافی سرمایہ رکھتی ہے۔ مولانا شاہ عبد العزیز کا "فتاویٰ عزیزی" مولانا اشرف علی تھانوی کا "فتاویٰ اشرفیہ"، "امداد الفتاویٰ"، "بہشتی گوہر"، "بہشتی زیور"۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کا "فتاویٰ رشیدیہ"، مفتی عزیز الرحمٰن اور مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا "فتاویٰ دار العلوم دیوبند"، مولانا خرم علی و احسن صدیقی کی غایت الاوطار (شرح در المختار)، مولانا امیر علی ملیح آبادی کا ترجمہ "فتاویٰ عالمگیری" وغیرہ مستند کتابیں ہیں۔ مولانا عبد القادر صاحب کی "خلاصۃ المسائل" مفتی کفایت اللہ صاحب کی "تعلیم الاسلام"۔ مولانا کرامت علی صاحب کی "راہ نجات" اور "مفتاح الجنۃ" گو چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں مگر ان کتابوں نے عام مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ملک کا ایک ایک فرد جانتا ہے۔!

اسلام کی روایات و ثقافت، تاریخی عظمت، مسلمانوں کے سابقہ کارنامے، اُن کے بلند خیالات اور اولوالعزمیوں کو جاننے میں اُردو زبان و ادب نے ہمیں کافی امداد بہم پہنچائی ہے۔ اُردو میں تاریخ و سیرت پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُردو کے جلیل القدر ادیب مولانا شبلی کا "الفاروق"، "المامون"، "سیرۃ النعمان"، "الغزالی" اور "سیرۃ النبیؐ"، جسٹس امیر علی کی "تاریخ اسلام"، اسلم جیراج پوری کی "تاریخ الامت"، سلطان جہاں بیگم کی "سیرۃ مصطفےٰ"، مولانا عبدالرؤف صاحب دانا پوری کی "اصح السیر" خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مولانا شبلی کی "سیرۃ النبیؐ" سے صرف عوام نہیں بلکہ خواص بھی فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ اس کتاب سے مطالعۂ حدیث و قرآن میں کافی مدد ملتی ہے۔ مواعظ و حکم کی اُردو میں بے حد کتابیں لکھی جاچکی ہیں، جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

علاوہ مستقل کتابوں کے اُردو کے مختلف مضامین اور بیانات سے بھی وقتاً فوقتاً دین و مذہب کو فائدے پہنچتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین اور مقالے اُردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اُن کے مذہبی مضامین میں اسلام کی روح تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کے مضامین میں خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشرتی بہت سی حدیثیں اور قرآن کی آیتیں بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

دورِ حاضر میں مختلف ادارے اُردو زبان و ادب کے ذریعہ مذہب اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی دینی کتابیں اور مضامین اُردو میں شائع ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ ان کتابوں میں "تفہیم القرآن" نہایت اہم ہے۔ اُن کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں قرآن مجید کی روشنی میں مختلف مسائل نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رسالہ "معارف"، ندوۃ المصنفین کے ماہنامہ "برہان" اور دیوبند کے رسالہ "دارالعلوم" میں اکثر دینی و مذہبی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

غرض اُردو زبان و ادب نے دین و مذہب کی وہ خدمتیں انجام دی ہیں کہ اخلاق و انسانیت کی تاریخ میں اُس نے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے!

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

چودھری علی احمد خاں مرحوم

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

چودھری علی احمد خاں مرحوم سے پہلے پہل میری ملاقات اب سے تقریباً آٹھ سال قبل ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بہت ہی مختصر سی تھی۔ وہ دفتر "فاران" میں تشریف لائے، گوجرانوالہ کے اسلام پسند نوجوان انشاپرداز سید عبداللطیف صاحب غالباً ہمراہ تھے۔ تعارف بس اتنا ہوا کہ جماعتِ اسلامی سے تعلق ہے، اور پولیس کی ملازمت ترک کر کے اقامتِ دین کی جدوجہد میں شریک ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بات چیت رہی پھر وہ چلے گئے مگر یونہی نہیں اپنی شخصیت کا میرے قلب و دماغ پر ایک نقش چھوڑ کر! یہ نقش اُس وقت دھندلا تھا مگر پھر روشن اور گہرا ہوتا چلا گیا!

ایک سرو قامت، گداز بدن، وجیہہ انسان، لہجے میں گرمی، آنکھوں میں چمک اور چہرے پر یقین و صداقت کا غازہ! میں سوچتا رہا کہ جماعتِ اسلامی میں کس کس گوشہ سے اخلاص اور دردمندی کھنچی چلی آ رہی ہے اور تحریک اسلامی کیسے کیسے لوگوں کو متاثر کر رہی ہے!

چودھری صاحب مرحوم نے کراچی میں کپڑے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ گوردھن داس مارکیٹ کے قریب کسی گلی میں ایک فلیٹ پر قیام تھا۔ ایک دن شب میں اُن کی قیام گاہ پر جانا ہوا۔ دعوت کا خاصہ اہتمام تھا۔ کھانے کے بعد شعر خوانی بھی رہی۔ اُن کے داد دینے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ شعر سمجھتے ہیں بلکہ شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں!

اس کے بعد مہینہ دو مہینے میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اُن کی زندگی مجھ سے بھی زیادہ مصروف تھی اس لئے تفصیلی ملاقات کا شاذونادر ہی موقعہ میسر آتا! مگر جب بھی اُن سے ملنا ہوتا میں یہ بات واضح طور پر محسوس کرتا کہ اُن کے دینی شغف میں ترقی ہوتی جا رہی ہے، اور ہر طلوع ہونے والی صبح اُن کے ایمان کو گرما دیتی ہے!

اُن کی استقامت، ایمانی فراست اور ضبط و وقار کا سب سے زیادہ اندازہ اس دن ہوا جس دن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو فوجی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ میں جماعتِ اسلامی کے دفتر میں پہنچا تو بعض افراد کافی ملول بیٹھے تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ چیخ نکل گئی اور آنکھوں سے جذبات آنسو بن کر بہنے لگے۔ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا:۔

"اس راہ میں سب کچھ پیش آتا ہے...... یہ مرحلہ بھی آتا ہے...... یہ بھی......"

ان لفظوں میں صبر کی کافی تلقین تھی مگر چودھری علی احمد خاں جو آئے تو اُن کے چہرے پر سکون و اطمینان کا جلال دمک رہا تھا۔ اپنی طاقتور اور توانا مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے بولے:۔

"ماہر صاحب! انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ لوگ مولانا مودودی کو قیامت تک پھانسی نہیں دے سکتے، نہیں دے سکتے......"

کتنی تسکین تھی ان جملوں میں، جیسے کسی نے ایک بیمار کو آبِ حیات پلا دیا!

ایک دن غریب خانہ پر رات کے وقت تشریف لائے، اپنے ایک مضمون کا مسودہ مجھے دیا کہ "اسے دیکھ لیجئے"۔ میں نے مضمون پڑھا تو اندازہ ہوا کہ انشاپردازی کی صلاحیت سے تو انہوں نے اب تک کام ہی نہیں لیا۔ یہ جوہر تو اب جاکر ابھرا ہے، خاصہ مضمون تھا۔ مشکل سے دو چار جگہ قلم لگانے کی نوبت آئی۔

جماعتِ اسلامی میں آنے کے بعد صرف اشاعتِ حق اور اقامتِ دین کی خاطر مرحوم نے تقریر اور تحریر کی مشق پیدا کی۔ یہ صلاحیتیں اُن میں پہلے سے موجود تھیں مگر معطل پڑی تھیں۔ جذبۂ اخلاص اور دل کی لگن نے جب اُنھیں اُبھارا تو یہ جوہر تابناک ہوتے چلے گئے۔ وہ اوسط درجہ کے ایک اچھے مقرر تھے اور اُن کی تحریر دیکھ کر کوئی یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کی مضمون نگاری کی عمر بہت سے بہت پانچ چھ سال کی ہوگی۔ اُن کے مضامین میں پختگی اور مشاقی جھلکتی تھی۔ کثرتِ مطالعہ نے اُن کی تحریر اور تقریر کو کافی وزنی بنا دیا تھا۔ اُن کے حوصلے کی طرح اُن کے افکار و خیالات بھی بلند تھے۔ مشرقی پاکستان پہنچے تو وہاں جاکر انگریزی میں تقریر کرنے کی بھی مشق پیدا کر لی انگریزی میں اُن کے لکھے ہوئے ایک دو کتابچے بھی شائع ہوئے۔

چودھری علی احمد خاں مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ یوں کہئیے "صدقۂ جاریہ" مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کی تنظیم کا کام ہے۔ وہ دو سال کے قریب وہاں رہے اور اس زمانہ میں جماعتِ اسلامی کا کام کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان سے واپس آئے تو صحت خاصی متاثر تھی۔ ڈاڑھی میں اکا دکا بال تک سپید ہو گئے۔

مرحوم سے میری آخری ملاقات مارچ ۵۶ء کے وسط میں ہوئی۔ لائلپور کے مشاعرے سے فارغ ہو کر میں لاہور گیا۔ انہی دنوں جماعتِ اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا اجتماع تھا۔ ایک دن شب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے یہاں دعوت تھی۔ دعوت کے بعد شعر خوانی بھی ہوئی اور شعر شاعری کے درمیان ہلکا سا مزاح بھی۔ چودھری صاحب مرحوم سے وہیں ملنا ہوا۔ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ اُن سے آخری بار ملنا ہو رہا ہے اور آج کے بعد اس دنیا میں تو پھر ملاقات ہوگی نہیں!

اُن کی زندگی میں اُن کے مُنہ پر نہ کہتا تھا مگر اب کہتا ہوں کہ چودھری علی احمد خاں کو دیکھ کر اور اُن سے مل کر میں خود اپنے حوصلہ میں قوت محسوس کرتا تھا۔ اور ماحول کو دیکھ کر طبیعت میں جو افسردگی پیدا ہو جاتی تھی وہ جاتی رہتی تھی، کیا عزم تھا۔ کیا بیباک طبیعت پائی تھی، کس قیامت کا حوصلہ تھا۔ خطروں کو تو وہ خاطر ہی میں نہ لاتے تھے گفتار سے لیکر کردار تک عزیمت ہی عزیمت! اقامتِ دین کی تحریک میں صفِ اول کے کارکن مگر اس کی تمنا ہی نہ رہی کہ کوئی اُن کے کارناموں کو جانے۔ جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا اور لوگوں کی داد و ستائش اور خوشی و ناخوشی سے بے پرواہ ہو کر کیا!

اللہ کی راہ کے مسافر ناکام تو ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ پہلے قدم ہی پر اس راستہ میں گرد و غبار بن کر بھی اُڑ جائیں تو بھی کامیاب ہیں۔ مگر چودھری علی احمد خاں مرحوم ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی کامیاب رہے۔ اسلامی دستور سازی جو اقامتِ دین کا پہلا مرحلہ ہے اس کی کامیابی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے۔ دوسرا مرحلہ آیا تو رفیقِ اعلیٰ کی طرف سے پیغام طلب آ گیا۔ ایسی زندگی بھی کامیاب اور ایسی موت بھی کامیاب! اور انشاء اللہ آخرت کی زندگی کامیاب تر ہوگی۔

جانے والے! ہم بھی تیرے پیچھے ہی پیچھے آ رہے ہیں۔ بس آگے پیچھے کی دیر ہے، موت ہر جان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے۔ یہ دن ہر کسی پر آنے والا ہے، ہر موت زندہ انسانوں کے لئے عبرت ہے!

جانے والے! قبر سے لے کر یوم حساب تک کی ہر منزل تجھ پر آسان ہو اور قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی رفاقت تجھے نصیب ہو (آمین)!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

حکیم ظہور احمد شاداں

مدینہ میں

پڑے ہوئے ہیں سرِ رہگزر مدینے میں — ہزاروں شمس ہزاروں قمر مدینے میں
وہ آب و تاب ہے اے چشمِ تر مدینے میں — کہ اشک بنتے ہیں اشکِ گہر مدینے میں
جوابِ خلد ہے ہر بام و در مدینے میں — سنور گیا مرا ذوقِ نظر مدینے میں
وہ رحمتوں کی شعاعیں وہ آفتابِ کرم — ہر ایک وقت ہے وقتِ سحر مدینے میں
سمندروں سے رکو گا نہ کوہ و صحرا سے — بلائیں گے جو شہِ بحر و بر مدینے میں
وہ روبرو تھے نہ تھی فرصتِ دعا ورنہ — دعا کو ڈھونڈھ رہا تھا اثر مدینے میں
کچھ اہلِ دل نے سُنا اور سُن کے مجھ سے کہا — یہ کہہ رہے تھے کچھ اہلِ نظر مدینے میں
کہیں جھکی نہ جبیں آستانِ رب کے سوا — کہیں لگی نہ طبیعت مگر مدینے میں

ابو البیان حماد

ذکرِ جمیل

یاد آئے محمدؐ تو ہوا ذکرِ خدا بھی — اللہ کا نام آیا تو یاد آئے محمدؐ
ہیں چشمِ بصیرت کا سمجھ لوں اسے سُرمہ — پاؤں جو کہیں خاکِ کفِ پائے محمدؐ
خود اس پہ عمل کرکے زمانے کو دکھایا — ساتھ اپنے جو پیغامِ خدا لائے محمدؐ
ایسا بھی کبھی جوشِ محبت میں ہوا ہے — پلکیں ہوئیں نمناک جو یاد آئے محمدؐ
پھر کیسے نہ روشن ہو بھلا اُس کا نصیبہ — حماد ہے وارفتۂ سیمائے محمدؐ

زکی زاکانی

نوائے سروش

مرے وجود سے ہے رازِ زندگی کی کشود — میری نمود ہے گویا حیات کی تسخیر
نوائے شوق نے چیرے جگر ہزاروں کے — رہِ جنوں کے مجاہد نہیں ہیں بے شمشیر
سمجھ سکے نہ تری شانِ کبریائی کو — یہ لوگ جن کی زباں پر ہے نعرۂ تکبیر
کھلی ہیں اہلِ جنوں پر فرار کی راہیں — اگرچہ خانۂ زنداں ہے بے در و زنجیر
اب اپنے خون سے سینچ محبتوں کا چمن — اب اپنے ہاتھ سے کھینچ بہار کی تصویر

عبد اللہ خاور ۔ بی اے بی ٹی

عالم

نشاط و درد میں اک اشتباہ کا عالم — نہ پوچھئے نگہِ گاہ گاہ کا عالم
بہشت کیا ہے؟ ہجومِ سرود کیف و نشاط — یہی تو تھا مرے رنگیں گناہ کا عالم
چھپیں گے جا کے کہاں اُن کے سُرمگیں انداز — دلِ حزیں سے افق تک نگاہ کا عالم
رہِ خلوص میں کچھ ایسے پیچ و خم آئے — بدل گیا ہے ذرا، رسم و راہ کا عالم

ڈاکٹر عبد المجید صدیقی

زندہ بادائے دولتِ آزادِ پاکستانِ ما — زندہ بادائے راحتِ قلب و دماغ و جانِ ما

سعید عزمی

پھول تو خوشبو ہی دے گا دشت ہو یا ہو چمن — عظمتِ انساں نہیں مرہونِ محراب و محل

محمد علی خاں اثر

مجھے تنگ تر نہ ہو کیوں یہ فضائے آسمانی — مری فرع ہے زمینی، مری اصل لامکانی

صابر متھیاوی

بے پردہ مسلم خاتون سے!

فتنۂ خوشبو میں لاکھوں قاصدِ شیطان ہیں — عطر میں بھیگی ہوائیں رہزنِ ایمان ہیں

فردوسِ تغزل

سید حجاب ترمذی:-

زندگی کے آہ پیچ و خم سے جی گھبرا گیا — ہر قدم پر مشکلاتِ غم سے جی گھبرا گیا
رہروِ راہِ محبت اس قدر کم ہمتی — ابتدا میں انتہائے غم سے جی گھبرا گیا
جادۂ عشق و محبت میں قدم رکھنا تو ہو — اور اگر ناکامیٔ پیہم سے جی گھبرا گیا
فیصلہ اس امر کا کرنا ذرا دشوار ہے — جی سے ہم گھبرا گئے یا ہم سے جی گھبرا گیا

روش اندر روش یہ گل کھلے ہیں — کہ اُن کے نقشِ پا کے سلسلے ہیں
کرے گا آخر اس کا فیصلہ کون؟ — مجھے تم سے تمہیں مجھ سے گلے ہیں
یہ اعجازِ تبسم اللہ اللہ — بہار آنے سے پہلے گل کھلے ہیں
مجھے جھوٹی تسلی دینے والے — جُدا ہو کر کہیں دو دل ملے ہیں

تسکین قریشی:-

ہمیں تو غمِ پائمالی نہ تھا — اُنھیں کے قدم ڈگمگانے لگے

جگر مراد آبادی

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم، خلوتِ غم ہے — اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

محشر بدایونی

چٹک اے کلی لیکن آہستگی سے — یہ آواز گوشِ خزاں تک نہ پہنچے

نظر خورجوی۔

گل قہقہوں میں کھو گئے، نغموں میں عندلیب — عالِ چمن سے اہلِ چمن بے خبر ملے
ہو کر اسیرِ دام اسیری کا غم نہیں — میں سوچتا ہوں کیوں یہ مجھے بال و پر ملے

قمر جلالوی

ہمیں اے ناخدا! طوفاں ہی میں ڈوب جانے دے — وہ ڈرتے ہیں جنہیں کشتی کنارے پر اُتار آئی

کند مہر چناں پارہ کن کہ گردونے
شوی ز کردہ پشیماں بہم توانی بست!
(یکے از شعراء ایران)

روحِ انتخاب

کیا یہ آزادی، بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند بُت پرستوں، یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع وضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت جوڑتے ہیں، اُن کے سر نیاز خم کرتے ہیں اور اُن کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسُول کی اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

یسأل احدکم ربہ حاجۃ کلھا حتی یسأل الملح وحتی یسأل شسع نعلہ اذا انقطع ۔ (اخرجہ الترمذی عن انس)

ہر کسی کو چاہیئے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار ہی سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی اُسی سے مانگے اور جُوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنہیں افسوس ہو کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے مصائب میں اُن ہی کو پکارتی ہے۔ آفات کو دُور کرنے کے لئے اُن ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) اس حدیث کو جو اوپر مذکور ہوئی ہے اپنی فتوح الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہیئے اس حدیثِ نبوی کو اپنے قلب کے لئے آئینہ بنائے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و درشتی، راستی و کجی کو معلوم کرے بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے لئے اس کو ایک سخن و حکایت ٹھہرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات و سکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفاتِ نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے!

مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزو سے ہم نے صفحات بالا میں تفصیل سے بحث کی کہ یہ غیر اللہ کو مقرب و شفیع، نافع وضار جان کر اپنی حاجت کے وقت فریادرسی چاہتے تھے، یعنی ان کو پکارتے اور استغاثہ کرتے تھے، یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا۔ اگر ان ہی افعال کا ارتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہوگی! دیکھیے "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔

درد و مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارنے والا نہ صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس درد و غم کو دُور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ اُس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سُن بھی سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سُنے اور بغیر مطلع ہوئے وہ اس کی مدد کیسے کر سکتے ہیں! اس طرح وہ غیر اللہ کے لئے علم غیب بھی ثابت کرتا ہے حالانکہ علم غیب خصائصِ الٰہیہ سے ہے!

امام ابو حنیفہؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صالحین کی قبروں پر آکر کہہ رہا ہے "ھل لکم ..... الی آخرہ" ..... ترجمہ:- اے اہلِ قبور! کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں، میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لئے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم میرے حال سے غافل ہو۔ امام اعظمؒ نے اس شخص سے پوچھا "ھل اجابوا لک" انہوں نے تجھ کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا "نہیں"۔ آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں کہا "سحقا لک وتربت یداک! کیف تکلم اجسادا لا یستطیعون جوابا ولا یملکون شیئا ولا یسمعون صوتا"! یعنی پھٹکار ہو تجھ پر! خاک آلود ہوں تیرے ہاتھ! ایسے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ جو کسی شے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز نہیں سُن سکتے! پھر آپ نے یہ آیت پڑھی "وما انت بمسمع من فی القبور" (یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ آپ اُن لوگوں کو جو قبروں میں ہیں کچھ سُنا نہیں سکتے)

(قرآن اور تعمیر سیرت۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

کہاوت یہ ہے کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" مگر پاکستان میں پردۂ غیب سے کوئی شخص برآمد نہیں ہوا۔ بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے عبدالرب نشتر کے نام کا ایک مردِ توانا منظرِ عام پر آیا اور مسلم لیگ کو جس کا کفن دفن بھی ہو چکا تھا۔ اس نے "قم" کہہ کر کھڑا کر دیا۔ جس نے سنا محو حیرت بلکہ غرقِ حیرت ہو گیا کہ مُردہ جی اٹھا!

خوش فہمیوں کے ہوائی محل پھر بننا شروع ہو گئے۔ بعض ضرورت سے زیادہ رجائیت پسند لوگ کہنے لگے کہ مسلم لیگ اب کی بار اخلاص و اتحاد کے ساز و سامان کے ساتھ میدانِ عمل میں آئی ہے۔ چند دن میں یہ کچھ سے کچھ کر کے دکھا دے گی۔ مگر واہ ری "لیلائے وزارت" تیری سحر کاریاں کہ بس ایک ہی جھلک میں مسلم لیگ کے کتنے عاشقوں کو توڑ کر اپنا نیاز کیش اور گرویدہ بنا لیا۔ مسلم لیگ کے یہ پرانے شیدائی "سلمائے اقتدار" اور "لیلائے وزارت" کی طرف اس طرح رسّے تڑا کر بھاگے ہیں کہ "یقین، اتحاد اور تنظیم" آواز پر آواز دیتے رہے مگر ان لوگوں نے سنی ان سنی کر دی!

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ڈاکٹر خاں صاحب مسلم لیگ والوں کو ملزم ٹھہرا رہے ہیں اور مسلم لیگی ڈاکٹر خاں صاحب کو مطعون کر رہے ہیں! دیکھئے! جاہ و اقتدار کی یہ معرکہ آرائی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ اس معاملہ میں "بڑے بڑوں" کے دامنوں کو آلودہ بتایا جاتا ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو اور یہ ہوائی کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہو!

دیکھئے یہ ڈرامہ کیا سین دکھاتا ہے؟ اور سیاسی شیشہ گری کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ اس دنیا میں عجیب سے عجیب تر لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مگر پاکستان کو جن لیڈروں سے سابقہ پڑا ہے ان میں کا ایک ایک فرد اپنی آپ مثال ہے! چھوٹا بچہ اپنا کھلونا توڑ کر تھوڑا بہت پچھتاتا ہے۔ مگر یہ حضرات اصول توڑتے ہیں اور اپنے کئے پر انھیں ذرا سا بھی پچھتاوا نہیں ہوتا۔

ہم تو آٹھ نو سال سے یہی دنگل دیکھ رہے ہیں! ع

دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں!

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ روس کے عظیم لیڈر "خروشچیف" کے نام کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ بہرحال یہ تو بظاہر امر مسلم ہے کہ "خروش" اس نام کا ایک ٹکڑا ضرور ہے۔ تو انہی "خروشچیف" صاحب نے کس جوش و خروش کے ساتھ اپنے آنجہانی لیڈر اسٹالن کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس "مردِ آہن" کی ذات پر وہ وہ الزام لگائے ہیں کہ ان الزاموں کا ایک لفظ بھی اگر کسی چشمہ کے پانی میں ملا دیا جائے تو اس ایک لفظ کی سیاہی سے سارا پانی گدلا ہو جائے! اسٹالن کے جیتے جی خروشچیف جی مہاراج دم سادھے خاموش بیٹھے رہے۔ آنجہانی کے زمانے میں کس مائی کے لال میں یہ ہمت تھی جو "خداوندِ نعمت" کے خلاف ذرا لب بھی ہلا سکتا۔ اسٹالن سچ مچ مردِ آہن تھا بلکہ اس کا دل تو فولاد سے بھی زیادہ سخت تھا! اس نے اپنی زندگی میں کسی پر رحم کھایا ہی نہیں۔ مردِ آہن کا دل کسی مظلوم کی آہ و زاری پر بھلا پسیج جائے تو اسے "مردِ آہن" کون کہے!

کمیونزم نے چند روز پہلے کیا زور باندھا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ طوفان ساری دُنیا پر چھا جائے گا۔ مگر یہ ترکی تو اب تمام ہوتی نظر آرہی ہے، اسٹالن کی شخصیت اور ناموری کے بُت پر یہ تیشے درحقیقت کمیونزم کے سنگین مجسمہ پر کاری ضربیں ہیں۔ ؎

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ!

اخباری اطلاع ہے کہ جمال ناصر صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ (۱) تین سال کے اندر اندر مصر کے سارے باشندوں کو عربی لباس ترک کر کے انگریزی لباس میں ملبوس ہو جانا چاہیئے۔ جو ایسا نہ کرے گا اسے سزا دی جائے گی۔ (۲) جامعہ ازہر میں لڑکیوں کے لئے رقص و سرود کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اور (۳) مسجدوں کے ساتھ فلمی اسٹوڈیو یا سینما گھر ملحق کئے جائیں گے۔ پاکستان کے وہ علمائے کرام جنہوں نے مصر کے "اسلامی دستور" کی تشکیل پر جمال ناصر کو مبارکباد دی تھی، ان خبروں کو سننے کے بعد شاید کوئی "باب الحیل" تصنیف فرما رہے ہیں! ان "مولاناؤں" کے علم و دانش (؟) کا کیا پوچھنا کہ یہ جس کو جو بنا دیں تھوڑا ہے! اس ڈیزائن کے "مولاناؤں"؟ اور "متقیوں" کا ہمیشہ سے یہی رول (Role) رہا ہے کہ یا تو جابروں اور ظالموں کی کارستانیوں پر شریعت کی رُو سے رخصت و اباحت کی مہریں ثبت کریں یا پھر اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں پر کفر کے فتوے لگائیں! لمبی ڈاڑھیاں۔ نیچے نیچے جبے، پیشانیوں میں سجدوں کے گھٹے۔ اور۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

قرآن کی آیتیں جلسوں میں تلاوت کر کے سفید جھوٹ بولتے ہیں! اور شریف انسانوں کی پگڑیاں اچھالتے ہیں! فٹ پاتھ پر دوا بیچنے والے اور تماشہ دکھلانے والے مداری کی بات کا وزن ہے مگر ان "مولاناؤں" (؟) کی بات کا وزن نہیں ہے! جب تک یہ گروہ مسلمانوں میں موجود ہے، باطل کا کاروبار ٹھنڈا پڑ ہی نہیں سکتا۔ فتنہ و فساد کی انہی کے دم سے گرم بازاری ہے!

اُردو زبان و ادب (؟) کے چند نمونے:۔

—— سریش کچھ سوچ رہا تھا، اس کے دل و دماغ کی گپھا میں خیالات رینگ رہے تھے۔ وہ کسمسا کر اُٹھا اور تمتما کر چل دیا۔ جیسے ایک ڈرا ہوا مینڈک پھدک رہا ہو۔ اُس کے قریب سے ایک خارشتی کتا گزرا۔ سریش چونک پڑا جیسے کسی بچے کا غبارہ ہوا میں ٹوٹ کر گونج پیدا کر دے۔ کتا ہانپ رہا تھا اور سریش کے جذبات ڈگمگا رہے تھے!

—— خیالات کا انجماد اور جذبات کا سیلان جب مدغم ہو جائیں تو پھر زندگی بسیط نہیں رہتی۔ اس میں ترکیب پیدا ہو جاتا ہے اور تشحید ذہن بھی ہوتی ہے۔ ذہن کا اعوجاج جب متجد ہوتا ہے تو کائنات کی ہر چیز کو متحجر بنا دیتا ہے!

—— میرا پوائنٹ آف ویو تمہارے آئیڈیا سے ڈفر کرتا ہے! تمہارے تھنک کرنے کا انداز ہی اور ہے۔ بھائی! آدمی ذرا ہمت سے کام لے تو ایٹ ماس فیر (atmosphere) ذرا سی دیر میں چینج ہو سکتا ہے مگر ہر کوئی ایسا بولڈ اسٹیپ نہیں لے سکتا۔ اس کے لئے لائن ہرٹیڈ (Lion Hearted) لوگ چاہئیں۔ میرے دوست ڈویو فولومی (Do you follow me)!

—— تم مجھے نراش نہ کرو مادھو! مجھے اب بھی تمہارے پریم کی آشا ہے۔ تمہیں دردھتا سے کام لینا ہوگا۔ جیون کا ڈرامہ کبھی تو سماپت ہوگا۔ وہ آرمبھ تھا یہ انت ہے۔ جیون کا اپمان تو نہ کرو!

---

۱ ضرورت۔ ۲ دلیری۔ ۳ ختم۔ ۴ آغاز۔ ۵ اختتام۔ ۶ توہین۔

ہماری نظر میں

حیاتِ سرورِ کائنات

"حیاتِ سرورِ کائنات" (حصہ اوّل) تالیف:- ملّا واحدی دہلوی۔ ضخامت ۳۷۸ صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ دفتر نظام المشائخ ۷۸/۱۷ جیکب لائنز کراچی نمبر ۳۔

جناب ملّا واحدی پچاس سال سے ادب و اخلاق کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کی انشاء پردازی کا آغاز ہی دینی موضوعات سے ہوا ہے۔ پاکستان میں آنے کے بعد یہ رنگ اور گہرا ہو گیا ہے۔ جس کے ثبوت میں اُن کی گراں قدر تالیف "سرورِ کائنات" پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں واحدی صاحب نے زیادہ تر قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تالیف "رحمۃ للعٰلمین" اور مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کی "سیرت النبی" کے مجلدات کو سامنے رکھا ہے۔ واقعات قریب قریب وہی ہیں جو ان کتابوں میں موجود ہیں مگر موصوف نے جس سہل اور سلیس انداز میں اُن کو پیش کیا ہے وہ اُن کا بلاشبہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ دلی کی ٹکسالی زبان تکلف آورد اور تصنع سے دُور!

نمونہ کے لئے صرف ایک اقتباس:-

"..... حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر پہنچتے ہی تبلیغ شروع کر دی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ بے تامل ایمان لے آئے۔ سُننے کی دیر تھی ایمان لانے میں دیر نہ لگی۔ حضرت خدیجہؓ بیوی تھیں۔ حضرت علیؓ چچا زاد بھائی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ بچپن کے دوست تھے۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ خادم تھے۔ چاروں پل پل کے حالات سے باخبر۔ جن کی زندگی مثل آئینہ صاف و شفاف سامنے گزری تھی اور جسے چالیس سال مسلسل سچ بولتے دیکھا تھا۔ اس سے بدگمانی کیونکر ہوتی۔ وہ اکتالیسویں سال غلط بات کس طرح کہہ سکتا تھا۔"

بعض ایسے مقامات جن میں اربابِ تاریخ و سیر کے درمیان اختلافِ رائے رہا ہے۔ اُن مقامات سے فاضل مؤلف بڑے اعتدال و توازن کے ساتھ گزرے ہیں۔ اور کہیں کہیں تو اُن کے ایک دو جملوں ہی سے دل کی کھٹک دُور ہو جاتی ہے۔

"مدینہ جانا خود حضورؐ کا کتنا مخدوش تھا۔" (صفحہ ۳) "کا" کے استعمال نے اس جملہ میں خاصہ جھول پیدا کر دیا۔ "حضورؐ پر تیرہ سال انتہائی کمزوری کے گزرے۔" (صفحہ ۶) جو مفہوم صاحبِ تالیف ادا کرنا چاہتے ہیں وہ اس جملہ سے ٹھیک طرح ادا نہیں ہوتا۔ "وہ (ابو طالب) حضورؐ کی مخالفت کو حتی المقدور نمٹاتے رہتے تھے۔" (صفحہ ۱۲) "مخالفت" کو "نمٹانے" کی جگہ "مخالفت سے نمٹتے رہتے تھے" لکھنا چاہیے تھا۔ "دوسرے نبیوں اور رسولوں کی کارکردگی کے حلقے محدود تھے۔" (صفحہ ۱۷) "کارکردگی" دفتری زبان کا لفظ ہے۔ "اپنے بچوں کو ابتدائی نشو و نما کھلے میدانوں میں کرایا کرتے تھے۔" "نشو و نما کا کرانا!

نامانوس انداز بیان ہے۔ "حضور نظر نا صحیح کار رکھتے" (صفحہ ۴۵) "غلط کار" کے مقابلہ میں "صحیح کار" اردو میں عام طور پر مروج نہیں ہے۔ "اور کفار مکہ سے بے نیل ومرام واپس لوٹے" (صفحہ ۱۴۷) صحیح "بے نیل مرام" ہے۔ "بے نیل ومرام" خاصی فاحش غلطی ہے۔

"یہودیوں کا اقتدار بگڑ رہا تھا" (صفحہ ۲۱۷) "اقتدار خطرے میں تھا" یا "یہودیوں کی ساکھ گر رہی تھی" اسی قسم کا کوئی جملہ بھتا تھا "اقتدار بگڑنا" وجدان کو کھٹکتا ہے۔ صفحہ ۶۱ پر "حضرت لپینہ" کو حضرت بقیہ" ۔ صفحہ ۲۹۵ پر حضرت دحیہ کلبیؓ کو "حبہ کلبی (واؤ کے ساتھ)۔ صفحہ ۳۲۵ پر "حیس" (کھانے کا نام) کو "حیش" اور صفحہ ۳۲۲ پر "قبیلہ تجیب" کو "قبیلہ نجیب" (ن کے ساتھ) املا کیا گیا ہے۔

قرآنی آیتوں میں بھی کہیں کہیں اعراب کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

(صفحہ ۱۸) "ظھر الفساد فی البر والبحر" کتابت میں "د" پر "تنوین" (ظھر الفسادٌ) لگایا گیا ہے۔ صفحہ (۲۴۴) "ان اردنا الا الحسنیٰ" میں "ن" کی جگہ "ت" تحریر ہے۔ اسی طرح صفحہ ۳۴ پر "الیوم اکملت لکم دینکم" کے "ن" پر زبر کی جگہ پیش (دینُکم) لکھا ہوا ملتا ہے۔

کتاب اپنی جگہ ہر اعتبار سے خوب ہے اور نہ صرف مسلم گھرانوں میں بار پانے کے قابل ہے۔ بلکہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہونے کی مستحق ہے۔ لکھنے والے کا خلوص اور عشق رسولؐ تو ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔ ملا واحدی صاحب کو مبارکباد کہ انہوں نے عمر کے آخری حصہ میں سفر آخرت کے لئے اچھی زاد راہ مہیا کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے!

احسن الکلام فی شرح بلوغ المرام

"احسن الکلام فی شرح بلوغ المرام"۔ از۔ مولانا محمد سلیمان کیلانی۔ ضخامت ۳۰۸ صفحات (بڑا سائز) غیر مجلد۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ مکتبۃ السلام، کشمیری بازار لاہور۔

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کا ایک مجموعہ بڑی سعی وتفحص کے ساتھ مدون کیا تھا۔ جو "بلوغ المرام" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کتاب کا ترجمہ مختصر مگر ضروری شرح کے ساتھ مولانا محمد سلیمان کیلانی صاحب نے کیا ہے۔ مولانا موصوف کی محنت یقیناً قابل داد ہے۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے اور شرح نے اس کی افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

"ابن حجر نے اس مغالطہ میں اسے معلول کہا کہ شاید یہ سلیمان بن داؤد یمانی ہے اور وہ متروک ہے حالانکہ یہ روایت سلیمان خولانی کی ہے اور وہ ثقہ ہے۔ اس لئے یہ حدیث معلول نہیں۔" (صفحہ ۱۶)

اس سے فاضل شارح ومترجم کی "علم حدیث" میں بصیرت وتعمق کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کا بھی کہ شخصیت کا احترام اعلانِ حق سے انہیں باز نہیں رکھتا۔

اس کتاب میں کہیں کہیں احادیث درج کر کے شرح میں یہ دکھایا گیا ہے کہ احناف کا مسلک فلاں فلاں حدیث کے خلاف ہے۔ مثلاً:-

"ابوبکر بن عبدالرحمٰن (ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

آپ فرماتے تھے جو شخص مفلس کے پاس اپنی چیز بعینہٖ پالے اُس کا وہی حقدار ہے۔ (متفق علیہ)

اس پر شارح کا نوٹ حسب ذیل ہے:-

"حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی سے کوئی مال خریدے اور اس کے بعد وہ مفلس ہو جائے۔ قرضہ ادا کرنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ ہو تو چیز بیچنے والے کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی بیع کو فسخ کر کے اپنی چیز پر قبضہ کر لے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک وہ اکیلا اس چیز کو نہیں لے سکتا بلکہ اور قرضخواہوں کے ساتھ وہ بھی اس میں شامل ہے۔ یعنی جس تناسب سے اوروں کو قرضہ ملے گا اُس کو بھی اسی تناسب سے ملے گا۔ لیکن یہ حدیث کے خلاف ہے۔" (صفحہ ۱۶۸)

احناف کے اس قسم کے بعض فقہی مسائل پر جو اہلِ حدیث کی طرف سے احتساب کیا جاتا ہے اُن کے جواب دینے کی ذمہ داری علماء احناف پر عائد ہوتی ہے اور حق یہ ہے کہ کسی امام کے قول اور قیاس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو نہیں چھوڑا جا سکتا!

"بلوغ المرام" کے ترجمہ اور شرح کی خدمت یقیناً ایک بڑا کام ہے جس کے لئے مولانا محمد سلیمان کیلانی صاحب کے حق میں ہم دعائے خیر ہی کر سکتے ہیں اس کا اجر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گا!

نئے سفینے "نئے سفینے" - مرتبہ:- ابو الفہیم وحید علی خاں۔ ضخامت ۹۴ صفحات۔ قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ نشان ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن۔ پاکستان میں - مکتبہ چراغ راہ کراچی ۱۔

نومبر ۱۹۵۵ء میں ادارہ ادب اسلامی حیدر آباد دکن کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اُس اجلاس میں نظم و نثر کے جو مضامین پڑھے گئے یہ کتاب اسی مجموعہ سے عبارت ہے!

اسلامی ادب کیا ہے؟ اس کا جواب جناب امین صدیقی صدر ادارہ ادب اسلامی کی زبان سے سنئے:-

"ادبِ اسلامی کسی گروہ یا قوم کا ادب نہیں ہے بلکہ وہ ہمہ گیریت اور افادیت کے اعتبار سے تمام بنی نوع انسان کے لئے پیغام ہے۔ تمام افراد کی مشترکہ میراث ہے۔ اسی طرح ادبِ اسلامی تمام پچھلے سرمایۂ ادب کو باطل قرار نہیں دیتا بلکہ ہر اچھی چیز کو وہ اپنی سمجھتا ہے اور اُس کی حفاظت کرتا ہے۔"

اس مجموعہ میں بعض چیزیں خاصی ہیں۔ "فکر" کے لحاظ سے بھی اور "اظہار" کے اعتبار سے بھی۔ جناب ابو الفہیم وحید علی خاں کا مقالہ "ادیب اور عمل" جاندار اور وزنی ہے۔ اس قسم کے اشعار نے:-

شاہیں زادوں کی فطرت بدلتی نہیں | زاغ و کرگس مقابل میں آیا کریں!
آسمانوں پہ پرواز کرتے ہیں ہم | ماہ و انجم سے آنکھیں لڑاتے ہوئے (عزیز اقبال)

اس مجموعہ کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔

(صفحہ ۳۴) "عزیز کہتا کیا ہے وہ بہاتا ہے، جیسے سامعین کے دماغ کھود کر اپنی بات بٹھانا چاہتا ہے۔" یہ اندازِ بیان ہی عجیب و غریب ہے۔ "دریا بہانا" اور پھر "دماغ کھود کر اپنی بات بٹھانا" ایک عجوبہ سے کم نہیں۔

کون کہتا ہے کہ جینا درد ہے آزار ہے | زندگی کس کیلئے ہنگامۂ دشوار ہے (صفحہ ۸۰)

"درد" اور "ہنگامۂ دشوار" کا اس شعر میں استعمال کہنے والے کی ناپختہ کاری بلکہ نامشقی کی دلیل ہے۔

"اپنا گھر" (افسانہ) میں گھر بنانے کو "گھر باندھنا" کہا گیا ہے۔ اس کی تکرار سے وجدان کو عجیب وحشت ہوتی ہے۔ "اُلٹا کالر" (افسانہ) میں "فوراً" کو فورن، احتیاطاً کو احتیاطن۔ مجبوراً کو مجبورن اور معاً کو معن لکھا گیا ہے۔ زبان کی بنی بنائی شکل میں اس قسم کے ناروا تصرفات کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان کا رسم الخط آسان تو کیا ہوگا۔ ایسی باتیں اس کا حلیہ بگاڑ دیں گی۔ اسلامی ادب والوں کو ایسی جدتیں (؟) کسی طرح زیب نہیں دیتیں!

یہ کتاب مجموعی طور پر یہ تاثر دیتی ہے کہ پاکیزہ افکار اور صالح تصورات شعر و ادب کے ذریعہ اپنا اظہار چاہتے ہیں اور انتہائی ناساز گار حالات میں خدا کے کچھ نیک بندوں نے یہ مہم شروع کر دی ہے۔ آغاز اپنی خامیوں کے باوجود حوصلہ افزا ہے۔ اور مستقبل کے افق کی تابناکیاں ابھی سے اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں ۔۔۔ توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

اور اس کشمکش کا وقت آ پہنچا ہے۔

تاریخ ادبیات ایران

"تاریخ ادبیات ایران" از:۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق۔ مترجمہ:۔ سید مبارز الدین رفعت ایم اے (عثمانیہ) ضخامت ۵۶۰ صفحات (بڑا سائز) لکھائی چھپائی، کاغذ، گرد پوش اور جلد ہر چیز خوب سے خوب تر۔ قیمت نو روپے، غیر مجلد آٹھ روپے، ملنے کا پتہ:۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

"تاریخ ادبیات ایران" سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ پروفیسر براؤن کی تصنیف ہے۔ زیر تنقید کتاب کے مصنف ایران کے فاضل ناقد اور بلند پایہ ادیب ڈاکٹر رضا زادہ شفق ہیں۔ جس کا اردو زبان میں ترجمہ سید مبارز الدین رفعت ایم اے (عثمانیہ) نے کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں میخی خط، اوستائی خط۔ اور پہلوی ابجد کے نمونے دیئے گئے ہیں اور "کتاب کارنامک اردشیر بابکان" کی ایک عبارت کا اقتباس ترجمہ کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ پھر قدیم پارسی اور "اوستائی ادب" سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد پہلوی زبان اور پہلوی ادب کا مختصر تذکرہ ہے۔ پہلوی زبان کی ایک مثال (کتاب گجستک اَبالش سے):۔

"ایدون گویند کو گجستگ ابالش زندی از استخر بود، مردی وہ زبان دوست بوذ اور روزی گرسنہ (گرہ سگ) او تشنہ۔ آتشگاہی آند کو باژ گیرم او ادنو کس نبوذ۔"

ترجمہ:۔ چنیں گویند کہ ملعون ابالش زندی از استخر بود، مرد خوب رواں (مہربان) ودوست وروزی گرسنہ وتشنہ بہ آتش گاہ آمد کہ باج گیرد آنجا کس نبود۔

"کارنامہ اردشیر بابکان" کا ایک جملہ:۔

"چہ کارنامکی از تخشیری پاپکان اینوں نپشت۔" ترجمہ:۔ بکارنامہ اردشیر بابکاں چنیں نوشتہ است!

اس کے بعد عربوں کے ایران پر حملہ سے لے کر صفوی اور قاچاری دور تک کے شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ جو اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ یہ تذکرہ مصنف کے تعمقِ نظر، وسعتِ معلومات، ذوقِ شعری اور صحتِ وجدان کی مخلص شہادت ہے۔ کہیں شاعروں کے درمیان محاکمہ ہے، کہیں اس بات کی نشاندہی ہے کہ کس شاعر نے اپنے کس پیش رو شاعر کی تقلید کی ہے۔ پھر ان کے کلام کا مختصر انتخاب دیا ہے۔

نثر کے یہ نمونے جہاں نظر آتے ہیں، طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے:۔

"کسائی نے اخلاق اور معنوی مطالب کی طرف توجہ کرنے کے باوجود عالمِ حسن کو بالکل فراموش نہیں کیا۔

فطری مناظر نے ہمیشہ اس کے دل پر اثر کیا ہے۔ کبھی آپ نیلوفر کو دیکھا ہے اور اسے تیغ آبدار اور یاقوت نابکار سے تشبیہ دی ہے، کبھی پھولوں کو دیکھ کر مست ہوا ہے اور گل فروش کو اس بات پر سرزنش کی ہے کہ وہ ایسی چیز کو روپے کی خاطر بیچتا ہے۔ بارش کے قطروں کو پیل گوش کے پتوں پر دیکھ کر اسے چشم عاشق کے آنسو یاد آئے ہیں اور اس کے پتے ایسے معلوم ہوئے ہیں جیسے ایک سفید باز ایک ناسفتہ موتی اپنی منقار[1] میں لئے جا رہا ہو۔"

جب ترجمہ کا یہ عالم ہے تو فارسی متن کتنا رواں اور شگفتہ ہو گا؟

ڈاکٹر رضا زادہ شفق کا ذوقِ شعری بہت بلند اور معتبر ہے۔ مشاہیر شعراء کے اندازِ بیان (style) میں جسے وہ "سبک" کہتے ہیں، انفرادیت و امتیاز کی جو حدیں انہوں نے قائم کی ہیں۔ اس نے اس کتاب کے حسن و خوبی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ فاضل ناقد اور لائق مصنف کی نگاہ عربی اور مغربی ادب پر بھی ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے قیدخانہ میں جو اثر انگیز اشعار کہے ہیں۔ اُن کے سامنے مشہور انگریز شاعر بائرن کے اشعار ہیچ ہیں۔

ناصر خسرو کے "سبک" (style) پر شفق کا تبصرہ:-

"ناصر خسرو عبرت انگیز اور پند آمیز اشعار پیش کرتے ہیں، اُن کے اشعار میں مے و معشوق اور باغ و چمن کی جگہ روحانی اور اخلاقی مطالب ملتے ہیں۔ یہی اُن کی خصوصیت اُن کی تحریروں اور اصطلاحوں میں نظر آتی ہے۔ یہی خصوصیت ان کی شاعری کو ایک مخصوص رنگ دیتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کوئی فرخی کا قصیدہ سُن کر اسے عنصری کا سمجھ لے۔ لیکن ناصر خسرو کا سبک دوسروں سے اتنا ممتاز ہے کہ ان کے کلام کا لحن اور انداز ہی سب سے نرالا نظر آتا ہے۔"

فاضل مصنف کا ذوق سنجیدہ اور باوقار ہے۔ اس لئے شاہنامہ کی ایک خوبی اس کی نگاہ میں یہ بھی ہے کہ:-

"پورے شاہنامہ کو اٹھا کر دیکھئے ایک بھی خلافِ ادب یا بے شرمی کا لفظ آپ کو دکھائی نہ دے گا۔ حد یہ ہے کہ جہاں سخت سُست کہنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ وہاں بھی اس نے پردے ہی میں بات کہہ دی ہے اور اپنے شعر کو رکیک اور ذلیل ہونے نہیں دیا ہے۔"

کاش! ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے کان تک یہ آواز پہنچ سکتی!

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے بعض مسلمان شاعروں کے دل میں نہ صرف یہ کہ ایرانی کلچر بلکہ ایران باستان کے دین سے بھی ایک طرح کا لگاؤ تھا۔ دقیقی کہتا ہے:-

لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ مے خوش رنگ و دین زردہشتی

مجوسیت کی یہی بچی کھچی چنگاریاں تھیں جو رضا شاہ پہلوی کے زمانہ میں پھر بھڑکیں اور فارسی زبان سے عربی لفظوں کے اخراج کی مہم شروع کی گئی۔

کتاب کا ترجمہ بہت شگفتہ اور جاندار ہے جس پر مترجم تبریک و تحسین کا مستحق ہے مگر کہیں کہیں قلم سے چوک بھی ہو گئی ہے۔

---

[1] - مترجم نے یہاں "چونچ" ترجمہ کیا ہے مگر میں نے جملہ کے دروبست اور لفظوں کے توازن کے لحاظ سے "منقار" ہی رہنے دیا۔ (م-ق)

(صفحہ ۱۱) "علمار السنہ نے جو تحقیقاتیں[1] کیں"۔ (صفحہ ۲۰۶) اپنی عمر ان ہی لا دوا دردوں[2] کے علاج کے پیچھے گزاری ہے۔

(صفحہ ۳۴۱) "جیسے شیخ عطار وغیرہ کے دفتر پر خطِ بطلان[3] کھینچ دیا ہے"۔ "درونی تجارب" (صفحہ ۱۷۲) بھی ثقیل ترجمہ ہے۔

(صفحہ ۱۴۵) "وہ خوش زبان، شیریں بیان، شکستہ نفس اور مہربان تھے"۔

جدید فارسی میں شاید منکسر المزاج کو "شکستہ نفس" کہتے ہیں۔ مگر مترجم کو اس ترکیب کا ترجمہ اردو کے مزاج کی رعایت سے کرنا چاہیئے تھا۔

لفظ "استاد" سے یقیناً احترام اور پختہ کاری کا پہلو نکلتا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس میں ایک طرح کی فرسودگی اور "کاریگری" بھی پائی جاتی ہے۔ فردوسی اور حافظ جیسے شاعروں کو جہاں جہاں استاد کہا گیا ہے اور ان کے "آرٹ" کو "استادی" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وہ وجدان کو خاصی کھٹکتی ہے۔ مترجم کو اردو میں ان لفظوں کا ترجمہ "فن کار" وغیرہ کرنا چاہیئے تھا۔

حضرت امیر خسرو کے بیان میں مصنف نے لکھا ہے کہ ان کے والد "مغلوں کے ہنگامے میں ہندوستان فرار ہو گئے اور یہاں شہر پٹیالہ میں سکونت اختیار کر لی تھی"۔ (صفحہ ۳۸۵) یہ غلط ہے۔ امیر خسرو کے والد نے شہر پٹیالہ میں نہیں بلکہ قصبہ پٹیالی (ضلع فرخ آباد) کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ اور یہی قصبہ خسرو کی جائے پیدائش ہے۔ پٹیالہ اور پٹیالی میں تجنیس خطی کے سبب لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے!

غیاث اللغات کے بارے میں لکھا ہے:۔

"یہ لغت سنہ ۱۰۲۰ ہجری میں تصنیف ہوئی"۔ (صفحہ ۵۰۶)

یہ کسی طرح درست نہیں۔ غیاث اللغات سنہ ۱۲۴۲ ہجری میں مکمل ہوئی ہے اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

اس کتاب میں ان شعراء کا بھی تذکرہ ہے جو ہندو پاک کے علمی حلقوں میں ذرا بھی شہرت نہیں رکھتے۔ بلکہ بہت سوں کے تو ان کے نام تک معلوم نہ ہوں گے۔ مگر ایران میں ان کو شاید خاص درجہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً قطران، امیر معزی، فخر الدین گرگانی، عمق بخارائی، مجیر الدین بیلقانی، مختاری غزنوی، مجمر اصفہانی ....!

اس کتاب میں سب سے زیادہ ایک بات کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ نشاط اصفہانی، فتح علی خاں صبا۔ اور وصال شیرازی جیسے پست شاعروں پر کئی کئی صفحے مصنف نے سیاہ کئے ہیں مگر نظیری نیشاپوری جیسے بلند پایہ شاعر پر پوری دو سطریں بھی نہیں ہیں۔ فیضی پر صرف ڈیڑھ صفحہ ہے اور ابو طالب کلیم پر صرف چند سطریں ہیں۔ ان شاعروں کا اس کے سوا اور کیا قصور تھا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، یا یہ کہ وہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ اس کے برخلاف صائب پر تین صفحے لکھے ہیں اور وہ اس لئے کہ صائب ہندوستان میں چھ سال رہ کر پھر ایران واپس چلا گیا تھا۔ اس قسم کی وطنی عصبیت اہلِ علم کو کسی طرح زیب نہیں دیتی۔

"ادبیاتِ ایران" میں صرف شاعروں ہی کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس میں ایران کے علماء اور فضلاء اور فارسی زبان کی مشہور تصانیف کا تعارف بھی درج ہے! ندوۃ المصنفین نے اس کتاب کو شائع کر کے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

گلگونہ

"گلگونہ" از:۔ محمد یسین تسکین قریشی۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات (مجلد) رنگین گرد پوش۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

---

[1] تحقیقات کی جمع الجمع "تحقیقاتیں" کھٹکتی ہے۔ [2] درد کی جمع اردو میں محلِ نظر ہے اور یہ کہ "درد ہو رہے ہیں"۔ زچگی کے درد کے لئے عام طور پر بولتے ہیں۔ [3] "خطِ تنسیخ" کا محل تھا۔

جناب تسکین کو لوگ بہت کم جانتے ہیں حالانکہ وہ شہرت و تعارف کے مستحق تھے۔ پروپیگنڈے کے اس دَور میں ایک عزلت پسند، خاموش اور خود دار شاعر کا گمنام رہنا یا بہت کم مشہور ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جو شاعر ایسے شعر کہتا ہو ؎

رندی و میکشی کارِ آساں نہ تھا — ہائے! وہ رند جو پارسا ہو گیا!

مجھے تو غمِ پائمالی نہ تھا! — اُنہی کے قدم ڈگمگانے لگے

اس کی گمنامی خود زبان و ادب ہی کا نقصان ہے۔

"گلگونہ" تسکین صاحب کے کلام کا حسین مجموعہ ہے۔ جس پر حضرت جگر مراد آبادی نے پیش لفظ۔ جناب اختر لکھنوی نے تعارف اور پروفیسر آلِ احمد سرور نے مقدمہ لکھا ہے۔ جناب سرور نے تسکین کے کلام پر کس قدر محتاط مگر سچا تبصرہ کیا ہے۔

"ایک ہمواری، شگفتگی، اور مہذب رندی کا احساس اُن کے یہاں چھلکا پڑتا ہے۔ اُن کے یہاں پختگی کے باوجود تازگی اور شگفتگی ہے...."

تسکین کے کلام میں نغمہ و فریاد کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ انتہا پسند عاشق نہیں ہیں۔ اُن کے مزاج میں بیشک شوریدگی ہے مگر توازن و اعتدال کے ساتھ۔ اور یہی چیز اُن کے کلام میں ملتی ہے۔ ان شعروں کو پڑھیے اور لطف اندوز ہوجیے ؎

خوشا عمرے کہ گزرد در جوارِ گنبدِ خضرا — خوشا مرگے کہ سازِ زندگی را کامیاب ایں جا

غمِ بے مائگی، شرمِ گنہ، بے تابیٔ ہجراں — یہ سارا قافلہ منزل بہ منزل لے کے آیا ہوں

کم نہیں حوصلۂ ضبط مگر کیا کیجیے — دل بھر آیا ہے ترا نام جہاں آیا ہے

کبھی کبھی تو کوئی نعرۂ جنوں پرور — کہ بے دلی ہی نہیں اہلِ عشق کا دستور

ہر ایک داغِ جگر جنتِ نظارہ سہی — تری نگاہ کی رسوائیاں نہیں منظور

زندگی تیرے تصور سے الگ رہ نہ سکی — نغمہ کوئی ہو مگر ساز یہی کام آیا

بڑا لطف ہے نالۂ نیم شب میں — اگر عشقِ خود دار کر لے گوارا

غمِ زندگی کا مٹانا ہی کیا ہے — محبت کی دو چار آہیں بہت ہیں

عقل ہے مصلحت نگر، عقل سے کر نہ ساز باز — دل جو کہے وہ کر گزر، عشق نہیں زمانہ ساز

تمہیں خوشی ہے کہ ساحل سے ہمکنار ہو تم — ہمیں یہ غم ہے کہ طوفاں کا لطف اُٹھا سکے

کرم کی آس بھی امیدِ پائمال میں ہے — کہ دل بڑھانے کی قوت ترے خیال میں ہے

کہاں تک حسن بھی آخر کرے بربادیاں دل کی — محبت روز اک دنیا نئی آباد کرتی ہے

کچھ ایسے نقش بھی راہِ فنا میں چھوڑ آیا ہوں — کہ دُنیا دیکھتی ہے اور مجھ کو یاد کرتی ہے

رہِ عشق میں کوئی کتنا ہی سنبھلے! — مگر کچھ نہ کچھ لغزشیں ہیں ضروری

نہ سمجھے تھے عہدِ تغافل سے پہلے — کہ تیری جفا بھی ہے کتنی ضروری

دل ہی نہ رہا تو آرزو کیا — خود ہی نہ رہے تو جستجو کیا

کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار — لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھیے

بڑھ جائیں حوصلے نہ دلِ مبتلا کے دیکھ — اے دوست! التفات کے پہلو بچا کے دیکھ

ہے شاق جدائی مجھے یارانِ سفر کی ——— لیکن میں کروں کیا مری منزل ہے کہیں اور

اٹھے نہ دستِ دعا ورنہ یہ دعا کرتے ! ——— کہ اہلِ حُسن بھی دردآشنا ہوا کرتے

دے چکے دل تو کسی سے ہمیں کیا لینا ہے ——— عشق دراصل تمنّا کا مٹا لینا ہے

تیرے لئے ملنے مجھے سب اب یہ تعلق چھوٹ گیا ——— ایک ترا کیا دامن چھوٹا، سارا زمانہ چھوٹ گیا

عشق میں رسوائیاں ہوتی ہیں اور ہوں گی ضرور ——— کیا کریں مجبور ہیں، تم کیا کرو، ہم کیا کریں

انجام تو ظاہر ہے اے موجِ فنا ! لیکن ——— آنے دے نظر جب تک ساحل نظر آتا ہے

صبر کی تلقین وہ بھی یاد دیار آنے کے بعد ——— دیر تک روتے رہے ہم دل کو سمجھانے کے بعد

درازیٔ شبِ غم کی دعائیں کرتا ہوں ——— غرض یہ ہے کہ مری زندگی دراز نہ ہو

محبت میں کسی کی کیا شکایت ——— جو ہوتا آرہا ہے۔ ہو رہا ہے !

نکالوں کس طرح دل سے تری نظروں کے تیروں کو ——— بھلا کوئی مٹا سکتا ہے ہاتھوں کی لکیروں کو

ہزاروں[1] اور بھی گئے تھے بے بلائے ہوئے ——— مجھی سے کیوں یہ بھری بزم میں سوال ہوا

اسی دامن میں کبھی پھول بھرے تھے میں نے ——— جس میں الجھے ہوئے آتے ہیں نظر خار مجھے

حالِ بیتابیٔ دل کون کہے کون سنے ——— اپنے ہی ہوش بجا رکھنے میں دشوار مجھے

ترا خیال بھی ہے تیرے حُسن سے معمور ——— تمام نغمہ و مستی، تمام نکہت و نور

دوسرا رُخ :-

یہ طیبہ قیمت کونین ہم یکسر نمی ارزد ——— خدا ایں جا، رسول ایں جا، کلام ایں جا، کتاب اینجا (صفحہ ۴۵)

"قیمت" کا نہیں یہاں "دولت" کا محل تھا۔

کس قدر اس غم عشق نہاں آیا ہے ——— دل دہی کے لئے اک دشمنِ جاں آیا ہے (صفحہ ۶۱)

"نہاں" زاید ہے جو مطلع میں قافیہ کی مجبوری کے سبب لایا گیا ہے۔

خدا گواہ کہ ساقی پرستیوں کے لئے ——— نہ ترکِ توبہ لازم نہ ترکِ مے ہے ضرور (صفحہ ۶۳)

اوّل تو "ساقی پرستی" کی جگہ جمع (ساقی پرستیوں) لائی گئی ہے۔ پھر "ساقی پرستیوں" ہی نے شعر کے مفہوم کو گنجلک بھی بنادیا ہے !

نہ جانے ہے کیوں زندگی کا سہارا ——— وہ پہلی نظر جو نہ اٹھی دوبارہ (صفحہ ۷۰)

کس کی پہلی نظر، معشوق کی یا عاشق کی ؟ اگر محبوب کی پہلی نظر مراد ہے تو اس کا دوبارہ نہ اٹھنا ایک عجیب بات ہے۔ شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب سے جب پہلے پہل نظر ملی تھی تو وہی اس کی پہلی نظر میری زندگی کا سہارا ہے اور پھر اس کے بعد پہلی نگاہ کی طرح محبوب نے دوسری نگاہ کی ہی نہیں — شعر میں یہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوا۔

مجھے عزیز سہی خاکِ دل مگر یہ کیا ——— تمہیں نے آگ لگائی، تمہیں بجھا نہ سکے (صفحہ ۸۵)

شعر دو لخت ہے۔ دونوں مصرعوں میں معنوی ربط نہیں۔

---

[1] "ہزاروں" کی جگہ "بہت سے" ہوتا تو مبالغہ کا یہ تکلف باقی نہ رہتا۔ (م،ق)

بت کدہ، بت کدہ سہی لیکن آ گئے اب تو ہرچہ بادا باد (صفحہ ۹۰)

کاش! "بت کدہ" کی جگہ "میکدہ" ہوتا! "بت کدہ" سے ہنگامہ آرائی اور بدحالی و خرابی کا کوئی تصور وابستہ نہیں ہے۔ "ہرچہ بادا باد" میکدے میں پہنچ کر ہی ایک اجنبی آدمی کہہ سکتا ہے۔

اب آ گئے سہارا ہی تیرے کرم کا جہاں تک ہوا ہم نے ہستی مٹا دی (صفحہ ۹۹)

دوسرا مصرعہ کتنا کمزور ہے۔ اس شعر کو غزل میں رکھنا ہی نہیں چاہیئے تھا!

جب آساں نظر آئی راہِ محبت تو خود بیٹھ کر ہم نے مشکل بڑھا دی (صفحہ ۱۰۰)

یہ شعر بھی اُوپر والے شعر کی طرح بھرتی کا شعر ہے۔

ہے حقیقت آشنا ایک تیرے ستم سے میں بیٹھا ہوں کیسا مطمئن دونوں جہاں کے غم سے میں (صفحہ ۱۱۷)

"بیٹھا" کا الف کتنی بُری طرح دب رہا ہے! مصرعہ ثانی میں "ایک" بھی کھٹکتا ہے۔

دلیلِ شوق تسلیم و رضا معلوم ہوتی ہے جفا سے بے نیازی اپنی وفا معلوم ہوتی ہے (صفحہ ۱۴۲)

شعر میں خاصہ ابہام ہے۔ "جفا سے وفا کا بے نیاز ہونا" یہ کیا بات ہوئی؟

فراق کیا ہے محبت کی آبرو کرنا کوئی ملے نہ ملے ہم کو جستجو کرنا! (صفحہ ۱۵۷)

اوّل تو "محبت کی آبرو کرنا" ہی عجیب سا انداز بیان ہے۔ پھر "فراق" کی یہ تعریف "defination" کہ وہ محبت کی آبرو کیا کرنا ہے۔ عجیب تر ہے!

دلِ مخزوں مٹے، ہم بھی مٹیں، دُنیا بھی مٹ جائے جب اتنی منزلیں طے ہوں تو اُن کی دید ہوتی ہے (صفحہ ۱۷۰)

"دُنیا بھی مٹ جائے" یہ ٹکڑا شعر میں بے ربط سا ہے!

کہیں کہیں ایسی رنگینیوں کے باوجود "گلگونہ" کی رنگینی اور عارض آرائی اپنی جگہ قائم ہے۔

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری
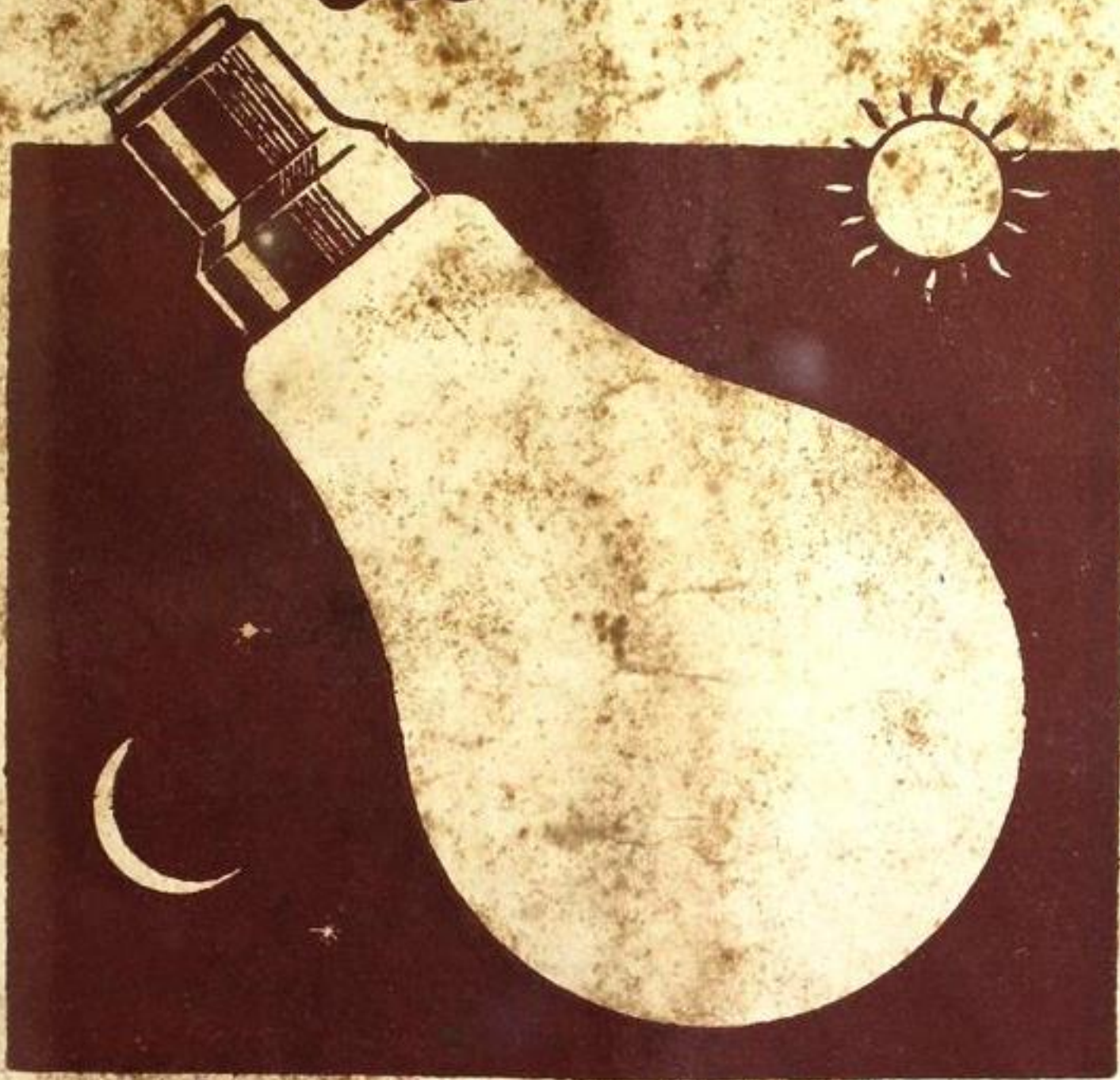
جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۳

فاران

جون ۱۹۵۶ء ایڈیٹر ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان کی قسمت کے ستارے اُس وقت تک گردش میں رہیں گے، جب تک یہاں حصولِ اقتدار کی رسہ کشی جاری ہے۔ دستور سازی کی اسلامی اسپرٹ کو اگر یہ "بڑے لوگ" محسوس کرتے تو اُن کے فکر و عمل کا معیار بدل جاتا۔ "دستور" کی تشکیل کے بعد تلافیٔ مافات کا بہترین موقع ہاتھ آگیا تھا۔ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو آئینِ پاکستان کی اساس تسلیم کرنے کے بعد ضرورت تھی کہ پاکستان کے نظم و نسق کے سفینہ کا رُخ مُڑ جاتا۔ اربابِ حل و عقد کی زندگیوں میں تبدیلیاں نظر آنے لگتیں، لوگ اس طرح سوچنا چھوڑ دیتے کہ پاکستان ایک خوانِ یغما ہے اور جس حیلہ سے بھی ممکن ہو اس سے بہ قدرِ لب و دنداں لذت حاصل کی جائے۔ حالانکہ اب فکر و نظر کا انداز یہ ہونا چاہیئے تھا کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے۔ یہاں جس کے پاس کوئی منصب اور عہدہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس امانت کی حفاظت اور اس کی ترقی و بقا کی کوشش ہر عہدہ دار اور صاحبِ منصب کا فرض ہے۔ "حکومت کرنے" کا چسکا جو انگریز نے لگایا تھا اُسے اب رخصت ہو جانا چاہیئے۔ کہ اپنے بھائی بندوں کی خدمت کی جاتی ہے اُن پر حکومت نہیں کی جاتی!

اب تک کس نے کیا کیا؟ اس کا ریکارڈ ہر "بڑے آدمی" کے حافظہ میں بھی محفوظ ہے۔ اور عوام بھی اس سے واقف ہیں۔ ضرورت تھی کہ پچھلی غلطیوں کی ایک ایک کرکے تلافی اور اُن بدنما داغوں کی سنت دھونے کی جاتی ——— مگر "مغربی پاکستان" میں جاہ و اقتدار کی جو کشمکش جاری ہے اُس نے اس حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا کہ پاکستان کے "بڑے لوگوں" کے نہ تو دل بدلے ہیں اور نہ اُن کے زاویہ ہائے فکر و نظر میں کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ دستور سازی سے پہلے جاہ و اقتدار کے لئے جو کچھ ہوتا تھا ٹھیک اسی طرح کی نزاع آج بھی برپا ہے۔ وہی توڑ جوڑ، وہی ساز باز، وہی ایک دوسرے کو پچھاڑ کھانے کی فکر! اور یہ نہیں ہے کہ یہ کشمکش صرف پاکستان کے اس ایک بازو (wing) تک ہی محدود ہے۔ اس کے تار مرکز تک

کھنچے ہوئے ہیں۔ اور اوپر کے جو واقعات ہمارے کان تک پہنچتے رہتے ہیں اگر اس کے مبالغہ کو ان واقعات سے منہا بھی کر دیا جائے تو
بھی پاکستان کے "خاک نشین وڈیروں" کو یہ نظر آتا ہے کہ اسلامی دستور سازی کے بعد پاکستان کے افق پر تو سپیدۂ سحر طلوع
ہو چکا ہے مگر ان "سرکاروں"، "حضوروں"، اور "عالی جاہوں" کے ایوانوں میں اسی دھندلکے کی عملداری ہے۔ جس کو اب اجالے
سے بدل جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اسی انقلاب کے لئے اسلامی دستور سازی کا عوام نے مطالبہ کیا تھا۔

وہی پہلے کی طرح پارٹی بازیاں اور توڑ جوڑ کی شیشہ گری ہے۔ اور اپنے اقتدار کی عمر کی درازی کے لئے دوڑ دھوپ ہے!
جاہ و اقتدار کی خواہشیں دوسرے ملکوں کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں مگر پاکستان میں یہ خواہش جنون کی حد تک پہنچ گئی ہے
پاکستان چاہے بنے یا بگڑے مگر کرسی نشینوں کی کرسیاں سلامت رہنی چاہئیں، یہاں جو ایک بار کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر
اس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ مرتے دم تک یا تو وہ کرسی سے چمٹا رہے یا کرسی اس سے چمٹی رہے!

ہم یہ سطور اس وقت قلم بند کر رہے ہیں جب کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی دو چار دن میں اپنا فیصلہ صادر کر دے گی۔ یہ
فیصلہ کس پارٹی کے حق میں ہوگا؟ اس کے متعلق ہم کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ ہماری معلومات کا ذریعہ "پریس" ہے اور پریس
کے واسطہ سے جو خبریں اب تک آتی رہی ہیں ان میں عجیب و غریب مدوجزر پایا جاتا ہے۔ اگر کسی ملک میں اصول پسند لوگ ہوں
تو ان کی روش سے کسی بات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا امکان ہے۔ ایسا ہوگا اور ایسا نہ ہوگا۔ مگر جہاں ذرا
سے لالچ پر اصول کی دھجیاں بکھر سکتی ہوں وہاں کوئی بڑے سے بڑا مبصر بھی یہ حکم نہیں لگا سکتا کہ کل کیا ظہور میں آنے والا ہے۔
اس قسم کے "مرغانِ بادنما" عین وقت پر اپنی سمت بدل سکتے ہیں!

مغربی پاکستان کی جنگ اقتدار نے ان "بڑے لوگوں" کو بھی بے نقاب کر دیا جو اصول پرستی کے نہ صرف یہ کہ دعویدار تھے
بلکہ اپنے کو اس کا علمبردار سمجھتے تھے اور جو پارٹی بازی سے بلند رہنا چاہتے تھے! کہاں وہ شورا شوری اور کہاں یہ بے نمکی کہ جماعت
سازی اور پارٹی بازی پر لعنت بھیجنے والوں نے خود "پارٹی" بنائی اور اس طرح بنائی کہ ہتھیلی پر سچ مچ سرسوں جما کر دکھا دی!
اور یہ بھی عجیب اتفاق بلکہ یوں کہیئے کہ توارد ہے کہ اسی زمانہ میں مغربی پاکستان کے اربابِ حل وعقد کو "نظم و نسق" کی درستی
کے لئے وہاں کے بعض ذمہ دار عہدہ داروں کے تبادلہ کی تدبیر سوجھی، راتوں رات تبادلے اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کسی کے
تو ڈیپارٹمنٹ تک کو بدل دیا گیا! مخالف پارٹی کے لوگ ان تبادلوں پر جو رائے زنی کر رہے ہیں وہ اخبارات میں عوام کی
نگاہ سے گزرتا رہتا ہے مگر ہم تو پھر بھی یہی کہیں گے کہ یہ وہ "امورِ مملکت" ہیں جن کو "خسرواں می دانند"! جن کے ہاتھوں میں
زمامِ اقتدار اور عنانِ حکومت ہے وہ اپنے زیردست عہدیداروں کو حسبِ مصلحت کے تحت جب چاہیں بدل سکتے ہیں! جس ملک
میں "مصلحت" کی خاطر مرکزی اسمبلی توڑی جا سکتی ہے وہاں چھوٹے موٹے عہدیداروں کے تبادلے کس گنتی میں ہیں۔ اوپر سے
ہی ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے! مگر "اصول" کیا کہتا ہے؟ جی اصول! اصول کچھ نہیں کہتا۔ اقتدار کے سامنے اس بیچارے
——— اصول ——— میں دم مارنے کی طاقت کہاں ہے؟

مسلم لیگ نے جس کردار کے لوگ پیدا کئے ہیں اس کا اندازہ اس جماعت کے ان اونچے "سابق وفاداروں" سے ہو سکتا ہے
جو جاہ و اقتدار کی چمک دمک دیکھ کر مسلم لیگ کو دھڑلے سے طلاقِ بائن دیئے چلے جا رہے ہیں اور جنہوں نے ہوا کا رخ
دیکھ کر اپنی تمام اگلی پچھلی وفاداریاں اور عقیدت مندیوں کو تہ کر کے رکھ دیا ہے! ری پبلکن پارٹی چاہے آگے چل کر پاکستان کو
جنت الفردوس بنا کر دکھا دے مگر اس وقت اس کے پاس "جاہ و اقتدار" کے سوا اور کیا ہے؟ یہی وہ کشش ہے جس نے

بڑے بڑوں کو اس نومولود پارٹی کی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا دیا ہے۔ یہ لوگ تو بس اقتدار کے ساتھی ہیں۔ جب تک مسلم لیگ کے پاس اقتدار تھا اور اس سے توقعات وابستہ رہیں تو اس کیمپ میں شامل رہے۔ جب ادھر سے امیدیں ٹوٹ گئیں تو جس کے پاس اقتدار ہو اُدھر ٹوٹ کر آملے۔ ان لوگوں نے مسلم لیگ کا ساتھ کسی اصول کی بناء پر نہیں بلکہ اپنے اغراض کی بناء پر دیا تھا۔ اور اب "ری پبلکن پارٹی" سے اُن کی اس نئی نئی وابستگی اور جدید وفاداری کی بنیاد بھی شخصی منفعت ہے! "ری پبلکن پارٹی" کا بودا پن تو اسی بات سے ظاہر ہے کہ اس پارٹی میں کسی کے شامل ہونے کی شرط نہ اُس کی اصول پرستی ہے اور نہ کسی کے کردار کی مضبوطی ہے، اسے تو اپنی تائید کرنے والوں کی تعداد بڑھانے کے لئے کچھ "سر" کچھ "ہاتھ" اور کچھ "زبانیں" چاہئیں۔ ملک اور قوم کی تعمیر کے لئے نہیں، ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو بچانے کے لئے یہ حصار باندھا گیا ہے۔ ع

یہ ابتداء ہے تو پھر اس کی انتہا معلوم!

ڈاکٹر خان صاحب کانگرس کے دست و بازو رہے ہیں۔ انہوں نے زمانہ کے بہت کچھ گرم و سرد دیکھے ہیں۔ وہ اپنے ان "نئے حامیوں" کو پہچانتے تو ہوں گے کہ وہ کیا ہیں؟ اگر ہمارا خیال صحیح ہے کہ وہ سب کچھ جانتے پہچانتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے اقتدار کی عمر بڑھانے کے لئے ان اصول شکن اور بودے کردار رکھنے والوں کی کمزوریوں سے بروقت فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ـــ اور اگر وہ ان لوگوں کو اب تک نہیں پڑھ سکے ہیں تو زمانہ انھیں آگے چل کر بتا دے گا کہ۔ ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!

مسلم لیگ کے باوقار صدر سردار عبدالرب نشتر یقیناً مخلص ہیں اور اقتدار کے بھوکے نہیں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی سردار صاحب موصوف جرأت مندانہ اقدام سے ہمیشہ کتراتے رہے ہیں۔ پاکستان میں بارہا ایسے اوقات آئے ہیں کہ عوام کی نگاہیں اُن کی طرف لگی ہوئی تھیں اور وہ اگر جرأت دکھاتے اور ہمت سے کام لیتے تو حالات بہت کچھ بدل سکتے تھے! اب انہوں نے تھوڑی بہت چلت پھرت دکھائی بھی ہے تو مسٹر کھوڑو اور میاں ممتاز دولتانہ جیسے "یاران شاطر" اُن کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں دوسری طرف مسٹر گورمانی اور جناب حسین شہید سہروردی کا اتحاد اور اُن کے عزائم ہیں۔ ان حالات میں مغربی پاکستان میں جس گروپ اور پارٹی کی بھی فتح ہوگی تو وہ حقیقت میں "ہوس اقتدار" کی فتح ہوگی، کرسیاں جوں کی توں رہیں یا بدلیں۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں، ہم تو اس نقطۂ نگاہ سے یہاں کے حالات کو دیکھتے اور سوچتے ہیں کہ اسلام اور پاکستان کے لئے کس فرد اور جماعت کا وجود فائدہ بخش ثابت ہوگا۔

آٹھ سال کی طویل مدت ان "بڑے لوگوں" کی کشمکش اقتدار ہی کی نذر ہو گئی۔ تعمیر کی طرف اگر دو قدم بڑھے ہیں تو تخریب کی جانب پچاس قدم اٹھے ہیں۔ بناؤ اور بگاڑ کا تناسب اگر نصف نصف رہتا تو بھی غنیمت تھا۔ دستور سازی کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد توقع تھی کہ یہ ڈرامہ جو اب تک کھیلا جاتا رہا ہے۔ اب بند ہو جائے گا اور کسی وقفہ کے بغیر تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ توقع ایک خواب بے تعبیر ثابت ہوئی۔ طالبانِ جاہ و اقتدار کی ذہنیت میں کوئی انقلاب نمودار نہیں ہوا۔ اُن کے وہی مشاغل ہیں جو اب سے پہلے تھے۔ آپس کی اس نزاع و کشمکش نے بین الاقوامی دنیا میں پاکستان کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ آج نہ امریکہ ہمارا دوست ہے اور نہ روس ہمارا وزن محسوس کرتا ہے۔ ہماری اس کمزوری کو دیکھ کر ہندوستان جو چاہتا ہے کہہ اور کر گزرتا ہے اور ہم اس کے قول و فعل کی بس وضاحت ہی طلب کرتے رہتے ہیں۔

رہا انگریز، تو اس کے داخلی اور خارجی اثرات کے "آسیب" سے ہم اپنے کو محفوظ نہیں کر پائے! جھاڑو کے بکھرے ہوئے تنکوں کی طرح ہمارا حال ہے۔ ہوا کا کمزور سے کمزور جھونکا ہم پر اپنا زور چلا سکتا ہے!

پاکستان کو ہم نے "بنیانِ مرصوص" کی توقع کے ساتھ حاصل کیا تھا مگر اربابِ اقتدار کی بے تدبیری، بے دانشی اور غرض پرستی کے ہاتھوں یہ ریت کی دیوار بن کر رہ گیا ہے۔ اور اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی خدا کے ان نیک بندوں (؟) کو ترس نہیں آتا اور یہ بتانِ خود پسند اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس جہاز میں چھید پر چھید ہوتے چلے جا رہے ہیں اس میں وہ خود بھی سوار ہیں!

ذمہ دار کون ہے؟

ایک طرف ملحدوں اور کمیونسٹوں کی وہ ٹولی اور اسلام کے دشمنوں کا وہ گروہ ہے جس نے نفاق کی چادر اوڑھ رکھی ہے اور جو اپنی فطرت سے "مجوسی" واقع ہوا ہے۔ اور جو اس انتظار میں ہو کہ کیسے ہی پاکستان کے حالات بگڑیں اور اس کا شیرازہ پراگندہ ہو اور ہم اس برہمی اور پراگندگی کا سارا "الزام" "اسلام" پر رکھ دیں اور دنیا میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹیں کہ اسلامی نظریے اس زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے اور پاکستان کے حالات کو "اسلامی دستور و آئین" نے بگاڑا ہے!

ہم ان لوگوں پر جو اس معاملہ میں "نفاق" میں تو نہیں مگر تذبذب میں مبتلا ہیں۔ اس بات کو کھول دینا چاہتے ہیں کہ "اسلامی دستور" کی تشکیل کے بعد اگر عوام، خواص نے اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا تو یہ کوتاہی "اسلامی دستور" کی نہیں پاکستان کے باشندوں کی ہوگی! اللہ کی کتاب مسلمانوں کے درمیان موجود ہے اور چونکہ مسلمان اس پر عمل نہیں کرتے اس لئے وہ روز بروز گرتے اور پست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو مسلمانوں کی اس پستی اور زبوں حالی کا "قرآن" ذرہ برابر بھی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ مسلمان خود اپنی بربادی کے ذمہ دار ہیں! اگر کوئی مریض طبیب حاذق کے لکھے ہوئے نسخہ کی دوائیں ہی کو سرے سے نہ پیئے اور اس کی حالت بگڑتی چلی جائے، تو مریض کی اس ابتری کا ذمہ دار طبیب کے اس نسخہ کو تو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ "سچائی" کا کون قائل نہیں ہے اور "جھوٹ" کو کون برا نہیں سمجھتا۔ مگر دنیا میں جھوٹ بولنے والوں کی اکثریت کو دیکھ کر کیا یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ "سچائی" ناکام ہو گئی اور زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ کیا اندھوں کے اس قول اور طنز میں کوئی وزن ہے کہ سورج کی روشنی سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا!

یہ کسی نے بھی دعویٰ نہیں کیا تھا کہ کاغذ پر "اسلامی آئین" ثبت و متشکل ہوتے ہی پاکستان کے دن پلک جھپکتے پھر جائیں گے اور آناً فاناً یہاں کا سارا بگاڑ، بناؤ سے بدل جائے گا۔ دستور سازی نے تو اس قافلہ کی سمت متعین کی ہے۔ اب اگر قافلے والے اور خود قافلے کے نگہبان چل کر ہی نہ دیں تو تنہا "سمت کا تعین" نہ منزل بن سکتا ہے، نہ تعینِ جادہ اور نہ کسی رہرو کا نقشِ پا!

عوام سے

ہمیں آخر میں پاکستان کے عوام سے یہ عرض کرنا ہے کہ تم میں جو کمتری کا احساس پایا جاتا ہے، اس نے تمہیں ابھرنے اور غالب ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اس لئے ہر وہ شخص جسے تم ناپسند بھی کرتے ہو صرف اپنی طاقت، سازباز اور سیاسی شعبدہ گری کے زور پر تم پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور تم اس کی طاقت کے آگے اپنے کو بے بس پاتے ہو۔ ملک کی اصل طاقت تمہارے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے کہ پاکستان تمہاری قربانیوں کے سبب وجود میں آیا ہے۔ ان "بڑے آدمیوں" میں سے تو کسی کے پھانس بھی نہیں لگی اور جس کے لگی ہے تو وہ اس چبھن کی بہت زیادہ قیمت وصول کر چکا۔ گھر سے بے گھر تو تم ہوئے ہو۔ ناموس تو تمہارا لٹا ہے۔ تمہاری عورتیں بیوہ اور تمہارے بچے یتیم ہوئے ہیں۔ پاکستان پر تمہاری مظلومیت کا، بیکسی کا اور قربانیوں کا

احسان ہے اور ان "بڑے آدمیوں" کی عیش سامانیاں پاکستان کی رہینِ منت ہیں!

پاکستان ایک جمہوری سلطنت ہے اور جمہوریت میں کوئی شخص عوام کے مفاد اور اُن کی "پسند" سے بے پروا ہو کر حکومت کے کسی منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ تمہیں خود اپنی طاقت کا پُوری طرح اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا ہو؟ حالانکہ دستور سازی کے بعد تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ نہ جانے کتنے "بڑے لوگ" اسلامی دستور کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے مگر تم نے مطالبہ کیا کہ ہم "اسلامی دستور" چاہتے ہیں۔ یار لوگوں نے "دستور اسلامی" کی راہ روکنے کے لئے کیا کیا جتن کئے۔ اور کیسی کیسی نازک اور خوفناک چالیں چلیں۔ مگر اہلِ نفاق کی تمام کوششوں کے علی الرغم دستور بن کر رہا۔ اور اس محاذ پر تمہاری کھُلی ہوئی فتح ہوئی!

دستور سازی کے بعد ملک کی تعمیر اور معاشرے کی تطہیر کا مرحلہ شروع ہونا چاہیئے۔ مگر پاکستان کی تعمیر اُس وقت تک نہیں ہو سکتی، جس وقت تک یہاں کی زمامِ حکومت جاہ و اقتدار کے پیاسوں اور عیش و دولت کے بھوکوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس ذہنیت، سیرت، کردار اور عزائم کے لوگ تعمیری کام انجام دے ہی نہیں سکتے، ملکوں کی تعمیر یوں ہی نہیں ہو جاتی۔ یہ تو بہت کچھ ایثار، اخلاص اور دردمندی چاہتی ہے۔ اور ذاتی اغراض کے بندوں کے پاس سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ خلوص و ایثار کی دولت ہے!

ان دردناک حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ آئینی جدوجہد کے ذریعہ مُخلص اور ایثار پیشہ لوگوں کو اُوپر لایا جائے، قیادت کی تبدیلی لازمی، ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ جب تک یہ نہ ہوگا پاکستان کے افق پر مسرت و خوشحالی کی ایک صبح بھی طلوع نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کا دستور جس طرح آئینی جدوجہد کے سہارے بنا ہے۔ اسی طرح آئینی طور پر قیادت کو بھی بدلا جائے گا۔ ناپسندیدہ قیادت کسی ملک کے عوام کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ جمہوریتوں میں عوام کی آئینی جدوجہد بیداری کی علامت ہوتی ہے کہ اس خاکستر میں ابھی تک "شررِ زندہ" موجود ہیں۔

عوام کا ایکا بہت بڑی چیز ہے۔ سیاست و حکومت کی کوئی طاقت عوام کے اتحاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عوام جس مطالبہ پر جم جائیں اور جس بات کا تہیہ کر لیں، کوئی طاقت اُس کو پھر ٹال نہیں سکتی! پاکستان کسی خاندان نے تلوار کے زور سے فتح نہیں کیا۔ جس پر حکومت کرنا وہ اپنا حق اور ورثہ سمجھتا ہو۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ہندوستان کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ تھا۔ مسلم لیگ کے چند لیڈر کیا کر سکتے تھے اگر مسلمانوں کی غالب اکثریت اس مطالبہ کی تائید نہ کرتی! پاکستان اس لئے ہرگز حاصل نہیں کیا گیا تھا کہ یہ چند خاندانوں کے جذبۂ جاہ و اقتدار اور خواہشِ حکمرانی کا کھلونا بن کر رہ جائے، یہاں جو کوئی سیاسی جزر و مد سے فائدہ اُٹھا کر طاقت حاصل کر لے، وہ اپنے کو یہاں کا شاہِ مطلق العنان سمجھنے لگے اور عوام ان "بادشاہوں" کے خدمت گزار اور حاجب و دربان بن کر رہ جائیں پاکستان میں جب تک حاکم و محکومیت کی یہ صورت باقی رہے گی، یہاں کے حالات درست ہو ہی نہیں سکتے!

جس طرح پاکستان میں آئینی کوششوں کے ذریعہ دستوری انقلاب آیا ہے اسی طرح آئینی جدوجہد کے واسطے سے یہاں قیادت کا انقلاب بھی آئے گا۔ اور ضرور آئے گا۔ عوام کو موجودہ حالات سے بددل نہ ہونا چاہیئے۔ یہ حالات انشاء اللہ زیادہ دن تک قائم نہ رہیں گے، ان کو ایک نہ ایک دن بدل جانا پڑے گا!

اس انقلاب کی آئینی اور اصولی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ پاکستان میں جلد سے جلد انتخابات ہوں۔

اور ان انتخابات میں عوام اُن افراد کو اپنا ووٹ دیں۔ جو مخلص بھی ہوں، ایثار پیشہ اور عوام کے غم خوار بھی ہوں اور اچھی سیرتیں بھی رکھتے ہوں۔ تو توقع ہے کہ دو انتخابوں میں ناپسندیدہ لوگ بڑی حد تک چھٹ جائیں گے۔ اور اُن کی جگہ وہ لوگ آجائیں گے جو منصب و اقتدار کو اللہ کی دی ہوئی امانت سمجھ کر استعمال کریں گے !

پاکستان کے عوام جب تک افراد اور جماعتوں میں اچھے اور بُرے یا خوب اور خوب تر کی تمیز نہ کریں گے، اُس وقت تک پاکستان کا سفینہ یوں ہی موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہے گا کبھی منجدھار میں، کبھی ساحل کے قریب اور کبھی کسی چٹان سے ٹکرائو ــــ !

پاکستان کی حکومت عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہاں کے عوام کو ایک بہت بڑے امتحان میں مبتلا کیا ہے۔ یہ کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک کڑی آزمائش ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور انسانیت کی غم خواری اور فلاح و بہبود کے لئے حکومت کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن پاکستان کے خواص اور عوام دونوں سے باز پرس ہوگی کہ تمہیں جو خطۂ ارض دیا گیا تھا۔ اس کے نظام کو تم نے کس طرح چلایا اور سنبھالا؟ جب ہمارا ایمان ہے کہ آخرت میں ایک ایک ذرہ اور دانہ دانہ کا حساب لیا جائے گا۔ تو کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کے بارے میں ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے اور اگر پوچھ گچھ ہو تو ہم چند اُونچے درجہ کے غلط کاروں کی طرف اشارہ کر کے چھوٹ جائیں کہ پاکستان کی ابتری کے اصل ذمہ دار تو یہ تھے! مگر ہمارے ایسا کرنے سے کیا ہمیں چھٹکارا مل جائے گا۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم جن غلط کاروں سے واقف تھے اُن کے بدلنے کے لئے تم نے کیا جدوجہد کی؟ تمہارے اعمال ناموں میں اس جدوجہد، ایثار اور قربانی کا کیا کوئی نقش ملتا ہے؟

اپنے اندر خدا کے لئے جرأت و عزم پیدا کیجئے۔ توڑ پھوڑ کے لئے نہیں تعمیر کے لئے، تاریخ اپنا ورق اُلٹنے کے لئے تیار ہے مگر کچھ ہاتھ حرکت میں بھی تو آئیں۔ ع

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں میں جو شدید ابتری پائی جاتی ہے اُسے دیکھ کر مایوس ہوجانا اور ملک کے حالات سے علیحدگی اور بیزاری اختیار کرلینا۔ یہ بڑی کم ہمتی اور بزدلی کی بات ہے۔ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے۔ اس کے ایک ذرّہ کا نقصان خود ہمارا اور دین و ملت کا نقصان ہے۔ پاکستان کے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لئے جدوجہد کرنا دنیاداری کا کام نہیں ہے بلکہ دین کا کام ہے۔ اس جدوجہد میں شریک ہونے والوں کو آخرت میں اجر ملے گا۔ اور جو اس سے کترائیں گے اور علیحدہ رہیں گے اُن سے باز پرس ہوگی !

حکومت اور سیاست "دنیائے بے آخرت" اُس وقت بن جاتی ہے، جب اس کا مقصد ذاتی اغراض اور شخصی منفعتیں ہوں۔ لیکن جب حکومت کو "اقامتِ دین" کا ذریعہ اور سیاست کو بہ منزلۂ تدبیر سمجھا جائے تو پھر یہ پوری جدوجہد عبادت بن جاتی ہے۔

اگر کسی مسجد کو اُس کے بے راہ رو متولی سینما گھر میں تبدیل کرنا چاہیں تو کیا اُس بستی یا محلہ کے مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اللہ کے گھر کو "سینما ہال" نہ بننے دینے کے لئے جدوجہد کریں اور اُن کی اس جدوجہد کو "دنیاداری" کہنا خود مفہوم عبادت سے کس قدر بے خبری کی دلیل ہے !

مانا کہ ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر ہمیں تو اس "بدتری" کو "بہتری" سے اور اس "ابتری" کو "شیرازہ بندی" سے بدلنے کے لئے تگ و دو کرنی ہی چاہیئے۔ اسی میں ہماری دُنیا کی بھلائی ہے اور دین کی بھی!

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جرأت و عزیمت اور صداقت و اخلاص نے حکومتوں، قوموں اور ملکوں کے انتہائی بگڑے ہوئے حالات کو دُرست کیا ہے۔ اور بڑے بڑے فتنوں کو خیر و فلاح سے بدلا ہے۔ جنہوں نے حالات کو بگاڑا ہے وہ بھی آدمی ہی ہیں اور اس بگاڑ کو آدمی ہی بناؤ سے بدلیں گے۔ بگاڑنے کے مقابلہ میں "بنانا" یقیناً دُشوار تر ہے مگر دشواریوں پر بھی تو آدمی ہی قابو پایا کرتے ہیں!

نیکی کو مظلوم اور دبا ہوا پا کر اور بدی کو اُبھرتے ہوئے دیکھ کر بعض لوگ سہم جاتے ہیں کہ ہم اب کیا کریں اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی ہے۔ یہ نفس کا بہت بڑا دھوکا اور شیطان کی انتہائی باریک اور پُر پیچ چال ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کی مرضی تو حضرت خلیلؑ کی بُت شکنی، ضربِ کلیمی اور بدر و حُنین میں غازیوں کی تکبیر بن کر گُونجی ہے!

پاکستان کو لوگ ایک "واہمہ" سمجھتے تھے مگر ملّت کی عزیمت نے اُسے ایک حقیقت بنا دیا۔ "دستورِ اسلامی" بھی لوگوں کو ایک "خواب" نظر آتا تھا لیکن عوام کی جدوجہد نے اُسے ایک واقعہ کی صورت دے دی۔ اسی طرح عوام میں حرکت پیدا ہو گی اور اس حرکت کے پیچھے اخلاص و ایثار اور تعمیر و صداقت کی قوّت ہو گی تو "صالح قیادت" جس کا آنا آج "سعیِ بے حاصل" سمجھا جاتا ہے۔ کل انشاء اللہ ایک حقیقت اور پاکستان کے مُستقبل کی صبحِ تو بن کر رہے گا۔

میں مطمئن ہوں اگرچہ خراب ہے ماحول
خزاں کے بعد کا عالم بہار ہوتا ہے

ماہر القادری

س، ب بنتِ ارشد
(ممیرہ اسمٰعیل خان)

حقدار و سزاوارِ حمد و ثنا خدائے واحد و یکتا است کہ حبیب خود محمد رسول اللہ صلعم فرستادہ ما را از ظلمت کفر و شرک و جہل و معصیت نجات بخشیدہ است، و بنورِ ایمان و عرفان روشن گردانیدہ است۔ الحمد للہ۔

زن و پردہ در پاکستان

از قیامِ پاکستان یک مملکتی نو بوجود آمدہ است، چوں اکثریت مردمان مسلمانند، علمائے مذہب و دیگر دانشمندانِ ملت می خواہند کہ قانونِ ایں مملکت بر شرع اسلامی باشد و تمام اوضاع و رسوم بر اصولِ اسلامی برپا شود۔ دیموکراسی اروپائی برطرف شود و جمہوریتِ اسلامیہ جائے آں بگیرد۔ ہر مرد و زن بحق واجبی خود برسد و زندگانی با عزت و با عظمت بسر بردہ در دنیا و آخرت سُرخ رو شود۔ دریں خصوص زناں کہ از مدت دراز از بے التفاتی و جور و جفائے مردمان، بے سواد و پست حال و غافل بودہ اند نیز سر بر آوردہ برائے یافتن حقوق خود صدائے احتجاج بلند می کنند۔ مدبرانِ ملت و روشن دماغانِ مملکت پے ایں نقطہ بردہ اند کہ تا وقتیکہ زنانِ ملت با سواد و با سلیقہ و ہوشیار نباشند۔ ہرگز اطفال و جوانان با ہوش و دلیر و عادل پیدا نشوند۔ ترقی و سربلندئ ملت بر اہلیت و دانشورئ زنان منحصر است۔ اگر آں ہا جاہل و بے سواد باشند ہمہ ملت ناشائستہ و بد اطوار باشد۔ امّا لازم است کہ ہمہ تعلیم ایشاں بر کتاب و سنت و حکمت و آداب خانہ داری و مثل آں منحصر باشد۔ چوں مسئلہ تعلیم زناں در پیش آید مسئلہ پردہ ہم سر بر آرد۔ بعضے از روشن خیالانِ نام نہاد بر آنند کہ زن از پردہ بیروں آید و کارے بکند و در رزم و بزم بیاید۔ در ہیئتِ اجتماعیہ با مردم مساوی الحقوق باشد۔

بعضے از ظواہر پسنداں بر آنند کہ جائے زن خانہ است، و از خانہ بیروں نیاید۔ خانہ داری را پیشہ گیرد۔ اولاد پیدا کند و پرورش کند و بس۔ لیکن علمائے دین کہ روشن فکر باشند مے گویند۔ زن بیک اندازہ ای تعلیم دینی و دنیوی حاصل بکند تا اولاد صالح بر آورد۔ تربیت نکو بدہد و در ہیچ حال پردہ را بر طرف نیندازد۔ ہر کس بہ فکر و رائے خود پے سے برد۔ اما ہر چہ زمانہ بگوید یا بکند ما مسلمانان بہر حال ہر قدم کہ برداریم، ہر روش کہ اختیار کنیم باید کہ از جادۂ اسلامی منحرف نشویم۔

از روئے کلام پاک واجب است کہ زناں حجاب اختیار کنند کہ خدائے دانا می فرماید[1]:-

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا — الآیہ

---

[1] و بہ زنانِ ایمان دار بفرما کہ چشمانِ خود پست و فرود دارند و عصمت و ناموسِ خود نگاہ دارند و از زیب و زینتِ خود چیزے ظاہر نکنند مگر آنکہ بلا اختیار و ارادہ از آں چیزے خود ظاہر گردید۔ و خمار ہائے خود و سر پوشہا بر سینہ ہا و گریبانہائے خود انداختہ بپوشند و بجز شوہران و پدرانِ خود و دیگر محرمان بہ پیش کسے آرائشِ خود ظاہر نکنند — الخ۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ - (وپائے خود نکوبند تا از
زینت و آرائش خود آنچہ پوشیدہ دارند معلوم و ظاہر گردد)

ازیں آیات واضح است و بر صاحب ہوش و فہم ظاہر است کہ روش بے حجابی زناں کہ در مملکت ہائے اسلامی یعنی ایران و ترکی و مصر اختیار کردہ شدہ است خلافِ احکامِ خداوندی ہست - ایں طور ہرگز روا نیست کہ زناں ساقہا را عریاں کردہ - سینہ برافراختہ و چہرہا از غازہ برافروختہ سر برہنہ میانِ نامحرماں آیند و روند۔

خداوند حکیم ہر طریق کہ ما را آموختہ است برائے فلاح و بہبودیٔ دنیوی و اُخرویٔ ما انسب و اہم است، می توانیم کہ بر آں عمل نمودہ منازلِ ترقی طے کنیم - حدودِ پردہ کہ خدا تعالیٰ معین کردہ است آنہا را برجا داشتہ ہر عملِ مناسب بکار بردہ آسودگی و آزادی و ترقی کنیم - آں کوتاہ نظراں و تنگ بیناں کہ خواہند کہ زن را در چہار دیوار خانہ اسیر دارند[1] تا ہوائے بیرونی بر او اثر نکند - خلافِ احکامِ ایزدی راہ می برند[2] - حق و صواب میانِ افراط و تفریط در اعتدال است کہ زن نہ بے حجاب شود و نہ اسیر و درماندہ - در حدودِ شرع و حسبِ حالات تا یک حد از آزادیٔ سودمند متمتع باشد و لکن پردہ عصمت و حیا از ہر سو او را محیط باشد - و از اختلاط با بیگانگاں و نامحرماں و زنانِ ناپاک بکلی محترز باشد - و از علومِ دینی و مادی بحدِ لائق بہرہ ور باشد۔

چندانکہ زنانِ ملت تعلیم یافتہ تر و مہذب تر باشند - آں ملت دانش ور تر و متمدن تر باشد - در زمانِ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اولین زمانۂ ترقی و آزادیٔ زن بود - مے بینیم کہ او از دانش و درایت و بصیرت بہرہ ور بود و علوم دینیہ بر گرفتہ نام آور بود - ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا زنِ اول مسلمانست کہ در قرآن فہمی بہ درایت و تدبر کار برد - ایں واقعہ تاریخی است کہ زناں در جنگ شریک شدند - تیمار داری زخمیاں کردند - و سقائی کردند - و مردمانِ کم حوصلہ را بر دلیری و جہاد برانگیختند، اکنوں کہ مے توانیم کہ متفق شدہ حکومتِ مستقلۂ اسلامیہ قائم کنیم و ذرائع ترقی و اسبابِ معیشت در دستِ خود آریم باید کہ از تربیتِ زناں غافل نہ باشیم - او را از علومِ دینیہ بہرہ دار فرمائیم - و از علومِ مادیہ نیز عاری نہ باشد تا خدا ترس و باحیا باشد و صاحبِ بصیرت و دانشور نیز - و بدیں طور دخترِ امروز در فردا خواہر و مادرِ نیک باشد۔

اللہ تعالیٰ توفیق دہندہ است - از و یاری مے طلبیم۔

ترجمہ

حمد و ثنا اور ستائش کا صد ادا اور سزاوار خدائے واحد و یگانہ ہے۔ جس نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجکر ہم کو کفر و شرک اور جہالت و معصیت کی تاریکی سے نجات بخشی ہے اور ایمان و عرفان، یقین اور علم کی روشنی سے منور فرمایا ہے۔ الحمد للہ!

---

[1] البتہ وقتیکہ ضروریات معاشی و مقتضیاتِ صحتِ بدنی و روحی تقاضائے بیروں نہادنِ قدم از خانہ نکنند - بہتر است کہ در خانہ قرار گیرد و گوشۂ عافیت گزیند - وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ ـــ الآیہ۔

[2] کہ خلاف حکمِ خداوندی است - وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (با زناں معاشرتِ نیک ورزید)

"پاکستانی خواتین اور پردہ"

پاکستان کے قیام سے ایک نئی مملکت معرضِ وجود میں آئی ہے۔ چونکہ اس میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت مُسلمان ہے اس لئے مذہبی علماء اور دوسرے دانشورانِ ملک و ملت کی یہ زبردست خواہش ہے کہ اس مملکت (پاکستان) کا قانون "اسلامی شریعت" ہو اور اس کے جملہ قواعد و قوانین اور طور طریقے اسلامی اصول (کتاب اللہ اور سُنتِ رسول اللہ صلعم) پر قائم ہوں۔ یورپین طرز کی جمہوریت (ڈیموکریسی) ہٹائی جا کر اس کی جگہ اسلامی جمہوریہ (اسلامی شورائیتہ) قائم کی جائے۔ ہر مرد اور عورت اپنے مناسب حق پائیں اور عزت و توقیر کی زندگی بسر کرتے ہوئے دُنیا و آخرت میں سُرخرو اور کامیاب ہوں۔

اس سلسلہ میں عورتیں جو مردوں کے جور و ستم اور بے التفاتی کے باعث بے علم، پست و ذلیل اور (اب تک اپنے حقوق سے بھی) غافل و بے خبر رہی ہیں۔ اب خصوصیت کے ساتھ سر اُٹھا کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے صدائے احتجاج بلند کر رہی ہیں۔ ملک و ملت کے روشن دماغ مدبروں پر اس بات کا بخوبی انکشاف ہو چکا ہے کہ جب تک قوم کی عورتیں پڑھی لکھی، سمجھدار اور ہوشیار (دیندار اور سلیقہ شعار) نہیں ہوں گی، تب تک ہوشمند، دلاور اور انصاف پسند بچے اور نوجوان ہرگز پیدا نہیں ہوں گے۔

قوم کی ترقی اور سرفرازی عورتوں کی لیاقت اور دانش مندی پر منحصر ہے۔ اگر عورتیں جاہل، بے علم اور اَن پڑھ ہونگی (دینی اور دنیاوی پیش آنے والے مسائل سے غافل اور بے خبر ہوں گی) تو ساری قوم (بحیثیتِ مجموعی) پست اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہوگی۔

لیکن یہ بات لازم ہے کہ عورتوں کی ساری تعلیم اوّل سے لے کر آخر تک مضامین ذیل میں منحصر ہے:-

(۱) قرآن پاک اور حدیثِ رسول اللہ صلعم۔ (۲) حکمت و دانش (فقہ دین اور پاکیزہ علم و ادب) (۳) آداب خانہ داری، اور اس قسم کے دوسرے مفید مضامین (تربیتِ اطفال، گھریلو حساب، اصولِ حفظانِ صحت، بقدرِ ضرورت طبی اصول و فروع سے واقفیت۔ سینا پرونا وغیرہ)

عورتوں کی تعلیم اور پردہ

جب عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو اُن کے پردہ کا مسئلہ بھی معرضِ بحث میں آتا ہے۔ بعض نام نہاد روشن خیال یہ چاہتے ہیں کہ عورت پردہ سے باہر نکل آئے اور مرد کے دوش بدوش کام کرے اور رزم و بزم میں شریک ہو۔ اور ہیئتِ اجتماعیہ اور انسانی سوسائٹی میں اس کے حقوق مرد کے ساتھ بالکل برابر ہوں۔

اس کے برعکس ظاہر پسندوں کا یہ خیال ہے کہ بس عورت کی جگہ گھر ہے، وہ ہرگز گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔ خانہ داری ہی کو اپنا پیشہ بنائے رکھے۔ اولاد پیدا کرنے کی مشین ہو اور اُن کی پرورش ہی میں لگی رہے۔ (باہر کی دُنیا سے کوئی تعلق نہ رکھے اور نہ مردوں کے کام میں کوئی مداخلت کرے، زمانہ کی مقتضیات اور حالاتِ حاضرہ سے کوئی سروکار نہ رکھے)

لیکن ایسے علمائے دین جو روشن خیال اور بالغ النظر ہیں۔ کہتے ہیں کہ عورت ایک حد تک دینی اور دُنیوی تعلیم حاصل کرے تاکہ اس کی اولاد نیک اور قابل ہو جن کو وہ اچھی تربیت دے سکے۔ لیکن کسی حالت میں بھی پردہ نہ چھوڑے۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے۔ لیکن زمانہ جو کچھ بھی کہے اور جو روش بھی اختیار کرے۔ ہم مسلمان بہر کیف جو قدم بھی اٹھائیں

اور جو طریقہ بھی اختیار کریں۔ ضروری ہے کہ ہم اس میں اسلام کے جادۂ حق اور صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہوں۔

کلام پاک کا فرمان

کلام اللہ شریف کی رُو سے واجب و لازم ہے کہ عورتیں پردہ کیا کریں۔ خدائے دانا و بینا فرماتا ہے:۔

"اور ایمان دار عورتوں سے فرما دیجئے گا کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں، اپنی عزت و ناموس اور عصمت و عفت کی حفاظت کریں اور اپنی زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کچھ بھی ظاہر نہ کریں۔ البتہ جو بلا قصد و ارادہ اس میں سے کچھ ظاہر ہو گیا (تو وہ اور بات ہے، اس پر مواخذہ نہیں ہو گا) اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں اور گریبانوں پر ضرور ڈالا کریں۔ اور اپنا بناؤ سنگھار اور مقاماتِ زینت اپنے شوہروں، اور اپنے محارم مثلاً باپ، دادا، خسر، بیٹا، بھائی وغیرہ محرموں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کیا کریں"۔ الآیہ۔

"اور پاؤں اُٹھا اُٹھا کر زمین پر زور سے نہ ماریں۔ تاکہ اُن کا پوشیدہ سنگھار دوسروں کو معلوم نہ ہو"۔

ان آیاتِ کریمہ سے ایک ہوشمند صاحبِ علم و فہم شخص پر یہ حقیقت بخوبی واضح ہے کہ ایران، ترکی اور مصر وغیرہ (ممالکِ مسلمانان) میں عورتوں کی بے پردگی کی جو روش اختیار کی جا رہی ہے وہ احکام خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔ یہ بات ہرگز روا نہیں کہ عورتیں پنڈلیاں (یا بازو وغیرہ) ننگی کر کے، سینہ تان کر اور کھلا رکھ کر، اپنے چہروں اور رخساروں کو غازہ سے چمکا کر، ننگے سر، نامحرم اشخاص میں کھلے بندوں آئیں جائیں (یہ سراسر اسلامی احکام کی خلاف ورزی اور ننگ و ناموس اور حیا و شرافت کے خلاف ہے)

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو بھی طریقہ سکھایا ہے اور جو جو ہدایتیں بھی (قرآن پاک اور اسوۂ طیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ) دی ہیں۔ وہ سب کی سب ہماری دُنیوی اور اُخروی فلاح و نجات اور بہتری کے لئے نہایت ہی ضروری اور حد درجہ مناسب ہیں۔ ہم اُن ہی ہدایات پر چل کر ترقی کی منزلیں بخوبی طے کر سکتے ہیں۔

پردہ کے متعلق جو حدود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرمائے ہیں، ہم اُن کی پُوری پابندی کرتے ہوئے اپنی صحیح ترقی، آزادی اور آسودگی کے حصول کے لئے ہر مناسب کارروائی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

(اسی طرح، دوسری طرف) وہ کوتاہ بین اور تنگ نظر اشخاص بھی خداوندی احکام کے خلاف راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں[1]۔ جو عورت کو دیگر انسانی آزادی سے محروم کر کے، چاہتے ہیں کہ اس کو گھر کی چار دیواری میں اسیر و قیدی بنائے رکھیں، تاکہ اس پر باہر کی ہوا تک بھی نہ لگے۔

البتہ اتنی بات درست ہے کہ جب تک معاشی ضروریات یا صحت بدنی اور روحانی مسرتوں کے حصول کے ضروری مقاصد گھر سے باہر رکھنے کا تقاضا نہ کریں۔ تب تک یہی بہتر ہے کہ عورت گھر ہی کے گوشۂ عافیت میں قرار پکڑے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:۔

"عورتو! تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو (یعنی) سابقہ عہدِ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کر کے (نامحرموں کے سامنے اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے) نہ نکلا کرو۔ اور پانچ وقت کی نمازیں پابندی سے پڑھا کرو اور زیور، نقدی وغیرہ کی زکوٰۃ باقاعدہ ادا کیا کرو۔ اور ہر بات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کیا کرو"۔ الآیہ۔

صواب اور حق بات افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال اور میانہ روی میں ہے۔ کہ عورت نہ تو بے پردہ ہو اور نہ بکسر قیدی

---

[1] کیونکہ یہ اسیری نیک معاشرت کے خلاف ہے۔ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ط۔ حکمِ خداوندی ہے۔

اور عاجز و درماندہ۔ (کہ جائز ضرورت یا درستیٔ صحت اور تفریح مناسب کے لئے اُسے گھر سے باہر قدم رکھنے کی (محرم کے ساتھ بھی) اجازت نہ ہو۔

حدودِ شرع کے اندر — اور حالات کے مطابق عورت ایک حد تک مفید آزادی سے بہرہ مند ہونی چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ پردہ، حیا اور عفت و عصمت میں (بفضلِ خداوندی) ہر طرف سے وہ گھری ہوئی ہو۔ اور بیگانوں، نامحرموں اور ناپاک و بداطوار عورتوں کے میل ملاپ (اختلاط) سے قطعاً محترز ہو۔ اور دینی اور مادی علوم سے ایک مناسب حد تک بہرہ ور ہو۔

جس قدر بھی کسی قوم کی عورتیں زیورِ علم و تہذیبِ اسلامی سے آراستہ ہوں گی اسی قدر وہ قوم و ملت دانش مند اور تہذیب و ترقی میں بڑھی ہوئی ہو گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اگرچہ عورت کی صحیح آزادی اور ترقی کا پہلا زمانہ تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عورت علم و دانش اور دینی فہم و بصیرت سے بہرہ ور تھی۔ اور دینی علوم حاصل کر کے ایک ممتاز مقام رکھتی تھی۔

اُم المومنین بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلی مسلمان خاتون ہیں جنہوں نے قرآنی حقائق و مطالب تک رسائی حاصل کرنے میں صحیح دینی بصیرت، تفکر اور غور و پرداخت سے کام لیا ہے۔ (اور اس میں کامیاب ہوئیں) الحمد للہ۔

عورتوں کی شرکتِ جہاد

یہ بھی ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے کہ عورتیں (بعض اوقات) لڑائی (جہاد) میں شریک ہوتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور مجاہدین کو پانی بھی پلایا کرتیں۔ اور کم حوصلہ اشخاص کو دلیری اور جہاد پر اُکسا کر اُن کو ہمت دلاتی تھیں۔

اب جبکہ ہم متفق ہو کر، قانونِ اسلام کے مطابق ایک آزاد سلطنت قائم کر سکتے ہیں اور اپنی ترقی اور معیشت کے جملہ امکانی ذرائع اور وسائل اپنے تصرف میں لا سکتے ہیں۔ چاہیئے کہ ہم عورتوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہ رہیں۔ انھیں دینی علوم (قرآن و حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ وغیرہ) سے بہرۂ وافر دلائیں اور … مادی علوم (سائنس، ریاضی، جغرافیہ، طب وغیرہ) سے بھی عاری اور بے بہرہ نہ ہوں۔ تاکہ خدا ترس اور باحیا ہوں اور فہم و بصیرت اور عقل و دانش سے بھی بہرہ یاب ہوں۔ اور اس طرح آج کی لڑکی، کل کی اچھی بہن اور اچھی ماں ثابت ہو۔

اللہ تعالیٰ توفیق دینے والے ہیں۔ اُن ہی سے امداد کے طالب ہیں (وہ مدد فرمائے، آمین!)

عبدالحکیم، ایم اے (علیگ)

اجزائے کائنات

اس خاکدانِ ارضی کی کہانی کہنے والے مدت سے کہتے چلے آ رہے ہیں مگر ہنوز یہ ادھوری اور ناتمام ہے۔ کچھ ہی دنوں پہلے ہمیں صرف پچھلے تین ہزار برسوں کی تاریخ معلوم تھی۔ اس سے پہلے کے حالات مسلسل اور مرتب طور پر معلوم نہ تھے۔ دیو مالاؤں اور قیاس آرائیوں کا دور دورہ تھا۔ اہلِ مغرب ایک عرصہ تک یہی باور کرتے اور کراتے رہے کہ دنیا ۴۰۰۴ قبل مسیح میں اچانک عدم سے وجود میں آگئی اختلاف جو کچھ تھا وہ صرف اس مسئلہ میں تھا کہ یہ واقعہ سال مذکور کے موسمِ بہار میں رونما ہوا تھا یا خزاں میں۔ یہ مبالغہ آمیز قطعیت کس درجہ مضحکہ خیز تھی۔ مگر اس کی بنیاد عبرانی کتابِ مقدس کے بعض فقرے تھے۔ جس کا مفہوم من مانے طور پر کچھ کا کچھ ٹھہرا لیا گیا تھا۔ اب عرصہ سے اس طرح کی باتیں محض لطائف کے طور پر بیان کی جاتی ہیں اور یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ زمین کی تخلیق پر صدیوں اور قرنوں کا ایک زبردست انبار گزر چکا ہے، ممکن ہے یہ خیال بھی صحیح نہ ہو۔ مگر وہ خیال کہ دنیا کی عمر ابھی چھ سات ہزار سال سے زیادہ نہیں، یکسر غلط ثابت ہو چکا ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ زمین شکل کے اعتبار سے ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ جس کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔ قطبین پر قدرے چپٹی ضرور ہے مگر اس کے حجم کو دیکھتے ہوئے یہ چپٹا پن ناقابلِ لحاظ ہے۔ استوائی قطر کے مقابلہ میں اسکا قطبینی قطر صرف ستائیس ۲۷ میل چھوٹا ہے۔ باخبر لوگوں کو زمین کی کرویت کا علم تقریباً ۲۵۰۰ سال پہلے سے تھا مگر اور پہلے سبھی لوگ اسے چپٹی ہی خیال کرتے تھے۔ زمین اپنے محور پر ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گردش کرتی ہے اور یہی گردش محوری دن اور رات کے وجود کی ذمہ دار ہے۔ اس روزانہ کی گردش کے علاوہ زمین سال میں سورج کے گرد ایک چکر کرتی ہے۔ سورج کا فاصلہ نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور ہم سے دو لاکھ اڑتالیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ چاند اور زمین کے علاوہ دوسرے اجرامِ فلکی بھی سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ مثلاً عطارد، زہرہ۔ جن کا فاصلہ سورج سے زمین کے مقابلہ میں کم ہے۔ پھر وہ سیارے آتے ہیں جن کے فاصلے زیادہ ہیں ان میں زیادہ مشہور مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو ہیں۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے سیارے بھی ہیں۔ جو زمین اور مریخ کے درمیانی حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ سورج، سیارے اور ان کے چاند سب مل کر نظامِ شمسی کی تشکیل کرتے ہیں۔

نظامِ شمسی تو ہمارا اپنا گھرانا ہوا۔ آسمان میں مطالعہ و مشاہدہ کی اور بے شمار چیزیں ہیں۔ فضا اگر گرد و غبار سے پاک ہو تو رات بھر پورا آسمان ان گنت ستاروں کی خنک اور دلآویز روشنی میں بڑا جگمگ جگمگ کرتا رہتا ہے۔ ایک ذرا غور سے دیکھئے تو ستاروں اور روشن بادلوں کی ایک کشادہ شاہراہ آسمان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہی کہکشاں ہے۔ شہاب ثاقب کی روشن لکیریں دیکھنے والوں کے لئے سب سے زیادہ دلکش نظارہ فراہم کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہمیں خالی آنکھوں سے نظر آجاتا ہے۔ لیکن مشاہدہ میں اگر معمولی دوربینوں سے بھی مدد لی جاسکے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے ستارے مثنیٰ ہیں۔ خالی آنکھوں سے دیکھنے میں وہ قطعاً اکیلے نظر آتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت وہ اکیلے نہیں۔ دو دو تین تین یا اس سے بھی

زیادہ ہیں۔ دیکھنے والے کو آسمان میں کہیں کہیں دھندلے بادلوں کے ٹکڑے سے دکھائی دیں گے جو صورتاً ستارے نہیں معلوم ہوتے۔ یہ ہیولائے سحابی ہیں۔ مجامع النجوم ان کے علاوہ ہیں، بہت سارے ستاروں کے تھوڑی ہی سی جگہ میں جمع ہونے سے مجامع النجوم بن جاتے ہیں آسمان کا مسلسل مشاہدہ کرنے والے کو کبھی کبھی دُمدار ستارے بھی نظر آجائیں گے۔ جو ایک خاص مدت تک نظر آنے کے بعد غائب ہوجاتے ہیں۔ یہ سب کے سب کائنات کے وہ اجزاء ہیں جو ہم سب کو نظر آتے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ ہم کیسے جانیں کہ فی الواقع یہ کیا ہیں اور کتنے فاصلے پر ہیں۔

دوربین کی ایجاد اور کوپرنیکی اصولِ فلکیات کے عام ہوجانے کے بعد عموماً لوگ اس حقیقت سے واقف ہوگئے تھے کہ زمین اور سیّارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ نظامِ شمسی اور اس سے پرے بے شمار ستاروں کی موجودگی کا لوگوں کو علم تھا۔ لیکن ان کے باہمی فاصلے اور ماہیت کا مسئلہ ابھی تک قیاس و گمان کے دائرے سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ منظار اللون کی ایجاد اور اس کے استعمال کے بعد ہی اس مسئلہ پر صحیح معلومات فراہم ہوسکیں۔ منظار اللون کے ذریعہ کسی جلتی ہوئی دھات کا جو گیس کی حالت میں ہو مشاہدہ کیا جائے تو چند روشن اور رنگین خطوط ایک خاص ترتیب میں نظر آتے ہیں۔ یہ خطوط منظرہ کے خطوط کہلاتے ہیں۔ مختلف عناصر کے منظرے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک عنصر کا منظرہ بالکل دوسرے عنصر کے منظرے جیسا ہو۔ اس لئے منظرے کے خطوط کو دیکھ کر متعلقہ عنصر بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اب ستاروں کی ماہیت کا مسئلہ بڑی حد تک آسان ہوگیا۔ کیونکہ کام اب صرف اس قدر رہ گیا تھا کہ مختلف عناصر کے منظروں کو فہرست کی صورت میں مرتب کرلیا جائے۔ پھر ستاروں کے منظروں کا مشاہدہ کرکے معلوم کرلیا جائے کہ مختلف ستاروں میں کون کون سے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مگر منظار اللون نے جہاں بہت سے مسائل حل کئے وہاں ایک نئی مشکل بھی پیدا کردی۔ بعض ستاروں اور خود سورج کے منظرے میں روشن خطوط کے ساتھ ساتھ کچھ تاریک خطوط بھی اُن کو منقطع کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ عرصہ تک یہ تاریک خطوط معمہ بنے رہے اور سب سے پہلے ان کا حل ایک جرمن ماہر طبعیات گستاو رابرٹ کرشوف Gustav Robert Kirchhoff نے پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ اگر گیس کی حالت میں کسی عنصر کے منظرہ کے روشن خطوط کا مشاہدہ کریں اور پھر تیز روشنی جو کسی گرم تر ماخذ سے آرہی ہو گیس میں سے گزاریں تو اب نئے منظرے میں تاریک خطوط ٹھیک اُنہی مقامات پر ملیں گے جہاں پہلے منظرے کے روشن خطوط موجود تھے۔ گرم تر ماخذ کی تیز روشنی جب گیس میں سے ہوکر گزرتی ہے جو نسبتاً کم گرم ہوتی ہے تو روشنی کے رنگین چھلکے گیس میں جذب ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ جذب ہوجانے والے چھلکے وہی ہوتے ہیں جو ابتداء میں گیس کے منظرہ میں موجود تھے۔ اس طرح تاریک خطوط کا معمہ حل ہوجاتا ہے۔ مثلاً سورج کے منظرہ میں تاریک خطوط کو دیکھ کر یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ ان مقامات پر کون کون سے روشن خطوط ہوسکتے تھے۔ پس ان تاریک خطوط سے متعلقہ گیس کا معلوم کرلینا بھی آسان ہوگیا۔ ان حقائق کی روشنی میں ماہرین فلکیات اس نتیجہ پر پہنچے کہ سورج میں کوئی ایسا عنصر موجود نہیں ہے۔ جو زمین پر نہ پایا جاتا ہو۔ پھر یہ نتیجہ بھی نکلا کہ زمین اور جملہ سیارے کسی زمانے میں سورج ہی کے اجزاء تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن عناصر سے زمین کی تخلیق ہوئی ہے، وہی عناصر فضا میں اور ستاروں میں اور پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں بھی کسی مقام پر یا کسی ستارے میں کوئی ایسا عنصر نہ دریافت کیا جاسکا جو نوعیت میں عناصر ارضی سے مختلف ہو۔

ستاروں کو ثوابت کہا جاتا تھا گویا کہ وہ اپنے مقام پر قائم اور ثابت ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ستاروں کے مختلف اوقات کے نقشوں کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان میں اُن کی جگہ برابر بدلتی جارہی ہے لیکن اُن کی رفتار اور سمت سے متعلق کوئی صحیح علم نہ ہوسکا تھا۔ پھر یہ کہ جو ستارے سمت نظر میں حرکت کررہے تھے۔ خواہ وہ ہم سے قریب ہورہے ہوں یا

یا دُور جا رہے ہیں۔ مختلف نقشوں میں ان کے مقامات یکساں نظر آتے تھے اس لئے اُن کی رفتار کا پتہ لگانا اور بھی دشوار تھا جو ستارے سمت نظر میں یا سمت نظر کے علی القوائم حرکت کر رہے تھے، اُن کا معاملہ پھر بھی آسان تھا۔ کیونکہ ایسے ستارے بھی ہیں جو آڑی ترچھی سمتوں میں گرم رفتار ہیں۔ اُن کا مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہے مگر منظار اللون نے یہ مسائل بھی حل کر دیئے۔ اگر ہم کسی ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ہوں اور دُور سے ایک انجن مسلسل سیٹی بجاتا ہوا ہماری طرف آئے اور اسٹیشن سے ہوتا ہوا گزر جائے تو سیٹی کی آواز کے زیر و بم میں ایک خاص چیز نظر آئے گی، انجن جب ہماری طرف آرہا تھا تو آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی اور جب اسٹیشن سے گزر کر آگے بڑھ گیا تو آواز اسی مناسبت سے پست سے پست تر ہونے لگی۔ سبب یہ ہے کہ جب انجن قریب آرہا تھا تو آواز کی زیادہ سے زیادہ لہریں ہم تک پہنچ رہی تھیں جو اس کی قوت اور بلندی کو بڑھا رہی تھیں اور جب انجن ہم سے دُور جانے لگا تو اس کے بالعکس آواز کی کم سے کم لہریں ہم تک آسکتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ آواز کمزور ہوتی گئی۔ ٹھیک یہی اصول روشنی کی لہروں میں بھی کارفرما ہے جب کوئی ستارہ سمتِ نظر کے متوازی حرکت کرتا ہوا ہم سے قریب ہوتا جاتا ہے تو منظرے کے روشن خطوط اس کے بنفشجی حصہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور جب ہم سے دُور جا رہا ہوتا ہے تو منظرے کے خطوط اس کے سُرخ حصہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں پس منظروں کے روشن خطوط کے میلان کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی مخصوص ستارہ ہم سے قریب ہو رہا ہے یا دُور جا رہا ہے۔ سمت نظر میں یا سمت نظر کے علی القوائم ستاروں کی رفتار معلوم ہو جانے کے بعد آڑی ترچھی سمتوں میں حرکت کرنے والے ستاروں کی رفتار کا مسئلہ یکسر آسان ہو جاتا ہے جسے ریاضیات کے طلباء بآسانی حل کر سکتے ہیں۔

منظار اللون نے ایک اور معمہ حل کر دیا۔ بعض ستارے مثنی ہوتے ہیں مگر ایک ستارہ دوسرے سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی دُور بین میں بھی دونوں الگ الگ نہیں دیکھے جا سکتے۔ البتہ اس طرح کے ستاروں کے منظرے دوہرے ہوتے ہیں۔ دوہرے منظروں کی توجیہ بجز اس کے نہیں کی جا سکتی کہ ستارہ نہیں ہے بلکہ مثنی ہے اسی لئے ایک کے بجائے دو منظرے بہ یک وقت حاصل ہوتے ہیں۔

فلکیات جدیدہ کے ارتقاء میں دوسرے وسائل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو زمین کے قطر اور محیط صحیح طور پر دریافت ہوئے (یہاں تفصیل میں جانا بے محل ہوگا) پھر زمین سے چاند، سورج، ستاروں اور قریبی ستاروں کے فاصلے معلوم کئے گئے کسی ایسے مقام کا فاصلہ معلوم کرنا جہاں تک رسائی ناممکن ہو فی الحقیقت مثلث کے ضلعوں اور زاویوں کی درمیانی نسبتوں کا ایک مسئلہ ہے۔ اگر مثلث کے ایک ضلع فرض کیجئے کہ قاعدہ کا طول معلوم ہے اور وہ زاویئے بھی معلوم ہیں جو یہ قاعدہ بقیہ دونوں اضلاع کے ساتھ بناتا ہے تو قاعدہ کے نقطۂ وسطی سے راس مثلث کا فاصلہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ زمین اور نظام شمسی کی فضاؤں کی پیمائش تک تو خوب کامیاب رہا۔ لیکن آگے چل کر کچھ زیادہ مفید مطلب نہ رہا۔ جیسے جیسے ستاروں کے فاصلے زیادہ ہوتے گئے مناسب طول کے مثلثی قاعدے کا حصول دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔ قاعدہ کے سروں سے ستارے تک پہنچنے والے دونوں اضلاع طول میں اتنے بڑھتے گئے کہ بڑے سے بڑا قاعدہ جو ہماری دسترس میں ہے۔ یعنی زمین کے مَیر کا قطر (تقریباً ۱۹ کروڑ میل) بھی ناقابلِ لحاظ ہو گیا۔ اس لئے نجومی عقود اور ہیولائے سحابی کے فاصلے دریافت کرنے کی کوئی سبیل نہ رہی۔

ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ستارے کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے یہاں تک کہ ایک مدت معینہ میں روشنی ایک خاص حد تک پہنچ کر رُک سی جاتی ہے اور پھر بڑھنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ

ستارہ اپنی پہلی چمک دمک دوبارہ حاصل کرلیتا ہے، روشنی کا یہ اُتار چڑھاؤ معینہ مدت میں گھڑی کی سوئیوں کی مثالی صحت گردش کے ساتھ رونما ہوتا ہے اور اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے کہ متغیر ستاروں کی مدت تغیر اور ان کی قدر مطلق میں ایک خاص نسبت ہوتی ہے۔ ستارے کی ظاہری روشنی نتیجہ ہوتی ہے اس کی حقیقی روشنی پر فاصلہ کے اثرات کا۔ ایک چھوٹا اور دھندلا ستارہ بھی اگر قریب ہو تو نہایت روشن نظر آئے گا۔ بخلاف اس کے ایک عظیم الشان ستارہ زیادہ فاصلہ پر ہو تو تقریباً غیر مرئی رہے گا۔ پس اگر ہم ستارے کی حقیقی ضو یا قدر مطلق یعنی وہ ضو معلوم کرسکیں جو ستارے کا فاصلہ ۳۲٫۶ سالِ نور ہونے کی صورت میں مشاہدہ میں آئے گی۔ تو ہم اس کا فاصلہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ قریب ترین متغیر ستاروں کے فاصلے معلوم کرنے کے بعد اُن کی قدر مطلق کا تعین کیا گیا پھر طویل مطالعہ و مشاہدہ کے نتیجہ میں یہ حقیقت دریافت ہوئی کہ دو ستاروں کی مدت تغیر اگر برابر ہو تو قدر مطلق بھی ان کی یکساں ہوگی اور یہ ٹھیک وہی بات تھی جس کی جستجو عرصہ سے ماہرین فلکیات کو تھی۔ یہ معلوم کیا گیا کہ ہیولائے مجعد میں بھی جن کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ تصور کی رسائی بھی وہاں تک مشکل ہے متغیر ستارے موجود ہیں، اُن کے وقفۂ تغیر معلوم کرنے کے بعد اُن کی حقیقی ضو کا حساب لگا لیا گیا۔ اب کہ ان کی حقیقی ضو معلوم ہوچکی تھی مشاہدہ میں آنے والی ظاہری روشنی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرکے فاصلہ دریافت کرلیا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہیولائے مجعد خود جن میں کہ یہ متغیر ستارے پائے جاتے ہیں ہم سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ فاصلے معلوم کرلینے کے بعد جسامت اور حجم کے مسائل از خود آسان ہوگئے۔

کہکشاں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر یہی ایک کہکشاں نہیں ہے اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ لیکن ان کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں۔ کہ دُوری والے قدیم پیمانے بیکار ثابت ہوتے ہیں، اس لئے اب فلکیات میں فاصلے بتانے کے لئے سالِ نور کا استعمال ہوتا ہے۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ۱۸۶۳۲۴ میل سفر کرتی ہے۔ اس رفتار کے حساب سے ایک سال میں ۶،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل طے کرے گی۔ لیکن سالِ نور کا حساب بھی بعض بعض مقامات کے لئے کچھ مفید نہ رہا۔ اس لئے کہ بات لاکھوں اور کروڑوں سالِ نور تک جا پہنچتی ہے۔ بہر حال جو وسائل اور جو آلات ہم ساکنانِ ارض کو میسر ہیں، اُن کی مدد سے مرئی کائنات کی ایک اچھی خاصی تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ ابتدا نظامِ شمسی سے ہوتی ہے جو ہمارا اپنا گھرانا ہے، جس کے مرکز میں ایک ستارہ یعنی سورج ہے، جسامت کے اعتبار سے سورج اوسط یا اوسط سے قدرے کم درجہ کا ایک ستارہ ہے جو فضا میں بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں ہے، اور اپنے جلو میں نو بڑے سیارات (جن میں زمین بھی شامل ہے) ان کے توابع ہزاروں چھوٹے ستارے، ایک ہزار دُمدار ستارے اور لاکھوں شہاب ثاقب رکھتا ہے۔ ہمارا یہ نظامِ شمسی بقیہ کائنات کے نزدیک سے نزدیک ستاروں سے بھی اتنا الگ تھلگ اور اس درجہ دُور دراز فاصلہ پر واقع ہے کہ اس کی موجودہ تنہائی یکسر ناقابلِ تصور ہے۔ قریب ترین ستارہ بھی ہم سے تقریباً چار سالِ نور کے فاصلہ پر ہے۔ نظامِ شمسی کے ہر چہار طرف ایک لا انتہا اور لامحدود خلا ہے۔ اتنا مکمل خلا کہ مادہ کے لطیف سے لطیف ذرات سے بھی خالی ہے۔ اور ٹمپریچر فارن ہائٹ کے صفر درجہ سے ۴۵۹ر۴ نیچے ہے۔ ایک تاریک اور سنسان لامکان ہر جانب سے نظامِ شمسی کو محیط ہے۔ یہ تاریک اور سنسان لامکان کہکشاں کے ہر فرد کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہی نہیں بلکہ کہکشاں کو دوسرے کہکشانی نظاموں سے ٹھیک اسی طرح الگ کرتا ہے جس طرح کہ نظامِ شمسی کو بقیہ کائنات سے۔

یہ کہکشاں جس کا ایک جزو نظامِ شمسی بھی ہے اور جسے ہم اپنی کہکشاں کہتے ہیں کروڑوں ستاروں پر مشتمل ہے، بعض تو بالکل سورج کے برابر ہیں اور بعض سورج سے ہزاروں گنا بڑے اور بعض چھوٹے بھی ہیں۔ کچھ ستارے اُوپر نیچے دائیں بائیں اس طور سے واقع ہیں جیسے کسی کمرے کی چھت میں بے شمار قمقمے نیچے اُوپر اس طرح سے معلق ہوں کہ سب مل جل کر ایک بڑے قمقمے کا منظر پیش کریں۔ بہت سے ستارے

ایسے ہیں جو عقود کی شکل میں ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور بعض ایک یا چند اس درجہ قریبی رفیقوں کے ساتھ چلتے ہیں کہ ان میں باہم امتیاز مشکل ہوتا ہے۔ اور بہتیرے ایسے ہیں جو بالکل یکہ و تنہا اپنے کبھی نہ ختم نہ ہونے والے سفر پر رواں ہیں۔ ستاروں کے علاوہ کہکشاں میں ہیولائے سحابی بھی ہیں۔ ان میں سے بعض حلقہ نما ہیں یعنی گیسی مادہ کے کرّے جو بیچ سے خالی ہیں۔ بعض ہیولائے ناموزوں ہیں جو دُھنکی ہوئی روئی کے قطعات معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ سیاہ نظر آتے ہیں۔ تاریک اور روشن ہر دو طرح کے ہیولائے سحابی کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ مادہ کے لطیف اور دقیق ترین ذرات کے ذخائر ہیں۔ جن سے کہ یہ کائنات وجود پذیر ہوئی ہے۔ یہ ذرات تمام خالی فضاؤں میں منتشر حالت میں ملتے ہیں، مختلف اثرات کے ماتحت یہ مُنتشر ذرات مجتمع بھی ہوتے رہتے ہیں اور صورتاً بادل جیسے نظر آتے ہیں، اس طرح کے عظیم الشان بادل جو آسمان کے بڑے بڑے قطعات پر محیط ہوتے ہیں مقدار مادہ کے لحاظ سے سورج کے مقابلہ میں دو تین گنا سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ذرات کے یہ بادل اگر تاریک ہوں تو آسمان کے بڑے بڑے رقبہ کو چھپا لیتے ہیں اور ستاروں کے درمیان سیاہ سوراخ کے مانند نظر آتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو پڑوس کے ستاروں کی روشنی سے منوّر نظر آتے ہیں۔

یہ ہیولائے سحابی بھی قائم اور ثابت نہیں ہیں بلکہ ستاروں کی طرح سے اپنے اپنے سفر پر رواں ہیں۔ سورج کی ایک رفتار ہے۔ سیّارے اپنے اپنے مدار میں گرم رفتار ہیں، توابع سیاروں کے گرد گردش کرتے ہیں۔ دُمدار ستارے، شہاب اور سیارات صغیر اپنے اپنے میروں میں گرم سیر ہیں۔ مگر سب کے سب سورج کے ہم رکاب ہیں۔ ستارے بھی اپنے اپنے راستوں پر رواں ہیں۔ مگر اُن کی منزل ہنوز نامعلوم ہے۔ یہی حال عقود اور مجامع النجوم کا بھی ہے۔ سب کے سب فضا کی مختلف سمتوں میں رواں دواں ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر پُورا نظام کہکشاں بھی ایک مرکزی محور پر گردش کر رہا ہے۔ جس کا رُخ برج جاثی کی طرف ہے۔ کہکشاں کو اپنے محور پر ایک مکمل گردش کرنے کے لئے بیس کروڑ سال درکار ہوں گے۔

دوسرے کہکشانی نظاموں میں بھی محوری گردش کا پتہ چلتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ہیولائے مجعد میں جو مختلف جہتوں سے ہمارے نظام کہکشاں کے مشابہ ہیں۔ ہیولائے مجعد ہم سے بہت ہی دور دراز فاصلے پر واقع ہیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں دریافت کئے گئے ہیں۔ اُنہی میں سے بُرج مُسلسلہ کا وہ ہیولائے سحابی بھی ہے جو ہم سے نو لاکھ سال نور کے فاصلہ پر ہے اور نظامات کہکشانی کی عظیم الشان برادری میں ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے۔ ہیولائے مجعد میں ہمارے اپنے نظام کہکشاں کی طرح ستارے مجامع النجوم، عقود، متغیر ستارے، عارضی ستارے اور عظیم الشان ہیولائے سحابی سبھی کچھ موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ ہیولائے مجعد بھی ایک مرکزی محور پر گردش کرتے ہیں۔ البتہ ایک نمایاں فرق جو ہمارے نظام کہکشاں اور دُوسرے نظاموں میں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر نظام میں مرکز میں ستاروں کی کثرت ہے۔ بخلاف اس کے ہماری کہکشاں کے مرکزی حصوں میں ایسا نہیں ہے کچھ اور مستثنیات بھی ہیں۔ لیکن شاید اُن کا ذکر یہاں کچھ زیادہ برمحل نہ ہو۔ یہ تمام نظام ہائے کہکشاں الگ الگ کائناتوں کی مانند ہیں۔ مگر سب مل جُل کر کس عظیم تر نظام کائنات کے اجزاء ہیں؟ ہنوز اس سوال کا حل معلوم کرنا باقی ہے۔ کیونکہ یہاں پہنچکر موجودہ علوم انسانی کے حدود ختم ہو جاتے ہیں۔ ع

مقام ہوش و خرد سے آگے تمام عالم غبار سا ہے!

فتبارک اللہ احسن الخالقین!

سید عبدالقدوس ہاشمی

فلاحِ انسانی

فلسفہ کوئی آسمان سے اُتری ہوئی بلا یا زمین سے ابھری ہوئی عجوبہ روزگار نمود کا نام تو نہیں۔ یہ تو ہمارے اور آپ کے سامنے روزانہ ہونے والے واقعات و حوادث اور ہر لمحہ پیش آنے والی اشیاء اور اُن کے حرکات پر غور کر کے اُن کی حقیقت کو پہچاننے کی مخلصانہ مساعی کا نام ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم خود ہی صحیح طریقہ پر اپنی فکری قوتوں سے کام لیں اور کچھ "کلی ضوابط" تلاش کر لیں۔

آج ہمارے عنوان کے دو اجزاء ہیں۔ اوّل فلاح نوع انسانی۔ اور دوسرا فلسفہ۔ صحیح اور منطقی طریقۂ فکر یہ ہوگا کہ ہم پہلے اُن میں سے ہر ایک کے معانی متعین کر لیں۔ اور اُن کے حدود و خواص کو ذہن نشین کر لیں۔ اس کے بعد اس نسبت و علاقہ پر غور کریں جو ان دونوں کے اجزاء کے مابین موجود ہو۔ اس طرح ہم خطائے ذہنی سے محفوظ رہ کر صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں گے۔ اچھا! تو ہم سب سے پہلے فلاح پر غور کرتے ہیں:۔

سوال یہ ہے کہ نوع انسانی کی فلاح سے کیا مراد ہے؟ لغت میں ہم اگر لفظ فلاح کے معانی کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں یہ لفظ بقول مجد الدین فیروز آبادی نجات، فوز اور بقاء فی الخیر کا ہم معنی دکھائی دیتا ہے۔ اہل لغت بتاتے ہیں کہ یہ لفظ اسی لئے فلاحت (یعنی کاشتکاری) بولا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک کاشتکار اپنے عمل فلاحت کے ذریعہ اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنی احتیاجات سے نجات کی تلاش کرتا ہے۔ کسی فارسی لغت میں اس کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ لفظ فلاح فارسی لفظ رستگاری کا ہم معنی ہے۔ یعنی احتیاجات سے نجات و رستگاری۔ اصطلاحاً یہ لفظ رمضان شریف میں سحری کے کھانے کو بھی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایک روزہ دار بھوک پیاس کی شدت سے رستگاری حاصل کرتا ہے۔

لغت اور اصطلاح کی طرف اس اشارے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ فلاح کا مفہوم متعین کرنے میں اس سے مدد لی جائے لغت کا فیصلہ یہ ہے کہ "فلاح نوع انسانی" اس صورتحال کو کہیں گے جس میں آدمی بدنی، ذہنی اور فکری ہر طرح کے خطرات سے مامون ہو کر مطمئن اور پُر سکون زندگی بسر کرے۔

فلاح چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ فرد بشر کی فلاح ہو، یا کسی کنبہ، برادری، آبادی، قوم یا پورے نوع انسانی کی فلاح مقصود ہو۔ یہ درحقیقت اس ذہنی کیفیت کا نام ہے جو افراد بشر میں مادّی اور غیر مادّی خطرات سے نجات کے یقین کی بناء پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ ذہنی کیفیت کبھی مادی احوال کے مطابق بھی ہوتی ہے۔ لیکن اکثر صورتوں میں یہ مادی ماحول سے بالکلیہ غیر مطابق پائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک غریب کاشتکار گھرانا فلاح کے اس بلند مقام پر زندگی بسر کر رہا ہو اور ایک ایک فرد خاندان کی موت تک فوز و فلاح کا یہ مرتبہ اسے حاصل رہے جہاں ایک کروڑ پتی گھرانا کبھی نہ پہنچ سکے۔

کیا واقعتاً لغوی معانی ہی اس اصطلاح کی بنیاد ہیں۔ اور کیا حقیقتاً "فلاح نوع انسانی" رستگاری اور نجات ہی کو

کہا جائے گا۔ اس کے لئے انسان کے مختلف اعمال اور ان کے محرکات کا جائزہ لیجئے۔ بغیر کسی تخصیص و تعین کے آپ انسان اور اس کے اعمال و افکار کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ مثلاً:-

آپ کسی شاہراہ عام پر صبح سے شام تک آنے جانے والے ہر مرد و عورت سے سوال کریں۔

تم کیا چاہتے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیا مقصد ہے؟

شام تک جتنے جوابات آپ کو ملیں۔ انھیں ایک کاغذ پر لکھتے جائیں۔ اس طرح دس بیس مقامات پر، دس بیس ممالک سے، راجپوتانہ کے ایک کور دہ سے۔ افریقہ کی ایک جنگلی بستی سے۔ نیویارک، ماسکو اور لندن کے متمدن مقامات سے ایسے جوابات مہیا کیجئے۔ اور بغیر کسی تخصیص و تعین کے، ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد سے لیجئے۔ ایک سناتن دھرمی سے بھی جواب لیجئے۔ جو سوا تین کروڑ دیوتاؤں میں الوہیت کو مانتا ہے۔ ایک کمیونسٹ سے بھی پوچھئے جس کا مذہب ہی یہ ہو کہ ایک خدا بھی موجود نہیں۔ اگر ان تمام جوابات کو آپ اکٹھا کر کے دیکھیں گے اور انھیں اصناف و اقسام میں الگ الگ کرنے کی سعی کریں گے تو یہ سارے جوابات دو اقسام میں آ جائیں گے:-

(۱) کچھ خطرات ہیں جن سے محفوظ رہنے کے لئے انسان جد و جہد کر رہا ہے۔ یہ خطرات بدنی بھی ہیں۔ ذہنی بھی۔ حاضر و موجود بھی۔ اور مستقبل میں پیش آنے والے بھی۔ مثلاً کوئی دوا لانے کو جا رہا ہو گا تاکہ وہ دانتوں کی موجودہ تکلیف سے نجات حاصل کر سکے، کوئی ڈاکیہ اس لئے تیز جا رہا ہو گا کہ وقت پر کام پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ملازمت ختم نہ ہو جائے اور اُسے آئندہ دو تین ماہ کے بعد بھوک کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ اس طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو حاضر خطرات سے نجات کے لئے جد و جہد میں منہمک ہوں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو مستقبل بعید میں پیش آنے والے خطرات کی روک تھام کے لئے بے چین ہوں گے۔

(۲) دوسری قسم ان جوابات کی ہو گی جو اگرچہ پہلی قسم ہی کے ماتحت آتی ہیں مگر بہ یک واسطہ یا دو واسطہ اپنی ادنیٰ اور ظاہری شکل میں سلبی نہیں بلکہ ایجابی تمناؤں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ انسان، انفرادی یا اجتماعی طور پر ان ہی تمناؤں کے حصول کی جد و جہد میں سرگرداں و پریشان نظر آتا ہے۔ یہ تمنائیں کبھی تو صریحی، قابل دید اور ظاہری ہوتی ہیں۔ اور کبھی ذہنی اور تصوراتی ہوتی ہیں۔ لیکن ہر دو صورتوں میں یہ تمنائیں فی الحقیقت مختلف قسم کی بدنی یا ذہنی ضروریات کی تکمیل یا دفع ضرر ہی کی ایک قسم ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ بھی بالواسطہ نجات اور رستگاری کا مفہوم رکھتی ہیں۔

اب ان جوابات پر غور کرنے کے بعد ہمارے لئے فلاح کا مفہوم سمجھنے میں کچھ زیادہ دقت باقی نہیں رہتی۔ یہ صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ انسان نے اس اصطلاح سے کیا مراد لیا ہے۔ انسان ایک ایسی ذہنی کیفیت کی تلاش میں سرگرداں ہے جس میں اسے مستقبل میں اپنی ضروریات کی تکمیل اور خطرات سے رستگاری کا یقین اور ضمانت حاصل ہو۔ اگر یہ کیفیت اسے حاصل ہو جائے تو یہی اس کی فلاح ہو گی۔ اس کیفیت کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی محنت، تجربہ، علم اور اپنے پیش رو انسانوں کے سارے تجربات اور ان کے حاصل کردہ علوم و فنون سے کام لیتا ہے۔ کبھی بڑی بڑی صنعتیں قائم کرتا ہے، کبھی بھوک سے نجات کے لئے زراعت اور اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے کبھی حمل و نقل کے لئے تیز سے تیز ذرائع پیدا کرتا ہے۔ کبھی بیماریوں سے جنگ کے لئے نئے نئے دواخانے بناتا ہے، کبھی جہالت سے بچنے کے لئے کالج اور اسکول قائم کرتا ہے۔ اور کبھی دھوپ اور بارش سے محفوظ رہنے کے لئے مکانات بناتا ہے۔ اس طرح فلاح کی تلاش میں اس کی جد و جہد جاری رہتی ہے۔

انسان کا ذہن انفرادی طور پر، اور پوری انسانی آبادی کا ذہن اجتماعی طور پر ان ہی سوالات کو حل کرتا رہتا ہے۔ کسان کا ذہن دانہ ڈالنے کے بعد یہ سوال حل کرتا رہتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ پانی دیا جائے گا۔ گرم و مرطوب ہوائیں چلیں گی۔ پودے نکلیں گے پھول آئیں گے۔ پھل تیار ہوں گے اور اس کو بھوک سے نجات کا ایک آزمودہ نسخہ حاصل ہوگا۔ ایک ماہر کیمیا ساز کا ذہن اس سوال پر غور کرتا ہے کہ مرکب نمبرا مرکب نمبر ۲ سے مل کر اتنے گھنٹوں کے بعد فلاں قسم کا ایک کیمیاوی مرکب بن جائے گا جو فلاں ضرورت کی تکمیل میں کام آئے گا۔ ایک وزیر ترقیات کا ذہن پنج سالہ و ہفت سالہ قومی لائحہ عمل کے درجہ بدرجہ مراحل کو سوچتا رہتا ہے۔ غرض یہ کہ انسانی ذہن ہمیشہ اس سوال کے حل کرنے میں لگا رہتا ہے کہ آئندہ کا وقت اس کے لئے بدنی و ذہنی تکالیف سے نجات و رستگاری کا وقت ہوگا یا نہیں۔ اور جب اس کو ایسا یقین مل جاتا ہے کہ مستقبل اس کے لئے نجات و رستگاری کا ضامن ہے تو یہ ذہنی کیفیت اس فرد کے لئے اور بحیثیتِ مجموعی "بنی نوع انسان کی فلاح" کہلاتی ہے۔

مثلاً ایک نوجوان اپنی ناتجربہ کاری کی بناء پر اپنے پیش رو حضرات، باپ دادا، اور استاد سے آئندہ زندگی کے نشیب و فراز کی تفصیلات اُن سے کامیاب طریقہ پر گزرنے کے طریقے پوچھتا اور سیکھتا رہتا ہے۔ بچپن، پھر جوانی، پھر بوڑھاپا۔ اس کے بعد موت، ان سب کے متعلق پچھلے حضرات کے تجربات، اور معلومات، اُن کی تفصیلات، پھر اس پر خود اپنی فکر اور تجربوں سے اضافے۔ یہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنے لئے فلاح کی راہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ان میں اس کی بدنی تکالیف سے نجات کی راہ بھی ہوتی ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، دوا، وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ذہنی اور فکری تکالیف سے نجات کی راہ بھی ہوتی ہے۔ اعزاز، امتیاز، مامونیت و محفوظیت کے طریقے بھی۔

انسان دیکھتا ہے کہ ساری دنیا کے لوگ مرجاتے ہیں، اور آدمی ہی کیا۔ فرسودگی، زوال، اور فنا تو ہر چیز پر طاری ہوتی ہے۔ اس وقت اسے ایک سوال ذہنی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا اہم سوال ہو جس سے کوئی ذہن خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کا ذہن اس سے خالی ہے تو وہ شخص یا کاذب ہوگا یا پاگل۔ یہ سوال چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ہر فرد انسانی کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے، اور اس کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ وہ سوال یہ ہے:-

"مرنے کے بعد کیا ہوگا؟"

جب تک اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ مل جائے، نہ کوئی فرد انسانی فلاح پا سکتا ہے اور نہ جمعیتِ انسانی، ساری زندگی میں بدنی ضروریات کی تکمیل، اور جسمانی تکالیف سے نجات کا یقین حاصل ہونے کے باوجود۔ اس سوال کا لاینحل رہنا فطری طور پر انسانی زندگی کو اس قدر اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے کہ اسے فلاح کا کوئی حصّہ نہیں مل سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا حل مل جانے کے باوجود جسمانی اور بدنی ضروریات کی تکمیل، اور نجات کا یقین حاصل نہ ہونے کی بناء پر آدمی کو وہ ذہنی کیفیت میسر نہ آسکے جسے ہم فلاح کہتے ہیں۔ اس طرح تکالیف بدنی سے نجات کا یقین اور سوال ما بعد الممات کا حل دونوں ہی فلاح نوع انسانی کے لئے لازمی ہیں۔

انسان کی تمام تر حرکات، بدنی ہوں یا ذہنی، ان کا دارومدار اس یقین پر ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اگر اندرونی طور پر یقین کام نہ کرے تو انسان کسی قسم کی کوئی حرکت ارادی نہیں کر سکتا۔ اور یقین کے لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ خارج سے انسانی ذہن میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یقین ہمیشہ انسان کی داخلی کیفیتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ ایک یقین سے دوسرا یقین پیدا ہوتا رہتا ہے۔ کسی لڑکے کا یہ یقین کہ ریحانہ اس کی ماں ہے، دوسرا یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ مرد جسے

رہجانہ اُس کا باپ بتاتی ہے۔ یقیناً وہ باپ ہی ہے۔ اور اسی طرح کی لاکھوں مثالیں آپ اپنے گردوپیش تلاش کرسکتے ہیں۔

"مرنے کے بعد کیا ہوگا؟"

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے انسانی ذہن ہمیشہ مضطرب ہوتا ہے۔ یہ کہہ دینا کہ کچھ نہیں ہوتا۔ درخت سے ٹپکے ہوئے پھل کی طرح ہم بھی گل سڑ کر مٹی ہوجائیں گے۔ اس مٹی سے گیہوں، اور اس سے کسی اور بدن انسانی میں خون، خون سے مادہ تولید، اور پھر مقررہ مدت گزرنے پر۔ ہم جیسا ایک دوسرا انسان۔ یہ ایک جواب ہے۔ اور شاید کم ہمت۔ پست خیال لوگوں کے لئے اصل سوال سے فرار کی ایک جانی پہچانی راہ ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ کونسا مشاہدہ اور تجربہ ہے جو اس جواب کے صحیح ہونے کا یقین ہم میں پیدا کرسکے گا۔ دعویٰ اور وہ بھی منفی دعویٰ۔ اور اس کے پیچھے دلیل نہ عقلی اور نہ وجدانی۔ اسے کون مانے گا۔

خیال و فکر کا شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں!

شفیق جون پوری

انقلابِ زمانہ

کچھ یاد نہیں موسمِ گل ہے کہ خزاں ہے
اب دل پہ نشیمن کا تصوّر بھی گراں ہے

آرام ہمیں تیری گلی میں بھی کہاں ہے
ہر چند کہ ماوائے غریبانِ جہاں ہے

اپنی بھی زمیں قطعۂ شاداب ہے لیکن
گلشن جسے کہتے ہیں نصیبِ دگراں ہے

بلبل کا ترانہ بھی ہے شاخوں کی لچک بھی
نرگس ہے کہ با دیدۂ حیرت نگراں ہے

جس رات نے بخشی تری زلفوں کو درازی
اس رات کے چہرے پہ غریبی کا دھواں ہے

گفتار کی محفل تو ہے آراستہ لیکن
کردار کی دنیا ابھی بے امن و اماں ہے

ہمدردیٔ مزدور کا نعرہ تو ہے لیکن
اس نعرہ میں بھی اپنی ہی غرض روحِ رواں ہے

اِس پار کی بستی ہو کہ اُس پار کی دُنیا
آرام شریفوں کو یہاں ہے نہ وہاں ہے

تاریخ بھی ہے فلسفہ و شعر و ادب بھی
سب کچھ ہے مگر جوہرِ اخلاق کہاں ہے

مذہب سے الگ ہٹ کے غریبوں کی حمایت
یہ ذہن کی پستی پہ بلندی کا گماں ہے

تہذیب کی توہین، تقدس کا تمسخر
کہنے کے لئے مجمعِ صاحب نظراں ہے

مسجد تو نمازی سے بھی خالی ہوئی زاہد!
میخانہ زیارتگہِ رندانِ جہاں ہے

توحید کا نقشہ ہے نہ طغرائے رسالت
کمروں میں جہاں دیکھئے تصویرِ بتاں ہے

کہتے ہیں جسے دائرۂ علم و ادب آج
تصویروں کا دفتر ہے معمّوں کی دکاں ہے

افسانہ نگاری ہوئی معیارِ لیاقت
مفتی کا قلم ہے نہ مؤرخ کی زباں ہے

شاعر سے بھی مفقود ہوئی روحِ محبت
دل ہے نہ تڑپ ہے نہ تپِ سوزِ نہاں ہے

الفاظ ہی الفاظ ہیں تقلید ہی تقلید
اقبال کی آواز نہ حالی کی زباں ہے

شبلی کی ہے تحقیق نہ سیماب کا پیغام
مغرب کا چرایا ہوا اندازِ بیاں ہے

اعلانِ بغاوت بھی ہے اخلاص سے عاری
نقّاد پہ بھی ہم کو منافق کا گماں ہے

عاشق کی نگاہیں ہدفِ بوالہوسی ہیں
معشوق وہ بیباک کہ رسوائے جہاں ہے

صوفی کو مریدوں کا ہو نذرانہ مبارک
قوّال کی آواز نہیں لحنِ اذاں ہے

ہاں خانقہِ شیخ ہو یا وعظ کی محفل
ایمان کی پوچھو تو اب ایمان کہاں ہے

اتنا ہی غنیمت ہے بہرحال شفیق آج
مستوں میں وہی پیر دئی پیرِ مغاں ہے

شعر و نغمہ

عروج زیدی بدایونی

نئی طرزِ چمن بندی، نرالی باغبانی ہے ۔۔۔ بہار آنے سے پہلے ہر زباں پر لن ترانی ہے

نفس کی آمد و شد میں حوادث ہی حوادث ہیں ۔۔۔ مری ہر سانس گویا اک نہادِ زندگانی ہے

اگر رہرو شکستہ پا ہو منزل خود قدم چومے ۔۔۔ رہِ منزل میں تھک جانا دلیلِ کامرانی ہے

دلِ بیتاب کی دھڑکن کو حرفِ آشنا سمجھتا ہوں ۔۔۔ مصنّف کا فسانہ خود مصنّف کی زبانی ہے

گلِ باغِ سخن لے کر عروج! آپ بھی چلئے ۔۔۔ ادب کے نام پر احباب نے محفل سجائی ہے

میرے قابو میں تو قرطاس کا پرزہ بھی نہیں ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہے کونین کا دفتر اے دوست!

دلِ بیتاب کے نالے بھی مرے بس میں نہیں ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہے ہنگامۂ محشر اے دوست!

خس و خاشاک بھی ہیں دور مرے ہاتھوں سے ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہیں کانٹے بھی گلِ تر اے دوست!

ایک لمحہ مرے روکے سے کبھی رک نہ سکا ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہے دن رات کا چکر اے دوست!

میرے قبضہ میں تو اک قطرۂ نیساں بھی نہیں ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہیں صد قلزمِ گوہر اے دوست!

عملِ نیک میں توفیق کا محتاج ہوں میں ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہے توفیق کا محور اے دوست!

سنگ ریزہ کی رگوں سے بھی میں ناواقف ہوں ۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں ہے آئینہ کا جوہر اے دوست!

وارث

چھایا تو آسماں کی حدیں پار کر گیا ۔۔۔ وہ ہیں بلندیاں مری مشتِ غبار میں

چمن میں کچھ نئی تبدیلیاں درکار ہیں ہمدم ۔۔۔ ابھی نغموں کا کیا موقع ابھی تو نوحہ خواں ہم ہیں

جفا شیوہ تمہارا اور مسلک ہے وفا اپنا ۔۔۔ معاذ اللہ! یہ دوری! کہاں تم ہو کہاں ہم ہیں

جتنی بھی میں نے اُن کو بھلانے کی فکر کی ۔۔۔ اُتنے ہی اور نقشِ تمنا اُبھر گئے

مجھ کو بلبل نہ سمجھ، روحِ چمن ہوں صیاد ۔۔۔ سینکڑوں حشر ہوں بیدار جو اک پر ٹوٹے

ازل سے یادگاریں چھوڑتا آیا ہوں میں اپنی ۔۔۔ جبیں ماضی کی دیکھو گے تو میرا نقشِ پا ہوگا

ماہر القادری

مدینہ کی زمیں پر پہلے کچھ سجدے گزار آئی ۔۔۔ پھر اُس کے بعد گلشن کی طرف فصلِ بہار آئی

مسرت بھی تو بن کر دشمنِ صبر و قرار آئی ۔۔۔ وہ کیسے لوگ ہوں گے جن کو دُنیا سازگار آئی

قفس میں ہم نشینو! اس طرح یادِ بہار آئی
گرے آنسو تکلف سے، ہنسی بے اختیار آئی

روحِ انتخاب

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے اربابِ اقتدار کے لیے دعوتِ فکر و عمل! کاش.... کاش!

دُنیوی اقتدار و اختیار دینے کا مقصد
یہ لوگ (مومنین) ایسے ہیں کہ اگر ہم اُن کو دُنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیک کاموں کو کرنے کے لئے کہیں گے اور بُرے کاموں سے روکیں گے۔ (قرآن کریم۔ سُورۂ حج)

اختیارات کے بے جا استعمال کرنیکا انجام
اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جہاں کے رہنے والے ظالم[1] تھے، غارت کر دیا اور اُن کے بعد دوسری قوم پیدا کر دی۔ (قرآن کریم۔ سورۂ انبیاء)

طلب امارت
حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ اپنی ولایت میں سے کسی علاقہ کا مجھے امیر بنا دیجئے۔ دُوسرے نے بھی اسی طرح کہا۔ اُس وقت حضورؐ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم میں کسی ایسے شخص کو والی امر نہیں بنا سکتا جو اُس کا طلب گار یا حریص ہو۔" دُوسری روایت میں ہے کہ کسی ایسے شخص کو ہم عامل مقرر نہیں کرتے جو اُس کی خواہش ظاہر کرے۔" (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ)

حاکم و والی کے فرائض
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ لوگوں پر حاکم بنائے۔ پھر وہ رعایا کی خیرخواہی میں تمام تر اختیارات صرف نہ کرے، وہ جنت کی بُو تک نہیں پائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "بہترین حکام وہ ہیں جن سے تم محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت رکھتے ہوں۔ اور تم ان کے لئے دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ اور بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور وہ تم سے بغض رکھتے ہوں اور تم اُن پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں۔"

اطاعت امیر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کیلئے امیر کی اطاعت اور تعمیلِ حکم ہر حال میں ضروری ہے چاہے اس کی پسند کے موافق ہو یا نہ ہو۔ جب تک اسے کسی معصیت کے ارتکاب کا حکم نہ دیا جائے۔ البتہ جب معصیت کا حکم کیا جائے، تب تعمیلِ حکم اور اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔ اور حضورؐ نے فرمایا کہ معصیت میں اطاعت نہیں ہے، اطاعت صرف نیک کاموں میں ہے۔

قبول ہدایا
ابو حمید ساعدی نے کہا کہ ابن اللتبیہ نامی ایک شخص کو حضورؐ نے عامل مقرر کیا۔ اس نے اپنے علاقہ سے واپس آکر کہا کہ یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے دیا گیا ہے۔ حضورؐ کھڑے ہوئے اور حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ "عامل کا یہ حال کیوں ہے کہ وہ کہتا ہے کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے! وہ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہیں بیٹھا رہا۔ پھر دیکھتا اس کو کوئی ہدیہ بھیجا جاتا ہے کہ نہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ جو بھی اس قسم کے ہدیہ قبول کرے گا وہ قیامت میں اُن کو اپنی گردن پر اُٹھا کر آئے گا۔"

---

[1] "ظلم" سے مراد کسی پر زیادتی کرنا ہی صرف نہیں ہے، شرک، معصیت، حقوق اللہ، اور حقوق العباد کو پس پشت ڈال دینا۔ دین و اخلاق سے بے پروائی۔ یہ سب چیزیں "ظلم" کی تعریف میں داخل ہیں۔

حکام کی گمراہی اور عوام کا فریضہ

حضورؐ کا ارشاد ہے "ظالم حاکم کے روبرو حق بات کہنی سب سے بڑا جہاد ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "میرے بعد بہت سے ظالم امیر ہوں گے، جو لوگ اُن کے پاس جا کر اُن کی جھوٹی باتوں کی تصدیق کریں گے اور اُن کے ظلم میں تعاون کریں گے۔ ایسے لوگ میرے زمرہ سے نہیں ہیں اور نہ میں اُن کے زمرہ سے ہوں"۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کسی کا اندیشہ اور خوف تم کو حق بات کہنے سے باز نہ رکھے۔

مثالی حکمران

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اے لوگو! میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کی پیروی کرنیوالا ہوں، کسی نئی راہ کا موجد نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو تم میری اعانت کرنا اور اگر میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے سیدھی راہ پر چلانا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بیت المال سے جو وظیفہ لیتے تھے وہ ایک عام شخص کے وظیفہ کی برابر تھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بیت المال سے کسی قسم کا وظیفہ لیتے ہی نہ تھے۔ حالانکہ حضرت علیؓ کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ حضرت عمرؓ بہت ہی موٹا کپڑا پہنتے تھے اور پیوند بھی لگواتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے آپ کے کرتہ کے دو بازوؤں میں چار پیوند دیکھے۔

ابنِ سعیدؓ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک خوبصورت شخص کے سر کے نیچے کچی اینٹ رکھ کر مسجد نبویؐ میں سوتے دیکھ کر متعجب ہوا۔ گھر جا کر میں نے اپنے والد سے اس شخص کی تعریف پوچھی۔ میرے والد نے کہا۔ یہی تو خلیفہ حضرت عثمانؓ ہیں۔

حضرت علیؓ کے متعلق ہارون بن عنتر فرماتے ہیں کہ میں نے خلیفۃ المسلمین حضرت علیؓ کو پھٹی ہوئی چادر پہنے، سردی سے ٹھٹھرتے دیکھا ہے۔

خلیفہ عمر ابن عبدالعزیزؒ خلافت سے پہلے اپنے لئے ہزار دینار (ڈھائی ہزار روپیہ) قیمت کا جوڑا خریدنے پر بھی اسے موٹا اور سخت کہہ کر ناپسند کرتے تھے۔ لیکن خلیفہ ہونے کے بعد دس درہم (ڈھائی روپیہ) کی قیمت کے جوڑے کو بھی وہ باریک اور ملائم کہہ کر ناپسند فرمانے لگے۔

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک مرتبہ میدے کی نرم روٹی پیش کرنے پر آپ نے پوچھا۔ "کیا ملک کے سب لوگوں کو ایسی روٹی نصیب ہوتی ہے؟ جواب ملا "نہیں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "تب میں بھی یہ نہیں کھاؤں گا"۔

حضرت علیؓ نے مقام عکبرہ میں متعین اپنے عامل سے فرمایا۔ دیکھو! خراج کے لئے کبھی ان لوگوں (غیر مسلموں) کی گائے، بھینس، یا سردی وگرمی کے کپڑے قرق نہ کرنا۔ بلکہ اُن سے نرمی برتنا، اُن سے نرمی برتنا، نرمی برتنا، جو اس کی خلاف ورزی کریگا اسے برخاست کر دیا جائیگا۔

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصرہ کے حاکم حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا کہ "وہی حاکم سب سے خوش قسمت ہے جس کی حکومت میں رعایا خوش حال ہو اور سب سے بدنصیب وہ حاکم ہے جس کے دَور میں رعایا خستہ حال رہے!

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ (بحرین کے عامل خراج) کے دس ہزار درہم ضبط فرمالئے۔ اُن کا خیال تھا کہ ابوہریرہ کے پاس یہ مال صحیح طریقہ سے نہیں آیا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ عمر ابن عبدالعزیزؒ اپنے ذاتی کام کے وقت اپنا ذاتی چراغ جلاتے تھے۔

("قرونِ اولیٰ میں اسلامی حکومت" سے ماخوذ)

ماہر القادری

بھکاری

بھیک مانگنا نہ کوئی پیشہ ہے اور نہ بھکاریوں کی کوئی قوم ہے مگر اس کو کیا کیجیے کہ سوسائٹی نے بھیک کو سچ مچ ایک پیشہ اور بھیک مانگنے والوں کو ایک مستقل قوم بنا دیا ہے، کتنے دکھ اور اچنبھے کی بات ہے کہ مردم شماری کے رجسٹروں میں بعض لوگوں کے ناموں کے سامنے "قوم فقیر" لکھا ہوتا ہے۔ لوگ بھیک کیوں مانگتے ہیں؟ یہ ایک اُلجھا ہوا سوال بھی ہے اور سادہ بھی! جو کوئی حالات سے ناچار و مجبور ہو کر دُوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور در در بھیک مانگتا ہے اُس کی حیثیت، حالت اور ضرورت سمجھ میں آتی ہے مگر جو لوگ اپنی قوتِ بازو سے کھا کما سکتے ہیں اُن کا بھیک مانگنا ایک اُلجھا ہوا مسئلہ ہے کہ محض تن آسانی کی خاطر انسان کا اپنے کو اتنا گرا دینا کہ وہ ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرے اور دُنیا اُسے فقیر، بھکاری اور منگتا کہہ کر پکارے، خاصی اُلجھی ہوئی بات ہے۔ عزت، شرافت اور خودداری کو یوں کوڑیوں کے مول بیچ دینا اور بھیک کے ٹکڑوں پر ساری زندگی گزار دینا، انسانی نفسیات کا ایک عجوبہ ہے!

وفاتی بھی اسی قسم کا بھکاری تھا جسے ضرورت نے نہیں تن آسانی اور بے حمیتی نے بھکاری بنا دیا تھا۔ اُس کی عمر پچیس[۲۵] سال کے لگ بھگ تھی، خوب گٹھا ہوا بدن۔ موٹی پنڈلیاں، چوڑی چکلی چھاتی۔ مضبوط شانے! وہ جو مشہور کہاوت ہے کہ جوان آدمی ٹھوکر مارے اور زمین سے پانی نکل آئے تو وفاتی ایسا ہی تومند جوان تھا کہ وہ کنواں کھود کر دُوسروں کو پانی پلا سکتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا تو اپنی کمائی سے ایک کنبہ کا پیٹ پال سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے کو دُوسروں کا محتاج بنا لیا تھا! اُس کی ٹانگ میں معمولی سا زخم تھا۔ اس زخم کو وہ بھرنے نہ دیتا۔ جب دیکھتا کہ زخم خشک ہو رہا ہے اور اچھے ہونے کے قریب ہے تو وہ اپنے ناخنوں سے کھُجا کر اُسے ہرا کر دیتا۔ اُس کی ٹانگ کا یہی زخم اُس کے بھیک مانگنے کا سہارا بلکہ "آرٹ" تھا۔ زخم پر ایک بہت ہی موٹے کپڑے کی میلی کچیلی دھجی اس انداز سے باندھتا کہ زخم کا ادھ کچا کھرنڈ کھُلا رہتا تاکہ ٹانگ کے چوٹ کھائے ہوئے گوشت کی لالی راہگیروں کو آسانی سے دکھائی دے سکے!

سر پر ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ ٹوپی، بدن پر پیوند لگا کُرتہ۔ وہ بھی اتنا شکستہ کہ سیدھے بازو کا مونڈھا کھُلا رہتا۔ چوخانہ کا گرد آلود تہبند ہاتھ میں ایک موٹے سے بانس کا ڈنڈا۔ جس کے سہارے وہ لنگڑا لنگڑا کر چلتا۔ فیشن پرست لوگ شاید کپڑے پہننے اور رہنے سہنے میں اتنا تکلف نہیں برت سکتے۔ جس تکلف سے اُس نے اپنے کو آشفتہ مُو، پریشان حال۔ دُکھیارا اور قابلِ رحم بنا لیا تھا! کس دردناکی کے ساتھ کراہتا۔ کس قدر ملتجی نگاہوں سے لوگوں کو دیکھتا۔ کس قدر دردناک ہیئت اور کتنی فلاکت زدہ صورت تھی۔ گویا سارے جہان کی مظلومیت، بیچارگی اور کس مپرسی سمٹ سمٹا کر اس ایک قالب میں ڈھل گئی ہے اور اس کی بیچارگی لوگوں کے دلوں کی سختی اور نرمی جانچنے کی کسوٹی ہے۔ جو کوئی اس کے حالِ زار پر ترس نہیں کھا سکتا وہ سنگدل اور پرلے درجہ کا بے رحم ہے!

بعض بھکاری واقعی مظلوم اور قابلِ رحم ہوتے ہیں مگر بیچاروں کو مانگنے کا آرٹ نہیں آتا۔ قدامت پسند بلکہ رجعت پرست، لکیر کے فقیر بس دن بھر ایک ہی طرح کی "صدا" لگائے جاتے ہیں۔ "تیرا بچہ جیئے" یہ صدا اُن نوجوانوں کو کیا اپیل کر سکتی ہے جن کے سرے سے اولاد ہی نہیں ہے، "تیرے کاروبار میں ترقی ہو" ایک کلرک کے لئے اس دُعا اور صدا میں کوئی جاذبیت نہیں۔ "تیری جوڑی بنی رہے" کالج کی ایک فیشن زدہ

لڑکی پر اس دعا کا کیا اثر ہو سکتا ہے کہ فری لو (free love) میں "جوڑے" نہیں ہوا کرتے۔ تتلیاں اور بھونرے تو کلی کلی کا رس چوستے ہیں۔

مگر وفاتی ایک آرٹسٹ بلکہ "ترقی پسند" قسم کا بھکاری تھا۔ اُس کی صدائیں، دعائیں، آوازیں بلکہ کراہیں تک بدلتی رہتیں۔ تجربہ نے اُسے بڑا مردم شناس بنا دیا تھا۔ طالب علم کو آتا دیکھ کر وہ نرم لہجہ میں صدا لگاتا "اللہ! امتحان میں کامیاب کرے"۔ بیوپاری کو آتا دیکھ کر ذرا کڑک کر کہتا "اللہ نے چاہا تو ایک کے دس ہوں گے"۔ اور اس کی یہ صدا "سب بھلا ہو گا"۔ کتنی عمومی بلکہ عوامی تھی۔ وفاتی قسمت سے لیڈر ہوتا تو کتنا کامیاب لیڈر ہوتا!

ہوٹلوں کے قریب سے گزرتا تو پکارتا "کھانا کھلوا دے کوئی اللہ کا سخی"۔ اور ہزاروں راہگیروں میں کسی نہ کسی کا دل پسیج ہی جاتا۔ ایک دن ایک شخص اُسے دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھلا چکا کہ ہوٹل سے نکلتے ہی پھر اس نے یہی صدا لگائی "کھانا کھلوا دے کوئی اللہ کا سخی"۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سائیکل پر جا رہا تھا۔ بھیڑ میں وہ سائیکل سے اُتر پڑا۔ وفاتی کی دردانگیز صدا سُن کر متاثر ہوا۔ وہ اُسے ساتھ لے کر نان بائی کے ہاں پہنچا۔ اور نان بائی کے ہاتھ میں آٹھ آنے پکڑا کر بولا۔ "سائیں جی کو ان پیسوں کا کھانا کھلا دینا"۔ وفاتی تنور کے پاس پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اُس آدمی نے سائیکل پر چڑھ کر اپنی راہ لی!

"شاہ جی! کیا نکالوں۔ قیمہ، آلو گوشت، کوفتہ، دال خشکہ ...."

وفاتی نان بائی کے اس سوال پر بنچ سے اُٹھ کر اُس کے قریب آیا اور لجاجت آمیز انداز میں کہنے لگا:۔

"مجھے ڈرگ روڈ جانا ہے، کرایہ کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی میرے پاس نہیں ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ یہ پیسے مجھے دیدو...."

اس پر نان بائی حقہ میں کش لگاتے ہوئے بولا:۔

"تو تمہیں پیسے لوٹا کر اپنی بکری کم کر لوں...... اور ہاں! پیسے میں لوٹا بھی دوں مگر پیسے کے پورے نہیں..... کچھ......"

وفاتی نان بائی کی بات کاٹتے ہوئے بولا:۔

"میں تو فقیر آدمی ہوں........ بھکاری........"

نان بائی نے قدرے درشت لہجہ میں جواب دیا:۔

"میں بھی تو کہیں کا سیٹھ ساہوکار نہیں ہوں۔ دن بھر تنور جھونکتا ہوں۔ تب کہیں جا کر کنبہ کیلئے روٹی کا سہارا ہوتا ہے"۔

نان بائی نے ایک آنہ کاٹ کر سات اکنیاں وفاتی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ ایک آنہ کی یہ کٹوتی اُسے بہت کھلی مگر جیل حجت کرتا تو بھرے پیٹ پر آٹھ آنہ کا کھانا کھانا پڑتا!

وفاتی بھکاری تھا مگر بہرحال آدمی تھا۔ دوسروں کی طرح اُسے بھی اپنے آرام سے اور لطف و تفریح سے دل چسپی تھی۔ خوش ہونا اور مگن رہنا وہ بھی جانتا تھا اور اس دُنیا میں اگر کسی کیلئے کوئی دل چسپی باقی نہ رہے تو وہ زندہ کا ہیکو رہے۔ وفاتی کی سب سے بڑی دل چسپی اسکولوں اور کالجوں کے دروازوں پر بیٹھ کر بھیک مانگنا اور لڑکیوں کا نظارہ کرنا تھا۔ یہ بے پیسے کی تفریح تھی! کیسے کیسے بے نقاب چہرے اُس کی نگاہوں سے گزرتے اور اُس کے دل کی دھڑکنیں کتنی تیز ہو کر رہ جاتیں۔ دوسری دل چسپی اُسے خبروں سے تھی۔ صبح، شام کسی چوراہے پر بیٹھ جاتا اور اخبار بیچنے والوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ ہاکروں کی زبانی خبریں سُن سُن کر بلگانن اور آئزن ہاور جیسی شخصیتوں کے اور جینوا، واشنگٹن اور پیکن جیسے مقامات کے نام اُسے یاد ہو گئے تھے۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ فرانس کی حکومت مراکش اور الجزائر کے مسلمانوں پر ظلم کر رہی ہے۔ اُس کے کان جمال ناصر اور اخوان المسلمون کے نام سے بھی آشنا تھے۔ پاکستان کی خبروں میں جب کبھی وزارت یا اسمبلی ٹوٹنے کی خبر اُس کے کان میں پڑتی تو وہ کچھ فکرمند سا ہو جاتا۔ اور اُس کے ہونٹ آپ ہی آپ ہلنے لگتے:۔

"توڑ پھوڑ ہی ہوتی رہے گی، بننے بنانے کا کام بھی کبھی شروع ہوگا"

بازیگروں کے کھیل اور بندر نچانے کا تماشہ بھی وہ خاصی دلچسپی کیساتھ دیکھتا اور کبھی موج آجاتی تو دو چار پیسے اُن کو دے بھی دیتا۔ بندریا کے روٹھنے اور بندر کے منانے کا منظر دیکھ کر وہ ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنی آغوش کو عورت سے تہی پاکر ملول ہوجاتا۔

"بھکاری کا بیاہ کسی بھکارن ہی سے ہو سکتا ہے۔ مگر ......" یہ کہتے ہوئے وہ بیڑی سلگا کر لمبے لمبے کش لگاتا، غم غلط کرنے کے لئے! مگر ذرا سی بیڑی سینکڑوں من بوجھ کے غم کو ہلکا کیسے کر سکتی ہے، یوں کوئی دل کو جھوٹی تسلی دے لے تو دوسری بات ہے!

وفاتی نے یہ سارے دکھ خود ہی مول لئے تھے۔ وہ چاہتا اور ہاتھ پاؤں ہلاتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ وہ اپنے حق میں خود ظالم تھا مگر اپنے کو مظلوم سمجھتا تھا، موٹر نشینوں کو، خوش پوش اور کھاتے پیتے لوگوں کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتا جیسے ان سب نے اس کا حق مار کر اور اس پر ظلم کرکے اپنے کو خوشحال بنایا ہے۔

ایک دن وہ اپنی لکڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا بندر روڈ سے گزر رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر کئی رمال اور نجومی بیٹھے تھے، جو زائچہ کھینچکر، ہاتھ دیکھ کر اور پانسہ پھینک کر لوگوں کو اُن کی زندگی کے ماضی اور مستقبل کے حالات بتاتے۔ وفاتی بھی ایک نجومی کے پاس بیٹھ گیا۔ نجومی کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی سفید براق ڈاڑھی، گھنی بھی اور مدوّر بھی! اُجلے کپڑے، گلے میں تسبیح، جس میں رنگ برنگ کے دانے پروئے ہوئے تھے، ناک کے بانسہ پر عینک لگی ہوئی نہیں بلکہ ٹکی ہوئی، ایک کمانی آدھی ٹوٹی ہوئی اور دوسری کمانی کی جگہ نیلا دھاگا بندھا ہوا۔ نجومی ایک آدمی کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ اُن کی باتیں:-

"اس لڑکی کے دل میں تمہاری محبت ہے مگر اُسے ایک آدمی بہکا تا رہتا ہے"

"تو اُس آدمی کے لئے بھی کوئی تدبیر بتا دیجئے کہ لڑکی اس سے فرنٹ ہوجائے"

"اس کے لئے بھی تعویذ دوں گا۔ پچّے تعویذ کے لئے ڈھائی روپے اور کچے تعویذ کا سوا روپیہ ہوگا"

"اس میں کچھ کمی نہیں ہو سکتی"

"ہاں! ہو سکتی ہے مگر اتنا خیال رہے کہ جتنا گُڑ ڈالوگے اُتنا ہی میٹھا ہوگا"

"آپ کے پاس دس کے نوٹ کے کھلے روپے ہوں گے"

"نہیں، اتنے روپے تو نہ ہوں گے"

"میں نوٹ تڑا کر ابھی آتا ہوں"

اُس آدمی کے جانے کے بعد وفاتی نے اپنا ہاتھ نجومی کے سامنے کھول دیا۔ نجومی نے عینک ناک پر ذرا سی کھسکائی اور بڑے غور سے وفاتی کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگا۔ انگلیوں کے پوروں کو، ناخنوں کو، ہتھیلی کی گہرائی کو اور اس کے ارد گرد ابھار کو بار بار دیکھا ...... اور ...... پھر:-

"آنے والا سال تم پر اور سخت گزرے گا۔ پھر چین ہی چین ہے، ایک میمن سے تمہیں فائدہ پہنچے گا۔ ہزاروں کی دولت ہاتھ لگے گی۔ ارے تمہارے ہاتھ کی یہ لکیر ٹوٹ نہ جاتی تو سو سال کی ہوتی تمہاری عمر۔ پھر بھی ستّر سال جیوگے"

"میرا بیاہ کب تک ہوگا ملّا جی!"

"جب تم چاہوگے"

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ شام کے ہوتے ہوتے دولھا بن جاؤں .... مگر ......"

وفاتی کی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایک بوہری نجومی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور نجومی نے موٹی آسامی کو دیکھ کر وفاتی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وفاتی اُٹھنے لگا۔

"فیس تو دو ہاتھ دکھانے کی۔" نجومی نے سخت لہجہ میں کہا۔

"جب میمن کے یہاں سے روپیہ ملے گا اس وقت آپ کا بھگتان کر دوں گا۔" وفاتی کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور "کوئی سخی کھانا کھلوائیگا!" کی کڑک کر صدا لگا دی۔

وفاتی نے ملنسار طبیعت پائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا لوگوں سے میل جول بڑھے، اس دُنیا میں بالکل الگ تھلگ کوئی رہ بھی کیسے سکتا ہے؟ مگر اُس جیسے بھکاری سے کون ربط بڑھاتا اور میل جول کرتا۔ اُس کا دُنیا میں بس ایک ہی شخص سے یارانہ تھا۔ جمعہ خاں گوڑگانوہ کا مہاجر تھا یہ دونوں لاہور سے کراچی مال گاڑی میں بیٹھ کر ساتھ ہی ساتھ آئے تھے۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب پاکستان کو بنے چند مہینے ہوئے تھے اور مسافر ریل گاڑی کے ڈبوں کی چھتوں تک پر چڑھ جاتے تھے۔ جمعہ کراچی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر قلی گیری کرنے لگا اور وفاتی بھکاری بن گیا!

ان دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی۔ دونوں کی طبیعتیں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں، جمعہ خاں کے کہنے سننے سے وفاتی نے سڑکوں پر گھوم کر مانگنا چھوڑ دیا۔ اب ٹانگ پر زخم کے باقی رکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی اس لئے چند دن میں زخم اچھا ہو گیا مگر کئی سال تک لنگڑا کر چلنے کی عادت کا یہ اثر رہا کہ زخم اچھا ہونے کے بعد بھی وفاتی چلتے پھرتے لنگڑانے لگتا!

بھیک مانگنا اُس نے نہ چھوڑا تھا اور اس عادت کا چھٹنا مشکل بھی تھا۔ پہلے میلے کچیلے کپڑے پہن کر سڑکوں پر اپاہجوں کی طرح مانگتا پھرتا اب صاف کپڑے پہن کر ریلوے اسٹیشن پر مانگتا، بہانہ یہ کہ جیب کٹ گئی ہے ملتان تک کا کرایہ چاہیئے۔ بیوی کے بچہ ہونے والا ہے دوا دارو کے لئے ایک پیسہ بھی گھر میں نہیں ہے۔ پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ لگا دیا ہے، اُس کی پیروی کے لئے کچھ رقم درکار ہے!

سٹی اسٹیشن سے کچھ دور پر جمعہ خاں قلی نے ایک جھگی پچاس روپے میں خرید لی تھی۔ یہ جھگی صوبہ بہار کے ایک مہاجر کی تھی، وہ بیچارہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا مگر اُسے جانا پڑا۔ اُس کے تین جوان لڑکیاں تھیں۔ آس پاس کے نوجوان اُنھیں گھورتے تھے اور ان کی تاک جھانک اور چھیڑ چھاڑ کا انداز غمازی کر رہا تھا کہ یہ لوگ اس سے بھی بہت زیادہ بڑی شرارت کر کے رہیں گے۔ اپنی عزت آبرو بچانے کے لئے اُس غریب مہاجر نے اپنی جھگی جو اُس نے سوا سو روپے میں مول لی تھی اور جس کی مرمت اور مضبوطی میں تیس چالیس روپے اور خرچ کئے تھے، پچاس روپے میں جمعہ خاں کے ہاتھ بیچ دی!

وفاتی بھی اپنے دوست کے پاس اسی جھگی میں رات کو سو رہتا تھا۔ جھگی کی خریداری میں اس کا ایک پیسہ بھی نہیں لگا تھا۔ اُس کے ذمہ بس پانی کا انتظام تھا چاہے وہ نل سے خود بھر کر لائے یا کسی پانی والے سے اُجرت دے کر بھروائے! ایک مٹکا، دو گھڑے اور ایک صراحی۔ بہرحال صبح سویرے بھر جانے چاہیئے تھے!

جمعہ خاں قلی گیری کے ذریعہ اور وفاتی بھیک مانگ کر اچھی خاصی کمائی کر لیتے مگر پھر بھی پھٹے حال رہتے! دن رات میں پندرہ بیس چائے کی پیالیاں پی لیں، کھڑے کھڑے دس دس بارہ بارہ آنہ کی چاٹ کھالی، سینما دیکھ لیا، ہفتہ میں ایک آدھ بار نشہ بھی کر لیتے! تاش کے پتوں کا کھیل بھی بد کر کھیلتے۔ اس میں بھی روپیہ دو روپیہ جیب سے نکل ہی جاتا۔

وفاتی کو زنانہ اسکولوں اور کالجوں کے دروازوں پر کھڑے رہنے کی چاٹ پڑی ہوئی تھی۔ اب بھی وہ ایک دو دن کی آڑ سے اُدھر کا چکر لگا آتا۔ اور اب چند دن سے وہ ذرا فکر مند سا رہنے لگا تھا مگر سٹی اسٹیشن سے شہر جاتا تو بن سنور کر جاتا!

رات کا وقت تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بوندا باندی ہو رہی تھی، دونوں دوست گئے کا سیر بھر تلا ہوا گوشت کھا کر لیٹے تھے۔ حقہ کا دور چل رہا تھا۔ جمعہ خاں نے وفاتی سے کہا کہ بھیا! کچھ دن سے تم بدلے بدلے سے دکھائی دیتے ہو، کچھ سوچ، کچھ فکر، اپنے مانگنے کے کام سے بھی بے پروائی سی۔ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ دوست سے اپنے دل کی بات نہ چھپاؤ!

وفاتی نے ایک سرد آہ کھینچی اور چلم کی آگ کو چمٹے سے اُکساتے ہوئے بولا۔

"بھیا! تو نے پوچھا ہی اور ہمدرد بن کر پوچھا ہی تو اپنے دل کی بات کہے دیتا ہوں۔ تم جب برات سے ایک دن پہلے میرے ساتھ اس کالج کے پاس سے گزرے تھے، جہاں گھوڑا گاڑی کی موٹر رکشا سے ٹکر ہوئی تھی۔ تو اسی کالج کی ایک لڑکی کے دیدار کی کھاطر (خاطر) دوسرے تیسرے دن ادھر جانا پڑتا ہے۔ اس طرح آنے جانے میں میری آمدنی میں کمی آگئی ہے۔ لاکھ کوشش کی کہ اس ظالم کا خیال دل سے نکل جائے۔ مگر بھیا! جتنا بھلاتا ہوں اتنی ہی وہ اور یاد آتی ہے۔

اس پر جمعہ خاں اپنے بچھونے پر کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

"تو یوں کہو آج کل عشق لڑا رہے ہو۔ بھیا! ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گے (دوست کی بات کا بھلا کوئی برا مانا کرتا ہے۔ وفاتی بول پڑتا ہے) ہاں! تو میرا کہنا یہ ہی کہ شریف لڑکی کو تکنے اور گھورنے کیلئے دو میل چل چل کر جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ (وفاتی بات کاٹتے ہوئے۔" اگر شرافت موٹر میں بیٹھنے، اچھے کپڑے پہننے، کھلے بندوں پھرنے اور کالج میں پڑھنے پڑھانے کا نام ہے تو پھر کراچی میں ہوا، پانی اور مٹی کم ہے اور سراپت (شرافت) زیادہ ہے۔ جمعہ بھیا! میں نے "شرافت" کے نہ جانے کتنے تماشے دیکھے ہیں ایک عورت حیا کی چادر اتار کر سڑکوں پر سینہ تان تان کر چلے اور اس پر بھی اس کی "شرافت" جوں کی توں رہ جائے تو میں کہتا ہوں کہ شرافت سے زیادہ پنچ اور جلیل (ذلیل) کوئی چیز نہیں!)

وفاتی کے جواب پر جمعہ خاں نے چند سیکنڈ سکوت اختیار کیا۔ پھر وہ اکڑوں بیٹھ کر بولا "شرافت" کی بات کو میں چھوڑتا ہوں۔ مگر بھیا! یہ تو دیکھ کہ تو کہاں، اور وہ لڑکی کہاں۔ پدمنی رانی اور گنگو تیلی کا کیا جوڑ! یہ تو وہی بات ہوئی کہ رہیں جھونپڑی میں خواب دیکھیں محلوں کے! وفاتی بھیا! دل لگائے بغیر تیرا کھانا ہضم ہی نہ ہوتا تھا تو کسی بھکارن سے، مہترانی سے، پھل بیچنے والی سے یا کسی ماما سے دل لگایا ہوتا!"

اس پر وفاتی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"اس کا بھی انتظام کرلیا ہے۔ یہ دیکھ اسلام پور والے شاہ صاحب نے تعویذ عطا کیا ہے۔ سیٹھ ساہوکار تو ان شاہ صاحب کے ایک ایک تعویذ کے بدلے میں سو سو روپے کی نذر دیتے ہیں۔ مجھ غریب کے حال پر ترس کھا کر شاہ صاحب نے کلہم تین روپے، سوا سیر مٹھائی، ڈھائی گز کورا لٹھا اور دو سیر ماش کی دال قبول فرمائی ہی۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ چھ ہفتے نہ بیتنے پائیں گے کہ لڑکی تمہاری طرف آپ ہی پہل کرے گی۔ اور تمہارے سوا کسی کو نہ چاہے گی۔ یہ شاہ صاحب بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے تعویذوں میں بڑا اثر ہی، ان کے یہاں صبح شام لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ایک گیا اور چار آگئے، پرسوں ان کے یہاں پیران پیر کی نیاز تھی۔ پھر قوالی ہوئی، قوال کے ایک بول پر شاہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور بہت دیر تک تالیاں بجا بجا کر گھومتے رہے (یوں کہو ناچتے رہے۔ جمعہ خاں بیچ میں بول پڑتا ہی) ایسا نہ کہو! شاہ صاحبوں کی جو کوئی ہنسی اڑاتا ہی اس کے نہ دین کا ٹھکانا رہتا ہے اور نہ دنیا کا!

جھگی کے پاس سے محلہ کے کتے لڑتے ہوئے گزرے، "جنگِ عظیم" اور شور وہ آوازیں کہ جمعہ خاں اور وفاتی کو اپنی باتیں بند کرنی پڑیں۔ یہ بھی غنیمت ہی کہ کتے ایک دوسرے سے لڑتے کم ہیں اور شور زیادہ کرتے ہیں۔ ورنہ وہ بھی اگر آدمیوں کی طرح بالکل "عملی" ہوجائیں تو دنیا میں روزانہ ہزاروں کتے "آنجہانی" ہوجایا کریں۔

سورماؤں اور رنبیں مارخاؤں کا یہ قافلہ گزر گیا تو وفاتی نے اپنی بات کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑ دیا:۔

"جمعہ بھیا! دل ملے کی بات ہی، عشق نہ جانے جات کجات! کل اخبار بیچنے والا لڑکا چلا رہا تھا کہ راولپنڈی میں ایک مالدار گھرانے کی لڑکی ایک موٹر ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہمارے گاؤں کے نائی کا لڑکا بمبئی میں ایک سیٹھ کے یہاں گھر کے کام کاج پر نوکر تھا۔

سیٹھانی سے اُس کی آنکھ لڑگئی، چند دن خوب اُس نے گلچھرے اُڑائے۔ سیٹھ جی کو کچھ شبہ ہوا تو سیٹھانی ہزاروں روپے کا زیور اور نوٹ کی گڈیاں لے کر اُس لڑکے کے ساتھ متھرا بندرابن چلی گئی۔ مگر بھیا! اُس نائی کے لونڈے نے بے وفائی کی۔ کمین ذات تھا۔ دو چار سال بھی نباہ نہ کر سکا۔ چند مہینے پیچھے سیٹھانی کا سارا مال اسباب لے کر چمپت ہو گیا۔ اس بیچاری کے پاس پہننے کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ آخر لاچار ہو کر ایک چکلے میں بیٹھ گئی......اور......!

وفاتی کی رام کہانی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی "سلام علیکم" کہتے ہوئے جھگی میں داخل ہو گیا۔

"اس جاڑے میں اتنی رات گئے کیسے آنا ہوا بشیر! خیر (خیر) تو ہے"۔ جمعہ خاں نے کہا۔

"ایک کام سے آیا ہوں اور وہ میرا اپنا نہیں اللہ میاں کا کام ہے"۔ بشیر نے جواب دیا۔

"اللہ میاں نے اپنے کام کے لئے تمہیں بھیجا ہے۔ تمہیں......" وفاتی نے کہا اور جمعہ خاں نے قہقہہ لگایا۔

"بھائیو! بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارے محلے میں کُل ایک مسجد ہے اور وہ بھی ویران رہتی ہے۔ چٹائیاں تک ثابت نہیں ہیں۔ بیچارہ کلو بڑھئی چراغ بتی کا انتظام نہ کرے تو مسجد میں اُجالا تک نہ ہو۔ اب کی برسات میں ایک دیوار بھی ڈھ گئی ہے۔ اس کے چندے کے لئے ہی نکلا ہوں۔ تمہاری جھگی کے سامنے جو علیم چپراسی رہتا ہے اُس کے چھ بچے ہیں۔ پھر بھی اُس نے دس روپے چندے میں دیئے ہیں۔ تم لوگ تو اکیلے رہتے ہو۔ بیوی بچوں کی کوئی جھنجھٹ نہیں ہے۔ تم سے بڑی امید لے کر آیا ہوں"۔ بشیر کی بات ختم ہوتے ہی جمعہ خاں بول پڑا:-

"بھیا! بیوی بچے تو ہمارے بیشک نہیں ہیں مگر کھرچ (خرچ) سب جھگی والوں سے ہمارا جاستی ہے! اور نیک کاموں میں جیسا کچھ بن پڑتا ہے چندہ بھی ہم دیتے ہی رہتے ہیں۔ ہجرت (حضرت)، تو نبے شاہ صاحب کا عرس اسی مہینے میں ہونے والا ہے۔ اس میں ہم دونوں نے بارہ بارہ روپے چندے کے دیئے ہیں۔ اب رہا محلہ کی مسجد کی مرمت سرمت کا سوال، تو بھیا! تمہیں معلوم ہے کہ ہم تو تمہاری مسجد میں مہینوں پاؤں تک نہیں دھرتے۔ مسجد کا حق اُن پر ہے جو اُس میں روزانہ جاتے ہیں۔ پھر بھی تم آئے ہو تو ہم تمہاری بات ٹالیں گے نہیں۔ پرسوں شام تک جو کچھ ہمیں دینا ہو گا، تمہارے گھر پہنچا دیں گے"۔

وفاتی اور جمعہ خاں کا حقہ ختم ہونے پر تھا۔ تمباکو جل چکا تھا مگر بشیر نے اُسی میں دو چار کش لگائے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے اُس نے مسجد کی ضرورتوں کا پھر ذکر کیا۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک دونوں دوستوں میں بات چیت ہوتی رہی۔ طے یہ پایا کہ کل شام کو دونوں دوست کالج کے دروازہ پر جا کر کھڑے ہوں گے۔ وفاتی اپنے دوست جمعہ خاں کو بتلائے گا کہ یہ ہے وہ فتنۂ روزگار اور آشوبِ جہاں جس کی محبت میں وہ گرفتار ہے اور جسے اپنا بنانے کے لئے اُس نے کئی روپے خرچ کر کے شاہ صاحب سے تعویذ حاصل کیا ہے!

صبح ہوئی، دن چڑھنے لگا، یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی، دوپہر کے بعد دونوں دوست نہائے دھوئے، دُھلے ہوئے کپڑے پہنے، وفاتی نے تو آج اس طرح مانگ پٹی کی کہ جیسے وہ "بردکھوے" کیلئے جا رہا ہے۔ باریک ململ کا کرتہ، خوب بڑے سے گھیر کی شلوار۔ ہری مخمل کی رام پوری ٹوپی۔ جوتہ پرانا تھا مگر وفاتی نے اُس پر پالش کر کے جو کپڑے سے مالش کی ہے تو اتنا چمکدار بنا دیا کہ اُسی صورت کا دُھندلا دُھندلا عکس پالش کی چمک میں دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں میں سُرمہ لگایا۔ سرسوں کے تیل میں اُنگلی کے پورے ڈبو کر ٹیڑھی مانگ کو اچھی طرح جمایا۔ چار بجے کے قریب یہ دونوں دوست اپنی جھگی سے شہر کی جانب چلے۔ ان میں ایک عاشق تھا اور دُوسرا اُس کا مشیر (homme de confiance)۔ بیچارے وفاتی کا نیا نیا عشق تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ غالب محبت میں دوسرے کو رازدار بنا کر پچھتا چکا ہے ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اور تجربہ کار عاشقوں کا یہ عالم رہا ہے:-

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی!

مگر وفاقی نہ جانے کیوں اس کوچے میں ایک رازدار، غمخوار اور ساتھی کی ضرورت محسوس کرتا تھا!

کالج کے دروازہ پر جاکر دونوں دوست کھڑے ہوگئے۔ وفاقی نے اپنے گلے میں خوب گہرے رنگ کا سرخ رومال باندھ رکھا تھا اور اس کے دونوں بازوؤں پر دو غبارے اُڑ رہے تھے۔ یہ ترکیب خود اس نے سوچی تھی کہ محبوبہ کیلئے کوئی نہ کوئی عجوبگی اور "attraction" تو ضرور چاہیئے۔

آج کالج میں کوئی تقریب تھی۔ مہمان آجا رہے تھے۔ اتنے میں ہرے رنگ کی ایک کار دروازہ پر آکر رکی اور وہ لڑکی دو عورتوں کے ساتھ اُتری۔ خوب کھلتی رنگت، کتابی چہرہ، درمیانہ قد، بس آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں۔ مگر رخسار کے تلوں نے چہرہ کو کافی جاذب نظر بنا دیا تھا۔ وفاقی نے جمعہ خاں کے چٹکی لی کہ ع

اسی کو دیکھ کر اے دوست! ہم دل ہار بیٹھے ہیں!

لڑکی تیزی کے ساتھ کالج کے دروازہ میں داخل ہوئی اور اندر جاتے جاتے اس نے اس شخص کو ذرا مڑ کر دیکھا جس کے بازوؤں پر گلابی رنگ کے غبارے اُڑ رہے تھے۔ لڑکی نے اپنی ساتھی عورتوں سے مخاطب ہوکر "nonsense" کہا اور آگے بڑھ گئی۔

وفاقی نے جمعہ خاں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا کہ دو چار بار ہی کی تاک جھانک میں اتنا اثر ہو چلا ہی اس لڑکی پر! پھر اس نے اپنے گلے کے تعویذ کو عقیدت کیساتھ چھوا اور دل ہی دل میں بولا "شاہ صاحب! آپ کی کرامت کا قایل ہوگیا۔ ارے آپ ہی جیسے اللہ والوں کی برکت سے دُنیا چل رہی ہے۔ اللہ میاں اپنے پیاروں کی بات کہیں ٹال سکتے ہیں!

کالج کے چپراسی کی زبانی معلوم ہوا کہ رات کے آٹھ بجے تک یہ جلسہ ختم ہوگا۔ وفاقی نے "میک اپ" کی ضرورت محسوس کی۔ یعنی یہ کہ چہرہ پھر دھویا جائے اور آٹھ بجے جب لڑکی کا دیدار ہو اور اس سے نگاہیں ملیں تو اس کی نظر ایک تازہ دُھلے ہوئے چہرے پر پڑے! اس کام کے لئے انہوں نے مسجد کو منتخب کیا۔ اطمینان کیساتھ منہ وہیں دھویا جا سکتا تھا۔ دونوں پہنچے، لوگ وضو کر رہے تھے، یہ منہ دھو رہے تھے۔ مگر شرماحضوری انہوں نے بھی تقریب قریب وضو کی طرح چہرے اور منہ کو دھویا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ عین نماز کے وقت مسجد سے ایک مسلمان کا ہاتھ منہ دھو کر نکل جانا کوئی کم معیوب بات نہ تھی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھ کر ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ نماز کے بعد اعلان ہوا کہ سب لوگ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائیں، تقریر ہوگی۔ وفاقی اور جمعہ خاں کو آٹھ بجے تک وقت کہیں نہ کہیں گزارنا ہی تھا۔ وہ مسجد میں بیٹھے رہے، تقریر سنی، ان کیلئے بالکل نئی قسم کی تقریر! اور وہ یہی تاثر لے کر مسجد سے نکلے کہ ایسی باتیں انہوں نے آج تک کسی مولوی اور شاہ صاحب کی زبان سے نہیں سنیں!

پھر وہ دونوں کالج کے دروازہ پر کھڑے ہوگئے۔ دوسروں کے ساتھ وہ لڑکی بھی جلسہ ختم ہونے پر کالج سے نکلی۔ اور موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔ "اتنے بہت سے لوگوں میں وہ بیچاری مجھے دیکھتی تو اس کی بدنامی کیا نہ ہوجاتی"۔ وفاقی نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی۔ اور وفاقی ہی پر کیا موقوف ہے یہ جھوٹی تسلیاں لوگوں کے کیسے کیسے غم غلط کرتی اور نا امیدی کے اندھیرے میں اُمید کے دیئے جلاتی رہتی ہیں!

تیسرے دن دونوں دوست پھر آئے شام کے قریب! لڑکی کو انہوں نے کالج کے دروازہ سے نکلتے دیکھا۔ آج وہ موٹر میں نہیں وکٹوریہ میں سوار ہوئی، وفاقی کو بوڑھے کوچبان کی قسمت پر رشک آرہا تھا کہ اس کی جگہ کاش! میں ہوتا! ـــــ دن چھپنے والا تھا۔ جمعہ خاں نے کہا "وفاقی آؤ مولوی صاحب کا واج (وعظ) آج پھر سننے چلیں!" "مگر نماج (نماز) بھی پڑھنی پڑے گی"۔ وفاقی بولا۔ "نماج (نماز) پڑھنے میں ہماری گرہ سے جاتا کیا ہے۔ ہاتھ منہ دھل کر اور صاف ہوجاتے ہیں۔ چلو مسجد چلیں"۔ جمعہ خاں کے کہنے پر دونوں دوست مسجد پہنچے، وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ اور تقریر سنی!

سیدھی سادی تقریر، دلنشین انداز، پھر سب سے بڑھ کر مقرر کا خلوص، دونوں دوست اپنی جھگی کو واپس ہوئے تو خاصے متاثر تھے، اب یہ معمول ہوگیا کہ کالج کے دروازہ پر لڑکی کا نظارہ کرتے اور پھر مسجد میں جاکر نماز پڑھتے اور تقریر سنتے ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

بدی اور نیکی کی دوڑ ہو رہی تھی! دھندلکے کے بعد اُجالا، رات کے بعد سویرا، خزاں اور اس کے فوراً بعد بہار کی نمود!

وفاتی اور جمعہ خاں رات کو اپنی جھگی میں پیلی مسجد کے اس مقرر کی تقریر پر بہت دیر تک تبصرہ کرتے، وہ آپس میں کہتے کہ ہمارے محلہ میں جو میلاد (میلاد شریف) ہوا کرتے ہیں اُس میں جو مولوی صاحب واج (وعظ) کہتے ہیں اُس میں کچھ اور ہی باتیں بیان کی جاتی ہیں، دوسروں پر لعن طعن، ملا حیے لطیفے، یہ تک کہ جس آدمی کا ایسا عقیدہ ہو اُس کی بیوی پر طلاق پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ مولوی صاحب ایسی کوئی بات نہیں کہتے، سیدھی سادی باتیں بناوٹ نام کو بھی نہیں!"

اُن کی جھگی سے تھوڑی دور پر ایک نوجوان رہتا تھا۔ اُس کے یہاں دودھ کا کاروبار ہوتا تھا، دو بھینسیں تھیں، یہ نوجوان پہلوانی کرتا تھا کیا صحت تھی، کتنا گٹھا ہوا بدن تھا، چوڑا چکلا دیدہ رو نوجوان! اس محلہ کے تو قریب قریب سارے پہلوانوں کو پچھاڑ چکا تھا۔ ملیر سٹی میں کشتی کا جو دنگل ہوا تو اُس میں بھی وہ اپنے مقابل پہلوان پر دھوبی پاٹ چلا چکا تھا مگر اتفاق سے اس کا پیر پھسل گیا اور وہ اس طرح اکھاڑے میں گرا کہ دوسرے پہلوان کے ذرا سے جھٹکے نے اسے چت کر دیا۔ بس یہ ایک ہی بری ہوئی کشتی ایسی تھی جس میں اس کی ہار ہوئی۔ ورنہ وہ ہر دنگل میں کامیاب رہا۔ اس نوجوان پہلوان کو بخار آیا اور تین دن کے اندر اندر چل بسا۔ پورے محلہ کو اُس کے مرنے کا غم ہوا۔ وفاتی اور جمعہ خاں کو غم کیساتھ پیلی مسجد کے مقرر کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

"دوستو! اس دنیا میں کوئی سدا نہیں رہ سکتا، اُس دنیا کیلئے کچھ کرو جہاں سدا رہنا ہو جس دل میں اللہ کا ڈر نہیں وہ دل کسی کام کا نہیں!"

محلہ کے اس نوجوان کی موت کے دن دونوں دوستوں نے مسجد میں جاکر نماز پڑھی، سجدوں میں خلوص اور دعاؤں میں درد تھا۔ مسجد سے چلے تو جمعہ خاں نے مسکرا کر کہا۔ "وفاتی! اُس لڑکی کو اپنا بنانے کی دعا تو آج تو نے ضرور مانگی ہوگی۔" اس پر وفاتی ذرا سخت لہجہ میں بولا "تو یہ اللہ میاں سے کہیں بری باتوں کے لئے دعائیں مانگی جاتی ہیں؟"

جمعہ خاں بہت کم اور وفاتی بہت زیادہ۔ دونوں آہستہ آہستہ بدل رہے تھے۔ اس طرح جیسے کوئی کسی کپڑے کو دھو کر پھیلائے اور آس پاس کی گرد پھر اُسے میلا کر دے۔ اور پھر اُسے دھویا جائے! جس ماحول میں وہ رہتے تھے وہ کچھ اور تھا! ایک بار تیز آندھی آئی اور ان کے محلہ کی جھگیوں میں آگ لگ گئی، بہت سی جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ وفاتی اور جمعہ خاں نے دیکھا کہ کچھ دیر بعد لوگوں کی امداد کیلئے ایک جماعت آئی جن میں پیلی مسجد والا وہ مقرر بھی تھا۔ انہوں نے ملبہ سے لوگوں کے سامان کو نکالا، کھانا تقسیم کیا۔ لوگوں کو تسلی دی۔ وفاتی نے دیکھا کہ ایک عورت اپنا حال بیان کر رہی ہے اور اُس مقرر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں! پھر اُس نے یہ بھی دیکھا کہ محلہ کی جوان عورتیں ان لوگوں کے سامنے سے گزرتی ہیں اور بات چیت کرتی ہیں تو وہ اپنی نگاہوں کو جھکائے رکھتے ہیں۔ ایک ہفتہ تک یہ کیمپ وہاں رہا۔ وفاتی ان لوگوں سے ملتا جلتا اور زیادہ وقت اُنہی کیساتھ گزارتا۔ ایک مہینہ بعد محلہ میں عرس کیلئے چندہ جمع ہونے لگا تو وفاتی نے اس میں چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ محلہ کے لوگ کہنے لگے کہ وفاتی وہابی ہو گیا ہے!

وفاتی اب بھکاری نہیں رہا تھا، وہ پھیری کے ذریعہ ریلوے اسٹیشن پر لگے ہوئے پان بیچتا، ایک دن شام کے وقت جب وفاتی پان لگا رہا تھا جمعہ خاں اس کے پاس دوڑا ہوا آیا اور آتے ہی وفاتی کا بازو ہلا کر بولا "وفاتی! وہ لڑکی اس گاڑی سے کہیں جا رہی ہے۔ میں اُس کا سامان ڈبہ میں ابھی رکھ کر آیا ہوں۔ گاڑی چھوٹنے میں آدھ گھنٹہ کی دیری ہے، چل آج خوب جی بھر کر اُسے دیکھ لے۔"

وفاتی نے اس پر جواب دیا۔ "جمعہ خاں! جس دلدل سے میں نکل چکا ہوں، اُس میں مجھے پھنسانے کے لئے نہ اکساؤ۔"

جمعہ خاں خفیف سا ہو گیا۔ اُس نے کان سے آدھ جلی بیڑی نکال کر انگلی سے مسلی جیسے وہ اپنی جھینپ مٹانا چاہتا ہو۔ پھر وہ چلتے ہوئے بولا۔ "محلہ کے لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ وفاتی وہابی ہو گیا ہے"!

ہماری نظر میں

ماہنامہ "تاج"

ماہنامہ "تاج" - مدیر اعلیٰ - بابا ذہین شاہ تاجی - ادارۂ تحریر - ڈاکٹر محمد محمود احمد - سید ظہور الحسنین (ایڈووکیٹ) سید رفیق عزیزی اور پروفیسر عبید اللہ قدسی - ضخامت - ۵۰ صفحات - چندہ سالانہ آٹھ روپے - فی پرچہ آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- تاج منزل - مسان روڈ - بہار کالونی - کراچی -

یہ جریدہ حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے - اس کا دوسرا شمارہ (ماہ اپریل) ہمارے سامنے ہے - سرورق کی لوح پر "اردو زبان میں تصوف اسلام کا پہلا ترجمان" مرقوم ہے - پورا رسالہ اسی فکر و خیال کا آئینہ دار ہے - حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آجکل کی متمدن دنیا کے سامنے ایک پاکباز، خدا ترس، عادل فرمانروا کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور آپ کی سادگی، زہد و تقویٰ انتظامی صلاحیت اور حکمت و بصیرت کی مثالیں سامنے لائی جاتی ہیں اور دنیا کو چیلنج دیا جاتا ہے کہ وہ اگلے، پچھلے اور موجود حاکموں اور قائدین سے عمر فاروق کا مقابلہ کر کے دیکھ لیں - مگر اس رسالہ میں حضرت فاروقؓ کے مکاشفات و کرامات کو پیش کیا گیا ہے، معجزات و کرامات کے ہم خدانخواستہ منکر نہیں ہیں مگر زمانہ کے تقاضوں کا لحاظ بھی ضروری ہے !

ایک مضمون کا عنوان "کلمۃ الحق" ہے - جو مولانا شاہ صوفی سید عبد الرحمٰن لکھنوی کی کتاب کلمۃ الحق کا اردو ترجمہ ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :-

"سوائے ایک فرقہ صوفیا رصافیہ کے اس امت کے تمام افراد نے گمان کیا کہ کلمہ طیبہ کے، اس کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں ہیں کہ خدائے پاک ایک ہے اور پوجنے کے لائق ہے - حالانکہ کلمہ طیبہ کے یہ معنی (اور یہ مراد نہیں) کیونکہ مشرکین عرب بھی خدا کی یکتائی کا یقین رکھتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ خدائے تعالیٰ پرستش کے لائق ہے - (اور بتوں کا وجود اور تمام عالم کا وجود خدا کے وجود کا غیر ہے) ان میں سے کسی نے بھی کسی بت کے لئے یہ نہ کہا کہ یہ بت اللہ رب العالمین ہے - (یہ دعویٰ از روئے قرآن ثابت ہے) جیسا کہ قرآن میں مشرکین سے حکایتاً آیا ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت نہیں کرتے - مگر اس کے لئے کہ یہ ہم کو قرب کے مرتبہ میں اللہ سے نزدیک کر دیں اور یہ اصنام اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں - اگر کلمہ طیبہ سے وہی معنی مراد ہوں تو مسلمانوں اور مشرکوں میں کوئی فرق نہ ہو[1] .... حاصل یہ ہے کہ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ خدا کا وجود کائنات کے وجود سے الگ ہے اور اصنام وغیرہ ممکنات کا وجود، خدا کے وجود سے الگ ہے - جیسا کہ سوائے صوفیا رموحدین کے تمام مسلمان یہی اعتقاد رکھتے ہیں - مشرکین کے

---

[1] طوالت کے سبب عبارت کے بعض حصے ہم نے حذف کر دیے ہیں - مگر مصنف کا مقصد اس سے مجروح نہیں ہوا -

اس عقیدے کی رد میں لا الٰہ الا اللہ نازل ہوا۔ یعنی نہیں ہے کوئی موجود غیر اللہ، اور ہر وہ چیز جس کو تم
اپنے وہم سے غیر اللہ سمجھتے ہو۔ غیر خدا نہیں ہے۔ عین خدا ہے۔
افسوس اور کمال افسوس ہے کہ علمائے کبار نے شرق سے لے کر غرب تک، سلف سے لے کر خلف تک، کیا محدث،
کیا مفسر، کیا مجتہد، کیا مقلد، کیا متکلمین، کیا متفقہین سب نے کلمہ طیبہ کی اس کے مقام سے تحریف
کر ڈالی۔ اور اس کو محکم سے متشابہ کی طرف لوٹا دیا۔۔۔۔۔۔ پس انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہہ کر
شرک سے بچایا اور لا الٰہ الا غیر اللہ کا اعتقاد رکھ کر دل سے شرک کیا اور نہ جانا کہ یہ غیریت اور
تفرقہ کہ جس کے وہ معتقد ہیں "لا الٰہ الا اللہ" کے مخالف ہے۔۔۔۔۔۔ (صفحہ ۵ و ۶)
ہم نے دل پر جبر کر کے یہ سطریں نقل کی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف کوئی مجذوب بھی نہیں کہ شطحیات کہہ کر اُن کے ان خیالات کو
نظر انداز کر دیا جائے، ان کے نام کے ساتھ تو فاضل مترجم نے "عالمِ ربّانی اور قطبِ عالم" کے القاب کا اضافہ فرمایا ہے۔
"لا الٰہ الا اللہ" کی جو تفسیر اُوپر پیش کی گئی ہے اس کی رُو سے تو صوفیاء کی ایک بہت ہی محدود جماعت کو چھوڑ کر سلف سے لیکر
خلف تک تمام عوام مسلمان ہی نہیں بلکہ لاکھوں محدثین، مفسرین، اور فقہاء (خاک بدہن گستاخ) کلمہ طیبہ کے محرف اور
مرتکبِ شرک قرار پائیں گے، لوگوں نے "عینیت" اور "غیریت" کا نظریہ یونانی فلسفہ، عجمی افکار اور ویدانت سے متاثر ہو کر
تراشا ہے اور اس کا جوڑ اسلام سے ملا کر "لا الٰہ الا اللہ" کا وہ مفہوم بیان کیا ہے، جس کی تردید خود قرآن کرتا ہے۔ یہ اندازِ فکر
ہی غیر اسلامی ہے۔ اس بنیاد پر جو عمارت بنے گی وہ چاہے ثریا تک کیوں نہ پہنچ جائے "کج" ہی ہو گی، ہم اس قسم کی خرافات
سے لاکھ بار اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

شیخ اکبر محی الدین عربیؒ کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" کے ترجمہ کا یہ رنگ ہے:۔

"وہ خدائے پاک ذات ہی ہے جو مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے اور جو
فرائض و واجبات حقوق الٰہیہ کی صورت میں مخلوق پر متعین فرماتے ہیں وہ اپنے آپ ہی پر متعین
فرماتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔" (صفحہ ۱۷)

ان جملوں کی "خطرناکی" کی کوئی انتہا ہے! اگر یہ "حقائق و اسرار" ہیں اور کشف و وجدان کی نزاکتیں ہیں تو کیا ان کا اس طرح
افشاء مناسب ہے؟

بابا تاج الدین ناگپوری کو "شہنشاہ ہفت اقلیم" لکھا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے سوا
کسی انسان کو بھی "بادشاہوں کا بادشاہ" کہنے کی ممانعت فرمائی ہے!

"ایک روز کسی درخت کے نیچے بابا آرام فرما رہے تھے۔ زائرین کا ہجوم چاروں طرف تھا۔ کچھ خدام پاؤں دبا رہے
تھے۔ ہم نے موقع پا کر پائے مبارک کو ہاتھ لگایا کہ آپ پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ جبہ مبارک اتار دیا۔ اور
ہماری طرف پھینک کر فرمایا "لے تیری شریعت تجھے ہی مبارک۔۔۔ ۔۔۔" (صفحہ ۳۵)

یہ بیچاری شریعت پر طنز کیوں؟ اور "شریعت" تو ہر مسلمان کے لئے "مبارک" ہے اور ہر حال میں مبارک ہو! جو کوئی "شریعت"
کی پابندیوں سے اپنے کو آزاد سمجھتا ہے یا کسی جسمانی اور دماغی مرض کے سبب اُس کی حالت غیر مکلف کی سی ہو جاتی ہے تو وہ شخص
"لا یعقل" ہے! عاقل و بالغ مسلمان پر تو مرتے دم تک شریعت کے قوانین نافذ رہتے ہیں!

"ایک روز فرمایا کہ بتاؤ بابا کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ ہم کو حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ میں نے عرض کیا پیش خیر کیا مجھے حاجت خبر کی ہے۔ فرمایا کوئی ولی قوسِ ولایت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جب تک جناب سیدہؓ اس کی تربیت نہ فرمائیں۔ اور جب جناب سیدہ کی توجہ شامل حال ہوتی ہے تو طالب مرتبۂ ولایت پر فائز ہوتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اس میں عصمت آجاتی ہے۔ یہ قاعدہ ولایت کا ہے۔ اب سنئے بابا کو جناب سیدہ نے جو پیغمبر[1] بنا کر بھیجا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قوسِ ولایت میں بابا کی تربیت جناب سیدہ نے فرمائی تو آپ مرتبۂ ولایت پر فائز ہوئے، پھر اس مرتبۂ ولایت سے آپ کو جناب سیدہؓ نے اتنی ترقی اور عطا فرمائی کہ اپنا پیغمبر بنا کر عالمِ خلق میں مامور فرمایا.........ؒ (صفحہ ۳۶)

اس عبارت کا پڑھنا ہی ایک مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ اس پر مزید اذیت یہ کہ اس کو کاغذ پر نقل بھی کرنا پڑا۔ یہ کیا واردات ہیں؟ یہ کیا اندازِ فکر ہے؟ یہ کس قسم کے ظروف و احوال ہیں؟ وہ دن کتنا پشیمانی کا دن ہوگا جب حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس قسم کے اعتقادات سے اپنی برأت ظاہر فرمائیں گی کہ بارِ الہا! پیغمبروں کا بھیجنا اور مامور کرنا تو صرف تیرا کام تھا۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو نے پیغمبری اور نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ یہ میری تعریف میں مبالغہ کیا گیا کہ میں نے دنیا میں کسی کو اپنی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا تھا اور انسانوں کو ترقی بخشنا اور ان کی غیبی تربیت فرمانا بھی صرف تیری ہی ربوبیت کی شان ہے!

اگر رسالہ "تاج" کا یہی رنگ رہا تو پھر اس کے مضامین سے "تصوف" (؟) کو فائدہ پہنچ جائے تو پہنچ جائے۔ مگر غریب "اسلام" کو تو ایک نئی کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہم اس قسم کے افکار و عقائد سے، احوال و واردات سے اور اسرار و غوامض (؟) سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں! توبہ!

آدابِ والدین

"آدابِ والدین" از مولوی محمدؐ ظفر ایم اے، ایل ایل بی۔ ضخامت ۱۲ صفحات (جیبی سائز)۔
ملنے کا پتہ:۔ محمدؐ ظفر صاحب وکیل، مہتمم سلسلہ رفیق الاسلام۔ سرگودھا۔

جناب مولوی محمد ظفر صاحب اب تک متعدد کتابچے اسی نہج پر لکھ چکے ہیں۔ جن میں دین و اخلاق کے مسائل عام فہم افسانوی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اُن کی بچیسویں[2] کتاب ہے۔ جس میں کتاب و سنت اور بزرگانِ دین کے اقوال کی روشنی میں "آدابِ والدین" کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ کتاب مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے۔ یہ کتابچہ ڈاک کے ٹکٹ بھیجکر مصنف سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کے چند نمونے

"قرنِ اولیٰ میں اسلامی حکومت کے چند نمونے" از۔ مولانا نور محمد اعظمی۔ مترجم:۔ مولانا عبدالحق مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ۔ ضخامت ۴۶ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ اے شریف بی اے (علیگ) جہتا بلڈنگ، وُڈ اسٹریٹ، کراچی۔

یہ چھوٹی سی کتاب "بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کی مصداق ہے۔ اس میں مستند تاریخی واقعات کے ذریعہ بتایا گیا ہے

---

[1] قادیانیوں کو مژدہ کہ اُن کو اپنے مسلک کی تائید کے لئے "تازہ مسالہ" مل گیا! [2] صفحہ ۱۴، پر "آگ کے انگارے" کھٹکا "دنگا سے" کیسا تھ "آگ" نا پید ہے۔

کہ خلفائے راشدین نے کس عدل، خدا ترسی، ذمہ داری، رعایا پروری، بے نفسی اور احتیاط و تقوی کے ساتھ حکومت کی! کتاب کے ہر صفحہ پر حکمت و اخلاق کے جواہر بکھرے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے فرمانروا اور ارباب کار کاش! اس آئینہ میں اپنے چہروں کو دیکھ سکتے!

تاریخ ملت

"تاریخ ملت جلد دہم سلاطین ہند" (جلد اوّل) تالیف:۔ انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات، کاغذ، کتابت، طباعت، دیدہ زیب، مجلد گردپوش کیساتھ قیمت تین روپے بارہ آنہ۔ غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

جناب منشی انتظام اللہ صاحب شہابی اُردو زبان کے کثیر التصنیف تاریخ نگار ہیں۔ اُن کی دسیوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں موصوف کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کتاب میں "سندھ کی پہلی مہم، سلاطین لنگا اور سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لے کر سلطان سکندر لودھی کے زمانہ تک کے حالات دواقعات جامعیت و اختصار کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں"۔ فاضل مورخ نے ہزاروں صفحوں کا خلاصہ چند سَو صفحوں میں پیش کردیا ہے۔ بعض مقامات پر تاریخ نگاری کا رنگ آگیا ہے!

کتابت کی غلطیاں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ (صفحہ ۹۲) عسجدی کو عجدی اور دامغانی کو وامغانی (صفحہ ۲۳۳) (قطب الدین) اوشی" کی جگہ "روشنی" (صفحہ ۲۴۳) "محاسن و معائب" کی جگہ "محاسن و مصائب" اور (صفحہ ۲۵۳) "ساز و براق" کو "ساز وبراق" لکھا ہے!

"سنہ ۱۱۹۴ء میں علی گڑھ قبضہ میں آیا" (صفحہ ۱۰۲) اُس وقت اس بستی کا نام کول تھا۔ اس لئے کول لکھ کر قوسین میں "علی گڑھ" لکھنا چاہیئے تھا۔

سُلطان علاءالدین خلجی کی داد و دہش کا یہ واقعہ خاصہ نادر و عجیب ہے:۔

"ہر منزل پر پانچ من وزن ستارے (سونے کے بنے ہوئے) ایک سبک سی منجنیق میں رکھ کر اُڑائے جاتے تھے اور ہزاروں آدمی اُن کے لُوٹنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے"۔

یہ جو اشیاء کی قیمتوں کے کنٹرول (controls) کا چند سال سے چلن سا ہو گیا ہے، اس کی بناء شاید علاؤالدین خلجی نے ڈالی تھی۔ کہ گائے، بھینس، بکری اور بازار کی تمام چیزوں یہاں تک کہ سبزی، نیشکر، شوربہ، بریانی اور ترکاریوں تک کی قیمت اس کے عہدِ حکومت میں مقرر تھی۔ اور چیزوں کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے سکہ کی قیمت اور وزن کے لحاظ سے ۱۲ بارہ آنہ میں ایک من گیہوں اور دس پیسوں میں تیس سیر نمک ملتا تھا۔ ایک وہ دَورِ ملوکیت اور ایک یہ عہدِ جمہوری ــــ ! ! اور ..... "دہلی سے دولت آباد (دیوگڑھ) تک چالیس دن کا سفر تھا۔ ان دونوں شہروں کے درمیان جو سڑک تھی اُس کے دونوں جانب بید وغیرہ کے درخت لگے تھے۔ ایک مسافر ایسا محسوس کرتا تھا گویا وہ کسی باغ کی روش پر ٹہل رہا ہے۔ راستہ میں تمام ضروریات کی چیزیں اس قدر فراوانی سے دستیاب ہوتی تھیں گویا بازار لگا ہوا ہے"۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ خضر خاں اور دیول دیوی کے عشق کا واقعہ اور سلطان علاؤالدین کے چتوڑ گڑھ کی رانی پدمنی پر عاشق ہونے کی کہانی، استناد کے اعتبار سے بس ایک افسانہ سے زیادہ نہیں ہے!

بھارت کی دولت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۳۱۱ء میں ملک کافور نے میسور کو فتح کیا ہے تو ۶۱۲ ہاتھی۔ بیس ہزار گھوڑے، جواہرات کے متعدد صندوق اور ۲۴۰ ٹن سونا ہاتھ لگا۔

"غیاث الدین تغلق نے خراج کے اصول از سرِ نو منضبط کئے اور پیداوار کے دسویں یا گیارھویں حصہ سے زائد محصول لینے کی

سخت ممانعت کردی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ہر سال رقبۂ زراعت بڑھتا جائے اور مقدم وچودھری کاشتکاروں پر جبر نہ کرسکیں (۲۳۹)

اور ——" مطالبات کے وصول کرنے میں بھی وہ بہت نرمی سے کام لیتا، لاکھوں کے مطالبہ میں اگر ہزاروں بھی وصول ہو جاتے تو غنیمت سمجھتا اور حدِ درجہ نرمی و آشتی سے کام لے کر معاملات طے کرتا۔ میانہ روی اس کی خصوصیت تھی اور عدل و انصاف اس کی حکومت کا نصب العین۔" (صفحہ ۲۴۰)

"غیاث الدین صوم وصلوٰۃ کا بھی پابند تھا۔ وہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتا اور تراویح کے ساتھ روزہ رکھتا۔ اکثر با وضو رہتا۔ شراب نہ خود پیتا نہ کسی کو پینے دیتا" (صفحہ ۲۴۱)

"سلطان سکندر لودی اپنے باپ کی طرح حددرجہ سادگی پسند تھا۔ اور کبھی شاہانہ تکلفات میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔ وہ خدا سے ڈرتا تھا۔ ہندو، مسلمان، قوی وضعیف سب کو برابر سمجھتا۔ اور چاہتا تھا کہ سرِ مو انصاف سے احتراز نہ ہو۔ وہ نماز ظہر ادا کر کے مجلسِ علماء میں جاتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس کی عدالت و بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ متدین شخص اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خائن شخص ہر وقت لرزاں رہتا۔ (صفحہ ۳۲۱)

"مذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلافِ شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اس نے حکم نافذ کردیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعودؒ کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے۔" (صفحہ ۳۲۷)

آج کل کے جمہوری حاکموں کی "سمیع ہمایونی" تک ان نیک نفس بادشاہوں ہی کے حالات کاش! پہنچ سکتے!

تاریخ عبرت کا ایک آئینہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ کوئی اس سے عبرت حاصل کرنا چاہے۔ ورنہ آج کل تو یہ حال ہے کہ لوگ تاریخ میں "ڈاکٹریٹ" کرتے ہیں مگر عبرت کا ایک دھندلا سا نقش بھی اُن کے آئینہ فکر و خیال پر مرتسم نہیں ہوتا!

انوارِ حدیث

"انوارِ حدیث" از:- مولانا سید محمد ہاشم فاضل شمسی۔ ضخامت ۲۱۳ صفحات (مجلد، سرورق نہایت جیدہ زیب اور گنبدِ خضراء کی تصویر سے مزین)

یہ کتاب "حدیث" کی حمایت میں لکھی گئی ہے اور درایت و روایت سے ثابت کیا گیا ہے کہ سنتِ رسولؐ نہ صرف یہ کہ دین میں حجت ہے بلکہ "سنت سے انکار قرآن مجید سے انکار ہے"۔ کتاب کے چند اہم عنوانات:-

کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اسباب —— عہدِ صحابہؓ اور روایتِ حدیث —— حکومت اور تدوینِ حدیث —— رسولؐ کا مقام قرآن میں —— کتاب و سنت کا باہم ربط —— فہم قرآن کے چند اصول۔

"خاکی نژادوں کا دست رس روز بروز اس تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے" (صفحہ ۵) "دست رس کا بڑھنا" پہلی بار نگاہ سے گزرا —— "اُن کی پاکیزگی و قدوسیت، عظمت و رفعت کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے" (صفحہ ۷۹) "قدوسیت" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ کسی انسان اور شے کو ہم "مقدس" تو کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہی ہیں مگر "قدوس" نہیں کہہ سکتے —— "خیال فرمائیے کہ عہدِ رسالت کی چوتھی صدی ہجری تک ....." (صفحہ ۱۶۲) "عہدِ رسالت کی چوتھی صدی ہجری" ایک معمہ سے کم نہیں۔

کتاب بڑی محنت اور خلوص کیساتھ مرتب کی گئی ہے۔ تاریخی حوالوں کے علاوہ عقلی دلائل بھی خاصے وزنی ہیں۔ کاش! اندازِ بیان میں تکلف اور آورد نہ ہوتی۔

بابر کی کہانی

"بابر کی کہانی" از:- محمد رحیم دہلوی۔ ضخامت ۷۶ صفحات۔ سرورق رنگین و مصوّر۔ قیمت چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ رضیہ۔ جناح ہاؤس۔ لارنس روڈ۔ کراچی۔

بابر کی کہانی کچھ خود اُس کی زبانی اور کچھ مصنف کے قلم سے! چند صفحے مگر خاصے دل چسپ! زبان بچوں کی سمجھ کے لحاظ سے آسان استعمال کی گئی ہے۔ جناب محمد رحیم دہلوی نے ہمایوں اور جہانگیر کی کہانیاں بھی اسی انداز پر لکھی ہیں۔

رہنمائے حجاج

"رہنمائے حجاج" مولفین:۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور الحاج عبدالرحمان کیلانی۔ ضخامت ۱۹۱ صفحات
قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۃ السلام، کشمیری بازار، لاہور۔

یہ کتاب تفصیلات اور معلومات کے اعتبار سے یقیناً "رہنمائے حجاج" ہے۔ حج کے مسائل، دعائیں، مشہور مقامات کی تفصیل کے علاوہ مکہ مکرمہ، مسجد الحرام، میقات اور مدینہ منورہ کے نقشے بھی کتاب کی زینت ہیں۔ اس کی بھی تفصیل کتاب میں ملتی ہے کہ حضورؐ نے حج کس طرح کیا تھا؟

فاضل مؤلفین نے مسلمانوں کی اس کمزوری کی بجا طور پر نشاندہی کی ہے:۔

"بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بڑھاپے کی عمر ہی ــــ جس کو قرآن کریم نے ارذل العمر سے تعبیر فرمایا ہے۔ حج کا صحیح وقت تصور کر لیا گیا ہے۔ جب انسان کاروبار کی مصروفیتوں اور اولاد کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا تو حج کا موسم آجاتا ہے۔"

مدرسہ تفہیم القرآن

"تاریخ آٹھ سالہ، نصاب آٹھ سالہ، حساب مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ"۔ ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت چھ آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مدرسہ تفہیم القرآن۔ جھنگ۔

جناب مولانا عظمت اللہ صاحب تفہیمی نے اپنی زندگی تعلیم قرآن کے لئے وقف کر دی ہے اسی نیک مقصد کے لئے انہوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مدرسہ تفہیم القرآن کی بنا ڈال دی۔ جو شروع میں صرف چھ چھوٹے بچوں سے شروع کیا گیا۔ اور اب ۱۹۵۶ء میں اس نے ایک ایسی مستقل درسگاہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کی "اصلہا ثابتٌ" اور "فرعہا فی السماء" کی بشارت اس کا مستقبل ابھی سے دے رہا ہے۔

اس کتابچہ میں مدرسہ تفہیم القرآن کے حالات، نصاب اور حساب کی تفصیل درج ہے۔ کتابچہ کی تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں یہ ایک مثالی مدرسہ ہے جس کے نصاب میں دورِ حاضر کے تقاضوں کی بھی رعایت رکھی گئی ہے۔

خلشِ خار

"خلشِ خار" از:۔ راسخ عرفانی۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ مجلد۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ نور۔ گوجرانوالہ۔

یہ جناب راسخ عرفانی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کا ابتدائیہ خود شاعر نے۔ پیش لفظ[2] الطاف مشہدی نے اور "تعارف" ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے۔ راسخ صاحب ایک حساس انسان ہیں۔ جن کا دل غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں سے معمور ہے۔

آہ اس دار المحن میں موت بھی ارزاں نہیں — کیوں جئیں ورنہ ہمیں جینے کا بھی ارماں نہیں (صفحہ ۲۲)

"ورنہ" نے سارے شعر کی ساخت اور معنویت کو غارت کر دیا۔

کیا ہے انسان یہ محصوریٔ اضدادِ جہاں (صفحہ ۳۲)

۱؎ "ادی ابھی تو نہیں مری ہوئی ہے" (صفحہ ۱۱) یہ جملہ وجدان کو کھٹکا۔ "ادی ابھی تو نہیں مر رہی ہے" مناسب تھا! (م۔ق)

۲؎ اس پیش لفظ میں "لچکیلے نقوش" (صفحہ ۱۳) پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

شاعری کے ساتھ کتنا دردناک مذاق ہے ـــــ یہ !

اُن کی ہر بات میں اک طنز کا انداز بھی تھا — اور تہ گوشۂ دل رشکِ جنوں ساز بھی تھا ! (صفحہ ۳۸)

مصرعہ ثانی اچھا خاصہ گورکھ دھندا ہے !

اور وہ بچہ ایک بیکس کی اساسِ زندگی — یاس کی ظلمت میں مدھم سی کرن اُمید کی (صفحہ ۳۹)

مصرعہ اولیٰ کا وزن ہی درست نہیں !

لرزاں تھا جس کے خوفِ تدبّر سے کفرِ ہند — رخصت وہ ہم سے بندۂ باطل شکن ہے آج (صفحہ ۴۵)

"خوفِ تدبّر" کتنی مضحکہ انگیز ترکیب ہے !

پھر اُٹھ رہی ہیں کفر و تشدد کی یورشیں — ساکن مگر وہ بازوئے شمشیر زن ہے آج (صفحہ ۴۵)

شاعر نے شاید "یورش" کو "شورش" کا ہم معنی سمجھا ہے۔ جو اس کے لئے "اُٹھ رہی ہیں" استعمال کیا ہے! پھر قائد ملت لیاقت علی خاں مرحوم اُونچے درجے کے مدبّر اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تو تھے مگر "شمشیر زن" نہ تھے۔

وہ جس نے مردہ قوم کو بخشی تھی زندگی — آغوشِ گور میں وہی راحت فگن ہے آج (صفحہ ۴۶)

اس "راحت فگن" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے ؟؟ "آسودۂ راحت" کہنا چاہیئے تھا اور قافیہ پیمائی کے لئے باندھ دیا "راحت فگن"۔

وداع اے ارتعاشِ ہوش رخصت — نگاہوں سے پلائی جا رہی ہے (صفحہ ۵۶)

"وداع" کے بعد پھر "رخصت" کی کوئی نہ کوئی تاویل بھی کرلی جائے مگر "ارتعاشِ ہوش" کو کیا کیجئے !!

ـــــہ کہ زندہ قوم کے شاعر کا دل غیوّر ہوتا ہے (صفحہ ۵۷)

"غیوّر" کو یائے مشدد کے ساتھ نظم کرنا کس قدر بے ذوقی اور کم علمی کی دلیل ہے۔

تجھے سسرال جانا ہے یہاں کی رونقیں لیکر — تجھے ہم الوداع کہتے ہیں سارے یہ دُعا دے کر

"الوداع" کے "ع" کی موت پر وجدان روئے یا "سارے" پر قہقہہ لگائے۔

"خلشِ خار" میں وجدان کے لئے ایک ایک صفحہ پر خلش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس مناسبت سے کتاب کا نام موزوں ہی !

سراپائے رسولؐ

"سراپائے رسولؐ" مؤلفہ:- اعجاز الحق قدوسی۔ ضخامت ۳۴۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ دس آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ فلاحِ انسانیت۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱

مولانا اعجاز الحق قدوسی کی بیسیوں کتابیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب (سراپائے رسولؐ) بھی اُنہی کی تالیف ہے اور اس کا یہ ساتواں ایڈیشن منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے۔ مضامین کی فہرست سے کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حلیہ مبارک، لباس، ہتھیار، معمولات و عادات، کھانے پینے کے آداب، اخلاق، معاشرت، اوقات، عبادتیں، وفات۔ ہر عنوان کے تحت احادیث کی مستند کتابوں کے حوالے سے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے شمائل مقدس سلیس اردو میں پیش کئے ہیں، زبان سہل اور عام فہم ہے۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دے دی گئی ہے۔

"سراپائے رسول" ہر مسلمان گھرانے میں بار پانے کی مستحق ہے اور اس کی ایک ایک سطر ہر مسلمان کیلئے سرمایۂ سعادت و نجات اور منشورِ اخلاق ہے !

---

۱ دینار کی یہ تعریف "پرانے زمانہ کا ایک قیمتی سکّہ" کھٹکتی ہے۔

ذکر و فکر

"ذکر و فکر"۔ از:۔ تہنیت۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش، قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

دکن کے مشہور ادیب اور اردو زبان کے مجاہد خدمت گزار جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی شریک حیات محترمہ تہنیت صاحبہ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "ذکر و فکر" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ تہنیت نے جاہ و دولت کے آغوش میں آنکھ کھولی اور پھر متاہل زندگی بھی راحت و آسودگی کے عالم میں بسر کی۔ مگر اس ہجوم فراغت و امارت میں دینی شغف ترقی ہی کرتا رہا۔ "ذکر و فکر" کے تعارف نگار نے موصوفہ کی پردہ نشینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"میں اپنے علمی و ادبی مشاغل کے سلسلہ میں بار ہا رفعت منزل گیا۔ کبھی ان محترمہ کی آواز تک نہیں سنی"۔

اس دورِ بے باکی و آزادروی میں ایسا کردار فخر کے قابل ہے کہ حیا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "شعبہ من الایمان" فرمایا ہے۔

"ذکر و فکر" کا پیش لفظ جناب امجد حیدر آبادی نے لکھا ہے۔ دس بارہ سطریں ہیں جن میں کوئی جان نہیں۔ "تعارف" البتہ خاصہ دلچسپ اور وزنی ہے۔ سید علی منظور مرحوم کی نثر کی یہ پہلی تحریر نظر سے گزری اور طبیعت خوش ہو گئی۔ اگر وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے تو شاید نظم سے زیادہ وزنی سرمایہ چھوڑ جاتے۔

تہنیت کے کلام میں تصنع اور تکلف نہیں ہے، فکر کی عصمت اور خیالات کی سادگی شعر کے قالب میں ڈھلتی چلی گئی ہے۔ محبتِ رسول ایک ایک شعر سے جھلکتی ہے۔

ہے تصور میں ہمیشہ اب سراپائے نبیؐ — ہم سراپا اک گلستاں بن گئے ہیں آج کل

وقتِ رخصت[1] ہم پہ جو گزری ہے اب تک یاد ہے — چھوڑتے ہی اُن کا در تنہا نظر آنے لگے

نور واں ظاہر ہوا اور یاں جہاں بنتا گیا — رونقِ کون و مکاں وہ جانِ جاں بنتا گیا

چو طرف دشمن کا نرغہ اک طرف تبلیغ دیں — بجلیاں گرتی رہیں اور آشیاں بنتا گیا

ہم کو یثرب کے گلی کوچے جو یاد آتے رہے — ہر نفس اک نقش پائے رہرواں بنتا گیا

ہونٹ مل جاتے ہیں جب نام نبیؐ لیتے ہیں — یہ حلاوت یہ کشش اُن کے فقط نام میں ہے

آپ اسی طرح عنایت کے بہانے ڈھونڈیں — روز اک لطف نیا اے کرم ایجاد! رہے

"کرم ایجاد" کی ترکیب پہلی بار نظر سے گزری اور وجدان نے "مرحبا" کہا۔

آپ کے نور سے روشن ہوا سارا عالم — آب و رنگ اس کو دیا آپ کی رعنائی نے

توشۂ صبر و رضا لائی ہے اولادِ علی — صبحِ زنداں کے لئے، شامِ غریباں کے لئے

"ذکر و فکر" میں کہیں کہیں فنی خامیاں بھی ملتی ہیں اور شعروں کا اگر انتخاب کر لیا جاتا تو اس گلدستہ میں خار و خس نہ رہتے۔

حضور خیر الوریٰ ہمارے، ہیں سرورِ انبیاء ہمارے — قلوب اُن پر فدا ہمارے، ہو جان اُن پر نثار اب بھی (صفحہ ۶۲)

اگر اس شعر کی اس طرح نثر کی جائے کہ "ہمارے حضور خیر الوریٰ اور سرورِ انبیاء ہیں" تو "ہمارے" کی تعقید کتنی ناگوار لگتی ہے۔ دوسری کمزوری اس مصرعہ میں یہ ہے کہ "خیر الوریٰ" اور "ہمارے سرور" تو کہہ سکتے ہیں مگر "ہمارے خیر الوریٰ" اور "ہمارے سرورِ انبیاء" کی ترکیب درست نہیں۔ پھر ردیف "اب بھی" شعر میں زائد اور بیکار ہے۔

---

[1] مدینہ سے رخصت ہوتے ہوئے۔

روئے احمد کے سوا صورت کوئی دل میں نہ ہو — عمر یاں زائل الٰہی نقش باطل میں نہ ہو (صفحہ ۷۷)

دوسرا مصرعہ کتنا کمزور اور نومشقوں کا سا ہے!

کبھی ہو عطا ہمیں بھی وہی چشمِ عارفانہ — ہمیں کچھ خبر نہیں ہے جو لگا ہے تازیانہ (صفحہ ۸۵)

دونوں مصرعوں میں نہ کوئی معنوی ربط ہے اور نہ لفظی مناسبت ہے۔ مصرعہ ثانی کا ابہام اس پر مستزاد!

مرا دل یہ چاہتا ہے کہ ہٹوں نہ اُن کے در سے — مرے سجدے سے گھسے کیوں نہ وہ سنگِ آستانہ (صفحہ ۸۵)

ایسے شعر مجموعہ سے یک قلم خارج کردینے چاہیئے تھے کہ انھیں پڑھ کر وجدان بہت بے مزہ ہوتا ہے!

سلطان احمد تنبل

"سلطان احمد تنبل"۔ از:۔ محمد رحیم دہلوی۔ ضخامت ۱۶۷ صفحات، سرورق رنگین۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ رضیہ۔ جناح ہاؤس، لارنس روڈ۔ کراچی۔

سلطان احمد تنبل ایک بہادر شمشیر زن تھا اور شاہ بابر کے اُمرا میں شامل تھا۔ مگر بعد میں جاکر یہ شخص بابر کا حریف بن گیا۔ اور برسوں بابر سے معرکہ آرا رہا۔ اس کتاب کے ابتدائی ۸۴ صفحات بابر اور تنبل کی معرکہ آرائی کی داستان سے معمور ہیں۔ جو دلچسپ ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہیں۔ اس کتاب میں جن مقامات اور شخصیتوں کا نام آیا ہے اُن کے مختصر حالات کتاب کے آخر میں درج ہیں۔ جس نے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کردیا ہے۔

"بابر اکیلا کیا بھاڑ جھونتا" (صفحہ ۶۸) ضرب المثل یہ ہے "اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونے ......" "چنے" کو ہٹا کر اس کی جگہ "بابر" کے رکھ دینے سے ساری عبارت بے جوڑ بلکہ مضحکہ انگیز ہوگئی۔ لکھنا اس طرح چاہیئے تھا:۔

"بابر تنہا رہ گیا۔ اور اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونتا"۔

شعر و ادب میں لفظوں ہی کا تو سارا کھیل ہے۔ لفظوں کے ادھر اُدھر ہو جانے سے بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

"تنبل کی سرگرمیاں بھی پردۂ راز میں پوشیدہ ہیں"۔ (صفحہ ۸۲) "پردۂ راز میں ہیں" کافی تھا۔ "پوشیدہ" کی ضرورت نہ تھی۔

"اوش کی فضیلت میں کئی حدیثیں ہیں"۔ (صفحہ ۱۴۱) یہ بالکل لغو اور بے سروپا بات ہے۔ اگر مقام اوش کی تعریف میں حدیثیں ملتی ہیں تو وہ بالکل جعلی اور موضوع ہیں۔ "اور دشمنوں پر جو معرکے مارے"۔ اول تو "پر" کا استعمال یہاں درست نہیں۔ پھر عام طور پر "میدان مارنا" اور "معرکے سر کرنا" بولتے ہیں۔

کتاب کی زبان سلیس ہے اور مصنف نے ایک ایسی شخصیت کو اُبھارا ہے جس کے ساتھ بقول مصنف "مورخوں نے آج تک اُس (احمد تنبل) کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ اُس کو بھلا دیا گیا ہے۔ اُردو تاریخ کے صفحات اُس کے ذکر سے خالی ہیں۔ اُردو کا یہ ایک بہت بڑا قرض تھا جو آج میں ادا کر رہا ہوں"۔

سائنس

سالنامہ "سائنس" (ماہ اپریل ۱۹۵۵ء) نگران و سرپرست:۔ پروفیسر محمد سعید الدین پرنسپل سائنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی۔ مشیر:۔ ڈاکٹر سید محمد محسن (محشر عابدی) مدیر اعلیٰ:۔ عبد الرحمٰن عارف۔ مدیرین:۔ ابراہیم پرویز۔ انور حسن درانی۔ رکن مجلس ادارت:۔ مس قمر صدیقی (ایم ایس سی ریسرچ اسکالر نباتات)، ضخامت ۱۸۴ صفحات (بڑا سائز) قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ سائنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔

حیدرآباد دکن کا نام آتے ہی علم و تمدن اور تہذیب و شرافت کی ایک تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اور نہ جانے کتنی بہت سی چوٹیں اُبھر آتی ہیں۔ مجلہ "سائنس" اسی اچھے زمانے کی یادگار ہے۔ اور نہ جانے یہ یادگار بھی کب تک باقی رہتی ہے کہ "اُردو"

کے معاملہ میں بہت سے ظالموں کی نیت بدلی ہوئی ہے جن کے سامنے کوئی دلیل و حجت کام نہیں آتی۔ اس سالنامہ کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی اس میں سائنس پر معلومات آفریں مضامین کے ساتھ ساتھ غزلیں، نظمیں، تنقیدی مضامین اور افسانے بھی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ خوب اور منتخب ہے۔ آغا حیدر حسن دہلوی کی تحریر بہت دن کے بعد نظر سے گزری اور جی باغ باغ ہوگیا۔ دلی کی ٹکسالی زبان کا لکھنے والا اور مغلیہ دور کے تمدن و معاشرت کا عکاس بس اب یہی ایک ادیب رہ گیا ہے۔

اس سالنامہ میں متعدد تصاویر بھی ہیں۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ خوب سے خوب تر۔ مجلہ "سائنس" سے جس کا جتنا بھی تعلق ہے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ رسالہ کا حسن ترتیب اس کا پتہ دیتا ہے کہ ڈاکٹر محشر عابدی کی کوششوں کا اس میں خاصہ دخل ہے۔

سالنامہ "تذکرہ"

سالنامہ "تذکرہ"۔ مدیر:۔ بشیر محمد۔ نائب مدیر:۔ معراج محمد بارق۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ سرورق رنگین و جاذب نظر۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت فی پرچہ چھ آنہ۔ سالانہ چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "تذکرہ" آرام باغ۔ فریر روڈ۔ کراچی۔

مجلہ "تذکرہ" ایک دینی و اخلاقی رسالہ ہے۔ جو کئی سال سے سنجیدہ ادب پیش کر رہا ہے۔ اس کا سالنامہ بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ جس میں ادبی، تنقیدی، مذہبی اور اخلاقی مضامین ہی نہیں۔ نظمیں، غزلیں، افسانے، خاکے اور رپورتاژ بھی ہیں بعض مضامین خاصے وزنی ہیں۔

"ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں" جناب حسن وارثی کا دلچسپ اور شگفتہ مقالہ ہے۔ مگر شعروں کی کثرت نے اس کی سنجیدگی میں شوخی کو ضرورت سے زیادہ مقدار میں شامل کر دیا ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کے سامنے اس کے منتخب شعروں کی بیاض کھلی ہوئی ہے۔ اور وہ اُن شعروں کو کھپانے کے لئے مضمون کی تمہید باندھتا ہے!

ایک وہ جس کے توسط سے ہو امر معاش   دوسرا جس کے توسل سے ملے عیش معاد   (صفحہ ۹۰)

اس قسم کے اشعار جہاں آ گئے ہیں، وجدان بے مزہ ہو جاتا ہے!

"علامہ اقبال کی ذات والا صفات آج کسی تفصیلی تعارف کی محتاج بیان نہیں"۔ (صفحہ ۹۲)

یہ مضمون شروع ہی اس جملہ سے ہوتا ہے جو ایک مشاق ادیب کے قلم سے نکل ہی نہیں سکتا!

اس قسم کی بے رنگیاں اور پستیاں سالنامہ میں ملتی ہیں۔ اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ مگر اس کے باوجود سالنامہ "تذکرہ" کی دلچسپی اور افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے!

ہفت روزہ "تسکین" کا ادب نمبر

ہفت روزہ "تسکین" کا "ادب نمبر"۔ ترتیب دینے والے:۔ بندل الہٰی ضمیر احمد صدیقی۔ ضخامت ۵۰ صفحات (اخباری سائز) اس شمارے کی قیمت آٹھ آنے سالانہ چندہ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ۵ گوبند گڑھ۔ گوجرانوالہ۔

ہفت روزہ "تسکین" کا ادب نمبر ہمارے سامنے ہے، جو اُبھرتے ہوئے ادب کی نمائندگی کرتا ہے۔ بعض نظمیں اور مضامین خاصے ہیں۔ مگر جہاں یہ رنگ ہے:۔

عشق پر جب سے بے خودی چھائی   حُسن کی کائنات تھرائی

دیکھ کر اُس کی مدھ بھری آنکھیں   ہر رگ جاں پہ بے خودی چھائی

میرے ادراک کی مفلوج اڑانوں کی قسم — تیرے اُلجھے ہوئے گیسو نہیں دیکھے جاتے

وہاں ___ طبیعت بڑی اذیت محسوس کرتی ہے۔ نثر کے مقابلہ میں نظم کا حصّہ کمزور ہے۔ "شہر پُر زیب" (تاریخ سہارنپور) جیسے چند معلوماتی مضامین اور ہوتے تو یہ شمارہ وزنی ہو جاتا۔

جُمیتہ حدیث نمبر ہفت روزہ "الاعتصام"

"جُمیتہ حدیث نمبر ہفت روزہ "الاعتصام"۔ مدیر:- مولانا محمد اسحاق۔ ضخامت ۳۰ صفحات (اخباری سائز) قیمت فی پرچہ ڈیڑھ روپے۔

ملنے کا پتہ:- ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور۔

"الاعتصام" مسلک اہلِ حدیث کا ترجمان اور داعی ہے۔ اور اس کی دینی خدمات شاندار ہیں۔ اہلِ حدیث کے دوسرے پرچوں کے مقابلہ میں یہ بحیثیت زبان و ادب اور تنوع کے اعتبار سے بلند تر ہوتا ہے۔ اس کا "جحیتہ نمبر" اپنے موضوع پر ایک قابلِ قدر دینی پیشکش ہے۔ قریب قریب تمام مضامین سنجیدہ، مدلل، اور معلومات آفریں ہیں۔ فتنۂ انکارِ حدیث پر مسلسل ایسی ہی ضربیں پڑتی رہیں گی تو اس فتنہ کا پُوری طرح قلع قمع ہو گا!

مولانا محی الدین قصوری کے مضمون ___ انکارِ حدیث یا انکارِ رسالت ___ میں یہ بات ہر پڑھنے والے کو کھٹکے گی کہ انہوں نے منکرینِ حدیث کے دو گروہ قائم کئے ہیں۔ پہلے گروہ میں پرویز اور ان کے ہمنواؤں کو اور دوسرے گروہ میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کو زبردستی شامل کر دیا ہے۔ یہ کھُلی ہوئی زیادتی ہے۔ سنتِ رسوؐل کو دین میں حجت مانتے ہوئے کسی "حدیث" کو پرکھنا اور کتاب اللہ کی طرح حدیث کے کسی مجموعہ کو "لاریب فیہ" نہ سمجھنا "انکارِ حدیث" نہیں ہو اور یقیناً نہیں ہے!

ماہنامہ ترجمان کا شاہ سعود نمبر

ماہنامہ "ترجمان" کا "شاہ سعود نمبر"۔ مرتبہ:- عجاز اعظمی۔ ضخامت ۲۰ صفحات۔ سرورق رنگین۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- پریس اسٹریٹ، صدر بازار دہلی ۶ اور پاکستان میں، محمد احمد اینڈ کمپنی ۱۰ موتی مسجد۔ بندر روڈ۔ کراچی۔

سلطان سعود والی نجد و حجاز ایدہ اللہ نبصرہ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اُنہی کی آمد کی یادگار اور خوشی میں جمیعت اہلِ حدیث کے آرگن "ترجمان" نے "شاہ سعود نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ شروع میں سلطان ابن سعود مرحوم اور سلطان سعود کی عکسی تصویروں کی جگہ قلمی تصویریں ہیں۔ پھر اُن کا نسب نامہ ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کا زیادہ تر تعلق سلطان سعود الاول کی ذات اور شخصیت کے تعارف اور خاندانی حالات سے ہے۔ عربی کے مدحیہ قصائد بھی ہیں۔

"سعودی عرب ترقی کی شاہراہ پر" خاصہ معلومات آفریں مقالہ ہے۔ ایک مقالہ جس کا عنوان "ہندوستان میں اہلِ حدیث کی تاریخ" ہے۔ اس کا یہ رنگ ہے کہ پہلی اور دوسری ہجری پر چند سطروں کے بعد ہی بارھویں صدی ہجری کا ذکر آ جاتا ہے۔ اس طرح یہ تاریخ مربوط نہیں رہتی! "ارضِ حرم کے تاجدار کا پیغام" اس عنوان پر دل و نگاہ رُکے کہ عثمانی سلاطین اپنے تمام ملوکانہ کر و فر کے باوجود اپنے کو "خادم الحرمین الشریفین" لکھا کرتے تھے۔

اس شمارے میں نگاہ یہ ڈھونڈتی ہی رہ گئی کہ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے جیسا مکتوب خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا تھا۔ اس قسم کی کوئی چیز اس میں مل جاتی!

جرائم یا مظالم جو شریفی دور میں آئے — سعودی دور جب آیا لگے ہیبت سے کترانے
نظر بھر کے بھی کوئی اب نہ دیکھے کیا ہی کس کا ہے — گلی میں سیم و زر رکھ کر گئے پیشاب، پاخانے

اس قسم کے بچکانے شعروں نے اس شمارے کو ادبی اعتبار سے پست کر دیا ہے!

اسباق النحو

(۱) اسباق النحو (حصہ اول) ضخامت ۵۶ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔
(۲) اسباق النحو (حصہ دوم) ضخامت ۷۴ صفحات۔ قیمت بارہ آنے
(۳) تحفۃ الاعراب (منظوم) ضخامت ۱۲ صفحات۔ قیمت چار آنے۔

مصنفہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ
ملنے کا پتہ:۔ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ

اسباق النحو (حصہ اول) اسم کے اور اسباق النحو (حصہ دوم) فعل کے بیان میں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں عربی زبان کے کارآمد اور ضروری قواعد آسان مثالوں کے ذریعہ سمجھائے گئے ہیں۔ عربی سیکھنے والوں کے لئے یہ کتابیں انتہائی کارآمد اور فایدہ بخش ہیں۔ جناب اختر احسن اصلاحی نے ان کو مرتب فرمایا ہے اور مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مثالوں کے لئے جو جگہ خالی چھوڑ دی تھی اُن کو پُر کر دیا ہے۔

تیسری کتاب — تحفۃ الاعراب — میں "اعراب" کے مسائل نہایت سلیس اور آسان پیرایہ میں نظم کئے گئے ہیں۔ ایک نمونہ:۔

اسم مرفوع دو ہیں بے کم و بیش	مسند ایک دوسرا ہے خبر
ہے مثال اُن کی حیدرٌ اَسَدٌ	جس کے معنی ہیں شیر ہے حیدر
یا کہ الغُصْنُ یَانِعٌ ثَمَرُہٗ !!	یعنی یہ شاخ ہے رسیدہ ثمر
یا کہ الخادمانِ مُختصِمانِ	یعنی دو نوں جھگڑتے ہیں نوکر
یا کہ زیدٌ دنٌ حاضِرونَ ھُنَا	یعنی حاضر ہیں زید سب یاں پر

مولانا حمید الدین فراہی کی قبر پر اللہ کی رحمت کے پھول سدا برستے رہیں کہ وہ علمی فیض کے چشمے چھوڑ گئے ہیں۔

صحیح لغات القرآن

"صحیح لغات القرآن" مؤلفہ:۔ مولانا مولوی شہید الدین مرحوم۔ حجم ۲۷۰ صفحات (مجلد رنگین گرد پوش) قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب مقابل آرام باغ، فریر روڈ۔ کراچی۔

اس کتاب میں تمام قرآنی الفاظ کی تشریح آسان زبان میں اختصار اور جامعیت کیساتھ کی گئی ہے۔ اُردو جاننے والوں کے لئے تو یہ لغت نعمت غیر مترقبہ ہے۔ عربی سے تھوڑی سی بھی مناسبت اور قرآن سے شغف ہو تو اس لغت سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ نمونہ:۔

اَلحِق:۔ تو ملا، تو جوڑ۔ اَلَدُّ:۔ بڑا جھگڑنے والا، سخت عداوت کرنے والا۔ اُلقِیَ:۔ میں ڈالوں گا۔ اَمْ:۔ یا۔ خواہ (حرف تردید) — مؤلف اور ناشر دونوں اس لغت کی تالیف و اشاعت پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر پائیں گے۔

آسان درس قرآن

"آسان درس قرآن" (حصہ اول پارہ عم) مؤلفہ:۔ حافظ محمد یعقوب صاحب۔ ضخامت ۹۴ صفحات۔ (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ الفاروق بک ڈپو کاملی (ایم، پی، انڈیا)

اس کتاب میں پارۂ عم کی چند صورتوں کا آسان ترجمہ اور سلیس تفسیر پیش کی گئی ہے۔ عید کے دو اُردو خطبے بھی اس میں درج ہیں۔

(صفحہ ۲۶) "جو کہ اُن کو بھوک میں کھلانے کو دیا"۔ بامحاورہ ترجمہ یوں ہونا چاہیئے تھا "جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا۔ (صفحہ ۴۴) "کالفراش المبثوث" کا ترجمہ "چیونٹیوں کی طرح پٹلے پڑے ہوں گے"۔ عجیب ہے۔ "فراش" چیونٹیوں کو نہیں پتنگوں کو کہتے ہیں۔ اور "مبثوث" کے معنی ہیں بکھرے ہوئے — "اذا جاءَ نصرُ اللہ والفتح" "جب نہ آ جائے مدد اللہ کی اور فتح" اس میں "نہ" زاید ہے، شاید یہ کتابت کی غلطی ہو!

شیعہ سنی اتحاد

"شیعہ سنّی اتحاد" از:- مولانا فضل احمد غزنوی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت تین آنہ۔
ملنے کا پتہ:- ادارہ تبلیغ الاسلام۔ فضل پریس گاڑی کھاتہ۔ حیدر آباد سندھ۔

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی حرام ہے۔ اور شیعہ اور سنّیوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ اور یہ کہ نادر شاہ نے شیعہ سنی کے درمیان اتحاد کی کوشش کی تھی۔ اور:-

"ایران میں صفوی بادشاہوں نے اپنے اغراض و مقاصد اور ذاتی مفاد کی خاطر تینوں خلیفوں اور دوسرے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف طریق سب و شتم اور تبرّا بازی شروع کی"۔

اس کتاب میں علامہ عبد اللہ سویدی اور ملّا باشی کا مناظرہ بھی درج ہے!

سہل قواعد تجوید

"سہل قواعد تجوید" از:- قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۶۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ نشاۃ الثانیہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد دکن۔

"مختلف روایتِ قرأت میں سب سے زیادہ آسان اور سہل قرأت حضرت حفص رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔ یہ کتاب اُردو زبان میں اسی قرأت کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ فصول کی ترتیب یہ ہے:-

مخارج حروف۔ صفاتِ حروف، لام جلالہ وغیرہ۔ قواعد راء۔ نون ساکن اور تنوین کے قاعدے۔ میم ساکن و میم و نون مشدد ہائے ضمیر، مد و قصر، وقف و ابتداء۔ وقف کے اقسام۔ متفرقات۔

تجوید کے ہر قاعدے کو بہت ہی آسان انداز میں لکھا گیا ہے۔ اگر کسی قاری کی صحبت و تلمذ بھی میسر آ جائے تو اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

جماعت اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینہ میں

"جماعتِ اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینہ میں" ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت ڈھائی آنہ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعت اسلامی۔ بانی منزل۔ محلہ بدر قہ، اعظم گڑھ (یوپی۔ انڈیا)

اس کتابچہ میں جماعتِ اسلامی کی کتابوں کے اقتباسات درج کر کے بتایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی کے عقائد و تصورات کیا ہیں۔ اس کتابچہ کو پڑھ کر اُن تمام گمراہ کن اتہامات کی تردید ہو جاتی ہے۔ جو جماعتِ اسلامی پر لگائے جا رہے ہیں۔ ملّت کی انتہائی بدنصیبی یہ ہے کہ بعض مدعیانِ علم و تقویٰ اور صاحبانِ دلق و سجادہ بھی اس مہم میں شامل ہو گئے ہیں۔

لوگوں کو چاہیئے کہ اگر وہ جماعتِ اسلامی کی صحیح پوزیشن سمجھنا چاہتے ہیں تو خود جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ کریں اور دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر نہ جائیں۔

اللسان

"اللسان" (حصہ سوم) مرتبہ:- مولانا عظمت اللہ تفہیمی۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- دار الاشاعت مدرسہ تفہیم القرآن۔ جھنگ (صدر)

جناب مولانا عظمت اللہ تفہیمی نے اپنی زندگی خدمتِ قرآن کے لئے وقف کر دی ہے۔ اُن کی برسوں سے یہ کوشش ہے کہ مسلمان عربی زبان سے واقفیت حاصل کریں تاکہ وہ قرآن پاک سے ترجموں کی مدد کے بغیر براہ راست فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ کتاب اُردو جاننے والوں کی مشکلات کا لحاظ کر کے مرتب کی گئی ہے۔ جس کو اگر سمجھ کر پڑھا جائے تو تھوڑی سی محنت سے بہت فائدہ

لے صفحہ ۲۵ پر کتابت کی غلطی کے سبب "لثة" (مسوڑھے) کا ترجمہ "ہونٹ" درج ہو گیا۔

حاصل ہوسکتا ہے اور چھوٹے چھوٹے جملے بولنے اور لکھنے کی قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔

جناب تفہیمی صاحب نے عربی ریجد کے بڑے بڑے مصور چارٹ بھی تیار کئے ہیں۔ جن سے عربی بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مولانا موصوف کا یہ کام ہمیں توقع ہے کہ آگے چل کر عربی دانی اور قرآن فہمی کی تحریک بن جائے گا۔

راہ رو اور کارواں

"راہ رو اور کارواں" مرتبہ:- حفیظ قتیل۔ ضخامت ۱۵۹ صفحات۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد دکن) کی طرف سے جن ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں ان کا مختصر تذکرہ درج ہے۔ چوّن شعراء اور ادباء کے سوانح حالات۔ صرف ۱۴۸ صفحات میں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کسی کسی بیچارے کے حصہ میں تو صرف چند سطریں آئی ہیں۔

دیباچہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

"دکن دیس کی مٹی ہی میں کچھ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں کے بسنے والے ہر زمانے میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور منوانے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔۔۔۔۔"

"کچھ یہ بات معلوم ہوتی ہے" میں تحریر کی کس قدر ناپختگی جھلکتی ہے۔ پھر تاریخ دکن کا یہ عجیب انکشاف ہے کہ یہاں کے بسنے والے اپنی انفرادیت منوانے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ "انفرادیت کا منوانا" اور اس کے لئے جدوجہد کرنا کوئی اچھی صفت نہیں ہے!

"۔۔۔۔۔ کتنے ہی ایسے بڈھے ادیب ہیں جنہوں نے غم روزگار کے پیچھے غم جاناں کو بھلا رکھا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے آنکس نے ان کے قلم کو بھی چلنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔ (ھ)"

"آنکس" نے ساری عبارت کو مضحکہ انگیز بنا دیا۔

چھ (۶) کو جگہ جگہ "چھے" لکھا ہے۔ (چھے بہنیں اور چار بھائی ہیں ۔۔۔۔۔) (صفحہ ۲۶)

"طرح طرح کی موانعات کے باوجود"۔ "موانع" کی جمع الجمع (موانعات) درست نہیں۔

بشیر النساء بیگم بشیر کا سال پیدائش ۱۹۱۵ء خلاف واقعہ ہے۔ موصوفہ کی عمر پچاس سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ بلکہ عجب نہیں کہ اس سے زیادہ ہو۔ نواب کاظم یار جنگ بہادر کو حیدرآباد کا "با اقتدار امیر" لکھا ہے (صفحہ ۱۳۷) نواب صاحب مرحوم کا شمار حیدرآباد کے امراء میں نہیں ہوتا تھا۔ "با اقتدار عہدہ دار" لکھنا چاہیئے تھا۔ علی اختر صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے (صفحہ ۹۹) یہ بھی غلط ہے۔ اُن کی پیدائش یو۔پی کی ہے۔

اس کتاب سے یہ بات البتہ نئی معلوم ہوئی کہ جناب عبد الرحمن خاں صاحب (بی، ایس، سی آنرز لندن) شعر بھی کہتے ہیں۔ اور ضمیر تخلص فرماتے ہیں۔

پوری کتاب کی ایک ڈائرکٹری کی حیثیت ہے۔ ادبیت کا دور دور پتہ نہیں!

نئی راہ

"نئی راہ" از:- محمد الیاس۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:- میوات پبلیکیشنز، شکراوۃ گوڑگانوہ (مغربی پنجاب)

اس کتاب میں میو قوم کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔ کہ وہ کیا تھے اور انہوں نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے آشوب میں اُن پر کیا بیتی؟ کتابچہ کے آخری صفحات میں میوات کے موجودہ حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انھیں غیرت دلائی گئی ہے

اور آخر میں تنظیم و ترقی کے منصوبے پیش کیے گئے ہیں۔ تحریر کا انداز جذباتی اور ہمدردانہ ہے!

آدمؑ۔ نوحؑ

(۱) "آدمؑ"۔ مترجم:۔ عُبید الحق۔ ضخامت ۳۸ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ (۲) "نوحؑ"۔ مترجم:۔ عُبید الحق۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ۔ ۱۵۰ لیک روڈ۔ لاہور

یہ دونوں کتابچے عربی سے براہ راست ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ترجمہ شستہ اور رواں ہے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ علیہما السلام کی پاک زندگیوں کا حال ان کتابچوں میں درج ہے۔ جن کا ماخذ قرآن کریم ہے۔ بچوں کیلئے ان کتابچوں کا مطالعہ سو فیصدی فائدہ مند ہے۔

"سب اسی نظام سے آپس میں شادیاں کرتے"۔ (حضرت آدم علیہ السلام۔ صفحہ ۲۸) اس جملہ کی ترکیب گنجلک ہے مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کیا جانا چاہیئے تھا ـــــ "اس طرح حضرت نوحؑ نے ۹۵۰ سال تک نہایت سخت جہاد اور طویل صبر کرنے کے بعد اپنی زندگی بسر کی"۔ (صفحہ ۴۲) "کرنے کے بعد" نے جملہ کے مفہوم کو مبہم بنا دیا۔

بچوں کے لئے ان کتابچوں کا مطالعہ ہر اعتبار سے فائدہ بخش ہے۔

تجدید معاشیات

"تجدید معاشیات"۔ از پروفیسر عبد الباری سابق استاد فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی۔ ضخامت ۲۷۵ صفحات مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ تجدید دین، شبستان، قدم رسول، ہارڈنگ روڈ، لکھنؤ۔

جناب مولانا عبد الباری "تجدید دین" کے سلسلہ میں تین کتابیں اب تک لکھ چکے ہیں۔ (۱) جامع المجددین (۲) تجدید تصوف و سلوک اور (۳) تجدیدِ تعلیم و تبلیغ۔ اب یہ چوتھی کتاب "تجدید معاشیات" اسی اہتمام اور عزم و خلوص کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے ـــــ کتاب کے مرکزی عنوانات یہ ہیں:۔

معاشیات عبدیت ـــــ معاشیاتِ مشیت ـــــ معاشیات عبثیت جدیدہ ـــــ معاشیات انفاق ـــــ معاشیاتِ ایمان۔ معاشی مشکلات و مسائل کا حل ـــــ ان عنوانات کے تحت سینکڑوں ذیلی عنوانات ہیں۔

مولانا عبد الباری صاحب کو اپنے مرشد حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کی ذات سے لگاؤ نہیں عشق ہے۔ اور وہ اس لئے کہ مولانا تھانویؒ کی تربیت نے اُن کی فکر کو، دل و دماغ کو اور کردار کو دین کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کتاب میں مولانا تھانوی کی تحریروں کے اقتباسات اس کثرت سے درج کئے گئے ہیں کہ شاید ایک تہائی کتاب انہی جواہر پاروں سے مزین ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ اقتباسات بڑے وزنی اور بصیرت افروز ہیں:۔

دنیا اور آخرت کے درمیان کیا نسبت اور تعلق ہے؟ اور "بندگانِ شکم" نے اُسے کیا بنا دیا ہے۔ اس پر فاضل مصنف کی تحریر کا یہ اقتباس بار بار پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے:۔

"آخرت کا یہ راستہ چونکہ دنیا ہی سے ہو کر گیا ہے۔ اس لئے بقدر ضرورت ایسی ہدایات دینا ضروری تھا کہ منزل کھوٹی ہوئے بغیر جہاں تک ہو سکے راستہ امن و راحت کے ساتھ طے ہو نہ یہ کہ راستوں کے تماشوں میں کھو کر منزل ہی کھو جائے عہد جدید کے یورپ کی لائی اور سکھائی ہوئی جدید معاشیات و سیاسیات کی بنیاد بالکلیہ اسی آخرت فراموشی بلکہ آخرت بیزاری پر ہے اور یہی رجحان ساری دنیا پر ایسا چھا گیا ہے کہ راقم ہذا کو تو سچ پوچھئے اسلامی معاشیات اور اسلامی سیاسیات کی تعبیر سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات میں معیشت و سیاست کی ضمنی و ذیلی یا وسائلی اہمیت سے زیادہ ہی نہیں، بالکلیہ مقصد کی اہمیت و معنویت پیدا ہو گئی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ تعبیرات و اصطلاحات جنہوں نے

چلائی ہیں اور اُن کو مستقل علم و فن اور دعوت (آئیڈیالوجی) کا درجہ دیا ہے اُن کی نظر میں یہ ذیلی و ضمنی وسائل نہیں اعلیٰ مقاصد ہی ہیں۔ جو تہذیب و تمدن بھی آخرت سے اپنا رشتہ کاٹ لے لازماً اُس کی دُنیوی زندگی اور اُس کے مسائل ہی زندگی کا محور و مرکز بن کر رہ جائیں گے۔

انسان کے حیوانی یا مادّی خمیر کا سب سے کمزور پہلو قدرتاً اُس کے پیٹ یا معاش کا معاملہ ہے۔ اصول و اخلاق، علم و ہنر، عزت و شرافت، غیرت و حمیت، مروت و محبت، غرض انسانیت کے ہر چھوٹے بڑے جوہر کو بھینٹ چڑھا دینے کے لئے اس کمزوری کو آمادہ کر لیا جاتا ہے۔

مذہب و مذہبیت کا کبھی ذکر خود انسان اور اُس کی نفس انسانیت کے حق میں شاید ہی تاریخ کی کسی شخصیت و تحریک نے انسان کی اس حیوانی و بطنی کمزوری سے اتنا مفسدانہ فایدہ اُٹھایا ہو۔ جتنا کارل مارکس اور اس کے انتہائی مادہ پرستانہ فلسفۂ معیشت نے! لیکن بھولی بسری یہ انسانی غیرت کہ آج بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بندۂ شکم کہہ دو تو وہ اس کو اپنی آدمیت یا انسانیت کی انتہائی توہین بلکہ گالی ہی جانے گا اور کہاں یہ دعوتِ شکم کہ انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی و اخلاقی، علمی و فکری، تہذیبی و تمدنی، سیاسی و سماجی قدریں سب کی سب ایک معاش ہی کے مسئلہ یا پیٹ ہی پیٹ کا چکر ٹھہرادی گئیں۔ (صفحہ ۱۵-۱۶)

اس کتاب میں اسی خیال کو سینکڑوں صفحات پر پھیلایا گیا ہے۔ کہ دُنیا آخرت فراموش ہو گئی ہے۔ انسان کے تمام مقاصد اور کوشش کا محور صرف "پیٹ" بن کر رہ گیا ہے۔ اس طرف بہت کم لوگوں کا خیال جاتا ہے کہ رزق کا اصل سررشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بندوں کو رزق یہ خود منسٹریاں نہیں دیتیں اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ زمین کو روئیدگی اور دانہ کو پھلنے پھولنے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے! لیکن اس "شکم پرستی" کے نظریہ کا بُرا ہو کہ اُس نے آج کے انسان کو خدا اور آخرت سے غافل بنا دیا ہے اور پوری زندگی "بھوک اور شہوت" بن کر رہ گئی ہے ——— اپنے موضوع پر کتاب کامیاب ہے۔ اسے پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر یقین قائم و راسخ ہوتا ہے اور دُنیا کے مقابلہ میں آخرت بدیہی طور پر قابلِ ترجیح محسوس و مشہود ہونے لگتی ہے!

فاضل مصنف کی نیت سو فیصدی نیک اور اُن کے جذبات دین و اخلاص سے لبریز ہیں۔ اس اعتراف کے بعد سیاست و معاشیات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہے کہ کہیں کہیں اس معاملہ میں مصنف کا قلم پورے طور پر معتدل نہیں رہا۔ جو لوگ اقامتِ دین کا جذبہ اپنے اندر پاتے ہیں اور جن کی زندگیاں بھی عام طور پر اسلامی اخلاق کی پابند ہیں اور جو دین کے ساتھ دُنیا کے تقاضوں کی بھی اہم رکھتے ہیں وہ سیاست و حکومت کو دین سے جدا نہیں سمجھتے۔ خلافتِ راشدہ دین و سیاست کا سنگم تھی اور اُسی دورِ سعادت کو واپس لانا اور اس کا نمونہ پیش کرنا مقصود ہے کہ اس طرح نہ دُنیا کے فطری تقاضے مضمحل ہو کر اُن میں رہبانیت کی جھلک پیدا ہونے پاتی ہے اور نہ آخرت کا تصور کمزور ہوتا ہے۔ خود ذاتِ رسالتؐ نے اسلامی حکومت کی تاسیس کا فرض انجام دیا ہے۔ اس محکم اور بدیہی تاریخی شہادت کے بعد، کسی مسلمان کو چناں اور چنیں کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے! اللہ کی زمین کے صحیح وارث "صالحین" ہی ہیں جن فاسقوں، فاجروں اور خدا کے باغیوں کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت ہے وہ سب کے سب غاصب ہیں اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقامتِ دین ہی کی خاطر "ارضِ مغصوبہ" کو غاصبوں سے چھڑانے کی جدوجہد کرے۔ جو لوگ نظامِ کفر کو مسلط دیکھ کر اپنے اندر کسی قسم کی ناگواری تک نہیں پاتے اور اطمینان کے ساتھ دین کے معروف ارکان کی پابندی کئے جاتے ہیں اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام سے بدلنے کے لئے جدوجہد کو دُنیاداری کا کام سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنے اس "راحت پسند تقویٰ" کا اللہ کے

جواب دینا ہوگا۔ اسلام کی راہ میں "صفہ" بھی آتا ہے۔ بدر و خیبر بھی آتے ہیں۔ فتح مکہ بھی آتی ہے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے بھی آتے ہیں۔ اس میں نماز کے لئے شب بیداریاں بھی ہیں اور اسلامی حکومت کے حدود کی حفاظت کے لئے راتوں کو جاگ جاگ کر پہرہ دینا بھی ہے اور یہ پورا سلسلہ عبادات ہی عبادت ہے!

جو لوگ "اسلامی معاشیات" کو پیش کرتے ہیں۔ اُن کا زیادہ تر روئے سخن کمیونسٹوں اور مادہ پرستوں سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ صرف یہ سن کر کہ "اللہ رازق ہے" مطمئن نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ان کو اقتصادی تکنیک کی زبان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے معاشیات کا کس قدر فطری نظام پیش کیا ہے۔ جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ "اسلامی معاشیات" کی اصطلاح کوئی وحشت کی چیز نہیں ہے جس زمانہ میں باطل جس بھیس میں نمودار ہوتا ہے اہل حق اُسی کی مناسبت سے اُس کا توڑ کرتے ہیں!

"جو پوچھا دل نے اس جینے سے کچھ حاصل بھی ہے" (صفحہ ۸)

چنیں قفس نہ سزائے چومن الحان است — روم بہ گلشن رضواں فرع آں چمنم (صفحہ ۵۰)

یہ دونوں شعر غلط درج ہوئے ہیں۔ صفحہ ۱۰ پر "علانیتہ" کو "علی نیتہ" املا کیا گیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۶۲ پر "من غشنا" کتابت میں "من غشنا" ہو گیا۔

مولانا عبدالباری صاحب اس کتاب پر مبارکباد کے ہماری طرف سے اور اجر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستحق ہیں!

تاریخ علم فقہ

"تاریخ علم فقہ" از۔ مولانا مفتی سید عمیم الاحسان۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ مجلد گردپوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے چار آنہ۔ غیر مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ "برہان" اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔

علم فقہ کی یہ مختصر مگر معلومات آفریں تاریخ ہے۔ چند عنوانات:۔

فقہ کے ماخذ — صحابہ اور تابعین کے اجتہادی فتوے — تخریج مسائل میں اختلاف اور اُس کے اسباب — ضرورت تدوین فقہ — تدوین و ارتقاء کے مختلف ادوار — سوانح امام ابو حنیفہؒ — فقہ حنفی کی حقیقت — امام زفرؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام حسنؒ کے حالات — دیگر اکابر فقہاء — امام مالکؒ کے سوانح — فقہ مالکی — امام شافعیؒ کے سوانح — فقہ شافعی — امام احمدؒ بن حنبل — فقہ حنبلی — ائمہ اربعہ — چند نا شدہ مذاہب — دورِ تدوین میں مذاہب شیعہ — فقہ کے مختلف ادوار!

اس کتاب میں سب سے زیادہ مفصل حال امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے فقہی مذہب کا ملتا ہے۔ (صفحہ ۱۳۴) "فقہ حنفی بغایت رنگین، باضابطہ اور متنوع تھی"۔ فقہ حنفی کو "رنگین" کہنا عجیب سی بات ہے بلکہ اس میں ایک طرح کا ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔ صفحہ ۱۳۵ پر شیخ ابو حامد اسفرائینی "کو" الفرائی" لکھا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے!

تدوین فقہ کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے۔

NEWERA

ہفتہ وار "نیو ایرا" (انگریزی) ایڈیٹر۔ خورشید احمد، ظفر اسحٰق انصاری۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر انصار اعظم۔ حسن اختر۔ ضخامت ۱۲ صفحات۔ گیٹ اپ (get-up) دیدہ زیب۔ قیمت فی پرچہ چار آنہ۔ (ہوائی ڈاک سے مزید ایک آنہ) سالانہ چندہ دس روپے ششماہی ساڑھے پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر "نیو ایرا" آرام باغ روڈ۔ کراچی

"نیو ایرا" (NEW ERA) ایک نو طلوع ہفتہ وار ہے۔ جس کے سولہ شمارے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ پرچہ انگریزی زبان میں دین، اخلاق اور سیاست و معیشت کو باوقار انداز میں پیش کرتا ہے۔ مقصدیت سے اس کی ایک سطر بھی خالی نہیں ہوتی۔

مضامین سنجیدہ ہی نہیں متنوع اور دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ پاکستان کی سیاست پر اس کی تنقید دل میں جرأت و بیباکی کے ساتھ مخلصانہ مشورت صحافتی متانت، اور گہری بصیرت پائی جاتی ہے۔ جب یہ پرچہ نکلنا شروع ہوا ہے تو پاکستان میں دستور سازی کا کام آخری مرحلہ میں تھا اور اسلامی دستور کے مخالفین پوری قوت کے ساتھ اپنے محاذ پر جمے ہوئے تھے۔ "نیو ایرا" نے اس بُت کدے کے "صنمِ اکبر" مسٹر شہید سہروردی ــــ کے پندار پر اس وقت جو کاری ضربیں لگائی ہیں اس کی گونج نے بڑے بڑوں کے دل دہلا دیئے!

"نیو ایرا" کی عنانِ ادارت اُن اسلام پسند نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے جو "اقامتِ دین" کو اپنی زندگی کا مشن بنا چکے ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ پاکستان ہی نہیں ملّتِ اسلامیہ کا مستقبل جن سے بڑی اچھی توقعات رکھتا ہے۔ ایسے ذہین، صالح، حوصلہ مند اور صاحبانِ علم و بصیرت ہر اخبار اور رسالہ کو کہاں میسّر آتے ہیں! "نیو ایرا" زیادہ سے زیادہ تعاون کا مستحق ہے۔ زمانہ اور تجربہ کے ساتھ ساتھ خامیاں دُور ہوتی جائیں گی اور انشاء اللہ ہر اگلا قدم مستقیم تر ہوگا۔ ہم اس پرچہ کی عمر، ترقی، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔

VOICE OF ISLAM

"وائس آف اسلام" (صوت الاسلام)۔ ایڈیٹوریل بورڈ:۔ مولانا تمیز الدین خاں (چیئرمین) مسٹر آفتاب حسن۔ مسٹر ظفر احمد انصاری۔ ڈاکٹر محمد عزیز احمد۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری۔ لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر ایم۔ ایم احمد۔ مولانا ایم الیف، آر انصاری (ارکان) ظفر اسحٰق انصاری۔ ایم اے (ایڈیٹر) قیمت فی پرچہ ایک روپیہ۔ سالانہ چندہ دس روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ا۔ ۲، ایم نمبر ۲۰ فریئر روڈ۔ صدر کراچی نمبر ۳ (فون نمبر ۸۳۹۴۴)

یہ ماہنامہ ــــ (وائس آف اسلام) ــــ جمعیۃ الفلاح کا آرگن ہے۔ جس کے بانی اور صدر مولانا تمیز الدین خاں صاحب ہیں۔ جن کی جرأتِ ایمانی کا پاکستان کی جمہوریت پر احسان ہے۔ ورنہ یہاں تو ڈکٹیٹر شپ کا رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ اور چند دنوں کے لئے تو پاکستان کا مطلع بہت زیادہ غبار آلود ہو گیا تھا۔

"وائس آف اسلام" کئی سال سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اُس کے مضامین دین و اخلاق کے ترجمان ہوتے ہیں۔ افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال، ہمواری اور توازن اُس کا امتیازی وصف ہے۔ پاکستان کا یہی وہ واحد اسلام پسند انگریزی ماہنامہ ہے۔ جو پاک و ہند کے علاوہ انگلستان، افریقہ اور امریکہ کے علمی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے تنوع کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی شمارے میں سائنس پر، بنکنگ پر، اخلاق و سیاست اور تاریخ پر مضامین ملتے ہیں۔ مسٹر ظفر اسحٰق انصاری نے جب سے اس کی صدارت کو سنبھالا ہے "وائس آف اسلام" کا معیار بلند تر ہو گیا ہے۔ اور ایڈیٹر کا رسالہ سے غیر معمولی شغف اس کی ترتیب و تنوع سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہم اہلِ علم اور مطالعہ کے شوقین حضرات سے اس ماہنامہ کے پڑھنے کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی مائیں

"مسلمانوں کی مائیں"۔ از۔ رازق الخیری۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات مجلد۔ رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت پانچ روپے ملنے کا پتہ:۔ عصمت بک ڈپو۔ کراچی نمبر ۳۔

رسالہ "عصمت" اور مولانا راشد الخیری مرحوم کے نام بغیر کسی وقفہ اور فصل کے ایک ساتھ ذہن میں آتے ہیں اور اس کے بعد ادارہ "عصمت" کی وہ ادبی و اخلاقی خدمات سامنے آجاتی ہیں جو اس ادارہ نے انجام دی ہیں اور مسلم گھرانوں میں اخلاق کی بنیادوں پر علم و تہذیب کو پھیلایا ہے۔ جناب رازق الخیری صاحب اپنے نامور باپ کے قدم بہ قدم (الولد سرٌ لابیہ) ادب و صحافت کی منزل میں گامزن ہیں۔ اُن کی یہ کتاب "سلسلۂ عصمت" کی نواسویں (۸۳) پیشکش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں پر متعصب غیر مسلموں نے جو بے سروپا اعتراضات کیے ہیں - اس کتاب میں اُن کا خاصے وزنی دلائل کے ساتھ جواب دیا گیا ہے، کتاب کا تقریباً ایک تہائی حصہ حضورؐ کی مقدس سیرت پر مشتمل ہے - اس کے بعد امہات المومنین کے حالاتِ زندگی ہیں اور پھر معترضین کے اعتراضات کے جوابات ہیں - زبان آسان اور عام فہم ہے اور جوابات ایک جویائے حقیقت کو مطمئن کرنے والے ہیں - مگر وہ لوگ جن کے قلوب پر تعصب اور اسلام دشمنی کی زنگ جم چکی ہے اُن کو قرآن بھی مطمئن نہیں کر سکتا - !

(صفحہ ۲) "...... اگر تاریخ اسلام سے واقفیت نہ ہو تو نیت ڈانواں ڈول ہونے لگتی ہے" "نیت کا ڈانواں ڈول ہونا" یہاں سیاق و سباق کے اعتبار سے خاصہ کھٹکتا ہے۔ "ایمان ڈگمگانے لگتا ہے....." اسی قسم کے کسی جملہ کی یہاں ضرورت تھی (صفحہ ۱۴) "اس ملک (عرب) کی آبادی کی ابتداء پیغمبرِ اسلام سے ڈھائی ہزار برس قبل حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ہوئی تھی" عرب کی آبادی کا آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ہوا تھا؟ یہ تاریخ دانی کے ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے بنو جرہم میں شادی کی تھی جو وادیٔ مکہ میں پہلے سے آباد تھے اور اس سے جو اولاد ہوئی وہ "عرب مستعربہ" کہلاتی ہے۔

(صفحہ ۲۳) ؎ پروانہ کو شمع ہے، عنادل کو پھول بس!

یہ مصرعہ بالکل ناموزوں اور غلط درج ہوا ہے۔ اور اس غلطی کو کاتب سے منسوب کرنے میں ہمیں تامل ہے۔

کتابت کی بعض ایسی فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے یا سیرت اور اسلامی تاریخ کا جنہوں نے زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ وہ کتابت کی ان غلطیوں میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے:-

"حضرت حاجرہ"[1] (صفحہ ۱۶) "واد"[2] (صفحہ ۱۷) "بنی ہزیل"[3] (صفحہ ۱۷)، "ہماہ"[4] (صفحہ ۱۸) "قبیلہ تغلب"[5] (صفحہ ۲۰) "اظہار"[6] (صفحہ ۲۲) "استبزار"[7] (صفحہ ۲۲) "حکیم بن خزام"[8] (صفحہ ۲۳، ۲۷) "پیچان"[9] (صفحہ ۲۷)

عرب میں جس شخص کی وجہ سے بُت پرستی کی ابتداء ہوئی اور جس نے شام سے بُت لاکر خانۂ کعبہ میں رکھ دیے تھے۔ اس کا نام فاضل مصنف نے "عمر بن لُحئی خزاعی" لکھا ہے۔ یہ شخص خزاعی تو تھا مگر اس کا نام "عمرو بن لحی" ہے!

جناب رازق الخیری اللہ کے فضل سے اُن لوگوں میں نہیں ہیں۔ جو مغربی افکار و تصورات کی عینک سے قرآن کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ موصوف اس کے قائل ہیں کہ اگر کوئی مسلمان عدل کی شرائط پوری کر سکتا ہے تو وہ ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی وزنی باتیں کہی ہیں۔ اُن کے لیے بھی جو اس "اجازت" سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے شادیوں کے حریص ہوں اور اُن کے واسطے بھی جو مغرب زدگی کے باعث "تعدادِ ازدواج" کو درست نہ سمجھتے ہوں۔ مصنف نے یہ کتاب بڑے خلوص کے ساتھ لکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر دارین میں عطا فرمائے گا!

مینائے فطرت

"مینائے فطرت" از میر زیدی۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اردو۔ نوشہرہ (چھاؤنی)

جناب میر زیدی کے کلام کا یہ مجموعہ ہمارے سامنے ہے جس کا شروع سے لے کر آخر تک زیادہ تر یہ رنگ ہے:-

---

[1] ہاجرہ۔ [2] وود (بُت کا نام) [3] بنی ہذیل [4] ہامہ [5] قبیلۂ تغلب [6] "ظہار" [7] استبراء [8] حکیم بن حزام۔
[9] "پہچان" (اس لفظ کا تعلق تاریخ سے نہیں، زبان سے ہے)

اُس کی آنکھوں میں فلسفۂ تقدیس　　ایک مجسم کتاب ہے عورت　　(صفحہ ۸)

"فلسفۂ تقدیس" پر اضافت (ہمزہ کے ساتھ) نہ ہو تو "فلسفہ تقدیس" ایک بے معنی ترکیب ہو جاتی ہے اور اضافت تسلیم کی جائے تو شعر وزن سے گر جاتا ہے!

اس کا ہر لفظ اک حدیثِ حیات　　موجدِ انقلاب ہے عورت　　(صفحہ ۸)

اول تو "موجدِ انقلاب" کی جگہ "بانیٔ انقلاب" کہنا چاہیے کہ انقلاب کی بنا ڈالی جاتی ہے اُسے ایجاد نہیں کیا جاتا۔ پھر عورت کا "بانیٔ انقلاب" ہونا بھی تاریخی اعتبار سے بہت کچھ محلِّ نظر ہے۔

طرزوں میں ایک حشرِ حلاوت لیے ہوئے　　ہے نغمہ بار تیری محبت لیے ہوئے

طرز کی جمع "طرزوں" ہی کچھ کم مضحکہ خیز نہ تھی کہ "حشرِ حلاوت" نے شاعر کی شعر گوئی کا رہا سہا بھرم بھی کھو دیا۔

ہر ورق اس کا دفترِ صنعت کردگار ہے　　اس کی ادائے جانفزا فلسفۂ بہار ہے　　(صفحہ ۱۲)

مصرعِ اولیٰ بحر سے خارج ہے اور دوسرے مصرعہ میں ادائے جانفزا کو جو "فلسفۂ بہار" کہا گیا ہے یہ بھی ایک عجوبہ ہے!

آئینہ جب بھی دیکھتے ہیں وہ　　پھول سا چہرہ اُتر جاتا ہے　　(صفحہ ۱۳)

دونوں مصرعوں کی بحریں مختلف ہیں۔

میں نہیں کہتا ترقی کا فسانہ چھوڑ دے　　میں نہیں کہتا کہ تو تعلیم پانا چھوڑ دے　　(صفحہ ۲۵)

اس شعر میں کتنی ناشستگی اور ناپختگی پائی جاتی ہے۔ قافیہ پورا کرنے کے لئے کوئی لفظ چاہیے تھا اس لئے "فسانہ" رکھ دیا گیا۔

رنگ میرا انتقامی فلسفہ یوں لائے گا

لفظ فلسفہ بار بار لایا گیا ہے اور اکثر جگہ بے معنی بلکہ مضحکہ خیز بن کر رہ گیا ہے۔

نظم "دخترِ چین" کے بعض شعر جاندار ہیں۔ مگر اس قسم کے شعروں نے ؎

محو تھیں اس کے چلانے میں شجاعت سے وہاں　　قوم کی ہمدرد و خادم چار چینی لڑکیاں

نظم کی شعریت کو غارت کر دیا۔ اس شعر میں "شجاعت سے" کے مکروہ تیور تو دیکھیے۔

اپنے ہاتھوں سے ترشوائے ہیں آذر ہم نے　　اپنی گودوں میں کھلائے ہیں پیمبر ہم نے

کاش شاعر کے اشعار اُن کے اس شعر کے جوڑ کے ہوتے!

انجمن ترقی اُردو لوتھرہ کے کارکنوں کے ذوق کو کیا کہیے کہ انہوں نے اس قسم کے مجموعۂ کلام کو چھاپنے کے لئے منتخب فرمایا!

نماز

"نماز" ضخامت ۳۰ صفحات (لکھائی، چھپائی، کاغذ ہر چیز دیدہ زیب) قیمت تین آنہ۔

ملنے کا پتہ:۔ محمد حسنی ۳۲ گوئن روڈ۔ لکھنؤ (یو، پی۔ بھارت)

کتاب پر ناشر کا نام تو ہے مگر مصنف و مرتب کا نام درج نہیں ہے۔ دیباچہ میں "عبد العلی" نام لکھا ہوا ملتا ہے۔ جو غالباً ڈاکٹر عبد العلی صاحب ہیں اور وہی اس کتابچہ کے مرتب معلوم ہوتے ہیں۔ نماز میں جو دعائیں اور سورتیں پڑھی جاتی ہیں، اُن کا نہایت ہی آسان اور عام فہم ترجمہ[1] اس میں دیا گیا ہے۔ ہائے! وہ نماز جو اس طرح پڑھی جائے کہ اس کے پڑھنے والے کو یہ تک

---

[1] "وتب" کا ترجمہ (اور وہ بلاک گیا) محلِ نظر ہے۔

ماہنامہ

فاران

ماہر القادری

جلد ۸ — نمبر ۴

ماہنامہ

فاران

جولائی سنہ ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

تاریخ میں ایک ایسا دَور بھی گزرا ہے کہ کُرۂ ارض پر ہم مسلمانوں سے زیادہ مُعزز اور اقبال مند کوئی قوم نہ تھی۔ فتحمندی اور کشور کُشائی ہمارے قشونِ قاہرہ کے جلو میں رہتی تھی اور کامیابیاں اور کامرانیاں ہمارے قدم چُومتی تھیں۔ خلافتِ الٰہی کی زمام ہمارے ہاتھوں میں تھی۔ اور انسانیت کے گلّہ کی پاسبانی ہم کرتے تھے۔ ساری دُنیا میں بس ہمیں ہم نظر آتے تھے۔ "خیر الامم" کا لقب سچ مُچ ہمیں زیب دیتا تھا۔

ہم اہلِ ایمان صرف فاتح اور کشور کُشا ہی نہ تھے۔ دُنیا ہمیں انسانیت کا سب سے بڑا غم خوار اور امن و فلاح کی کھیتی کا رکھوالا سمجھتی تھی۔ شرافت و آدمیت کی سند ہم سے لی جاتی تھی۔ علم و فضل کے سکّے ہماری مُہر اور ٹھپّہ کے بعد معتبر بنتے تھے۔ مظلوموں کے لئے ہم شبنم کی طرح رقیق القلب اور سراپا عجز و تواضع تھے اور ظالموں اور سرکشوں کے لئے ہماری ذات سنگِ خارا سے زیادہ سخت اور شعلوں سے بڑھ کر تند و گرم تھی!

ہمارا انصاف بے لاگ تھا، ہمارا اصولِ عدل اپنے اور پرائے میں تمیز کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہماری عدالتوں نے غیروں کی فریاد رسی اس طرح کی ہے کہ اپنوں کو سزائیں دی ہیں اور اُن پر حدیں جاری کی ہیں۔ ہمارا ابرِ کرم دوست دشمن کے کھیتوں میں امتیاز روا نہ رکھتا تھا ہم کہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" تھے اس لئے اللہ کی شانِ احسان و کرم کا اظہار ہماری ذات سے ہوتا تھا۔ دُنیا ہمارے قول و فعل پر اعتبار کرتی تھی اور ہمیں اپنا خیر خواہ اور غم خوار جانتی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے چراغ دُنیا کی محفلوں میں ہم نے روشن کئے ہیں۔ اور جہانبانی کے اصول دُنیا کو ہم نے سکھائے ہیں!

حکمت کو اپنی متاعِ گم شدہ سمجھ کر ہم نے جہاں بھی پایا، اُٹھا لیا۔ روم و یونان کے علوم کا نام و نشان بھی آج دُنیا میں باقی نہ رہتا اگر ہم علم و دانش کے ان موتیوں کی حفاظت نہ کرتے! علوم کی تحقیق و اکتشاف کی منزلوں کے امیرِ کارواں ہم تھے۔ ہمارے نقشِ قدم سے دُوسروں کو منزلوں کا سُراغ ملتا تھا۔ سائنس کی طرف دماغوں کی رہنمائی ہم نے کی اور صنعت و حرفت کی شاہراہوں میں

سنگِ میل ہم نے قائم کئے۔ پچھلی قوموں نے علم و حکمت کی جتنی مقدار بھی چھوڑی تھی ہم نے اُس میں ذرا سی بھی خرد بُرد نہیں کی۔ بلکہ اُن میں حیرت انگیز اضافے کئے۔ افادیت تو دُنیا میں ہمارا نام لے کر پھولتی پھلتی تھی۔ اور دُنیا میں رفاہِ عام کا وجود ہمارے دم قدم سے تھا!

آرٹ کی قدر و قیمت ہی کو نہیں اس کے حدود کو بھی ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے کہ اس کی شوخی اور رنگینی کس نقطہ پر پہنچ کر غیر سنجیدہ اور بازاری بن جاتی ہے۔ تفریح کو ہم نے جائز حدود میں تفریح ہی سمجھا۔ اُسے حاملِ زندگی نہیں بنایا۔ اس احتیاط کے باوجود محفلوں میں ہم سے زیادہ کشادہ جبیں اور خوش طبع کوئی نہ تھا۔ ہم نے "بارِ شاطر" بن کر لوگوں کے درمیان زندگی بسر کی "بارِ خاطر" بن کر نہیں!

ہمارا گھریلو ماحول ایک مثالی ماحول تھا۔ پوری فضا شرم و غیرت، پاکبازی اور ثقاہت سے لبریز! دُنیا نے عورت کے ناموس کی حفاظت کے طور طریق ہم سے سیکھے ہیں۔ ہمارے آئینوں میں دیکھ دیکھ کر قوموں نے اپنے کردار و سیرت کی زلفوں کی مشاطگی کی ہے۔ اخلاق کے معلم، نیکیوں کے مبلغ اور صداقت کے علمبردار دُنیا میں ہم تھے، ہماری امانت اور راستبازی کی لوگ قسم کھاتے تھے۔ ہماری بات پانی کی نہیں پتھر کی لکیر ہوتی تھی!

ظلم و ستم کو دیکھ کر ہماری جن آنکھوں سے غضب کے شرارے نکلتے تھے، وہی آنکھیں خدا کے خوف سے راتوں کی تنہائی میں اشکبار رہتی تھیں۔ ہم جفاکش، ایثار پیشہ، اور سختی اُٹھانے والے تھے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے کنواں کھودتے اور اُس سے خود بھی سیراب ہوتے اور دوسروں کی پیاس بھی بجھاتے، افلاس ہمیں خود فروش اور دولت ہمیں مغرور نہ بناتی تھی۔ ہم "اُمتِ وسط" ہونے کے سبب توازن و اعتدال کے تقاضوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے!

ہماری عزیمت و ہمت نے پہاڑوں کے ورق موڑ کر رکھ دیئے۔ ہمارے حوصلے کسی نازک سے نازک وقت میں بھی پست نہیں ہوئے، مایوسی ہماری کارگاہِ عمل میں قدم رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ تواضع میں ہم ہر قدم کی خاک تھے مگر عزت و جلالت اور خود داری میں ہم اتنے بلند تھے کہ شاہوں کے تاج ہمارے تلووں سے لگے رہتے تھے!

ہماری خوشی اور غم کا پیمانہ رضائے الٰہی تھا۔ ہمارا جینا اور مرنا صرف اللہ کے لئے تھا، اُسی کا خوف اُسی سے طمع! ہماری یہ پیشانی اپنے نبیؐ کی قبر کے آگے نہیں جھکی تو اور کسی کے آستانہ پر کیا جھکتی! خدا کے بعد ہمیں سب سے زیادہ محبت خدا کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تھی۔ حضورؐ ہی کے نقوشِ قدم ہمارے لئے دلیلِ راہ تھے۔ سنتِ نبویؐ کو ہم نے اپنی زندگیوں میں اُتار لیا تھا۔ یہ رشتہ، رشتۂ جاں سے بھی زیادہ ہمیں عزیز تھا۔ ہم نے حضورؐ ہی کی غلامی کی برکت سے بادشاہوں کے تخت و تاج کو اپنے پیروں سے روندا ہے اور دُنیا کی قیادت اور سیادت ہمارے گھر کی کنیز بن کر رہی ہے!

پردہ نشینانِ حرم عصمتِ مریمؑ کی وارث تھیں ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر — کہ در آغوش شبیرے بگیری

جن کی بے داغ زندگیوں کا مطمحِ نظر تھا۔ خدا کی یہ نیک بندیاں کسی غیر مرد کے نظارے کے لئے اپنے لباس کے ایک تار کو بھی مزین نہ بناتی تھیں۔ زینتِ محفل بننے کا تصور بھی بھولے سے اُن کے دل و دماغ میں نہ آتا تھا۔ اُن کے آغوش میں ایکٹر اور رقاص نہیں، مجاہد اور غازی پروان چڑھتے تھے۔

ہم ملت کے اجتماعی مفاد پر اپنے بڑے سے بڑے ذاتی فائدے کو بے دریغ قربان کر سکتے تھے۔ ہم میں اتحاد و اخوت اتنا

کہ ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی تسبیح کے دانے نظر آتے تھے۔ نسل و رنگ کے تمام امتیازات کو ہم نے اسلام کی وحدت میں سمو دیا تھا!

ہمارے علماء میں یہ جرأت تھی کہ امراء اور حکام کو اُن کی غلط کاریوں پر ٹوکتے۔ انہوں نے حق گوئی کی پاداش میں اپنے جسموں پر کوڑے کھائے ہیں اور قید و بند کے مصائب برداشت کئے ہیں!

اور اب! مگر اب ہم کیا ہیں؟ خزاں دیدہ پتّوں کی طرح بکھرے ہوئے کہ ہوا کا کمزور سے کمزور جھونکا ہمیں جہاں چاہتا ہے اڑا لے جاتا ہے۔ ہماری پراگندگی اور بکھرے ہوئے شیرازے کو دیکھ کر کوئی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ کبھی متحد تھے! فقہ کے نام پر، علمِ کلام کی بنیاد پر۔ رنگ و نسل اور جغرافیائی خطّوں کے امتیاز پر۔ رسم و رواج، بدعتوں۔ تصوّف کے خانوادوں اور سجادوں کے تنوع پر اور سیاست کے اغراض پر فرقے، جماعتیں، ٹولیاں اور پارٹیاں جو اب تک بن چکی ہیں اور بنتی رہتی ہیں اُن کی کوئی حد و نہایت ہے۔ اتحاد کی جگہ افتراق و تشتت نے لے لی ہے اور اُمت گروہوں میں بٹتی چلی جارہی ہے۔

عزت و اقبال ہمارا کب کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ہمارے در و دیوار پر ذلت و خواری کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ دنیا میں ہماری ساکھ گر چکی ہے۔ ہم سے معاملت کرتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں کہ یہ اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں کھا کر اور قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر نہ جانے کب زبان بدل جائیں!

ہم میں ایسے خود غرض لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی اغراض کی خاطر پوری قوم کو کھڑے کھڑے کھوٹے داموں پر بیچ سکتے ہیں۔ ہم میں ایسا ایسا منافق بھی موجود ہے جو اسلام کی ترقی دیکھ کر دل ہی دل میں جلتا اور آپ ہی آپ پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اور غیروں سے سازشیں کر کے اسلام کی راہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم میں وہ مجوسی سرشت لکھے پڑھے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے قلم و زبان سے اسلام کے بارے میں بدگمانی پھیلانے اور دلوں کو تشکیک، و بے یقینی کی راہ پر لگانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس تخریبی مشن پر انہوں نے "فکر و دانش" اور "تحقیق و آگہی" کا لیبل لگا رکھا ہے!

ہمارے اکابر اور حکمرانوں میں جمال ناصر اور انوار السادات جیسے ظالم، شقی القلب اور بے رحم لوگ بھی موجود ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی حق کی جگہ باطل کو لانا اور حق کے علمبرداروں کو مٹانا، برباد کرنا اور بے اثر بنانا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ بے ضمیر علماء ان ظالموں اور منافقوں کی ہم نوائی اور پذیرائی کے لئے موجود ہیں ۔۔۔ دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں!

ہمارے علماء[1] کرام کا اب یہ مشغلہ رہ گیا ہے کہ دین کے مخلص اور بے لوث خدمت گزاروں پر کفر و گمراہی کے فتوے لگائیں۔ اُن پر طرح طرح کی ناروا تہمتیں جوڑیں اور اُن کی تحریروں میں تحریف کر کے یا اُن سے عجیب و غریب نکتے تراش کر، مسلمانوں میں بدگمانی پھیلائیں!

ہم ایسے "بڑے لوگوں" سے بھی واقف ہیں جو مسلمانوں کے جلسوں میں علامہ اقبال کے کلام کے مفسر بلکہ مبلغ بن کر نمودار ہوتے ہیں اور "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" پڑھ پڑھ کر مسلمانوں کو اخوت کا درس دیتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں صوبائی تعصب کے بُت کدے قائم ہیں۔ اور جن کو سدا یہی فکر رہتی ہے کہ فلاں صوبہ کے لوگوں کا سرکار دربار پر کس عنوان سے غلبہ ہو اور اس کے لئے کیا چارۂ کار اختیار کیا جائے!

---

[1] علماء حق کو اس گروہ سے مستثنیٰ سمجھا جائے۔

قوم کی عورتوں میں بے حجابی اور آزادی دیبا کی کا وہ شوق پیدا ہوا ہے کہ اس طوفان بدتمیزی کو اگر جلد سے جلد چیک نہ کیا گیا تو پوری مسلم آبادی "فلم اسٹوڈیو" بن کر رہ جائے گی۔ شریف سے شریف گھرانوں پر بھی اس نحوست کی پرچھائیں پڑنے لگی ہے۔ وہ جو منہ دیکھے کی تھوڑی بہت شرم و آبرو رہ گئی تھی اب اس پر بھی شب خوں مارنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جن کا آنچل مہ و مہر بھی نہ دیکھ سکتے تھے اب وہ خود اپنے جسمانی حُسن کو طرح طرح سے نمایاں کر کے حریص نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

عین اُس وقت جبکہ مساجد میں جماعت کھڑی ہوتی ہے اور تکبیر کہنے والا "حی علی الصلوٰۃ" اور "قد قامۃ الصلوٰۃ" پکار رہا ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوان سینما ہالوں کے دروازوں پر ٹکٹ لینے کے لئے دھینگا مُشتی میں مصروف ہوتے ہیں۔ لہو و لعب، عیش و تفریح اور فسق و فجور کی آج گرم بازاری ہمارے دم سے ہے!

"صدقِ مقال" (؟) کا یہ عالم کہ ہم ذرا سے فائدے کے لئے بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اور "اکلِ حلال" (؟) کی یہ کیفیت کہ حرام و حلال کا امتیاز ہی سرے سے اُٹھتا جا رہا ہے۔ سٹہ، جوا، لاٹری، چور بازاری، جعل، فریب۔ غرض جس طرح بھی روزی کمائی جا سکتی ہے کماتے ہیں۔ اور شرم و ندامت کے پسینہ کی ایک بوند بھی ہمارے ماتھے پر نمودار نہیں ہوتی!

دفتری کاروبار کا یہ عالم ہے کہ چپراسی اپنا حق مانگتا ہے اور افسر اپنے لئے تحفہ طلب کرتا ہے۔ ہر طرف رشوت کا چلن ہے اور جلبِ منفعت کے دروازے کھُلے ہوئے ہیں!

دعویٰ یہ کہ ہم توحید پرست ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں اور ساری دُنیا میں توحیدِ خالص کی حامل صرف ہماری ذات ہی ہے مگر ہم میں کتنے ایسے ہیں جو قبروں کا طواف کرتے، آستانوں کو چومتے، چوکھٹوں پر سر رکھتے اور اہلِ قبور سے مدد مانگتے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی ہمارے بھائی بند مطمئن ہیں کہ ایسی مشرکانہ باتوں سے نہ توحید پر کوئی حرف آتا ہے نہ ایمان پر کوئی زد پڑتی ہے!

ہماری محفلیں ایک دوسرے کی غیبتوں کے لئے وقف ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو گرانے اور ذلیل کرنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔ اپنے کلمہ گو بھائی کے زوالِ نعمت کی خبر ہمارے لئے نویدِ مسرت ہوتی ہے!

ہم میں سے ہر کوئی اپنے رسُول کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ مگر عمل کی دُنیا میں ہماری محبت قدم قدم پر اپنے محبوب سے غداری اور بے وفائی کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات و احکام کی ہم کس نشاطِ خاطر کیساتھ خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ عجیب قسم کی محبت ہے کہ محبوب کی چاہت پر اپنی پسند کو ہم نے غالب کر رکھا ہے اور جن کو ہم اپنا آقا، حضور اور سرکار کہتے ہیں اُن کے فرمان کی عدمِ تعمیل کو ہم نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے!

آخرت کا، جنت و دوزخ کا اور گناہ و ثواب کے اجر و عقوبت کا ہم میں سے کوئی بھی منکر نہیں ہے۔ مگر ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اعمال و کردار میں محاسبۂ آخرت کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے! ہمارے اور منکرینِ خدا و آخرت کے مشاغل میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا!

ہم میں جو مذہبی لوگ ہیں اُن میں کتنے ایسے ہیں جو اقامتِ دین کے تقاضوں سے باخبر ہیں اور اُن کے اندر اللہ کے دین کو غالب کرنے کا ولولہ پایا جاتا ہے۔ نظامِ کفر کے سایہ میں اذانیں اور نمازیں ہوتی رہیں بس اسی کو انہوں نے دین کی اقامت، تبلیغ اور سربلندی کا ماحصل سمجھ رکھا ہے!

ہمارے حالات کو، مشاغل کو اور معاشرے کو دُنیا دیکھ دیکھ کر ہنستی ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے دین کو دینِ فطرت

کہتے ہیں اور جن کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کے سوا اور کوئی دوسری صراطِ مستقیم نہیں اور یہی ہدایت و فلاح کی راہ ہے، مگر یہ خود کہاں بھٹکے جا رہے ہیں۔ دعوے رہبری اور رہنمائی کے مگر رہزنوں اور بٹ ماروں کے سے چلن! سچ تو یہ ہے خود ہمارے وجود نے اسلام کو رسوا کر رکھا ہے۔ لوگ ہم نابکاروں اور نافرمانوں کی "خزاں" سے گلشنِ اسلام کی "بہار" کا اندازہ لگاتے ہیں۔

جھونپڑیوں سے لے کر قصر و ایوان تک خدا فراموشی کا ایک ہی رنگ ہے۔ غریب و امیر کی غفلتوں کا ایک ہی عالم ہے۔ ہماری زندگیوں کا ایسا کونسا رُخ ہے جس میں بگاڑ پیدا نہیں ہوا ؏

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اتنی بلندی اور ایسی پستی۔ وہ عروج اور یہ زوال۔ اُس "طربیہ" کے بعد یہ "حزنیہ"! اللھم احفظنا من الحور بعد الکور!

برخیز......!

یہ شامتیں خود ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہیں۔ ہم نے جو بویا اُسے کاٹ بھی رہے ہیں۔ ہماری غفلتوں، سرشاریوں اور بد اعمالیوں کا صلہ ہمیں مل رہا ہے!

اب کیا ہوگا؟؟ اگر ہم نے کسی اچھے تغیر کے لئے جد وجہد نہ کی اور قوم نے غفلت کو بیداری سے نہ بدلا تو ہمارے مسلمانوں جیسے نام اور یہ اصطلاحی اور قانونی "نسبتیں" ہمیں اس خوفناک زوال سے نہیں بچا سکتیں جس کی پرچھائیاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں!

ہمارے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنی اس نکبت اور زبوں حالی کو غنیمت سمجھے ہوئے ہیں۔ جن کے اندر اصلاح و انقلاب کا کوئی ولولہ اور کوئی اُمنگ نہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی ذلت جن کی رگِ حمیت و غیرت کو حرکت میں نہیں لاتی! ہمارا خطاب اُن افراد سے ہے جو ملت کے بگاڑ کا احساس اپنے اندر رکھتے ہیں اور اصلاح و انقلاب کی تڑپ جن کے اندر موجود ہے۔ ملت کا یہی وہ زندہ عنصر اور جوہر قابل ہے جس سے تغیرِ احوال کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ اور جن کی جد وجہد اللہ کے غضب کو رحمت سے بدل سکتی ہے

یہ اضطراب، یہ دھڑکن، یہ تپش، یہ بے تابی، یہ اخلاص اور لگن جہاں جہاں بھی پائی جاتی ہے اسے ایک قوتِ متحدہ بن جانا چاہیئے۔ منتشر ذرّوں کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں۔ جب یہ مل جاتے ہیں تو بہت بڑی چیز بن جاتے ہیں۔ اب یہ سوچنے کا وقت نہیں رہا کہ پہل کون کرے! اور پہل تو اللہ کے فضل سے ہو چکی ہے۔ ایسے مخلص، حق شناس اور باہمت لوگ میدانِ عمل میں آچکے ہیں جو اللہ کے دین کو غالب کرنے کا سودا اپنے سروں میں رکھتے ہیں۔ جو اسلامی انقلاب کی تحریک کے داعی ہیں۔ جنہوں نے انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اقامتِ دین کی جد وجہد کو جاری رکھا ہے۔ کوئی رکاوٹ انھیں اپنے مقصد اور مشن سے دل برداشتہ نہیں بناتی اور کسی مصیبت کو دیکھ کر وہ ہمت نہیں ہارتے۔ وہ آزمائشوں میں بھی ڈالے گئے ہیں مگر اُن کے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی!

خدا کے ان نیک اور مخلص بندوں کے پاس صرف جوش اور ولولہ ہی نہیں، دین کی صحیح فہم بھی ہے اور ساتھ ہی زمانہ کے تقاضوں سے بھی وہ پوری طرح باخبر ہیں۔ اسی تحریک سے، اسی جماعت سے اور اسی اندازِ فکر و عمل سے اقامتِ دین کی توقع وابستہ ہیں۔ آپ کو اسلام کی سربلندی مطلوب ہے تو اس تحریک کا ساتھ دیجئے۔

مگر ادھر آنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح سوچ لیجئے کہ "اقامتِ دین" کی تحریک کوئی وقتی اور ہنگامی تحریک نہیں ہے جو کسی سیاسی اور اقتصادی مقصد کو حاصل کرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ جس طرح نظامِ کائنات قیامت تک حرکت میں رہیگا اور اسکی افادیت ختم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح "اقامتِ دین" کی تحریک کو سکون و آرام کی فراغت اور فرصت نصیب نہیں۔ پھر اس راہ میں

نفس کے لئے کوئی لذت نہیں، یہ چٹخاروں کی نہیں ایثار اور جفاکشی کی راہ ہے۔ جہاں قدم قدم پر خطرے بھی ہیں۔ ادھر کا رُخ کرتے ہی سب سے پہلے تو بعض تنگ نظر مولویوں اور صاحبانِ دلق و سجادہ کی کفر ساز مشینوں کی چاندماری سے آپ کا سابقہ پڑے گا۔ آپ پر گمراہی اور بے دینی کی تہمتیں جوڑی جائیں گی۔ طنز کی جائے گی کہ آپ "محمدی اسلام" کو چھوڑ کر "مودودی اسلام" کی طرف جا رہے ہیں۔ اس راہ میں قدم رکھتے ہی کتنی لمبی ڈاڑھیاں، کتنی نیچی قبائیں اور کتنے سجادے آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کوئی کہیگا آپ "خارجی" ہو گئے ہیں۔ کہیں سے آواز آئے گی آپ "منکرِ حدیث" ہیں۔ مگر آپ کو یہ سفر جاری رکھنا ہے تو زہر کے ان جرعوں کو گوارا کرنا ہوگا!

پھر آپ کو حق و باطل کی مستقل کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا جس میں ہر مصیبت پیش آسکتی ہے اور آنی چاہیئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور نبیوں جیسے محبوب ترین بندوں کے لئے اس خارزار کو پھولوں کی سیج اور فرشِ گل نہیں بنایا تو آپ کیلئے اللہ کی سنت کس طرح بدل سکتی ہے! اور یہ تو وہ دَور ہے جب دہکتے ہوئے انگارے کو مٹھی میں پکڑنا آسان ہے مگر دینِ حق پر جمے رہنا مشکل ہے۔ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

بدر و اُحد کے شہیدوں کا خون کربلا کے میدان میں حق پرستوں کے خون سے جا کر ملا۔ اور پھر یہ ایک مستقل سنت بن گئی۔ امام احمدؒ بن حنبل کا دَور ہو یا علامہ ابن تیمیہؒ کی صدی۔ مجدد الفؒ ثانی کا عہد ہو یا سید احمد شہیدؒ کا زمانہ۔ یہ سوزِ عشق اور سودائے محبت ہمیشہ گردش میں رہا ؎

ابھی ہے اس حقیقت سے چراغِ صبح بیگانہ
کہ سوزِ عشق گردش میں ہے ہر پروانہ بر پروانہ!

اور ہمارے زمانہ میں حسن البناؒ کے خونِ ناحق نے اس محضر پر شہادت کی مُہر ثبت کردی، پھر عبدالقادر عودہؒ، طلعت مجبوؒر، فرغلیؒ اور دوسرے شہیدوں نے حق و صداقت کی تاریخ میں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ لاہور کے پھانسی گھر نے ان کڑیوں کو مربوط کر دیا ع

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

اگر آپ کو سچے دل سے اسلام کی سربلندی مطلوب ہے تو پھر اقامتِ دین کی تحریک کا ساتھ دیجئے اور اللہ کے دین کو غالب کر کے تمام دُنیا کو امن و عافیت سے معمور کر دیجئے کہ تخریبی انقلابات سے دُنیا تنگ آچکی ہے اور اب وہ تعمیر و اصلاح کی بنیاد پر انقلاب چاہتی ہے۔ جس کے آغوش میں انسانیت کو آسودگی میسر آسکے!

جو لوگ کسی عزم و حرکت کے بغیر محض دعاؤں سے انقلاب چاہتے ہیں وہ دعا کی غرض و غایت سے بے خبر ہیں۔ دعا کی اہمیت کا کوئی مسلمان منکر نہیں ہو سکتا کہ ہر تدبیر کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے مگر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ امام انس و جان اور محبوبِ ربِ کون و مکان نے بدر کے میدان میں جب دعا مانگی تھی تو اس پر آمین کہنے کے لئے مجاہدوں کی تلواریں بھی موجود تھیں۔ "دعائے بے تدبیر" راہبوں کا شیوہ ہے اور "تدبیر بے دعا" خدا کے باغیوں کی روش ہے۔ اور ہم ان میں سے کسی مسلک کو قبول نہیں کر سکتے۔ اپنی تمام توانائیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگاتے رہنا اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے فوز و فلاح کی دعا کرتے رہنا۔ یہ ہے بندۂ مومن کی وہ صحیح روش جس کو انبیاءِ کرام نے اختیار فرمایا ہے اور اسی راہ پر ہمیں بھی چلنا ہے اور اس راہ میں گامزن ہونے کی توفیق ہی اس منزل کی کامیابی ہے!

حق و صداقت کو تاریخ کے ہر دَور میں آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ غرض کے بندوں اور خواہشوں کے پجاریوں نے اہلِ اخلاص

کی مظلومیت کو ہمیشہ اپنے لئے سنہری موقع سمجھ کر بڑی بڑی ہولناک دست درازیاں کی ہیں۔ جس ناپسندیدہ شخص کے ہاتھ میں جب بھی اقتدار آگیا ہے، اُس نے جان توڑ کوشش کی ہے کہ اُس کی کُرسی اقتدار کی چُول بھی ہلنے نہ پائے۔ اور وہ زندگی کے آخری سانس تک "مالکِ رقابِ اُمم" بنا رہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ایسے شخصوں کو قدرت کی طرف سے ڈھیل دی گئی ہے۔ ایسے دَور آتے رہے ہیں کہ غرض پرستیوں کو عروج حاصل ہوا ہے اور اخلاص و وفا گلی گلی ٹھوکریں کھاتے پھرے ہیں۔ مگر جب پاپ کا گھڑا بھر چکا ہے اور اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے تو پھر غلط کاروں کو خدائے قادر و جبار نے اس قدر سخت پکڑا ہے کہ سطوت و شکوہ کے تخت اوندھے ہو گئے ہیں! اگر "تلک الایام نداولها بین الناس" کا الٰہی قانون جاری نہ ہوتا تو پھر آج ساری دُنیا نمرود، فرعون، ہامان، نیرو اور حجاج ہی کے خاندانوں کی غلامی میں ہوتی!

اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت و تکوین اپنا کام بہرحال انجام دیتا رہتا ہے۔ لیکن ہر عروج و زوال میں ظالم و مظلوم دونوں کا امتحان ہوتا ہے کہ کون "حق" کے لئے کیا پارٹ ادا کرتا ہے۔ حق شناسی کا یا حق ناشناسی کا! حق کی اطاعت کا یا حق کی نافرمانی کا!

آج بھی تمام دُنیا میں حق و باطل اور خیر و شر کا معرکہ گرم ہے۔ ہر شخص اپنے حالات، اپنی نیت اور اپنے مقصد کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے۔ تخت نشین ہوں یا خاک نشین سب کو سوچنا چاہیئے کہ وہ حق کا ساتھ دے رہے ہیں یا باطل کی رفاقت کر رہے ہیں۔ اُن کی ذات سے خیر کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا شر کو! "فرعونیت" اپنے جاہ و جلال اور لاؤ لشکر پر نہ اترائے کہ "ضربِ کلیمی" اُسے دُنیا کے لئے افسانۂ عبرت بنا سکتی ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں اُن لوگوں کی پرچھائیں سے بھی دُور رکھے جن پر اُس کا غضب نازل ہوا ہے۔ ہمیں اُن نفوسِ قدسیہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جن پر اُس کی نعمتیں ابرِ بہار بن کر برسی ہیں۔ (آمین!)

ماہر القادری

۲۴ جون ۱۹۵۶ء

سرورِ کائنات کے معجزات

(ملّا واحدی کی زیرِ ترتیب کتاب "حیات سرورِ کائنات" حصّہ دوم کا ایک مضمون)

حیات سرورِ کائنات حصّہ اوّل کے ابتدائی صفحات میں ایک مضمون ہے۔ جس کا عنوان ہے "اہلِ عرب سرورِ کائنات سے قبل" اُسے پڑھیے اور دیکھیے کہ جب ساری دُنیا پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور عرب اندھیرے کے اعتبار سے دُنیا کا سرتاج تھا۔ اُس وقت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو پیدا کیا گیا۔ اور پھر حضورؐ کو باپ، ماں اور دادا کی سرپرستی سے یکے بعد دیگرے محروم کر دیا گیا۔ تاکہ جو اُلٹی سیدھی تربیت مل سکتی ہو وہ تک نہ ملے۔

لکھنا پڑھنا اوّل تو اور عرب کون سا جانتے تھے۔ لیکن حضور نے حروف شناسی کا موقع بھی نہیں پایا۔ حضورؐ بچپن میں اپنی انا بی بی حلیمہ کے بچوں کے ساتھ بکریاں چراتے رہے۔ جوانی میں تجارت کرنے لگے، تجارتی قافلوں کے ساتھ باہر گئے تو زیادہ سے زیادہ شام گئے۔ روم، ایران اور مصر نہیں گئے۔ جو اُس وقت کے ملکوں میں نسبتاً تہذیب یافتہ تھے۔ اور چلے جاتے تو وہاں ایسا کیا سبق مل جاتا کہ حضورؐ یکایک کُل عالم کو سبق سکھانے کے قابل ہو جاتے۔ تمام انبیاء تو ایک ایک قطعہ زمین کی رہنمائی کرتے آئے تھے۔ حضورؐ ساری دُنیا کی رہنمائی فرماتے اور معاشرت و معیشت، قانون و سیاست، تہذیب و تمدّن۔ مذہب و اخلاق کی ایسی باتیں بتلاتے جن کا چالیس سال کی عمر سے پہلے خود حضورؐ کو علم نہ تھا اور جن کا اُس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا۔ اور معلومات کا ایسا ذخیرہ چھوڑ جاتے جنہیں اُس وقت عرب کیا دُنیا میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ ہمارا رسول تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

حضورؐ کی تعلیم اور حضورؐ کی صحبت نے تیئیس ۲۳ سال کے اندر اندر جاہل اور سرکش عربوں کو جیسا آدمی بنا دیا اُس پر ذرا غور فرمائیے۔ اُسے معجزہ نہ کہیے گا تو کیا کہیے گا۔ حضورؐ پارس تھے، جو حضورؐ سے چھو گیا سونا بن گیا۔ آج کل تبلیغ کے جتنے وسائل ہیں، مدرسے، کالج، تار۔ ٹیلیفون، ریڈیو، اخبار، رسالے، کتابیں، ریل، ہوائی جہاز۔ ان وسائل کا چودہ سو برس پہلے انسان تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ کیا اب ان وسائل کی موجودگی میں اور دولت و حکومت کی مدد لے کر حضورؐ کے برابر کامیاب ہوا جا سکتا ہے؟

عرب میں نہ دولت تھی نہ حکومت اور اگر تھی تو حضورؐ کے پاس نہیں تھی۔ اُن کے پاس تھی جو گوارا نہیں کرتے تھے کہ حضورؐ جہالت و وحشت کو دُور کریں اور تہذیب و تمدن پھیلائیں۔ ضابطوں، قاعدوں میں اُنھیں جکڑیں۔ چوری، رہزنی، قتل، خونریزی، شراب، جوئے اور زنا سے انھیں روکیں۔ انھیں سوتیلی ماؤں سے نکاح نہ کرنے دیں۔ مادرزاد برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کرنے دیں۔ پتھروں، درختوں اور سیاروں وغیرہ کی پرستش نہ کرنے دیں۔ مگر حضورؐ کے مخالفوں کی دولت اور مخالفوں کا اقتدار دونوں دھرے رہ گئے اور بالآخر حضورؐ نے انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کر ہی دیا۔ اتنی روشنی میں کہ جس تعلیم کے وہ مخالف تھے اُسے وہی دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلاتے پھرے اور کیسی سُتعدی سے پھیلاتے پھرے، مخالف دو چار نہ تھے۔ ملک کا ملک مخالف تھا! اور پھر ملک کا ملک حضورؐ کی تعلیمات کا

دل وجان سے فدائی بلکہ اس کا مبلغ و منّاد ہوگیا۔

مخالفوں نے حضورؐ سے کہا کہ ہمیں ہماری قدیم روش پر چلنے دو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں گے اور اگر تم باز نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ حضورؐ نے بادشاہت کو ٹھکرادیا اور ظلم پر ظلم سہنے قبول کئے اور مسلسل اکیس برس ظلم سہے اور پھر اُن ظلم کرنے والوں کو جنہوں نے حضورؐ کو لہولہان کیا تھا۔ جنہوں نے حضورؐ کو وطن سے بے وطن کیا تھا۔ جنہوں نے حضورؐ پر فوج کشیاں کی تھیں، انسانیت کی انتہائی بلندی پر جا بٹھایا جانوروں سے بدتر لوگ فوق البشر قسم کے انسان بن گئے۔ ایسے انسان جن کی نظیر نہیں ملتی۔ کیا بادشاہت کو ٹھکرادینا اور مظالم کو قبول کرنا اور دشمنوں کو دین و دُنیا کی نعمتوں سے مالا مال کردینا اور خود دُنیا کا ذرا سا آرام نہ اُٹھانا معجزہ نہ تھا۔

بقول حضرت عیسیٰ علیہ السلام درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں، کُل نبیوں کا سب سے بڑا معجزہ اُن کی نبوت سے قبل زندگی تھی، نبوت سے قبل کا کیرکٹر اور نبوت سے قبل کے حالات اُن کے دعوے کی صداقت کو ثابت کرتے تھے۔ لیکن سمجھنے والے، صدیقین اور صالحین ہی اسے سمجھ سکتے تھے[1] اور نہ سمجھنے والے اور اور معجزے مانگتے رہتے تھے اور وہ معجزے دیکھ کر بھی عموماً ایمان نہ لاتے تھے۔ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ○ اِن (منکرین خاتم النبیین) سے پہلے کی جن جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا ہے اُن میں کوئی بھی (ہلاکت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد اپنے زمانہ کے پیغمبر پر) ایمان نہیں لایا تھا۔ تو کیا یہ (آجکل کے ایمان نہ لانے والے خرق عادت اور حسّی معجزوں کی وجہ سے) ایمان لے آئیں گے۔ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ط اور ہم حسّی معجزے بھیجیں تو ہمارا ہاتھ کون پکڑتا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ (ایمان لانے والے یہ معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لایا کرتے) پچھلے لوگوں نے حسّی معجزے ہی تو جھٹلائے تھے۔

تاہم اتمام حجت کے لئے نبیوں اور رسولوں کو حسّی معجزے دیئے ضرور گئے اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حال میں مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حضورؐ کو بھی خرق عادت اور حسّی معجزے ملے۔

ہمیشہ سے تین قسم کے آدمی ہوتے رہے ہیں۔ ایک حضرت خدیجہؓ، حضرت زیدؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ جیسے۔ جنہیں حسّی معجزوں کی قطعی احتیاج نہیں تھی۔ دوسری قسم میں ابولہب اور ابوجہل ہیں کہ مرتے مرگئے۔ لیکن کسی دلیل، کسی نشانی اور کسی معجزے نے اُن کی آنکھوں کے آگے سے پردہ نہیں ہٹایا۔ وہ معجزہ دیکھتے تھے تو اُسے جادو کہہ دیتے تھے۔ تیسری قسم درمیانی حضرات کی ہے کہ حسّی معجزات سے اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور اُن کے ایمان مستحکم ہوگئے۔

معجزے نبیوں اور رسولوں کو حالات اور وقت کے مناسب دیئے جایا کرتے تھے۔ حضورؐ کو حضورؐ کے حالات اور وقت کے مناسب

---

[1] مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

رُوئے و آواز پیمبر معجزہ است — در دلِ ہر اُمتی کز حق مزہ است

جو حق وصداقت کی لذت سے آشنا ہوتا ہے اس کا دل تو پیغمبر کے چہرہ اور پیغمبر کی آواز میں اعجاز دیکھ لیتا ہے۔

دید و نفزود ش ازاں الّا کہ شک — معجزہ جست از نبی بوجہل سگ

ابوجہل کتّے نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزہ کا مطالبہ کیا اور معجزہ دیکھ کر اُس کے کفر میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

گفت ایں رو خود نہ گوید غیر راست — لیکن آں صدیق حق معجز نخواست

لیکن ابوبکر صدیقؓ معجزہ کے طالب نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ چہرہ بھلا سچ کے سوا کیا بول سکتا ہے۔

معجزے دیئے گئے۔ تمام نبیوں اور رسولوں کا حلقہ اور کام محدود تھا۔ حضورؐ ساری دنیا کے لئے آئے تھے، اور آخری پیغمبر ہو کر آئے تھے۔ لہٰذا حضورؐ کے معجزے ایسے ہیں جن کا اعجاز تا قیامت باقی رہیگا۔ اور جوں جوں انسان کی عقل اور انسانیت ترقی کرے گی ووں ووں حضورؐ کے معجزے چمکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بن گیا اور جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کوڑھیوں کو تن درستی اور مُردوں کو زندگی دلوائی، مگر ان معجزوں کا نتیجہ کیا نکلا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور پچھلے جملہ نبی اور رسول دُنیا سے رخصت ہونے لگے تو اُن کے کتنے پیرو تھے۔ اور وہ پیرو بھی ان عظیم المرتبت پیغمبروں سے کیا اتنے متاثر ہوئے جتنا ہونا چاہیئے تھا۔ پھر ان پیغمبروں کے معجزوں کو اُسی زمانے کے لوگوں نے دیکھ لیا سو دیکھ لیا۔ آج ان معجزوں کا انکار اقرار کی نسبت آسان ہے۔ برخلاف ازیں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وقتی معجزے بھی ملے۔ مثلاً معجزہ شق القمر۔ اور دائمی معجزہ بھی ملا۔ یعنی قرآن مجید۔ حضور زندہ نبی ہیں اور حضورؐ کا معجزہ زندہ معجزہ ہے!

معجزہ کی اصطلاح بعد کے حضرات نے تجویز کی ہے۔ قرآن یا حدیث میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ قرآن اور حدیث میں بجائے معجزہ کے آیت، حجت، برہان اور سلطان کے الفاظ ہیں۔ یا تائید اور نصرالٰہی کہا گیا ہے۔ جامع لفظ آیت ہے۔ آیت کے معنی ہیں علامت۔ نشانی، شناخت کی علامت ونشانی۔ دُنیا میں جتنی چیزیں ہیں علامتوں اور نشانیوں سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ یہ فلاں شخص ہے۔ یہ فلاں جانور ہے۔ یہ فلاں پھل ہے، یہ فلاں پتھر ہے۔ یہ اچھا ہے۔ یہ بُرا ہے۔ اگر علامات ذہن میں نہ ہوں تو انسان کسی چیز کی بابت کچھ نہیں بتا سکتا۔ وہ انسان اور حیوان میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ بُرے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اللہ اور اللہ کے پیغمبروں کے پہچاننے کے لئے آیت کا لفظ خاص طور سے اور اصطلاحاً بولا جاتا ہے۔

انسان فقط اُن چیزوں پر حیرت کا اظہار کیا کرتا ہے جنہیں وہ روزمرہ نہیں دیکھتا۔ حالانکہ حیرت کے لائق اللہ کی ایک ایک صنعت ہے۔ قرآن اور حدیث اللہ کی صنعتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ چاند کا طلوع ہونا۔ پھر بڑھنا اور گھٹنا۔ رات بھر چمکنا اور دن بھر غائب رہنا۔ مستقل اور دائمی آیت ہے اور چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا وقتی اور عارضی آیت۔ جس اللہ میں چاند کو بنانے اور نظم کے ساتھ قابو میں رکھنے کی قدرت ہے اُس میں چاند کے دو ٹکڑے کر دینے کی بھی قدرت ہے اور یہ بھی قدرت ہے کہ ایسا واقعہ ظہور میں لائے اور اس کے باوجود نظام عالم میں فرق نہ آنے دے۔ مستقل اور دائمی آیات اللہ کی پیدا کی ہوئی تمام چیزیں ہیں۔ رات، دن، سورج، چاند، آسمان، زمین، پہاڑ، سمندر، بارش، بجلی، نر، مادہ، چوپائے، چرند، پرند، خود تمہاری پیدائش۔ تمہارا پلنا، تمہاری زبانوں اور رنگوں میں اختلاف، غرض کس کس چیز کا نام لیا جائے، گنوایا نہیں جا سکتا۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ۔ اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی نشانیوں کو نہ مانے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

مستقل اور دائمی آیات وقتی اور عارضی آیات کی صداقت کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہیں۔[1]

بہر حال اسلام عارضی اور غیر عارضی دونوں کو آیات کہتا ہے۔ ہم غیر عارضی آیات کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عارضی وہ وقتی

---

[1] پیغمبروں کے معجزے اللہ کے قبضہ میں تھے۔ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ۔ پیغمبر اپنے اختیار سے اور اللہ کی مرضی اور مشیت کے بغیر معجزے نہیں دکھا سکتے تھے۔ مَا کَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ۔

آیات و معجزات سے دیکھنے والوں نے اثر لیا بھی اور نہیں بھی لیا اور اب نہ دیکھنے والے اُن کے متعلق شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔ کہ بھلا یہ کیونکر ہوا ہوگا۔ اتنی بڑی زمین کے معلق چکر کھانے پر عقل نہیں چکراتی۔ لیکن اگر بیان کیا جائے کہ اللہ چھوٹا سا گولا معلق رکھ سکتا ہے اور اُسے معلق حالت میں گردش دے سکتا ہے تو عقل کو گھمیری آ جاتی ہے۔ اللہ کے ادنیٰ کارناموں کو مانتے ہوئے ہم ہچکچاتے ہیں اور سٹپٹاتے ہیں۔ حالانکہ سٹپٹانے کے لائق تو زمین اور زمین کے اوپر کا ذرہ ذرہ ہے۔ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ - وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ - ماننے والوں کے واسطے زمین میں آیات ہی آیات ہیں۔ خود تمہارے وجود میں آیات ہیں۔ تم انھیں آنکھیں کھول کر دیکھتے نہیں ـــــ!

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ صرف عقل سے اپنے کو پہچنوانا اور اپنے احکام کو منوانا چاہتا تھا۔ لیکن کم عقلوں اور کٹ حجتوں نے مطالبہ کیا کہ نہیں، قدیم قسم کے معجزے ہی لاؤ۔ ہمارے نزدیک صداقت کا معیار خارقِ عادات واقعات ہی ہیں۔

ایک دور تھا کہ انسان افعالُ اللہ سے اتنا متاثر تھا کہ اُس نے افعال اللہ کو اللہ قرار دے دیا۔ اُس دور کی یادگاریں آگ، پانی، درخت اور پہاڑ کی پرستش کی شکل میں ابھی تک موجود ہیں۔ اُس دور کے انسان افعالُ اللہ کے سامنے اللہ کو بھول گئے۔ وہ اللہ کی بجائے اللہ کے مظاہر کی پرستش کرنے لگے۔ پھر ایک دور آیا کہ افعالُ اللہ کے ساتھ مساوات ہو گئی اور اللہ کے پیمبر بھٹکے ہوئے لوگوں سے راہِ راست پر آنے کے لئے کہتے تو اُن سے خواہش کی جاتی کہ اللہ کے نئے کرشموں کا مشاہدہ کراؤ۔ لیکن حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت نے تیسرے دور کا آغاز کیا۔

حضورؐ کی بعثت کے وقت نوعِ انسان اس قابل ہو چکی تھی کہ اُس کے بچپنے اور جوانی دیوانی کی ذہنیت بدل جائے اور اُس میں پختہ کاری آئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اب نوعِ انسان سے اُسی طرح خطاب فرمایا جس طرح پختہ عمر والوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ فرمایا:۔ قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ (اے محمدؐ!) کہہ دو۔ میرا طریق یہ ہے کہ میں اللہ کی جانب (عقل اور) بصیرت کے ذریعہ بلاتا ہوں۔ میرا اور جو میرے نقشِ قدم پر چلتا ہے اس کا طریق کار یہی ہے۔ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ جسے ہلاک ہونا ہے وہ اتمامِ بیّنات کے بعد ہلاک ہو اور جسے جینا ہے وہ بیّنات دیکھ کر جئے۔ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ - اللہ کی نگاہ میں بدترین حیوان وہ انسان ہیں جو بہرے اور گونگے ہو گئے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

معجزہ طلبی پر ارشاد ہوا:۔

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ -

(اے محمدؐ!) جب تم اُن کے پاس کوئی (خرقِ عادت) نشانی (معجزہ) لے کر نہیں جاتے تو وہ (از راہِ طنز) کہتے ہیں۔ نشانی اپنے جی سے کیوں نہ گھڑ لی۔ کہہ دو کہ میں تو اُس وحی کی تعمیل کرتا ہوں جو میرا پروردگار مجھے بھیجتا ہے۔ (اپنے جی سے کچھ نہیں گھڑتا)

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بصیرتوں کا مجموعہ ہے اور جو اہلِ یقین ہیں اُن کے لئے باعثِ ہدایت و رحمت ہے۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ

مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۝

(ذرا) بنی اسرائیل سے پوچھو (تو) ہم نے انھیں کیسی کیسی (خرق عادت) نشانیاں دکھائی تھیں۔ (انھیں دیکھ کر بھی تو وہ راہ ہدایت پر قائم نہ رہے) اور جو اللہ کی رحمت آنے کے بعد اُسے (شقاوت سے) بدل ڈالے تو یاد رکھو اللہ سزا دینے میں بڑا سخت ہے۔ (اس کے بعد عذاب آتا ہے)

وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ‌ؕ وَلَـئِنۡ جِئۡتَهُمۡ بِاٰيَةٍ لَّيَـقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُبۡطِلُوۡنَ‏ - كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ‏ -

اس قرآن میں ہم نے بنی نوع انسان کے فائدہ اور ہدایت کی ساری باتیں بیان کردی ہیں (جنھیں فائدہ اٹھانا اور ہدایت یاب ہونا ہوگا وہ فائدہ اٹھالیں گے اور ہدایت یاب ہوجائیں گے) اور جنہوں نے راہ انکار اختیار کررکھی ہے، اُن کے پاس تم کیسی بھی نشانی لے جاؤ وہ یہی کہیں گے کہ تم (اور تمہارے متبع) سب غلط راہ پر گامزن ہو۔ (حقیقت یہ ہو کہ) اللہ اوندھی عقل والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

اِنَّمَا يَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ يَسۡمَعُوۡنَ ؕ‌ وَالۡمَوۡتٰى يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ۔

تمہاری پکار کا وہی جواب دے سکتے ہیں جو تمہاری پکار (سُنتے ہیں۔ لیکن جو (سرے سے) مُردہ ہیں (اُن سے جواب کی کیا اُمید لگاتے ہو) انھیں تو (بس) اللہ (قبروں سے) اٹھائے گا اور وہ اُس کے پاس لوٹائے جائیں گے۔ (اور اُس وقت جو دیکھنا ہے دیکھ لیں گے)

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَـئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا‌ ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰيٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ وَمَا يُشۡعِرُكُمۡ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ‏ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفۡـــِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝ وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ الۡمَلٰۤـئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الۡمَوۡتٰى وَحَشَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ كُلَّ شَىۡءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ ۝

اور یہ (کفار) اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی (خرق عادت) معجزہ انھیں دکھادیا جائے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے ——— (اے محمد!) تم جواب دے دو کہ معجزے اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ (میرے قبضہ میں نہیں ہیں) تمہیں کیا معلوم، معجزہ دکھادیا جائے تو بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (کیونکہ خود ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں) ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو اُلٹ دیں گے (یہ خرق عادت معجزے بھی دیکھیں گے تو انکار ہی کریں گے) جس طرح قرآن پر اول دن ایمان نہیں لائے تھے (اُسی طرح خرق عادت معجزوں کا اِن پر اثر نہیں ہوگا) ہم انھیں (اُن کے حال پر) چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں (سر پھوڑتے اور) بھٹکتے پھریں۔ یقین جانو، ہم اِن پر فرشتے اُتار دیتے یا (ایسا کرتے کہ قبروں کے) مُردے (اٹھ کر) اِن سے باتیں کرنے لگتے اور جتنی چیزیں بھی دُنیا میں ہیں سب کو اِن کے سامنے (گواہی میں) لاکھڑا کرتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے (ہاں اگر اللہ کی مشیت ہو (تو اُس کی قدرت سے کچھ باہر نہیں ہے۔ لیکن اللہ نے چند قاعدے قوانین بنا رکھے ہیں) جنھیں اِن (لوگوں) میں سے اکثر سمجھتے نہیں (اللہ ایسا خرق عادت معجزہ لا سکتا ہے کہ پھر اقرار کے سوا چارہ نہ رہے۔ مگر اُس سے عقلوں اور طبیعتوں کی آزمائش کیا ہوگی۔ اللہ رضا و رغبت کا ایمان چاہتا ہے۔ جبر و اکراہ کا ایمان نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ اب صورت یہ ہو کہ اللہ کی ہدایتیں بار بار نہیں آئیں گی۔ جو جو ہدایتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں وہ قیامت تک کے واسطے ہیں۔ اللہ معجزہ مانگنے والوں کی مرضی کے مطابق معجزہ دکھا بھی دے تو اُسے موجودہ آدمی دیکھ لیں گے۔ وہ معجزہ قیامت تک نہیں چلے گا۔ قیامت تک صرف قرآن اور قرآنی تعلیمات کا معجزہ ہی چل سکتا ہے)

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ اَوۡ يَاۡتِىَ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ‌ ؕ

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ
فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ○

یہ (خرق عادت معجزے مانگنے والے) کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ فرشتے اُتریں یا تمہارا پروردگار اِن کے روبرو آجائے۔ یا تمہارے پروردگار کی بعض (ایسی) نشانیاں ظاہر ہوجائیں (جو قیامت کے دن ہوتی ہیں)، تو (اے محمدؐ! انھیں بتادو کہ) جس روز تمہارے پروردگار کی وہ نشانیاں ظاہر ہوں گی اُس روز کسی شخص کو، جو پہلے سے ایمان قبول نہ کرچکا ہوگا۔ یا ایمان کی حالت میں اُس نے نیکی نہ کمائی ہوگی۔ ایمان لانے سے خاک فائدہ نہیں ہوگا (اُس روز کا ایمان غیر معتبر ہے۔ اے محمدؐ!) تم (ان سے) کہہ دو کہ جاؤ انتظار کئے جاؤ۔ ہم بھی (فیصلے کے وقت کے) منتظر ہیں۔

حسّی اور خرق عادت معجزات کو اہمیت نہ دینے اور دُنیا کا رُخ تفکّر و تدبّر کی طرف پھیرنے کے باوجود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے ایسے افعال سرزد ہوتے رہتے تھے۔ جن کی بابت ارشاد ہے۔ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ وَقَالُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ۔ جب وہ (یعنی کفار) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کھُلا جادو ہے[1]۔

---

[1] دُنیا کا رُخ تفکّر و تدبّر کی طرف پھیرنے کے علاوہ حسّی اور خرق عادت معجزات کو اہمیت نہ دینے اور اُن کا مطالبہ کرنے پر جھنجلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پیغمبروں سے مداریوں کے سے کرتب اللہ تعالیٰ نے کبھی نہیں کرائے۔ پیغمبروں سے معجزے خود بخود سرزد ہوتے رہتے تھے۔ فرمائشی معجزے دکھانے سے ہر پیغمبر نے تامّل کیا۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی "انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے تمام انبیاء سے زیادہ معجزات اور نشانیاں دکھائیں۔ تاہم فریسی یہودیوں میں معجزہ کی تشنگی باقی ہی رہی اور ہر ملاقات میں انہوں نے معجزہ کی نئی فرمائش کی۔"

انجیل میں ہے:۔

"تب فریسی نکلے اور اُس سے (حضرت عیسیٰؑ سے) حجّت کرکے اس کے امتحان کے لئے کوئی آسمان سے نشان چاہا۔" (مرقس ۸-۱۱)

حضرت عیسیٰؑ نے آہ سرد بھر کر فرمایا:۔

"اِس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائیگا۔" (مرقس ۸-۱۲)

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ نے کسی گونگے کو اچھا کیا۔ بعض آدمیوں نے کہا۔ "یہ بعل زبول دیوتا کی مدد سے ایسے عجیب کام کرتا ہے اور اوروں نے آزمائش کے لئے اُس سے (حضرت عیسیٰؑ سے) ایک آسمانی نشان مانگا۔" (لوقا ۱۱-۱۶)

حضرت عیسیٰؑ نے جواب میں فرمایا۔ "اس زمانے کے لوگ بُرے ہیں، وہ نشان ڈھونڈتے ہیں، پر کوئی نشان ان کو نہیں دیا جائیگا۔ مگر یونس نبی کا نشان۔" (لوقا ۱۱-۲۹)

غرض حضرت عیسیٰؑ سے یوں تو معجزے سرزد ہوتے تھے مگر فرمائشی معجزوں سے انہوں نے بالعموم انکار کیا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل کی تباہی دیکھنی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن سے آسمانی خوان اُتروانے کی فرمائش کی گئی تو اللہ نے کہا:۔

"میں یہ آسمانی خوان تم پر اُتار تو سکتا ہوں۔ لیکن اُس کے بعد بھی اگر تم میں سے کسی نے انکار کیا تو میں اُسے ایسا سخت عذاب دوں گا۔ جو دُنیا میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔" (مائدہ - ۱۵)

پیغمبر اگر فرمائشی معجزے دکھانے لگتے تو پھر انھیں اُس کام کی فرصت تو ملتی نہیں جس کیلئے وہ بھیجے گئے تھے۔ بس دن رات معجزے ہی دکھائے جاتے اور تماشہ بن جاتے، ایک کے بعد دوسری فرمائش ہوتی اور دوسری کے بعد تیسری۔ پیغمبروں کو پیغمبری کی فرصت نہ ملتی اور معجزے مانگنے والوں کو عذاب سے بچنے کی مہلت نہ ملتی۔ حضور (صلعم) کی انگلیوں سے چشمہ بہ نکلا اور اشارے سے درخت چلے۔ مگر فرمائش پر حضورؐ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔

ان معجزات کا قرآن مجید میں بھی ذکر یا اشارہ ہے اور احادیث میں تو پوری تفصیل ہے۔ مثلاً غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کفار سے ایک تہائی تھی۔ نیز مسلمان بے ساز و سامان تھے اور کفار ساز و سامان سے لیس تھے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کی۔ ایک ہزار فرشتے مسلمانوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ اور مسلمانوں نے معجزانہ فتح پائی۔ سورہ انفال میں ہے:-

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ۔

جب تم اپنے پروردگار سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمہاری درخواست کو منظور فرمایا اور کہا میں ایک ہزار سواروں سے تمہاری مدد کئے دیتا ہوں۔

جنگ شروع ہونے سے قبل خواب میں دکھایا گیا تھا کہ کفار مسلمانوں سے تعداد میں کم ہیں۔ اس خواب کو اللہ یاد دلاتا ہے:-

اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا وَّلَوْ اَرٰىکَهُمْ کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (انفال)

اللہ کا احسان یاد کرو کہ اس نے تمہیں خواب میں کفار کو تھوڑا کر کے دکھایا۔ اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے، لڑائی کے بارے میں اختلاف کرنے لگتے (کہ لڑیں یا نہ لڑیں) لیکن اللہ نے بچا لیا۔ اللہ سینوں کے راز جانتا ہے۔

میدان جنگ میں مسلمانوں کو کفار اپنے سے کم نظر آ رہے تھے اور وہ اطمینان سے لڑ رہے تھے اور کفار کو بھی مسلمان اتنے ہی نظر آ رہے تھے جتنے وہ تھے۔ یعنی کم۔ یہ اس لئے کہ زیادہ نظر آنے سے کفار بھاگ نہ کھڑے ہوں، میدان میں ڈٹے رہیں۔ اور خوب قتل ہوں۔ اس احسان کو بھی قرآن مجید میں یاد دلایا گیا ہے۔

پھر جب گھمسان کی لڑائی لڑی جانے لگی اور مسلمان اور کفار گتھ گئے تو کفار نے محسوس کیا کہ مسلمان ان سے دگنے ہیں۔ اب کفار کے ہاتھ پاؤں پھول جانے ہی میں بہتری تھی۔

میدان بدر میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ اونچی تھی۔ اور جہاں کفار تھے وہ جگہ نیچی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مینہ برسا دیا اس سے مسلمانوں کے ہاں تو گرد و غبار دب گیا اور مسلمانوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو گئی اور کفار کے ہاں پانی نے کیچڑ کر دی۔ ان کے پاؤں پھسلنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی قرآن مجید میں جتایا ہے۔

بدر میں ایک اور واقعہ بھی ہوا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کچھ مٹی اور کچھ کنکریاں مٹھی میں بھر کر دشمن کی سمت پھینکیں اور دشمن نے فوراً شکست مان لی۔ قرآن مجید اس واقعہ کا یوں ذکر کرتا ہے:-

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔

مسلمانو! کفار کو تم نے قتل نہیں کیا۔ اللہ نے قتل کیا۔ اور (اے محمدؐ! وہ کنکریاں) جب تم نے پھینکیں تو تم نے نہیں پھینکیں۔ تاکہ (اس عمل) کے ذریعہ مسلمانوں کو فتح کی نعمت حسنہ سے سرفراز کرے ......

غزوہ احزاب، یعنی وہ لڑائی جس میں عرب کے جملہ قبائل نے مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔ اس کے وقوع سے پہلے حضورؐ بتا چکے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایسا ایسا ہونے والا ہے۔ جب وہ جنگ پیش آئی تو پریشان ہونے کی بجائے مسلمانوں کے ایمان نے تازگی پائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا۔

جب مُسلمانوں نے (اتنے) قبائل کو (حملہ کرتے) دیکھا تو بولے، یہی وہ (بات ہے) جس کا اللہ اور اُس کے رسُول نے ہم سے وعدہ (ذکر) کیا تھا۔ اللہ اور اُس کے رسُول کا کہنا سچا نکلا۔ اس واقعہ (یعنی اتنے زیادہ قبائل کے حملہ آور ہونے) نے اُن کے ایمان اور اعتراف کو اور زیادہ پکا کر دیا۔

ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل یہ آیت اُتری تھی:۔

وَاِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا۔

اگر کفار نے تمہارا مکہ میں رہنا دوبھر کر دیا۔ تاکہ (دوبھر کر کے) تمہیں مکہ سے نکال دیں تو (فکر مت کرو) یہ لوگ تمہارے بعد بہت دن اپنی ہستی برقرار نہ رکھ سکیں گے۔

یہ پیشین گوئی جن حالات میں کی گئی تھی کوئی عام انسان اسے باور نہیں کر سکتا تھا اور ایک اور پیشین گوئی تو اس سے بڑھ کر ہے فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ۔

تم میں سے جو ایمان لے آئے ہیں اور (جنھوں نے) نیک عمل کئے ہیں اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں زمین میں (اپنا) خلیفہ (وائسرائے) بنائے گا۔

یہ بشارت اُس وقت دی گئی تھی جس وقت مدینہ پہنچ کر بھی اطمینان میسر نہیں آیا تھا۔ اور مسلمان کہتے تھے کہ آیا کوئی گھڑی ایسی بھی ہوگی کہ ہم اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور ہمیں تیرے سوا کسی کا ڈر نہ رہے۔ مدینہ جانے سے پہلے کی ایک اور آیت ہے:۔

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

یعنی (اے رسُول) تم اپنے پروردگار سے دعا مانگو کہ اے پروردگار! مجھے (کسی) اچھی جگہ پہنچا اور (مکہ سے) بعافیت نکال اور مجھ کو اپنی جناب سے ایسی قوت عطا فرما جو (دشمنوں کے مقابلہ میں میری معین و مددگار ہو۔ اور (پھر) اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل کو (ایک نہ ایک دن) مٹنا تھا۔

یہ دعا اُس وقت سکھائی جا رہی ہے جبکہ دشمنوں پر غلبہ پانا تو درکنار حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وطن میں جائے پناہ نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ ترک وطن ہی کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ یوں دعا کرو۔ لیکن اس کے ساتھ وعدہ ہے کہ تمہیں ایسی جگہ لے جایا جائے گا جہاں سے فاتح بن کر لوٹو گے، دس برس پہلے اور انتہائی پریشانی کے زمانے میں بشارت دے دی ہے کہ حق غالب آئے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ فتح مکہ کے دن حضورؐ یہ آیت بار بار پڑھتے تھے۔

غرضکہ متعدد پیشین گوئیاں قرآن مجید میں ہیں۔ جو ایک ایک کر کے اور حرف بہ حرف ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ حضورؐ کی وفات کی پیشین گوئی بھی قرآن میں موجود ہے۔ بعض پیشین گوئیاں بالکل صاف ہیں۔ بعض اشارے ہیں۔

سب سے بڑھ کر معرکۃ الآراء پیشین گوئی کو تو میں بھول ہی گیا۔ روم کے غلبہ پانے کی پیشین گوئی۔ ملاحظہ کیجئے کتنی صاف پیشین گوئی ہے:۔

عرب کے ایک جانب روم کی حکومت تھی۔ اور ایک جانب فارس کی۔ سنہ نبوی میں یہ دونوں حکومتیں لڑ پڑیں۔ رومی چونکہ عیسائی اور اہل کتاب تھے۔ مسلمانوں کو اُن سے ہمدردی تھی۔ اور اہل فارس (ایرانی) مشرک تھے اس لئے مشرکین کو اُن سے لگاؤ تھا۔ فارس نے

روم پر فتح پائی اور رومی سلطنت بتاشے کی طرح بیٹھ گئی۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں سے کہا۔ ہماری تمہاری لڑائی ہو تو تمہارا بھی یہی حشر ہو جائے۔ رومی اس قدر کمزور پڑ گئے تھے کہ فارس کی جن شرائط کو انہوں نے قبول کیا ان میں ایک شرط یہ تھی کہ رومی ہزار باکرہ لڑکیاں ایرانیوں کے حوالہ کریں گے اور جس وقت رومی قاصد ایران کے دربار میں مصالحت کا پیام لایا تو خسرو (بادشاہ ایران) نے کہا کہ خود بادشاہ روم کو پابزنجیر میرے تخت کے نیچے آکر کھڑا ہونا چاہیئے اور اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کے سامنے سر جھکانا چاہیئے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں :۔

الٓمّٓ۔ غُلِبَتِ الرُّومُ فِيٓ أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنصُرُ مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ۔

رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے۔ وہ مغلوب ہونے کے چند ہی (سال بعد پھر غلبہ حاصل کریں گے۔ اللہ ہی کے ہاتھ میں پہلے اور پیچھے (جتانے) کا کل اختیار ہے (جس روز رومی جیتیں گے) اس روز اللہ کی نصرت سے مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔ اللہ جس کی چاہے مدد کرے۔ وہ غالب رحم والا ہے (یہ) اللہ کا وعدہ ہے اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتا۔

اس پیشین گوئی کو سن کر کفار نے مذاق اڑایا اور کہا شرط لگاؤ۔ پیشین گوئی صحیح نکلے تو اتنے اونٹ ہم دیں گے ورنہ تم دینا۔ ہمارے اللہ میاں نے میعاد مقرر کر ہی دی ہے۔

انگریز مورخ گبن لکھتا ہے۔ "شہنشاہ روم، جو کہ شکست سے قبل سستی، عیاشی اور اوہام میں مبتلا رہتا تھا اور رعایا کے مصائب کا تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ دفعتاً اس کی طبیعت بدلی اور روم کی عزت بچ گئی۔ عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو فتح پر فتح ہو رہی تھی۔ محمد نے وحی الٰہی کی بناء پر ایسی پیشین گوئی کرنے کی جرأت کی۔ جس سے زیادہ دور از قیاس پیشین گوئی اس وقت اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی"

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "بِضْعِ سِنِينَ" کا مطلب "دس سال سے کم" فرمایا تھا۔ چنانچہ نویں سال ادھر مسلمانوں نے کفار مکہ کو ہرایا ادھر خبر آئی کہ رومیوں نے ایرانیوں کو بھگا دیا۔

اس پیشین گوئی کے پورا ہونے سے قریش کے کافی آدمی ایمان لے آئے تھے۔

قرآن مجید میں ان آیات اور نشانیوں کا بھی ذکر ہے کہ :۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں سے ہاتھیوں اور ہاتھی نشین فوج کو ہلاک کرا دیا۔ یہ واقعہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے چند دن پہلے کا ہے۔ یہ حضورؐ کے ظہور کا اشارہ تھا۔ ابرہۃ الاشرم خانہ کعبہ ڈھانے آیا تھا۔ ڈھا جاتا تو نقصان حقیقتاً معمار خانہ کعبہ کے جانشین کا ہوتا۔ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چیز ہے اور حضورؐ اس کی حفاظت کے کفیل تھے، حضورؐ کو اسے پاک اور صاف کرنا اور سنبھالنا تھا۔ حضورؐ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ ابابیلیں کنکریاں برسا کر ہاتھیوں اور ہاتھی نشینوں پر غالب آگئیں۔ جب سورہ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ۔ نازل ہوئی تو اس واقعہ کی تصدیق کرنے والے مسلم و غیر مسلم زندہ تھے، کسی واقعہ کی تکذیب نہیں کی۔ اور یہ تو کون کہہ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو اس لئے بچایا تھا کہ اس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

(۲) ہجرت سے قبل جو سازش کفار نے حضورؐ کے قتل کے لئے کی تھی۔ کوئی مسلمان سازش کے وقت کفار کے پاس نہیں بیٹھا تھا۔ اور کفار خود آکر کہنے سے رہے، پھر حضورؐ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ ارادے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔

یاد کرو وہ وقت جب کفار تمہارے ساتھ داؤں کر رہے تھے تاکہ تمہیں قید کردیں، یا گھر سے نکال دیں۔ (اُدھر) وہ تدبیریں سوچ رہے تھے اور (ادھر) اللہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

(۳) ہجرت کا یہ واقعہ بھی معجزہ ہی تھا کہ کفار غار ثور کے منہ پر جا کھڑے ہوئے، ذرا نیچی گردن کر کے دیکھتے تو کھوج لگا لیا تھا۔ حضرت ابوبکر گھبرا گئے۔ لیکن حضور نے فرمایا۔ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" ڈرومت ہم صرف دو نہیں ہیں) اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور کے اس جملہ کو قرآن مجید میں محفوظ کر دیا ہے۔

حضور ہجرت کے قصد سے نکلے تو مکان کے چاروں طرف کفار کا پہرہ تھا۔ لیکن حضور نکل گئے اور کفار کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔

(۴) مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندہ کو خانہ کعبہ سے بیت المقدس ایک رات میں لے گیا۔ (حالانکہ دونوں مقامات کا فاصلہ اُس زمانے میں مہینوں کا تھا۔)

(۵) اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا اور اگر یہ کافر کوئی نشانی دیکھیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جادو تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ یہ آیت معجزہ شق القمر کے متعلق ہے۔

یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ قرآن نے دعویٰ کیا کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ اللہ کفار سے تمہیں محفوظ رکھے گا۔ وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا۔ اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کئے بیٹھے رہو۔ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو (ہم تمہیں گزند نہیں پہنچنے دیں گے) اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ۔ تمہارے پروردگار نے کفار کو (ایسا) گھیر رکھا ہے کہ (اُن کے لئے ممکن نہیں ہے کہ تم پر دسترس پائیں) قرآن کا یہ دعویٰ سچا رہا۔ حضور کے خلاف کیا کیا سازشیں نہ کی گئیں۔ کیا کیا منصوبے نہ گانٹھے گئے۔ کھانے میں زہر دیا گیا۔ سوتے میں قتل کا اہتمام کیا گیا۔ چھپ چھپ کر حملے کئے گئے۔ کھل کھل کر نرغہ میں لیا۔ لوگ تلواریں زہر میں بجھا بجھا کر مارنے پہنچے۔ لیکن اللہ کے فضل سے حضور سلامت رہے۔

غرضکہ ایسے معجزات قرآن مجید میں کافی ہیں اور احادیث میں تو بے شمار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان معجزات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی خاص قرآن[1] کے مستقل اور دوامی معجزے کو دیتا ہے اور حضور کی قبل نبوت زندگی کو دیتا ہے۔ قرآن مجید کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ۔

یہ ہدایت نامہ) جو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلعم) پر اُتارا ہے اُس کی صداقت میں اگر تمہیں شک ہو (اور تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلعم نے خود تصنیف کر لیا ہے) تو (سیدھا حل یہ ہے کہ) تم قرآن جیسی (پوری کتاب نہیں، قرآن جیسی)

---

[1] حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ کوئی پیغمبر نہیں ہے جسے نبوت کی نشانی نہ ملی ہو۔ مجھے قرآن ملا ہے اور قرآن میں ہے۔" اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم" کیا کفار کو یہ نشانی کافی نہیں معلوم ہوتی کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا ہے جو انھیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔

ایک سورۃ تصنیف کر کے لے آؤ۔

یہ چیلنج سن کر کفار تلواریں نکال لائے مگر ایک سورۃ نہ لاسکے۔ اور سورۂ طور میں تو سورۃ نہیں بات کا مطالبہ ہے۔ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ ۔ قرآن جیسی ایک بات پیش کردو۔ شروع میں دس سورتیں لانے کو کہا تھا۔ دوسرے انبیاء کے صحیفے معجزہ نہیں تھے۔ قرآن مجید کی ہر آیت معجزہ ہے، قرآن مجید کا انداز کلام اور اندازِ بیان معجزہ ہے۔ قرآن مجید نے نظم و نثر کے درمیان ایک عجیب و غریب اسلوب ایجاد کیا اور فصاحت و بلاغت کا دریا بہا دیا۔ قرآن کے سامنے عرب کے شعراء کی زبانیں گونگی ہوگئیں۔ اس وقت کے عرب شعراء کا۔ غیر عرب، غیر اہل زبان، تو کیا مقابلہ کریں گے۔ پھر قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہی قرآن مجید کا اعجاز نہیں ہے۔ قرآن مجید کے مخاطب عہد نبویؐ سے لے کر قیامت تک کے لوگ ہیں اور قرآن مجید تنہا عرب کے لئے نہیں ہے۔ سارے عالم کے لئے ہے۔ فصاحت و بلاغت کا جواب دیتے تو تو اہل عرب ہی دیتے[1] لیکن قرآن کے حکمت و موعظت سے بھرے ہوئے بیانات ساری دنیا کو چیلنج کر رہے ہیں۔ کوئی بیان علمائے نفسیات کو چیلنج کرتا ہے۔ کوئی بیان ماہرین سیاست کو دعوت دیتا ہے۔ قرآن کے قوانین قانون دانوں کو پکارتے ہیں ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے　　　یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے

قرآن نے مزید نزول وحی سے دنیا کو مستغنی کردیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔

قرآن مجید نے دلوں کے وہ اسرار فاش کئے جن تک انسانوں کی نگاہ خود کبھی نہیں پہنچی تھی۔

قرآن مجید کا سمجھنے کے بعد وہ اثر ہوتا ہے کہ کسی کتاب کا نہیں ہوتا۔ آدمی مسخر ہو جاتا ہے۔

پھر قرآن مجید کے احکام اور ارشادات تو اعجاز ہیں ہی۔ قرآن نے کہیں اپنی تاثیر کی طرف توجہ دلائی ہے، کہیں اپنی یکسانی اور اپنے مضامین کے عدم اختلاف کو جتایا ہے۔ قرآن کا ایک بین معجزہ یہ ہے کہ قریباً چودہ سو برس گزر چکے اور جوں کا توں محفوظ ہے۔ اور وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم قرآن کے محافظ ہیں) کی صداقت کو ثابت کر رہا ہے۔ اتنے عرصہ کوئی ارضی اور سماوی کتاب اصلی حالت پر باقی نہیں رہی اور ہمارا ایمان ہے کہ قرآن تا قیام قیامت باقی رہیگا۔ اور اس کی جامعیت میں اور اس کے زیر، زبر اور پیش میں فرق نہیں آئیگا توراۃ، زبور اور انجیل اب اپنے پیروؤں کو راستہ دکھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن قرآن اپنے پیروؤں کی ہمیشہ رہنمائی کرتا رہیگا۔ قرآن وہ آفتاب ہے جو ڈوبنے والا نہیں ہے۔

قرآن مجید حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمّی ہونے کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اور رسالت سے قبل کی ناواقفیت کو بتاتا ہے۔ قرآن میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کا جو حال ہے۔ وہ حضورؐ کے علم میں کیسے آگیا۔ قرآن مجید نے گزرے ہوئے ایسے واقعات پیش کئے ہیں جنہیں حضورؐ بطور خود جان ہی نہیں سکتے تھے۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ ۔ یہ پچھلے زمانے کی باتوں کا علم ہم وحی کے ذریعہ دے رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کے پاس اُس زمانہ میں نہیں تھے جب وہ باہم مشورہ کر رہے تھے۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ۔ تم تو رسالت سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھ سکتے تھے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔ تم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۔

---

[1] سبعہ معلقہ والے لبید حضورؐ ہی کے زمانہ کے شعراء میں نہیں تمام اگلے پچھلے عرب شعراء میں ممتاز ہیں۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا اور کہا کرتے تھے کہ اللہ نے بقرہ اور آل عمران جیسی سورتیں سکھادی ہیں۔ اُن کے سامنے شعر کہنا زیب نہیں دیتا۔

یہ پچھلے زمانہ کی باتیں جنہیں ہم تمہیں ذریعہ وحی بتاتے ہیں۔ انھیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم جانتی تھی۔

کفار قریش نے حضورؐ کو شاعر، ساحر اور مجنوں تو کہا لیکن حضورؐ پر یہ الزام کبھی نہیں لگایا کہ چھپ کر پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے، یہ ضرور کہا کہ باہر کا فلاں آدمی قرآن لکھوا رہا ہے، چنانچہ قرآن نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ جس سے قرآن کو منسوب کیا جاتا ہے اُس کی زبان عجمی ہے۔

یہاں تک مکہ کا قصہ تھا۔ مکہ کا عجمی مکہ میں رہ گیا اور حضورؐ مدینہ پہنچے تو وہاں یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ مسلمان ہو جاتے اور پھر ترک اسلام کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ اسی قماش کا ایک عیسائی کہنے لگا۔ بس جتنا لکھوا چکا اُس سے زیادہ محمدؐ کچھ نہیں جانتے لیکن چونکہ وحی کا سلسلہ اس عیسائی کے ارتداد کے بعد جاری رہا۔ اُس کی بات چلی نہیں۔ حتیٰ کہ وہ عیسائی مرگیا اور وحی برابر آتی رہی۔

حضورؐ کی قبل نبوت زندگی کو بھی قرآن نے بطور چیلنج پیش کیا ہے، فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ میں نبوت کے دعوے سے پہلے (ایک دو نہیں، چالیس سال قریباً) پوری عمر تم ہی میں بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم (اتنا) نہیں سوچ سکتے (کہ مجھ جیسا شخص جس نے انسانوں کے معاملہ میں عمر بھر جھوٹ نہیں بولا آخر عمر میں اللہ پر بہتان باندھے گا۔ وحی نہ آتی ہوگی اور کہیگا کہ وحی آتی ہے، کیا میری زندگی افترا پردازوں کی زندگی تھی، تم میری زندگی میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سقم بھی بتا سکتے ہو)

اس چیلنج کا بھی جو اللہ نے اپنے رسولؐ سے قرآن میں دلوایا کفار جواب نہ دے سکے، حضورؐ کی سیرت کے خلاف کسی کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا اور کسی نے کہنے کا ارادہ کیا تو دوسرے کفار نے روک دیا کہ وہ بات کہو جو اٹھائی اور بٹھائی جاسکے، جسے لوگ مان سکیں۔ فقط ایک چیز ہے۔ اسے شہرت دو کہ محمدؐ کا اتباع کرنے سے بیٹے باپ سے، بیویاں شوہروں سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو جاتے ہیں۔ آپس کا اتفاق باقی رکھنا ہے تو محمدؐ کے قریب مت جاؤ۔

بہرحال قرآن اور سیرت سے متاثر ہونے والے سب نہیں تھے۔ زیادہ لوگ ایسے ہی تھے جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلے میں حسّی معجزات سے متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے سب کا ذوق اور سب کا رجحان طبع یکساں نہیں تھا۔ مگر ذرا آجکل کے ذوق اور رجحان طبع کے ساتھ تو اس بات کو جوڑیے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف حضورؐ سرور کائنات سے حسّی معجزے بھی صادر کراتا رہا۔ اور دوسری طرف معجزوں پر معجزے مانگنے والوں کو سمجھاتا رہا کہ معجزوں کے پیچھے مت پڑو۔ معجزے تو فقط متحیر اور مبہوت کر دیتے ہیں۔ تم ہماری تعلیم کے محاسن سے بہرہ در ہو۔ یہ دیکھو کہ جو نظام زندگی تمہیں دیا جا رہا ہے وہ دلیل و برہان پر مبنی ہے یا نہیں۔ قرآنی دعوت کی بنیاد سرتاسر حکمت و بصیرت پر قائم کی گئی ہے۔ قرآن نے دنیائے مذہب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ بات بذات خود ایک معجزہ ہے۔

معجزات اور امکان معجزات کے متعلق چہ میگوئیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے اختلاف ممکن نہیں ہے کہ حضورؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اہل وطن سے اُن عادات کو ترک کرنے کے لئے کہا جو اُن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھیں۔ اُن عادات کی خرابی اُن ہی میں کے صرف ایک شخص کو کس نے سمجھا دی۔ حضورؐ نے اُن بتوں کی مذمت کی اور اُن بتوں کو توڑ پھینکنے کا وعظ کہا جن کی سارا عرب پرستش کرتا تھا۔ ان بتوں کی ہیبت یکہ و تنہا، بے یار و مددگار اور بے زر و بے پر انسان کے دل سے کس نے ہٹادی۔

پھر یہ کیا ماجرا تھا کہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لئے حضورؐ کے پاس ظاہری بدلہ اور معاوضہ کچھ نہ تھا۔ پھر بھی لوگ اسے قبول کر رہے تھے، مصیبتیں اٹھاتے تھے، بلائیں جھیلتے تھے، گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہوتے تھے لیکن کھنچے چلے آتے تھے۔ مکہ کے تیرہ سال میں جنہوں نے اسلام قبول کیا کس امید پر قبول کیا۔ اور فتح مکہ سے پہلے تک بھی جنہوں نے اسلام قبول کیا انھیں ہی کون سی توقعات تھیں۔ وہ سود، قمار، لوٹ مار، سرقہ، ڈاکہ، اپنے ایک ایک ذریعہ معاش سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور فاقے کرنے لگے تھے۔ آخر کیوں؟

دشمنانِ اسلام پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ کیا بدر کے تین سو انیس مجاہد بھی شمشیر کے ذر سے ایمان لائے تھے۔ فرمائیے یہ پہلے شمشیر زن کس شمشیر سے مسلمان ہوئے تھے؟

پھر اسے معجزہ اور کرشمۂ ربانی نہ کہیے گا تو کیا کہیے گا کہ نبوت کے تیرہ سال مصائب میں گزرے اور دس سال حملوں کے دفاع میں۔ کوئی اور ہوتا تو تیرہ سالہ مصائب ہی سے بتاشے کی طرح بیٹھ جاتا۔ اور حملے بھی ہمت ہارنے کے لئے کافی تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ پورا زمانۂ نبوت مصیبتوں اور جنگوں کی نذر ہو گیا۔ اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مصیبتوں اور جنگوں ہی میں مبتلا رہے۔ لیکن حضورؐ ان حالات کے باوجود وہ کام کر گئے کہ غیر نبی اطمینان کی حالت میں نہیں کر سکتا۔ حضورؐ نے اندھیرے کو اُجالے سے بدل دیا۔ روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا کر دیا۔ بندوں کا اللہ سے رشتہ جوڑ دیا اور انسانوں کو فرشتوں سے بڑھا دیا۔ حضور کی احادیث ہی کو پڑھ کر دیکھئے۔ کس کا دماغ پُر آشوب حالات میں ایسی حکمت و موعظت کی باتیں سوچ سکتا ہے۔

آجکل کمیونزم کا بڑا چرچا ہے اور لوگ اس کے گرویدہ ہیں۔ ہم کمیونزم سے واقف نہیں کہ کیا چیز ہے۔ ایک فقرہ برنارڈ شا کا البتہ اس کی بابت کہیں پڑھا تھا کہ اسلام سے خدا اور عاقبت خارج کر دیے جائیں تو اسلام کا نظامِ حیات اور کمیونزم کا نظامِ حیات تقریباً ایک ہے۔

بعض لوگوں کو جن بڑے آدمیوں سے عقیدت ہوتی ہے، اُن کی عقیدت اور محبت کا حق وہ اس طرح ادا کرنا چاہتے ہیں کہ ان بزرگوں سے زیادہ سے زیادہ ایسی باتیں منسوب کر دیں جو کرامات، معجزات اور خوارق سے ملتی جُلتی ہوں۔ عقیدت کے اس جوش میں بات کو جانچنے اور معاملہ کو پرکھنے کی بھی کوشش نہیں کی جاتی۔

اسی طبیعت اور مزاج کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی سے معجزوں کے منسوب کرنے میں درایت و روایت کی حدود کا خیال نہیں کیا۔ ان متساہلین اور معجزوں کے شوقینوں کو بس اس کی دُھن رہی کہ حضورؐ کے معجزات میں کسی نہ کسی طرح تعداد کا اضافہ ہو جائے۔

ایسے واقعات کو بھی معجزات کے شوقینوں نے خواہ مخواہ معجزہ قرار دے لیا ہے۔ مثلاً حضورؐ حضرت جابرؓ کی عیادت کرنے گئے۔ حضرت جابرؓ سخت بیمار تھے اور بے سُدھ پڑے تھے۔ حضورؐ نے اُن کے منہ پر پانی چھڑکا۔ انھیں ہوش آگیا۔ یہ واقعہ بخاری و مسلم میں ہے، اور صحیح ہے۔ لیکن محض واقعہ ہی۔ معجزات کے شوقینوں نے اسے معجزہ بنا ڈالا۔

مُسند امام حنبلؒ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں کوئی جانور پلا ہوا تھا۔ وہ یُوں تو ہر وقت پھرتا رہتا تھا مگر جب حضورؐ تشریف لاتے تو ایک جگہ بیٹھ جاتا تھا۔ اور حضورؐ تشریف لے جاتے تو پھر دوڑنا شروع کر دیتا تھا۔ یہ معجزہ نہیں ہے۔ محدثین نے مندرجہ بالا دونوں واقعوں کو بطورِ معجزہ پیش نہیں کیا۔ لیکن کتب دلائل و فضائل میں پہلا واقعہ بھی بطورِ معجزہ درج ہے اور دوسرا واقعہ بھی بطورِ معجزہ درج ہے۔

صحابۂ کرامؓ حضورؐ کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کو یاد رکھتے تھے۔ ہمیں بھی انھیں تبرک اور باعثِ برکت سمجھنا چاہیے اور حرزِ جان بنانا چاہیے لیکن ہر قول اور ہر عمل کو اس کی جگہ پر رکھنا چاہیے۔ جس طرح ہدفِ مطاعن بنانے والی من گھڑت حدیثیں حضورؐ کے لئے موجبِ تکلیف ہیں اسی طرح معجزات کی تعداد بڑھانے سے بھی حضورؐ خوش نہیں ہوں گے۔ ناراض ہوں گے۔ خوشی کی صورت تو فقط ایک ہی ہے۔ کہ حضورؐ کے احکام کی تعمیل کی جائے اور حضورؐ کے لائے ہوئے اسلام کا پابند ہوا جائے۔ حضورؐ کا وقار معجزوں کی تعداد بڑھانے سے نہیں بڑھ سکتا۔ حضورؐ کا وقار اس میں ہے کہ اُن کے نام لیوا احکامِ اسلام کا کتنا خیال کرتے ہیں اور نظامِ اسلام کو کہاں تک عملی جامہ پہناتے ہیں۔ اسلامی نظام اگر عملاً منشکل ہو جائے تو وہ حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اُس معجزہ کے آگے دنیا ایک دفعہ سر جھکا چکی ہے۔

اسد ملتانی

جگر کا ایک شعر

اپریل اور مئی کے "فاران" میں "اقبال کی فارسی شاعری" کے عنوان سے سید محمد عبدالرشید فاضل صاحب کا ایک فاضلانہ مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ خاص محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے اور اس میں فکر اقبال کے بعض مخصوص پہلوؤں پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال نے فارسی کے کن شعرا کا تتبع کیا ہے اور کن سے استفادہ؟ بالخصوص مرشد رومؒ سے کس قدر اکتساب فیض کیا ہے؟ فاضل مضمون نگار نے ان سوالوں کا جواب دینے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور موضوع کی مقررہ حدود کے اندر رہنے کے باعث مضمون کی علمی اور افادی حیثیت بلند کر دی ہے۔

مضمون کے سلسلہ میں اقبال کے "گستاخانہ" اشعار کا بھی ذکر آیا ہے۔ مضمون نگار نے یہ لکھ کر کہ "اقبال کے ہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو گستاخی اور سوء ادبی[1] پر محمول کیا جاتا ہے"، مثال کے طور پر پانچ فارسی شعر نقل کئے ہیں۔ اور ان کی صفائی ان الفاظ میں پیش کی ہے کہ "ان مضامین کو بھی صوفی شعرا اور بالخصوص مولانا رومؒ کے اتباع میں سمجھنا چاہیے"۔ مولانا کے ایک شعر کی مثال دے کر مزید لکھا ہے۔ "مگر ان اشعار کو گستاخی پر محمول وہی لوگ کرتے ہیں جو مقام بندگی اور تخلقوا باخلاق اللہ کے مفہوم حقیقی سے ناآشنا ہونے کے باعث انسان کے مقام جذب و تسخیر کی غایت الغایات تک نہیں پہنچے ہیں اور جنھوں نے قرب نوافل والی حدیث کو درخور اعتنا نہیں سمجھا"۔ اس کے بعد اس حدیث کا ترجمہ دیا ہے اور "روح اقبال" سے دو مختصر اقتباس جو اقبال کے ان اشعار کی توضیح و توجیہ کرتے ہیں۔

اس پر "فاران" کے ایڈیٹر صاحب نے ذیل کا نوٹ دیا ہے:-

"بعض مقامات پر تو اس قسم کے اشعار کی حیثیت "ناز عبدیت" جیسی ہے اور کہیں اس کی صورت "بچوں کی ہٹ" کی سی ہے۔ مگر جہاں یہ رنگ ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

تو یہ بے شبہ "شاعرانہ شطحیات" ہیں اور توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان حلم و عفو ان شطحیات سے چشم پوشی اختیار کرے گی۔ جگر مرادآبادی نے اقبال کے اس شعر کا کس قدر بلیغ انداز میں جواب دیا ہے ؎

نظر کم، جستجو کم، تشنگی کم　　نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم!"

جہاں تک ان اشعار کا تعلق ہے جنہیں گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے، اقبال کا اپنا جواب یہ ہے ؎

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی　　ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک

گو یا گستاخی اور بے باکی محب اور محبوب کی باہمی گفتگو تک محدود رہنی چاہئیں۔ جونہی ان کا اظہار کیا جائے اور معاملہ خلوت سے جلوت میں لایا جائے تو پھر یہ سب کچھ حکم شریعت کی زد میں آجاتا ہے۔ اقبال کا روحانی مقام کچھ بھی ہو اور محبت کی رمزیں کتنی ہی خاص کیوں نہ ہوں

---

[1] "سوء ادبی" غالباً سہو کاتب ہے کیونکہ صحیح ترکیب "سوء ادب" ہے یا "بے ادبی"۔ (اسد)

جہاں تک شرعی آداب کا تعلق ہے الفاظ کے استعمال میں بہرحال مناسب احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ بالخصوص صاحب اسماء حسنیٰ سے کوئی بری صفت منسوب کرنا خواہ وہ حقیقت واقعی ہی کیوں نہ ہو کسی طرح جائز نہیں۔ لہٰذا مضمون نگار کی پیش کردہ صفائی اور اقبال کے دعویٰ اختصاص کے باوجود مدیر "فاران" کے اعتراض سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔

لیکن مدیر فاران نے اقبال کے اس شعر کے "بلیغ جواب" کے طور پر جگر مرادآبادی کا جو شعر پیش کیا ہے وہ ذرا غور طلب ہے۔ اقبال کو شکوہ ہے کہ "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم" جگر کا جواب ہے کہ "نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم" یعنی میسر تو دریا ہے لیکن نظر آتا ہے شبنم۔ مگر کیوں؟ اس کی تین وجوہ بیان کی ہیں۔ (۱) نظر کی کمی، (۲) جستجو کی کمی۔ (۳) تشنگی کی کمی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ تین وجوہ وہ نتیجہ پیدا کرتی ہیں جو حضرت جگر نے حتمی طور پر پیش کیا ہے۔

نظر کی کمی

نظر کی کمی کی ایک صورت کوتاہ نظری ہے جس سے قریب کی چیز تو دکھائی دے مگر دور کی چیز نظر نہ آئے۔ ضعف بینائی کی دوسری صورت یہ ہے کہ سامنے کی چیز بھی دھندلی معلوم ہو اور صاف صاف نظر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چیز تو دکھائی دیتی ہے مگر اس کے باریک اجزاء نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کم بینی یہ ہے کہ نظر کسی شے کو دیکھے مگر اس کی حقیقت کا اندازہ نہ کر سکے۔ بقول اقبال ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن ۔۔۔ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دوسرے لفظوں میں کم نظری کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی چیز کے ظاہر کو دیکھا جائے اور اس کے باطن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اقبال ہی نے کہا ہے ؎

کم نظرے تابِ جمالم ندید ۔۔۔ سم شکارم دیدہ پنہانم ندید!

کم نظری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کل کو دیکھ کر جزو کا احساس تو کیا جائے مگر جزو سے کل کا اندازہ نہ لگایا جائے۔ بقول عرفی ؎

من از گل باغ می بینم تو گل از باغ می جوئی ۔۔۔ من آتش از دخاں بینم تو از آتش دخاں بینی!

اسی طرح دیدۂ بینا کی تعریف غالب نے ان لفظوں میں کی ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۔۔۔ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا!

یا جیسا کہ ذوق نے کہا ہے ؎

دانہ خرمن ہو ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو ۔۔۔ آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ "دیدۂ بینا" نہ ہونے سے دانہ خرمن یا قطرہ دریا نہ دکھائی دے۔ مگر یہ نہ ہو گا کہ خرمن دانہ نظر آنے لگے اور دریا قطرہ۔

البتہ کم نظری کی ایک مجازی صورت کم شناسی ہے جس کے باعث کسی چیز کی عظمت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے یا بد بینی کے سبب کوئی اچھی چیز بھی بری نظر آئے۔ بقول سعدی ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد ۔۔۔ عیب نماید ہنرش در نظر

یا تکبر کا جذبہ اتنا بڑھ جائے کہ بڑی چیز کو چھوٹا کر دکھائے۔ اقبال نے ایک جگہ "کافر گر" ملا کی شکایت کی ہے کہ ؎

شبنم مادر نگاہ مایم است ۔۔۔ از نگاہ ادیم ما شبنم است

ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی صورت بھی ایسی نہیں کہ کم نظری کے سبب بڑی چیز چھوٹی معلوم ہو یا دریا بھی شبنم نظر آئے۔ البتہ اس کے

عین برعکس وسعتِ نظر پیدا ہو جائے تو دریا کی حیثیت بھی ہیچ معلوم ہو اور وہ محض قطرہ کے برابر دکھائی دینے لگے۔

جستجو کی کمی یہی صورت جستجو کی کمی سے پیدا ہوتی ہے، اگر جستجو کم ہو تو انسان بڑی چیز کے بجائے چھوٹی پر اکتفا کرلے۔ بقول اقبال ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!

جستجو کم ہو تو راہرو کو منزلِ مقصود کا صحیح اندازہ بھی نہ ہو اور وہ سفر کی دشواریوں کو ترک کر کے راہ میں بیٹھ جانے کو کافی سمجھ لے ؎

غمِ تلاش سے بچنے کا کیا بہانہ ملا پڑے ہیں نقشِ قدم پر کہ آستانہ ملا

غرضکہ جستجو کی کمی سے بھی کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ بڑی چیز چھوٹی نظر آئے یا دریا قطرہ۔ البتہ جستجو زیادہ بڑھ جائے تو ممکن ہے کہ دریا بھی شبنم نظر آنے لگے اور بڑی سے بڑی چیز چھوٹی۔

تشنگی کی کمی علیٰ ہذا القیاس پیاس کی کمی بھی اس امر پر تو آمادہ کر سکتی ہے کہ قطرہ کو دریا تصور کر کے مطمئن ہو جائیں لیکن یہ کیونکر ہو کہ دریا شبنم نظر آنے لگے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

تشنہ جوید آب را اندر جہاں آب ہم اندر تلاشِ تشنگاں!

تا توانی تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

یعنی تشنگی زیادہ ہو جائے تو پانی خود بخود ہر طرف سے جوش زن ہو۔ اس لحاظ سے یہ تو بالکل صحیح ہے کہ تشنگی میں جتنی زیادتی ہو اتنا ہی زیادہ پانی بہم پہنچے اور تشنگی میں جتنی کمی ہو اتنا ہی کم پانی ملے مگر یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ تشنگی کم ہو تو پانی کی زیادہ مقدار بھی تھوڑی نظر آئے۔ اس کے برعکس البتہ تشنگی بہت زیادہ ہو تو اغلب ہو کہ دریا کو بھی شبنم سمجھ لیا جائے۔ عرفی کا ایک شعر ہے ؎

ز نقصِ تشنہ لبی داں، بہ عقلِ خویش مناز دلت فریب گر از جلوہ سراب نہ خورد!

یعنی سراب کا فریب نہ کھانا بھی تشنگی کی کمی کی دلیل ہے۔ تشنگی بڑھی ہوئی ہو تو انسان سراب کو دیکھ کر یہی سمجھتا ہے کہ سر آب پہنچ رہا ہے۔ لیکن تشنگی کم ہو تو دھوکا نہیں کھاتا۔ سراب کو سراب ہی سمجھتا ہے ریت کو پانی نہیں سمجھتا۔ گویا اس پہلو سے بھی تشنگی کی کمی کا یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ دریا شبنم نظر آئے۔

اس مختصر تجزیہ سے ظاہر ہے کہ اگرچہ کم نگاہی کی تاویل سے کوئی پہلو نکال بھی لیا جائے پھر بھی کم از کم جستجو اور تشنگی کی کمی سے دریا کا شبنم نظر آنا کسی حالت میں بھی صحیح نہیں۔ بلکہ معاملہ عین اس کے برعکس ہے، قطع نظر اس سے کہ جگر کا یہ شعر اقبال کے مصرعہ کا جواب۔ اور وہ بھی بلیغ انداز میں، ہے یا نہیں، خود اس شعر کی معنویت محلِ نظر ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو اس کے دوسرے مصرعہ کو اس طرح اُلٹ دیا جائے ؎

نظر کم، جستجو کم، تشنگی کم نظر آئے نہ کیوں شبنم بھی دریا!

مُدیرِ "فاران" :- جناب اسد ملتانی نے جس دقتِ نظر سے جگر مراد آبادی کے شعر کا تجزیہ فرمایا ہے۔ اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ مگر بات اس "اعتراف" پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ سلسلہ طویل و دراز ہونا چاہتا ہے۔

شعر میں جو بات کہی جائے اس کے لئے یقیناً کوئی نہ کوئی "قرینہ" پایا جانا چاہئے۔ مگر "شعروں" کا بالکل واقعاتی انداز پر تجزیہ کیا جائے تو نہ جانے کتنے اچھے شعر ایسے نکلیں گے جو واقعات کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکیں گے، مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

اپنی جگہ "سحرِ حلال" بلکہ شاعری کی معراج ہے! اس میں نزاکتِ خیال، تاثر اور حسنِ بیان سبھی طرح کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر کوئی واقعاتی

انداز پر اس شعر کا تجزیہ کرے تو اس شعر کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا!

کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے مرنے کے بعد کیا واقعی ایسا ہوا تھا کہ حسینانِ جفا پیشہ کو کشاکشِ ناز و ادا سے فرصت مل گئی تھی؟ اور کیا تمام دنیا کے حسین اور خوبرو غالبؔ ہی کو لبھانے اور ستانے کے لئے ناز و غمزہ دکھایا کرتے تھے۔ اور کیا یہ کسی طرح ممکن بھی تھا کہ دنیا کے تمام حسینوں پر غالبؔ کی نگاہ ہو اور تمام حسین اور ماہ وش غالبؔ کو جانتے اور پہچانتے ہوں؟ اس واقعاتی تجزیہ کے بعد سوچئے کہ اس شعر کی کیا گت بنتی ہے؟

میرؔ کا مشہور شعر ہے ؎

کل کا وعدہ کیا ہے اس نے میرؔ — ایک دن اور بھی جئے ہی بنی!

اس شعر میں کس قدر شدید تاثر ہے۔ مگر "واقعات" کی خراد پر اس شعر کو رکھ دیجئے تو اس کے پرزے اڑ جائیں گے۔ کہا جا سکتا ہے کہ موت کا جو وقت مقرر ہے، ایک لمحہ بھی وہ وقت اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا۔ مرنے اور جینے پر کسی جاندار کو دسترس نہیں۔ یعنی واقعات کی دنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ محبوب کے وعدہ کر دینے سے کسی کی آئی ہوئی ٹل جائے اور جسے آج مرجانا تھا وہ محبوب کے وعدے کے سبب اپنی زندگی کی مدت کو "بہ قدر یک روز" طویل کر دے! ــــ اس قسم کے تجزیے "شعر کو "بے کچھ" بنا سکتے ہیں!!

اقبالؔ کا شعر ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے!

اس شعر میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رزاقی پر نامناسب انداز میں چوٹ کی گئی ہے اور اس قسم کے شعروں کا شمار "اقبال کے شطحیات" میں ہے

جگرؔ نے اس کے جواب میں کہا ہے ؎

نظر کم، جستجو کم، تشنگی کم — نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم!

اس شعر پر غور کرتے وقت اقبالؔ کا مندرجہ بالا شعر ذہن و فکر میں ضرور رہنا چاہیئے۔ اقبالؔ نے یہ کہا ہے کہ "پیاسے کو دریا سے شبنم دی جا رہی ہے"۔ جگرؔ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایتوں کا دریا ہر وقت موجیں مار رہا ہے اور یہ دریا کا دریا ہر تشنہ کام کی پذیرائی کے لئے موجود ہے۔ مگر نظر، جستجو اور تشنگی کی کمی کے سبب "دریا" "شبنم" نظر آتا ہے۔ یعنی سائل اور طالب کے اندر خود ایسی خامیاں موجود ہیں جن کے باعث اُسے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتیں بہت ہی کم دکھائی دیتی اور محسوس ہوتی ہیں۔

اقبالؔ کے شعر میں "کفرانِ نعمت" کا پہلو نکلتا ہے۔ جگرؔ کے شعر میں "شکرِ نعمت" کی فراوانی ہے۔ جگرؔ نے اپنے شعر میں "کفرانِ نعمت" کی تردید کی ہے اور شکرِ نعمت کے رخ کو ابھارا ہے۔ جگرؔ نے "مَن جَدَّ وَجَدَ" کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کوئی سعی و جستجو سے کام لے تو قدرت کے خزانے اس کا دامن بھرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ بندے کے لئے کسی حال میں بھی شکوہ و شکایت زیبا ہی نہیں ہے، صرف ایک "سانس" جو بظاہر حقیر معلوم ہوتا ہے اپنے اندر بے پایاں منافع رکھتا ہے۔

اس انداز پر جگرؔ کے شعر پر غور کیا جائے تو اس شعر میں حُسن ہی حُسن نظر آئے گا اور اس میں کوئی بات بھی گرفت کے قابل یا قرینہ کے خلاف محسوس نہ ہوگی۔

اسد صاحب کو مصرعہ میں "نظر آنے" کے الفاظ آجانے سے دھوکا ہوا ہے اور وہ شعر کو "آنکھ کے دیکھنے کی قوت" اور اس کے فصل و بُعد اور دوری و نزدیکی" کے فیتے سے ناپنا چاہتے ہیں۔ کوئی کہے اور لوگ اس طرح کہتے ہی رہتے ہیں کہ "مجھے تو دنیا میں چاروں طرف جھوٹ ہی جھوٹ نظر آتا ہے"، تو کیا اس پر یہ اعتراض کسی طرح بھی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جھوٹ تو ایک صفت کا نام ہے جو غیر مادی ہے۔ وہ آنکھوں کو آخر نظر کس طرح آ سکتا ہے۔ شعر و ادب پر اگر اس طرح احتساب کیا جائے تو لٹریچر کے نہ جانے کتنے بڑے حصہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دینا پڑے گا۔

"نظر کم" کے بہت سے پہلو ہیں، بصارت اور بصیرت کی کمی، نظر کی پستی، مشاہدہ کی خامی، تنگ نظری...... اور "تنگ نظری" آدمی میں جذبہ شکر و استحسان پیدا نہیں ہونے دیتی کہ بڑے سے بڑے احسان کو بھی تنگ نظر آدمی تھوڑے سے تھوڑا ہی سمجھتا ہے۔ تو اس شعر میں اس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ کائنات میں اللہ کی نعمتوں کے چشمے انسان کے لئے اُبل رہے ہیں مگر بصیرت و بصارت کی کمی اور تنگ نظری اُسے اعتراف شکر نعمت نہیں کرنے دیتی اور نعمتوں کا یہ دریا اُسے شبنم دکھائی دیتا ہے۔

"جستجو کی کمی" میں ذرا سا بھی ابہام نہیں۔ یہ الفاظ زبانِ حال سے خود اپنی شرح کر رہے ہیں کہ جو لوگ سعی و جستجو میں کمی کرتے ہیں وہ تقدیر کا رونا روتے رہتے ہیں اگر آدمی جد و جہد کرے اور سعی و جستجو کا حق ادا کردے تو اللہ کی نعمتوں کے خزانے اُس کا دامنِ مراد بھرنے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ یہ جستجو کی کمی ہے کہ دریا پر شبنم کا اور خزانوں پر خزف ریزوں کا دھوکا ہوتا ہے!

"تشنگی کم" سے مراد ذوقِ اضطراب کی کمی ہے اور اسی ذوقِ اضطراب کی کمی کے سبب شوقِ جستجو میں بھی کمی آگئی ہے کہ اضطراب و جستجو لازم و ملزوم ہیں اور فاضل ناقد نے یہ جو کہا ہے کہ "...... لیکن تشنگی کم ہو تو دھوکا نہیں کھاتا، سراب کو سراب ہی سمجھتا ہے، ریت کو پانی نہیں سمجھتا" تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ شاعر نے یہ نہیں کہا کہ "تشنگی کی کمی" کے سبب اُسے پانی ریت دکھائی دے رہا ہے۔ اس قسم کے دھوکے اور فریب نظری کا شعر میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ شعر میں یہ نہیں کہا گیا کہ نظر، جستجو اور تشنگی کی کمی کے سبب "شے" کی ماہیت بدلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ شاعر نے دراصل اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ نگاہ و جستجو اور اضطراب (تشنگی) کی یہ کمی ہے۔ جس کے سبب دریا شبنم نظر آتا ہے۔ اور یہ نعمتِ فراواں بہت ہی حقیر اور چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔

اگر واقعاتی انداز پر "تشنگی کم" کا تجزیہ کیا جائے تو بھی اس شعر میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ کہ پیاس جتنی کم ہوتی ہے اتنی ہی پانی کی قدر و قیمت کم محسوس ہوتی ہے اور پیاس بڑھی ہوئی ہو تو پانی کا ایک گھونٹ بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ "تشنگی کی کمی" کے سبب "دریا کے شبنم نظر آنے" کا مفہوم "دریا کے پانی کی قدر و قیمت کی کمی" کا احساس ہے!

جگر کے شعر کا مرکزی تخیل:۔

"اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی فراوانی کا احساس دلانا اور جذبہ شکر کو اُبھارنا ہے۔ لفظوں کے در و بست سے لے کر معنویت تک اور خیال سے لے کر پیرایۂ بیان تک یہ شعر اپنی جگہ مکمل ہی نہیں حسین و اثر انگیز بھی ہے۔

رضوان الندوی
(مقیم دمشق)

عقل و جنوں اقبال کی کسوٹی پر

اقبال کے یہاں عقل اپنے تمام علوم و فنون، فلسفہ و حکمت، ایجاد و اختراع، تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک اکائی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ اس سے موجودہ مغرب کا مدرسۂ فکر بھی مراد لیتے ہیں۔ عقل کے ساتھ وہ انہی معنوں میں اکثر فکر و نظر، اندیشہ و حکمت اور علم و ادب کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جنوں اُن کے یہاں دیوانگی اور بے خبری و مدہوشی کا نام نہیں بلکہ وہ انسان کی اُس قلبی طاقت کا نام ہے جس سے اُس کے تمام اعمال و افعال میں زندگی و حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے بغیر زندگی کے سارے مظاہر مردہ و افسردہ ہیں، جنوں کے ساتھ ہی وہ اکثر اسی معنی میں عشق و جذب، ذکر و محبت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں!

علامہ اقبال کے کلام میں ہمیں عقل و جنوں یا علم و عشق کے موضوعات بکھرے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ ایک کو موضوعِ فکر بناتے ہیں تو کبھی دوسرے کو اور کبھی دونوں کا بر سبیل مقابلہ و موازنہ یکجا ذکر کرتے ہیں۔

اگرچہ پہلی اور سرسری نظر کے بعد ہی ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال خود "صاحب جنوں" یا "مردِ عشق" ہیں ؎

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر　　شریکِ زمرۂ "لایحزنوں" کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

یہ بھی اُن کے جگر پاروں سے بآسانی دریافت ہو جاتا ہے کہ علم و دانش کا یہ مردِ میداں "جنونِ بے ساماں" کے سامنے سر بزیر ہو چکا ہے اور اُسی کا کشتہ اور اسی کے فیض سے پُر دم و زندہ ہے ؎

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال　　مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ
من بندۂ آزادم عشق است امامِ من　　عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجموعی طور پر اقبال نے جنون یا عشق کو اپنے یہاں پہلی جگہ دی ہے اور وہی ان کے نزدیک "میر کارواں" ہے لیکن فکر و عقل کا وہ سرے سے انکار نہیں کرتے، اُس کی حیثیت اُن کے یہاں ثانوی ہے اور اگر وہ اپنی حدود دائرہ کے اندر ہی تو پھر جنوں کی دمساز اور شریک ہے اور کمالِ انسانی کیلئے دونوں لازم و ملزوم۔ مسلمان کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

آپ نے دیکھا کہ نہایت اندیشہ اور کمالِ جنوں پہلو بہ پہلو ہیں اور ان کے بغیر تکمیل حیات ناممکن ہے، ایک دوسرے موقع پر الفاظ و اسلوب کے تغیر کے ساتھ اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم　　کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں　　تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

اس حد تک تو اُن کے یہاں ان دونوں اضداد میں ہم آہنگی اور صلح ہے۔ لیکن جب عقل تنہا ڈکٹیٹر بن جائے اور دل و نظر اُس کے

ندیم و رفیق نہیں تو پھر وہ ناکارہ اور کبھی یا غلط کار نظر آتی ہے۔ حقیقتِ وحی کے ذیل میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا جذبِ عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

اصل میں اس "عقل بے مایہ" یا "عقل محض" سے اُن کی ساری پیکار ہے اور اس کو اپنے یہاں وہ کوئی جگہ دینے کو تیار نہیں وہ اپنی عیاری سے نئے نئے قالب اختیار کرتی اور انسانیت کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے ؎

عقل عیّار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے — عشق بیچارہ نہ صوفی ہے نہ مُلّا نہ حکیم

درآنحالیکہ یکرنگ عشق ان ہتھکنڈوں سے بالکل دُور ہے۔ پھر اس عقل کی ایک بڑی خرابی اس کا نکماپن ہے۔ یہ انسان کو شدائد و خطرات کے مقابلہ سے روکتی اور چین و چناں کرکے اس کو بزدل بناتی ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

یہاں بھی عشق کی سخن گسترانہ بات آگئی ہے۔ ورنہ مقصود عقلِ تمرّد کی حیرانی اور خوف دکھانا ہے۔ یہ عقل انسان کو ظاہر پرست بناتی اور حقیقتوں کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ کرتی ہے۔ چنانچہ آج کا یہ انسان زبردست انکشافات اور کائنات کا دل چیرنے کے بعد بھی اس "ظاہر" کے ماوراء "حقیقتِ کبریٰ" یا "کثرت" کے حجابات کے پرے "وحدت" کو نہ پاسکا۔ یہ اپنی منطقی پیچیدگیوں اور فلسفہ کی بھول بھلیوں میں اصل راہ کو گُم کردیتی ہے۔ اپنے شیدائی کو سرگشتہ و حیران رکھتی اور اس میں تذبذب اور بے یقینی پیدا کرتی ہے۔ ؎

انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دُوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

"زمانہ حاضر کے انسان" کے عنوان سے ایک مستقل اور مختصر نظم ہے۔ جس میں اس عقل بے مایہ کی کوتاہ دستی اور نارسائی کو بہت لطیف اور حقیقت آمیز پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

عشق ناپید و خرد میگزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس عقل بے مایہ یا علم بے نور کی یہ ساری کجروی ہے جس کا سیلاب مغرب سے قدیم و حاضر میں اُمڈا ہے اور جس کی برکات شک و تذبذب الحاد و بے دینی، بے ضمیری و نفس پرستی، شہوانیت و بہیمیت اور فسق و فجور رہی ہے۔ اسی نے ایٹم اور ہائیڈروجن بم کو جنم دیا۔ اور اُس نے مغرب و مشرقی مغرب میں انسان سے انسانیت کا جامہ اُتار کر اس کو ایک وحشتناک اور بے رحم درندے میں تبدیل کردیا ہے۔ جن کی دُنیا میں "سستی شہرت" اور "مکروہ فحش" کے "گندے نالاؤں" یا پھر آگ اور دھوئیں کے بادلوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس عقل کو لے کر انسان کیا کرے جو اس کو پرندہ کی طرح فضا میں اُڑنا اور مچھلی کی طرح سمندر کی تہوں میں تیرنا تو سکھادے لیکن وہ انسان کو انسان نہ بناسکے۔ شاید اسی صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھ کر غالب نے کہا تھا کہ ؏

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

وہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار — شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک مختصر نظم جس کا عنوان "علم و عشق" ہے اور جو اپنی لطافت اور زور کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ اس میں علامہ نے بہت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ علم و عشق کا موازنہ کیا ہے ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن　　عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات　　علم ہے پیدا سوال عشق ہے پیدا جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں　　عشق کے ازلی غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں　　عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام　　شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام　　علم ہے ابن الکتاب عشق ہے امّ الکتاب

جنوں اقبال کے یہاں محسوس بھی ہے اور محسوسات سے ماورا بھی۔ میرا مطلب ہے کہ کبھی تو وہ خود عمل و حرکت کا نام ہے اور کبھی وہ حرکت و عمل کی وہ بے پناہ قوت ہے جس سے زندگی میں گرمی و حرارت، عالم میں شادابی و رونق اور قلب میں یقین و سکون پیدا ہوتا ہے اپنی حرکت و عمل کی لامحدود قوت سے کبھی یہ جنون تقدیر کو بھی بدلتا نظر آتا ہے ؎

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے　　جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں　　عشق سیتا ہے انھیں بے سوزن و تارِ رفو

انسانیت کے سارے محیر العقول عجائبات اور زبردست کارنامے اس "عشق بلا خیز" کا کرشمہ ہیں۔ نمرود کی آگ میں یہی عشق کودا تھا۔ بدر و حنین میں بھی یہی عشق معرکہ آرا تھا۔ کربلا کے معرکہ میں بھی یہی عشق خوں چکاں تھا ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہی عشق بیچارہ یا "جنونِ آتش بجاں" ہے جو خود سر اور گردن کش عقل سے نبرد آزمائی کرتا اور اُسے نیچا دکھاتا رہتا ہے ؎

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی　　باہر نہیں کچھ عقلِ خداداد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا　　اک دل ہے کہ ہر لحظہ اُلجھتا ہے خرد سے

محسوسات سے ماورا وہ ایک زندہ و پائندہ کیفیت کا نام ہے جو زندگی کی اصل اور روح ہے اور جس کے بغیر ہر انسانی کوشش و تخلیق بے جان و سرد ہے ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

"مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" دو طویل اور پُر کیف و ولولہ انگیز نظموں میں علامہ نے انتہائی جذب و لطافت کے ساتھ عشق کی کیفیات و صفات اور امتیازات و کمالات کو گنایا ہے۔ ایک موقع پر عقل پر تنقید کرتے ہوئے جنوں کی ایک پوشیدہ اور ممتاز صفت "ادراک" کا ذکر کیا ہے ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ　　کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

اسی عشق پر شرع و دین کی بُنیاد ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

اس مضمون کے بظاہر انسکھے پن پر اچنبھے کی کوئی ضرورت نہیں - یہ درحقیقت انما الاعمال بالنیات کی طرف اشارہ ہے شریعت میں ہر عمل کی شرط یہ ہے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ اور سنّتِ نبویؐ کے مطابق ہو - ورنہ اس کی کوئی قیمت نہیں - منافقین کا ایمان مقبول نہیں - اسی جذبۂ اخلاص و اتباع کا نام اقبال کے یہاں عشق ہے - بلکہ یہی عین ایمان ہے - جس کا اقبال نے بارہا ذکر کیا ہے -

غرضکہ جیسا ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے جنون و عشق کے لفظ کو پاکیزگی و لطافت کے ساتھ معانی و حقائق کی ایک وسیع دنیا سے مالا مال کر دیا ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ عقل و جنوں کے تضاد کو ختم کرنے اور اُن کو باہم جمع کرنے کی علامہ نے کیا صورت اختیار کی ہے -

درحقیقت عقل کا اُن کے یہاں ایک مقام ہے جس سے اگر وہ تجاوز نہ کرے تو مفید اور کارکُشا ہے، ورنہ تباہ کن ہے - یہ مقام دل و نظر یا عشق و وحی کا اتباع ہے اگر عقل جنون کی دمساز اور شریکِ کار ہے تو رحمت ہے ورنہ زحمت ہی زحمت ہے - اس عقل کا نام اقبال کے یہاں "عقل جہاں بیں" یا "دانشِ نورانی" ہے اور انسانیت کو اس سے مفر نہیں ؎

اک دانشِ برہانی اک دانشِ نورانی ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر ست بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر ست

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ عالم با اوست

یہ "عقلِ پاک" جنوں کے کوچوں میں ہی دستیاب ہو سکتی ہے ؎

پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلہ کو شرر سے

اقبال کے نزدیک "مسلم صادق" ہی انسان کامل ہو اور اس کی حقیقت "نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں ہے"؛ اور اس طرح عقل و جنوں کا معرکہ ختم ہو جاتا ہے !

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم

حیدرآباد دکن نے چھوٹے پیمانہ پر حقیقت میں قرطبہ اور بغداد کی علمی مجلسوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اربابِ کمال کھنچ کھنچ کر سرزمین دکن میں پہنچ گئے تھے۔ ان آنکھوں نے دکن میں جو چہل پہل دیکھی ہے اور علم و کمال کے جن جمگھٹوں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حیدرآباد ہی میں سب سے پہلے نیاز حاصل ہوا۔ اُن کے مضامین کے ذریعہ غائبانہ تعارف تو تھوڑا بہت پہلے ہی سے تھا۔ حیدرآباد کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں اُن کی تقریریں سُن کر یہ غائبانہ تعارف، تعلقِ خاطر سے بدل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد دکن میں سیاسی اور مذہبی جلسوں کا بڑا زور و شور تھا۔ بہت ہی کم ایسے جلسے ہوتے تھے جن کے پروگرام میں میری "نظم" نہ شامل ہوتی ہو۔ قایدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی تقریر اور میری نظم جلسوں کے پروگرام میں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ انہی جلسوں کی بدولت مولانا گیلانی مرحوم سے تعارف ہوا اور یہ جان پہچان رسمی تعارف ہو کر ہی نہیں رہ گئی بلکہ ربط و اخلاص بڑھتا ہی چلا گیا۔

میں نے اپنی مشہور نظم "ظہورِ قدسی"[1] کہی تو اُسے لے کر مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُن دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے قریب ایڈیکمیٹ میں رہتے تھے، میں نے نظم سُنائی، تو اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوگئیں۔ کاش! عشقِ رسولؐ کے ان موتیوں کو میں چُن سکتا! میری اس نظم پر مولانا گیلانی مرحوم نے مقدمہ لکھا اور نظم کی شہرت و مقبولیت کی جو پیشگوئی انہوں نے اُس وقت کی تھی۔ وہ بعد میں جاکر حرف بحرف پوری ہوئی۔ میری سعادت اور خوش نصیبی کی انتہا ہو کہ دو سال پہلے جب میں نے روضۂ رسولؐ پر حاضری دی تو مسجدِ نبوی کے دروازوں پر یہ نظم (ظہورِ قدسی) کتابی صورت میں تقسیم ہو رہی تھی۔

حیدرآباد دکن میں ایک نیک نفس بزرگ مچھلی والے شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کی عقیدت کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ سر اکبر حیدری مرحوم تک اپنے تمام اعزاز و مرتبت کے باوجود اُن کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ انہی شاہ صاحب کے ایک خلیفہ مولوی محمد حسین صاحب تھے، جو دکن کی ایک جاگیر (دیپرتی) میں ناظم تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب مرحوم کو توحید کے اسرار و معارف کی شرح و تفسیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے "طولِ لسان" عطا فرمایا تھا۔ گھنٹوں "لا الٰہ الا اللہ" کی تفسیر فرماتے اور کئی کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا مگر مضامین کی تکرار اور اعادہ نہ ہونے پاتا۔ ہر لمحہ نئی تشریح اور تازہ سے تازہ تر مضامین! مولانا مناظر احسن گیلانی بھی اُن کے عقیدت مندوں میں تھے

---

[1] سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی۔

ایک دن میں اپنے مکان[1] میں تھا کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی چوکھٹ کے قریب کھڑے ہیں۔ اُن کو شاید محسوس بھی نہ ہوا ہو۔ مگر میں نے دیدہ و دل ان دونوں بزرگوں کے قدموں تلے بچھادیئے۔ فرمانے لگے، "ہم تمہیں مولوی محمد حسین صاحب قبلہ کے یہاں لے چلنے کے لئے آئے ہیں"۔ میں آن کی آن میں شیروانی پہن کر تیار ہوگیا۔ مولوی صاحب مرحوم کے یہاں ہم پہنچے تو وہ مجھے دیکھتے ہی بولے:-

"عہدہ بہت چھوٹا ہے۔ ابھی اور ترقی ہونا......... اور .... ترقی"

وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر میں چلا آیا۔ صوفی محمد حسین صاحب قدس سرہٗ کی ذات اور شخصیت میں بڑی جاذبیت بلکہ محبوبیت تھی۔ ساری عمر وعظ و تلقین ہی میں گزار دی۔ اور توحید کے وہ نکتے بیان کئے کہ بڑے بڑے کتابی علم رکھنے والوں کو حیران و ششدر کردیا۔

ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم!

کسی نہ کسی عنوان اور تقریب سے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سے نیاز حاصل ہوتا ہی رہتا اور ہر ملاقات میں میری نیازمندی اور اُن کی کرم فرمائی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوجاتا۔ جب ملتے بڑی کشادہ خاطری اور بے تکلفی کے ساتھ ملتے۔ اپنی علمی عظمت اور شہرت کا احساس تک نہ ہونے دیتے!

حیدرآباد دکن سے قطع تعلق کے بعد ۱۹۴۹ء تک کوئی آٹھ نو سال کی مدت ہوتی ہے، اس مدت میں مولانا گیلانی سے نہ تو پھر ملنا ہوا اور نہ خط و کتابت کی نوبت آئی۔ جب میں نے "فاران" نکالنے کا ارادہ کیا تو اُن کی خدمت میں مضمون کے لئے عریضہ بھیجا۔ جواب میں مضمون روانہ فرمایا اور ساتھ ہی محبت آمیز مکتوب بھی! مولانا مرحوم نے اس کے شاید تین چار مہینے کے بعد پھر ایک اور مقالہ روانہ فرمایا مگر وہ "فاران" میں نہ چھپ سکا۔ اسی شرمندگی کے سبب کئی سال تک میں اُن کی خدمت میں خط بھیجنے کی جرأت نہ کرسکا۔ مگر رسالہ (فاران) مولانا کی خدمت میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا رہا۔

جب میں زیارت حرمین شریفین سے واپس ہوا تو اُس وقت علامہ گیلانی مرحوم کا گرامی نامہ آیا۔ جسے میں نے بار بار پڑھا۔ اور اُن کو مجھ نابکار کی ذات سے جو غیر معمولی حُسن ظن تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے مکتوب میں فرمایا تھا۔ اُس نے مجھے خوب رُلایا۔ اُن کی تحسین و ستائش سے مجھے غرقِ ندامت کردیا!

مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہٗ علم و فضل، اخلاق و کردار اور وضع قطع کے اعتبار سے عُلماءِ سلف کا نمونہ تھے۔ گداز بدن، متوسط قد و قامت، گندمی رنگت، چہرے پر داڑھی کتنی بھلی لگتی تھی۔ مسکراہٹ کا خاص انداز تھا۔ باتیں بڑی دل نشین کرتے اور اُن میں جو ایک "جذب" کی سی کیفیت تھی، اُس نے اُن کی ذات میں بڑی جاذبیت پیدا کردی تھی۔

درسِ نظامی کی تکمیل امتیازی شان کیساتھ کی۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں خود اُن کے اساتذہ اُن کی ذہانت اور فہم و دانش کے معترف تھے۔ سب کچھ پڑھ کر پھر ٹونک پہنچے اور حضرت مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ سے علوم عقلی میں استفادہ کیا۔ علامہ برکات احمد جیسا کامل استاد اور مناظر احسن جیسا ذہین شاگرد، ہم جیسے بے علم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ کہ استاد نے کیا سکھایا اور شاگرد نے کیا حاصل کیا؟

مولانا مرحوم کی زندگی کا زیادہ زمانہ دکن میں گزرا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں برسوں شعبہ دینیات کے صدر رہے۔ ایک ہزار سے اوپر

---

[1] واقع ملک پیٹ (حیدرآباد دکن)

تنخواہ ملتی تھی۔ ہر طرح کے فراغت کے اسباب میسر تھے، موٹر نشین تھے، بنگلہ میں رہتے تھے، بلدہ حیدر آباد کے ہر طبقہ میں اُن کا احترام کیا جاتا تھا۔ بلکہ لوگ آنکھوں پر بٹھاتے تھے، مگر مزاج میں انکسار اور طبیعت میں تواضع کا رنگ ہمیشہ باقی رہا!

مولانا گیلانی اونچے درجہ کے واعظ نہیں مُقرر (اسپیکر) تھے۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم جو تقریر میں اپنا آپ جواب تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ "میں نے تقریر کرنی مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے، میں اُن کے پیچھے موٹر لئے پھرتا تھا جہاں اُن کی تقریر ہوتی وہاں جا کر اُن کو ضرور سُنتا"۔۔۔ اُن کی تقریر میں خطابت کی تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ آخر میں بیماری کے سبب تقریر میں اُلجھنے لگے تھے۔ مگر اس دورِ انحطاط میں بھی جب سنبھل کر بولتے تو خطابت کا حق ادا کر دیتے۔

تحریر میں قلم کی روانی کا یہ عالم کہ ذرا سی بات پھیل کر ایک اچھا خاصہ دفتر بن جاتی۔ "اختصار و ایجاز" انھیں ناپسند اور شرح و اطناب سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ معلومات کے انبار کے انبار لگاتے چلے جاتے۔ اُن کا قلم طوفان کی طرح خس و خاشاک اور لالہ و گل سب کو اپنی رَو میں بہائے جاتا۔ تحریر میں "انجیل" کا انداز جھلکتا تھا۔ "النبی الخاتم" میں مولانا گیلانی کی تحریر کے جوہر پوری طرح جھلکتے ہیں۔ دسیوں کتابیں اور درجنوں طویل مقالے یادگار چھوڑے!

شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی، خود بھی اچھے شعر کہتے تھے۔ مگر اُن کے دُوسرے کمالات کے سامنے اُن کا یہ وصف دبا اور چھپا ہی رہا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی وفات پر جو فارسی نظم کہی تھی اُسے علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا!

ذاتِ رسالت مآبؐ سے مولانا گیلانی مرحوم کو جو محبت اور عشق تھا۔ وہی اُن کی سیرت و کردار کا سب سے زیادہ نمایاں باب ہے عشقِ رسولؐ کی زادِ راہ لے کر جس نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہو اُس کی سعادت اور خوش نصیبی کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ دل بڑا درد مند پایا تھا۔ دُنیا کے کسی خطہ سے بھی مسلمانوں کی مظلومیت کی کوئی خبر سنتے تو بے چین ہو جاتے۔ بہار اور دکن میں مسلمانوں کی تباہی اور قتل و غارت گری کے روح فرسا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور مظلوموں کی جگر خراش داستانیں اپنے کانوں سے سُنیں۔ اِس نے اُن کے دل میں اور زیادہ گداز پیدا کر دیا تھا۔ مولانا گیلانی "نالۂ نیم شب" اور "آہِ سحر گاہی" کی لذت سے بھی آشنا تھے۔ اور وہ اُن لوگوں میں سے تھے کہ خشیتِ الٰہی کے سبب جن کے آنسوؤں سے سجادہ سچ مچ بھیگ جاتا ہے۔ صاحبِ حال و قال، اہلِ جذب و سوز۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو معطر فرمائے کہ اُن کے اٹھ جانے سے خیر و فلاح اور علم و فضل کی مسند خالی ہو گئی۔ اُن کی موت کا اُن کے کس عزیز کو پُرسا دیجئے کہ مولانا گیلانی مرحوم کے ہم تمام مغموم عقیدت کیش اور نیاز مند خود تعزیت کے مستحق ہیں!!

(رحمۃ اللہ تعالیٰ)

---

[۱] بہ عشقِ مصطفےٰ دیوانہ بودی۔

معراج کی رات

ڈگمبر پرشاد گوہر دہلوی

کھل گئے چرخ پہ اسرارِ خدا آج کی رات　　پڑ گئی عرش پہ بنیادِ وفا آج کی رات

ہے فرشتوں میں بھی اک شور بپا آج کی رات　　عرش پر آتے ہیں محبوبِ خدا آج کی رات

کس کے پرتو سے منور ہے بساطِ عالم　　عرش پر کون ہوا جلوہ نما آج کی رات

اللہ اللہ! یہ اعزازِ محمدؐ دیکھو!　　خود طلب کرتا ہے بندے کو خدا آج کی رات

اس طرح پھیلی ہے کچھ روئے محمدؐ کی ضیاء　　ذرۂ خاک بھی مہتاب ہوا آج کی رات

"بمقامے کہ رسیدی نہ رسد، ہیچ نبیؐ"　　خود یہ کہتا تھا محمدؐ سے خدا آج کی رات

نورِ عرفاں سے مرا دل بھی ہے روشن گوہر
ظلمتِ کفر میں پھیلی ہے ضیا آج کی رات

..... کیا ہوگا؟

ابوالاشرف شبیر بخاری (ایم اے)

کمالِ عشق کی ناپختگی کا کیا ہوگا؟　　زوالِ عقل کی بخیہ گری کا کیا ہوگا؟

چھپا ہے دیدۂ انساں سے جلوۂ رخِ دوست　　یہ آگہی ہے تو اس آگہی کا کیا ہوگا؟

نمودِ صبح پہ ہے شب کی تیرگی کا گماں　　یہ روشنی ہے تو اس روشنی کا کیا ہوگا؟

رکھی ہے جس کی بنا، بیکسوں کی آہوں پر　　یہ خواجگی ہے تو اس خواجگی کا کیا ہوگا؟

وطن میں اسوۂ شبیرؓ جس سے عام نہیں
یہ شاعری ہے تو اس شاعری کا کیا ہوگا

تبصرہ

اکبر زمزم

ہم یہ سمجھے تھے گلستاں میں بہار آنے پر　　نظم و ترتیب کا انداز بدل جائیگا

کیا خبر تھی کہ سیاست کے حسیں نغموں کی　　لَے وہی ہوگی مگر ساز بدل جائیگا

(مولانا محمد علی جوہر)

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست　　اُس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

(مولانا روم رح)

از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

فردوسِ تغزّل

(رشید کوثر فاروقی)

لمحہ بہ لمحہ دم بہ دم نقص بھی ہے، کمال بھی ایک ہی شے ہے جس کا نام بدر بھی ہے ہلال بھی

غربت آوارہ بڑی مشکل سے گلشن تک گئے ہر قفس کی خاک چھانی تب نشیمن تک گئے

اشتیاقِ جلوہ کو جلوہ سمجھ بیٹھا ہوں میں یہ تو میری ہی نظر کے تار چلمن تک گئے

ہر نگاہِ دوست کی تعبیر کچھ آساں نہ تھی بارہا ناوک پلٹ کر ناوک افگن تک گئے

حیف ایسے طائروں پر جو قفس کے ہو رہے یا بڑی پرواز کی تو شور و شیون تک گئے

اے امیدِ بے عمل تُو آج کل کرتی رہی پھر ترے جھولوں کے دن آئندہ ساون تک گئے

(ڈاکٹر ماتا پرشاد استھانہ زیب - بریلوی)

موج کے ساتھ تلاطم کا سہارا لے کر کشتیٔ عمرِ رواں شوق سے چل سکتی ہے

جادۂ شوق کے ہر موڑ سے جانِ منزل! تجھ سے ملنے کیلئے راہ نکل سکتی ہے

نیم پژمردہ یہ کلیاں نہ ہوں مایوس ابھی رُخ ہوا صحنِ گلستاں کا بدل سکتی ہے

زندگی رنگ بدلتی ہے تو بدلے لیکن موت بھی زیست کا عنوان بدل سکتی ہے

جب محبت میں کچھ انقلاب آگیا غم کی دوشیزگی پر شباب آگیا

التفاتِ نظر کی یہ مجبوریاں مری جانب جو دیکھا حجاب آگیا

تیرے جلووں کا دورِ مسلسل ہے یہ ماہ و انجم چھپے آفتاب آگیا

سید آلِ رضا لکھنوی

کشتِ بے آب نے دیکھے ہیں وہ کالے بادل جو کہیں اور برسنے کو ادھر سے گزرے

فضلی

آئی بڑھ بڑھ کے مگر رہ گئی چھو چھو کے قدم موج نے جب بھی یہ چاہا مرے سر سے گزرے

نجم آفندی

گرتے گرتے اُن کا دامن تھام لے گرنے والے! لغزشوں سے کام لے

(ماہر القادری)

تاروں میں محبت کا جہاں ڈھونڈ رہا ہوں گزری ہوئی راتوں کے نشاں ڈھونڈ رہا ہوں

سحر اگرچہ ہے دھندلی مگر ہوئی تو سہی دعائے نیم شبی کارگر ہوئی تو سہی!

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

کراچی میں کچھ شوخ مزاجوں نے "حسینۂ پاکستان" کے انتخاب کے لئے "مقابلہ" کا انتظام کیا تھا۔ کمیٹی بن چکی تھی۔ قریب قریب تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ عوام نے اس پر احتجاج کیا کہ ہم اس بے غیرتی کو برداشت نہیں کر سکتے کہ مسلمان عورتیں حسن کے مقابلوں میں شریک ہوں اور غیر مرد اُن کے اعضاءِ جسمانی کے تناسب اور حسن و جمال کی نزاکت و رعنائی کا جائزہ لے کر بہت سی عورتوں میں سے ایک عورت کو "حسینۂ پاکستان" منتخب فرمائیں! غنیمت ہے اور بہت غنیمت ہے کہ عوام کے اس احتجاج کی بروقت شنوائی ہو گئی اور یہ مقابلۂ حسن روک دیا گیا۔

تماشائی کو اُن شاہدانِ خوبی و رعنائی اور بتانِ نازو ادا کی تمناؤں پر بڑا ترس آتا ہے کہ جو گھٹ کر، دب کر، تلملا کر بلکہ زندہ درگور ہو کر رہ گئیں۔ ہائے! یہ دقیانوسی مُلّانے! جو پاکستان کو نہ جانے کیا بنا کر چھوڑیں گے! "ترقی" سے تو اِن کو سدا کا بیر ہے! صاحبو! ان "مُلّانوں" کے احتجاج کا اگر اسی طرح وزن محسوس کیا جاتا رہا اور اُن کی بات یونہی چلتی رہی تو پاکستان کے شراب خانوں اور ناچ گھروں میں ایک دن خاک اُڑتی اور کتنے روتے ہوئے نظر آئیں گے ــــ اور ہمیں سب سے زیادہ ہمدردی عوامی لیگ کے "پاپائے اعظم" مسٹر شہید سہروردی سے ہے، اِن کی راتیں کہاں بسر ہوں گی!

پاکستان کے مغرب زدوں اور "صاحب لوگوں" نے اگر اس خطرے کو محسوس کر کے اس "دقیانوسیت" اور "قدامت پرستی" کا مقابلہ نہ کیا تو وہ دن دُور نہیں ہے کہ ان "مُلّانوں" کی کوششوں کی بدولت پاکستان ایک "خطۂ بے رنگ"۔ "جہانِ بے ذوق" اور "عالمِ بے کیف و مستی" بن کر رہ جائیگا۔ جہاں نہ لوگ شراب کے جام چھلکا سکیں گے۔ نہ گلے میں باہیں ڈال کر عورت مرد رقص کر سکیں گے۔ نہ گھوڑ دوڑ کا جوا باقی رہے گا، نہ کوئی سٹہ کھیل سکے گا۔ نہ عورتیں سڑکوں پر اپنے اسبابِ زینت کی نمائش کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ یہ سب شوخیاں ــــ رعنائیاں، لذتیں، خلاص ــــ ایک دم خلاص! یہ نظارہ بازیاں رخصت! ان تفریحوں اور بے باکیوں کا ڈراپ سین!

مگر اس کو کیا کیجئے کہ سنجیدگی کا، شرم و غیرت کا، پاکیزگی اور نیک چلنی کا یہ دَور تو پاکستان میں بہر حال آکر رہیگا۔ جنہیں یہ تبدیلی ناگوار ہو اور اس انقلاب کو برداشت نہ کر سکیں۔ اُن کو چاہیئے کسی ایسے ملک کا رُخ کریں۔ جہاں اُن کو اس "خشک مُلّائیت" سے نجات مل سکے!

لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی بالقابہم العالی اگر مسلم لیگ کی حمایت میں کمزوری نہ دکھاتے اور اپنے مؤقف پر سختی کے ساتھ جمے رہتے تو مسلم لیگ کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر تماشائی عرض کرتا ہے کہ وزیر اعظم مسلم لیگ کے وقار کو سنبھالتے یا اپنی وزیر اعظمی کو! ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے! اور پھر ہمارے وزیر اعظم اللہ کے فضل سے بڑے مُدبّر ہیں، زیرک اور دانشمند واقع ہوئے ہیں۔ وہ طوفان کی نبض دیکھ کر کشتی کا رُخ بدلتے رہیں۔ طوفان کا رُخ بدلنے کا خطرہ وہ مول لینا نہیں چاہتے۔ وہ جو علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ ؏

تو اگر میرا نہیں بنتا مگر اپنا تو بن

یہ بات وزیراعظم صاحب نے اپنی گرہ میں خوب کس کر باندھ لی ہے! اور یوں بھی بند مٹھی کا بھرم بڑی چیز ہے!

روایت کی گئی ہے۔ یہ روایت جھوٹی ہے یا سچی اس کا گناہ راوی کی گردن پر ــــ یہ کہ کراچی میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کے لئے ایک صاحب کو ہزار روپے دیئے گئے۔ جلسہ ہوا، اور کیوں نہ ہوتا۔ روپے کے زور پر رنڈیاں ناچ سکتی ہیں تو جلسہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ایک ہزار روپے کا خرچ اور حاضرین کی تعداد لگ بھگ پانسو! جن میں محلہ کے کچھ نابالغ لونڈے بھی تھے۔ اور کچھ راہگیر، روشنی اور شامیانے کو دیکھ کر آ کھڑے ہوئے تھے! تماشائی عرض کرتا ہے کہ کراچی میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کو دیکھ کر دو دو روپے میں کسی جلسہ کے لئے اگر ایک عدد "حاضرین" ہاتھ لگ جائے تو یہ سودا ارزاں ہے گراں نہیں ہے!

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جب لاہور میں اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اور اسپیکر کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا تو اُس وقت سردار عبدالرب نشتر کو لاہور میں ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ سیاسیات میں شخصیتوں کا ذاتی اثر بہت کچھ کام کرتا ہے ــــ مگر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ سردار نشتر صاحب سرحدی پٹھان ہونے کے باوجود "لالہ مزاج" واقع ہوئے ہیں۔ محتاط، دور اندیش! پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے! روز ازل جب "قسمتیں" بٹنے لگیں تو نشتر صاحب کو "جرأت" کی جگہ "مونچھیں" ملیں ــــ گھنی سے گھنی بھی اور لمبی بھی، خاصی پُر رعب! تو جو چیز اُنھیں قدرت کی طرف سے ملی ہے اُس کا وہ مظاہرہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ اور جو چیز اُنھیں دی ہی نہ گئی اُسے کہاں سے لے آئیں۔

تماشائی کہتا ہے کہ اس فتنہ پرور دور میں "شریر جرأت مندوں" کے مقابلہ میں یہ "شریف بے جرأت" لوگ پھر غنیمت ہیں!

آقا:- (ملازم سے) اندر سے فقط تکیہ لے آؤ؟

(ملازم اندر چلا جاتا ہے اور بہت دیر ہو جاتی ہے مگر واپس نہیں آتا)

آقا:- (جھنجلا کر) تم ابھی تک تکیہ لے کر نہیں لوٹے؟

ملازم:- حضور! تکیہ تو مل گیا۔ "فقط" نہیں ملا، اُسے ڈھونڈ رہا ہوں۔

تصحیح

صفحہ (۴۲)، (فاران ماہ جون ۵۶ء) ــــ اور صفحہ ۵۲ (فاران ماہ جون ۵۶ء)

یہ دونوں مصرعے علی الترتیب:-

ع وہ بچہ ایک بیکس کی اساس زندگی

ع ہر ورق اس کا دفتر صنعت کردگار ہے

بحر سے خارج نہیں ہیں۔ اور وزن کے اعتبار سے درست ہیں۔

روحِ انتخاب

سوال:- (از مجیب الرحمٰن - ضلع گلبرگہ (دکن) زیارتِ قبور - حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارتِ قبور کے متعلق تاکید کی ہے کہ قبروں کی زیارت کرو تاکہ موت یاد آئے - براہ مہربانی معلوم کرائیے کہ زیارت کس طرح کریں؟ وہاں جاکر کیا پڑھیں؟ اور زیارتِ قبور کے لئے کونسا وقت موزوں ہے؟

جواب:- اللہ کے رسولؐ نے بیشک زیارتِ قبور کو پسند فرمایا - لیکن جس وجہ سے پسند فرمایا وہ بھی ساتھ ہی بیان کردی - یعنی "تاکہ موت یاد رہے"۔

موت کو یاد رکھنا بجائے خود کوئی عبادت نہیں - بلکہ یہ ذریعۂ عبادت اور وسیلۂ خیر ہے - اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ موت کے بعد ہر شخص سے حساب کتاب لیا جائیگا اور اللہ کے رسولؐ نے عذابِ قبر کی بھی خبر دی - جب کسی مسلمان کو موت یاد رہے گی تو زندگی میں وہ ایسے بُرے اعمال سے بچنے کی کوشش کرے گا جن کی سزا میں موت کے بعد کا عذاب درپیش ہو - بس اسی لئے موت کو یاد رکھنے کا سبق دیا گیا اور قبریں چونکہ موت کے تصور کو دل و دماغ سے وابستہ کرنے میں بہت قوی الاثر ہیں اور قبرستان میں پہنچکر انسان کی بے ثباتی اور دُنیا کی ناپائیداری کا گہرا نقش دل پر کندہ ہوتا ہے، اس لئے قبروں کی زیارت کی ترغیب فرمائی گئی!

لیکن قسم ہے اُس خدائے برتر کی جس کے قبضہ میں ہماری جانیں ہیں اگر رسولؐ اللہ اپنی زندگی میں یہ دیکھ پاتے کہ قبروں کی زیارت کو موت یاد رکھنے کی بجائے شیطان کی خدمت اور بددینی کی اشاعت کے لئے اختیار کیا جارہا ہے تو فرماتے کہ ایک ایک قبر کو زمین کے برابر کردو - ایک ایک مرنے والے کا نشان مٹادو - قبروں کا رُخ کرنے والوں کو کوڑے مارو - اور توحید کو شرک ونکاثر سے بچاؤ!

عبرت کا مقام ہے کہ جو زیارتِ قبور زندگی کی بے ثباتی اور موت کی ہمہ گیری یاد رکھنے کے لئے پسند فرمائی گئی تھی - اسے غلامانِ رسولؐ موت کی ہمہ گیری کی دائرے سے مرحوم بزرگوں کو نکالنے اور حیاتِ جاوید کا انوکھا تصور زندہ رکھنے کی غرض سے اختیار فرمائے ہوئے ہیں - قبروں پر وہ اس لئے نہیں جاتے کہ موت کی یاد کو ہر دم تازہ رکھتے ہوئے گناہوں سے بچنے کی جدوجہد کریں گے - بلکہ اس لئے جاتے ہیں کہ بدکاریوں اور گناہوں سے عذابِ آخرت کا جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اس میں سفارش و شفاعت کے ذریعہ کچھ کمی کرالیں، اس لئے جاتے ہیں کہ جو خواہشاتِ نفس ہر امکانی کوشش کے باوجود پوری نہیں ہو سکی ہیں انھیں مرحوم بزرگوں کی وساطت سے پورا کرلیں - اس لئے جاتے ہیں کہ قرآن کے اس اعلان "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" کو جھوٹا ثابت کرتے ہوئے (عیاذاً باللہ) دُنیا کو یہ بتائیں کہ ہمارے بزرگ مرے نہیں محض پردہ کرگئے ہیں - انھیں خاک نے نہیں چاٹا نہ قیامت تک چاٹے گی - وہ خدائی میں اللہ کے شریک اور طاقت و قوت میں چھوٹے موٹے رب ہیں -

ناقابلِ حد تک شرم انگیز ہے یہ حقیقت کہ قبروں پر جانے والے موت کی ویرانی اور عبرت ناکی کو ڈھول ڈھماکوں اور ناچ گانوں، التجاؤں، فریادوں، سجدہ بازیوں اور کن کن خرافاتِ شدیدہ سے ذبح کرکے نہ صرف اپنے فسق وفجور کا کھُلا اعلان کرتے ہیں بلکہ قبروں میں خاک شدہ مرحومین کی شفاعت وسفارش کے بھروسہ پر گناہ و فسق کا نیا عزم و حوصلہ اور تازہ جرأت لے کر لوٹتے ہیں - اُن کی عام زندگی دیکھئے تو نماز روزہ تک سے فارغ نظر آئیں گے اور اسلامی اخلاق اُن کو چھو تک نہ گیا ہوگا - لیکن قبروں پر ہنگامۂ شیطانی برپا کرنے والے

فقیروں اور قوالوں اور مجاوروں کے قدموں پر دامے درمے سخنے اس طرح جھکیں گے گویا قرآن وحدیث کا سارا نچوڑ یہی ہے اور اسی ذریعہ سے قبروں کے مرحوم بزرگ اُن کے سارے اگلے پچھلے گناہ اللہ سے معاف کرا کے جنّت کا دروازہ کھول دیں گے!

بخدا اس طرح کے عقیدے سے تو اچھا عیسائیوں ہی کا یہ عقیدہ ہے کہ پوپ کے حضور گناہوں کا اعتراف کرلو تو سب گناہ معاف ہوئے۔ پوپ آخر ایک انسان تو ہے جسے ربّ حی وقیوم سے کم سے کم اُس بے جان خاک سے تو زیادہ مشابہت ہے جو روحوں سے جدا ہو کر قبروں میں پڑی ہے۔

افسوس بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آپ کا مختصر جواب یہ ہے کہ قبروں پر صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت ہے اور قبروں پر جانے کا واحد مقصد موت کو یاد رکھنا ہونا چاہیئے۔ اور موت کو یاد رکھنے کا لازمی مقصد نیکی اختیار کرنا اور گناہوں سے بچنا ہونا چاہیئے۔ یہ سلسلۂ مقاصد نہیں ہے تو قبروں پر جانا اور مراقبے جمانا اور الحاج ونذر کرنا اور عرس منانا سب حرام۔ خدا کا کلام اور رسُولؐ کا فرمان اگر جھوٹا نہیں ہے تو خدا کی قسم قبروں کو عبادت گاہ اور بازیچۂ لہو ولعب بنانے والے قیامت کے دن آگ کی طرف ہنکائے جائیں گے اور فریاد وماتم کرنے پر اللہ جلّ شانہٗ فرمائے گا کہ جاؤ وہ کھڑے ہیں تمہارے شفیع اور قاضی الحاجات۔ اُن سے کہو تمہیں بچائیں! یہ بدنصیب اُن کی طرف دوڑیں گے تو نظر آئے گا کہ جنہیں انہوں نے شفیع اور قاضی الحاجات سمجھ رکھا تھا اُن کا تو یہ حال ہے کہ جلالِ ربانی کے سامنے آنکھ نہیں اُٹھا سکتے۔ لب نہیں ہلا سکتے۔ اس سے بھی آگے وہ دیکھیں گے کہ اُن کے خود ساختہ شفیعوں اور معبودوں سے ہزاروں درجے اُونچے مرتبے والے انبیاء ورسل تک گھبرائے پھر رہے ہیں اور تنہا۔ پورے میدانِ قیامت میں اکیلا ایک شخص ہے جس کی حالت سب سے جدا ہے جس کے لب بارگاہِ ربانی میں ہل رہے ہیں۔ جو جلالتِ خداوندی سے نظر ملانے کی صلاحیت رکھتا ہے جو آیت مَنْ ذَا الَّذِی یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ کا واحد مصداق ہے ــــ کون؟ سیّد البشر خاتم الانبیاء امام الابرار مرجع الخلائق شفیع المذنبین رئیس المرسلین محمد عربی عبداللہ ورسول اللہ فداہ روحی وعیالی وامی وابی صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ واہل بیتہٖ اجمعین!

ہم کہتے ہیں کہ آج کے دورِ قبر پرستی میں شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے بھی قبروں پر کھلم کھلا جانا اور ہاتھ اُٹھا کر دعائیں مانگنا۔ یا فاتحہ پڑھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ جبکہ جہلا اور مبتدعین کا شوقِ مردہ پرستی بہانوں کے انتظار میں رہتا ہے اور جائز چیز دسیوں ناجائز رسوم وعقائد کی آڑ بن جاتی ہے۔ جو لوگ حضورؐ کے حکم زیارتِ قبور کو نظر انداز کرنے سے واقعتہً خوف کھا سکتے ہیں۔ وہ بالیقین وہی ہوں گے جو زندگی کے ہر فعل وحرکت میں قرآن وسنّت کی مکمل پیروی کر رہے ہوں گے۔ اُنھیں چاہیئے کہ حکم حضورؐ کی اطاعت کرنی ہی ہے تو رات کی تنہائی میں چھپ کر، بچکر قبر پر جائیں اور خلوت کے سنّاٹے میں موت کی اُس یاد کو تازہ کریں جس کی خاطر حضورؐ نے زیارتِ قبور کی ترغیب فرمائی تھی۔ یہ کیا کہ جنرل نے تو حکم دیا کہ فلاں سرحد پر جا کر دشمنوں سے لڑو اور سپاہیوں نے سرحد پر جا کر راگ رنگ کی محفل جمالی۔ اور وہ ساری خرافات شروع کر دیں جنہیں جنرل ہزار بار خلافِ قانون اور ملعون ومردود قرار دے چکا تھا! ویاحسرتا۔

(ماہنامہ "تجلّی" دیوبند)

سید حسن ریاض

کردار

کئی آدمی باتیں کر رہے تھے اور نثار سوچ رہا تھا۔ اس کو اپنے خیال میں اس قدر انہماک تھا کہ اس نے ان کی گفتگو میں سے بہت کم سنا، بالآخر رفیع نے ذرا بلند آواز سے کہا:۔

"یہ کیا ہے نثار! تمہیں ایک مسئلہ پر مشورہ کے لئے بلایا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ کسی طرح متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

نثار نے چونک کر جواب دیا۔ "جس مسئلہ پر تم بلا سوچے گفتگو کر رہے ہو اُسی مسئلہ پر میں بلا گفتگو غور کر رہا ہوں۔"

"اوہ! تم نے تو ہماری گفتگو پر سخت طنز کیا۔ ہماری گفتگو اس کے سوا اور کیا ہے کہ میں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو رہا ہوں اور میرے دوست میری کامیابی کی تدابیر پر اظہار رائے کر رہے ہیں۔ آپ کے لئے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"جی ہاں میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے موزوں ہیں یا نہیں اور اگر آپ کھڑے ہو جائیں تو آپ کو کامیاب ہونا چاہیئے یا نہیں۔" نثار نے بڑی متانت سے کہا۔

رفیع کو یہ سن کر ایک دھکا سا لگا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "نثار کیا یہ بات تمہارے کہنے کی ہے کہ میں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے موزوں ہوں یا نہیں اور اگر میں کھڑا ہو جاؤں تو مجھے کامیاب ہونا چاہیئے یا نہیں۔ تم میرے لڑکپن کے دوست ہو اور میرے عزیز ہو۔ تمہیں یہ خیال نہ آیا کہ اگر تمہاری بہن سنیں گی تو انہیں کیسا صدمہ ہوگا۔ میں نے اُنہی کے متواتر تقاضوں سے یہ قصد کیا ہے۔"

نثار نے ہنس کر جواب دیا۔ "وہ یہی باتیں تھیں جو میں سوچ رہا تھا کہ بہن کو صدمہ ہوگا اور بہنوئی کو شکایت ہوگی۔ مگر پارلیمنٹ کی رکنیت نہ میرے باپ کا ترکہ ہے کہ بہن کی خوشنودی کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کردوں اور نہ آپ کے باپ کا ترکہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے بیوی کی رضا جوئی حاصل کریں۔ یہ قوم کی نیابت کا ایک منصب ہے اور خدمت کا ذریعہ، آپ نیابت اور خدمت کر سکیں گے یا نہیں، یہ قابل غور ہے۔"

"تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مجھ میں نیابت کی صلاحیت اور خدمت کا شوق نہیں ہے۔" رفیع نے فخر کے ساتھ کہا۔

"نیابت کی قابلیت آپ میں ہے مگر خدمت کا شوق بالکل نہیں۔ اور اگر سچ کہوں تو آپ میں نیابت کی صلاحیت بھی نہیں۔ محض خطابت اور سیاست میں نکتہ رسی اور نکتہ سنجی نیابت کے لئے کافی نہیں، کردار ان سب پر مقدم ہے۔ وہ آپ میں بالکل نہیں۔" نثار نے تلخی کیساتھ کہا۔

رفیع کو نثار کی یہ بات ناگوار تو بہت گزری مگر وہ میدان سیاست کا پرانا کھلاڑی تھا۔ غصہ کو ضبط کر کے زور سے ہنسا۔ "آج معلوم ہوتا ہے کہ تم گھر سے کسی بات پر برہم ہو کر آئے ہو اور وہ غصہ مجھ پر اتارنا چاہتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوں اور تم میری مدد نہ کرو اور بیشک یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ بغیر تمہاری رضامندی کے یہ قصد کروں۔"

نثار نے متانت سے جواب دیا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے تھے کہ اس الیکشن کے لئے آپ نے ایک لاکھ روپیہ الگ رکھ دیا ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ کی ضرورت ہوگی تو آپ وہ مہیا کریں گے۔ آپ کو کیا لالچ ہے کہ اس الیکشن پر اتنا روپیہ ضائع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور یہ روپیہ آپ کس مد میں خرچ کریں گے۔ اور یہ روپیہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟ بظاہر آپ کی اسکیم یہ ہے کہ ووٹ خریدیں گے اور کامیابی کے لئے اگر یہ تدبیر بھی

کافی نہ ہوگی تو بااثر لوگوں کو اور عمال اور اہلکاروں کو رشوت دیں گے۔ پھر کامیابی کے بعد وزارت کے لئے کوشش کریں گے، وزیر کی حیثیت سے رشوت لیں گے اور آئندہ الیکشن کے لئے کئی لاکھ روپیہ محفوظ کر دیں گے۔ آپ نے پہلے بھی یہی کیا ہے۔ گویا اس طرح قوم کو آپ جیسے لوگوں سے کبھی نجات نہ ملے گی۔"

رفیع کو اندازہ ہو گیا کہ نثار کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ مگر نثار بڑا بارسوخ سیاسی کارکن تھا۔ اس کو نظر انداز کرنا بھی دشوار تھا۔ اس لئے اُس نے بڑی نرمی سے کہا۔ "نثار تمہیں عملی سیاست کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تم نے صرف قومی تحریکات میں کام کیا ہے اور قومی لیڈروں کی وہ باتیں سنی ہیں جو وہ کارکنوں میں جوشِ خدمت پیدا کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ اور اس جوش کو اپنی کامیابیوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ الیکشن میں ناکام ہونے کیلئے کوئی کھڑا نہیں ہوتا اور کامیابی کے لئے ہر تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ یہ تدبیریں اگر میں نہ کروں گا تو کوئی دوسرا کرے گا اور کامیاب ہو جائے گا۔ بہرحال اس جگہ کے لئے نہ تم کسی صحابی کو لا سکتے ہو اور نہ کسی ولی کو۔ پھر میری مدد کرنے سے گریز کیوں؟ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو ملازمت چاہو گے تو ملازمت دلاؤں گا اور تجارت کرو گے تو اس کے لئے لائسنس دلاؤں گا۔"

"لاحول ولا قوۃ، یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں! میں اس وقت تہیہ کرتا ہوں کہ اگر آپ الیکشن میں کھڑے ہوئے تو میں آپ کی مخالفت کروں گا۔"

نثار یہ کہہ کر بڑے غصے سے اُٹھا اور چلا گیا۔ سب لوگ متحیر رہ گئے اور رفیع کو اپنے حامیوں سے ندامت ہوئی۔

نثار نے اطہر کو رفیع کے مقابلہ کے لئے تیار کیا۔ اور اس کی تائید کے لئے مخلص کارکنوں کا ایک گروہ پیدا کیا۔ پارلیمنٹ کی رکنیت کیلئے اطہر نہایت موزوں تھا۔ ذی علم، خوش فکر، امورِ سیاست سے خوب واقف اور صاحبِ کردار۔ وہ بہت دولت مند نہ تھا۔ لیکن دیانت کے ساتھ الیکشن لڑنے کے لئے بہت دولت مند ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ نثار نے اس سے یہ صاف کہہ دیا تھا کہ ہارنے کے لئے کھڑا ہو رہا ہے۔ اس وقت صرف یہ مقصد ہے کہ انتخابات میں دیانت کی مثال قائم کر دی جائے۔ بااصول اور ایماندار لوگوں کو دو تین الیکشنوں میں ناکامیاں ہوں گی۔ بالآخر بددیانت دولت مندوں کے پاس اتنا روپیہ ہی نہ رہیگا کہ ووٹ خریدیں اور رشوتیں دیں۔ "کافر نتواں گشتن ناچار مسلماں شو" کا مضمون ہوگا۔ اپنی شرارتوں سے انھیں خود ہی باز آنا پڑے گا۔ اور یہ انہی اصولوں کے مؤید ہو جائیں جن کی یہ آج مخالفت کر رہے ہیں۔

الیکشن کی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہوگئی۔ رفیع کو نثار کی مخالفت کی قوت محسوس ہونے لگی۔ رفیع کا روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور اطہر کا سب سے بڑا سرمایہ نثار کی تدابیر، قوتِ عمل اور دلنشین تقریریں تھیں۔ اطہر کی کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

نثار سے مخالفت کا انتقام لینے کے لئے اور الیکشن کے کام سے اس کو باز رکھنے کے لئے رفیع نے ایک جعلی دستاویز بنوائی اور اپنے ایک دوست کو اُس پر ایک لاکھ روپے کا دعویٰ کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ نہایت برہمی کے ساتھ رفیع نے اپنی بیوی سے کہا۔ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ آپ کا بھائی میری کیسی مخالفت کر رہا ہے۔"

"جی ہاں دیکھ رہی ہوں۔" میمونہ نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"کیا اس کا تدارک آپ کا فرض نہ تھا؟" رفیع نے سخت لہجہ میں کہا۔

"میں نے بھائی کو بہت سمجھایا مگر وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ میرے کہنے کا اُن پر اثر نہ ہوا۔ میں لاچار ہوں۔" میمونہ نے لجاجت سے کہا۔

"جی نہیں، لاچاری کا عذر کافی نہیں ہے۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ میرا ساتھ دیں گی یا بھائی کا۔" رفیع نے تلخ لہجہ میں کہا۔

"اس فیصلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس روز سے بھائی نے آپ کی مخالفت شروع کی ہے اور میری درخواست رد کی ہے۔ میں نے اُن سے ملنا

ترک کر دیا ہے" میمونہ نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔

" اگر آپ کو میرا ساتھ دینا ہے تو اس سے بھی زیادہ کرنا پڑے گا۔ میں نثار پر ایک لاکھ روپے کے قرضے کا دعویٰ کرا رہا ہوں۔ اس میں آپکو قرض خواہ کی طرف سے شہادت دینی ہوگی " رفیع نے بے حیائی کے ساتھ کہا۔

میمونہ نے جرأت سے پوچھا۔" بھائی نے ایک لاکھ روپیہ کب قرض لیا ؟ انھیں اس کی کیا ضرورت تھی "

رفیع نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔" انھوں نے قرض لیا نہیں مگر میں کہتا ہوں کہ لیا۔ اور میں نے جعلی دستاویز بنوائی ہے۔ تمہیں اس دستاویز پر گواہی کے دستخط کرنے ہیں اور پھر عدالت میں شہادت دینی ہے "

" وہ جھوٹا قرضخواہ کون ہے جس کی طرف سے یہ دعویٰ ہوگا " میمونہ نے غم و غصہ کو ضبط کر کے سوال کیا۔

" افضل خاں " رفیع نے اختصار سے کہا۔

" ہے ہے ! افضل خاں۔ یہ تو وہی ہیں جن کو ابا جان کی مدد سے یہ ثروت حاصل ہوئی ہے "

" ہاں ہاں وہی افضل خاں۔ تم بھی تو ابا جان کی بیٹی ہو۔ ابا جان کے بیٹے نہ سہی وہ بیٹی کی مدد کریں گے۔ یہ بھی تمہارے ابا جان کے احسانات ہی کا بدلہ ہوگا " رفیع یہ کہہ کر ہنسا اور پھر بولا " قطعی جواب دیجئے آپ کا کیا فیصلہ ہے ؟ "

" مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ بھائی جان سے ایک مرتبہ اور گفتگو کر لوں " میمونہ نے خوشامد سے کہا۔

رفیع نے ذرا سکوت کے بعد جواب دیا " بہت اچھا مہلت دیتا ہوں، مگر نثار سے صلح کی شرائط یہ ہوں گی کہ وہ اطہر کی امیدواری کی درخواست واپس لوائیں۔ میری مخالفت پر بالاعلان ندامت کا اظہار کریں اور میرے معاون کی حیثیت سے کام کریں "

میمونہ نثار کے ہاں گئی اور رو رو کر بھائی سے اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ اور اس کے پیروں پر سر رکھ کر ہچکیوں کے ساتھ بولی " بھائی جان آپکو اس سے کیا فائدہ ہے کہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ خود الیکشن میں کھڑے ہوئے ہوتے تب بھی ایک بات تھی "

نثار نے میمونہ کو اٹھایا اور شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا :-

" میمونہ تم جانتی ہو کہ مجھے تمہاری خاطر کیسی عزیز ہے، مگر یہ معاملات بہن بھائی اور باپ بیٹے کی محبت سے متاثر ہونے کے نہیں ہیں۔ یہ اجتماعی اور قومی معاملات ہیں۔ ہمارا ملک اب آزاد اور خود مختار ہے، اب ہمارے جو دشمن ہیں وہ براہ راست ہمارے دشمن ہیں اور جو دوست ہیں وہ براہ راست ہمارے دوست ہیں۔ ہماری خوشحالی اور بدحالی اب براہ راست ہمارے عمل اور طرز عمل پر منحصر ہے۔ اور ہماری ترقی اور ہمارا تنزل ہماری ہی سرگرمیوں، کوششوں یا کوتاہیوں کا نتیجہ ہوگا۔ تم جانتی ہو یہ سارا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے ؟ بیشک حاکم مطلق اللہ ہے۔ اور اس کی نیابت کا حق پوری قوم کو ہے۔ مگر پوری قوم کی طرف سے پارلیمنٹ مختار کل ہے اور اس کی وہ پارٹی گورنمنٹ قائم کرے گی جس کی اکثریت ہو۔

ملک کی معاشی سرگرمیاں، داخلی امن و امان اور عدل قائم کرنا۔ غیر ملکوں سے مالی، تجارتی اور طرح طرح کے معاملات اور معاہدات دفاع و تحفظ۔ ان سب کاموں کا اختیار پارلیمنٹ کو ہے۔ اگر پارلیمنٹ میں ایماندار، فرض شناس اور خدا ترس لوگ ہوں تو تمام معاملات عدل دیانت اور ملک کی فلاح و ترقی کو مدنظر رکھ کر ہوں گے اور اگر بددیانت لوگ چلے جائیں گے تو قوم کے مفاد کے مقابلہ میں اپنے ذاتی مفاد میں کو ترجیح دیں گے۔

جس طرح الیکشن میں یہ ووٹ خریدتے ہیں اسی طرح پارلیمنٹ میں وزیروں، تاجروں اور زمینداروں کی اغراض پوری کرنے کے لئے یہ ووٹ

پہنچیں گے، اور حکومت کے کسی شعبہ میں نہ انصاف قائم رہے گا اور نہ دیانت، تھوڑے سے بے ایمان لوگ امیر ہو جائیں گے اور ساری قوم میں افلاس ترقی کرے گا اور بالآخر ملک کی تمام دولت اور پورا اختیار چند خاندانوں کیلئے مخصوص ہو جائے گا۔

تم بڑی آسانی سے سمجھ سکتی ہو کہ جو لوگ دس دس ہزار روپے کے نفع کے لئے اجتماعی اور قومی مفاد کو ضرر پہنچا سکتے ہیں وہ دس بیس کروڑ کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ خود غرض افراد نے قوموں کی آزادیاں بیچ ڈالی ہیں۔ یہ کیسی ہولناک بات ہے۔ جو آزادی بچوں عورتوں اور بوڑھوں کے خون کے بدلے میں خریدی گئی ہے۔ وہ رفیع اور اس جیسے دوسروں کی حرص پر قربان کر دی جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں صرف رفیع کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ خود غرضوں کے مقابلہ میں مخلصوں کی ایک پوری پارٹی قائم کی گئی ہے۔ وہ الیکشن لڑ رہی ہے اور میں اسکی مدد کر رہا ہوں۔"

میمونہ نے رو کر کہا۔ "تو بھائی جان میں کیا کروں؟"

"تم یہ کرو کہ اس جعلی دستاویز پر دستخط کرو اور عدالت میں یہ شہادت دو کہ میرے بھائی نے افضل خاں سے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا۔ پوری قوم کے نفع کے مقابلہ میں میرا ایک آدمی کا نقصان بہت چھوٹی سی بات ہے۔ تم اس کا بالکل خیال مت کرو۔ اللہ مددگار ہے۔ وہ میرے لئے کوئی راہ نکال دے گا۔" نثار نے یہ عزم کے ساتھ کہا۔

میمونہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔" اس نے درد آمیز لہجہ میں کہا۔

نثار نے محبت سے بہن کی کمر تھپکی اور استقلال کے ساتھ بولا۔ "میمونہ! میری بہن ہو کر ایسی کمزوری کا اظہار کرتی ہو۔ جاؤ یہ میرا حکم ہے کہ دستاویز پر دستخط کرو اور میرے خلاف شہادت دو۔ میں تمہارے گھر کے امن میں خلل انداز ہونا نہیں چاہتا اور اس سے کوئی قومی فائدہ بھی نہیں ہے جاؤ مضبوطی اور استقلال کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

"بھائی جان آپ کی ساری جائداد بک جائے گی۔ پھر آپ کیا کریں گے" میمونہ نے رو کر کہا۔

"میری اور میرے بچوں کی کفالت نہ تمہارے ذمہ ہے اور نہ خود میرے ذمہ ہے۔ اللہ رزاق ہے وہ کفالت کرے گا۔ بس اب تم چلی جاؤ اور اپنے شوہر کے سامنے مجھ پر سخت غصہ کا اظہار کرو۔" نثار نے میمونہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر چلا گیا۔

میمونہ اپنے بھتیجوں، بھتیجیوں اور بھاوج سے مل ملا کر خوب روئی اور اپنے خیال میں ہمیشہ کیلئے بھائی کے گھر سے رخصت ہو کر واپس آگئی۔

میمونہ نے نثار کے حکم کی پوری تعمیل کی، بھائی سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اور دستاویز پر دستخط کئے۔ مقدمہ دائر ہو گیا۔ مگر نثار کی سرگرمیوں میں اور زیادہ ترقی ہو گئی۔ رفیع کی توقع کے خلاف اس سخت دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔

الیکشن ہوا اور بالکل خلاف توقع اطہر کامیاب ہوا۔ اس سے رفیع کی عداوت اور زیادہ بڑھ گئی۔ افضل خاں کے دعوے کی تائید میں اس نے بڑی کوشش کی، جب عدالت میں شہادت کی نوبت آئی تو میمونہ نے بھائی کے خلاف شہادت بھی دی۔ نثار نے یہ کہہ کر دعویٰ قبول کر لیا کہ میں اپنی بہن کی شہادت کی تردید نہیں کروں گا۔ دعویٰ ڈگری ہو گیا۔ نثار کے پاس رہنے کے لئے گھر تک نہ رہا۔

نثار کی پارٹی اور اس کے ساتھیوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا کہ اس نے کتنی بڑی قربانی کی، یہ مسلمانوں کی روایات کے بالکل مطابق ہوا۔ مسلمان نہ کسی کو حسن خدمت کا انعام دیتے ہیں اور نہ قصور کی سزا!!

☆

ہماری نظر میں

بصائرالسنہ (حصہ اول) تالیف:- مولانا سید امین الحق (فاضل دیوبند) ضخامت ۲۹۵ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- سید محمد امین الحق خطیب جامع مسجد شیخوپورہ۔

یہ کتاب "انکار حدیث" کے رد میں لکھی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اطاعت" دین و ایمان کا رکن اعظم ہے اور حضورؐ کی "اطاعت" قیامت تک کے لئے فرض ہے۔ اور قرآن پر ایمان لانے والا "اطاعتِ رسول" کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ "اطاعت رسول" سے جی چراتے ہیں اور حضورؐ کی سُنتِ مطہرہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے طرح طرح کے نکتے پیدا کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں!

"بصائرالسنہ" میں قرآن وحدیث کے باہمی ربط کو واضح کیا گیا ہے۔ عہد نبوت اور عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت پر تاریخی دلیلیں دی گئی ہیں۔ تدوین حدیث کے اعتراضات کے مسکت جوابات ہیں۔ فاضل مؤلف نے پرویز اور برق کی چوریاں بھی پکڑی ہیں کہ اصل روایات کو یہ فتنہ پرداز کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور ان سے کیسے عجیب وغریب نکتے پیدا کرتے ہیں!

"اگر علی نہ ہوتے عمر مارا گیا تھا" (صفحہ ۱۵) یہ "لولا علی لھلک عمر" کا ترجمہ ہے۔ "عمر مارا گیا تھا" کی جگہ "عمر ہلاک ہو جاتا" ترجمہ زیادہ اچھا تھا۔ "ہلاک" میں جو جامعیت ہے وہ "مارا گیا" میں نہیں ہے — صفحہ ۶۲ پر جس آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اُس میں "وَیُزَکِّیھِم" کا ترجمہ چھوٹ گیا — "صحابہ اہل زبان تھے مگر زبان کی مدد اور ادبیت کے ذوق میں اپنے شبہات کو حل نہ کر سکے" — (صفحہ ۱۶۳) نہ جانے صاحب تالیف کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ عبارت بہت گنجلک اور نومشقوں کی سی ہے — "اور اس کو قرآن شریف سے وہ استفادہ حاصل نہیں ہو سکتا۔" (صفحہ ۱۷۸) استفادہ کے ساتھ "حاصل ہونا" زائد ہے کہ "استفادہ" میں خود "حصول" کا مفہوم پنہاں ہے۔

"خدا کے علم اور اس کی تدبیر میں مُنہ زبانی قرآن کو یاد کرنا ہے۔" (صفحہ ۲۳۰) "مُنہ زبانی" پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لفظ مؤلف کے قلم سے کس طرح نکلا — "اس کا وہم وگمان بھی قرآن سے نہیں ہو سکتا۔" (صفحہ ۱۹۹) "سے" نے پورے جملہ میں عجیب جھول پیدا کر دیا — صفحہ ۱۳۳ پر "ابوبکر رازی حصباص[1]" کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

اپنے موضوع پر یہ کتاب خوب ہے۔ مولانا سید امین الحق صاحب نے جو کچھ کہا ہے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ کہا ہے۔ مؤلف کو سنتِ رسول سے جو شغف اور ربط ہے وہ کتاب کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہے۔

فجزاہ اللہ خیر الجزاء

---

[1] صحیح "جصاص" ہے۔

سالنامہ تعمیرِ انسانیت

ادارۂ تحریر:- کوثر نیازی، عبدالحمید۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ (سرورق رنگین اور دیدہ زیب) اس اشاعتِ خاص کی قیمت دو روپے۔ عام پرچہ کی قیمت آٹھ آنہ۔ چندہ سالانہ چھ روپے، ششماہی تین روپے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر تعمیرِ انسانیت، گجر گلی، موچی دروازہ لاہور۔

ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" کا سالنامہ بڑے آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ جیسی اس کی دھوم تھی اللہ کے فضل سے سالنامہ کو ایسا ہی پایا۔ ۹ علمی مقالے، گیارہ غزلیں، ۹ نظمیں اور تین ڈرامے سالنامہ کی زینت ہیں۔ مضامین متنوع ہیں۔ ترتیب بھی خوب ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سالنامہ کی کوئی تحریر مقصدیت سے خالی نہیں ہے۔ ادب و اخلاق کو ایک دوسرے میں سمو دینا ایک کارنامہ ہے۔ جس کی جھلکیاں ہر صفحہ پر نظر آتی ہیں۔

پھر آج دل میں اُٹھی ہے خلش رہائی کی۔ (صفحہ ۸۶)

"خلش اُٹھنا" پہلی بار نظر سے گزرا اور وجدان تلملا کر رہ گیا۔

خرد ایمان رُبا ہو مجھے منظور نہیں　　　دل کم آگاہ خدا ہو مجھے منظور نہیں (صفحہ ۸۹)

دونوں مصرعے بچکانے ہیں۔

اُن کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے　　　اب تو ناصح بھی پریشان برابر ہوگا (صفحہ ۹۰)

"برابر" نے شعر کو "عجیب" بنا دیا۔

"جیسے کسی نے ایک زنّاٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ اُس کا سارا بدن ٹھٹھر کر رہ گیا۔" (صفحہ ۹۷) تھپڑ سے "بدن کا ٹھٹھر کر رہ جانا" ایک مضحکہ سے کم نہیں۔

"نگہت کو اس پاک محبت کی اہانت کے قبیح فعل میں مشغول پایا۔" (صفحہ ۹۲) یہ آخر کیا اندازِ تحریر ہے — توبہ!

"اُس نے لڑکپن سے پوچھا۔" (صفحہ ۱۰۷) شاید یہ کہنا مقصود ہے "اُس نے طفلانہ انداز سے پوچھا۔"

"گیارہ آدمی اور ایک جزیرہ" جس افسانہ کا عنوان ہے اُس میں "ایک تھلتھلے بدن" (صفحہ ۱۲۰) "بھس بھی ربت ہیں" (صفحہ ۱۲۲) — "ہڈیوں کو رفیلی نمی کا گھن لگنے لگا" (صفحہ ۱۲۴) جیسی نامانوس ترکیبیں پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور کوفت بھی ہوئی۔ افسانہ نگار کو اس قسم کی ترکیبیں تراشنے کی اگر چاٹ پڑ گئی۔ تو اُن کی تحریریں "مضحکہ" بن کر رہ جائیں گی!

مجموعی طور پر سالنامہ کامیاب ہے اور اُس کے مرتبین (جناب کوثر نیازی اور جناب عبدالحمید) ادبی دُنیا کی طرف سے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ہوس انگیز لٹریچر کے مقابلہ میں پاکیزہ ادب کو منظرِ عام پر لانا کتنا جراٴت مندانہ اقدام ہے۔ "تعمیرِ انسانیت" کا سالنامہ ادبی بُت کدوں میں اذان اور علمی صنم کدوں میں نعرۂ تکبیر ہے!

حیاتِ حضرت امیر خسروؒ

از:- خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی، ضخامت ۲۱۲ صفحات مجلد (سرورق رنگین) قیمت دو روپے بارہ آنہ ملنے کا پتہ:- ٹائمز پریس، صدر، کراچی۔

اس کتاب کا آغاز حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی تصویر سے ہوتا ہے اور ہمارے خیال میں یہ "خیالی تصویر" ہے۔ سرورق کی پُشت پر ڈھولک، ستار اور طبلوں کی تصویر ہونے کتاب کی ثقاہت کو مجروح کر دیا ہے۔ بیجو باورے، تان رس خاں یا عبدالکریم جیسے گویّے جن کی شہرت صرف گانے بجانے سے وابستہ ہے۔ اُن کے حالات پر اگر کوئی کتاب لکھی جاتی تو مزامیر کی تصاویر موزوں سمجھی جاتیں۔ مگر امیر خسرو کے دوسرے کمالات کو خاطر خواہ اہمیت نہ دے کر اُن کے ایک "تفریحی مشغلہ" کو اتنا نمایاں کر دینا فنِ سیرت نگاری

(بیوگرافی) کے اعتبار سے محلِ غور ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ امیر خسروؒ اُس معلمِ اخلاق اور انسانیت کے محسنِ اعظمؐ کے متبع اور پیرو تھے جو آلاتِ موسیقی کے ایجاد کرنے والے نہیں بلکہ انہیں توڑنے والے تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)

کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے:-

سلسلہ پیدائش، لڑکپن اور تعلیم ـــــ شہرت، عروج اور اعزازِ شاہی ـــــ سلسلۂ بیعت، طریقت اور وفات ـــــ ہندی شاعری، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ـــــ فارسی شاعری ـــــ تصانیف امیر خسرو ـــــ ایجادِ موسیقی ـــــ امیر کے اوصاف۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب، تالیف اور تصنیف میں خاصی کاوش سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اس گلدستہ کو سجانے کے لئے کس کس چمن اور خیاباں سے پھول اور کلیاں چُنی ہیں!

کتابت کی بعض فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں:-

(صفحہ ۴) "دیوان غرتہ الکمال" (غرۃ الکمال) (صفحہ ۷۹) "کسافت" (کثافت) (صفحہ ۹۵) "اے سرت کردم ..... " (اے سرت گردم .....) (صفحہ ۱۰۷) "..... عمر بیاد میدہد" (..... عمر بہ باد میدہد) (صفحہ ۱۱۲) "..... مغربی آموز" (..... مُطربی آموز) (صفحہ ۱۲۵) "ثامانی" (سامانی) (صفحہ ۸۵) "تخفۃ الصغر" (تحفۃ الصغر)

(صفحہ ۷۷) "حضرت امیر نے الوہیت کے انداز میں انسان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا نظم میں ایک خاکہ پیش کیا ہے" یہ "الوہیت کے انداز میں" کیا بات ہوئی؟ "الوہیت" بالکل ایک بے جوڑ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔

حضرت خسروؒ کی جو غزلیات کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ وہ اُن کی وہی مشہور ترین غزلیں ہیں جن کو قوال گاتے رہتے ہیں مصنف کو چاہیئے تھا کہ وہ خسروؒ کے پورے کلام کو پڑھ کر اُس سے خود چند اشعار یا چند غزلیں منتخب فرماتے۔

لائق مصنف کو راگ رنگ سے فطری دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کتاب میں اسی چیز کو سب سے زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، کتاب میں بتایا گیا ہے کہ امیر خسرو نے سترہ تالیں ایجاد کیں اور بہت سے راگوں کو ترکیب دے کر نئے راگ بنائے۔ جن میں ایمن اور عشاق بہت مشہور ہیں اور سازوں میں ستار کے علاوہ مردنگ کو ڈھولک میں خسرو ہی نے تبدیل کیا۔

اس آخرت فراموش دور میں جبکہ نفسانی خواہشوں نے اگ رنگ اور لہو و لعب کو انسانیت کیلئے ایک مستقل فتنہ بنا دیا ہے۔ اکابر و اسلاف کے لغو بھی مشاغل کا ذکر خطرے سے خالی نہیں۔ کہ جیدہ جو طبیعتیں اُس کو حجت بنا کر اخلاقی حدود سے گزر جائیں گی۔ تصوف کا طغرائے امتیاز ساز اور راگنیاں نہیں "تزکیۂ نفس" ہے۔ ہم "حیاتِ امیر خسروؒ" میں اسی کی زیادہ سے زیادہ جھلکیاں دیکھنا چاہتے تھے۔

خضرِ مسیحا

مرتبہ:- ایم، عبدالرحمٰن خاں۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات مجلد (رنگین گردپوش کیساتھ) قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- ادارہ نشر المعارف، چہل بیک، ملتان شہر۔

جناب منشی عبدالرحمٰن خاں نے اسلامی، اخلاقی اور قومی نظموں کے انتخاب کا ایک مرقع تیار کیا ہے۔ جس میں مشاہیر اور گمنام سبھی طرح کے شعراء کا منتخب کلام شامل ہے۔ فاضل مرتب کا مقصد سَو فیصدی ٹھیک ہے۔ انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق کتابوں سے، رسالوں اور اخباروں سے نظموں کو چُنا ہے، اُن کی کوشش مفید اور کامیاب ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ پھولوں کیساتھ خار و خس بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اپنوں سے رُوٹھنا نہیں اسلام کا اصول ۔۔۔ کافر سے میل ہی کہیں اسلام کا اصول (صفحہ ۲۲)

مر کے بھی تم شانِ خودداری نہ دینا ہاتھ سے ۔۔۔ خم نہ ہو جائے کہیں سر دشمنوں کی گھات سے (صفحہ ۹۲)

لگا دے آگ دنیا میں کوئی طوفان پیدا کر ۔۔۔ تنِ بے جان میں مسلم ذرا ہیجان پیدا کر (صفحہ ۱۰۱)

جیسے شعروں کا اس انتخاب میں آجانا مرتب کے مذاقِ شاعرانہ پر انگشت نمائی کرتا ہے۔

جناب اسد ملتانی کے یہ شعر کس قدر پاکیزہ ہیں۔ (نظم کا عنوان ہے "خاتونِ حرم سے")

رنگ کبھی نہیں سکتا پاکیزہ جمالی کا	بیباک نگاہوں سے رونڈے ہیں چہروں پر
بیشک تری جلوت ہے محرم میں نامحرم	خلوت ہی میں تو رہ کہ ملت کی ہے صورت گر
آئینہ قرآں میں دیکھ اپنی اداؤں کو	شانہ تری زلفوں کا فرمودۂ پیغمبر!

حقائق ومعارف

"حقائق ومعارف" مرتبہ:- ایم عبدالرحمٰن خاں۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات مجلد (رنگین گرد پوش) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ نشر المعارف۔ چہل یک، ملتان شہر۔

یہ مرقع بھی جناب منشی عبدالرحمٰن خاں کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ تین سو دس عناوین کے تحت مختلف شعراء کے منتخب اشعار درج ہیں۔

بعض "عنوان" ایسے بھی ہیں:-

آسرا — بھروسا — عیب جوئی — معیت — یگانہ و بیگانہ۔

اس انتخاب میں بلند شعروں کے ساتھ پست شعر بھی ملتے ہیں۔ یہ "شتر گربگی" ہر اس شخص کو کھٹکے گی جو صحت مند وجدان اور مذاقِ صحیح رکھتا ہے۔ شعروں کے انتخاب کا معاملہ بہت نازک ہے۔ اس کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ انتخاب کرنے والے کا ذوق شبلی نعمانی کے ذوق سے ملتا جلتا ہو۔ نفاستِ ذوق پر بے مزہ شعر بہت گراں گزرتا ہے۔

جینے کا مقصد ہے تو سکوں کی نہ کر تلاش	یہ زندگی حوادثِ پیہم کا نام ہے (صفحہ ۱۷۴)
مانا کہ عرش سدرہ و طوبیٰ سے ہے بلند	مومن کا اس فضا سے بھی اونچا مقام ہے۔ (صفحہ ۲۹۱)

ماہر القادری کے ان شعروں کو "زاہد القادری" سے منسوب فرمایا گیا ہے۔

ایک شعر ہے:-

اپنے دامن کو نہ کر غیر کے آگے تو دراز — تیرے اسلاف نے خشکی میں چلائے ہیں جہاز

یہ شعر درد کا ہے؟ مگر کون درد؟ اردو میں تو اس تخلص کے ساتھ میر دردؔ ہی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن ہمیں یقین نہیں آتا کہ خواجہ میر دردؔ نے ایسا سپاٹ شعر کہا ہوگا!

اس مجموعہ انتخاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اخلاق و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو خواتین بھی پڑھ سکتی ہیں کہ بے راہ روی اور آزاد خیالی اور شوخی و بیباکی کی پرچھائیں بھی فاضل مرتب نے کہیں نہیں پڑنے دی!

ہمدرد نونہال

ماہنامہ "ہمدرد نونہال"۔ نگران۔ حکیم حافظ محمد سعید دہلوی۔ مرتبہ:- ثریا ہمدرد۔ قیمت فی پرچہ چار آنہ۔ سالانہ ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ "ہمدرد نونہال" ہمدرد منزل۔ کراچی۔

ہمدرد دواخانہ کا نام ہی خود اپنے تعارف کے لئے کافی ہے اور اس کا طبی رسالہ "ہمدرد صحت" بھی ہر حلقہ میں شہرت رکھتا ہے۔ "ہمدرد نونہال" بھی اسی طبی ادارہ کا ماہنامہ ہے جس کا پہلے نام "نونہال" تھا اور اب وہ "ہمدرد" کے اضافہ کیساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ "ہمدرد نونہال" کے مضامین بچوں کی نفسیات کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہلکی پھلکی دلچسپ کہانیاں، مزیدار نظمیں اور عام فہم معلوماتی مضامین! اگر اس کی اشاعتِ خاص۔ روس اور ایشیا کی کہانیاں، کافی مقبول ہوئی۔ افسانہ و ادب کے ساتھ دینی اور اخلاقی چاشنی کو ذرا تیز کر دیا جائے تو "ہمدرد نونہال" کی افادیت اور بڑھ جائے گی!

رسالہ کی لکھائی چھپائی بھی خوب ہے اور اس کے مضامین اور کارٹونوں میں بچوں کے لئے بڑی جاذبیت ہے۔

ہُود علیہ السلام
مترجم:۔ عبدالحق۔ ضخامت ۴۶ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ۔ ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور۔

یہ عربی سے براہ راست ترجمہ کیا گیا ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔[1] قوم عاد پر شرک، بُت پرستی اور اللہ کی نافرمانی کرنے اور اللہ کے پیغمبر حضرت ہُود علیہ السلام کو جھٹلانے پر کیسا دردناک عذاب آیا۔ اس کتابچہ میں اسی تفصیل کو پیش کیا گیا ہے۔ پوری کتاب عبرت و موعظت سے لبریز ہے۔

صالح علیہ السلام
ترجمہ۔ عبدالحق۔ ضخامت ۴۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ۔ ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور

قوم ثمودؑ نے کس طرح اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کی بھیجی ہوئی نشانی (اونٹنی) کو ہلاک کرنے کے بعد اُن پر کس طرح عذاب نازل ہوا۔ اور حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمودؑ کو راہ راست پر لانے کی کتنی کوشش کی۔ یہ کتاب اسی عبرت آموز داستان پر مشتمل ہے۔ ترجمہ[2] عام فہم اور رواں ہے۔

سلسلہ صحت آئی ساکو
(۱) قبض اور اس کا صحیح علاج۔ (۲) ہمارا نظام دفع۔ (۳) نزلہ زکام اور اس کا صحیح علاج
مرتبہ آئی ساکو (پاکستان) لارنس روڈ، نگار ٹن ٹرام ٹرمینس، کراچی ۳

آئی ساکو کو قائم ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے مگر اس کی طبی خدمات نے (جس میں اس کی بنائی ہوئی قابل اعتماد دوائیں اور طبی مشورے بھی شامل ہیں) کافی شہرت اور قبولیت حاصل کر لی ہے۔ آئی ساکو نے متذکرہ بالا تین کتابچے شائع کئے ہیں جن کا مطالعہ اور اُن میں دیئے ہوئے مشوروں پر عمل مریضوں اور صحت مندوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

آئی ساکو کا پیش کردہ "سلسلۂ صحت" اس کی دلیل ہے کہ اس معمل اور ادارہ کے قیام کا مقصد صرف تجارت ہی نہیں ہے بلکہ خدمتِ خلق بھی ہے!

کُوکُو
تالیف عبدالحق۔ ضخامت ۲۸ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ۔ ۱۵ لیک روڈ۔ کراچی۔

"کُوکُو" یہ عربی کا قاعدہ ہے۔ جس میں تصویروں کے ذریعہ حروفِ تہجی اور اُن سے بنے ہوئے الفاظ ظاہر کئے گئے ہیں۔ مثلاً الف سے "ارنب" (خرگوش)، "ز" سے "زرش" (بطخ)، "ص" سے "صفدعہ" (مینڈک)، "خ" سے "خلد" (چھچھوندر) "و" سے "وسطیٰ" (ہاتھ کی بیچ کی انگلی)۔ عربی سیکھنے کا جو شوق رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ قاعدہ بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

تعلیم قراۃ العربیہ
"مبادی تعلیم القرأۃ العربیۃ المصورہ" مؤلفہ جناب عبدالحق۔ ضخامت ۶۲ صفحات (بڑا سائز)
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ۔ کراچی۔

یہ بھی عربی کا باتصویر قاعدہ ہے۔ جس کو جدید اسلوب پر مرتب کیا گیا ہے۔ مثلاً "وَزَنَ" کے معنی بتانا مقصود ہیں تو تصویر کے ذریعہ ایک دکاندار کو دکھایا گیا ہے جو ترازو میں کوئی چیز تول رہا ہے۔ اس تصویر کے اوپر تین چھوٹی تصویریں بھی ہیں جن میں "و" سے "ورد" (گلاب کا پھول)، "ز" سے "زرافہ" اور "ن" سے "نحلہ" (شہد کی مکھی) کی تشریح کی گئی ہے۔

---

[1] (صفحہ ۴) "جس کے مرد و عورت بھاری بھرکم اجسام کی وجہ سے ممتاز تھے"۔ "اجسام" نے اس جملہ میں جھول سا پیدا کر دیا۔ (صفحہ ۳۴) "حضرت ہودؑ نے کہا مانا"۔ "حضرت ہودؑ نے اپنے رب کا کہا مانا" ہوتا تو اچھا تھا۔

[2] (صفحہ ۱۲) "یہ سن کر وہ غصہ میں بھوت ہو کر بولے"۔ یہ جملہ البتہ کھٹکتا ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ایک طالب علم بڑی آسانی کے ساتھ عربی کے سینکڑوں الفاظ کے معنی سے واقف ہو سکتا ہے اور اُس کو متعدد ایسے "افعال" بھی معلوم ہو جائیں گے جو اپنے اعراب کے لحاظ سے مختلف ہیں - مثلاً :-

تقبَ ـــ لَبسَ ـــ تَرکَ ـــ

عربی لکھنے پڑھنے اور بول چال کے لئے جن ابتدائی باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے - اُن کو اس کتاب میں آسان انداز پر پیش کیا گیا ہے آخر میں مشکل لفظوں کی فرہنگ درج ہے -

الدروس العربیہ | تالیف - عبدالحق عباس - ضخامت ۱۱۲ صفحات - قیمت ایک روپیہ دو آنہ -
ملنے کا پتہ :- المکتبۃ العلمیہ - ۱۵ لیک روڈ - کراچی -

عربی سیکھنے کے لئے یہ کتاب جدید ترین اسلوب پر تالیف کی گئی ہے ، عربی کے انتہائی آسان چھوٹے چھوٹے جملے مبتدیوں کی نفسیات اور فہم کے مطابق اسباق میں لائے گئے ہیں اور ان جملوں میں تدریجاً ترقی اور وسعت ہوتی چلی گئی ہے -
مُبتدیوں کو گرامر سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے - اس کتاب میں اس اُلجھن کو بڑی خوبی سے رفع کیا گیا ہے - اگر کوئی توجہ کے ساتھ اس کتاب کو پڑھ کر اُس کے جملوں پر حاوی ہو جائے تو عربی کی معمولی بول چال کا کام چلا سکتا ہے -

ذوالقرنین بدایوں نمبر | ایڈیٹر :- احید الدین نظامی - ضخامت ۸۱ صفحات ، سرورق رنگین ، تاریخی یادگاروں کی متعدد تصاویر کے ساتھ ، قیمت دو روپے ملنے کا پتہ :- منیجر نظامی پریس و اخبار ذوالقرنین - بدایوں ـــ پاکستان میں - شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ - لاہور -

مولوی نظام الدین حسن نظامی مرحوم نے سنہ ۱۹۰۳ء میں بدایوں سے اخبار ذوالقرنین جاری کیا تھا اس کو ترپن (۵۳) سال ہونے کو آئے کہ یہ اخبار جب سے اب تک ایک ہی انداز پر شائع ہو رہا ہے - بانیٔ اخبار کے لائق فرزند جناب احید الدین نظامی نے "ذوالقرنین" کی سلور جوبلی کی یادگار میں "بدایوں نمبر" مرتب فرمایا ہے - جو اس وقت ہمارے سامنے ہے -

"بدایوں نمبر" میں نثر و نظم کے اٹھارہ مضامین شامل ہیں - جن میں علامہ حسن صغانی کا وطن اور بدایوں اسلامی ہند کے دورِ اول میں ـــ خاصے وقیع مقالے ہیں ـــ مورخینِ بدایوں اور اُن کے کارنامے اور شیخ تاجا اوسط درجہ کے اور بعض دوسرے مضامین سطحی ہیں - "بدایوں کا ماضی و حال" تاریخی اعتبار سے سب سے زیادہ معلومات آفریں مقالہ ہے -

"بدایوں سے خطاب" (نظم) میں کوئی شعریت نہیں "بدایوں" (ایک غریب الوطن کی نظر میں) یہ نظم نسبتاً اچھی ہے مگر "بدایوں" جس سے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ نے اس درجہ عقیدت کا اظہار فرمایا ہے ع

بجائے سرمہ در دیدہ کشم خاک بدایوں را

اس پر ہم ایک بلند پایہ نظم یا نظمیں پڑھنے کی توقع رکھتے تھے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ "بدایوں نمبر" محنت اور کاوش کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے مگر بدایوں کی علمی ، تاریخی اور روحانی عظمت کے اعتبار سے "بدایوں نمبر" کو بہت زیادہ متنوع ، جامع اور بلند تر ہونا چاہیے تھا - بدایونی شعراء کے ایک مستقل تذکرہ کی ضرورت تھی - اور اس کام کو آل احمد سرور اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بڑی خوبی سے انجام دے سکتے تھے - "بدایوں کی ادبی خدمات" کا تذکرہ بھی ضروری تھا - اس ضمن میں ماہنامہ نقیب اور مجلہ نقاش کی بھولی ہوئی خدمات کی یاد تازہ ہو جاتی - ملا عبدالقادر بدایونی پر ایک بسیط تحقیقی مقالہ تو ضروری ہونا چاہیے تھا - چاہے "بدایوں کا فرزند جلیل" جس مقالہ کا عنوان ہے ، وہ نہ ہوتا -

بدایوں کے آثار قدیمہ پر بھی ایک تاریخی مقالہ کی ضرورت تھی۔ جیسے سر سید احمد خاں کی "آثار الصنادید" کے انداز پر مرتب کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں اردو زبان جس نازک اور پُر مصائب دور سے گزر رہی ہے اُس کے لحاظ سے "بدایوں نمبر" بہرحال غنیمت ہے۔

برکات الاسلام

"نظام اسلامی کی برکات یعنی برکات الاسلام"۔ از:- مولانا عبد الحمید خاں ارشد۔ ضخامت ۴۰ا صفحات (بڑا سائز، کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب) قیمت ایک روپیہ دو آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ "التصدیق" بیرون لوہڑ دروازہ۔ ملتان شہر۔

اس گرانقدر کتاب میں عقلی و نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "اسلام ہی سعادت بشر کا واحد ذریعہ ہے"۔ امن ہو۔ عدل و انصاف ہو، فلاح و کامرانی ہو، حق و صداقت ہو، معیشت کے مسائل ہوں یا حکومت کے طریقے، ان تمام عقدوں کا حل اور ان تمام سعادتوں کا سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہے! انسانیت کی جلتی ہوئی کھیتی اس وقت تک نہیں لہلہا سکتی، جب تک اسلام کے ابرِ کرم کے چھینٹے اس پر نہ پڑیں۔ پوری کتاب میں عنوانات بدل بدل کر اپنی خیالات کو پھیلایا گیا ہے۔ اس میں تاریخی شہادتیں بھی ہیں۔ اسلامی فتوحات کی چند جھلکیاں بھی ہیں۔ ختم نبوت پر بھی جاندار استدلال ہے۔ اور "اسلامی حکومت" کن بنیادوں پر قائم ہونی چاہیئے، اس کی بھی تفصیل ہے۔

اندازِ بیان شگفتہ ہے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ فاضل مصنف کے خلوص، دردمندی اور دینی حمیت کی شہادت دے رہا ہے۔

"عبد اللہ بن مسعودؓ (مشہور صحابی) کی قرأت" ولکن نبیاً ختم النبیین" کے الفاظ موجود ہیں۔ اب خواہ اسے مستقل قرأت قرار دیا جائے یا خاتم النبیین کی تفسیر" (صفحہ ۲۹)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن کی آیتوں کے ساتھ اُس کی تشریح بھی کہیں کہیں لکھتے جاتے تھے۔ تو اُن کی اس "یادداشت" میں جہاں جہاں بھی قرآن کی قرأت متواترہ کے مقابلہ میں لفظوں کی کمی بیشی پائی جاتی ہے، اُسے "قرأتِ قرآن" یا "قرأت عبد اللہ ابن مسعود" کہنا بڑی خطرناک غلط فہمیوں کا سبب بن جائیگا۔ لوگوں کو "تشریح یا یادداشت" اور "قرأتِ قرآن" میں فرق کرنا چاہیئے۔ اگر بعض پچھلے مفسرین کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں تو کیا ضرور ہے کہ ہم بھی اسی لکیر کے فقیر بنے رہیں۔

ترجمانِ خودی

از:- سید محمد عبد الرشید فاضل۔ ایم اے (پروفیسر اردو کالج۔ کراچی) ضخامت ۲۰۵ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- ادارہ تنویرات ادب۔ ۵۰۵ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی۔

"ترجمانِ خودی" علامہ اقبال کی مشہور مثنوی "اسرارِ خودی" کا اردو ترجمہ ہے۔ ہم نے قرآن پاک، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کے اردو ترجمے پڑھے ہیں اور وجدان کو بعض اشعار نے خاصی اذیت دی ہے۔ مگر "ترجمانِ خودی" کے اشعار پڑھ کر وجدان کو فرحت حاصل ہوئی اور مترجم کے لئے دل سے دعا نکلی۔

سبزۂ نارُستہ زیبِ گلشنم ۔۔۔ گل بشاخ اندر نہاں در دامنم

ترجمہ

جو اُگا سبزہ نہ اب تک وہ مرے گلشن میں ہے ۔۔۔ شاخ پر جو گل نہ آیا وہ مرے دامن میں ہے!

ٹ (صفحہ الف) "دوسری پرتو" "نصرت السنۃ کی صورت میں پڑی"۔ "پرتو" مذکر ہے۔ اسی صفحہ پر "اے میرے حبیب اللہ!" بھی وجدان کو کھٹکا۔

غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد		درخورِ ابرِ بہارِ من نشد

ترجمہ

وسعتِ گلزار جس غنچے کے داماں میں نہیں		وہ مرے ابرِ بہاری کے لئے شایاں نہیں

تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش		نکہتِ خود را چو گل ارزاں فروش

ترجمہ

غنچہ ساں کب تک رہیگا باغِ دوراں میں خموش		چاہیئے ہونا تجھے گُل کی طرح نکہت فروش

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت		تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

ترجمہ

لاکھوں ابراہیمؑ کو دکھلائیے شعلوں کے باغ		تب کہیں روشن کیا ہے اک محمدؐ کا چراغ

(اقبال کے اصل شعر میں "صد ابراہیم سوخت" نے جو قدحِ ذم کا پہلو پیدا کر دیا تھا۔ ترجمہ میں "دکھلائیے شعلوں کے باغ" نے اس کو کس خوبصورتی کے ساتھ بدل دیا۔ اور پھر لطف یہ کہ معنویت مجروح نہیں ہوئی۔

لیکن اُس ہیرے سے وہ پانی نہ حاصل کر سکا		خوب ہی ٹھونگیں لگائیں اور تھک کر رہ گیا

اس قسم کے بے مزہ شعر بھی ترجمہ میں کہیں کہیں آ گئے ہیں۔

"ترجمانِ خودی" (اسرارِ خودی کے فارسی ترجمہ) سے پہلے اسی مجلّہ میں اقبال کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری پر پوری ایک کتاب ہے، پروفیسر عبدالرشید فاضل کو اقبال سے عقیدت ہی نہیں بلکہ اُن کے مزاج و فکر سے خاص مناسبت بھی ہے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اقبال کے افکار کی روشنی ہی میں لکھا ہے۔ اندازِ تحریر سادہ اور شگفتہ ہے۔ سلجھاؤ، توازن، اور سنجیدگی اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ اقبال نے حافظ شیرازی کے شعروں پر جو کڑی تنقید کی تھی اور اس پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا "ترجمانِ خودی" میں اُس کی تفصیل بھی ملے گی، اقبال کی شاعری پر جو چوٹی کے مضامین رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اُن کے بعض اہم اقتباسات فاضل مصنف نے درج کر کے کتاب کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی		مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا		(صفحہ ۲۲)

یہ اقبال کے ابتدائی دور کے اشعار ہیں۔ اقبال آج زندہ ہوتے اور کوئی اُن کو یہ سمجھاتا کہ شیخ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کا مقام ایک پیغمبر (مسیحؑ) سے کسی طرح اونچا نہیں ہو سکتا ؟ تو وہ اپنے شعر کو یقیناً بدل دیتے !

اسی طرح اقبال نے :-

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے		کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے

جو کہا ہے تو یہ بھی اُن کے شروع زمانہ کے معتقدات کا عکس ہے۔ ورنہ کسی ولی کی قبر پر جا کر اس طرح عرض معروض کرنا کسی عنوان جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی داتا ہے اور نہ مشکل کشا ہے۔

من حضورِ آں شہِ والا گہر		بے نوا مردے بدربارِ عمرؓ

شاہ افغانستان کے دربار کو "دربارِ عمرؓ" کہنا تکلیف دہ مبالغہ ہے۔ کم از کم اقبال سے ایسی بے جا مدح خوانی کی توقع نہ تھی !

اقبال کی تحریروں کے یہ اقتباسات کس قدر بالغ نظری، ژرف نگاہی اور فراستِ ایمانی پر مبنی ہیں!۔

"میرا ذاتی عقیدہ یہی کہ یہ روحانیات یا تصوف بعد کی پیداوار ہی اور ہمارے مذہب کی روح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد "ہمہ اوست" پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور "ہمہ اوست" منفی۔"

"میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہی اور یورپ کا فلسفہ پڑھ کے یہ میلان اور بھی تیز ہوگیا تھا۔ مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کردیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"

"تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اور اس جگہ تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہی۔ اُس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبانہ تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہی، یہاں تک کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا۔"

"اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کو توحید اور وحدۃ الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے، یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں۔ مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور موخرالذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں ہے جیسا کہ بعض صوفیا سمجھتے ہیں، یہ شرک ہے ـــ ہاں وحدۃ الوجود کی ضد کثرت ہے......."

"ترجمانِ خودی" اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ پروفیسر عبدالرشید فاضل کی یہ علمی کاوش حوصلہ افزائی اور تحسین و ستائش کی مستحق ہے!

برزخ اور عذابِ قبر

از:۔ مولانا محمد سورتی (سابق استاذ جامعہ ملیہ دہلی) ضخامت ۷۸ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اسلام۔ کشمیری بازار لاہور۔

مولانا محمد سورتی عربی لغت و ادب کے امام تھے۔ اور تحقیق علوم میں بلند پایہ رکھتے تھے، اس کتاب میں مولانا مرحوم نے حافظ اسلم جیراجپوری کے ایک مضمون۔ "برزخ از روئے قرآن" پر بڑی معرکہ آرا اور سیر حاصل تنقید کی ہے اور جیراجپوری صاحب کی فکری اور علمی غلطیوں پر احتساب فرمایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے رسولؐ کی سنت سے بے نیاز ہو کر قرآن پر غور کرتے ہیں اُن کو قدم قدم پر کیسی خوفناک ٹھوکریں لگتی ہیں!

کتاب الصلوٰۃ

از:۔ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ۔ مترجمہ:۔ شیخ علی جواد صاحب۔ ضخامت ۱۵۴ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) ملنے کا پتہ:۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ فریئر روڈ۔ کراچی۔

کتاب کے شروع میں فاضل مترجم نے حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس زندگی کے حالات دیئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے حق گوئی اور عزیمت و استقامت کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ اُس کے بعد امامؒ موصوف کی کتاب کا ترجمہ ہی۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نماز تعدیل ارکان کے ساتھ ادا کرنی چاہیئے۔ اور ایسی نماز جو بے دلی کیساتھ، بیگار سمجھ کر پڑھی جائے وہ نمازی کے منہ پر ماردی جاتی ہی۔ اس لئے کہ جو شخص رکوع و سجود پوری طرح ادا نہیں کرتا وہ نماز کا چور ہی ـــ! اس کتاب کا مطالعہ ہر اعتبار سے مفید اور باعث برکت و سعادت ہے!

نذرِ شہدائے کربلا — از:- راغب مرادآبادی - مرتبہ:- رعنا ظفر - ضخامت ۷۴ صفحات - قیمت ایک روپیہ:-
ملنے کا پتہ:- مکتبہ ادب اردو - بی ۴۴/۲۱۵ مارٹن روڈ - کراچی - بھارت میں:- جگدیش پرشاد بھٹناگر
حیات نمبر ۸ کارنوٹس اسکوئر نئی دہلی -

"نذرِ شہدائے کربلا" کا پیش لفظ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے - جو گاندھی جی کی بارگاہ میں یہ خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں:-

"السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام"

دیباچہ جناب علی اختر نے تحریر فرمایا ہے - اور راغب صاحب کے شاعرانہ کمال کا پورے انشراح کیساتھ اعتراف کیا ہے۔
یہ کتاب سلاموں اور رباعیوں پر مشتمل ہے جس میں شہیدِ کربلا کے حضور عقیدت کے آنسو پیش کئے گئے ہیں - اہلِ بیتِ کرام کی محبت ایک ایک شعر میں جھلکتی ہے۔

نہ دشمنی کی غرض سے نہ دوستی کیلئے		جہادِ سبطِ پیمبر تھا دین ہی کے لئے
زمانہ آج بھی گم کردہ راہ ہے راغب		حسینؑ ہی کی ضرورت ہے رہبری کے لئے

ہر سعادت کیلئے توفیقِ یزداں چاہیئے		پوچھیئے حُر سے کہ یہ رتبہ عطا کیونکر ہوا

یاد آتا ہے جو راغب چمنِ آلِ عبا		خندۂ گل بھی طبیعت پہ گراں ہوتا ہے

وہ جو صف آرا ہوئے آلِ عبا کے سامنے		حشر میں کس منہ سے آئیں گے خدا کے سامنے

یہ وہ چند شعر ہیں جن سے ان منظومات کی روانی اور شگفتگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جو اپنے دل میں غمِ کربلا نہیں رکھتے		وہ سطح بیں نگہ آشنا نہیں رکھتے		(صفحہ ۹)

"غمِ کربلا" اور "نگہ آشنا" کے درمیان آخر کیا معنوی ربط ہے! دل میں گداز کا نہ ہونا "سطح بینی" کی دلیل نہیں ہے۔ کیا تعمقِ نگاہ اور دردمندی لازم و ملزوم ہیں؟

بچوں کی تشنگی سے جی کیوں نہ مضطرب ہو		احساس اگر ہے زندہ لازم ہے بے قراری		(صفحہ ۳۲)

مصرعۂ ثانی میں بڑا "تکلف" پایا جاتا ہے۔ حالانکہ مصرعہ اولی کے بعد مصرعۂ ثانی بہت پُرسوز اور اثر انگیز ہونا چاہیئے تھا۔

عام ہے فیضِ شہ والا مگر دل چاہیئے		جلوہ فرماتے ہیں خود اہلِ عزا کے سامنے		(صفحہ ۳۵)

جب "شہ والا" کا فیض عام ہے تو پھر صرف "اہلِ عزا" کے سامنے جلوہ فرمانے سے اس "فیضِ عام" کی عمومیت کہاں باقی رہتی ہے۔

نظروں سے گر گیا ہے ہر اک جلوۂ حیات		جب یاد آ گئی ہے مصیبت حسینؑ کی		(صفحہ ۴۷)

"جلوۂ حیات" یہاں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ حضرت حسین علیہ السلام کی مصیبت یاد آنے ہی دنیا کی ہر خوشی اور شادمانی نظروں سے گر گئی -

راغب صاحب کے کلام کی خصوصیات بہرحال "نذرِ شہدائے کربلا" میں جھلکتی ہیں!

فاران

کراچی

پاکستان

11

ماہر القادری

جلد ۸ نمبر ۵

فاران

اگست ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان کی اکثریت اللہ کے فضل سے اسلام پسند ہے۔ ان میں اگرچہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے، جن کی زندگیاں اسلامی اخلاق سے بہت ہی کم مطابقت رکھتی ہیں۔ مگر اُن کی دلی تمنّا یہی ہے کہ اسلام کو سربلندی حاصل ہو اور اللہ کا دین غالب ہو کر رہے۔ خود بُرائیوں میں مُبتلا ہونے کے باوجود یہ لوگ بُرائیوں کا چلن دیکھ کر دُکھ محسوس کرتے ہیں اور دین و اخلاق کی جہاں سے بھی آواز آتی ہے، اُن کا ضمیر اس پر "لبیک" کہتا ہے! یہی احساسِ شرافت ہے جو ایک گنہگار انسان کو "توبہ" کی توفیق بخشتا ہے اور کوئی تردامن ہو جائے تو ہو جائے مگر گناہوں کے سمندر میں بالکل ڈوب کر نہیں رہ جاتا!

مگر دُوسری طرف پاکستان اور ملّتِ اسلامیہ کی بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی پایا جاتا ہے۔ جس کے فکر و خیال پر مغربیت کا غلبہ ہے۔ یہ طبقہ زندگی کے مسائل کو یورپ کی دانش گاہوں میں بنی ہوئی سیر بینوں سے دیکھتا ہے۔ یورپ نے سود و زیاں کی جو قدریں مقرر کردی ہیں، یہ اُنہی پیمانوں سے حقائق کو ناپتا ہے۔ اس مغرب زدہ گروہ کو اسلام سے جتنی بھی واقفیت ہے، وہ یورپ کے اربابِ فکر اور تاریخ نگاروں کے واسطے سے حاصل ہوئی ہے! ان "صاحب لوگوں" کی نگاہ میں اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی شخصیتیں اور نامور ہیرو رضا شاہ پہلوی اور مصطفےٰ کمال ہیں۔ اسی فکر و کردار کے لیڈروں کے نقشِ قدم اس گروہ کے لئے دلیلِ راہ ہیں!

یورپ سے آواز آئی کہ حجاب و نقاب صنفِ نازک کی آزادی کی توہین ہیں اور عورت گھر کی چاردیواری میں قیدیوں کی طرح محبوس نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کے جواب میں مغرب زدہ طبقہ نے عورت کے عارض دکاکل ہی نہیں، گردن، بانہوں اور پنڈلیوں تک کی عریانی تک کو یہ کہہ کر پیش کردیا کہ ؏

چہ گُند بے نوا ہمیں دارد

اس "ترقی زدہ گروہ" نے اسی پر بس نہیں کیا۔ یہ گروہ عورت کو تھیٹر کے اسٹیج پر، کرکٹ اور ہاکی کی بازی گاہوں اور پریڈ کے میدانوں میں لے آیا۔ پاکستان کے شراب خانے، ناچ گھر، گھوڑ دوڑ کی شرطیں اور کلب، گھروں کی قمار بازی بند ہو سکتی تھی اور بند ہو جانی چاہیئے تھی۔ مگر یورپ کے ان ذہین شاگردوں کی نگاہ میں یہ ترقی کے آثار، تہذیب کی علامتیں اور تمدن کے مظاہر ہیں۔ اس لیئے یہ شیطانی کاروبار ابھی تک پاکستان میں چل رہا ہے!

اس اخلاقی گراوٹ اور غیر اسلامی حرکتوں پر اسلام پسند طبقہ نے انگشت نمائی کی تو مغرب زدہ ٹولی پکار اٹھی کہ یہ رجعت پسندی، قدامت زدگی اور مُلّائیت ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے، نیکی اور بدی کی قدریں تک کچھ سے کچھ ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان دقیانوسی ملاؤں کے فتوے اب نہیں چل سکتے۔ اسلام میں بہت لچک ہے۔ اس لچک سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا!

اسی "اینگلو پاکستان" گروہ نے اسلامی دستور سازی کی راہ روکنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی ہیں۔ کیسے کیسے پینترے بدلے ہیں اور کن ہتھکنڈوں سے کام لیا ہے۔ وہ تو پاکستان کے دن پھرنے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام پسندوں کو عزیمت کی توفیق عطا فرمائی اور وہ سب کے سب ایک محاذ پر اکٹھے ہو گئے۔ ہر طرف سے ایک ہی نعرہ، ایک ہی پکار، ایک ہی مطالبہ:-

"اپنا مقصد، اپنی منزل اسلامی دستور"

جمہور کی بات بڑا وزن رکھتی ہے۔ اکثریت کے مطالبہ کو رد کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اسلامی دستور کی راہ روکنے والوں کے تمام توڑ جوڑ اکارت گئے، ہر سازش کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اس مغرب زدہ ٹولی کی تمناؤں اور امیدوں کے علی الرغم کتاب و سنّت کو اسلامی دستور کی اساس تسلیم کیا گیا اور ایسا دستور بنا جو بہت سی خامیوں اور چور دروازوں کے باوجود اسلامی حدود سے قریب تر ہے!

جو مغرب زدہ پارٹی دستور کے محاذ پر شکست کھا چکی تھی، اُسے اپنے عزائم اور خواہشوں کے لئے بہرحال کوئی نہ کوئی راہ نکالنی تھی۔ جو نظریئے اور افکار اُن کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکے ہیں اور جو عادتیں اُن کی زندگیوں میں جڑ پکڑ چکی ہیں اُن سے یہ لوگ دستبردار کس طرح ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس ہزیمت اور پسپائی کا انتقام "عائلی کمیشن" کی رپورٹ کی شکل میں لیا گیا ہے، اسلامی معاشرے پر یہ تعمیر و اصلاح اور ترقی و آزادی کی آڑ لے کر شبخون مارا گیا ہے۔ یہ دستور کے اسلامی تقاضوں کو بے اثر کرنے کے لئے خطرناک داؤں چلا گیا ہے!

آپ نے دُنیا میں یہ اچنبھا بھی دیکھا اور سنا ہے؟ ـــــ کہ کسی علم و فن کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے ایسے لوگ مقرر کئے جائیں، جنہیں اُس فن کے مبادی کا بھی اتا پتا نہ ہو اور یہ لوگ صرف اپنی ذہانت اور بہت ہی سرسری اور سطحی معلومات کی بناء پر اُس فن کے بنیادی نظریوں کو کانٹ چھانٹ کر ایک رپورٹ تیار کر دیں ـــ کہ یہ ہے اس فن کے منشاء کی صحیح تعبیر اور ان مسائل کی ترقی یافتہ تشکیل! اس قسم کے "بے علم مجتہدین" کی ایسی رپورٹ کو زیادہ سے زیادہ شوخیٔ فکر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ علم و عمل کی دُنیا میں اس کا کوئی وزن، کوئی حیثیت اور کوئی درجہ نہیں!

"عائلی کمیشن" میں غالب تعداد اُنہی ارکان کی تھی جو کتاب و سنّت اور فقہ کا نہ کوئی علم رکھتے ہیں اور نہ ان علوم سے ان حضرات کو کوئی مَس رہا ہے! ان کے فکر و شعور مغربی علوم کی فضا میں پروان چڑھے ہیں اور مغربی افکار ہی ان کے خوب و ناخوب کا پیمانہ بنے رہے ہیں۔ ان ارکان میں وہ "بیگمات" بھی شامل تھیں جن کی قریب قریب ساری زندگی

"تبرج جاہلیت" میں گزری ہے اور جو "اپوا" کا مزاج رکھتی ہیں ـــــ اور "اپوا" کے کارناموں (؟) کو سب ہی..... جانتے ہیں۔ پاکستان کی عورتوں میں بے حجابی اور آزادی پھیلانے کا ذمہ دار یہی ادارہ (APWA) ہے۔ اسی "اپوا" کے جھنڈے کے نیچے مسلمان لڑکیوں نے مسز روز ویلٹ کے خیر مقدم میں شہر کی گلیوں کا گشت لگا کر اسلامی تہذیب کو سر بازار رسوا کیا ہے۔ پاکستان میں شاہ ایران نزولِ اجلال فرمائیں یا صدر جمہوریہ ترکی، شرق اُردن کے فرمانروا کا ورود ہو یا امریکہ کے کسی بڑے آدمی کی آمد ہو۔ "اپوا" کی ان بیگمات کو خیر مقدم کے جلسوں، پارٹیوں اور دعوتوں میں اپنے حُسن و جمال کی نمائش کے لئے پہنچنا ضروری ہے!

اس مزاج و طبیعت اور فکر و نظر کی عورتوں کو اسلامی مسائل کی کسی کمیٹی میں شامل کرنا کس قدر عجیب و غریب مذاق ہے۔ بلکہ دردناک بھی! جن لوگوں نے یہ کھیل کھیلا ہے وہ بڑے ہوشیار اور کائیاں واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے "عائلی کمیشن" کے ذریعہ پاکستان کی عورتوں کو اسلام پسند طبقہ کے خلاف محاذ قائم کرنے کے اسباب اور مواقع بہم پہنچا کردیئے ہیں ـــ!

اس سے قطع نظر کہ نکاح و طلاق کے اساسی مسائل میں کتاب و سنّت کا کیا فیصلہ اور جزئیات میں اجماعِ اُمت کیا ہے؟ پاکستان میں تعدد ازواج کا رواج اتنا کم ہے کہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح طلاق کے واقعات بھی شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔ اور مردوں کا ایک سے زیادہ شادی کرنے اور بیویوں کو طلاق دینے کا رجحان بھی نہیں بڑھ رہا ہے بلکہ قریب قریب مفقود سا ہے۔ ان حالات میں تعدد ازواج پر پابندی لگا کر، عورت کو طلاق کا حق دے کر اور اسی طرح کے دوسرے شوشے چھوڑ کر بیٹھے بٹھائے ایک فتنہ کھڑا کر دینا کہاں کی عقلمندی اور دوراندیشی ہے یہ تو وہی دیہاتی مثل ہوئی کہ:۔

"آ بیل مجھے مار"!

سب سے زیادہ قابلِ غور و توجہ بات یہ ہے کہ "عائلی کمیشن" کو شریعت کے حدود کے اندر عائلی مسائل کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا، یا اُس کو یہ اختیار بھی تفویض کر دیا گیا تھا کہ وہ پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ اسلامی شریعت ہی پر ہاتھ صاف کردے۔ اس کمیشن نے اپنے حدود سے مجرمانہ تجاوز کیا ہے! اس کے ارکان نے کہیں سے یہ سُن پایا ہے کہ اسلام میں "پاپائیت" نہیں ہے ـــــ بیشک اسلام میں "پاپائیت" نہیں ہے مگر اسلام میں "پاپائیت" نہ ہونے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ ہر عامی اور جاہل کو "اجتہاد" کا حق دے دیا جائے اور وہ اپنی فہم و استعداد اور اپنے رجحانات کے مطابق شریعت کے قوانین میں کاٹ چھانٹ کرتا چلا جائے!

عائلی کمیشن کی رپورٹ اس "جاہلانہ اجتہاد" کی بدترین مثال ہے۔ یہ رپورٹ عبرت کا ایک مرقع ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کسی علم و فن میں مہارت و بصیرت کے بغیر دخل در معقولات کے نتائج کس قدر خوفناک ہوتے ہیں اور جہالت جب علم کا دعویٰ لے کر اٹھتی ہے تو وہ کیسے کیسے فتنوں کا دروازہ کھولتی ہے! یہ رپورٹ غمازی نہیں کرتی بلکہ صاف صاف بتاتی ہے کہ اس کے واضعین اور مرتبین نے یورپی تہذیب اور مغربی معاشرے کو سامنے رکھ کر رپورٹ مُرتب کی ہے۔ اسلامی شریعت کے تقاضے اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں! انہوں نے نکاح و طلاق کے دینی مسائل کو اس نہج پر مُرتب فرمایا ہے جیسے کوئی کرکٹ اور ہاکی کے قواعد ترتیب دیتا ہے۔ اور کرکٹ اور ہاکی کے قوانین

بنانے والے پھر بھی گزشتہ نظائر اور روایات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مگر ان جدت پسندوں نے تو خود رائی کی حد کردی۔ دین کے ماخذ منبع اور ماضی کی طرف مڑ کر ہی نہیں دیکھا! ان کے سامنے مغرب کا عائلی نظام رہا ہے، بس اسی کو معیار بنا کر اور منزلِ مقصود ٹھہرا کر رپورٹ کی تدوین فرمائی گئی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ شریعت کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل کا "اسلام" کا نام لے کر حلیہ بگاڑا گیا ہے! ع

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

عائلی کمیشن کی رپورٹ کن رجحانات و میلانات کی حامل ہے، اس کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے کمیونسٹ اخباروں نے اس رپورٹ کو سب سے زیادہ سراہا ہے اور اس رپورٹ کے منظرِ عام پر آتے ہی اشتراکیت پسندوں کی خوشی کے مارے باچھیں کھل گئی ہیں۔ کہ — "وہ مارا"۔ — "وہ پڑی دین و شریعت پر خوب کس کر ضرب"۔ — "وہ ہوئی جدت و ترقی کی جیت"۔ — ... یہ سلسلہ چل پڑا تو پھر اسلام کے ایک ایک اصول کا یہی حشر ہوگا! دوسری طرف دین میں ناروا جدتوں، دراز دستیوں اور ترقی پسندانہ اجتہادات کی تائید کے لئے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پہلے سے بنا بنایا موجود ہے! اس کے حقِ نمک ادا کرنے کا مناسب وقت تو اب آیا ہے!

خطرہ۔ خطرہ! خطرہ!! عائلی کمیشن کی رپورٹ پاکستان کے اسلام پسند طبقہ کو کھلا چیلنج ہے۔ یہ رپورٹ مغرب زدہ طبقہ کے عزائم کی آئینہ دار ہے کہ یہ حضرات پاکستان میں کس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کا پروگرام کیا ہے؟

وہ لوگ بڑی غفلت میں مبتلا ہیں جو اس رپورٹ کو معمولی سا دستاویز سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ یہ کوئی پٹاخہ اور پھلجھڑی نہیں ہے کہ ذرا سی دیر اپنی نمود دکھا کر ختم ہو جائے گی۔ یہ بارود ہے جو دینی نظام اور اسلامی معاشرے کو اڑانے کے لئے بچھائی گئی ہے!

اس رپورٹ کے نتائج بڑے دور رس ہوں گے اور گہرے بھی! اس سے مسلمانوں کا نام عائلی نظام تہ و بالا ہو کر رہ جائیگا اور رفتہ رفتہ دین کی کوئی قدر بھی ثابت نہ رہ سکے گی! اگر اس رپورٹ کو مؤثر احتجاج کے ساتھ رد نہ کر دیا گیا تو پاکستان کے قوانین پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنے کے لئے جو بورڈ مقرر ہونے والا ہے اس کے ارکان بھی اسی قماش اور ذہن و فکر کے مقرر کئے جائیں گے اور جس بورڈ کی یہ ہیئتِ ترکیبی ہوگی اس کے غور و فکر کے جو نتائج ہوں گے ان کا اندازہ عائلی کمیشن کی رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے!

ترکی کی افسوسناک مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں مغرب زدہ ذہنیت کو جب دراندازی کا موقعہ ملا تو اسلام سے اور اس کے تمام لواحق و متعلقات سے اس قدر بیزاری پیدا ہو گئی کہ عربی رسم الخط تک کو بدل دیا گیا اور حکومت نے اذان پر لسانی پابندی لگا دی۔ اب خدا خدا کر کے "کمالی دور" کی یہ زیادتی ختم ہوئی ہے ورنہ ترکی کی مسجدوں سے "اللہ اکبر" کی جگہ ترکی زبان کے کلمے بلند ہوتے تھے!

عائلی کمیشن کی رپورٹ کو خدا نخواستہ پاکستان میں قانونی حیثیت دے دی گئی تو پھر دین و شریعت کے حدود توڑنے کی بنیاد پڑ جائے گی اور یہ معاملہ صرف نکاح و طلاق ہی تک محدود نہ رہے گا۔ رقص و سرود، شراب نوشی، قمار بازی اور سود خوری کے لئے اسلام ہی کے نام پر نکتے پیدا کئے جائیں گے، دلیلیں لائی جائیں گی اور تاویلیں تراشی جائیں گی۔

کہا جائے گا کہ اسلام نے اُس "خمر" کو حرام کیا ہے جو سُکر پیدا کر کے آدمی کے عقل و ہوش کو ڈھانک لے اور اس کے حواس پر چھا جائے۔ مگر جو "خمر" صرف طاقت و توانائی کے لئے مقررہ مقدار کے تحت پی جائے اُس پر اسلام پابندی عائد نہیں کرتا۔ جو لوگ "عورت" کو طلاق کا حق دے سکتے ہیں، اُن سے کیا بعید ہے کہ وہ مسلمان عورت کے رقص (DANCE) کو ایک معاشرتی حق (Social Right) قرار دے دیں کہ تھوڑی دیر ناچ کر اور تھرک کر عورت اپنا دل بہلا لے تو اس میں آخر قباحت کیا ہے؟ زمانہ منقلب ہو چکا ہے، حالات بدل چکے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے عورت کی عفت و حیا کا جو تصوّر مردوں کے ذہن میں تھا، اب وہ نہیں رہا۔ اس لئے .... رقص .... اختلاط .... اداکاری .... اور .... سب کچھ جائز بلکہ زمانہ کے تقاضوں کے عین مطابق!

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے محض خیالی اندیشہ نہیں ہے۔ مصر کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہاں دین سے بیزار اور مغرب پرست طبقہ کو حکمرانی کا موقعہ ملا ہے تو تمام فواحش اور فسق و فجور کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جاتی ہے اور خود حکومت مصر کے صدر جمال ناصر کے قصر میں نیم برہنہ ناچ ہوتا ہے اور شراب کے دَور چلتے ہیں۔ اور ان تمام برائیوں اور گندگیوں کو وہ لوگ تہذیب حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق سمجھتے ہیں!

ایک وہ دَور تھا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جب کسی نے اُن کے نسب کا حال دریافت کیا تو آپ نے "اسلام ابن اسلام ابن اسلام" فرمایا یعنی یہ کہ اسلام لانے کے بعد اب کسی قومی، نسلی اور وطنی تفاخر کا تصوّر بھی میرے ذہن میں نہیں رہا۔ اسلام کی محبت کی ایک تو یہ کیفیت تھی اور دُوسری طرف اسلام بیزاری اور وطن پرستی کا یہ عالم ہے کہ جمال ناصر ڈنکے کی چوٹ نحن ابناء الفراعنہ " (ہم ہیں فرعونوں کی اولاد) کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ ہے وہ جاہلیت جو ایک مسلمان کے دل و دماغ میں اسلام سے وابستگی کے نقوش کو دُھندلا بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اسلام سے دل میں کد پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا آدمی چاہے تحقیق و اکتشاف کے لئے مریخ و قمر تک پہنچ جائے یا زمین کی تہوں میں اُتر جائے مگر وہ "اسلام" کے کام کا نہیں رہتا!

بیشک اسلام نے غلامی، محکومیت اور ذلت کی زنجیریں کاٹ کر عورت کو غلامی سے نجات دلائی اور اُسے آزاد بنایا۔ مگر اس "آزادی" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت کو بے مہار چھوڑ دیا گیا کہ اس کا جی چاہے تو لوگوں کے ساتھ راتوں کو ناچ لے۔ اس کا جی چاہے تو غیر مردوں سے ربط و اختلاط تک کو روا رکھے مگر شادی کی پابندی قبول نہ کرے۔ اور شادی کر لے تو جب جی میں آئے شوہر کو طلاق دے کر ازدواجی رشتہ کو توڑ ڈالے! اسلام نے ایسی آزادی عورت کو ہرگز نہیں دی۔ اس قسم کی آزادی جاہلیت کی دی ہوئی آزادی ہے۔ اسلام کی عطا کی ہوئی آزادی نہیں ہے — خود قرآن اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر "قوّام" (سردھرا) بنایا ہے۔ مرد کی اس "قوامیت" پر جو اس کا فطری اور جائز حق ہے جب بھی دست درازی کی جائے گی عائلی نظام برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا!

یورپ کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے کہ مرد کی "قوّامیت" کے بندھن ٹوٹ جانے کے بعد وہاں کا عائلی نظام جانوروں کی معاشرت سے قریب تر ہو گیا ہے۔ وہاں کے ازدواجی تعلقات میں کوئی لطف، کوئی تسکین اور اطمینان باقی نہیں رہا!

عائلی کمیشن کی رپورٹ میں کسی قسم کی اُپج بھی نہیں ہے بلکہ اس میں یورپ کی نقالی کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کا مزاج

اسلامی مزاج کی ضد ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتائج بھی اسلامی تقاضوں کے خلاف ہی رونما ہوں گے۔ اس رپورٹ کے سراہنے والے کمیونسٹ ہیں، مغرب پرست ہیں۔ "اپوا" کی بیگمات ہیں اور امریکہ کے رسالے ہیں! کسی اسلام پسند فرد یا جماعت نے اس کی تعریف یا تائید میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی دستور کے بھی مخالف رہے ہیں اور انہوں نے طرح طرح سے کوششیں بلکہ سازشیں کی ہیں کہ پاکستان کسی عنوان "اسلامی مملکت" نہ بننے پائے! یہی لوگ عائلی کمیشن کی رپورٹ کے مخالفین پر "ملاّ، تنگ نظر اور قدامت زدہ" کی پھبتیاں چست کر رہے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے پرانے حربے ہیں۔ جو اگرچہ کند ہو چکے ہیں مگر یہ لوگ انھیں برابر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ہر وہ دینی شعار جس کی اسلام پسند طبقہ حمایت کرتا ہے اُس پر "ملائیت" کی طنز کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کا "علمِ کلام" اسی قسم کی طنزوں اور پھبتیوں کے سہارے قائم ہے!

عزم محکم

ارباب اقتدار بھی کان کھول کر سن لیں اور وہ بھی جو اسلام کے خلاف ایسے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں کہ عائلی کمیشن کی رپورٹ اسلامی شریعت کی اسپرٹ سے نہ صرف یہ کہ خالی ہے بلکہ اس کی ضد ہے، اسلئے اگر اس رپورٹ کو قانونی شکل دینے کی کوشش کی گئی تو پاکستان کی اکثریت اسے ہرگز ہرگز قبول نہ کرے گی۔ بہتری اور بھلمنساہت اسی میں ہے کہ خود حکومت اس رپورٹ کو اس کے واضعین کے پاس واپس کر دے۔ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو پھر پاکستان کے عوام اس رپورٹ کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ اگر حکومت عوام کے جذبات سے واقف ہے تو اُسے اس کشمکش کا موقع ہی نہ آنے دینا چاہیئے۔ یہ رپورٹ تعمیر و اصلاح کے بجائے ملک میں ایک نئی کشمکش کا دروازہ کھول دے گی!

انگریز کے دورِ غلامی میں "شاردا ایکٹ" کے خلاف مسلمان اپنے جذبات کا اظہار کر کے اس ایکٹ کو بے اثر بنا چکے ہیں تو یہ رپورٹ جو شاردا ایکٹ کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ غیر اسلامی ہے۔ اُسے مسلمانوں کی وہ اکثریت کس طرح برداشت کر سکے گی جو اللہ کے فضل سے آزاد ہے۔

ضرورت ہے کہ پاکستان میں اس سرے سے اُس سرے تک اس منحوس رپورٹ کے خلاف شدید احتجاج کیا جائے۔ اس احتجاج میں ضبط و نظم اور اسلامی اخلاق کو ملحوظ رکھا جائے کہ اسلام کمیونسٹوں کی طرح انارکی اور بد تمیزی کی اجازت نہیں دیتا۔ عوام کے احتجاج میں بڑی قوت ہے۔ اسلامی دستور سازی میں عوام اپنی قوت کا تجربہ بھی کر چکے ہیں!

ہو سکتا ہے کہ یہ مغرب زدہ گروہ "اپوا" کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں کو اس رپورٹ کی تائید کے لئے میدان میں لے آئے، اس کے توڑ کے لئے اسلام پسند خواتین کو تیار رہنا چاہیئے۔ اُن کو آواز بلند کرنی ہوگی کہ ہم اللہ اور رسولؐ کے دیئے ہوئے حقوق سے زائد حقوق طلب کر کے ظالم بننا نہیں چاہتیں۔ اور یہ "اپوا" کی بیگمات نہ ہماری نمائندہ ہیں اور نہ ہماری ترجمان ہیں۔ ہمارے حقوق و وظائف (Rights and Functions) کا فیصلہ اللہ اور رسولؐ کر چکے ہیں۔ ہم اس فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہیں۔ "اپوا" کے فیصلوں، رپورٹوں اور پروگراموں پر عمل کر کے ہم اپنی دین و دنیا تباہ کرنا نہیں چاہتیں!

حکومت اگر دانشمندی سے کام لے اور صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لے تو اس کشمکش کی سرے سے نوبت ہی نہیں آسکتی۔ لیکن اگر حکومت ہی میں کچھ لوگ اس کشمکش کی نمود چاہتے ہیں تو پھر اس ٹریجڈی پر ہم ابھی سے اپنے

حزن و ملال کا اظہار کرتے ہیں - اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ پہلے کی طرح اب کی بار بھی فتنہ کے یہ بادل چھٹ جائیں اور اسلام کے خلاف ان کوششوں کو نامرادی نصیب ہو!

بہتری اسی میں ہے کہ عائلی کمیشن کی یہ رپورٹ اس کے واضعین اور مرتبین ہی کے ہاتھوں چاک ہو کر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جائے ورنہ پھر پاکستان کے عوام کو اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا ہوگا - اس رپورٹ کی قسمت میں یا تو چاک ہونا لکھا ہے یا دفن ہونا!

اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا!

ماہر القادری

۲۳ جولائی ۵۶ء

ابو محمد امام الدین رام نگری

خلافت فقر با تاج و سریر است

امیری میں فقیری

(غیر مطبوعہ کتاب "اسلامی حکومت کے والیان وامراء" کا ایک باب)

جو لوگ خدا اور آخرت کو نہیں مانتے یا ماننے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی اس عقیدے کے مطابق عمل نہیں کرتے، انسان کی ساری دوڑ دھوپ، جدوجہد اور سعی وکوشش صرف دُنیا کے لئے ہوتی ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں اسی دُنیا کی راحت و آسائش اور عزت و سرفرازی کے لئے کرتے ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ ان کو جتنی راحت وخوشی اور عزت وجاہ حاصل ہو اور اُن کی زندگی کا معیار جس قدر بلند ہے اُس میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا جائے، دَور حاضر میں انسان کی ساری جدوجہد اور سعی وکوشش اسی محور کے گرد گھوم رہی ہے، دُنیا میں جو فساد برپا ہے اور ملکوں، ملکوں، قوموں قوموں، پارٹیوں پارٹیوں اور افراد افراد کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اُس کی تہ میں یہی خود غرضی، عیش پرستی اور نفس پروری کام کر رہی ہے، اگر انسان اس حقیقت کو سچائی کے ساتھ قبول کر لیتا کہ زندگی اس دُنیا کے ساتھ محدود نہیں ہے، اس کے بعد اس سے وسیع ایک اور زندگی موجود ہے اور سچی راحت وخوشی اور فلاح وکامیابی وہی ہے جو آئندہ زندگی میں میسر ہو۔ پھر اس عقیدے کی بناء پر وہ دُنیاوی زندگی کا ایک معیار مقرر کر لیتا تو انسانیت بے شمار قسم کی ہلاکتوں اور تباہیوں سے بچ جاتی۔ اور دُنیا امن وسلامتی کا گہوارہ ہوتی!

خدا نے انسان کے ساتھ اس کی ضروریات زندگی کے سامان بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر انسان اعتدال وتوسط اور مساوات وتوازن سے کام لے اور ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اسے غصب کرنے کی خو سے باز آ جائے تو جائز اور ضروری سامان زندگی کے لئے باہم فتنہ وفساد اور قتل وغارت کی کوئی وجہ باقی نہ رہے، دُنیا کے مختلف حصّوں میں خدا کے جتنے رسول اور پیغمبر آئے انہوں نے معیشت کو کبھی بنیادی مسئلہ کی حیثیت نہیں دی۔ معاشی مشکلات تو صرف زندگی کے بنیادی عقائد اور اخلاق کی خرابی کی بناء پر پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تحریک ودعوت کی بنیاد ہمیشہ خدا پرستی اور فلاح آخرت رہی۔ اور انہوں نے جو بھی جدوجہد کی انسانی اخلاق وکردار کی بلندی اور تطہیر کے لئے کی۔ کیونکہ انسانیت کے بناؤ سنوار اور اصلاح وترقی کی شاہ کلید یہی چیز ہے، اگر انسان کی زندگی کی بنیاد خدا پرستی اور فلاح آخرت کا عقیدہ ہو اور انسان کے اخلاق وکردار پاکیزہ اور بلند ہوں تو اس کے تمام اعمال واخلاق از خود بن سنور جائیں گے اور نوع انسانی لازمی طور پر انسانیت کا سچا نمونہ بن جائے گی۔

اسلام اسی بنیاد پر اپنے پیروؤں کی تربیت کرتا ہے، اسی لئے ایسے تربیت یافتہ معاشرے کے اندر جو حکومت قائم ہوتی ہے اُس کے سربراہ کار اور کارکن ذاتی راحت وآسائش اور عیش وآرام کے دلدادہ نہیں ہوتے، وہ امیری کی حالت میں بھی فقیری کی زندگی گزارتے ہیں۔ خود تکلیف اُٹھانے میں اور رعایا کو آرام پہنچاتے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ رعایا کے حقوق کے سچے امین اور محافظ ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگوں کے ذریعہ عوام کو سچی راحت وآسائش اور فراغت وخوشحالی میسر آ سکتی ہے!

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ کے خوش حال اور کامیاب تاجروں میں شمار ہوتے تھے، اسلام لائے تو چالیس ہزار درہم آپ کے پاس نقد تھے، وہ سب آپ نے اللہ و رسول کی خوشنودی کے لئے خرچ کر دیئے، خلیفہ ہونے سے پہلے بھی آپ تجارت کے ذریعہ اپنی معاش حاصل کرتے تھے، منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد آپ کو بیت المال سے دو چادریں ملتی تھیں، جب وہ پرانی ہو جاتیں تو انہیں واپس کر کے دوسری چادریں لے لیتے - جب اُن کے کپڑے کا یہ حال تھا تو اُن کے کھانے کا کیا حال رہا ہوگا - وہ دُنیا سے اس طرح گئے کہ موت کے وقت اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ صدیقہ سے فرمایا کہ مسلمانوں کے مال سے میرے پاس ایک لونڈی اور دو اونٹنیوں کے سوا کچھ نہیں ہے، میرے مرتے ہی یہ عمرؓ کے پاس بھیجدی جائیں - دُوسرے بیانوں میں اسی طرح کی دو ایک اور چیزیں بھی بتائی گئی ہیں - جو آپ کی وصیت کے مطابق بیت المال میں جمع کردی گئیں - اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق فرمایا کہ جو کپڑا اس وقت بدن پر ہے اُسی کو دھو کر دوسرے دو کپڑوں کے ساتھ کفن دینا - حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ یہ تو پُرانا ہے کفن کے لئے نیا ہونا چاہیئے - فرمایا - مُردوں کی بہ نسبت زندے نئے کپڑوں کے زیادہ حقدار ہیں - میرے لئے یہی پھٹا پُرانا لباس ہو - (خلفائے راشدین)

ایک مرتبہ آپ نے پینے کے لئے پانی مانگا - لوگوں نے پانی میں شہد ملا کر پیش کیا - آپ جیسے ہی اُسے مُنہ کے پاس لے گئے آنکھوں سے آنسو اُمنڈ پڑے، آپ اس قدر روئے کہ ریش مبارک تر ہو گئی - جب سکون ہوا تو رونے کا سبب پوچھا گیا - آپ نے فرمایا - ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا - آپ کسی چیز کو "دُور، دُور" کہہ رہے تھے - میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا چیز ہے جس کو دُور فرما رہے ہیں - مجھے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی" حضورؐ نے فرمایا "دُنیا مجسّم ہو کر میرے سامنے آئی تھی، میں نے اُس کو دُور کر دیا" - اس وقت یکا یک مجھے وہی بات یاد آ گئی اور میں ڈرا کہ شاید میں دُنیا کے جال میں پھنس نہ جاؤں - (اسد الغابہ)

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے - ایک روز آپ نے پینے کا پانی مانگا، لوگ شہد لائے، پیالے کو ہاتھ پر رکھ کر تین بار فرمایا - کہ اگر پی لوں تو اس کی مٹھاس چلی جائے گی اور تلخی (عذاب) باقی رہ جائے گی - یہ کہہ کر پیالہ ایک آدمی کو دے دیا اور وہ اسے پی گیا - (اسوۂ صحابہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۱)

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو یزید بن ابی سفیان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پڑا - معمولی کھانے کے بعد دسترخوان پر عمدہ کھانے لائے گئے تو آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا - اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم رسول اللہ کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو خدا تم کو سیدھی راہ سے منحرف کر دے گا - (خلفائے راشدین)

ایک روز حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں آئے - آپ زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے - آپ نے حضرت عتبہ کو بھی کھانے میں شریک کر لیا - لیکن یہ خشک لقمے اُن کے گلے سے نہ اُترے - بولے، امیر المومنین! آپ کو میدے سے رغبت ہے؟ فرمایا، کیا مسلمانوں کو مل سکتا ہے؟ انہوں نے کہا "نہیں"، فرمایا، تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں دُنیا ہی میں کھانے پینے کا مزا اُٹھا لوں؟

ایک روز اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے، انہوں نے سالن میں زیتون کا تیل ڈال کر پیش کیا - فرمایا "ایک برتن میں دو دو سالن مرتے دم تک نہ کھاؤں گا"

آپ عرب و عجم اور مصر و شام کے حکمران اور مسلمانوں کے امیر تھے - لیکن آپ کے سامنے کھجوریں رکھ دی جاتیں اور آپ سڑی گلی کھجوریں تک اُٹھا کر کھا جاتے - (اسوۂ صحابہ حصہ دوم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جسم مبارک کبھی نرم اور ملائم کپڑوں سے مَس نہیں ہوا - بدن پر بارہ بارہ پیوند کا کُرتہ - سر پر پھٹا

عمامہ اور پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہوتی تھیں۔ پھر اسی حالت میں قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملتے، مسلمانوں کو شرم آتی لیکن کس کی مجال تھی جو آپ کے سامنے زبان کھولتا۔

ایک بار حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے کہا "امیر المومنین! اب خدا نے فارغ البالی عطا کی ہے۔ بادشاہوں کے سفراء اور عرب کے وفود آتے رہتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اپنے طرزِ معاشرت میں تبدیلی کرنی چاہیئے" حضرت عمرؓ نے فرمایا "افسوس! تم دونوں امہات المومنین ہو کر دنیا طلبی کی ترغیب دیتی ہو۔ عائشہؓ! تم رسول اللہ کی اس حالت کو بھول گئیں جب تمہارے گھر میں صرف ایک کپڑا تھا۔ جس کو حضورؐ دن کو بچھاتے تھے اور رات کو اوڑھتے تھے۔ اور حفصہ تمہیں یاد نہیں ہے کہ ایک دفعہ تم نے بستر کو دوہرا کر کے بچھا دیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نرمی کے باعث رات بھر سوتے رہے، اور جب بلالؓ نے اذان دی تو آنکھ کھلی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "حفصہ! تم نے یہ کیا کیا کہ بستر کو دوہرا کر دیا؟ میں صبح تک سوتا رہ گیا۔ مجھے دنیاوی راحت سے کیا تعلق؟ بستر کی نرمی سے تم نے مجھے کیوں غافل کر دیا؟"

حضرت عمرؓ نے ایک بار اپنا گزی کا کرتہ ایک شخص کو دھونے اور پیوند لگانے کے لئے دیا۔ اس نے اس کے ساتھ ایک نرم کپڑے کا کرتہ بھی پیش کیا آپ نے اس کا کرتہ واپس کر دیا اور اپنا کرتہ لے کر فرمایا۔ "اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔"

عموماً گرمی میں کپڑے بنواتے اور پھٹ جاتے تو پیوند پر پیوند لگاتے، حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ ان کے دونوں شانوں کے درمیان کے کپڑے پر تہ بہ تہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے شمار کیا تو ان کے تہبند پر بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

ایک دفعہ لوگ آپ کے انتظار میں بیٹھے رہے، آپ دیر کے بعد اندر سے تشریف لائے۔ معلوم ہوا پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ جو کپڑے بدن پر تھے انہی کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیا تھا۔ سوکھ گئے تو پہن کر باہر نکلے!

کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب کے باشندے تھے اور وہ ایک تمدن نا آشنا ملک تھا۔ حضرت عمرؓ کی فوجیں روم اور فارس اور مصر کی سلطنتوں سے نبرد آزما ہو چکی تھیں اور انہوں نے ان کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ شام کی فتح کے بعد قیصرِ روم سے حضرت عمرؓ کے دوستانہ روابط بھی قائم ہو چکے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معاشرت کا یہی حال رہا۔ جسم مبارک پر موٹے جھوٹے پیوند لگے ہوئے کپڑے اور دستر خوان پر گیہوں کی بے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی اور زیتون کا تیل یا اسی طرح کا کوئی اور سالن۔ مہمان اور سفراء آتے اور یہی غذا ان کے سامنے بھی پیش کی جاتی۔ وہ ایسی خشک اور سادہ غذا کے عادی نہ تھے اس لئے ان کو کھانے کی تکلیف ہوتی لیکن ان کا پاس و لحاظ بھی حضرت عمرؓ کی معاشرت کو بدل نہ سکا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس فقیرانہ زندگی کی تہ میں کونسا جذبہ اور احساس کام کر رہا تھا۔ حضرت حفص بن العاص کھانے کے وقت موجود ہوتے تھے لیکن کھانے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ "آپ کے دستر خوان پر ایسی سادہ اور معمولی غذا ہوتی ہے کہ ہم لوگ اپنے لذیذ اور نفیس کھانوں پر اس کو ترجیح نہیں دے سکتے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں قیمتی اور لذیذ کھانوں کی مقدرت نہیں رکھتا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مجھے آخرت کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تم لوگوں کی طرح قیمتی اور لذیذ کھانوں کا دلدادہ ہوتا۔ (خلفائے راشدین)

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں دنیا کی زندگی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ آپ کی نظر آخرت پر تھی۔ اوپر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے متعلق حضرت عمرؓ کی گفتگو کا ایک واقعہ گزر چکا ہے۔ اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کے سامنے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس اسوۂ حسنہ تھا اور وہی آپ کے لئے چراغِ راہ تھا!

حضرت عمرؓ اپنے امراء و عمال کو بھی مصنوعی کر و فر کی حالت میں دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے ۔ چنانچہ آپ جن لوگوں کو کہیں حاکم یا افسر بنا کر بھیجتے اُن پر یہ شرط عائد کرتے کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا ۔ غذا میں چھنا ہوا آٹا استعمال نہ کرنا ۔ باریک کپڑے نہ پہننا اور لوگوں کی ضروریات کے وقت اُن کے لئے اپنے دروازے بند نہ رکھنا ۔ اگر تم نے ان میں سے کوئی کام کیا تو اس کی سزا دی جائے گی ۔ (مشکوٰۃ کتاب امارت و قضا)

ایک بار حضرت احنفؓ بن قیس کی قیادت میں عراق پر ایک مہم بھیجی ۔ لوگ کامیاب ہو کر مدینہ لوٹے تو اُن کے جسم پر زرق برق پوشاک تھی ۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا ۔ لوگ آپ کی برہمی کی وجہ سمجھ گئے ۔ چپکے سے آپ کی خدمت میں سے اٹھے اور عرب کے سادہ لباس میں دوبارہ حاضر ہوئے ۔ آپ ان کو اس لباس میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہر ایک سے الگ الگ بغل گیر ہوئے !

بیت المقدس کی فتح کی تقریب میں حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو حضرت خالدؓ بن ولید اور ان کے رسالے کے لوگ دیبا اور حریر کی قبائیں پہن کر آپ کے سامنے آئے ۔ آپ ان کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑے اور زمین سے کنکریاں اٹھا کر اُن کی طرف پھینکتے ہوئے غصہ سے بولے ۔ " تم نے دو ہی سال کے عرصہ میں اپنی سادگی ترک کر کے رومی وضع اختیار کر لی "

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دولت و ثروت سے نوازا تھا اور انہوں نے ناز و نعمت کے گہوارے میں پرورش پائی تھی ۔ لیکن اُن کا بھی یہ حال تھا کہ کبھی صرف زیب و زینت کے خیال سے کوئی چیز استعمال نہیں فرمائی ۔ ایک قسم کا رومی کپڑا جسے قز کہتے تھے اہل عرب کا پسندیدہ لباس تھا ۔ ارباب دولت و ثروت کے علاوہ متوسط طبقہ میں بھی استعمال ہونے لگا تھا ۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے بھی استعمال نہیں فرمایا ۔ نہ اپنی بیویوں کو پہنایا ۔ زمانہ خلافت میں بھی آپ کی یہ سادگی قائم رہی ۔ مسجد میں چادر سرہانے رکھ کر لیٹ جاتے ۔ اٹھتے تو بدن میں کنکریوں کے چبھنے کے نشانات نظر آتے ۔ لوگ دیکھتے تو کہتے ، یہ امیر المومنین ہیں ۔ (اسوۂ صحابہ)

آپ نے عمر بھر کبھی پاجامہ نہیں پہنا ۔ صرف شہادت کے وقت ستر پوشی کے خیال سے پہن لیا تھا ۔ عموماً تہمد پہنتے تھے ، ایک تابعی روایت کرتے ہیں کہ میں نے جمعہ کے روز حضرت عثمانؓ کو منبر پر دیکھا تو جو موٹا تہمد وہ پہنے ہوئے تھے اس کی قیمت پانچ درہم (ایک روپے) سے زیادہ نہ تھی ۔ (خلفائے راشدین)

حضرت علی رضی اللہ ہمیشہ دنیا کی نمود و نمائش اور راحت و آسائش سے دور رہے ۔ خلافت کے زمانے میں بھی آپ کے طرز زندگی میں کوئی تغیر نہیں ہوا ۔ زہد و ورع کا یہ حال تھا کہ اپنے لئے کبھی اینٹ پر اینٹ اور شہتیر پر شہتیر نہیں رکھا ۔ یعنی اپنے رہنے کے لئے مکان نہیں بنایا ۔ بیت المال میں جو کچھ آتا اس کو اسی وقت تقسیم کر دیتے ، اور کہتے ۔ " اے دنیا ! مجھے فریفتہ نہ کر "

لباس نہایت سادہ پہنتے تھے ، ایک شخص نے دیکھا کہ ان کے بدن پر ایک پھٹی پرانی قمیص ہے ۔ جب آستین کھینچی جاتی ہے تو ناخن تک پہنچ جاتی ہے اور چھوڑ دی جاتی ہے تو سکڑ کر آدھی کلائی تک آ جاتی ہے ۔ اسی سادہ لباس میں فرائض خلافت انجام دینے کے لئے بازاروں میں پھرا کرتے تھے !

ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا ۔ حضرت علیؓ گاڑھے کا تہبند باندھے ہوئے اور گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے بازار میں پھر رہے ہیں ۔ ہاتھ میں درہ ہے ، اور لوگوں کو سچائی اور حسن معاملہ کا حکم دے رہے ہیں ۔ لیکن بعض اوقات یہ سادہ لباس بھی بمشکل میسر ہوتا تھا ۔ ایک دن منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ میری تلوار کون خریدتا ہے ؟ اگر میرے پاس تہبند کے دام ہوتے تو میں اس کو فروخت نہ کرتا ۔ ایک شخص نے اٹھ کر کہا ۔ " ہم آپ کو تہبند کی قیمت قرض دیتے ہیں "

سادگی اور خاکساری اتنی محبوب تھی کہ بازار سے اپنا سودا سلف خرید کر خود ہی لاتے تھے ۔ ایک دن بازار میں کھجوریں خریدیں ،

اور خود اُٹھا کر لے چلے۔ ایک آدمی نے کہا۔ "یا امیر المومنین! لائیے میں پہنچا دوں۔" آپ نے فرمایا۔ "نہیں، ان بچوں کے لئے ہے اُن کا باپ ہی اُن کے اُٹھانے کا زیادہ مستحق ہے۔" دربان اور پہرہ دار کا جھگڑا نہیں رکھا تھا، تنہا اُٹھتے اور مسجد کو چلے جاتے تھے۔ (اسوۂ صحابہ جلد ۲)

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ قریش کے نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، بارگاہِ رسالت سے آپ کو امین الامت کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جہادِ شام کے سپہ سالارِ اعظم تھے۔ حضرت خالد بن ولید۔ حضرت یزید بن ابو سفیان، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے اکابرِ قریش آپ کے ماتحت سپہ سالار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، آپ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے گھر آیا۔ دیکھا تو آپ زار و قطار رو رہے ہیں۔ اُس نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ آپ اس قدر رو کیوں رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔ "ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے آئندہ فتوحات و تمول کا ذکر کرتے ہوئے شام کا تذکرہ فرمایا۔ اور کہا۔ "ابو عبیدہ! اگر اس وقت تک تمہاری عمر وفا کرے تو تمہارے لئے صرف تین خادم کافی ہوں گے۔" ایک خاص تمہاری ذات کے لئے اور ایک تمہارے اہل و عیال کے لئے اور ایک سفر میں ساتھ جانے کے لئے۔ اسی طرح سواری کے تین جانور کافی ہونگے ایک تمہارے لئے، ایک غلام کیلئے اور ایک اسباب و سامان کے لئے۔" لیکن اب دیکھتا ہوں تو میرا گھر غلاموں سے اور اصطبل گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے، آہ! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ حضورِ اقدس نے فرمایا تھا کہ وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہوگا جو اسی حال میں مجھ سے ملے گا جس حال میں میں اُسے چھوڑ جاؤں گا۔" (مہاجرین جلد اول)

ایک بار رومی سفیر اسلامی لشکر گاہ میں آیا تو اسے حضرت ابو عبیدہؓ تک پہنچنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ اس نے اپنے سپہ سالارِ اعظم کو جس شان و شوکت سے دیکھا تھا وہ اسی کو یہاں بھی تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اسے یہاں ہر چیز میں یک رنگی و یکسانی نظر آ رہی تھی۔ بالآخر اُس نے حیران ہو کر مسلمانوں سے پوچھا۔ "تمہارے سردار کہاں ہیں؟"

حضرت ابو عبیدہؓ سامنے ہی زمین پر بیٹھے تھے۔ کندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔ اور ہاتھ میں تیر تھا جسے آپ اُلٹ پلٹ رہے تھے۔ مسلمانوں نے کہا۔ "یہ بیٹھے ہیں۔"

آپ کو اس معمولی حالت میں دیکھ کر اسے یقین نہ آیا۔ اُس نے آپ سے پوچھا۔ "کیا واقعی آپ ہی سپہ سالارِ اعظم ہیں؟"

حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا۔ "ہاں۔" سفیر نے سوال کیا۔ "کیا آپ کا خیال ہے کہ اگر آپ قالین پر بیٹھیں تو خدا آپ سے ناخوش ہو جائے گا۔ اور آپ کو اپنے فضل و کرم سے محروم کر دے گا۔"

حضرت امین الامت نے جواب دیا۔ "میرے پاس قالین اور مال و دولت کہاں؟ اسلحہ جنگ کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ کل مجھے ایک ضرورت پیش آئی تو میرے پاس ایک حبہ نہ تھا۔ مجبوراً مجھے اس بھائی (حضرت معاذؓ) سے قرض لینا پڑا۔" (الفاروق)

آپ کو جب کبھی مال ملتا تھا، آپ راہِ خدا میں صرف کر ڈالتے تھے۔ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کی خدمت میں چار سو دینار اور چار ہزار درہم بطور انعام بھیجے، انہوں نے تمام رقم فوج میں تقسیم کر دی۔ اور اپنے لئے ایک حبہ بھی نہ چھوڑا۔ حضرت عمرؓ نے سُنا تو فرمایا۔ "الحمد للہ کہ اسلام میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔" (سیرت المہاجرین)

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر شہر کے عیسائی علماء و اکابر نے اسلامی سپہ سالار سے درخواست کی کہ خلیفۂ اسلام تشریف لائیں۔ ان کی موجودگی میں معاہدہ لکھا جائے اور ہم شہر کو مسلمانوں کے سپرد کر دیں۔ عیسائیوں کی اس درخواست کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ

بیت المقدس تشریف لے گئے۔ شہر کی حوالگی کے بعد افسرانِ اسلام نے باری باری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اپنے خیموں میں مدعو کیا اور ان کی خاطر و دلدی کے خیال سے آپ سب کے یہاں تشریف لے گئے۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کی دعوت نہیں کی، چنانچہ آپ نے ایک روز اُن سے کہا۔ "تمام افسروں نے میری دعوت کی لیکن آپ نے مجھے مدعو نہیں کیا۔"

حضرت ابو عبیدہؓ نے جواب دیا۔ "میں نے اس خیال سے آپ کی دعوت نہیں کی کہ شاید آپ کو میرے ہاں آکر آنسو بہانے پڑیں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "نہیں ایک روز اپنے یہاں میری دعوت کیجئے۔"

چنانچہ آپ نے ایک روز حضرت عمرؓ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ فاروق اعظم، فاتح شام کے خیمہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ گھر میں گھوڑے کے نمدے کے سوا کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ یہی نمدا اُن کا بستر تھا اور گھوڑے کا زین تکیہ۔ ایک طاق میں روٹی کے کچھ سوکھے ٹکڑے پڑے تھے، فاتح شام نے وہی ٹکڑے، تھوڑا سا نمک اور مٹی کے گلاس میں پانی لاکر آپ کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔

یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کو بے اختیار رونا آگیا۔ آپ حضرت ابو عبیدہؓ کو سینہ سے لگا کر کہنے لگے۔ "تمہی میرے بھائی ہو۔ تمہارے سوا میرے ساتھیوں میں اب کوئی نہیں جس پر دُنیا نے اپنا کچھ نہ کچھ جادو نہ کر دیا ہو۔"

حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا۔ "میں کہتا نہ تھا کہ آپ کو میرے یہاں آکر آنسو بہانا پڑیں گے۔"

حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ حمص کے حاکم تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو اس منصب پر مامور کرنا چاہا۔ تو پہلے انہوں نے اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے معذرت چاہی، کہا امیر المومنین! مجھے اس فتنہ میں نہ ڈالئے۔" لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کی معذرت قبول نہیں کی، کہا۔ "خدا کی قسم! میں تم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تم لوگوں نے میری گردن میں تو خلافت کی ذمہ داریوں کا پٹہ ڈال دیا اور خود علیحدہ رہنا چاہتے ہو۔" مجبوراً آپ نے اس عہدے کو قبول بھی کیا تو حالت یہ تھی کہ جو تنخواہ ملتی اُس میں سے معمولی طور پر کھانے پینے کا سامان خرید لیتے اور باقی تنخواہ خیرات کر دیتے۔ بیوی پوچھتیں کہ تنخواہ کی اور رقم کیا ہوئی تو کہتے۔ "قرض دے دیا ہے۔" قرآن مجید نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرضِ حسنہ قرار دیا ہے۔ حضرت سعید بن عامر کی قرض دینے سے یہی مراد تھی!

آپ کی عسرت اور تنگی کی زندگی کو دیکھ کر ایک دفعہ کچھ لوگ وفد کی شکل میں آپ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ پر آپ کے کنبے اور سسرالی رشتہ داروں کے بھی حق ہیں۔ آپ کو ان کا بھی خیال کرنا چاہئے۔" آپ نے فرمایا۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ فقراء مومنین دوسرے لوگوں سے ستر سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔" (صفتہ الصفوہ)

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لے گئے۔ حمص پہنچکر وہاں کے سربر آوردہ لوگوں سے ملاقات کی اور شہر کے فقراء اور مساکین کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا۔ فہرست مرتب ہو کر سامنے آئی تو دیکھا سب سے اُوپر حمص کے حاکم حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا نام موجود ہے۔ آپ نے ازراہِ تعجب دریافت فرمایا کہ "یہ سعید بن عامر کون ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا۔ "ہمارے حاکم۔" آپ کو اور بھی تعجب ہوا، فرمایا۔ "ان کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی ہے، وہ اس فہرست میں کیسے آسکتے ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا۔ "یہ درست ہے، لیکن انھیں جو کچھ ملتا ہے وہ دوسرے حاجتمندوں پر صرف کر دیتے ہیں، اُن کی فیاضی کچھ باقی رہنے نہیں دیتی۔"

یہ سُن کر حضرت عمرؓ رونے لگے۔ پھر اپنے خط کے ساتھ ایک ہزار دینار حضرت سعید بن عامر کے پاس بھیجے۔ اور قاصد سے کہا کہ انھیں میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا کہ امیر المومنین نے یہ رقم اس لئے بھیجی ہے کہ آپ اسے اپنی ضرورتوں پر خرچ کریں۔ قاصد نے حضرت سعید بن عامر کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عمرؓ کے خط کے ساتھ تھیلی پیش کی۔ دیناروں پر نظر پڑی تو بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ آپ کی بیوی کچھ دور تھیں اُن کے کان میں یہ آواز پڑی تو گھبرا کر بولیں۔ "خیریت تو ہے۔"

کیا خدانخواستہ امیرالمومنین کی وفات ہو گئی؟" فرمایا۔ "نہیں، اس سے بھی بڑا واقعہ ہے!" بیوی نے پوچھا "کیا خدا کی کوئی نشانی نمودار ہوئی ہے؟" فرمایا۔ "اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آیا ہے" کہنے لگیں "کیا قیامت کے آثار نمودار ہوئے ہیں؟" بولے۔ "نہیں، اس سے بھی بڑی بات ہو گئی ہے" انہوں نے کہا۔ "آخر کچھ بتلائیے بھی کہ معاملہ کیا ہے؟" فرمایا۔ "یہ دیکھو میرے پاس دنیا آ گئی ہے، ہائے میرے گھر میں فتنہ داخل ہو گیا ہے"۔

نیک بخت بیوی نے سمجھایا۔ "آپ اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہیئے گا اُسے رضائے الٰہی میں صرف کیجئے گا" اس بات سے ذرا دل کو تسلی ہوئی۔ رقم تھیلی میں باندھ کر ایک طرف رکھ دی۔ کچھ دنوں کے بعد ادھر سے مجاہدین کا گزر ہوا تو یہ ساری رقم اُن کی ضرورتوں پر خرچ کر دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی حکومت میں عام طور پر اعلان کر دیا تھا کہ جن لوگوں کو اپنے حاکم سے کوئی شکایت ہو وہ بے تامل میرے سامنے شکایتیں پیش کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اہلِ حمص نے حضرت عمر کی خدمت میں حضرت سعید بن عامر کی شکایتیں پیش کیں جن کی تفصیل یہ تھی:۔

(۱) جب تک کافی دن نہیں چڑھ آتا۔ آپ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

(۲) رات کے وقت کوئی آواز دیتا ہے تو جواب نہیں دیتے۔

(۳) مہینے میں ایک روز گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

حضرت سعیدؓ بن عامر جیسے فرض شناس، خداترس اور خدمت گزار شخص کی نسبت ان شکایتوں کو سُن کر حضرت عمرؓ کو بہت تعجب ہوا لیکن حضرت سعید بن عامر سے ان کے متعلق دریافت کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ طلب کیے گئے۔ وہ حاضر ہوئے، حضرت عمرؓ نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ اے اللہ سعید کے بارے میں میرے نیک گمان کو غلط ثابت نہ کرنا۔ پھر اہلِ حمص سے کہا کہ وہ اپنی شکایتیں پیش کریں۔ لوگوں نے شکایتیں بیان کیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "سعید! تمہارے پاس ان شکایتوں کا کیا جواب ہے؟"

حضرت سعیدؓ بن عامر نے کہا کہ "خدا کی قسم مجھے ان چیزوں کا تذکرہ پسند نہ تھا۔ لیکن اب اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ میں صبح اس لئے دن چڑھے باہر نکلتا ہوں کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے جو گھر کے کاموں میں مجھے مدد دے اور میری اہلیہ تنہا تمام کام انجام نہیں دے سکتی، اس لئے صبح کے وقت میں اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھتا ہوں، پھر خمیر اُٹھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اس کے بعد روٹی پکاتا ہوں۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر ان لوگوں کی خدمت کے لئے باہر نکل آتا ہوں"۔

دوسری شکایت کے جواب میں آپ نے کہا کہ "میں اس بات کو بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوراً اس کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں نے دن کو مخلوق کی خدمت کے لئے رکھا ہے اور رات کا وقت اللہ کی عبادت و بندگی کے لئے خاص کر دیا ہے"۔

تیسری شکایت کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "میرے پاس کوئی خادم نہیں جو میرے کپڑے دھو دیا کرے۔ نہ میرے پاس دوسرے کپڑے ہیں جنہیں میں بدل لیا کروں۔ اس لئے میں مہینے میں ایک بار اپنے میلے کپڑے دھوتا ہوں اور وہ سوکھ جاتے ہیں تو اسے پہن کر باہر نکلتا ہوں، اس طرح دن کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے اور میں لوگوں سے مل نہیں سکتا"۔

حضرت سعیدؓ بن عامر کا جواب سُن کر حضرت عمرؓ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ "سعید ابن عامر کے متعلق میری بصیرت نے غلطی نہیں کی"۔

حضرت عمرؓ نے حضرت سعید بنؓ عامر کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے اور کہلا دیا کہ ان کو اپنی ضرورتوں میں استعمال کریں۔ بیوی نے

یہ رقم دیکھی تو بہت خوش ہوئیں، بولیں: "اس رقم میں سے ایک غلام خرید لیا جائے تاکہ گھر کے کام کاج میں ہمیں آسانی میسر آجائے۔" حضرت سعید بن عامر نے فرمایا: "میں تمہیں اس سے بھی اچھی ایک بات بتاؤں۔ ہم یہ رقم ان لوگوں کو تقسیم کردیں جو ہم سے بھی زیادہ محتاج و پریشان حال ہوں۔" بیوی بھی اللہ والی تھیں، اس بات پر رضامند ہوگئیں۔ حضرت سعید بن عامر نے ایک قابلِ اعتماد شخص کو بلا کر یہ رقم دی اور حکم دیا کہ جاکر اس رقم کو فلاں فلاں بیوہ، یتیم، بیمار اور مسکین کو تقسیم کردو۔ مال تقسیم کرنے پر سونے کا ایک ٹکڑا بچ رہا۔ حضرت سعید بن عامر نے اپنی اہلیہ سے فرمایا۔ اسے خرچ کر ڈالنا۔ پھر آپ حسبِ معمول گھر کا کام کاج کرنے لگے۔ بیوی نے کہا: "یہ مال کیا ہوگا۔ اسی سے ہم ایک خادم کیوں نہ خرید لیں۔" آپ نے فرمایا: "اسے رکھے رہو۔ تمہارے پاس تم سے بھی زیادہ حاجت مند آئیں گے انھیں دیدینا۔"

(صفۃ الصفوۃ۔ ابن جوزی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمیر بن سعد کو عامل بناکر حمص بھیجا۔ حضرت عمیر کو حمص گئے ہوئے ایک سال کا زمانہ گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے متعلق دربارِ خلافت کو کوئی اطلاع نہیں دی۔ آخر حضرت عمرؓ نے انھیں خط لکھا اور تاکید کی کہ اب تک جو رقم وصول ہوئی ہو اسے اپنے ساتھ لے کر مدینہ حاضر ہو۔

حضرت عمیر نے زادِ راہ کا تھیلا کندھے پر ڈالا، ہاتھ میں اپنا ڈنڈا لیا اور حمص سے پیادہ پا چل پڑے، مدینہ منورہ پہنچے۔ تو حالت یہ تھی کہ بال بڑھ گئے تھے، چہرہ غبار سے اَٹ گیا تھا۔ اور جسم کا رنگ متغیّر ہوگیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: "تمہارا یہ کیا حال ہے؟"

حضرت عمیر نے جواب دیا: "امیر المومنین دیکھ رہے ہیں کہ بالکل اچھا خاصا ہوں اور میرے ساتھ دنیا ہے جسے کھینچ رہا ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا: "آخر تمہارے پاس کیا ہے؟"

عرض کیا: "یہ میرا تھیلا ہے جس میں میری زادِ راہ ہے، میرا پیالہ ہے جس میں کھاتا ہوں اور جس سے اپنا سر اور کپڑے دھوتا ہوں ایک چھوٹا سا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں، ایک ڈنڈا ہے جس پر ٹیک لگاتا ہوں اور جس سے ضرورت کے وقت دشمن کا مقابلہ کرتا ہوں۔ آخر انہی چیزوں کا نام تو دنیا ہے؟"

حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا: "کیا تم پیدل آئے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا: "جی ہاں۔"

فرمایا: "کیا وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو تمہارے لئے سواری کا انتظام کردیتا۔"

کہا: "نہ میں نے ان سے سوال کیا اور نہ انہوں نے سواری کا انتظام کیا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "وہ مسلمان کتنے بُرے ہیں جن کے پاس سے تم آئے ہو۔"

حضرت عمیر بولے: "امیر المومنین! خدا سے ڈریئے، اس نے آپ کو غیبت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ لوگ مسلمان ہیں، میں نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے سوال کیا: "تمہیں معلوم ہے۔ میں نے تمہیں کہاں بھیجا تھا اور کس غرض سے بھیجا تھا؟"

جواب دیا: "آپ نے مجھے جہاں بھیجا تھا وہاں گیا۔ وہاں کے نیک لوگوں کو جمع کیا اور انھیں محاصل کی وصولی کے لئے مقرر کیا اور وہ جو کچھ وصول کرکے لے آئے اسے ان کی ضرورتوں پر خرچ کردیا۔"

آپ نے مزید کہا: "کہ اگر آپ اس کے مستحق ہوتے تو میں آپ کے پاس بھی اس میں سے لے آتا۔"

حضرت عمرؓ اُن کے جواب سے بہت خوش ہوئے اور چاہا کہ انھیں اُن کے منصب پر قائم رکھیں۔ لیکن وہ دوبارہ اس منصب کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ عرض کیا، "امیرالمومنین! اب میں اس کام سے معافی چاہتا ہوں، نہ آپ کے زمانہ میں یہ ذمہ داری قبول کروں گا اور نہ آپ کے بعد۔ بہت کوشش کی کہ اپنے کو حکمرانی کے جذبہ سے پاک رکھوں۔ لیکن ایک روز ایک نصرانی کے لئے میری زبان سے نکل ہی گیا کہ خدا تجھے خوار کرے۔"

اس کے بعد اجازت چاہی اور گھر واپس گئے جو مدینہ منورہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ اُن کے جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک شخص کے ہاتھ سو دینار اُن کے ہاں بھیجے۔ اور کہا اگر اُن کی حالت سے اطمینان و فراغت کا اظہار ہو رہا ہو تو چُپ چاپ واپس چلے آنا اور اگر اُن کی حالت سے عسرت و تنگدستی ظاہر ہو تو یہ رقم اُن کو دے دینا۔ جس وقت حضرت عمرؓ کا آدمی حضرت عمیرؓ کے پاس پہنچا۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھے اپنے کُرتے سے جوئیں صاف کر رہے تھے، بولے "تشریف رکھئے، کہاں سے آ رہے ہیں؟"

قاصد نے جواب دیا "مدینے سے آ رہا ہوں۔"

پوچھا "امیرالمومنین کا کیا حال ہے؟"

کہا "اچھے ہیں۔ اللہ کے احکام و قوانین کا اجراء و نفاذ کر رہے ہیں"۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ کے حق میں دعا کی کہ اے اللہ عمرؓ کی مدد کر، وہ تیری محبت میں بہت سخت ہیں"۔

قاصد نے تین دن تک اُن کے ہاں قیام کیا۔ اُن کی معاشی حالت یہ تھی کہ مشکل سے روٹی کی ایک ٹکیہ میسّر ہوتی جسے وہ مہمان کے آگے رکھ دیتے اور خود فاقے سے رہ جاتے۔ قاصد نے تین دن کے بعد دینار نکال کر پیش کئے اور کہا "انھیں لیجئے ـــ امیرالمومنین نے آپ کی ضرورت کے لئے بھیجے ہیں"۔ حضرت عمیر یہ سُن کر چیخ پڑے اور فرمایا۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے"۔ اور وہ ساری رقم محتاجوں اور یتیموں کو تقسیم کر دی۔

قاصد مدینہ منورہ واپس آیا۔ اور حضرت عمرؓ کو سارا حال سُنایا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمیرؓ کو مدینہ منورہ بُلا بھیجا اور انھیں بہت سا غلّہ اور دو کپڑے دینے چاہے۔ انہوں نے غلہ قبول نہیں کیا۔ عرض کیا، امیرالمومنین! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، دو صاع (تقریباً سات سیر) جو گھر پر چھوڑ آیا ہوں۔ البتہ کپڑے لے لئے۔ کہا۔ "میری بیوی ننگی ہے اُس کے پاس تن پوشی کے لئے کوئی کپڑا نہیں ہے۔"

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد حضرت عمیر کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آپ پیادہ پا گورستان بقیع غرقد تشریف لے گئے۔ جس میں حضرت عمیر دفن کئے گئے تھے۔ ان کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا کی اور فرمایا۔ "کاش! کوئی عمیر بن سعد کی طرح مجھے ملتا اور میں اس سے مسلمانوں کے معاملات کی انجام دہی میں مدد لیتا۔" (صفتہ الصفوۃ ابن جوزی)

حضرت سلمان فارسی حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں مدائن کی گورنری پر فائز تھے۔ آپ زہد و ورع کے اُس مقام پر تھے جس کے بعد رہبانیت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ جس زمانہ میں آپ گورنری کے عہدہ پر ممتاز تھے آپ کو پانچ ہزار تنخواہ ملتی تھی۔ اور تیس ہزار نفوس پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی آپ کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے۔ اور اس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے۔ دو اینٹیں جوڑ کر تکیہ بناتے تھے۔ لباس میں بھی ایک عبا اور ایک معمولی سی جانگیا ہوتی تھی۔ ایرانی آپ کو اس ہیئت میں دیکھ کر "گرگ آمد۔ گرگ آمد" کہتے۔

ایک مرتبہ اسی امارت کے زمانہ میں اس شان سے نکلے کہ سواری میں بلا زین کا گدھا تھا۔ لباس میں ایک تنگ اور چھوٹی قمیص تھی جس سے گھٹنے بھی نہ چھپتے تھے۔ ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں، لڑکے آپ کو اس ہیئت میں دیکھ پیچھے لگ گئے۔ لوگوں نے یہ طوفانِ بدتمیزی

دیکھا تو ڈانٹ کر ہٹا یا کہ امیر کا پیچھا کیوں کرتے ہو ؟

ایک مرتبہ ایک دستۂ فوج کی سرداری سپرد ہوئی - فوجی امارت کی شان و شوکت کا کیا ذکر، یہاں ایک معمولی سپاہی کی بھی د
نہ تھی، چنانچہ فوجی نوجوان دیکھ کر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ "یہی امیر ہیں !" ایک بار ایک شخص حضرت سلمانؓ کے یہاں گیا - دیکھا
وہ بیٹھے آٹا گوندھ رہے ہیں - پوچھا، خادم کہاں ہے ؟ بولے، کام سے بھیجا ہے، مجھ کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دو کا مو
بوجھ اُس پر ڈالوں - اس غیر معمولی سادگی کی وجہ سے لوگوں کو اکثر مزدور کا دھوکا ہو جاتا تھا - ایک مرتبہ ایک شخص نے جانور
لئے چارہ خریدا، حضرت سلمانؓ کھڑے تھے، اُن سے کہا - اس کو گھر تک پہنچا دو - وہ اُٹھا کر لے چلے - راستہ میں لوگوں نے دیکھا
کہنے لگے، لایئے ہم پہنچادیں، یہ حال دیکھ کر اس شخص نے پوچھا - یہ کون ہیں ؟ لوگوں نے کہا - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی
وہ سُن کر بہت شرمندہ ہوا اور کہا - آپ تکلیف نہ کیجئے - لیکن انہوں نے فرمایا - اس میں مجھے نیت کا ثواب ہے، اب میں اس
کو پہنچائے بغیر نیچے نہیں رکھ سکتا -

حضرت سلمانؓ نے عمر بھر اپنے لئے کوئی گھر نہیں بنایا - جہاں کہیں دیوار یا درخت کا سایہ مل جاتا پڑ رہتے، ایک شخص نے اج
چاہی کہ میں آپ کے لئے مکان بنوا دوں - فرمایا - مجھ کو اس کی ضرورت نہیں - وہ برابر اصرار کرتا رہا - یہ برابر انکار کرتے جاتے تھے
آخر میں اس نے کہا - میں آپ کی مرضی کا مکان بناؤں گا - فرمایا - وہ کیسا مکان ہوگا ! عرض کیا - اتنا مختصر کہ اگر کھڑے ہوں تو سر
چھت سے لگ جائے اور اگر لیٹیں تو پیر دیواروں سے لگیں - فرمایا - خیر - اس میں کوئی حرج نہیں - چنانچہ اس نے ایک جھونپڑ
بنادی - !

حضرت سلمانؓ جو کچھ تنخواہ پاتے تھے پُوری کی پُوری حقداروں میں بانٹ دیا کرتے تھے - اور خود چٹائی بُن کر گزارہ کرتے تھے - او
چٹائی کی آمدنی کا بھی ایک تہائی اصل سرمایہ کے لئے رکھ لیتے - ایک تہائی بال بچوں پر خرچ کرتے اور ایک تہائی خیرات کرتے
حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں بیمار پڑے - سعد بن وقاص عیادت کو گئے - آپ رونے لگے - سعد نے کہا - ابو عبدا
رونے کا کونسا موقع ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے خوش خوش دنیا سے اُٹھے - تم اُن سے حوضِ کوثر پر ملوگے، بچھڑ
ہوئے ساتھیوں سے ملاقات ہوگی !

حضرت سلمانؓ نے جواب دیا - خدا کی قسم میں موت سے نہیں گھبراتا اور نہ دُنیا کی حرص باقی ہے - رونا یہ ہے کہ رسول اللہ صل
علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ ہمارا دُنیاوی ساز و سامان ایک مسافر کے زادِ راہ سے زیادہ نہ ہو - حالانکہ اس وقت میرے گر
اس قدر سانپ (اسباب) جمع ہیں، سعد کہتے ہیں کہ کُل سامان جس کو حضرت سلمانؓ نے سانپ سے تعبیر کیا تھا - ایک بڑا پی
ایک لگن اور ایک تسلہ سے زیادہ نہ تھا - (سیر المہاجرین)

یہاں اسلامی حکومت کی پالیسی کا ایک خاص رُخ قابلِ ذکر ہے - غیر اسلامی حکومتیں کسی غیر ملک کو فتح کرتی ہیں تو وہ
ایسا حاکم مقرر کرتی ہیں جو لوگوں کے دلوں پر اپنی حکومت کی شان و شوکت اور رعب و وقار کا سکہ بٹھائے - لیکن اسلامی حکو
کو عام طور پر اس پالیسی سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی - حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حالات اوپر گزر چکے ہیں - و
کتنے متواضع، منکسر مزاج اور زہد پسند انسان تھے - حالانکہ مدائن ایرانی سلطنت کا پایۂ تخت تھا - جس کی تہذیب و ثقاف
اور تمدنی شان و شوکت دُنیا میں مشہور تھی - حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اسی مدائن کی حکومت پر حضرت سلمانؓ جیسے فقیر منش
کو حاکم بنا کر بھیجا تھا - اب مدائن کے دوسرے فاروقی حاکم حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کے حالات ملاحظہ کیجئے :-

حضرت ابوحذیفہؓ بڑے مرتبے کے انصاری صحابی تھے۔ عہدِ فاروقی میں نہاوند کی جنگ میں مجاہدین کی امارت کے منصب
پر مامور تھے اور نہاوند اِنہی کے ہاتھ پر فتح ہوا تھا۔

آپ نے تاریخوں میں حکمرانوں کے غرور اور داخلے کے حالات پڑھے ہوں گے۔ اس موقع پر کیسی شان و شوکت اور
ے کر و فر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس شان سے مدائن میں ورودِ مسعود فرمایا کہ ایک خچر پر سوار تھے۔ جس پر
ن بھی نہ تھی صرف ایک پھٹا پرانا چارجامہ پڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، دوسرے میں گوشت کی ہڈی۔ اہلِ مدائن
خبر ہو چکی تھی کہ آج مدائن کے حاکم تشریف لا رہے ہیں۔ اس لئے اکابرِ شہر آپ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر کھڑے
کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ آئے اور اُن کے سامنے سے گزر گئے۔ لیکن لوگوں کے تصوّر میں بھی یہ بات نہ گزری کہ والی مدائن
کے سامنے سے گزر گئے۔ تصوّر میں آسکنے کی بات بھی نہ تھی۔ اہلِ ایران کی آنکھوں نے کسی حاکم کے ورود کا یہ نظارہ کب دیکھا تھا۔
کافی وقت گذر گیا تو انہوں نے مسلمانوں سے دریافت کیا کہ والی شہر آنے والے تھے، اُن کی سواری کیوں نہیں آئی۔ مسلمانوں
بتایا۔ کہ وہ تو ابھی تمہارے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ سُن کر اکابرِ شہر لپک کر حضرت حذیفہؓ بن الیمان کے پاس پہنچے۔ آپ کے
میں اب تک روٹی کا ٹکڑا اور گوشت کی ہڈی تھی۔ آپ نے اسی کو لوگوں کی طرف بڑھا دیا۔ بھلا اہلِ شہر ایسے ٹکڑے کو حلق
کو نکر اُتار سکتے تھے۔ از راہ احترام اُسے لے تو لیا مگر نگاہ بچا کر ایک طرف پھینک دیا۔

حضرت عمرؓ جس شخص کو کہیں کا عامل مقرر کرتے تھے، اس کے فرمانِ تقرری میں اپنے احکام اور اس کے فرائض درج کرتے
۔ لیکن حضرت حذیفہؓ کے نام[1] اکابرِ مدائن کے سامنے یہ فرمان پڑھا گیا تو ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں کہ آپ اپنی ضرورتیں بیان
ئے کہ ہم ان کو پورا کریں۔ حضرت حذیفہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے قدم بقدم چلتے تھے۔ فرمایا مجھے
اپنے پیٹ کے لئے کھانا اور گدھے کے لئے چارہ چاہیئے۔ میں جب تک یہاں رہوں گا، مجھے اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی۔
مدائن میں آپ نے ایک بار پانی مانگا۔ ایک رئیس نے چاندی کے برتن میں لا کر دیا۔ حضرت کی شانِ فقر اس تکلّف کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ اس
ں کو آپ اس سے پہلے بھی منع کر چکے تھے۔ اس لئے سمجھانے کے بجائے آپ نے جھنجلا کر پیالہ کھینچ مارا۔ ایک زمانے تک اسی فقر و سادگی
ساتھ مدائن کی حکومت اور درحقیقت حکومت نہیں رعایا، کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں مدینہ
ب فرمایا تو اسی شان سے مدائن سے روانہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اپنی آمد کی اطلاع دے چکے تھے، حضرت عمرؓ اُن کے راستہ میں چھپ کر ایک
کھڑے ہو گئے۔ حضرت حذیفہ پاس سے گزرے تو دیکھا حکومت و امارت نے اُن پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ وہ جس حال میں مدینہ
گئے اسی حال میں واپس آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ اپنی جگہ سے نکل کر اُن کے سامنے آئے اور فرطِ محبت سے لپٹ گئے۔ بولے حذیفہ!
میرے بھائی ہو اور میں تمہارا بھائی ہوں۔" (سیر الانصار جلد ۲)

آج کی دُنیا اور آج کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر کسی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ایسے لوگ ملکوں اور قوموں پر کس طرح
مت کرتے تھے۔ اور لوگ ان کی حکومت و فرمانروائی کو کیونکر تسلیم کرتے تھے۔ یہ اتنے مستند تاریخی حالات ہیں جن سے زیادہ مستند
ت کسی دوسری قوم اور حکومت کے نہیں ہو سکتے۔ اس کا راز اُن کے پاکیزہ عقیدے اور اُن کی پُر خلوص اور بے ریا سیرت اور
رتِ خلق میں پوشیدہ تھا۔ اللہ کی زمین پر یہ اللہ کے بندے بن کر رہنا چاہتے تھے۔ اور حکومت و امارت سے دُور بھاگتے تھے۔

---

[1] ت حذیفہ کے نام جو فرمان تھا اُس میں اہلِ مدائن کے نام یہ ہدایت درج تھی کہ اِن کا حکم سنو اور ان کی اطاعت کرو اور یہ جو کچھ مانگیں ان کو دو۔

اس لئے حکومت و امارت اُن کے قدموں پر قربان ہوتی تھی۔ حضرت حذیفہ لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ فتنہ کی جگہوں سے دور رہیں۔ لوگ پوچھتے کہ فتنہ کی جگہوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرماتے حکام اور امراء کی ڈیوڑھیاں۔ لوگ ان کے پاس جاتے ہیں۔ اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور جا و بیجا اُن کی تعریف کرتے ہیں۔

آپ جس اسلامی حکمران کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں گے آپ اُن سب کی زندگی میں بس ایک ہی چیز کو کار فرما پائیں گے۔ خدا ترسی اور اندیشۂ آخرت۔ اور اسی ایک چیز نے ان کی زندگیوں کو انسانیت کے پاکیزہ سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ حضرت حذیفہ کے انتقال کا وقت آیا تو انہوں نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا "خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ شان و شوکت کے مقابلہ میں مجھے تواضع و انکسار محبوب رہا۔ میں نے دولت و ثروت کے مقابلہ میں فقر و فاقہ کو پسند کیا۔"

لوگ کفن کا کپڑا لے کر آپ کے پاس آئے۔ دریافت فرمایا۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے پیش کیا۔ عمدہ قیمتی کپڑا تھا۔ دیکھ کر بولے "میرے لئے اس کی ضرورت نہیں۔ معمولی سفید کپڑے کا کفن کافی ہوگا۔ اگر میرے اعمال اچھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے اچھی پوشاک عطا فرمائے گا۔"

ایک بار حضرت عمرؓ نے صحابہ سے فرمایا "اپنی تمنائیں پیش کیجئے" سب نے کہا کہ زر و جواہر سے بھرا ہوا ایک گھر ملتا اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ حضرت عمرؓ کی جوہر شناسی دیکھئے۔ آپ نے فرمایا "میری تمنا تو یہ ہے کہ مجھ کو ابو عبیدہ، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان جیسے لوگ ملیں تاکہ میں ان کو حکومت کے عہدے تفویض کروں۔" (سیر انصار)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا تھا۔ آپ کی زندگی کا ابتدائی دور نہایت تنگدستی میں گزرا لیکن جیسے جیسے اسلام کو فروغ ہوتا گیا اُن کی تنگدستی میں کمی آتی گئی۔ ان کی ماتحتی میں متعدد مہمیں سر ہوئیں۔ برسوں تک مختلف صوبوں کے حاکم رہے، لیکن ان دونوں حالتوں میں اُن کی ظاہری زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ مال و دولت جمع کیا۔ نہ نخوت و رعونت پیدا ہوئی۔ گورنری کے بعد ایک مرتبہ مشہور صحابی حضرت ابوذرؓ غفاری سے ملاقات ہوئی۔ ابوذر فقیر منش آدمی تھے۔ دنیا سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ حضرت ابو موسیٰ "بھائی بھائی" کہتے ہوئے دوڑ کر لپٹ گئے۔ لیکن ابوذر بار بار یہ کہہ کر اُن کو اپنے سے دور کرتے تھے۔ "اب تم میرے بھائی نہیں ہو، اس منصب سے پہلے بھائی تھے۔" دوبارہ جب پھر ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ اشعری پہلے کی طرح لپکے۔ انہوں نے کہا "ابھی ہٹے رہو۔ پہلے میرے سوالوں کے جواب دے دو۔ پھر پوچھا۔ تم نے لوگوں پر حکومت کی ہے؟" ابو موسیٰ نے کہا "ہاں"۔ کہا "عمارتیں تو نہیں بنوائیں؟ زراعت تو نہیں کی؟ جانور تو نہیں پالے؟" انہوں نے سب کا جواب نفی میں دیا۔ تو پھر اُن سے دل کھول کر ملے۔ (مہاجرین)

حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ عہد رسالت میں مکہ معظمہ کے عامل تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں آپ کو اس منصب پر قائم رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب کے مصارف کیلئے دو درہم روزانہ مقرر فرمائے تھے۔ آپ اسی پر قانع رہے۔ فرمایا کرتے تھے "جو پیٹ دو درہم میں نہیں بھرتا۔ اُسے خدا کبھی آسودہ نہ کرے۔" (سیر الصحابہ جلد ہفتم)

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز خاندان بنو امیہ کے حکمران گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی پرورش بڑے عیش و تنعم اور راحت و آسائش میں ہوئی تھی۔ خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک زمانہ میں لباس، عیش و عشرت اور عطریات کا شوق ہوا تو میں نے اُسے اتنا پورا کیا کہ میرے علم کے مطابق میرے خاندان بلکہ دوسرے خاندانوں میں بھی ایسی زندگی کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اُن کی شوقینی اور نفاست پسندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کے کپڑوں پر ایک مرتبہ دوسروں کی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر انہیں وہ پرانا سمجھتے تھے۔

ولید کے زمانہ میں ان کو چار چار سو روپے کی قیمت کا کپڑا سخت و کرخت معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر چودہ درہم کا کپڑا بھی نرم و ملیح معلوم ہونے لگا تھا۔ خوشبو کے لئے ڈاڑھی پر عنبر نمک کی طرح چھڑکتے تھے۔ رجا ابن حیوۃ کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیز سب سے زیادہ خوش لباس، سب سے زیادہ معطر اور سب سے زیادہ فخر کی چال چلنے والے تھے!

لیکن تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی آپ کی زندگی میں دفعتاً انقلاب ہو گیا۔ عیش و تنعم کے سارے سامان چھوٹ گئے۔ اور عیش پرودہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوذر غفاری اور حسن بصری کا قالب اختیار کر لیا۔ خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے جس طرح دنیا سے دامن جھاڑا اس کے کچھ حالات نیچے لکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ساری املاک بیت المال کو واپس کر دی۔ لونڈی، غلام، فرش فروش، لباس و عطریات اور عیش و تجمل کے جملہ اسباب و لوازم کو بیچ کر اُن کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔ بیت المال سے گزارہ کیلئے چار سو دینار سالانہ لیتے تھے۔ اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ لیتے تھے۔ لباس بقدر ستر پوشی اور غذا بقدر لایموت سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

لباس میں عموماً صرف ایک جوڑا رہتا تھا۔ اسی کو دھو دھو کر پہنتے تھے۔ مرض الموت میں ایک قمیص کے علاوہ دوسری قمیص نہ تھی کہ بدلائی جاتی۔ آپ کے سالے مسلمہ بن عبدالملک نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ قمیص میلی ہو گئی ہے۔ لوگ عیادت کے لئے آتے ہیں۔ اس لئے دوسری بدلوا دو۔ وہ خاموش رہیں۔ مسلمہ نے دوبارہ کہا۔ فاطمہ نے جواب دیا "خدا کی قسم! اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے" پھر ایک جوڑا بھی سالم نہ ہوتا تھا بلکہ اس میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ آپ کے بچے بھی اسی تنگی سے بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی بچی کے پاس کپڑا نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر کرتہ بنا دیا جائے۔ آپ کی بہن کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک تھان بھجوا دیا۔ اور منع کر دیا کہ عمر سے نہ مانگنا!

ایک مرتبہ آپ کے صاحبزادے عبیداللہ نے کپڑے مانگے۔ آپ نے فرمایا۔ میرے کپڑے خیار بن رباح کے پاس رکھے ہیں۔ اُن سے جا کر لے لو۔ وہ اُن کے پاس گئے۔ انہوں نے گاڑھے کے کپڑے نکال کر دیئے۔ عبیداللہ نے کہا۔ یہ تو ہمارے پہننے کے لائق نہیں ہیں۔ خیار نے کہا۔ میرے پاس تو امیرالمومنین کے یہی کپڑے ہیں۔ عبیداللہ نے واپس جا کر حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی وہی عذر کیا۔ آپ نے فرمایا۔ میرے پاس تو یہی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے واپس بلا کر کہا۔ اگر اپنے وظیفہ سے پیشگی لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ چنانچہ سو درہم دلوا دیئے اور وظیفہ تقسیم ہونے کے وقت کاٹ لئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ ہونے کے بعد ایک شخص کو آٹھ درہم دے کر فرمایا۔ کہ اُن کے لئے ایک چادر خرید لائے۔ وہ خرید لایا۔ آپ نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا "کیسی نرم ہے!" وہ شخص ہنسا۔ حضرت عمر نے پوچھا "ہنستے کیوں ہو؟" اُس نے کہا۔ خلافت سے پہلے آپ نے ایک بار مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کے لئے ریشم کی بیلدار چادر خرید لاؤں۔ میں نے آٹھ سو درہم کی ایک خوبصورت چادر خریدی۔ لیکن جب میں اسے آپ کے پاس لایا تو آپ نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا "کس قدر سخت ہے!" اور آج آپ آٹھ درہم کی چادر کو بھی نرم فرما رہے ہیں۔ اس بات پر مجھے ہنسی آ گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنی صاحبزادیوں سے ملنے جاتے۔ ایک رات تشریف لے گئے تو صاحبزادیوں نے آپ کو دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور استقبال کے لئے دروازہ کی طرف بڑھیں۔ آپ نے انّا سے پوچھا۔ بچیوں کا یہ کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا "مسور کی دال اور پیاز کے سوا کھانے کو اور کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لئے ہیں کہ منہ سے بو نہ آئے۔" آپ یہ سن کر رو پڑے اور بولے۔ "میری بچیو! اگر تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارے

باپ کو دوزخ میں جھونک دیا جائے تو اس سے کیا فائدہ؟"
یہ سن کر بچیاں بے اختیار رونے لگیں۔ (المسلمون)
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی غذا نہایت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ روٹی اور روغن زیتون یا دال روٹی کھاتے تھے۔ آپ کے غلاموں کو بھی یہی ملتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک غلام نے کہا۔ روز روز دال روٹی۔ آپ کی بیوی نے جواب دیا۔ امیرالمومنین کی یہی غذا ہے۔ پھر یہ غذا بھی کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ آپ کے غلام کا بیان ہے کہ جب سے آپ خلیفہ ہوئے اُس وقت سے وفات تک کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔
اگر کبھی کوئی اچھی چیز کھانے کی خواہش بھی ہوتی تھی تو اس کی مقدرت نہ تھی، ایک مرتبہ انگور کھانے کو دل چاہا۔ اپنی بیوی سے پوچھا۔ "تمہارے پاس ایک درہم ہے۔ میں انگور کھانا چاہتا ہوں"۔ انہوں نے جل کر کہا۔ "امیرالمومنین ہو کر تم کو ایک درہم کی استطاعت نہیں"۔ فرمایا۔ "یہ جہنم کی ہتھکڑیوں سے میرے لئے زیادہ آسان ہے"۔ (تابعین)
مدینہ کے ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ میں دیکھا تھا۔ وہ سب سے زیادہ خوش پوشاک سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے اور سب سے زیادہ اکڑ کر چلنے والے تھے۔ پھر میں نے خلیفہ ہونے کے بعد اُن کو دیکھا کہ ان کا چلنا پھرنا بالکل راہبوں کے چلنے کی طرح ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ انداز رفتار ایک فطری چیز ہے اس میں تغیر ممکن نہیں ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تغیر حال اس دعویٰ کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ (اسلامی ریاست)
آپ کی معمولی وضع قطع اور فقیرانہ رہن سہن کو دیکھ کر اجنبی شخص تمیز نہ کر سکتا تھا کہ یہی امیرالمومنین ہیں۔ ایک بار عراق کی ایک عورت اپنی یتیم بچیوں کے لئے وظیفہ مقرر کرانے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ کے دروازہ پر پہنچی تو لوگوں سے دریافت کیا۔ کیا امیرالمومنین کے یہاں دربان بھی رہتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ دربان وغیرہ کچھ نہیں رہتے۔ تم جانا چاہو تو اُن کے پاس چلی جا سکتی ہو۔ عورت گھر میں گئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اہلیہ بیٹھی روئی ٹھیک کر رہی تھیں۔ عورت نے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر اُسے اپنے پاس بٹھایا۔ عورت تعجب بھری نگاہوں سے امیرالمومنین کے مکان کو دیکھنے لگی۔ اسے وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ اُس نے کہا:۔
"میں تو یہاں اس لئے آئی تھی کہ اس گھر کے فیض سے اپنے خراب و خستہ گھر کی ویرانی دُور کروں گی، لیکن یہ تو خود ویران ہو رہا ہے"۔
فاطمہ بولیں "تمہارے ہی جیسوں کے گھروں کو آباد کرنے میں یہ گھر ویران ہوا ہے"۔
اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز باہر سے آئے اور کنوئیں سے پانی کھینچ کھینچ کر مکان کے سامنے پڑی ہوئی مٹی پر ڈالنے لگے وہ درمیان درمیان میں اپنی اہلیہ کی جانب دیکھ رہے تھے۔ نو وارد عورت نے کہا:۔
"بی بی! آپ پردے میں ہو جائیں، یہ مزدور برابر آپ کو گھور رہا ہے"۔
آپ کی اہلیہ بولیں۔ "یہ مزدور نہیں ہیں۔ یہی امیرالمومنین ہیں"۔
اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز سلام کر کے اندر آئے اور مکان کے اس حصہ میں چلے گئے جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے اور اپنی اہلیہ فاطمہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کون خاتون ہیں؟ انہوں نے کہا۔ یہ ابھی آئی ہیں۔ ایک برتن میں تھوڑے سے انگور رکھے تھے۔ آپ اچھے اچھے انگور چھانٹ کر اپنی اہلیہ کو دینے لگے۔ پھر نو وارد عورت کی طرف متوجہ ہو کر دریافت فرمایا۔
"کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

عورت نے کہا۔ "میں عراق کی رہنے والی ہوں۔ میری پانچ بیٹیاں ہیں اور پانچوں بڑی ہی بے شعور اور بے پروا ہیں۔ میں اُن کے لئے آپ کی نگاہِ عنایت چاہتی ہوں۔" آپ نے فرمایا۔ "یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری سبھی لڑکیاں جبلے شعور اور بے پروا ہیں ــــــ!"

یہ کہتے ہوئے آپ رو پڑے۔ پھر قلم دوات اور کاغذ نکال کر حاکمِ عراق کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ پوچھا۔ "تمہاری بڑی بیٹی کا نام کیا ہے؟" اس نے نام بتایا۔ آپ نے اس کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے کہا۔ الحمدللہ۔ پھر آپ نے دُوسری بیٹی کا نام دریافت کیا۔ نام بتاتے پر اس کے لئے بھی وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے پھر الحمدللہ کہا۔ آپ نے تیسری بیٹی کا نام پوچھا۔ اور نام معلوم کر کے اس کے لئے بھی وظیفہ مقرر فرمادیا۔ عورت نے پھر الحمدللہ کہا۔ اسی طرح جب آپ چوتھی لڑکی کے لئے بھی وظیفہ مقرر کر چکے تو عورت اپنی خوشی ضبط نہ کر سکی۔ اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کو دعائیں دینے لگی۔ آپ نے اپنا قلم روک لیا۔ اور فرمایا۔ "تم جب تک خدا کی حمد و ثنا کرتی رہیں جو اس کا حقیقی سزاوار ہے میں تمہاری بیٹیوں کے لئے وظیفہ مقرر کرتا گیا۔ لیکن جب تم مجھے دعائیں دینے لگیں تو اب میں پانچویں کے لئے وظیفہ مقرر نہیں کر سکتا۔ تم اپنی چاروں لڑکیوں سے کہدینا کہ وہ اپنے وظائف میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی پانچویں بہن کو بھی دے دیا کریں گی"

عورت حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا فرمان لے کر عراق واپس چلی گئی۔ جب وہ اس فرمان کو لے کر حاکمِ عراق کے پاس گئی۔ تو حاکم فرمان کو دیکھ کر بے اختیار رو پڑا۔ بولا۔ "اللہ فرمان لکھنے والے پر اپنی رحمت نازل کرے۔" عورت نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا اُن کا انتقال ہو گیا؟" حاکم نے کہا۔ "ہاں"۔ یہ سُنکر عورت چیخ مار کر رونے لگی۔ حاکم نے کہا۔ "تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں اس فرمان کو رد نہ کروں گا۔" اور اُس نے اس کی بیٹیوں کے وظیفے مقرر کر دیئے۔

(سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز)

ماہر القادری

پھر تبصرہ

کیا یہ اسلامی تصوف ہے؟

سکھا دیئے ہیں اُسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہ شہر کو صوفی نے کردیا ہے خراب
(علامہ اقبال)

"فاران" کے پڑھنے والے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ "فاران" نے جس بات کو حق سمجھا ہے۔ اس کی حمایت میں کسی مصلحت، خوف اور طمع کی پروا نہیں کی، اُس نے ڈنکے کی چوٹ حق کا اعلان کیا ہے؟ دین کے معاملہ میں "فاران" کی یہ پالیسی بلکہ اُس کا مقصدِ اشاعت رہا ہے کہ اللہ کے خالص وسادہ دین کو اُسی انداز میں پیش کیا جائے جس بے میل اور خالص وسادہ انداز میں وہ نازل ہوا ہے، عجمی افکار اور غیر اسلامی تصورات کا جو غبار دین کی قبائے یک رنگ پر جم گیا ہے اُس پر اُنگلی رکھ کر بتلائے کہ یہ دین میں اضافہ اور زیادتی ہے!

ہم معاذ اللہ! یہ بڑا بول نہیں بول سکتے کہ حق گوئی اور حق شناسی کی اجارہ داری ہمارے حصہ میں آگئی ہے اور ہماری زبان وقلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عین حق ہوتا ہے۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری رائے، فکر اور زبان وقلم لغزش سے پاک نہیں ہیں۔ مگر اُن بنیادی اور مُسلّمہ مسائل میں جن میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، ہم اپنی فکر و معتقدات کے بارے میں کسی تذبذب میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہمیں اُن کا اسی طرح یقین ہے جس طرح اپنے وجود اور زندگی کا یقین ہے ——— مثلاً کوئی شوریدہ سر یہ نعرہ لگائے کہ "میں خدا ہوں" اور اپنی اس بکواس پر پشیمان اور اس کلمۂ کفر سے تائب ہونے کے بجائے، اُلٹا اُسے درست ثابت کرنے کے لئے دلیلوں اور تاویلوں کا انبار لگادے تو ہم اس کلمۂ کفر کے کہنے والے کو وہی قرار دینگے جس کا وہ مستحق ہے!

خود تراشیدہ تاویلوں کی آڑ میں، وجدان وذوق کی رنگا رنگیوں کے مناظر ان آنکھوں نے بہت دیکھے ہیں۔ طبلہ اور ڈھولک کی تھاپ اور ہارمونیم کی گت پر ایک صاحب "یا صابر" کہہ کر ناچ رہے ہیں۔ مزامیر اور رقص وغنا کے اس طوفانِ بدتمیزی کو "سماع شریف" کا لقب دیا گیا ہے، اور یہ سب کچھ "عرفان وتجلّی" کے نام پر ہو رہا ہے ——— ایک صوفی (؟)۔ (دراز دستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں) ہیں کہ ہندوؤں کو اپنی بیعت اور سلسلۂ طریقت میں داخل فرماتے ہیں۔ اور صوفی صاحب کی اس "سعیٔ التباس حق وباطل" کو اُن کے مُرید بہت بڑی کرامت سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب قبلہ نے اپنی کرامت سے شرک وتوحید اور کفر واسلام کو گلے ملوادیا ہے ——— ایک پیر صاحب، طوائفوں اور کسبیوں کے جُھرمٹ میں آرام فرما ہیں۔ مگر مُریدوں کو اُنھوں نے کچھ ایسی پٹی پڑھا رکھی ہے کہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہیں مگر اُن کی عقیدت میں ذرّہ برابر فرق نہیں آتا۔ ان آنکھوں نے آستانوں اور بارگاہوں کے بعض عقیدت مندوں کو قبروں کا طواف اور سجدے کرتے دیکھا ہے۔ مزار کی چوکھٹ پر پیشانی رکھی ہے اور

صاحبِ قبر سے مرادیں مانگ رہے ہیں۔ درگاہِ معلیٰ کے چراغوں کی راکھ چاٹ رہے ہیں۔ بلبلے گلہجے کے ساتھ مزارِ اقدس پر چڑھانے کے لئے چادر آرہی ہے۔ کسی جگہ "صندل شریف" نکل رہا ہے۔ کہیں سے "گاگر" اور "پنکھے" کا جلوس چلا آرہا ہے۔

ایک بوڑھا آدمی ہے اتنا بوڑھا کہ بھویں تک سپید ہو چکی ہیں۔ خوب گھنی اور لمبی ڈاڑھی مگر ان حضرت نے زنانے کپڑے پہن رکھے ہیں، ناک میں نتھ، کانوں میں جھمکے، ماتھے پر ٹیکا، گلے میں موہن مالا۔ اور پیروں میں پازیب! یہ حضرت زنخوں کی طرح ناک پر ہاتھ رکھ کر بات کرتے ہیں۔ ناچنے والیوں کی طرح ٹھمک ٹھمک کر اور کولھے مٹکا کر خرامِ ناز فرماتے ہیں اور اس قسم کے مسخروں اور بہروپیوں کو یار لوگوں نے "سدا سہاگن" کا لقب دے رکھا ہے اور ان کی راہ میں بعض لوگ اپنے دل و نگاہ بچھا دیتے ہیں!

مدک، بھنگ، چرس، سُلفہ اور شراب پینے والے شاہ صاحبوں (؟) کو عقیدت مندوں کی اچھی خاصی ٹولیاں ہاتھ آگئی ہیں۔ ان سے طرح طرح کی کرامتیں وابستہ کی جاتی ہیں اور یہ تک کہا جاتا ہے کہ بظاہر تو ان کے تونبوں، زنبیلوں اور بادیوں میں شراب ہوتی ہے مگر ان کا ظرف اُسے کچھ اور بنا دیتا ہے۔ جس کا ادراک عوام الناس نہیں کر سکتے۔ ان کے بادیہ کی دی ہوئی شراب کے ایک گھونٹ اور سُلفہ کے ایک کش میں نہ جانے کتنوں پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں!

ایک پیر صاحب ہیں کہ کبھی آپ کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ مگر مرید ہیں کہ لوٹے پڑ رہے ہیں اور "حضرت والا" کی ایک ایک ادا پر لوٹ ہوئے جاتے ہیں۔ ترکِ صلوٰۃ کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ حضرت والا کو یقین و عرفان کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ جس کے بعد ظاہری عبادت ساقط ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ ہیں کہ شہر کی گلیوں میں برہنہ یا نیم برہنہ پھرتے ہیں، نماز روزے سے کوئی سروکار نہیں۔ عموماً ان کی باتیں مجذوب کی بڑ ہوتی ہیں کہ ان کی "رموز" ہی بس نکالتے رہیئے۔ اس قسم کے آدمی نے اگر قصداً یہ حالت اختیار کی ہے تو وہ دھوکے باز ہے اور اگر وہ واقعی ایسا ہی ہے تو پھر غیر مکلّف ہے۔ لایعقل ہے اور کسی مرض کے سبب اُس کی ایسی حالت ہو گئی ہے، ایسا مریض آدمی جس کے حواس تک مسلوب ہو گئے ہوں، وہ کسی کو کیا روحانی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جس طرح ہسٹیریا کا مریض بڑبڑانے لگتا ہے اور اس کی اس بڑبڑاہٹ کو کوئی ذی ہوش آدمی ذرہ برابر اہمیت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اس قسم کے لایعقل اور مسلوب الحواس آدمی کے کسی قول و فعل کو وقعت دینا کتنی خطرناکیوں کا سبب بن سکتا ہے۔ مگر عقیدت مند ہیں کہ ان بے ربط اور غیر متوازن باتوں کی "ملفوظات" تیار کر رہے ہیں۔ اور کسی داخلی یا خارجی مرض کے سبب دل و دماغ اور اعصاب پر مرگی زدوں جیسی حالت جو طاری ہو گئی ہے، اس کی یہ توجیہہ کی جارہی ہے کہ حضور والا پر استغراق کا غلبہ ہے اور عالمِ لاہوت کی سیر میں "سرکار" مصروف ہیں۔ اس لئے عالمِ ناسوت سے تعلق قطع فرما لیا ہے!

ایامِ جاہلیت میں خود راقم الحروف اس قسم کے لطیفوں پر جھوما ہے کہ گیارھویں شریف کا تبرک ایک شخص کے پیروں کے نیچے آگیا اور اس بے ادبی پر اس کے ایسی ٹھوکر لگی کہ دانتوں پسینہ آگیا۔ اس نے بارگاہِ غوثیت میں معروضہ کیا کہ غلام کی اس میں کیا خطا تھی، غلام تو بالکل بے خبر تھا۔ جواب ملا کہ ہم کیا کریں غیرتِ الٰہی اس کو برداشت نہیں کر سکی۔

شرک و بدعت کی رسموں کا قاعدہ ہے کہ وہ ایک حال پر نہیں ٹھہرتیں، ان میں ہمیشہ نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خرافات بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی ہیں کہ بعض عقیدت مند اپنے بزرگوں کی تصویروں کو ہار پہناتے ہیں، لوبان کی دھونی دیتے ہیں اور ان کے سامنے دو زانو بیٹھ کر مراقبہ کرتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ تصوف، عرفان و تجلی، وجدان و باطن، کشف و القا اور تجرید و تفرید کے نام پر ہوتا ہے اور سب سے

بڑا ظلم یہ ہے کہ ان تمام لغویتوں کا جوڑ کتاب و سنّت سے ملایا جاتا ہے! اپنے قول و فعل پر قرآن و حدیث سے دلیلیں لانا، یہ ہر گروہ، ہر فرقہ اور ہر جماعت کا شیوہ رہا ہے۔ یہی کتاب و سنّت ہیں جن سے خوارج نے دلیلیں تراش کر حضرت علی کرم اللہ وجہ کو (خاک بدہن گستاخ) گمراہ اور منتہ دین کہا ہے (معاذ اللہ) اور خلیفۂ راشد سے اس طرح جدال و قتال کیا ہے جیسے کافروں اور بے دینوں سے جہاد کیا جاتا ہے اور دوسری طرف "نصیری" حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو "خدا" کہتے ہیں اور اس کیلئے بھی وہ وحی و کتاب ہی سے دلیلیں لاتے ہیں۔ معتزلہ، جہمیہ، قدریہ، جبریہ، یہاں تک کہ وہ لوگ جو حلول و تجسیم تک کے قائل ہیں، وہ اپنے عقائد کا ماخذ کتاب و سنّت ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے خود قرآن پاک نے اپنے بارے میں یہ کہا ہے:-

یُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا ط

(گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ (قرآن میں دی ہوئی مثال سے) بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہی اس سے بہتیروں کو)

کفار و مشرکین اور خدا کے باغی بھی کفر و شرک کا ارتکاب اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی دلیل و تاویل ہی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ اپنے کو خطا کار اور گمراہ نہیں سمجھتے۔ شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی اس نافرمانی کے لئے دلیل ہی پیش کی تھی — مشرکین مکہ بتوں کو پوجتے تھے اور اپنے اس فعل سے شرک کا عیب دور کرنے کے لئے تاویلیں اور دلیلیں تراشتے تھے۔ کہ ہم نے ان بتوں کو اللہ کی بارگاہ میں ذریعہ تقرب بنا لیا ہے، اُن کی پرستش مقصود تھوڑی ہے!

عیسائیوں نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" بنا ڈالا۔ اقانیم ثلاثہ کا نظریہ تراش کر جس انداز میں توحید و تثلیث کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اُن تمام فنی اصطلاحوں، معنوی نزاکتوں اور لفظی الجھاووں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے ارباب تصوّف اور مسلمان متصوفین کے انداز فکر میں کتنی مشابہت پائی جاتی ہے!

منصور حلاج کے "انا الحق" سے جن لوگوں کو دلچسپی رہی ہے اُن کے ذوق اور انداز فکر پر کیا عجمیت کا غلبہ نہ تھا؟ کتاب و سنّت کی نکھری ہوئی سادہ اور خالص تعلیم سے "انا الحق" اور "قم باذنی" جیسے شطحیات، متشابہات اور خطرناک اقوال کا پیوند جوڑنا اور اس قسم کے افکار کو "اسرار و غوامض" اور "عرفان و مشاہدہ" کا نام دینا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سیدھے اور بے خطر راستہ سے ایک مسافر کو اٹھا کر بھول بھلیوں میں چھوڑ دیا جائے!

اب رہی تاویل — تو ہر گمراہ کُن قول کی تاویل ہو سکتی ہے، کوئی شخص "انا اللہ" کا نعرہ لگا کر یہ تاویل کر سکتا ہے کہ مجھ پر تجلّی ذات بحت کا اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ میری "انا" ذات بحت میں بالکل ہی گم ہو گئی اور جس طرح قطرہ "انا البحر" کا دعویٰ کر سکتا ہے، اسی طرح میں بھی "انا اللہ" پکار اٹھا — تاویل کے ان الفاظ میں بظاہر کس قدر شکوہ، ندرت اور رمزیت دکھائی دیتی ہے مگر کتاب و سنّت کے نقطۂ نگاہ سے یہ تاویل سرتاپا خرافات ہے، عیسائیوں کا علم تصوّف و کلام اور ہندوؤں کا ویدانت اس قسم کے لطائف اور نکتوں سے بھرا پڑا ہے!

ایک مثال ذہن میں آرہی ہے جو سنجیدہ تو نہیں ہے مگر افہام و تفہیم کی ضرورت کے سبب ہم اپنے قلم کو ذرا سی دیر کے لئے اس سے آلودہ کر رہے ہیں — ایک صاحب کسی دوسرے آدمی سے کہتے ہیں:-

"تم الّو کے پٹھے ہو"

شخص مخاطب طیش میں آجاتا ہے کہ تم نے مجھے گالی دی ہے۔ مگر متکلم اپنے اس قول کی ان لفظوں میں تشریح اور تاویل کرتا ہے:-

"اے شخصِ مخاطب! تجھے حقیقتِ اشیاء کا علم نہیں ہے، تو اجسام و روح کے ربط و لزوم سے نابلد ہی! ارے سادہ لوح! مخلوقات کے تمام اجسام و ابدان میں ایک ہی روح جاری و ساری ہے، کثرتِ ابدان و اجسام کے اعتبار سے مخلوقات میں تفرقہ و تخالف پایا جاتا ہے۔ مگر وحدتِ روح کے اعتبار سے اُن میں کوئی اختلاف و تفرقہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں کا ایک ہی نوع اور حقیقت مشترک یعنی "دابہ" کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ پس تیری نگاہ کثرت نگر اجسام پر ہے اور میری نگاہ "وحدتِ روح" پر ہے۔ اس لئے میرے نقطہ نگاہ سے تیرے "باپ" اور "الو" میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے میں نے تجھے "الو کا پٹھا" کہہ کر تجھے گالی نہیں دی بلکہ وحدتِ روح کی حقیقت کا اظہار کیا ہے!"

خدا کے لئے سوچئے کہ اس اندازِ فکر پر جو "علم" اور "فن" وجود میں آئے گا وہ کس قدر خطرناک، پیچیدہ اور انمل بے جوڑ ہوگا۔ یہ ہوائی باتیں علمی دنیا میں آکر آدمی کے اعمال و افعال کو کس قدر غیر متوازن اور کاواک بنا دیں گی اور سوچنے کا یہ انداز اسلامی فکر کی سادگی سے کس قدر متغایر ہے!

یہ تاویلات!

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر ماہ جون ۵۹ء کے "فاران" کی تنقید (ہماری نظر میں) کو پڑھئے۔ جس کے آغاز ہی میں ماہنامہ "تاج" پر ریویو کیا گیا ہے۔ ہماری اس تنقید کا جواب ماہنامہ "تاج" (ماہ جولائی ۵۹ء) نے "تبصرہ پر تبصرہ" کے عنوان سے دیا ہے۔ ہم نے ماہنامہ "تاج" کی جن عبارتوں پر احتساب کیا تھا۔ جواب میں اُن کی اسی طرح تاویل کی ہے جس طرح اصل مضمون میں نکتہ آفرینی فرمائی گئی تھی!

ہم نے ماہنامہ "تاج" سے صوفی سید عبدالرحمٰن لکھنوی کی کتاب "کلمۃ الحق" کے اُردو ترجمہ کا اقتباس پیش کیا تھا جس میں صوفی صاحب نے لکھا ہے:-

"افسوس اور کمال افسوس ہے کہ علماء کبار نے شرق سے لے کر غرب تک، سلف سے لے کر خلف تک، کیا محدث، کیا مفسر، کیا مجتہد، کیا مقلد، کیا متکلمین، کیا متقشفین، سب نے کلمۂ طیبہ کی اس کے مقام سے تحریف کر ڈالی۔ اور اس کو محکم سے متشابہ کی طرف لوٹا دیا پس انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہہ کر شرک سے بچایا اور لا الٰہ الا اللہ کا اعتقاد رکھ کر دل سے شرک کیا۔"

اس عبارت میں کوئی اینچ پیچ نہیں اس کی رُو سے صوفیاء کی ایک بہت ہی محدود جماعت کو چھوڑ کر سلف سے لے کر خلف تک تمام عوام مسلمان ہی نہیں بلکہ لاکھوں محدثین، مفسرین اور فقہاء (خاک بدہن گستاخ) کلمۂ طیبہ کے محرف اور مرتکب شرک قرار پاتے ہیں!

ہمارے اس احتساب پر ماہنامہ "تاج" نے جو تبصرہ کیا ہے وہ "امکان وحدوث" "شئون و تجلیات" اور "تکرار و سکون" جیسی صوفیانہ اصطلاحات سے گرانبار ہے۔ جواب میں دلیلیں دی ہیں مگر اُن میں کوئی وزن نہیں۔ جگہ جگہ ماہر القادری (مدیر فاران)

کی بے علمی اور کم فہمی پر طنز ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"کاش ماہرالقادری صاحب اگر مضمون کلام کو سمجھنے سے قاصر تھے تو کم از کم مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی پوری تحریر ہی پڑھ لیتے۔ اسی مسئلہ زیر بحث میں دلائل سے ثابت کرتے ہوئے مولانائے مکرم رحمتہ اللہ علیہ نے صاف لفظوں میں بیان کر دیا کہ تمام علماء و عوام جو کلمہ توحید کے جزو ثانی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں وہ صاحب ایمان ہیں اور اس طرح جزو اوّل لا الہ الا اللہ کے بھی، تبعاً و ضمناً مصدق ہیں۔"

اس تضاد کا کوئی ٹھکانا ہے کہ کلمہ کی تصدیق سے بہ یک وقت دو نتیجے نکلتے ہیں ایک "ارتکاب شرک اور کلمہ کی تحریف" کا اور دوسرا "ایمان و تصدیق" کا! اور سنیئے:۔

"...... یہی حال کلمۂ توحید کی معرفت کا ہے، لفظی و عامی مفہوم کلمہ بھی حق ہے جس کی تشریح علمائے مفسرین و محدثین کا کام ہے اور اس پاک کلمہ کے وہ مفہومات جو اہل شہود کو دوسرے مقامات پر حاصل ہوتے ہیں، وہ بھی حق ہیں۔ دونوں مفاہیم کی غیریت نجات اخروی سے مانع نہیں۔ غلطی دراصل یہ ہے کہ ایک مقام کے پیمانۂ معرفت کو بلند تر مقام کے لئے بھی معیاری تسلیم کیا جائے......"

جب اہل تصوّف و شہود اور عوام اور ان کے علماء، دونوں نے کلمہ طیبہ کا جو مفہوم سمجھا ہے اپنی اپنی جگہ حق ہے اور سوال صرف راجح اور مرجوح اور بلند و بلند تر ہونے کا ہے تو پھر سلف سے لے کر خلف تک کے عوام، محدثین، مفسرین اور فقہا کو کلمہ طیبہ کا محرف اور مرتکب شرک قرار دے ڈالنا، کتنی غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔ شہود و عرفان کے بعد فکر و رائے میں اور اصابت و تمکین پیدا ہونی چاہیئے نہ یہ کہ زبان و قلم میں اعتدال ہی باقی نہ رہے۔ اس فکر و خیال کے "قطب عالموں" کو کوئی کچھ کہے تو خانقاہوں میں شور مچ جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کے ساتھ یہ دشمنی برتی جا رہی ہے!

خالق و مخلوق میں تعلق "صفت خلق" کا ہے "عینیت" کا نہیں ہے۔ "ہمہ اوست" کا عقیدہ عجمی افکار کی پیداوار ہے۔ وحدت الوجود دین و شریعت اور ایمان و اسلام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جس طرح آجکل سائنس داں کہتے ہیں کہ تمام کائنات میں "توانائی" کام کر رہی ہے۔ اس قسم کے خیالات:۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں مشاہدہ ہے کس حساب میں

شاعرانہ شوخیٔ فکر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، ان پر توحید و ایمان کے کسی نظریہ کی عمارت قائم کرنا اللہ کے دین کو بازیچۂ شعر و افسانہ بنانا ہے۔ دریا کا موج و حباب سے جو ربط ہے، خالق و مخلوق کے باہمی ربط کا اس پر قیاس کرنا اسلامی اندازِ فکر کی عین ضد ہے۔ یہ مجوسیت، ویدانت اور باطنیت کے افکار و نظریات ہیں جو عجمی تصوف کے قالب میں ڈھل گئے ہیں!

قرآن کی اس آیت "ھوالاول والآخر والظاھر والباطن......" کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اوّل و آخر اور ظاہر و باطن کی خالق و رب ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کے ٹھیٹ لفظی ترجمہ "وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے۔

وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے " ہی کی معنویت پر اصرار کرے تو پھر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "متشابہات" ہیں اور محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے وہی لوگ لگتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے — یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ قرآن اس پر شاہد ہے!

"...... یہ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ تقرب حق کے بعد ارادۂ قدرت بندۂ مقرب کے ذریعہ سے بھی کائنات میں نافذ العمل ہوتا ہے اور بقول مولانائے رومؒ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

لہٰذا بندۂ مقرب کے اختیارات دراصل اللہ بزرگ کے اپنے اقتدار کا اظہار ہے" (ماہنامہ "تاج")

مگر قرآن کیا کہتا ہے:۔

- "قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ"

(اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں مالک اپنے لئے بُرے کا نہ بھلے کا مگر جو چاہے اللہ)

- "قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝"

(اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے۔ میرے اختیار میں نہیں تمہارا نقصان وضرر اور نہ راہ پر لانا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اللہ کی بارگاہ میں اور کس کو تقرب حاصل ہو سکتا ہے۔ جب حضورؐ کے اختیار وقدرت کی یہ کیفیت ہے تو پھر دنیا میں وہ کونسا اللہ کا چہیتا ہے جو کائنات میں مختار و متصرف ہونے کی قدرت رکھتا ہے!

اس جگہ اہلِ بدعت کی طرف سے "ذاتی" اور "عطائی" کی تفریق پیدا کی جاتی ہے۔ مگر اس خیالی شیش محل پر بھی قرآن بھرپور ضرب لگاتا ہے:۔

- "قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ......"

(اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے.....)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں تو پھر ان لوگوں کو جو حضورؐ کی خاک پا کے بھی برابر نہیں ہیں، ہم کس طرح داتا۔ مالک ومختار اور شہنشاہ ہفت اقلیم مان لیں۔ قرآن پاک کے اس دو ٹوک فیصلہ اور اللہ تعالیٰ کے اس محکم ارشاد کے بعد ہم کسی کی تاویل اور نکتہ آفرینی کو ذرہ برابر وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں!

ماہنامہ "تاج" میں بابا تاج الدین ناگپوری سے یہ بات منسوب کی گئی تھی کہ انھیں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔" "فاران" میں اس پر گرفت کی گئی۔ اس کے جواب میں ماہنامہ "تاج" نے قرآن کی آیتیں پیش کی ہیں کہ "قرآن میں "رسول" اور "مرسل" قاصد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یقیناً عربی میں قاصد کو "رسول" کہتے ہیں، مگر ہمیں اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ بابا تاج الدین ناگپوری کیا عربی مصطلحات میں گفتگو فرمایا کرتے تھے؟ پھر اردو روزمرہ میں "پیغامبر" اور "پیغمبر" میں بھی فرق کیا جاتا ہے۔ "پیغامبر" تو قاصد اور پیام رساں کے معنی میں بولتے ہیں۔ مگر "پیغمبر" بول کر اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی اور رسول ہی مراد لئے جاتے ہیں۔ اور بابا تاج الدین صاحب ناگپوری سے جو قول منسوب ہے اس میں "پیغامبر" نہیں "پیغمبر" استعمال کیا گیا ہے — اصل عبارت یہ ہے:۔

"قوس ولایت میں باباؒ کی تربیت جناب سیدہ نے فرمائی تو آپ مرتبہ ولایت پر فائز ہوئے۔

پھر اس مرتبہ ولایت سے آپ کو جناب سیدہؓ نے اتنی ترقی عطا فرمائی کہ اپنا پیغمبر بنا کر عالم مخلوق میں مامور فرمایا۔"

"ولایت" کے مرتبے سے ترقی دے کر "پیغمبر" کا رتبہ عطا فرمایا۔ اس عبارت کو پڑھ کر قاری کا ذہن کیا ڈاکیہ اور قاصد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یا اُس "پیغمبر" کی طرف جو روحانی اعتبار سے ولی سے بلند تر ہوتا ہے اور جس کے معروف معنی رسول اور نبی ہی کے لئے جاتے ہیں!

پھر اس عبارت کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو وفات پائے ہوئے ساڑھے تیرہ سو سال سے بھی زائد مدت ہونے کو آئی اور آپ جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ کیا آپ قبر و برزخ اور علیین سے لوگوں کی تربیت فرماتی رہتی ہیں۔؟ یہ آخر کیا عقیدہ ہے؟ یہ کس دین کی ترجمانی ہے؟ یہ کیا لطیفے ہیں؟

پورے قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ کسی نبی اور رسول نے۔ یا اس کے صحابیوں نے وفات پانے کے بعد کسی اُمتی کی روحانی تربیت فرمائی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ایسی نہیں ملتی کہ آپ کے اصحاب اور اہلبیت دُنیا سے اٹھ جانے کے بعد مُسلمانوں کی، یا کسی ولی کی روحانی تربیت فرمایا کریں گے۔

کیا ماہنامہ "تاج" کے فاضل مدیر بتا سکتے ہیں کہ وفات کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس کی روحانی تربیت فرمائی تھی۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس مُسلمان کو "ولی" کے عہدہ سے ترقی دے کر "اپنا پیغمبر" مامور فرمایا تھا۔ اور پھر دُوسرے اصحاب اور اہل بیت دُنیا سے اٹھ جانے کے بعد کس کس کے روحانی مُربی تھے؟

اس قسم کے لغو عقائد کی تردید قرآن اس طرح کرتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (النحل)

(اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں۔ بلکہ مخلوق ہیں، مُردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور اُن کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انھیں کب (دوبارہ زندہ کرکے) اُٹھایا جائے گا!)

اس آیت کی "تفہیم القرآن" میں کتنی مطابقِ معنی تفسیر کی گئی ہے:۔

"یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور سے جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے، یا جن یا شیاطین یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اس لئے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں۔ ان پر "اموات غیر احیاء" کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لئے "مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ" کے الفاظ انھیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ انبیاء، صالحین اور دُوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کشا، فریاد رس، غریب نواز اور گنج بخش اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لئے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے

تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیتِ عرب کی تاریخ سے اُس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل ربیعہ، غسان، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، کعب و کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے۔ اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے۔ جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر یہ سب صالحین کے نام ہیں، جنہیں بعد میں لوگ بُت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں انسان تھے، اسی طرح کی روایات لات اور مناۃ اور عُزّیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایت میں آیا ہے کہ لات اور عزیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے یہاں اور گرمی عزیٰ کے یہاں بسر کرتے تھے۔ سُبحٰنہ وتعالیٰ عما یصفون۔"

"تیری شریعت تجھے مبارک" یہ ماہر صاحب نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ جیسے وہ نہیں جانتے ہوں کہ قرآن مجید میں بہت سے واقعات موجود ہیں جن میں صاحب الہام ولی یا نبی کو ظاہر احکام شرعی سے تجاوز کرنا پڑا ہے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ قرآن میں پڑھیں۔" (ماہنامہ تاج)

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ بیان کر کے اللہ یہ بتانا نہیں چاہتا کہ صاحب الہام ولی یا نبی شرعی احکام کو کبھی کبھی توڑ بھی دیا کرتے ہیں۔ ہم بے علموں کی بات اگر ان صاحبانِ معارف و غوامض (؟) کے نزدیک قابلِ سماعت ہو تو عرض کیا جاتا ہے کہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عالمِ تکوین کے بعض واقعات و احکام کا مشاہدہ کرایا تھا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ اس دنیا میں بعض واقعات بظاہر اس انداز سے رونما ہوتے ہیں کہ عقل اُن پر معترض ہوتی ہے اور ظلم و زیادتی کا فتویٰ لگا دیتی ہے۔ مگر حقیقت میں اُس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں!

اللہ تعالیٰ نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا تھا:۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ۔

(یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا وہ اُن سب میں پورا اترا)

انہی میں ایک "ذبحِ عظیم" کا واقعہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل کی خود ستائش فرما رہا ہے تو پھر اس واقعہ پر "خلافِ شرع" ہونے کا گمان کرنا حدودِ شریعت کے توڑنے کے لئے حیلہ اور جواز تلاش کرنے کی سعی نامحمود کے سوا اور کیا ہے؟

اُمِ موسیٰ نے جو موسیٰ کو تابوت میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا، اُس کا اللہ تعالیٰ نے جب ان لفظوں میں ذکر فرمایا ہے:۔

"وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی۔"

تو پھر اُمِّ موسیٰ کے اس فعل کو خلافِ شرع کہنا کتنی بڑی جسارت ہے! شارع جب خود ایک کام کے لئے حکم صادر فرمائے تو وہ "خلافِ شریعت" کیوں ہونے لگا۔ وہ تو "عین شریعت" ہے!

بے نمازی صوفیوں اور شریعت کی حدود کو توڑنے والے پیروں کی غلطیوں کو سندِ جواز دینے کے لئے خود قرآن سے "شرعی احکام سے تجاوز" کے نکتے نکالنا" اربابِ شہود و استغراق" ہی کو سزاوار ہے۔ ہم گنہگار، عامی اور بے علم تو ایسی جراُت کر نہیں سکتے

"مُسلمہ طور پر اولیاء اللہ کو تمام اُمت خدا رسیدہ تسلیم کرتی ہے۔ ملاء اعلیٰ میں اُن کی مقبولیت کا اعلان ہو چکا ہے اور اہلِ ایمان کے قلب میں اُن کی محبت و مقبولیت ودیعت کی گئی ہے آپ اس راستہ کو اختیار کیجئے ......" (ماہنامہ تاج)

اولیاء اللہ کا راستہ توحید اور کتاب و سنت کے علاوہ کوئی اور راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس راستہ میں توحید پر حرف آرہا ہو۔ اور اللہ کا دین بازیچۂ شوخیٔ افکار بن رہا ہو وہ "صراطِ مستقیم" نہیں کوئی اور پگڈنڈی ہے؟

ماہ جولائی کے ماہنامہ "تاج" میں ایک اور عبارت نظر سے گزری اور خدا جانتا ہے دل لرز گیا:۔

"۔۔۔ راقم نے بمقام کوٹھی چندنیاں علیگڑھ ۱۹۳۹ء شغلِ برزخ کی کیفیات اس عنوان سے عرض کیں :۔

"اے ذہین! ابن فراقی من نیم اعلانیم ظاہرم **عبد الکریم** و باطنم **رب الکریم**،

ارشاد ہوا۔۔۔ "مبارک"! (صفحہ ۷)

"تاج" کے مدیر اعلیٰ جناب ذہین شاہ تاجی صاحب "شغلِ برزخ کی کیفیات" اپنے پیر و مرشد بابا محمد یوسف شاہ تاجی کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں۔ عبارت سے صاف طور پر نہیں کھلتا کہ کہنے والے نے خود اپنے کو (بہ باطن) "رب الکریم" کہا ہے یا اپنے مرشد کو! بہرحال جس کے لئے بھی کہا ہے، غلط کہا ہے۔ اور "غلط" تو ہلکے سے ہلکا لفظ ہے جو ہم نے استعمال کیا ہے۔ پھر مُرید کی لغو بیانی پر پیر و مرشد "مبارک" کہہ کر اس بیہودہ گوئی پر مُہرِ تصدیق ثبت فرما دیتے ہیں!

اگر "تصوف" ایسے ہی مقامات سے اپنے طالبوں کو گزارتا ہے تو ان "مقامات" سے ہزار بار خدا کی پناہ! یہ جنید و شبلی کا (اسلامی) تصوف ہرگز نہیں ہے یہ تو کچھ اور ہی چیز ہے۔ جو سادہ طبیعت مُسلمان اس قسم کی "تعلیمات" کا شکار ہیں۔ اُن کے حال پر ہمیں بڑا ترس آتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ بار الٰہا! اُنھیں ان پھندوں سے جلد چھٹکارا دلا دے (آمین!)

ایک نظر!

"تاجی تصوف" کی رنگ رلیاں آپ دیکھ چکے، اس کے بعد ایک دوسرے "خانوادہ عرفان و تجلی" کی بوقلمونیاں بھی ایک نظر دیکھ ہی لیجئے!

حیدر آباد دکن میں ایک صاحب صدیق دیندار چن بسویشور گزرے ہیں۔ جو دین دار جماعت کے بانی تھے۔ بلدہ حیدر آباد میں قیام تھا۔ اُن کی خانقاہ کا نام "خانقاہ سرورِ عالم" تھا۔ اُن کی وفات ابھی حال ہی میں چند سال پہلے ہوئی ہے! چن بسویشور صاحب زیادہ تر ہندوؤں میں تبلیغ کرتے تھے اور اُن کا دعویٰ تھا کہ ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں اُن کے ظہور کی پیش گوئیاں اور علامتیں درج ہیں وہ اپنے کو "مثیلِ یوسف" بھی کہتے تھے حالانکہ وہ ندا ابھی خوبصورت نہ تھے!

ہندوستان کی تقسیم کے بعد جس طرح دوسرے مہاجرین کے ساتھ جنوبی ہند سے تھدوی اور بمبئی سے بعض آغاخانی بوہرے ہجرت کرکے پاکستان میں آگئے ہیں۔ اسی طرح صدیق دیندار چن بسویشور کے معتقدین بھی پاکستان میں آکر بس گئے ہیں۔ اس جمعیت (دیندار انجمن) کے لوگ ہرے عمامے باندھتے ہیں اور رنگے ہوئے کُرتے پہنتے ہیں۔ لانبی ڈاڑھیاں اور پراگندہ مُو! لارنس روڈ پر اس جمعیت کا مکتبہ ہے، اس سال انہوں نے مولانا صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کا عُرس بھی کیا تھا۔ اُن کے لوگ مسلمانوں کے پاس جا کر انفرادی طور پر بھی تبلیغ کرتے ہیں اور اُن کے یہاں سے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کتاب[1] ——— معراج المومنین ——— کے علاوہ اُن کے دو کتابچے (اسلام اور عصر حاضر ——— اور پیام خلافت) ہمارے یہاں آئے ہیں۔ جن میں مسلمانوں کو متفق و متحد ہونے، پاکیزہ زندگی اختیار کرنے اور مجاہد بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ فکر و بیان میں "تصوف" کی خاصی جھلک ہے!

سات سال کا عرصہ ہوتا ہو کہ "دیندار انجمن" کے ایک صاحب دفتر "فاران" میں تشریف لائے تھے اور راقم الحروف سے دریافت کیا تھا کہ مُسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو رفعت و ترقی سے بدلنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جاسکتی ہے ——— میں نے اُن کی خدمت میں اپنی فہم و استعداد کے مطابق چند معروضات کئے۔ اس پر انہوں نے خاصی طول طویل تقریر فرمائی اور اُن کی تلقین و تبلیغ کی تان اس پر آکر ٹوٹی کہ جب تک کسی "مامور وقت[2]" کی اتباع نہ کی جائے گی مُسلمانوں کی پراگندگی دُور نہیں ہو سکتی۔ اُن کا اشارہ صدیق دیندار صاحب چن بسویشور کی طرف تھا۔ اس پر میں نے انھیں اچھی طرح پھٹکارا۔ اس دن کے بعد وہ صاحب پھر میرے پاس آنے کی جرأت نہ کرسکے!

اس کتاب (معراج المومنین) کا پیش لفظ مولوی ابو احمد دستگیر صاحب نے لکھا ہے:۔

"جس طرح جہاد مردوں پر فرض ہے اسی طرح قرآنِ کریم ذاتِ وحدت الوجود رحمۃ للعٰلمین پر فرض ہے۔"

"قرآنِ کریم ذاتِ وحدت الوجود رحمۃ للعٰلمین پر فرض ہے"۔ یہ کیا "رمز" اور انداز بیان ہے۔ ہمارے تو کچھ پلے پڑا نہیں۔

"اسی حقیقت کے اظہار میں اللہ تعالیٰ جب کبھی روح کے نزول کا ذکر کرتا ہے تو وحدت کا اظہار کرتا ہے۔"

خوب! اور جب اللہ روح کے نزول کا ذکر نہیں کرتا تو وحدت کی جگہ "کثرت" کا اظہار کیا کرتا ہے۔ یہ آخر کیا چیستاں ہے؟

اس کے بعد "صاحبِ پیش لفظ" اپنے مافی الضمیر اور معتقدات کا کچھ اتا پتا دیتے ہیں:۔

"ایسے زمانہ میں حضور منبع انوار صلی اللہ علیہ وسلم کا رہنا ضروری ہے تاکہ اپنا دربار گرم کریں۔ اس دربار مبارک کی شان بھی فرضیت قرآن سے ظاہر ہے ...."

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ابدیت تو کتاب و سنت سے ثابت ہے یہ "حضور منبع انوار" کس "شخصیت" کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے دربارِ مبارک کی شان کی فرضیت بھی قرآن سے ظاہر ہے!

یہ "دیندار انجمن" کیا ہے اس کا تعارف خود اسی انجمن کے اکابر و فقراء مبلّغین اسلام ہمنے بانی تحریک کے ارشادات د

[1] جو دفتر "فاران" میں تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔ [2] یہی یا اسی سے ملتا جلتا ہوا کوئی لفظ بولا گیا تھا۔

ملفوظات سے کرایا ہے۔

"ان کا ہر فرد جب تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ بولتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے عالموں نے کبھی بھی نہیں سُنا تھا۔۔۔۔۔"

اس زمانہ کے بیچارے "علماء" کی رسائی بس کتاب وسنت تک ہے۔ اس سے "ماوراء حقائق" کو یہ غریب کس سے سنتے اور کہاں سُنتے؟

"تمام روئے زمین کے عالم ان کے سامنے گونگے ہیں۔ قرآن کریم کی جو بات بولتے ہیں وہ اپنی ذمہ داری سے بولتے ہیں، کلیم نے کلام سکھلایا ہے۔۔۔۔۔"

ہم نے تو آج تک "دیندار انجمن" کے کسی رکن یا فرد کی تقریر و وعظ کا شہرہ نہیں سُنا۔ خود بانی تحریک صدیق دیندار صاحب اپنی خانقاہ میں جو جلسہ کیا کرتے تھے تو قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم اور دوسرے علماء کو تقریر کے لئے بُلایا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی ان جلسوں میں نظمیں پڑھی ہیں۔ اگر اس انجمن کے بانی اور اس کے عمائد ایسے ہی فصیح البیان اور طلیق اللسان تھے کہ روئے زمین کے تمام علماء اُن کے سامنے گونگے ہیں تو اپنے جلسوں کو مقبول بنانے کے لئے دوسرے علماء اور مقررین کو بُلانے کی کیا ضرورت تھی!

ان "مبلغین دیندار انجمن" کے مبلغ علم کا حال بھی لگے ہاتھوں سُن لیجئے:۔

"یہ غریب لوگ کون ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کو قرآن نے قرن اولیٰ میں اپنا علمی جامہ پہنایا تھا جن کا لباس فقیرانہ ہے، بال بکھرے ہوئے ہیں۔ بازاروں میں جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں، جھگیوں میں رہتے ہیں۔ ظاہری علم سے بے بہرہ، نہ ان کے پاس تفسیروں کا خزانہ ہے نہ فقہ[1] و احادیث کا ذخیرہ ہے۔۔۔۔۔"

ظاہر ہے کہ قرآن کے یہ عجیب و غریب مفسر (؟)، اور دین کے مُبلّغ جو نہ علم تفسیر سے واقف ہیں اور نہ فقہ و حدیث میں درک رکھتے ہیں۔ جب تقریر فرمائیں تو تفسیر و حدیث اور فقہ کے جاننے والوں کی اسی میں سلامتی ہے کہ یہ بیچارے سکوت اختیار کرلیں۔ ہائے! قرآن اور دین کی مظلومیت!!

"اللہ تعالیٰ نے محض قدرت دکھلانے کے لئے اس زمرۂ وارث انبیاء کو کھڑا کیا ہے۔ قرآن کریم کی بشارت "النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین" ان سے پوری ہوئی ہے۔" (صـ ۲۴)

یہ مبالغہ آرائیاں، یہ خود ستائیاں، یہ خوش اندیشیاں ــــ کوئی کہے تو کیا کہے!

"اہل اللہ پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ بشارت دیتے ہیں۔ اگر اُن کے دل میں کوئی بات ہوتی ہے تو پوری ہو کر رہتی ہے۔" (صـ ۳۲)

حالانکہ قرآن اس پر شاہد ہے کہ انبیاء کرام تک کی بعض دل کی باتیں، تمنائیں اور دعائیں پوری نہیں ہوئیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تو یہ قول بہت مشہور ہے کہ "میں نے اپنے رب کو ارادے کے ٹوٹ جانے سے پہچانا"۔

---

[1] اصل عبارت میں "فقر" لکھا ہوا ہے مگر سیاق و سباق بتاتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اصل لفظ "فقہ" ہونا چاہیے۔

مگر صدیق دیندار صاحب کا یہ ارشاد ہے :۔

"ان (اہل اللہ) کا ارادہ خدا کا ارادہ ہوتا ہے ...." (صفحہ ۳۳)

اگر "اہل اللہ" کا ارادہ خدا کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ ناکام اور فسخ کس طرح ہو جاتا ہے۔ کیا اللہ کا ارادہ ٹوٹ سکتا ہے ؟ حالانکہ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ اہل اللہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کا تابع ہوتا ہے اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگے رہتے ہیں !

"یہ (اہل اللہ) اہم معاملات میں قرآن و حدیث میں غور کرنے کے بعد خداوند کریم کے دربار میں مشورہ کرتے ہیں ...." (صفحہ ۳۳)

اس راز کی پہلی مرتبہ پردہ کشائی ہوئی کہ "اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی بزم مشورت اور اسٹینڈنگ کمیٹی بھی قائم ہے۔ جہاں اہل اللہ" مشورہ فرمایا کرتے ہیں ——— توبہ !

"معلوم ہوتا ہے کہ مامور وقت یعنی فنا فی الرسول ظاہری علوم میں مشہور و معروف نہیں ہوتا ......" (صفحہ ۳۶)

یہ "مامور وقت"[۲] کون ہے؟ اس کا کچھ اتا پتا صدیق دیندار صاحب کے اس دعوے سے مل سکتا ہے :۔

"فقیر نے گاندھی جی اور محمد علی مرحوم سے کہا تھا کہ تم سب میری اطاعت کرلو انشاء اللہ دس سال کے اندر سوراج دلاتا ہوں ...." (صفحہ ۳۷)

یہ نہیں فرمایا کہ تم "میرا ساتھ دو" یا میری اسکیم اور مشورے پر عمل کرو۔ بلکہ اپنی "اطاعت"[۳] کے لئے دعوت دی تھی !

"معلوم ہوتا ہے کہ مامور وقت یعنی فنا فی الرسول انسان ظاہری علوم میں مشہور و معروف نہیں ہوتا اور وہ سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر مامور نہیں ہوتا۔ وہ خدا کا مقرر کردہ انسان ہوتا ہے دربار سرکار میں اس کی عزت نہیں ہوتی۔ وہ ایک پردہ میں رہتا ہے تاکہ اللہ کے کام کے لوگ ہی اس کے قریب آسکیں۔" (صفحہ ۳۶)

"خدا کا مقرر کردہ انسان" اور "پردہ نشین" بن کر بیٹھ جائے ——— یا للعجب! پھر یہ "فنا فی الشیخ"۔ "فنا فی الرسول" اور "فنا فی اللہ" کی اصطلاحیں کتنی خطرناک ہیں! کسی رسول اور نبی نے اپنے کو "فنا فی اللہ" نہیں کہا۔ کسی صحابی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں ——— "فنا فی الرسول" ہوں! یہ کیا مزاج، افتاد طبع اور انداز فکر ہے، جو ذہنوں کو ابہام و رمزیت، الجھنوں اور خطرناک نزاکتوں کی طرف لے جاتا ہے!

اس کتاب میں امام مالک، امام احمد بن حنبل اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ منصور حلاج کا بھی ذکر کیا گیا ہے! حالانکہ امام مالکؒ نے "جبری بیعت" کے خلاف کلمۂ حق بلند فرمایا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے "فتنۂ خلق قرآن" کے خلاف جہاد کیا تھا اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مغلیہ حکومت کی غیر شرعی رسوم و قوانین کو چیلنج کیا تھا ——— کیا "انا الحق" بھی اسی قبیل کی کوئی دینی ضرورت، تبلیغی کوشش تھی۔ اور کسی غیر اسلامی رسم و قانون کے مقابلہ میں کلمۂ حق کا اعلان تھا!

---

[۲] ایک بزرگ کے اس دعوے کو بھی یاد کیجئے کہ مجھے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

جو لوگ منصور حلاج کی اتنی عظمت اپنے دلوں کے اندر رکھتے ہوں اور "انا الحق" کو تصوف و عرفان کا "symbol" سمجھتے ہوں، اُن سے اظہار و بیان میں جو بے احتیاطی بھی سرزد ہو جائے، تھوڑی ہے۔

"لم یکن شیئاً مذکوراً" ظاہر کرتا ہے کہ ایک وقت انسان کا ایسا بھی گزرا ہے کہ اس کا بیان انسانی طاقت سے باہر ہے، یعنی ذات واجب الوجود احدیت کے مقام پر تھا۔ جب اس ذات مذکور نے اپنی ذات واجب الوجود سے مل کر شہادت میں آنے کا ارادہ کیا، عقلِ کُل میں آکر ٹھہری، عقلِ کُل سے عالم ارواح کا روپ لیا۔ پھر وہی ذات عالم امثال میں آئی، پھر عالم اجسام یا شہادت کا جامہ پہنا، رحمۃ للعٰلمین کی صورت اختیار کی۔" (صـ۳۱)

اس قسم کی خیالی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو کر اگر کسی کو سلامتی کی راہ مل جائے تو اسے ایک معجزہ سمجھنا چاہیئے، انسان کی تخلیق یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و بعثت کی ایسی تشریح کتاب اللہ میں، احادیث میں یا صحابہؓ کے اقوال میں، کہیں ملتی ہے؟ یہ یونان و عجم کی عقلی اور فکری نکتہ آفرینیاں ہیں جن کا اسلام سے جوڑ ملایا جاتا ہے!

"السلام علیک ایہا النبی والسلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصّٰلحین"۔ یہ لوگ زندہ ہیں۔ (صـ۳۲)

حالانکہ قرآنِ پاک میں بار بار اس حقیقت کو دُہرایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز ہلاک اور فنا ہونے والی ہے، انتہا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے لئے "میت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، صالحینؒ اولیاء اللہ کو یہ کہنا کہ "یہ لوگ زندہ ہیں"، قرآن کو جھٹلانا نہیں تو اور کیا ہے!

"یہ لوگ زندہ ہیں، یہ جسم کثیف بھی نہیں، یہ جسم لطیف بھی نہیں، ارادہ و عقل بھی نہیں، اطمینان بھی نہیں۔ یہ کُل ایک دُوسرے کے ماتحت ہیں یا کسی کے ماتحت نہیں۔ یہ کُل ضائع ہونے والے ہیں۔ یہ فنا سے خالی ہیں، خودی کو غائب کر کے مظہرِ خدا بنے ہیں ......" (صـ۳۲)

یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسی پہیلیاں اور کہہ مُکرنیاں ہیں —— توبہ! نعوذ باللہ من شرورِ انفسنا!

اس قسم کی باتیں کہنے میں کسی علم و تفکر کی ضرورت نہیں، کسی ذمہ داری کا احساس نہیں —— میں کسی فکر و تامل کے بغیر بداہتہً بلکہ ارتجالاً یہ عبارت لکھ رہا ہوں:۔

"میں کیا ہوں، نہ کلام ہوں نہ کلیم، نہ جسم ہوں نہ روح، نہ بساطت ہوں نہ ترکیب، نہ ارادہ ہوں نہ خیال، یہ میرا نام اور لقب (منظور حسین ماہر القادری) در اصل میرے "غیر" کا نام ہے میری "عین" کا نام نہیں ہے "عینیت" اسماء کی قید قبول ہی نہیں کر سکتی۔ میں جب بھی تھا، اب بھی ہوں، اور رہوں گا۔ میرے عالمِ وجود میں مَلا ہی مَلا ہے خلاء کا نام نہیں۔ اعتبار کیفیت کا ہوتا ہے کمیت کا نہیں، اسقاطِ اضافات و اعتبارات ہی میری حقیقت کی کُنہ ہے۔"

عجمی افکار کا یہ سلسلہ چلا ہے دکن سے چلا ہو یا کہیں سے، اسلوب و انداز سب کا ایک دُوسرے سے ملتا جُلتا ہے۔ اسلام فریسیوں، راہبوں اور کاہنوں کے جس "مکتبۂ فکر و نظر" کو مٹانے کے لئے آیا تھا افسوس ہے کہ مسلمانوں میں وہ فتنے "کشف و وجدان" اور "عرفان و شہود" کے ناموں سے داخل ہو گئے! کوئی خدا کا بندہ ان باتوں پر ٹوکتا ہے تو اُس پر بے علم، بے ذوق، وہابی اور اولیاء اللہ کے دشمن ہونے کی پھبتی چُست کی جاتی ہے، کیا اولیاء اللہ کی محبت اور دوستی کا تقاضا اُسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ کوئی "باطنیت" کی تعلیم میں غرق ہو کر رہ جائے؟

پیشکش

عبدالکریم ثمر

قلبِ سلیم و دیدۂ بینا بھی کر قبول
آئینہ ساز سختیٔ خارا بھی کر قبول

مانا کہ خامشیٔ محبت ہے مستجاب
اے بے نیاز عرضِ تمنا بھی کر قبول

بخشی گئی ہے مجھ کو کلیمی ترے لئے
اے حسن میرا ذوقِ تماشا بھی کر قبول

وہ شرحِ صدر جس پہ زمانہ کو ناز تھا
اس کی تجلیوں کا تقاضا بھی کر قبول

تُو نے حقیقتوں کو فسانہ بنا دیا
لیکن حقیقتوں کا فسانا بھی کر قبول

ساحل کی راحتوں میں کہاں گوہرِ حیات
اے ناخدا تلاطمِ دریا بھی کر قبول

ہے انتظار ہی میں نہاں لذتِ حیات
اے دل نواز وعدۂ فردا بھی کر قبول

ایک نظر؟!

ماہر القادری

عورت پہ یہ تہذیب کے ڈالے ہوئے گھیرے
کرگس کے ہیں چنگل میں ممولوں کے بسیرے

اب فلم کے نغموں سے ابھرتی ہیں شعاعیں
ہوتے تھے کسی وقت نمازوں میں سویرے

خاتونِ حرم کے لئے گھر ہی میں اماں ہے
جس دیس میں ہر سمت ہوں عصمت کے لٹیرے

اِن اہلِ سیاست کے فریبوں میں نہ آنا
سانپوں کو لئے پھرتے ہیں جیبوں میں سپیرے

باتوں سے بھی بدلی ہے کسی قوم کی تقدیر
جگنو کی چمک سے کہیں جاتے ہیں اندھیرے

تہذیبِ فرنگی کے یہ سفاک شکنجے!!
زلفوں کے بھی سائے نہیں ہوتے ہیں گھنیرے

اربابِ حکومت کے نہ وعدوں پہ لگا آس
اے دوست! یہ سائے تو نہ میرے ہیں نہ تیرے

اس دورِ پُر آشوب میں باطل کے مقابل
کچھ بھی ہو مگر ڈال دیئے ہم نے بھی ڈیرے

جنتِ ابلیس

شبنم رومانی

تضادِ فکر و نظر کی بہار ہے دُنیا
کسی کا گیت کسی کی پکار ہے دُنیا

شہیدِ جنبشِ ابروئے دوست کوئی نہیں
ہلاکِ گردشِ لیل و نہار ہے دُنیا

جو سوچئے تو ہنسی آئے اپنی آنکھوں پر
جو دیکھئے تو سراپا نگار ہے دُنیا

حقیقتوں کو فسانہ بناتی جاتی ہے
حقیقتوں کی فسانہ نگار ہے دُنیا

سمجھ سکا نہ زبانِ دل و نظر کوئی
فریبِ لفظ و بیاں پر نثار ہے دُنیا

دلوں کے نازک و حساس آبگینوں پر
نہ جانے کب سے یونہی سنگ بار ہے دُنیا

زکی زاکانی

بہارِ رنگ و بُو کچھ بھی نہیں ہے
یہ سب تیرا کمالِ خوش نگاہی

بھروسہ گر نہیں شانِ کرم پر
گنہگاری سے بدتر بے گناہی

کہاں ہیں منزلیں شام و سحر کی؟
یہ کس جانب بڑھے جاتے ہیں راہی؟

کوئی سمجھا نہ رازِ جستجو کو!
محبت بن گئی سرِّ الٰہی

ہے دُنیا بے خبر شانِ جنوں سے
یہاں ہر دین دینِ خانقاہی

رشید ارشد

بڑھا ہے نام خدا لے کے کاروانِ ادب
رواں دواں ہیں بصد شان رہروانِ ادب!

نئی اُمنگیں، نئے ولولے جلو میں لئے
بنا رہے ہیں جواں سال کہکشانِ ادب!

وقار صدیقی

نکہتِ گُل تو نہیں ہوں جو کسی محفل میں
لوگ محسوس کریں میرا پریشاں ہونا!

اک اُچٹتی سی نظر کا بھی کسی عالم میں
میں نے دیکھا ہے بہ تدریج رگِ جاں ہونا

رخصت اے عقل کہ اندیشہ صفت ہی تیری
مجھ کو منظور نہیں دشمنِ ایماں ہونا

شعلہ و شبنم

(راہی بلند شہری)

خواب نہ دیکھو رنگ محل کے　　رنگ محل ہیں اب کوئی پل کے
ساحل ساحل چلنے والے　　دیکھ کبھی موجوں پر چل کے
چوٹ لگی اور دل بھر آیا　　ٹھیس لگی اور ساغر چھلکے
کون اب شمع کے آنسو پونچھے　　خاک ہوئے پروانے جل کے

شاعر فتحپوری

ظاہر ہمہ جلوہ ہے باطن ہمہ تاریکی　　کعبہ ہے نگاہوں میں دل میں ہیں صنم خانے
طوفان کی موجوں سے ٹکرا کے تو بچ نکلا　　ساحل پہ سفینہ کا انجام خدا جانے
رنگیں نظر آتے ہیں سب خونِ تمنا سے　　وہ درد کے قصے ہوں یا شوق کے افسانے
کیا طرفہ تماشہ ہے میخانۂ عالم میں　　میخوار تو پیاسے ہیں گردش میں ہیں پیمانے
کعبہ کی زیارت سے کیا فیض تجھے زاہد　　دل میں تو ہزاروں ہیں پوشیدہ صنم خانے
نظریں نہ کبھی پہنچیں اسرارِ حقیقت تک　　دنیا کی زباں پر ہیں افسانے ہی افسانے

یوگیندر پال صابر۔ ایم اے

بھاگا کوئی دنیا سے دنیا پہ مٹا کوئی　　ہر فرض ہزاروں میں کرتا ہے ادا کوئی
ناقدریٔ دنیا کے حالات سناتے ہیں　　ہم آپ کی نظرت کا کرتے ہیں گلہ کوئی

شفقت کاظمی

شبِ فراق میں ہم نے بیادِ جلوۂ دوست
تصورات کے ایوان سجائے ہیں کیا کیا
کچھ اپنے جوشِ محبت میں فرق آ نہ سکا
وہ ترکِ شوق پہ بھی یاد آئے ہیں کیا کیا
کسی کی یاد نہ جب تک شریکِ حال ہوئی
رہِ وفا میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
مری وفا کا نہیں اُن کو اعتبار ابھی
یقین اپنی طرف سے دلائے ہیں کیا کیا
پڑا نہ صبر مری بیکسی کا آخر کار
سرشکِ غم تری آنکھوں میں آئے ہیں کیا کیا

عارف سنبھلی

ایک کی ضو نگاہ تک ایک سے دل ہے مطمئن
پھول کی بات اور ہے زخم کا کام اور ہے

نازش شاہ جہاں پوری

قیودِ رسمِ کہن توڑ دینا کوئی مشکل تھا
مگر اتنے جواں ہمت نہ تم نکلے نہ ہم نکلے
خوشی نہیں نہ سہی غم تو ہے شریکِ حیات
ذرا سی بات پہ ہم جی بُرا نہیں کرتے

رشید کوثر فاروقی

کبھی غربت میں ایسا وقت بھی پڑتا ہے انساں پر
چمن کیسا، خیالِ آشیاں بھی بار ہوتا ہے

روحِ انتخاب

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا

ان لوگوں نے اللہ کے لئے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ

هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ (الانعام)

مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کیلئے ہے بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لئے!

اس بات کے وہ (مشرکین) خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وہی اُگاتا ہے۔ نیز ان جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں۔ لیکن اُن کا تصور یہ تھا کہ اُن پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنات اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سلف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو اُن پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا۔ اس شکریہ میں کہ اُس نے یہ کھیت اور جانور انھیں بخشے اور دوسرا حصہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا۔ تاکہ اُن کی مہربانیاں اُن کی شاملِ حال رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے۔ کہ یہ سب مویشی ہمارے پیدا کئے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں۔ ان میں یہ دوسروں کی نذر و نیاز کیسی؟ یہ نمک حرامی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو جو اس نے سراسر خود اپنے فضل و کرم سے کیا ہے، دوسروں کی یہ مداخلت اور اُن کے توسط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریہ کے استحقاق میں اُنھیں اُس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ شریک کرتے ہو!

ان تو ہمات کی اصل جڑ کیا تھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لئے نکالتے تھے۔ وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صرف کیا جاتا تھا۔ اور جو حصہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لئے نکالتے تھے وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لئے ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ خدا کے حصے میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں مگر "خدا کے پیاروں" کے حصہ میں کمی نہ آنی چاہیئے!

(تفہیم القرآن ۔ ابوالاعلیٰ مودودی)

عارف سہارنی

موڑ

نوجوانی کے بعد جوانی نے جب اپنا کاروبار سنبھالا تو اُسے اپنے ارد گرد بہت سے خلا نظر آنے لگے۔ اگلی شورشوں میں کچھ سنجیدگی بلکہ تھوڑا سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ وہ جو اب تک رنگ و بُو کا دلدادہ تھا۔ اب پھولوں کو دیکھ کر محسوس کرتا کہ یہ رنگتیں ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ اُن کے پیچھے کوئی چیز چھپی ہوئی ہے۔ چڑیوں کی چہکار کتنی رسیلی ہے مگر ان کے اندر بھی ایک سوز نہاں ہے۔ ایک بے نام سوز! اور یہ بلبلیں صرف تفریح کی خاطر چہکتی نہیں پھرتیں، یہ کسی باطنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہیں!

وہ رات کے سناٹے میں دور سے ندی کی آواز سُن کر کسی سوچ میں ڈوب جاتا، اور اس آواز کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کرتا۔ وہ اب بھی سیرِ شام پنگھٹ کی طرف نکل جاتا، سُندر پنہاریاں سروں پر گاگریں رکھے ہوئے اب بھی اس سے دوچار ہوتیں مگر اس کے دل میں وہ پہلی سی بے چینی پیدا نہ ہوتی۔ شاید یہ دلِ وحشی اپنے وحشی پن کو بھول چکا تھا۔ اب اُسے اُن گلابی آنکھوں میں پسِ پردہ کوئی حسرت جھلکتی نظر آتی۔ اور حسین و شاداب رخساروں کی تہ میں ایک موجِ اضطراب دکھائی دیتی ــــ اور بہت جلد اُسے محسوس ہونے لگتا کہ ہر چیز کے ظاہری رُوپ میں کوئی اور رُوپ مستور ہے۔ اس زندگی کی تہ میں کوئی اور زندگی پائی جاتی ہے ــــ اس کائنات کے اندر کوئی دوسری کائنات چھپی ہوئی ہے ــــ کوئی اور منزل ــــ کوئی اور مقام!

اور اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ جیسے کسی تھکے ہارے مسافر کا دل منزل کا نام سُن کر اوپر نیچے ہونے لگے۔ ایک عالمِ جستجو اور جذبۂ تلاش و منزل رسی!

اُس پر یہ بھید کھلتا سا جا رہا تھا کہ یہ دنیا ــــ نشانِ راہ ہے ــــ مگر ــــ منزل نہیں ہے! اُس کے کان کبھی آپ ہی آپ بجنے لگتے۔ جیسے وہ آوازِ جرس کو سُن رہا ہے! چاندنی راتوں میں اُس کی آنکھ کھل جاتی۔ اور کوئی احساس جاگ اُٹھتا۔ وہ متجسس نگاہوں سے اُفق کے آس پاس گھورنے لگتا۔ پھر اُسے چاند کی کرنوں سے درد سا چھنتا نظر آتا۔ ہوائیں اُسے درد بھرے گیت سناتیں۔ اور ایک نئی منزل کی طرف قافلہ مڑتا ہوا سا ــــ وحشت و انس کا ملا جلا احساس! ایک دوراہہ جہاں سے یقین و توہم کے راستے پھٹتے تھے!

اور کبھی راتوں کی تنہائی میں اُسے رخسانہ کا حسین چہرہ نظر آتا۔ رخسانہ ــــ اُس کے نوجوانی کے خوابوں کی ملکہ! سرتا بقدم حُسن و رعنائی!

وہ حسنِ رنگیں، وہ قد موزوں ــــ عالم ہی عالم، منظر ہی منظر

اور ع

عارض ہیں وہ نازک کہ پسینہ سے گرانبار

مگر اس احساس کے جاگتے ہی اُس کے چہروں سے کچھ خشونت سی جھلکنے لگی ــــ وہ سوچنے لگتا ــــ مجھے جانا کہاں تھا اور

نکل کہاں گیا۔ ہائے! وہ نادان جو سانپ کے پھن کو پھول سمجھ کر چوم لے!

چاندنی راتوں میں اُس کی آنکھوں کے سامنے فلک بوس عمارتیں ہوتیں۔ یہ شبستان، یہ زمین کی جنتیں۔ کاش! میرے پاس بھی دولت کے ڈھیر ہوتے۔ کبھی وہ سوچتا کہ اگر کہیں سے دو چار کروڑ روپیہ اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ کیا کیا کرے ——— کوٹھیاں اور بنگلے ——— نئی کاریں ——— کئی اسکولوں اور یتیم خانوں کے سنگِ بنیاد اُس کے ہاتھوں سے نصب ہوں۔ جن پر اُس کا نام کندہ ہو!

کبھی وہ اپنے خیال کی دنیا میں "جہانگیر" ہوتا۔ اُس کے دروازہ پر زنجیر عدل لٹکی ہوتی۔ کبھی وہ "ڈاکٹر" ہوتا۔ ہر وقت مریضوں کا ہجوم۔ آمدنی کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ سچ مچ روپے کی بارش!

حبابوں کے محل۔ ہوا کے قلعے۔ خیالوں کے چمن۔ یہی اُس کی دنیا تھے۔ مگر ان جھوٹی تسلیوں سے وہ مطمئن نہ تھا۔ اپنے اندر ایک شدید اضطراب اور اکتاہٹ سی محسوس کرتا تھا!

ایک دن وہ گھر سے چل کر درختوں کے جھنڈ میں پہنچا۔ وہاں ندی بہ رہی تھی۔ اُس نے نیلی چٹان پر بیٹھ کر ندی میں پیر لٹکا دیئے۔ موجیں اُس کے تلوؤں کو سہلاتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ بڑا دلکش سماں تھا مگر وہ اب بھی بے چین تھا۔ اُس کی نگاہیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ دریا کی کوئی موج پارس پتھر اُس کے قدموں کے پاس لاکر ڈال دے کہ وہ اس کے اثر سے سینکڑوں من سونے کا مالک بن جائے۔ مگر..... دولت..... بہت ناپائدار..... "کمالِ ہنر" سے آدمی بڑا بنتا ہے۔ دولت کو ہر آن زوال کا خطرہ۔ مگر "کمال" کو کوئی خطرہ نہیں۔ ایک ابدی حقیقت!

ہوائیں ایکا ایکی تیز ہوگئیں۔ ندی کی پیشانی پر عتاب آمیز سلوٹیں ابھر آئیں۔ طوفان تند و تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے چٹان سے اٹھنے کے لئے جنبش کی ہی تھی کہ اُس کے کانوں میں ایک دردناک آواز آئی:-

"میرے اللہ! مجھے بچا........"

وہ چونک پڑا۔ اٹھا اور چٹان کے قریب جہاں سے آواز آرہی تھی، آن کی آن میں پہنچ گیا۔

اُس نے دیکھا، ایک بوڑھا آدمی ہے، ٹانگ سے خون بہ رہا ہے اور اس کی مٹھیاں شدتِ درد سے بھنچی ہوئی ہیں۔

"بابا! تم کون ہو؟" اس نے بوڑھے کو سہارا دیتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"میرے اللہ! تو کتنا کارساز ہے کہ اس طوفانی اور سنسان رات میں میری مدد کر سکتا ہے۔ اور ہاں میرے بیٹے تم کتنے اچھے ہو۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

اُس نے اپنے کرتہ کے دامن کو زور سے جھٹکا دے کر چاک کیا اور اُس سے ایک دھجی لے کر بوڑھے کی ٹانگ پر باندھ دی۔

"بابا! تم یہاں کہاں؟" اُس نے دریافت کیا۔

"میرے بیٹے! میں بستی کے باہر ریوڑ چرا رہا تھا۔ کہ طوفان آگیا۔ اگر میں چاہتا تو بھیڑوں کو چھوڑ کر بستی کی طرف بھاگ جاتا۔ مگر میری غیرت نے اسے گوارا نہ کیا کہ جس کا نمک کھاتا ہوں اُس کی امانت (بھیڑوں کے گلہ) سے بے وفائی کروں۔ میرے بیٹے! میں کہاں ہوں۔ ہم کہاں ہیں۔ بستی کتنی دور ہے۔ نہ جانے میری ننھی غزالہ کس حال میں ہوگی۔ میری پیاری بچی، میری زندگی کا سہارا۔ اپنے بوڑھے باپ کو طوفانی رات میں گم کر کے کیا کیا سوچ رہی ہوگی۔ نہ جانے سحر

ہونے تک .... وہ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے!

بوڑھا چلنے کے قابل نہ تھا۔ راستہ بھی ناہموار تھا۔ بڑھاپا، ٹانگ کا تنا گھاؤ۔ پُرشور ہوائیں۔! اس نے بوڑھے کو کاندھے پر اٹھا لیا۔ اور بستی کی طرف چل پڑا۔

درختوں کے کنج میں پگ ڈنڈیوں سے گزر کر کھیتوں میں پہنچا۔ وہاں سے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کی دیوار کے نیچے بوڑھے کی جھونپڑی تھی۔ اس نے بوڑھے کو ایک ٹوٹی سی کھاٹ پر لٹا دیا۔ غزالہ اپنے باپ سے چمٹ گئی اور بوڑھے نے اُسے گلے لگا لیا۔۔۔ مسکراہٹ اور آنسو ملے جلے!

صبح تباشیر بکھیرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اور مسجد سے "اللہ اکبر" کی صدا آئی۔ وہ مسجد کی طرف بے اختیار جا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے دل کو سکون حاصل ہوا۔ "اللہ اکبر"۔ ہاں! بیشک اللہ ہی بڑا ہے۔ اس کے لب ہلنے لگے!

ہماری نظر میں

زیرِ گل از: کوثر نیازی۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ مجلد خوبصورت گردپوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

جناب کوثر نیازی اقامتِ دین کی تحریک میں اُس وقت سے شامل ہیں جبکہ اُن کی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں۔ یوں سمجھئے خیر و تقویٰ اُن کو گھٹی میں پلائے گئے ہیں۔ پھر دوسری طرف انہوں نے مزاج شاعرانہ پایا ہے۔ نوجوانی کی منزل سے وہ ایک ہتھیلی پہ "جامِ شریعت" اور دوسری ہتھیلی پر "سندانِ عشق" لئے ہوئے گزرے اور کامیاب گزرے ؎

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

کوثر صاحب کا چہرہ مہرہ اور اُن کا ایک ایک انداز بتاتا ہے کہ ہوسناکیوں سے اُن کا عملاً سابقہ نہیں پڑا۔ اس لئے اُن کے کلام میں اُس چٹخارے کی تلاش فضول ہے، جو بے اعتدالیوں، ہوسناکیوں اور جوانی کی لغزشوں کے سہارے پروان چڑھتا ہے اور جس سے بڑے بڑے شاعروں کے دامن آلودہ ہیں!

کوثر کی "محبت" میں پاکیزگی اور وقار ہے، اس میں تاک جھانک، ہوس کی دراز دستیاں اور نفس کی چیرہ دستیاں نہیں۔ اس چیز نے اُن کی غزل کو شوخ سے زیادہ معصوم بنا دیا ہے ؎

کوثر شبیہِ یار ہے اشکوں کے درمیاں
یا چاند آگیا ہے ستاروں کی گود میں

"غمِ جاناں" کس شاعر کا موزوں نہیں رہا؟ مگر کوثر کے اس شعر کی "بے پناہی" بھی تو دیکھئے ؎

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں؟
کچھ لوگ زندہ ہیں غمِ جاناں ترے بغیر

قارئین کے وجدان کی تواضع کے لئے۔ کچھ اور ؎

جسے سناؤں تو آنسو نہ رُک سکیں ہمدم — وہ روئیدادِ چمن ہے قفس کی بات نہیں
ملی جو مُفت کی زاہد نے بھی ذرا چکھ لی — کچھ اس میں ورنہ ہوا و ہوس کی بات نہیں

روشنی نے یہ گُل کھلائے ہیں — ہر طرف ظلمتوں کے سائے ہیں

تھوڑی ہی کسر بس باقی ہے دُنیا کے جہنم بننے میں — ماحول گواہی دیتا ہے حالات اشارہ کرتے ہیں

وہ راہرو ہوں کہ خود اُٹھ کے منزلِ مقصود مرے حضور بہ شکلِ غبار آئی ہے

مجھ کو غم ہے کہ انھیں دیکھنے والے ہیں بہت اُن کو شکوہ ہے یہاں ذوقِ نظر عام نہیں

دلِ ناشاد میں یوں آج تری یاد آئی جیسے جگنو کوئی ظلمت میں چمک جاتا ہے

ہائے! یہ بیچارگی خود باغباں کا حکم ہے باغ میں رہنا ہے تو بے بال و پر ہو جائیے

جب جوانی تھی اُمنگوں پر بڑھاپا آگیا اب بڑھاپا ہے تو ہر خواہش جواں ہونے لگی
اللہ اللہ! تیرے دیوانوں کی راحت کا خیال ریگِ صحرا بھی حریر و پرنیاں ہونے لگی

اک ذرا دیکھ کے اے جراءتِ ایماں کہ یہاں قابلِ عفو ہے ہر جرم صداقت کے سوا
اور موضوعِ سخن بھی تو ہیں اے فن کارو! زلف و رخسار کی پامال حکایت کے سوا

ہزار چوٹ لگے لاکھ طنز ہو کوثر! جو اہلِ عشق ہیں وہ دل کشادہ رکھتے ہیں

رُکاوٹیں تو رہِ شوق میں ضروری ہیں قدم بڑھاؤ رفیقو! سفر کی بات کرو

زہے نصیبِ محبت! قبول ہو جائیں ترے حضور مرے آنسوؤں کے نذرانے
کشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثر اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے

تمہارے ساتھ ہی یہ حادثہ نہیں گزرا سُنو کہ دوست ہمارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

یہ بات کیا ہے کہ فصلِ بہار کے ہوتے مجھے چمن پہ گمانِ قفس بھی ہوتا ہے

کیا ارادے ہیں قافلے والو! دُور منزل ہے رات کالی ہے

کوثر نیازی کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبی "مقصدیت" ہے۔ یہ "مقصدیت" سپاٹ اور ہموار نہیں ہے اس میں ولولہ ہے، جوش ہے، مد و جزر ہے اور باطل کو مٹانے کا عزم ہے!

اپنی نئی نویلی دُلہن کو قید خانہ سے شاعر یہ پیام دیتا ہے ؎

ہنسی خوشی میں ہر اک غم کی چوٹ کھاؤں گا — ترے فراق کے ہوتے بھی مسکراؤں گا

وفا و عشق کی قدریں نئی بناؤں گا — خدا کی راہ میں تجھ کو بھی بھول جاؤں گا

اس "واردات" اور "آپ بیتی" میں کوثر نیازی کا حریف کوئی شاعر نہیں - ایثار و صداقت کا یہ سنگِ میل ہے جو شعر و ادب کی شاہراہ میں نصب کر دیا گیا ہے !

"نذر" - "اے سیدِ لولاک" - "مقبرے" بھی اچھی نظمیں ہیں - "نیا آئین بننے پر" کوثر نے کس جرأت کے ساتھ پوری قوم کے دلوں کی ترجمانی کی ہے ؎

صرف تبدیلیٔ آئین نہیں ہے کافی
ابھی اس باغ کے مالی بھی بدلنے ہوں گے

دوسرا رخ :-

زندانیو! گھبراؤ نہ اس جور و جفا سے — سر جبر کا اکڑا ہوا خم ہو کے رہے گا (ص ۲۰)

مصرعہ ثانی میں لفظوں کے دروبست نے خاصہ "کھردرا پن" پیدا کر دیا -

سینوں میں دیکھ اُن کے کوئی بد دعا نہ ہو — اے دہر! غم زدوں سے تو بے جا خفا نہ ہو (ص ۲۸)

پورا شعر بے مزہ ہے - "اے دہر!" کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے !

سرکارِ دو عالم کو کوئی جا کے بتائے — سب ہم نے بھلائے جو سبق تو نے سکھائے (ص ۳۴)

"تو نے" کی جگہ "تم نے" کا محل تھا - اس قسم کے بھرتی کے شعر کوثر صاحب کو چھانٹ دینے چاہئیں تھے -

کوثر در و دیوار سے کرتا ہوں میں باتیں — ڈستے ہیں مجھے جب بھی شبِ ہجر کے سائے (ص ۳۵)

"ڈسنے" کی تکلیف کا صرف یہ اثر کہ شاعر در و دیوار سے بس باتیں کرتا رہتا ہے - خوب ؟؟؟

کشمکش ایک زمانے سے کئے جاتے ہیں — تیرے کچھ بے سر و سامان رسولِ عربی (ص ۷۹)

"زمانہ سے کشمکش کئے جاتے ہیں" - روزمرہ اور محاورہ کے اعتبار سے محلِ غور ہے -

ابنِ آدم کو ڈسیں ہر سو زر و سیم کے ناگ — اور میں سکّوں کی جھنکار میں کھویا رہوں (ص ۸۹)

"ہر سو" کا "واؤ" کس بُری طرح دب رہا ہے ! توبہ !

جب میں گزرا ہوں کسی شہر کے چوراہے سے — مجھ کو محسوس مرے دل میں گھٹن ہوتی ہے (ص ۹۱)

"مرے دل" نہیں "اپنے دل" کہنا چاہیے تھا -

اے ابرِ مشکلات! محیطِ حیات ہو — دل میں ہے پھر سے چند سہاروں کی آرزو (ص ۱۳۰)

آورد ہی آورد - اور تکلف ہی تکلف !

میں جب یہ کہتا ہوں دنیا تہس نہس ہو جائے — تو اس میں اہلِ جہاں پر ترس بھی ہوتا ہے (ص ۱۵۱)

"زرِ گل" میں اور ایسا بے رنگ شعر - شاعر کے ذوقِ انتخاب سے فریاد !

"زرِ گل" پر مولانا امین احسن اصلاحی کے تعارف نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے - اتنے جاندار و اثر انگیز "تعارف" اور "پیش لفظ" بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں - مکتبہ تعمیرِ انسانیت نے کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی ہے اور سرورق تو اِتنا

حسین ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے!" زرگل" ایک جواں سال شاعر کے واردات وجذبات کا دلکش مرقع ہے!

شرح لوائح جامی

از:- سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے۔ لیکچرار شعبۂ فارسی اُردو کالج کراچی۔ ضخامت ۱۲۲ صفحات (قیمت درج نہیں) کتاب مصنف سے مل سکتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نورالدین جامی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب" لوائح جامی" کا سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے معانی اور غوامض کے اعتبار سے بہت ادق ہے۔ ہر فارسی جاننے والا اس کے معانی کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ جناب فاضل فارسی کے متبحر عالم ہونے کے علاوہ تصوف کا خاصہ ذوق رکھتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ اس لئے" لوائح جامی" کے ترجمہ میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

کتاب کے شروع کے تینتیس صفحات میں مولانا جامی علیہ الرحمۃ کے سوانح حیات اور اُن کی شاعری پر اجمالی تبصرہ ہے۔ "لوائح جامی" کا جو نسخہ نول کشور پریس (لکھنؤ) میں چھپا ہے۔ فاضل شارح نے اُس کی کتابت کی غلطیوں کو درست کیا ہے اور اس کتاب میں اُن کی فہرست دے دی ہے۔ یہ کام خود اپنی جگہ ایک مفید کارنامہ ہے!

ترجمہ کا ایک نمونہ:-

اے طبع ترا گرفتہ وسواس سخن ۔۔۔ ہیدار اگر اہل دانشی پاس سخن
مکشائے زباں بہ کشف اسرار وجود ۔۔۔ کیں دُر نشود سفتہ بالماس سخن

(اے وہ کہ تیری طبیعت کو شعر وسخن کا سودا ہو گیا ہے۔ اگر عقلمندوں میں ہے تو سخن کا پاس رکھنا چاہیئے (وہ اس طرح کہ سخن کے ذریعہ اسرار وحقائق بیان کرنے کی کوشش نہ کر۔ کیونکہ اس سے اسرار وحقائق بیان نہ ہو سکیں گے اور اس طرح عزت سخن جاتی رہے گی۔ لہٰذا سخن سے ایسا کام نہ لینا چاہیئے۔ جو اُس کے بس کا نہ ہو۔

(وجود کے اسرار بیان کرنے میں زبان نہ کھول۔ کیونکہ یہ موتی سخن سے نہیں پروئے جا سکتے۔ (سخن کے ذریعہ حقائق کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشتی!)

کتاب کے آخر میں خاص الفاظ کے معنی اور تصوف کی عام اصطلاحات کی شرح درج ہے جو بڑے کام کی چیز ہے۔ ایک نمونہ۔

حال:- حق تعالیٰ کی جانب سے واردات سالک کے دل پر وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً قبض وبسط، حزن وطرب، حقیقت و اُنس یا مستی وبے خودی وغیرہ" حال" کہلاتی ہیں اور حال اچانک وارد ہوتا ہے اور بہت جلد کسی غفلت کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے۔

مقام:- جب حال دائمی ہو کر سالک کا ملکۂ راسخ بن جاتا ہے تو مقام کہلاتا ہے۔ حال سے سابقہ اصحاب تلوین کو رہتا ہے اور مقام سے اصحاب تمکین کو! اس لئے حال سے مقام کا مرتبہ بلند ہے!

فاضل شارح نے" انتساب" کے آخر میں یہ شعر لکھا ہے ؎

ہم نے جانی تھی اس سے قدر سلف
اُن پہ ایمان لائے گا اب کون

شعر بہت پھیکا ہے۔ کوئی پُر جوش اور ولولہ انگیز شعر فارسی سے لیا جا سکتا تھا!

" اُس وقت مولانا کی عمر چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مولانا کے والد اُن (مولانا سعد الدین کاشغری)

کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا کو بھی ساتھ لے گئے۔ خواجہ صاحب نے ان کو التفاتِ خاص سے نوازا اور چلتے وقت ایک سیر مصری عطا کی۔ گویا مذاقِ تصوف کی تخم ریزی کی گئی۔" (صہ ۴)

"گویا مذاقِ تصوف گھٹی میں پلایا گیا" ہوتا تو عبارت کتنی برجستہ ہو جاتی!

"مگر تیری ذات وجودِ صرف اور ہستیٔ بحت ہے"۔ (صہ ۵۲)

"وجودِ محض" شاید "صرف" کے مقابلہ میں ذات کی شانِ تجرد و تفرد کی زیادہ بہتر ترجمانی کرتا ہے!

"الفقر اذا تم ہو اللہ این است"۔ (صہ ۴)

جس رباعی کا آخری مصرعہ ہے، یہ رباعی حضرت سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منسوب کی جاتی ہے۔ لائق شارح کو اس سے بحث ضرور کرنی تھی کہ اس رباعی کا کس سے انتساب درست ہے اور اس کے وجوہ کیا ہیں؟

این عشق کہ ہست جزو لاینفکِ ما حاشا کہ بود بعقل مُدرَکِ ما (صہ ۷)

اس شعر کا ترجمہ ہونے سے رہ گیا۔

مولانا جامی قدس سرہٗ پر "وحدت الوجود" کا غلبہ ہے۔ لہٰذا "لوائحِ جامی" کے بعض مقامات خاصے محلِ غور ہیں۔ مثلاً:۔

آنرا کہ فنا شیوہ و فقر آئین است نے کشف و یقین نہ معرفت نے دین است

رفت او زمیاں ہمیں خدا ماند خدا الفقر اذا تم ہو اللہ این است

کی معنویت سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نری شاعرانہ شوخیٔ فکر ہے!

لائحہ شانزدہم:۔ "ذات من حیث از ہمہ اسماء و صفات معراست واز جمیع نسب و اضافات مبرا۔۔۔۔"

یہ "معطلین" کے عقائد ہیں۔ جو اپنے خود ساختہ نظریہ "تعطیل" کے زد میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ "اللہ" کو ہم "احد و واحد" بھی نہیں کہہ سکتے کہ "ایک" کہہ کر ہم ذاتِ بحت کو مقید کرتے ہیں۔ مگر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ خود اپنے اسمائے صفات بیان فرماتا ہے!

فقیر:۔ بعض کے نزدیک وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہ ہو۔ اور بعض کے نزدیک اللہ کا بھی محتاج نہیں رہتا کیونکہ احتیاج صفت موجود ہے۔ حالانکہ فقیر بحرِ نیستی میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اور اپنی ہستی سے گزر جاتا ہے۔ جب ہستی ہی نہ رہی تو احتیاج کیسی"۔ (صہ ۱۰۹)

پروفیسر سید عبدالرشید صاحب فاضل سے صوفیا کی اس "تعریفِ فقیر" پر ہم اختلافی نوٹ کی توقع رکھتے تھے۔ بندہ ہر حال میں بندہ رہتا ہے، چاہے وہ عرش سے بھی اونچا ہو جائے اور "فقر" بندہ کی وہ صفت ہے جو اس سے کسی حال میں جدا نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام مضامین لطائف اور نکتے جو عبد و معبود کے فرق کو مٹاتے ہیں، یا شبہ میں ڈالتے ہیں۔ یکسر باطل ہیں۔ اور اس معاملہ میں کسی بڑے سے بڑے صوفی کی بھی بات نہیں مانی جا سکتی!

ہادیٔ اعظم

(۱) ہادیٔ اعظم (حصہ اول) از:- ابوخالد۔ ایم اے۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔
(۲) ہادیٔ اعظم (حصہ دوم) از:- ابوخالد۔ ایم اے۔ ضخامت ۹۵ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (بھارت)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس لائف انتہائی آسان، عام فہم اور دلنشین انداز میں لکھی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں پیدائش سے لے کر ہجرت تک کے حالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ہجرت سے لے کر حجۃ الوداع تک کے واقعات اور حضور کے اقوال وعادات کا ذکر ہے۔ دونوں حصے اس قابل ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی گھرانا ان سے خالی نہ رہے۔ اسلوبِ نگارش سادہ وسلیس ہی نہیں پُرجوش بھی ہے "فتح مکہ" کی کیفیت جس انداز میں پیش کی ہے اُسے پڑھ کر ایمان تازہ ہوجاتا ہے!

اسلامی دستورِ مملکت

مرتبہ:- مولانا عرفان رشدی (مجلس علمائے پاکستان) ضخامت ۵۶ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- سیکرٹری مجلس العلماء پاکستان۔ ۲۵ دیو سماج روڈ۔ لاہور

اس کتاب کے پہلے حصہ کے اہم عنوانات یہ ہیں:-

اسلام کا نظامِ حکمرانی ــــ بنیادی اصولِ سیاست ــــ امورِ شرعیہ ــــ جدوجہد آزادیٔ ہند ــــ امورِ شرعیہ ــــ مطالبۂ پاکستان ــــ

دوسرا حصہ، امورِ شریعت کے شعبوں اور طریق نفاذ پر مشتمل ہے ــــ کوئی شک نہیں پوری کتاب دینی فکر اور اخلاص و دردمندی سے لبریز ہے۔ پاکستان کے دستور کو خالص اسلامی دستور ہی ہونا چاہیئے۔ ایک زمانہ انشاء اللہ آئے گا کہ پاکستان کے دستور میں اسلامی اور جمہوری نقطۂ نگاہ سے جو خامیاں رہ گئی ہیں، وہ دُور کردی جائیں گی۔

اس کتاب میں ایک خط چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم پاکستان کے نام ہے۔ جہاں تک دینی فکر ورجحان کا تعلق ہے دوسرے اربابِ اقتدار کے معاملہ میں چودھری محمد علی صاحب پھر غنیمت ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کو یہ بات شاید معلوم ہے کہ چودھری صاحب موصوف اگر چاہتے کہ پاکستان کا دستور دینی اور جمہوری اعتبار سے اس قدر تہی مایہ نہ ہوتا جتنا اب ہے!

امراضِ چشم

"امراضِ چشم معہ ضروری تشریح اور مجرباتِ چشم" از:- ڈاکٹر حکیم محمد فاروق۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات۔
قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ تعمیر انسانیت، موچی دروازہ لاہور۔

اس کتاب میں امراضِ چشم سے بحث کی گئی ہے۔ ان چند عنوانات سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جاسکتا ہے:-

آنکھ کی حفاظت کے اصول ــــ اعصابِ چشم ــــ شرائین وعضلاتِ چشم ــــ طبقاتِ چشم ــــ امراض اور اُن کا علاج ــــ عوارضِ چشم اور مجرباتِ چشم ......!

آنکھ کے امراض کی تشریح کے ساتھ اُس کے اسباب بھی بتائے ہیں اور طریقِ علاج بھی۔ کتاب کے آخری حصہ میں آنکھ کی دواؤں کی تفصیل درج ہے۔ ایک مثال:-

---

سے۔ دص ۱۸، "بڑبڑاتے ہوئے اُونٹ" اونٹ کی آواز کو اُردو میں "بلبلانا" کہتے ہیں۔ (ص ۱۷) "حامی نہ بھری" ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی کتابوں میں "ہامی" لکھا ہے۔

کحل نوشادر:- پھٹکری بریان۔ نوشادر سفید، ہم وزن سرمہ بنالیں اور رات کو سوتے وقت دو سلائی لگائیں۔ شب کوری کے لئے مفید ہے۔

یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید ہے اور زبان سادہ اور عام فہم ہے۔

اقامتِ دین کی ضرورت

از:- مولوی شیدا قادری۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ ۲۰۵ گوجر گلی۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

اس کتاب میں مسلمانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کہ ہمارا مذہبی طبقہ تک اقامتِ دین کے تقاضوں سے کس قدر بے خبر ہے اور اسی بے خبری اور بے نیازی کا یہ سبب ہے کہ نمازوں، روزوں اور اذانوں اور تکبیروں کے باوجود اللہ کا دین غالب نہیں ہونے پاتا۔ یہ کتابچہ اپنے موضوع پر خاصہ اثر انگیز ہے!

قطع الوتین من لشبیر الدین

از:- مولانا عنایت اللہ اثری وزیر آبادی۔ ضخامت سولہ صفحات۔ (بڑا سائز) قیمت صرف دو آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مولوی عبدالرحمٰن صاحب ناظم انجمن اہلِ حدیث، سرکلر روڈ، گجرات۔

اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریروں سے پندرہ سوالات قائم کئے گئے ہیں۔ اور ان کا جواب میاں محمود احمد سے طلب کیا ہے؟ ان سوالات سے مرزا غلام احمد قادیانی کے تضاد، غلط بیانیوں اور جھوٹی پیش گوئیوں کی پول کھلتی ہے کہ اس جھوٹے نبی نے کیسی کیسی غلط باتیں کہی ہیں۔ (لعنۃ اللہ علیہ وعلی ذریاتہ)

ہمارے نبیؐ کے صحابہ

از:- اعجاز الحق قدوسی۔ ضخامت ۱۰۷ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ فلاحِ انسانیت۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے بڑے دلنشین، عام فہم اور شگفتہ انداز میں صحابہ کرامؓ کے اعمال و وظائف۔ مثلاً عبادات، اخلاق، سخاوت، بہادری، انصاف، علم، معاشرت .... کو جمع کیا ہے۔ کتاب کی ایک ایک سطر حرزِ جان بنانے کی مستحق ہے، ایک ایک صفحہ پر اخلاق و پاکیزگی کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ مسلمان گھرانوں میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیئے کہ جب تک ہماری سوسائٹی میں صحابہ کرام کے معاشرے کی جھلک پیدا نہ ہو گی ملت کے مقدر کا ستارہ گردش ہی میں رہے گا! فاضل مؤلف کی یہ کوشش کتنی بامقصد ہے، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

فانوس

از:- شفیق جون پوری۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- دفتر بزم واخبار نئی دنیا جون پور (بھارت)

جناب شفیق جون پوری کے کلام کا تازہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس میں غزلوں کے ساتھ نظمیں، رباعیاں اور قطعات بھی شامل ہیں۔ کتاب کے شروع کے چالیس صفحوں پر خود شاعر کے قلم کا لکھا ہوا مقدمہ پھیلا ہوا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ "مقدمہ" خاصہ وزنی ہے اس سے شاعر کے ادبی اور قومی وسیاسی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

شفیق صاحب نے "فانوس" کو اپنے جواں بخت اور جواں سال بیٹے صلاح الدین مرحوم سے منتسب کیا ہے۔ جوان اور ہونہار بیٹے کی موت نے شفیق کی دنیا ویران کر دی مگر اس صدمہ نے ان کے دل میں کتنا سوز اور گداز پیدا کر دیا۔ جس کی جھلک "فانوس" میں جگہ جگہ نظر آتی ہے!

جناب شفیق کا یہ مجموعہ کلام ان کی قادر الکلامی کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔ وہ نازک سے نازک خیال کی

ترجمانی کرتے ہیں۔ مگر شعر میں اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ زبان کی صحت کا بھی وہ خیال رکھتے ہیں اور الفاظ کا ٹھیک طرح سے برتنا بھی اُن کو آتا ہے۔ اُن کی شاعری قدیم و جدید شاعری کا برزخ ہے۔ شفیق کی غزلوں میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ قصیدے کا سا شکوہ بھی ملتا ہے۔ حُسن و محبّت کی شاعر نے ترجمانی کی ہے۔ مگر۔ ع

دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے!

کی نیچی سطح تک شاعر نہیں اُتر سکا۔ ان چند منتخب شعروں کو پڑھیئے اور لطف اُٹھائیے:۔

چمن میں تازگی پاتے ہیں گل ہائے خزاں دیدہ ‏ ‏ خوشا تیری ہوائے نازلے دامانِ جنیدہ

نہ صراحی نہ سبو اور نہ ساغر دینا ‏ ‏ رندِ خطرے میں ہے ساقی! مجھے خنجر دینا

تُو نے اے پستیٔ ہمت مجھے برباد کیا ‏ ‏ راہ کی دھوپ سے گھبرا کے وطن یاد کیا

ساغر و مینا پہ پھر رونق نہ آئی میرے بعد ‏ ‏ میرے ساقی نے بہت محفل سجائی میرے بعد

بے گناہی خود لیا کرتی ہے اپنا انتقام ‏ ‏ آج تک دُکھتی ہے قاتل کی کلائی میرے بعد

کس نے کہا ہمارے گل و یاسمن نہیں ‏ ‏ کہہ دو کہ ہم نہیں تو بہارِ چمن نہیں

تری چشمِ عنایت کے بہلاے کا تو کیا کہنا ‏ ‏ کئے دیتی ہے دیوانہ نگاہِ بے کرم مجھ کو
گئے وہ دن کہ جب شبنم کے قطروں پر قناعت تھی ‏ ‏ کہ اب اے ذوقِ سیرابی سمندر بھی ہے کم مجھ کو

زہے! وہ رات کہ یادِ حبیب آئی ہو ‏ ‏ دراز اور بھی عمرِ شبِ جُدائی ہو
بچائے کون اسے لے ہوئے دامنِ دوست ‏ ‏ کہ جس چراغ کو تو خود بجھانے آئی ہو

بڑی قیمت پہ بک جاتے ہیں چند آنسو ندامت کے ‏ ‏ جمالِ بیگناہی بن کے چمکا جرمِ بخشیدہ

نہ چھیڑ اے دوست! اب مجھ کو اسی مشکل میں رہنے دے ‏ ‏ نگاہ و دل کا افسانہ نگاہ و دل میں رہنے دے

مسیحا و خضر سے پوچھیئے اُس وقت کی قیمت ‏ ‏ مجاہد جس گھڑی خیمے میں زخموں سے نڈھال آئے

بہار تجھ کو بھی یارانِ صبح پیارے ہیں — کہ یاد آئے نہ آوارگانِ شام کبھی

ہمیں زمانہ کے رُخ پہ چلنا کسی طرح بھی نہیں گوارا — ذرا سنبھل کر قدم اُٹھائے تو آدمی خود زمانہ گر ہے

ہزار عفو کے قابل مری خطا نہ سہی — جب اُن کے لب پہ ہنسی آگئی تو کیا غم ہے

درِ قبول نہیں بند مانگنے والے — دعا کی بے اثری ہے زباں کی بے اثری

قسم ہے ایسی بیداری کو بیداری نہیں کہتے — کہ آنکھیں جاگتی ہوں آدمی کی روح سو جائے

تمہاری جنبشِ دامن کا پوچھنا کیا ہے — ذرا چلو تو بدل دو ہوا زمانے کی

مدت ہوئی آئے تھے وہ کھولے ہوئے گیسو — اب تک در و دیوار سے نکہت نہیں جاتی

پھول کی نکہت سے شکوہ ہے کہ ہوتی ہے جدا — پھول سے پوچھو کہ گنجائش بھی پیراہن میں ہے

جب تک جبیں پہ خاک ترے آستاں کی تھی — میری فتادگی پہ نظر دو جہاں کی تھی

خوشا فصلِ بہار و ہم شبِ ماہ — بدستم جام و یارم در کنارے

دُوسرا رُخ:-

بارے بکارِ آخر جذبۂ اُلفت نواز آیا! — کوئی بیمارِ غم کی نعش پر بہرِ نماز آیا (ص ۵۱)

"جذبۂ الفت نواز" نے اوّل تو شعر میں خاصہ تکلف پیدا کر دیا۔ پھر "بیمارِ غم کی نعش" بھی محلِ غور ہے۔ "پامالِ غم" ہوتا تو یہ کھٹک جاتی رہتی۔

افسوس خزاں جب دُور ہوئی، گلچیں کی نظر مغرور ہوئی — ہم نے تو چمن کو صدیوں کی مسموم ہوا سے پاک کیا (ص ۵۳)

یہ وہ "ابہام" ہے کہ جیسے بس معنی ہی پہناتے رہیئے۔

برافگن پردہ از بابِ حریمِ دلربا روزے — صبا! در اشتیاقِ یک نگاہِ یار می گردم (ص ۶۱)

"صبا" کا مصرعِ ثانی میں بہ رنگِ تعقید آنا، کس قدر اُکھڑا اُکھڑا سا لگتا ہے!

اتنا بھی نظمِ نو میں اضافہ نہ کیجئے — تہذیب چیخ اُٹھے یہ ہمارا چلن نہیں (ص ۶۵)

ایسے سطحی شعر "فانوس" میں ہرگز نہ رہنے چاہیئے تھے۔

تقسیم ہے یہ جنگ تو خامی ہے ظرف کی حد دلیل غیریت انجمن نہیں (ص ۶۴)

آخر یہ کیا بات ہوئی؟ دوسرا مصرعہ تو بالکل بچکانہ ہے!

موت کے نام سے کانپ اٹھتے ہیں دنیا والے کون سمجھائے کہ جینا بھی اہم ہوتا ہے (ص ۸۰)

"اہم" نے پورے شعر کو بے مزہ بنا دیا۔

کلیسا پر نہیں کچھ ختم مسجد ہو کہ بت خانہ جہاں جاؤ وہاں پھیلی ہے جنگِ زرگری آتی (ص ۹۳)

"پھیلی" کی جگہ "برپا" کا محل تھا۔

کوئی تو راستہ محفوظ ہوتا! قفس تک بوئے گل آتی کہاں سے (ص ۹۴)

یہ پہلی بار سننے میں آیا کہ "بوئے گل" کے آنے جانے کے لئے محفوظ راستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کسی خاص مضمون کیلئے خالص استعارہ ہے تو اس میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے۔

ہم آندھیوں سے بھی اپنا وجود منوالیں ذرا درست ہو ترتیب آشیانے کی (ص ۱۰۱)

یہ خیال کس قدر گنجلک اور عجیب ہے!

"فانوس میں نظم کا حصہ بھی جاندار اور وقیع ہے۔ "سچی اشتراکیت" غالباً سب سے اچھی نظم ہے۔ "ہولی" پر ایک قطعہ ہے:-

یار اور آشنا نہیں ملتا دل سے دل برملا نہیں ملتا
کیا کہیں ہم بھی کھیلتے ہولی ہم کو رنگِ وفا نہیں ملتا

"سوباش چندر بوس" پر جو نظم ہے اس کا یہ شعر کس قدر واقعاتی اور اثر انگیز ہے:-

نکلے تو پھر چمن کی طرف رخ نہ کر سکے اتنا بھی بوئے گل کو نہ آزاد کیجئے

افسوس ہے کہ شاعر نے اپنے کلام کے انتخاب کی ذرا سی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ جو اُن کے قلم اور زبان سے نکل گیا ہے اُسے بلفظہ چھاپ دیا گیا ہے۔ انتخاب ہو جاتا تو اس "فانوس" میں روشنی ہی روشنی ہوتی دھواں نہ ہوتا۔ "فانوس" اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے!

ہماری دُنیا

ہماری دُنیا حصہ اوّل۔ ضخامت ۹۶ صفحات قیمت نو آنہ۔ ہماری دُنیا حصہ دوم ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت بارہ آنہ
ہماری دُنیا حصہ سوم۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ دو آنہ۔

یہ تینوں جغرافیہ کی کتابیں ہیں۔ جن کو جناب افضل حسین صاحب ایم اے، ایل ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی ہند نے بالکل جدید اسلوب پر مرتب فرمایا ہے۔ جغرافیہ پر یہ کتابیں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان سے زیادہ دل نشین اور عام فہم کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ زبان تو اس قدر منجھی ہوئی اور شستہ درواں ہے کہ جغرافیہ جیسے خشک موضوع کو باغ و بہار بنا دیا ہے۔ طبعی جغرافیہ کے ساتھ ارضی جغرافیہ بھی ہے۔ ملکوں اور شہروں کے حالات ہیں۔ دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی تفصیل ہے۔ تاریخ کی نادر شخصیتوں کا اجمالی تذکرہ ہے۔ موسم کیوں بدلتے ہیں۔ دن رات کیوں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں؟ اس کو نقشوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ جغرافیہ جیسے مضمون میں دین کا رنگ سمو دیا ہے۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے طالب علم صرف جغرافیہ ہی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور خلاقیت

کا یقین محکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۱۰ (حصہ سوم) پر ہندوستان کے کاغذ کے ملوں کا جو تذکرہ ہے اُس میں دکن کے کاغذ کے بہت بڑے کارخانہ (سرپور ٹانڈور پیپر مل) کا نام چھوٹ گیا۔

صفحہ ۱۷۱ (حصہ سوم) پر ابن بطوطہ کے وطن کا نام تنجیر لکھا ہے۔ یہ نام تنجیر نہیں غالباً طنجہ ہے!

ان کتابوں کی ترتیب و تالیف پر فاضل مؤلف تعلیمی دُنیا کی طرف سے سپاس و تشکر کے مستحق ہیں۔ ان کتابوں نے حقیقت میں "علم جغرافیہ" کی سطح کو بلند کر دیا ہے۔ مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند، رام پور (یوپی) سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں۔

رحمان پرنٹنگ پریس کراچی

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۶

فاران

ستمبر ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

قرآنِ پاک پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن ـــ نُور ہے، شفا ہے، عدل کی ترازو ہے، ہدایت و رحمت ہے، نصیحت و بشارت ہے اور حق کو باطل سے جُدا کرنے والا ہے ـــ اور یہ صرف "صحیفۂ تبریک" ہی نہیں ہے، مکمل ترین ضابطۂ حیات اور منشورِ اخلاق و اعمال بھی ہے، اسی سرچشمہ سے ہدایت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور اسی آفتاب سے سب روشنی پاتے ہیں۔ اس مقدس کتاب کا ایک ایک حرف حق ہے، جس میں کسی قسم کا تذبذب نہیں۔ یہی اور صرف یہی وہ الہامی کتاب ہے جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک جن حرفوں اور لفظوں میں نازل ہوا تھا، ہُو بہُو اور حرف بہ حرف اُسی اپنی شکل و صورت میں موجود ہے۔ اس میں ایک شوشہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی! دُنیا کی کوئی کتاب، کوئی مصحف کوئی مجلّد قرآن کریم کی طرح "لاریب فیہ" نہیں ہے!

قرآن، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین اسلوب پر نازل کیا گیا ہے، ایسے اسلوب پر جس کی ایک آیت کی بھی نقل کرنا اور مثال لانا ممکن نہیں، مگر وہ "شعر" نہیں ہے۔ اس میں غیب کی باتوں کی بھی خبر دی گئی ہے، مگر وہ "کہانت" نہیں ہے، اُس میں قصّے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مگر وہ "افسانہ" نہیں ہے۔ اور وہ اس لئے کہ کاہن، افسانہ نگار، قصّہ گو اور شعراء بہت سی باتیں اپنے دل سے بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ خیالی تیر تُکّے لڑانا اُن کا شیوہ ہوتا ہے۔ اصلیت اور حقیقت پر جب تک نزاکتِ خیال اور جدّتِ فکر کا رنگ و روغن نہ ہو، اُن کا کوئی کارنامہ "آرٹ" نہیں بن سکتا۔ مگر قرآنِ پاک میں ذرّہ برابر ظن و تخمین اور خیال آرائی نہیں۔ اس کی ایک ایک آیت اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جا سکتے ہیں، مگر قرآن کی پیش کی ہوئی کسی حقیقت کو جنبش نہیں دی جا سکتی! جو نظام ہائے حیات اور علوم و فنون قرآنی تعلیمات سے

دُور ہیں، وہ حقیقت میں فوز و فلاح سے دُور اور خسران و گمرہی سے قریب تر ہیں!

شاعروں کے کلام کے ساتھ تو یہ معاملہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے کہ اپنے ذوق اور پسند کے شعر لوگ چن لیتے ہیں اور باقی اشعار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے مگر قرآن کے ساتھ کوئی مسلمان یہ سلوک نہیں کر سکتا کہ جو باتیں اُسے اچھی معلوم ہوں اور سہل العمل نظر آئیں اُن کو تو وہ قبول کر لے بلکہ اُن پر جمے رہنے ہی کو "عین دین" سمجھے اور قرآن کے دُوسرے احکام اور تقاضوں کو پسِ پشت ڈال دے! قرآن کے احکام و اوامر کی تعمیل و اطاعت کا تعلق فرد و جماعت کے ذوق، وجدان اور رجحان سے نہیں ہے۔ قرآن کا کوئی حکم چاہے کسی کے ذوقِ طبیعت اور مزاج پر کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے اس کی تعمیل بہرحال کرنی ہوگی اور مزاج و طبیعت کو قرآنی اوامر و احکام کے مطابق بنانا ہوگا۔

نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی طرح "جہاد" بھی اہلِ ایمان پر فرض کیا گیا ہے۔ اس لئے روحِ جہاد کا مسلمانوں میں نہ صرف یہ کہ باقی بلکہ تازہ رہنا ضروری ہے۔ اب اگر کوئی مذہبی جماعت مسلمانوں کے فکر و خیال اور کردار و عمل کی اس نہج پر تربیت کرے کہ "جذبہ جہاد" کی پرچھائیں بھی اُس کے تربیتی پروگرام پر نہ پڑنے پائے اور اس معاملہ میں یہاں تک احتیاط برتی جائے کہ کسی "منکر" کو ہوتے دیکھ کر اُس جماعت کے ارکان "منکر" کو ٹوکنے اور اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے تک کو سیاست اور دُنیاداری کا کام سمجھیں، تو ایسی جماعت کے تربیت کئے ہوئے افراد اللہ کے دین کو غالب کرنے میں کس حد تک مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں؟ وہ صالحیت جس میں غلبۂ دین کا جذبہ اور جہاد کی خُوبو نہ ہو رہبانیت سے کس قدر قریب تر ہے!

قرآنِ پاک میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے بعد سب سے زیادہ تفصیل حضرت سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات و حالات کی ملتی ہے۔ قرآن اس پر شاہد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف عبادت گاہوں تک ہی تبلیغِ دین کو محدود نہیں رکھا اور عوام کے مجمعوں پر ہی حق پیش کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ آپ نے وقت کے سب سے بڑے باجبروت بادشاہ کے دربار میں جا کر باطل کو دعوتِ مقابلہ دی۔ پھر اقامتِ دین کا یہی تقاضا فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں "ضربِ کلیمی" کا فرض انجام دیتا ہوا نظر آتا ہے! وقت کے فرعونوں کو ٹوکنا بلکہ اُن سے مجادلہ کرنا اور باطل کی قوت کا جواب حق کی طاقت سے دینا۔ یہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آئے ہوئے اُن واقعات و حالات کا خلاصہ جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر قرآن نے تفصیل کیساتھ کیا ہے! اور قرآن حضرت خلیلؑ کا پہلا تعارف اس طرح کراتا ہے کہ آپ بُت پرستی کی صرف زبانی مذمت و تردید اور توحید کی لفظی تبلیغ ہی کا حصار باندھ کر نہیں بیٹھ جاتے۔ آپ بت خانہ میں پہنچتے ہیں اور دستِ خلیلؑ پُوری قوت کے ساتھ بُت شکنی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پُوری قوم ایک طرف ہے اور یہ مردِ مجاہد ایک طرف ہے! بُت خانہ کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور توحید کا یہ علمبردار قصرِ شاہی میں خود شہنشاہ سے دو بدو مجادلہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی قوتِ استدلال اور عزمِ بیباک کے آگے کفر حیران و ششدر رہ جاتا ہے! اور پھر ـــــ کفر و باطل کی قوتیں ظلم و ستم پر اُتر آتی ہیں۔ مزاجِ شاہانہ برہم ہو جاتا ہے اور باطل پرست قوم حق کی اس آواز کو نہ صرف یہ کہ دبانا بلکہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہتی ہے!

وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قبائے خُلت پہنائی تھی اور جس سے زیادہ معزز آدمی اُس وقت کی دُنیا میں کوئی دُوسرا نہ تھا۔ اُس کے لئے آتش کدہ بھڑکایا جاتا ہے! بڑا سخت امتحان تھا، سو فیصدی جان جانے کا خطرہ ہی نہیں بلکہ پُورا یقین۔ مگر اللہ کا یہ بندہ اور رسُول کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لئے بے خطر آگ میں کود پڑا!

زمانہ کے جابر حاکموں کو ٹوکنا۔ "منکر" کو قوت سے مٹانا اور حق کی خاطر ہر طرح کے خطرے سے دوچار ہونا ــــ یہ ہے "انبیائی تعلیم"۔ "انبیائی کردار" اور "انبیائی طریقِ تبلیغ"! مضمون نگار اپنی طرف سے یہ نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ قرآن کا بیان ہے، یہ کلامِ الٰہی کی شہادت ہے اور یہ وہ حقیقت محکم ہے جس میں دُو رائیں نہیں ہوسکتیں!

قرآن پاک میں حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کا ذکر بھی کافی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے اور اُس میں قرآن پڑھنے والے کو یہ نظر آتا ہے کہ حکومتِ مصر کے تختِ اقتدار پر حضرت یوسفؑ جلوہ افروز ہیں اور تمام اختیارات کی کُنجیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ قرآن ہی اس کی شہادت بھی دیتا ہے کہ حضرت سیدنا داؤدؑ اور حضرت سیدنا سلیمان علیہما السلام نے نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت بھی کی ہے۔ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:۔

يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ......

اے داؤدؑ! ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے! (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ)

قرآن پاک ہی اللہ کی زمین کو "صالحین" کی ملکیت قرار دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین کے غلبہ کی خاطر کافروں سے جنگیں کی ہیں، قوموں کو حلیف اور معاہد بنایا ہے۔ بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی ہے مجرموں پر حدود جاری کی ہیں، مالِ غنیمت تقسیم فرمایا ہے۔ سفارت کے آداب اور صلح و جنگ کے اصول ہوں یا تجارت و زراعت کے اخلاقی حدود، غرض حکومت و معیشت کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس پر حضورؐ کی طرف سے کوئی ہدایت موجود نہ ہو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کے مؤسس بھی تھے اور حاکم اعلیٰ بھی تھے۔ اور اپنے بعد حضورؐ نے ایک ایسی منظم حکومت کو چھوڑا جس کے طول و عرض پر اسلامی نظام کا غلبہ اور تسلط تھا اور جہاں کتاب و سنت کا قانون چلتا تھا۔ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر اسلام کا مزاج شناس اور صاحبِ زہد و تقویٰ اور کون ہوسکتا ہے۔ اگر حکومت دُنیا داری کا کام ہوتی اور دین سے اس کا کوئی علاقہ نہ ہوتا۔ تو صحابہ کرام حکومت سے علیحدگی اختیار فرما لیتے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اسلامی حکومت کا کاروبار عبادت سمجھ کر چلایا ہے اور اُن کی عزیمت نے اسلامی حکومت کی حدود کو وسیع سے وسیع تر بنایا ہے!

یہ جمود!

اگر کوئی مذہبی جماعت اس انداز پر لوگوں کے ذہن و فکر کی تربیت کرے کہ یہ لوگ سیاست و حکومت کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھتے رہیں اور اللہ کے دین کے غلبہ کی خاطر اسلامی حکومت کے قیام کی تڑپ اُن کے اندر پیدا نہ ہو۔ نظامِ کفر کے بدلنے کے لئے تیاری کرنا اُن کے نزدیک دُنیاداری کا کام ہو اور اسلام کے بڑے سے بڑے شعائر کی پامالی پر اُن کی زبانوں سے شکوہ و احتجاج کا ایک لفظ بھی نہ نکلے۔ تو قیامت کے دن یہ دیندار لوگ دین کی اتنی بڑی کوتاہیوں پر کیا یہ معذرت پیش کر کے چھُوٹ جائیں گے کہ فلاں بزرگ نے ہمیں تبلیغ دین کا یہی طریقہ بتایا تھا اور فلاں "حضرت جی" پر اسی قسم کے انکشافات ہوئے تھے!

کیا اس معذرت کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہا جائے گا کہ ہم نے قرآن کے ذریعہ بتا دیا تھا کہ اقامتِ دین کا یہ طریقہ ہے۔ اپنے نبیوں کی زندگیاں ہم نے تمہارے سامنے پیش کر دی تھیں۔ تاکہ وہ تمہارے لئے نمونہ اور مثال بن سکیں۔

ان ہدایتوں، نمونوں اور زندگیوں کو چھوڑ کر "بزرگوں" کے طریقوں پر چل پڑنا اور انہی طریقوں کو "اللہ کا راستہ" سمجھ لینا، کیا تمہارے لئے زیبا تھا جبکہ تم کتاب و سنت ہی کو حق و باطل کا آخری معیار سمجھتے تھے! اُحد کے میدانِ جنگ میں تمہارے نبی کا چہرہ لہولہان ہوا تھا۔ حق و باطل کے کسی معرکہ میں تمہارے پاؤں پر کوئی خراش بھی آئی؟ ہم نے اپنے دین کو مکمل فرما کر اور ہدایت و فلاح کے تمام طریقے بتا کر محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نبوت کو ختم فرما دیا تھا اور وحی کے سلسلہ کو بند کر دیا تھا۔ پھر کسی بزرگ کے ذاتی انکشاف کو اتنی اہمیت دے دینا کتنی بڑی زیادتی تھی کہ "سبیل اللہ" کی بے پناہ وسعتوں کو بس تبلیغ نماز کے سفر اور گشت تک محدود کر دیا جائے۔ تمہاری یہ کوشش ہماری راہ میں "ایک قدم" تھا۔ یہ منزل نہ تھی اور وہ مسافر بڑا ہی نادان اور آرام طلب ہے جو ایک دو قدم چل کر ہی یہ سمجھ بیٹھے کہ اس منزل کی مسافت بس اتنی ہی ہے!

جو لوگ "اقامتِ دین" کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں اور چند اوامر و معروف ہی کو "کُل دین" اور "روحِ اسلام" سمجھے ہوئے ہیں اور اس اپنے کھینچے ہوئے حصار سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔ اُن سے قیامت کے دن اسی قسم کی باز پرس ہوگی جس کی ایک جھلک اوپر پیش کی گئی ہے!

نہ جانے یہ کس قسم کی دینداری ہے جو مسجد سے باہر کی دُنیا پر نظر ڈالنے کو دُنیا داری کا کام سمجھتی ہے۔ کسی بزرگ پر اس قسم کی تنگ و محدود دین داری (؟) کا انکشاف ہوا ہو تو ہوا ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں تو ہم کو یہ ملتا ہے کہ اسلامی سلطنت کے حدود پر دشمنوں کی فوج کے جمع ہونے کی خبر سُن کر حضورؐ، صحابہ کرام کے جرار لشکر کو لے کر تبوک جا پہنچتے ہیں اور اہلِ ایمان کے قشونِ قاہرہ کو دیکھ کر دشمنوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ آج خود اللہ کا دین نرغے میں ہے، اس پر شبخون مارے جا رہے ہیں، اس کی مدافعت کے لئے جس حوصلے جس عزیمت، جس جوش اور جس حرکت کی ضرورت ہے جب وہ کسی جماعت کے نظامِ عمل ہی میں شامل نہ ہو، اُس کی پرچھائیں سے بھی لوگوں کے ذہن و فکر کو دُور رکھنے کی کوشش کی جائے تو یہ روش، یہ اندازِ فکر اور یہ طریقۂ تبلیغ کیا دین کی مظلومیت کو کم کر رہا ہے...... یا......!

"اکرامِ مُسلم" کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم مگر صرف "اکرامِ مُسلم" ہی مُسلمِ مظلوم کی حمایت اور معاونت نہیں! جن دین دار لوگوں نے "اکرامِ مسلم" کو نمایاں طور پر اپنے نظامِ عمل کا جزو بنایا ہے۔ جب اُن کی طرف سے مراکش و الجزائر کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں کوئی آواز بلند نہیں ہوتی اور اس قسم کے جماعتی احتجاج سے گریز کیا جاتا ہے کہ یہ سب سیاست کی باتیں ہیں ___ تو پھر دماغ سوچنے لگتا ہے اور دل لہولہو ہو جاتا ہے کہ یہ کیسا "اکرامِ مُسلم" ہے جس نے اسلامی اخوت کے رشتہ کو استوار کرنے کے بجائے اُسے اتنا ڈھیلا بنا دیا ہے۔ حکم یہ دیا گیا تھا کہ مشرق کے مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چُبھے تو اس کی کھٹک مغرب کے مُسلمان کو محسوس کرنی چاہیئے۔ مگر یہ عجیب قسم کا "اکرامِ مُسلم" ہے کہ مسلمان کافروں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں اور مسلم آبادیوں پر دھڑا دھڑ بم باری ہو رہی ہے مگر دین داروں کی ایک جماعت ہے کہ مسلمانوں کی اس قتل و تباہی اور مظلومیت کا نوٹس تک نہیں لیتی اور احتجاج کے گمگشتہ طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ بھی استعمال نہیں کرتی!

مشرقِ وسطیٰ کی سب سے زیادہ فعال دینی جماعت (اخوان المسلمین) پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور اُن کو "اقامتِ دین" کے جُرم میں لرزہ براندام عقوبتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مگر تہجد گزاروں اور تسبیح خوانوں کی اس جماعت میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ کیا عبد القادر عودہ اور فرغلی کا خونِ ناحق اور سید قطب اور ہضیبی کی مظلومیت اسی

قابل تھی کہ وہ "اکرامِ مسلم" کی بے حسی اور جمود کی نذر ہو کر رہ جائے!

تسبیح و تہلیل اور اللہ کا ذکر بہت اچھی چیز ہے، ہر مسلمان کی زبان اس سے تر رہنی چاہیئے۔ مگر "ذکر اللہ" مسلمان کے قلب کو بے حس نہیں حسّاس بناتا ہے۔ جامد نہیں متحرک کرتا ہے۔ اس میں انفعالیت نہیں عزیمت کے جذبہ کو ابھارتا ہے اگر "ذکر اللہ" کے بعد کسی مسلمان کے قلب کی ایسی حالت ہو جائے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مظلومیت کی خبریں سُن کر اُس میں کوئی اضطراب ہی پیدا نہ ہو۔ تو پھر یہ "ذکر اللہ" نہیں بلکہ ایک غفلت ہے جو اُس پر طاری ہو گئی ہے اور ایک بیماری ہے جو اُس کے دل کو لگ چکی ہے، جسے اس نے شفا سمجھ رکھا ہے!

نماز کو تعدیلِ ارکان اور حضورِ قلب ہی کے ساتھ پڑھنا چاہیئے۔ نماز کی درستی کے لئے جدوجہد بہت بڑی نیکی ہے۔ مگر نماز کی درستی کے بعد قلب کی اگر ایسی حالت ہو جائے کہ نظامِ کفر کے غلبہ کو دیکھ کر اس کو بدلنے کا کوئی داعیہ ہی قلب کے اندر پیدا نہ ہو۔ کفر کی عدالتوں کے فیصلوں پر دل مطمئن رہے اور کتاب و سنّت کو عملی طور پر قائم کرنے کے لئے سرے سے دوڑ دھوپ ہی نہ کی جائے تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ نماز درست نہیں ناقص ہے اور اگر درست ہے تو پھر تنہا نماز کی درستی ان دینی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کر سکتی۔ کوئی اگر زکوٰۃ نہ دے، روزے نہ رکھے اور فریضۂ حج ادا نہ کرے تو نماز سے ان کوتاہیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اقامتِ دین کے لئے جدوجہد نہ کرکے کوئی اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے کہ نماز اتنی بڑی غفلت اور کوتاہی کی تلافی کر دے گی، تو یہ اس کی بہت بڑی بھول ہے! — نماز اُن کی درست تھی اور وہ صلوٰۃ کے اثرات اور نتائج کو پہچانتے تھے کہ جو راتوں کے راہب اور دن کے شہسوار تھے اور جن کی عزیمت نے روم و مدائن کی باطل حکومتوں کے دھوئیں اُڑا دیئے تھے۔ اور جنہوں نے سیاست و حکومت کو اقامتِ دین کا ذریعہ بنا کر دُنیا پر یہ حقیقت منکشف کر دی تھی کہ اسلام میں یہ دوعملی نہیں ہے کہ قیصر کو قیصر کا حصّہ اور کلیسا کو کلیسا کا حصّہ دیا جائے۔ اسلام اپنے مزاج سے ایک وحدت ہے جس کا کوئی جُزو دوسرے جُزو سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ مال میں نجاست ہے، نہ سیاست پلید ہے اور نہ حکومت ناپاک چیز ہے۔ ان کو اقامتِ دین کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ تمام چیزیں سراپا نظافت و طہارت ہیں! خود انبیاء کرام نے نبوت اور تزکیۂ نفس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چلایا ہے۔ اسلامی حکومت تو اللہ کے دین کے غلبہ کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر اور محسوس شہادت ہے!

یقیناً مال و حکومت میں خطرے بھی ہیں، مگر انہی خطروں اور آزمائشوں ہی سے گزارنا تو مشیت کا مقصود ہے۔ جن لوگوں نے مال و حکومت کا غلط طور پر استعمال کیا ہے اُن کی اس غلط کاری کے سبب مال و حکومت نجس اور ناپاک تو نہیں ہو گئے؟ اگر کوئی نادان تلوار سے اپنی گردن کاٹ لے تو کیا تلوار کا استعمال ہی ہمیشہ کے لئے ممنوع ٹھہرا دیا جائے گا۔ اور جس کے ہاتھ میں تلوار ہو گی اُسے دیکھ کر یہی قیاس کیا جائے گا کہ یہ شخص لازماً خودکشی کر کے ہی رہے گا اور تلوار بس "آلۂ خودکشی" کے سوا اور کچھ نہیں ہے!

حرفِ آخر

ہم قوتوں کے تناسب اور ظروف و حالات کی تدریج اور اس کی نوعیتوں کے منکر نہیں ہیں۔ "منکر" کو قوت سے بھی بدلا جا سکتا ہے۔ زبان سے بھی بُرا کہا جا سکتا ہے۔ اور دل میں بھی بُرا سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ آخری درجہ سب سے پست درجہ ہے۔ جو کوئی حالات کے سبب اس پستی میں مبتلا ہو جائے، اُسے

دُوسرے درجہ تک پہنچنے کی جدو جہد کرنی ضروری ہے۔ اور جو دُوسرے درجہ میں ہو اس کا فرض ہے کہ "منکر" کو بدلنے کے لئے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرے! ہمارا روئے سخن اس تعلیم و تربیت کی طرف ہے جو مومن کو "ضعفِ ایمان" کے تیسرے درجہ میں ہی سدا رہنے دے اور اُسے اس پستی سے نکلنے کے لئے تیار ہی نہ کرے!

مکی زندگی کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے، شعب ابی طالب کی سختیاں بھی اپنی جگہ مسلّم ہیں مگر اسلام کو غلبہ مدنی زندگی کے ذریعہ حاصل ہوا۔ مدینہ میں پہنچکر حالات سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا گیا۔ یہاں تک کہ مردانِ مجاہد نے لات و ہبل کی جھوٹی خدائی کے ساتھ صنادید قریش کے زور کو بھی توڑ مروڑ کر رکھ دیا!

حق و صداقت کی شاہراہ صفہ سے گزر کر بدر و اُحد اور فتح مکہ تک پہنچی ہے۔ کوئی جماعت صفہ پر پہنچ کر ہی پڑاؤ ڈال دے اور بدر و اُحد کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرے تو یہ اس کی آرام طلبی اور سہولت پسندی ہے! اصحاب صفہ کے ساتھ اصحاب بدر و حنین بھی تیار کیجئے، یا کم سے کم اُن لوگوں سے بیزاری اور برأت بلکہ نفرت کا اظہار تو نہ فرمائیے جن کے پاؤں بدر و اُحد کی راہ میں غبار آلود ہو رہے ہیں۔ آپ میں اگر عزیمت کی کمی ہے تو صاحبانِ عزیمت پر سیاست بازی اور دُنیا داری کی پھبتیاں تو چست نہ کیجئے۔ دُنیا میں اس کا ڈھنڈورا تو پیٹئے کہ اصحابِ صفہ اور اصحابِ بدر و حنین میں نظریات کا شدید اختلاف ہے!

فراستِ مومن یقیناً حالات کا اندازہ کر کے اہتمام کار اور تدبیر امر کرتی ہے۔ امریکہ میں تبلیغ نہ جانے کتنے دن تک کلمہ پڑھانے، نماز روزے کی تعلیم اور نیکیوں کی تلقین تک ہی محدود رہے گی۔ ہندوستان میں جہاں چار کروڑ مسلمان بستے ہیں وہاں تبلیغ کا انداز اس حد سے آگے بڑھ کر ہوگا۔ اور پاکستان اور انڈونیشیا میں جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے وہاں تبلیغ حق میں فعالیت کا رنگ غالب ہوگا۔ اور اقامتِ دین کے لئے ہر ممکن تدبیر اور طاقت سے کام لیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی جماعت تبلیغ کا ایسا پروگرام بنا دے جو مسلمانوں کی قلّتِ تعداد کی کمزوری اور کثرتِ تعداد کی قوّت میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہ کرے، ہر ماحول کے لئے ایک ہی اندازِ تبلیغ اور ایک ہی اسلوبِ تربیت" تو ایسی جماعت کی بدولت "اقامتِ دین" کے کیسے کیسے موزوں مواقع ضائع ہو جائیں گے اور اُمت پر نہ جانے کب تک مظلومیت کی گھٹائیں چھائی رہیں گی!

پاکستان میں برسوں منظم کشمکش جاری رہی ہے کہ یہاں لادینی حکومت قائم ہو یا اسلامی حکومت! مگر ایک مذہبی جماعت نے دین کے اتنے عظیم الشان کام کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ وہ اس کشمکش سے اس طرح الگ تھلگ رہی ہے جیسے یہ کوئی گندہ کام اور ناپاک تحریک ہے جس سے دامن کشاں رہنا ہی زہد و تقویٰ کا تقاضا ہے۔ حال ہی میں عائلی کمیشن نے نکاح و طلاق کے مسائل میں کتاب و سنّت کے بنیادی اصولوں تک کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ مگر ایک مذہبی جماعت ہے کہ دینی قدروں کی اس پامالی کو سرے سے قابلِ اعتناد اور لائق توجہ ہی نہیں سمجھتی! اُس کے پاس تو بس ایک پروگرام ہے۔ جس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ میوات ہو، راجستھان ہو، مصر و شام اور نجد و حجاز ہوں یا پاکستان ہو۔ اُن کا پروگرام ہر جگہ کے لئے ایک ہی ہے، حالات کا چاہے کوئی تقاضا ہو، واقعات کسی رُخ پر کیوں نہ جا رہے ہوں۔ حق و باطل کے درمیان کیسی ہی شدید کشمکش برپا ہو۔ اس جماعت کا طریق کار نہیں بدل سکتا! جن بزرگوں نے اپنے ذاتی انکشافات کی بنیاد پر لوگوں کو دین داری کی اس تنگ و محدود راہ پر ڈال دیا ہو۔ کیا قیامت کے دن اُن سے ان کوتاہیوں کی باز پرس نہ ہو گی؟

دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت کے پاس تسبیح و تہلیل کی زیادتی ہے اور وہ نماز حُسن و خوبی کیساتھ ادا کرتی ہے اور فواحش و معاصی سے بچی رہتی ہے۔ بس یہی اس کی کائنات ہے۔ "اقامتِ دین" کی جدوجہد اُس کے پروگرام میں شامل نہیں ہے، یا یُوں سمجھئے کہ نماز روزے کی تبلیغ و ادائیگی ہی کو اُس نے اقامتِ دین سمجھ رکھا ہے۔ دُوسری جماعت کے پاس تسبیح و تہلیل کی اتنی کثرت نہیں ہے اور بر سبیلِ تنزل اس کو مان لیا جائے کہ یہ جماعت نماز تو پُوری پابندی کیساتھ ادا کرتی ہے مگر پہلی جماعت کے مقابلہ میں اُس حُسن و خوبی کے ساتھ ادا نہیں کرتی۔ فواحش و معاصی سے بھی وہ مُجتنب ہے مگر اس کے علاوہ "اقامتِ دین" اس کی جدوجہد کا موضوع ہے۔ وہ اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ کفر و باطل کی جگہ اسلامی نظام قائم ہو۔ منبر و محراب سے لے کر بازاروں، دانش گاہوں اور قصر و ایوان تک کتاب و سنّت کا قانون چلے۔ حکومتوں کی زمامِ کار فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں سے نکل کر صالحین کے دستِ حق پرست میں آجائے، یہ جماعت تقریر و تحریر، شعر و افسانہ، معیشت و اقتصاد اور فلسفہ و دانش کے ہر محاذ پر باطل کا مقابلہ کر رہی ہے!

پہلی جماعت کے پاس نماز روزے کا حُسنِ اہتمام ہے مگر "اقامتِ دین" کی جدوجہد سرے سے ہے ہی نہیں۔ دُوسری جماعت کے پاس نماز روزے کی پابندی تو ہے مگر پہلی جماعت کے برابر حُسنِ اہتمام نہیں ہے لیکن اس کیساتھ "اقامتِ دین" کی جدوجہد میں وہ مقدمۃ الجیش بنی ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں کونسی جماعت دین کیلئے زیادہ مفید ہے، کس کے یہاں کس صفت کی کتنی کمی ہے اور کس کے یہاں کس چیز کا فقدان ہے!

دو دینی جماعتیں ہیں جن کے ارکان شراب کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ شراب نوشی سے مجتنب بھی رہتے ہیں۔ دوسری جماعت صرف شراب سے اجتناب ہی پر قانع اور مطمئن نہیں ہے، وہ اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ شراب نوشی کو قانون اور طاقت کے ذریعہ بند کرادیا جائے۔ دُنیا فیصلہ کرسکتی ہے کہ کس جماعت سے اخلاق، نیکوکاری اور اسلام کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دُوسرے اوامر و نواہی پر بس اسی طرح قیاس کرلیا جائے تو دونوں جماعتوں کا مُرقع مکمل کر سامنے آسکتا ہے!

اب رہا روحانیت اور مجاہدۂ نفس کا معاملہ تو خدا کے وہ صاحبِ عزیمت بندے جو محض حق پرستی کی پاداش میں پھانسی گھر تک دیکھ چکے ہوں اور سزائے موت سن کر جن کی پیشانیوں پر شکن تک نہ آئی ہو۔ اگر صاحبِ روحانیت اور اہلِ دل نہیں بن سکتے تو پھر رُوحانیت ایک عنقا صفت حقیقت کا نام ہے کہ اسم تو موجود ہے مگر مُسمّیٰ کا کہیں پتہ نہیں!

ہم میں فرشتہ کوئی بھی نہیں ہے، کسی میں کوئی نہ کوئی خامی اور کوتاہی ضرور پائی جاتی ہے۔ ان سطور کا راقم سب سے پہلے اپنی کوتاہیوں اور نقص کی دراز دستیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ کوتاہی اور خامی کو حُسن و خوبی اور کمال سمجھنا یہ نفس کا بہت بڑا خطرناک فریب ہے!

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ جو نیک ہیں انھیں نیکی کو قائم کرنے کی توفیق بھی عطا ہو اور جو نیکی کو قائم کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنے نفسوں سے غافل نہ رہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ!

ماہر القادری

۱۳ اگست ۱۹۵۶ء

سید عبدالقدوس ہاشمی

چین اور مذہب

ایک طالب علم کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف نظریاتِ زندگی کو اگر موقع مل سکے تو عملی شکل میں بھی ضرور مطالعہ کرے اس کے بغیر کسی نظریہ کی خوبیوں اور خرابیوں کا اکثر حصہ آنکھوں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ میں نے مطلق العنان شاہی، محدود شاہی، پارلیمانی طرز حکومت، جمہوریت اور عمومیت کو یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں برسرکار دیکھا تھا۔ لیکن یہ شوق ایک مدت سے موجود تھا کہ کیمونسٹ نظریۂ حیات کو بھی عملی شکل میں دیکھوں۔ یہی شوق تھا کہ جب مجھے جمعیۃ اسلامیہ چین کی طرف سے چین آکر وہاں کی سیر کرنے کے لئے دعوت دی گئی تو میں نے فوراً قبول کر لیا۔ حالانکہ میرے جیسے غریب اور روزی کمانے والے مشغول آدمی کے لئے اتنے طویل سفر کی فرصت پیدا کر لینا کچھ آسان کام نہ تھا۔

بہر حال میں ۹۔ مئی ۱۹۵۶ء کو بذریعہ طیارہ کراچی سے براہ ہانگ کانگ کیمونسٹ چین کو روانہ ہوا۔ اور ۱۲۔ جون کو واپس کراچی پہنچا۔ اس مدت میں چین کے وسیع ملک میں پوری طرح دیکھنے اور سمجھنے کا دعویٰ تو کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں! جنوب سے شمال مغرب تک چین کو تقریباً عبور ضرور کر لیا۔ آٹھ مشہور شہر دیکھے اور دو تین دیہاتوں کی سیر کی۔ جمعیۃ اسلامیہ چین اور حکومت چین نے ہمارے لئے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کیں۔ بڑی پُرتپاک میزبانی رہی۔ اس کے لئے ہم صمیم قلب سے شکر گزار ہیں۔ چینی زبان سے ناواقفیت نے سرکاری ترجمان کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے کانوں کو وہ آسانی میسر نہ تھی جو آنکھوں کو حاصل تھی۔ لیکن یہ شکوہ بیجا ہوگا کہ آزادی کے ساتھ مطالعہ کا موقع حاصل نہ تھا۔ ہم بازاروں میں جاتے تھے اور ہمیں کوئی نہ روکتا تھا۔ کچھ مقامات وہ دکھانے پر اصرار ضرور کرتے تھے۔ لیکن ہم جو دیکھنا چاہیں اس کے دکھانے سے وہ انکار نہ کرتے تھے۔

شہری آزادیاں

کسی کیمونسٹ نظام میں جمہوری ممالک کی طرح شہری آزادیاں نہیں ہوا کرتی ہیں۔ نہ جلسوں اور جلوسوں کی آزادی، نہ ہڑتال اور اسٹرائیکوں کی۔ نہ پریس اور پلیٹ فارم کی۔ نہ تحریر، تقریر، اظہار رائے اور نہ ریڈیو کے ذریعہ خبریں حاصل کرنے کی۔ ملک کے دستور اساسی میں چاہے یہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہو۔ مگر عملاً نہ کوئی غیر سرکاری اخبار ہوتا ہے اور نہ کوئی ادارہ، نہ سفر و مہاجرت کی آزادی ہوتی ہے اور نہ اختیارِ پیشہ کی۔ اس لئے یہ شکایت ایک قسم کی تحصیل حاصل ہے کہ چین بھی اسی طریقۂ کار کا پابند ہے۔ وہ ایک کیمونسٹ ملک ہے۔

جو لوگ علمی اور عملی صورت میں کیمونزم کو سمجھنے پر کافی وقت صرف نہیں کرتے۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ کیمونزم صرف ایک معاشی نظریہ یا معاشی نظام ہے۔ اس کا جوڑ کسی دوسرے نظریۂ حیات کے ساتھ بھی لگایا جا سکتا ہے، لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ کیمونزم ایک مربوط نظام زندگی ہے جو سوشلسٹ سوسائٹی پیدا کرنے کے لئے زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتا ہے۔ اعمال پر بھی اور عقائد پر بھی۔ یہ زندگی کی ایک ایسی تعبیر ہے جو انسانی زندگی کو عالم محسوس سے باہر

کی طرف سے بالکلیہ نابینا بنا دیتی ہے۔ نہ جذباتِ روحانی کے لئے اس میں کوئی گنجائش ہوتی ہے اور بعد الطبیعات و بعد الممات کے کسی فکر و نظر کی۔ یہ نظام فوری طور پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایک ایسی قوم پیدا کر دیتا ہے جو زندگی کی اس تعبیر کو بطور عقیدہ قبول کر لیتی ہے اور شدت کے ساتھ ان تمام آثار و اعمال کو مٹا دیتی ہے جو روحانی و ما بعد الطبیعاتی تعبیرات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ نظام یکا یک کہیں قائم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایک یا دو نسل اس کے پوری طرح رُو بہ عمل آنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔

چین میں ابھی یہ نظام اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ اس لئے روس سے جہاں سنہ ۱۹۱۷ء سے اس کا راج ہے مختلف شکل رکھتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف طریقۂ کار اور عبوری دَور کا اختلاف ہے۔ منزلِ مقصود کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چین میں بھی تعلیم و تربیت جبری ہے اور تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت مارکس کے نظریہ کو حاصل ہے۔ خدا سے بیزاری، اور مذہب سے انکار کو ہر تعلیم گاہ اور ہر تربیتی ادارہ میں اوّلین و اہم ترین مقام حاصل ہے۔ مارکس، اینجلز، ماؤ، لینن اور اسٹالن کی بڑی بڑی شاندار تصاویر اور تمثالوں سے ہر ادارہ مزین ہے۔ اور اندرون مسجد کے سوا کوئی جگہ حتیٰ کہ مسجد سے ملحق مکتب بھی ان تصاویر سے خالی نظر نہیں آتے۔

چین کے معاشی و معاشرتی حالات ایک الگ مقالہ کے متقاضی ہیں۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں میں صرف ایک موضوع کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ موضوع ہے "چین اور مذہب"۔ اصل موضوع سے پہلے چند الفاظ میں چین کا جغرافیائی تعارف پیش کر دوں تو شاید آئندہ کی تحریر سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ یہ حصہ بہت ہی مختصر ہوگا تاکہ باعثِ اطالہ نہ ہو جائے۔

تعارف

چین آبادی کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی تقریباً ساٹھ کروڑ ہے۔ صحیح طور پر مردم شماری نہیں ہوئی ہے اس لئے وثوق کے ساتھ کچھ کہنا آسان نہیں۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں ۲۱ ستمبر کو تقریر کرتے ہوئے چین کے صدر جناب ماؤزی تنگ صاحب نے کہا تھا کہ چین کی آبادی ۴۷ کروڑ ہے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں چین کے دوسرے اہم لیڈر نے پیرس میں کہا کہ ۵۵ کروڑ ہے۔ اور ۳۰۔ مئی سنہ ۵۶ء کو ہماری ملاقات کے دوران میں چین کے وزیر اعظم جناب چو ئن لائی صاحب نے فرمایا کہ چین کی آبادی ساٹھ کروڑ ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۴۹ء سے سنہ ۱۹۵۶ء تک سات سال میں باہر سے اندرون ملک کو منتقل ہوئے بغیر کوئی آبادی ۴۷ کروڑ سے ساٹھ کروڑ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جبکہ اس مدت میں کروڑوں نہیں تو لاکھوں کی آبادی چین سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں زیادہ تر ہانگ کانگ، سنگا پور و ملایا اور تھائی لینڈ میں، جا بسی ہے۔ اس لئے یہ سمجھئے کہ یہ سب اعداد قیاسی ہیں — بذریعہ شمار حاصل کردہ اعداد نہیں ہیں۔ بہر حال ایک محتاط اندازے کے مطابق چین کی آبادی کو ۵۵ کروڑ سمجھ لیجئے۔ اس میں سے ۲۲ لاکھ برطانوی مستعمرہ ہانگ کانگ میں ہے، جس کا رقبہ ۳۹۱ مربع میل ہے۔ اور تقریباً ۶۵ لاکھ جزیرہ فارموسا میں ہے، جس کا رقبہ ۱۳۸۹۰ مربع میل ہے۔ یہ جزیرہ نیشنلسٹ چائنا یعنی کومنتانگ حکومت کے ماتحت ہے اور چین کا شیخ (چین کائی شک) اس پر حکمران ہے۔ باقی سارا ملک چین جس کا رقبہ تقریباً ۴۸ لاکھ مربع میل ہے، ہند چینی کی سرحد سے منچوریا تک اور شنگھائی سے سنکیانگ کی مغربی سرحد یعنی افغانستان و کشمیر کی سرحد تک کمیونسٹ چین میں داخل ہے۔ انتظامی طور پر کمیونسٹ چین اٹھارہ صوبوں اور پانچ نیم خود مختار علاقوں پر منقسم

چینی طرز حکومت کے بموجب صوبہ جات کو تو صرف انتظامی تقسیم ہی سمجھیے - البتہ نیم خود مختار علاقوں کی حیثیت ذرا مختلف یعنی روسی علاقہ قازقستان و تاجیکستان وغیرہ کی سی سمجھ لیجئے -

طبعی طور پر چین حسب ذیل تین حصوں پر منقسم ہے :-

(۱) جنوبی حصہ :- سرحد ہند چینی سے دریائے ینگ تک - جہاں شہر اوشان واقع ہے، اس علاقہ میں بارش زیادہ ہوتی ہے - گرم و تر آب و ہوا - چاول اور مونگ پھلی کی کثیر پیداوار - چین کی سب سے زیادہ آبادی اسی حصہ میں ہے - مسلمانوں کی آبادی اس حصہ میں بہت ہی کم ہے - شہروں میں چار پانچ ہزار اور دیہی آبادی میں دُور دُور پر ایک یا دو چھوٹے چھوٹے گاؤں مسلمانوں کے پائے جاتے ہیں - مشہور شہر کینٹن اسی حصہ میں واقع ہے -

(۲) وسطانی حصہ :- دریائے ینگ سے لے کر چین کی مشہور دیوارِ عظیم تک بارش کافی، پیداوار مکئی، گیہوں اور روغنی اجناس خصوصاً سویابین - مشرقی حصہ زرخیز، مغربی اکثر کوہستان - دارالحکومت پیکنگ اسی حصہ کے زرخیز قطعہ میں واقع ہے - یہاں مسلمانوں کی آبادی جنوبی حصہ سے زیادہ ہے اور بعض علاقوں میں تو مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے - مسلمان شہروں میں بھی آباد ہیں اور دیہاتوں میں بھی -

(۳) شمالی و مغربی حصہ :- دیوارِ چین سے شمال اور دریائے ہوانگ سے مغرب کا حصہ - یہاں بارش کم ہوتی ہے - میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں - زمین کوہستانی ہے - قیمتی معدنی اشیاء یہیں سے برآمد ہوتی ہیں - اس علاقہ کے مغربی حصہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے - یہاں تک کہ صوبۂ سنکیانگ میں ۸۲ فیصد مسلمان آباد ہیں - اور ومچی، کاشغر، ختن، یارقند، وغیرہ مشہور شہر اسی صوبہ میں واقع ہیں -

مختصر تاریخ اس مختصر سے بیان سے دُنیا کے اس بڑے ملک کی جغرافیائی کیفیت کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے کے بعد یہ مناسب ہوگا کہ چند سطریں آپ کے سامنے اس کی مختصر تاریخ خصوصاً تاریخ جدید کی بھی پیش کردی جائیں- تاکہ "چین اور مذہب" کے موضوع پر جو کچھ عرض کیا جائے اس کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو -

چینیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کی تہذیب دُنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے - اس دعویٰ کے ثبوت میں ہندوستان کی طرح تاریخ کی عدم موجودگی سب سے بڑی دلیل ہے - افسانہ ہی افسانہ ہے نہ کوئی ناطق شہادت ہے اور نہ صامت - بہرحال، چین کے متعلق یہ البتہ کسی قدر زیادہ قابلِ وثوق انداز میں معلوم ہو سکا ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال سے یہاں کوئی ایک حکومت نہ تھی - ہر زمانہ میں یہ ملک مختلف مطلق العنان شاہیوں میں تقسیم رہا ہے - تاریخی ادوار کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے :-

۲۹۵۳	ق م	تک	عہد نامعلوم -
۲۵۹۸	"	"	افسانوی عہد -
۲۲۵۵	"	"	پانچ بادشاہیاں -
۱۷۶۶	"	"	ہیا خاندان کی بادشاہی -
۲۰۶	"	"	متعدد مختلف بادشاہیاں -

۲۲۱ ق م میں مشہور دیوارِ چین کی تعمیر مکمل ہوئی جو تقریباً ۱۳۴۰ میل طویل ہے -

۶۱۸ء تک — یہ ملک کبھی چھ اور کبھی گیارہ بادشاہیوں میں منقسم رہا۔
۹۰۷ء " تانگ شاہی چین کے اکثر حصہ پر حکومت رہی۔ اور چینی فنون لطیفہ اور ادبیات کی ترقی کا سب سے بہترین زمانہ یہی تھا۔
۹۶۰ء " طوائف الملوکی۔
۱۱۲۲ء " سونگ بادشاہی کے ماتحت چین کا دو تہائی حصہ رہا۔
۱۲۷۶ء " اکثر حصہ ملک پر منگولوں کی حکومت رہی۔
۱۳۶۸ء " اکثر حصہ پر مینگ خاندان کی حکومت رہی۔
۱۹۱۲ء " چنگ (مانچو) خاندان کی بادشاہی۔ اس دور میں چین کے مختلف حصوں میں بہت سی بادشاہیاں پیدا ہوتی اور مٹتی رہیں۔

۱۹۱۲ء میں آخری فرد شاہی خاندان مانچو کا قتل کر دیا گیا۔ رانی بھاگ کر یورپ چلی گئی۔ اور ڈاکٹر سن یات سین کی سرکردگی میں جمہوری حکومت چین کے ایک بڑے حصہ پر قائم ہو گئی۔

تحریک آزادی

چین کو شاہی مظالم سے نجات دلانے کی ابتدائی تحریک مسلمانوں ہی نے شروع کی تھی۔ اور اُن ہی نے اپنے خون سے سینچ کر آزادی کی بیل کو سرسبز رکھا۔ سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں صوبہ کانسو میں شاہی کے خلاف علم اٹھایا۔ اس کے بعد صوبہ شینسی میں سالار تحریک شروع ہوئی۔ پھر ۱۸۷۳ء میں ایک پنچایتی حکومت مسلمانوں نے قائم کی۔ پھر دوبارہ صوبہ کانسو میں ۱۸۹۵ء میں شاہی اقتدار سے مسلمانوں نے انکار کر دیا۔ اور پھر یعقوب بیگ کی تحریک صوبہ سنکیانگ میں شروع ہوئی۔ اگرچہ ان تمام تحریکوں کو بادشاہی فوجوں نے نہایت بے دردی سے کچل دیا۔ صرف یعقوب بیگ کی تحریک کو ایک خاصی مدت اصلاح و ترقی کی مل سکی۔ لیکن اس کا اقرار چین کے غیر مسلموں کو بھی ہے کہ چین کی مطلق العنان بادشاہی کے خلاف سارے چین میں زندگی کی لہر ان ہی تحریکوں نے پیدا کی۔

۱۹۱۱ء میں ایک چھوٹی سی جمعیۃ نے کینٹون میں ڈاکٹر سن یات سین کو صدر منتخب کر کے جمہوریہ قائم کر لی تھی۔ اور ۱۹۱۲ء میں آخری فرمانروا کو پیکن سے نکال لینے کے بعد اکثر حصہ چین جمہوریت کے ماتحت ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ماتحتی حقیقتاً ایک لفظی بندش سے زیادہ نہ تھی۔ ملک کے اکثر صوبوں میں فوجی جنرلوں کی مطلق العنان شاہیاں قائم ہو گئی تھیں۔ مضبوط مرکز قائم نہ تھا اور مرکزی حکومت ایک بے بس حکومت تھی۔ اس انقلابی جماعت کو جس نے یہ جمہوریت قائم کی تھی "کومنتانگ" کہتے ہیں۔ کومنتانگ خود مختار فرمانروا جنرلوں کا ایک کمزور سا اتحاد تھا۔ شمال مشرقی حصہ پر جاپان کا اثر تھا۔ اور جنوب مغربی حصہ پر یورپین تاجروں کی تجارت ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک حکومت بھی تھی۔ ان ہی جنرلوں میں ایک چین کائی شیک بھی تھے۔ یہ صورت حال ڈاکٹر سن یات سین کی وفات نومبر ۱۹۲۵ء بلکہ ۱۹۲۷ء میں جاپان کے حملہ تک قائم رہی۔

سن یات سین کے بعد تھوڑا سا وقفہ دوسرے لیڈر کا گزرا اور اس کے بعد چین کائی شیک کومنتانگ کے لیڈر ہو گئے۔ سن یات سین کی بیوی اور چین کائی شیک کی بیوی شنگھائی کے ایک مشہور دولت مند بینکر کی بیٹیاں اور حقیقی بہنیں ہیں۔ مادام چین کائی شک نے امریکہ میں تعلیم و تربیت پائی ہے۔ اُن کا اپنے شوہر پر غیر معمولی اثر ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جو جلسۂ عام کومنتانگ کا ہوا، اس میں اس جماعت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ چین کائی شک اپنی بیوی کے مشورہ کے ماتحت یہ خیال

رکھتے تھے کہ چین کی اقتصادی تباہی کا علاج امریکہ اور یورپ کا بیرونی سرمایہ ہے۔ اسی طرح تعمیر نو کی جائے۔ اور انتہا پسند نوجوانوں کی جماعت جس کا لیڈر ماؤزی تنگ تھا۔ یہ چاہتی تھی کہ ملک کی تعمیر نو روس کی امداد سے کمیونسٹ انداز میں کی جائے۔ اسی جماعت کا ساتھ مسز سن یات سن نے دیا اور دونوں بہنیں دو متحارب جماعتوں کی رہنما بن گئیں۔

اس کے بعد ایک حصہ ملک میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ پھیلتی رہی۔ پھر بہت سے خونی مقابلوں کے بعد جس میں ملک کو بڑی عظیم الشان جانی و مالی تباہیوں سے گزرنا پڑا۔ بالآخر ۱۹۴۹ء میں چین کائی شک اور اُن کی جماعت چین کے باہر ایک چینی جزیرہ فارموسا میں محدود ہو گئی۔ اس طرح چین کا تقریباً سارا حصہ کمیونسٹ حکومت کے ماتحت آ گیا۔ اور ایک مرکزی حکومت کلی اختیارات کے ساتھ قائم ہو گئی۔ جس میں صوبہ جات کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

چینی مذاہب جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ چین ایک بہت وسیع ملک ہے۔ بہت بڑی آبادی رکھتا ہے۔ جنوبی چین کو شمال مغربی چین سے بجز مرکزی حکومت کی ماتحتی میں اشتراک کے اور کوئی رابطہ مربوط نہیں کرتا۔ مثلاً سنکیانگ کے صوبہ کو آن تنگ یا کنٹن سے کوئی چیز مربوط نہیں کرتی۔ نہ کوئی نسلی اشتراک ہے۔ اور نہ لسانی۔ کھانا۔ لباس، وضع قطع، رسم و رواج، روایات، صورت شکل، قد و قامت، کہیں کوئی اشتراک نہیں۔ چینی زبان جاننے والے تو سنکیانگ کے بڑے شہروں میں دو چار مل بھی جاتے ہیں۔ مگر دیہاتوں میں تو اویغوری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں چلتی۔ یہ زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور تاتاری زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ اس کے اپنے ادبیات ہیں، اخبارات اور رسائل ہیں۔ بالکل اسی طرح چین میں مذہب کا معاملہ ہے۔ چین کے مختلف صوبوں میں ہر زمانہ میں مختلف مذاہب رہے ہے، اور آج بھی ہیں۔ لیکن چین کے لوگ مذہب کے بارے میں ہمیشہ سے غیر یقینی اور مبہم سا تصور رکھنے کے عادی رہے ہیں۔ بلکہ بڑی حد تک انھیں مذہب کے معاملہ میں بے پروا کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آج بھی چین میں لامذہبوں کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ ملاقات کے دوران میں خود جناب چوئن لائی صاحب وزیر اعظم چین نے یہ بیان کیا کہ چین کی ساری آبادی کسی نہ کسی مذہب کا عقیدہ رکھتی ہے۔ اور ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے عقیدہ خالق سے انکار کر کے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کر لی ہے نوّے لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور یہ دُنیا میں سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ لیکن چینیوں کی غیر یقینی کا یہ عالم ہے کہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ایک چینی ایک ہی وقت میں اپنے آپ کو تاؤ، شنتو، بدھ اور عیسائی چار مذاہب کی طرف منسوب کر دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ البتہ مسلمان ایسے نہیں ہیں۔ وہ واضح طور پر اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ عقیدہ و عمل میں دوسروں سے الگ ایک جماعت ہیں۔ وہ شادی بھی دوسروں میں نہیں کرتے۔ کھانے پینے میں حرام و حلال کے پابند ہیں۔ چینی نام کے ساتھ ایک عربی نام بھی ضرور رکھتے ہیں۔ اور بعض صوبوں میں صرف عربی نام ہی رکھتے ہیں۔ مقامی یا چینی نام نہیں ہوتے۔

قدیم مذاہب ابتداءً چینی لوگ عجائب پرست اور اوہام پرست تھے۔ پھر تاریخ کے نایادگار زمانوں میں یہاں تمدن کی نشو و نما ہوئی تو مختلف زمانوں میں بڑے بڑے فلسفی یہاں پیدا ہوئے اور ان فلسفیوں کے خیالات سے تاؤ ازم، شنتو ازم، کنفیوشس ازم، اور مانی ازم کے مذاہب پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان مذاہب میں

خالق کائنات کا کسی نہ کسی قدر تصور ضرور موجود تھا۔ لیکن چند اخلاقی نصائح کے سوا اوامر و نواہی اور انفرادی، عائلی و اجتماعی احکام و موانع سے یہ سب مذاہب یکسر خالی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہ استثنائے منگولیا و سنکیانگ جہاں ان مذاہب کا کوئی اثر نہ کل تھا اور نہ آج ہے پوری چینی نسل اپنے مورثِ اعلیٰ کی اطاعت اور اُسی کے بُت کی پوجا کے سوا مذہب کا اور کوئی مطلب سمجھ ہی نہ سکی۔ چینی ہمیشہ سے ایک علیحدگی پسند نسل تھے۔ دوسروں سے آمیزش انھیں کچھ بہت زیادہ پسند نہ تھی۔ اس لئے یہ اپنے مزاج کے مطابق ایک مبہم سا عقیدہ خالقِ کائنات کا رکھتے رہے اور چونکہ خدا کی صفتِ خالقیت کا ظہور باپ دادا کے وجود میں انھیں نظر آیا اس لئے ہر خاندان نے اپنے مورثِ اعلیٰ کی پوجا شروع کردی اور اسی پر وہ اب تک قائم ہیں۔

بُدھ دھرم بدھ مذہب ہندوستان کے صوبہ بہار میں بمقام گیا پیدا ہوا۔ یہ حقیقتاً کوئی ایجابی تعلیم نہ تھی بلکہ برہمنوں کے مذہبی تسلط کے خلاف روحِ انسانی کی بغاوت تھی۔ اس میں تپسیا اور ترکِ لذائذ کی تعلیم دی گئی تھی۔ کئی سو سال تک یہ مذہب پھولتا پھلتا رہا۔ حکومت و قوت نے اس کی امداد کی۔ لیکن جب پھر برہمنی دَور کا آغاز ہندوستان میں ہوا تو برہمنوں نے اس مذہب کو سخت بے رحمی کے ساتھ یہاں سے ختم کردیا۔ یہی زمانہ ہے کہ بدھ دھرم نے مشرق کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ اور برما۔ سیام، ہند چینی سے گزر کر جنوبی چین میں داخل ہوگیا۔ چینی مذہب کے معاملہ میں لاپرواہ تو تھے ہی۔ انہوں نے اپنے باپ دادا کے بتوں کے ساتھ ایک بُت مہاتما بدھ کا بھی رکھ لیا بہت سے لوگ تیاگ اور تپسیا کے بھی قائل ہوگئے۔ بعض نے تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر بھی کیا۔ مگر ہندوؤں نے اُن کے ساتھ بڑے دردناک سلوک کئے۔ ان ناروا مظالم کی داستانیں اب تک جنوبی چین کے ہر گھر میں کہی اور سُنائی جاتی ہیں۔ ان کی قصہ کہانیاں ان دردناک مظالم کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔ جو ہندوؤں نے چینی فقراء اور یاتریوں پر کئے تھے!

یورپ کی اقوام چونکہ تجارت اور نفع اندوزی کے لئے چین کے جنوبی حصہ ہی میں داخل ہوئیں اور وہاں انہوں نے مہاتما بدھ کے بعض ماننے والوں کو دیکھا۔ اُن کی تصانیف سے واقفیت پیدا کی۔ اس لئے یہ فیصلہ کردیا کہ چین کا عام مذہب بھی برما، اور سیام کی طرح بدھ مذہب ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ نہ آج چین میں بدھ دھرم کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور نہ کبھی تھی۔ بلکہ تاریخ کے کسی دَور میں بدھ دھرم کو چین میں قبولیت عام نہیں حاصل ہوسکی تھی۔ میں نے جنوب سے شمال مغرب تک چین کو عبور کیا۔ مجھے بدھ مذہب کے بہت تھوڑے آثار نظر آئے۔ شمال مغرب میں تو اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وسطانی علاقہ تک کچھ اثرات ہیں۔ مقامی روایات میں بھی بدھ دھرم کے محیط اثر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بدھ ایسوسی ایشن چین نے جو کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ڈوڈھائی کروڑ بدھسٹ وہاں موجود ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعداد کبھی نہ تھی۔ تانگ خاندان کے بادشاہ (۱۳ء تک) اگرچہ بدھ نہ تھے مگر بدھ دھرم کے سرپرست ضرور تھے۔ ان کے زمانہ میں بُدھ دھرم کو پھیلاؤ کا موقع ملا۔ لیکن اس کا دائرہ جنوبی علاقہ چین سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اسلام اسلام چین میں دو راستوں سے داخل ہوا۔ شمال مغربی سرحد سے جبکہ تانگ خاندان کے بادشاہ نے مسلمان تاجروں کے ایک وفد کو ۶۴۷ء میں اپنے دربار میں بُلایا تاکہ اُن کے ذریعہ حضرت عثمانؓ سے

تجارتی معاہدہ کرے۔ اور چینی ریشم کی تجارت عربی ممالک میں اور مصر میں اسی طرح جاری رہے جیسے پہلے تھی۔ اس بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ اپنے یہاں سے بھی کچھ لوگ بھیجے تھے۔ اس کے بعد مسلمان تاجر شمال مغربی چین میں آتے رہے، یہاں تک کہ چین میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوگیا۔ اور ۷۱۳ء میں قتیبہ کی سرکردگی میں مسلمان مجاہدین کاشغر اور ختن پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس وقت معاہدہ ہوگیا اور شہر حامی کے قریب حدود قائم ہوگئے۔ لیکن مسلمانوں سے میل جول کا موقع چینیوں کو ملتا رہا اور آہستہ آہستہ اسلام صوبہ یون نان۔ اور صوبہ کانسو میں پھیلتا رہا۔ دوسرا راستہ بحری تھا۔ مسلمان تاجر کنٹون سے اسّی میل مغرب کی طرف دریائے شم چون کے کنارے آئے، اور یہاں انہوں نے طویل عرصہ تک قیام کیا۔ اس طرح جنوبی حصہ کے لوگ اسلام سے واقف ہوسکے۔ یہ زمانہ خلیفہ ولید کا تھا۔ اور ۷۱۴ء کے قریب کا کوئی وقت ہوگا۔ چین ایک وسیع ملک ہے جس کا اکثر حصہ کوہستانی ہے۔ بیچ بیچ میں ذخار دریا راستوں میں حائل ہیں۔ آج ترقی کے اس دور میں بھی آپ چین کو شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً ریلوے کے ذریعہ عبور نہیں کرسکتے۔ کئی کئی سو میل ریلوے لائن بننا باقی ہے۔ تو آپ خیال کرلیں کہ آج سے بارہ سو سال قبل جبکہ راستے بھی مامون نہ تھے، اور چین طوائف الملوکی میں گرفتار رہا۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ مسلمان جنوب سے شمال تک چار ہزار میل کی طویل سرزمین پر آسانی سے پھیل جاتے۔ اس لئے دریاؤں کے کنارے کنارے مسلمان پھیلتے رہے اور صوبہ کوان چو میں تقریباً بیس لاکھ مسلمان پلے جاتے ہیں۔

مرحوم علامہ شکیب ارسلان کی تحقیق جو انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ سید عمر الاجل آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اور پہلی صدی ہجری کے بالکل آخری سالوں میں تجارت کرتے ہوئے دربار چین میں آئے اور یہیں بس گئے۔ اُن کے صاحبزادے سید مسعود کے ذریعہ چین میں اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی۔

حضرت ابو وقاص

شہر کینٹون میں مسلمانوں کی آبادی صرف پانچ ہزار ہے، اُن کی چار مسجدیں ہیں۔ اُن میں سے ایک مسجد کو یہ لوگ مسجد ابی وقاص کہتے ہیں۔ شہر سے باہر حضرت ابی وقاص کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ جہاں لوگ عید کی شام کو زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ ہم بھی وہاں گئے تھے۔ عید کی نماز بھی ہم نے مسجد ابی وقاص میں ادا کی تھی۔ اس مسجد کے امام جناب یوسف اسحاق صاحب کہتے تھے کہ یہ بزرگ ابی وقاص صحابہ میں سے تھے۔ یوسف اسحاق صاحب کوئی محقق آدمی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی ثبوت اس کا پیش کیا۔ اور نہ عربی تواریخ سے کہیں کوئی ایسی بات ثابت ہوتی ہے۔ مسجد کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ دو تین سو سال کی بنی ہوئی ہے، مگر جگہ وہی ہے جہاں حضرت ابی وقاصؓ نے مسجد بنوائی تھی۔ اس لئے اسے مسجد ابی وقاص کہا جاتا ہے۔ مقبرہ بھی نو تعمیر ہے، کوئی ڈیڑھ سو سال کی تعمیر ہوگی۔ کوئی کتبہ بھی موجود نہیں۔ کوئی چینی کتاب ایسی نہیں جو اس بیان کی تائید کرے۔ اس لئے ان حضرت ابی وقاص کو صحابی قرار دینا میرے لئے ممکن نہیں۔ البتہ صوبہ کانسو اور صوبہ سنکیانگ میں بعض قدیم مساجد دیکھیں جن کے آثار و کتبات انھیں گیارھویں صدی عیسوی تک قدیم ثابت کرتے ہیں۔

صوبہ سنکیانگ کے دار الصدر اُرومچی سے ہم نے کاشغر جانے کا عزم کرلیا تھا۔ مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے طیارہ پرواز نہ کرسکا۔ اور یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ شاید کاشغر کے گرد و نواح میں زیادہ قدیم آثار مل جاتے۔ تاریخی قیاس یہ چاہتا ہے کہ کاشغر اور اس سے مغرب کے حصہ میں ابتدائی دور کے اسلامی آثار رہ سکتے ہیں۔ مسلمان تین چار سو سال تک مقبرے اور درگاہیں نہیں بنایا کرتے تھے۔ بلکہ قبروں کی حفاظت کو بھی ایک سہل کام سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ توامید نہیں کہ وہاں کوئی قدیم مقبرہ مل جاتا۔ لیکن مساجد کے آثار۔ اور چونکہ بارش زیادہ نہیں ہوتی اس لئے بعض دوسرے تعمیری نقوش کا مل جانا

قرین قیاس ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغربی چین کے مسلمانوں اور جنوبی چین کے مسلمانوں کے مابین کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اور دونوں حصّوں میں الگ الگ اسلامی نور پھیلتا رہا۔ ۱۳۶۸ء میں منگ بغاوت کے بعد سے مسلمانوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ اور ان کی نو آبادیاں شمال مغربی حصہ سے آگے بڑھ کر وسطانی علاقہ میں بھی قائم ہوگئیں۔ اب اس وقت چین کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی کثیر آبادیاں ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ سنکیانگ، کانسو، شینسی، یون نان، کوانگ چو، ہونگ کنگ (زی چوان) ان کے علاوہ سارے چین میں شہروں اور دیہاتوں میں مسلمان موجود ہیں۔

چینی مسلمانوں کی تعداد

چین میں مسلمانوں کی جملہ تعداد بھی ایک عجب طرح کا اختلافی مسئلہ ہے، اور اس لئے اختلافی ہے کہ چین میں مکمل طور پر مردم شماری نہیں ہو سکی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جو ناقص مردم شماری ہوئی ہے۔ اس میں مذہب کا خانہ نہ تھا۔ اس لئے جو اعداد پیش کئے جاتے ہیں وہ مقامی معلومات سے ماخوذ ہیں۔ یہاں مردم شماری نسلی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ اس لئے وہ نسلیں جو تمام تر مسلمان ہیں مثلاً ہوئی، تاجیک، قازق، تاتار، اویغور وغیرہ ان کی تعداد تو مل جاتی ہے۔ باقی جن نسلوں میں مسلمان کم ہیں اور غیر مسلم زیادہ۔ ان کے متعلق صرف واقفِ حال حضرات کا بیان ہی واحد ذریعہ ہے۔ مثلاً ہان نسل۔ منگ نسل وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ جناب چوین لائی صاحب وزیر اعظم چین بنڈوگ کانفرنس میں چینی مسلمانوں کی تعداد پوری چینی آبادی کا بارہ فیصد یعنی تقریباً سوا سات کروڑ بتاتے ہیں۔ انگریز ماہرین اپنی ڈائرکٹریوں میں ساڑھے پانچ کروڑ کہتے ہیں۔ امریکہ کے ماہر حضرات پرنسٹن یونیورسٹی کے شائع کردہ اطلس تاریخ اسلامی بابت ۱۹۵۲ء میں چار اور پانچ کروڑ کے درمیان بتاتے ہیں۔ چین کے جنوبی یا وسطانی حصہ میں کسی سے پوچھئے تو وہ صرف ایک کروڑ بتائے گا۔ کیونکہ وہ صرف اپنے علاقہ کو پورا چین قرار دے گا۔ اور اگر صوبہ کانسو کے دار الصدر لنچاؤ میں پرنسپل صاحب سے پوچھئے تو وہ ساڑھے چھ کروڑ بتائیں گے سنکیانگ میں دریافت کیجئے تو پورے سات کروڑ جواب ملے گا۔ ہم ان تمام بیانات اور عینی مشاہدات کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر چین میں مسلمانوں کا صحیح شمار ہو سکے تو ان کی تعداد سات کروڑ اور ساڑھے چھ کروڑ کے درمیان ثابت ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چین میں بسنے والی نسلوں میں سے حسب ذیل نسلیں تمام تر مسلمان ہیں:۔

(۱) خوئی۔ (۲) اویغور۔ (۳) قازاق۔ (۴) کرغیز۔ (۵) تاجیک۔ (۶) تاتار۔ (۷) اوزبک۔ (۸) تونگسیان۔ (۹) سالار۔ (۱۰) پوآن۔

ان میں سے خوئی ہر جگہ موجود ہیں۔ پوآن جنوب مغربی علاقوں میں۔ تونگسیان وسطانی مغربی حصوں میں۔ اور باقی شمال مغربی حصہ ملک میں آباد ہیں۔

ان نسلوں کے علاوہ ہان نسل میں (جو چین کی اکثریتی نسل ہے اور چین کی تقریباً ۷۵ فیصد آبادی اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے) کافی تعداد مسلمانوں کی ہے جو "ہان مسلم" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح منگ اور تانگ نسلوں کے بھی لاکھوں ہی گھرانے مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور مختلف علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے حالات

چین میں مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی حالت عام چینیوں سے کمتر نہیں، بلکہ اکثر جگہ بہتر ہے۔ یہ لوگ عام طور پر پڑھنے لکھنے، کام کاج کرنے، اور محنت مزدوری میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ سرکاری کارخانوں میں بعض

جگہ خصوصاً شنگھائی میں میں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو کام سے لگانے میں غیر مسلم افسر کسی قدر غیر ہمدرد ہیں۔ لیکن یہ غالباً مقامی افسروں کی شرارت ہے۔ چین کے مسلمان سب کے سب فقہ حنفی کے پیرو اور متصوفانہ خانوادوں سے ناواقف ہیں۔ وہاں قادری اور چشتی قسم کے لوگ نہیں ہیں۔ مسلمانوں، بلکہ ہر شخص کو عبادت کی آزادی[1] حاصل ہے۔ لیکن نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق شخصی قوانین نہیں ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے بڑی قربانیوں کے بعد مسلمان مرد و عورت کا نکاح غیر مسلم مرد یا عورت سے قانوناً ناجائز منوا لیا ہے۔ چینی مسلمانوں میں پردہ کا رواج نہ آج ہے اور نہ کبھی تھا۔ بعض علاقوں میں مسلمان عورتیں سروں پر سیاہ رومال کساوے کے طور پر باندھ لیتی ہیں۔ لیکن بہت کم۔ عام طور پر مسلمان عورتیں بھی کوٹ پینٹ پہنے اور کھلے سر زندگی کے ہر شعبہ میں کارگزار نظر آتی ہیں۔

عیسائیت

چین میں سب سے زیادہ جدید آنے والا مذہب، عیسائیت ہے۔ عیسائیت کا اثر جنوبی علاقہ چین سے آگے نہیں۔ شنگھائی اور کنٹن میں دو تین ویران گرجے ملے۔ عیسائیت یہاں یورپین تاجروں کے ساتھ داخل ہو گئی۔ اور جب تک اُن کا اثر رہا پھلتی پھولتی رہی۔ لیکن کبھی ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ تعداد عیسائیوں کی اس ملک میں نہ ہو سکی۔ اور آج تو پتہ بھی نہیں کہ عیسائی کہاں بستے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مرکز شنگھائی تھا۔ وہاں دو تین لاکھ بھی اب عیسائی موجود نہیں ہیں۔ کانسو، شین سی، اور سیاں وغیرہ علاقوں میں عام آبادی عیسائیت سے بالکل ناواقف ہے۔

اس وقت چین کی مذہبی تقسیم آبادی تقریباً اس طرح کی ہے:۔

۱۔ تاؤ۔ شنتو۔ اور کنفوشش	=	تقریباً	۴۰ کروڑ
۲۔ بدھ	=	″	ڈھائی کروڑ
۳۔ مسلمان	=	″	چھ کروڑ ۷۵ لاکھ
۴۔ عیسائی	=	″	پچاس لاکھ
۵۔ لامذہب	=	″	۴ کروڑ
۶۔ کمیونسٹ	=	″	۹۰ لاکھ

حکومت اور مذاہب

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کمیونسٹ تمام مذاہب کے شدید ترین مخالف ہوتے ہیں۔ اور اس میں تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ چین میں کمیونسٹوں ہی کی حکمرانی ہے۔ پھر یہ بھی کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں کہ ہر معاملہ میں چین کی رہنمائی کے فرائض روس کے کمیونسٹ ہی انجام دے رہے ہیں — معاشیات میں بھی اور اندازِ حکمرانی میں بھی۔ چین کے ہر شہر میں روسی کلچر سینٹرز بڑے شاندار پیمانہ پر قائم ہیں۔ جہاں روسی ترقیات کی نمائش، روسی طرز زندگی کی طرف دعوت، اور روسی موسیقی و مصوری کے کمالات پیش کئے جاتے ہیں۔ روسی اکابر کی عظمت کا نقش دل پر بٹھا دیا جاتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود چین کی کمیونسٹ حکومت نے مذاہب کے خلاف اس قدر

---

[1] ۔ فاضل مقالہ نگار نے پوری تحقیق کے ساتھ واقعات کو لکھا ہے مگر اس سلسلہ میں جناب ارشاد احمد صاحب مدیر روزنامہ "تسنیم" (لاہور) کے تاثرات بھی پڑھ لئے جائیں تو واقعات اور زیادہ نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صاحب موصوف نے چین کے کسی ایک صوبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں مسلمان عورتیں اب سے پہلے پردہ کی پابند تھیں۔ (م۔ق)

شدید جارحانہ طریقۂ عمل نہیں اختیار کیا جیسا کہ روس میں اختیار کیا گیا تھا۔ بہ ظاہر یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے کہ چین نے مذہب کے خلاف لازمی تعلیم، اور مسلسل پروپیگنڈے ہی پر کیوں اکتفاء کی۔ اور تمام مذہبی لوگوں کو آزادیٔ عبادت، اور خصوصاً مساجد اور کلیساؤں میں اجتماعی عبادت کی آزادی کس طرح عطا کردی۔ یہ صحیح ہے کہ چین میں مسلمانوں، عیسائیوں، بدھوں اور تمام مذاہب کو اس قدر آزادی ضرور میسّر ہے۔ لیکن اس قدر آزادی بھی تو روس کے طریقۂ کار کے موافق نہیں ہے!

کمیونزم خود ایک مذہب ہے۔ جس کی بنیاد حیات بعد الممات سے قطعی انکار پر قائم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مذہب چاہے کوئی ہو اس کی بنیاد حیات بعد الممات کے یقین پر قائم ہے۔ اس لئے یہ یقین رکھیئے کہ کمیونزم چاہے روس میں ہو یا چین میں، پولینڈ میں ہو یا یوگوسلاویا میں، اس کی اولین سعی یہی ہوگی کہ مذہب کا نام و نشان مٹ جائے۔ پھر بھی روس اور چین کے طریقۂ کار میں جو فرق ہے وہ اس صورتِ حال سے پیدا ہوا ہے جو ان دونوں ممالک میں کمیونزم کی ابتداء کے وقت موجود تھی!

روس میں جب کمیونزم نے عملی شکل اختیار کرنے کی ابتداء کی تو اس کا مقابلہ ایک ظالم شہنشاہیت سے پڑا۔ کلیسا کا پورا مذہبی نظام جس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس لئے روسی کمیونسٹوں نے جہاں زار کو نیست و نابود کر دیا وہاں اس کے حمایتی کلیسا سے بھی ایک دن کی رعایت روا نہ رکھی۔ پھر یہ نفرت روز بروز شدّت اختیار کرتی گئی۔ اور کوہ یورال سے مشرق میں بسنے والے مسلمان بھی اس کے شکار ہو گئے۔ اس کے برخلاف جب چین میں کمیونزم کے پیرو اقتدار کے والی ہوئے تو انھیں یہاں کسی شہنشاہیت سے واسطہ نہیں پڑا۔ چین کی بادشاہی ایک ربع صدی پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ انھیں کوئی کلیسائی مذہبی نظام چین میں مدمقابل نظر نہ آیا۔ کیونکہ عیسائیوں کی تعداد قابلِ اعتناء بھی نہ تھی۔ تاؤ ازم، اور کنفیوشش مذاہب کی کوئی تنظیم ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ کوئی اجتماعی عبادت بھی ان مذاہب میں نہیں ہے، ان سے کیا خطرہ تھا، بدھ بیچارے نہ کسی کے مخالف تھے اور نہ منظم۔ مسلمانوں سے مقابلہ پڑتا۔ لیکن آزادی پسندی میں مسلمان ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ کنٹون کے اُس کنفیوشش مندر میں جہاں موجودہ چین کے زعماء کی خفیہ تربیت ہوئی تھی، آج بھی ابتدائی دور کے مسلمان حرّیت پسندوں کے کھانے کی کھردری سی میزیں اور بنچیں موجود ہیں۔ جو اس کی شہادت دیتی ہیں کہ جہاں تک آزادی، خود مختاری اور معاشی فراغ بالی کے حصول کا تعلق ہے، مسلمان غیر مسلموں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ اکثر مواقع پر امام و رہنما تھے!

اسی وجہ سے چینی کمیونسٹوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ روس کی طرح مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف فوری طور پر کوئی جارحانہ کارروائی کی جائے، وہ بہ یقین رکھتے ہیں کہ تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر ہم آئندہ نسل کو اتنا تیار کرلیں گے کہ یہ خود ہی اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی مسجدوں، کلیساؤں اور پگوڈوں کو ختم کر دیں گے۔ چینی مسلمان بھی اس کو سمجھ رہے ہیں۔ اور گھریلو تعلیم کے ذریعہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کو زندہ رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ مساجد میں عربی خطبہ کے سوا وعظ و پند تو ممنوع ہے مگر مساجد کے ساتھ برآمدوں میں قرآن مجید پڑھانے کی مساعی بہر حال جاری ہیں۔ مسلمان محلّوں میں، بچّوں کو کلمہ اور ابتدائی عقائد کی تعلیم بھی اسکول سے خارج اوقات میں دی جاتی ہے۔ اور سرکاری اسکولوں میں انھیں لامذہبی کی لازمی تعلیم بھی ملتی ہے۔ غرض یہ کہ مسلمان کوشاں ہیں کہ اپنی اولاد کو مسلمان رکھیں اور حکومت ساعی ہے کہ انھیں ملحد بنائے۔

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

اِس زندگی کے بعد......

آج کل کی مغربی فلاسفہ کی کتابوں میں اگر آپ کو کوئی چیز غائب نظر آئے گی تو وہ مابعد الطبیعیات کے مسائل ہیں۔ اِس زمانے کے حکمار نے ان مسائل کو اس لئے ترک نہیں کر دیا ہے کہ وہ ان کو کماحقہ حل کر چکے ہیں اور اب ان پر کچھ لکھنے لکھانے کی گنجائش یا ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ برخلاف اس کے اُنہوں نے ان مسائل کو اس لئے ترک کیا ہے کہ وہ باوجود اپنی تمام عقلیاتی کوششوں کے، تمام علم و فضل کے ان عقدوں کو حل کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں۔ اب تک انہوں نے اپنی اس عاجزی کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اس اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں۔ گویا اب اس درجہ پر پہنچے ہیں جہاں پہنچ کر کسی عارف نے کہا تھا کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اپنے دلکش انداز میں اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا ہے ؎

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا　　　جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا!

نبی کریم صلعم کے زمانہ میں بھی کچھ لوگوں نے اس قسم کے مسائل اُٹھائے تھے۔ لیکن انھیں اس قسم کا جواب دیا گیا کہ "بعض مسائل ہماری زندگی کے متعلق ایسے ہیں جن کو عقل کی بنیاد پر سمجھنا مشکل ہے اور انسانی عقل کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ اُن کا کامل طور پر احاطہ کر سکے اس لئے ان معاملات میں اعتقاد سے کام لینا چاہیئے"۔ اور ان مسائل کی توجیہ اللہ اور اس کے رسُول نے جو کچھ کر دی ہے اس کو قبول کر لینا چاہیئے۔ وہی توجیہ ہماری ضروریات اور قوائے عقلی کے لحاظ سے بہترین توجیہ ہے۔ اگر اس سے زیادہ ہم ان مافوق مسائل کے پیچھے پڑیں گے تو گمراہی کا خطرہ ہے اور حاصل کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ اس وقت کے مسلمانوں نے ان مسائل کو اللہ اور رسُول کے فرمان کے مطابق سمجھنے کی اور اُن پر اعتقاد رکھنے کی کوشش کی اور مطمئن ہو گئے۔ لیکن جنہیں اپنی عقل و حکمت پر ناز تھا وہ ان مسائل کے پیچھے پڑے رہے اور زور آزمائی کرتے رہے۔ لیکن اب ہزاروں برس کی سعیٔ ناشکور اور کاوش بے ثمر کے بعد آخر اسی نقطہ پر جا کر ٹھہرنا پڑا کہ یہاں عقلِ انسانی عاجز ہے ؎

ہرچہ دانا کند، کند ناداں　　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

ہیں بعض دورِ جدید کے حکماء اس قسم کے بھی ہیں کہ جنہوں نے عجز کا اظہار کرنے کے بجائے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے اور اب ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اس دُنیا کے علاوہ کوئی دوسری دُنیا سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے مافوقی مسائل کے پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہے صرف یہی ہماری دُنیائے آب و گِل ہے۔ اسی میں سے ہم اتفاقاً پیدا ہو گئے اور مرکر اسی میں مل جائیں گے۔ اس لئے ہماری زندگی کے مسائل جو کچھ ہیں اسی دُنیا کے ہیں۔ اس کے کسی دوسری دُنیا کا تصور حماقت ہے۔ بلکہ بعض حضرات نے تو اس قدر کہنے کی جرأت کر ڈالی ہے کہ یہ بات

ثابت ہو چکی ہے کہ خدا، یا حیات بعد الموت، یا حساب و کتاب، یا روح وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو وہ کہتے ہیں کہ خدا یا حیات جاوداں کے نہ ہونے کا ثبوت مہیّا ہو چکا ہے۔ لیکن اس ثبوت کا ذکر نہیں کرتے کہ آخر وہ ثبوت کیا ہے۔ جس نے یہ ثابت کر دیا کہ مافوقی مسائل کا وجود ہی نہیں۔ دراصل ثبوت تو یہ اس قسم کے پیش کرتے ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ خدا اور روح وغیرہ کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن جب نتیجہ نکالتے ہیں تو یہ کہ ان کا عدم وجود یا نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ میں یہ کہوں کہ خدا کا ہونا ثابت نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے وہ موجود ہو، ممکن ہے نہ ہو۔ لیکن ایک یہ کہ میں یہ دعویٰ کروں کہ خدا کا نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ گویا اس کے نہ ہونے کا کوئی امکان ہی نہ رہا۔

میں یہاں اس قسم کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ جس میں ایک مشہور مغربی مصنف نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ حیات جاودانی کو ثابت نہیں کیا جا سکا۔ لیکن نتیجہ یہ نکالا کہ حیات جاودانی کے عدم کو ثابت کر دیا گیا۔ مسٹر اسپنسر ایوربٹ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:-

> "مسلمانوں اور عیسائیوں کی دُنیا میں بہت سے لوگوں نے موت پر فتح حاصل کرنے کی کوشش حیات بعد الموت میں اعتقاد قائم کر کے کی ہے۔ لیکن چونکہ کوئی فلسفیانہ یا سائنسی امکان اس بات کا نہیں ہے کہ حیات بعد الموت ایک حقیقت ہے اور چونکہ فلسفیانہ دلائل جو اس معاملہ میں پیش کئے گئے ہیں وہ محض ناقص اور کمزور ہیں جو کہ صرف اُنہی لوگوں کو تسلّی دے سکتے ہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ بہرصورت اس کے معتقد رہیں گے۔ اس لئے آدمی کو اس بارے میں قدرتی طور پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیا نفسیاتی طاقت ہے جو اتنے لوگوں کو حیات بعد الموت پر اعتقاد رکھنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔" [1]

اس دعوے میں آپ یہ آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی بات یُونہی سرسری طور پر کہہ دی ہے اور ان دلائل کی قطعی نشان دہی نہیں کی جن سے مصنف نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حیاتِ جاوداں کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے یہ کہ کہا تو کوئی ثبوت اب تک نہیں ملا جس سے ہم یہ مان سکیں کہ حیاتِ جاوداں کوئی چیز ہے۔ لیکن نتیجہ اس قسم کا نکلا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا ثبوت مل چکا ہے کہ حیات جاوداں کوئی چیز نہیں ہے۔ دعوے اور دلیل میں کتنا فرق ہے۔ پھر اتنے بڑے دعوے کے ساتھ کچھ دلائل تو ہوتے۔ سرسری طور پر ہی سہی!

میرے خیال میں یہاں یہ بہتر ہو گا کہ میں مصنف ہی کے ہمعصر اور ہم پلّہ لوگوں کے کچھ قول پیش کر دوں۔ جنہوں نے واضح طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر حیاتِ جاودانی کا وجود ثابت نہیں ہو سکا تو اس کے عدم کو بھی ابھی تک ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ سب سے پہلے میں ایک چوٹی کے انگریز فلاسفر رسل کا قول پیش کروں گا۔ جنہوں نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ ابھی ہم کائنات کے راز ہائے سربستہ میں سے ایک ذرّے کے برابر بھی معلومات حاصل نہیں کر سکے ہیں

---

[1] - Ideals of life - P.28

مافوق مسائل کے متعلق کوئی کیا فیصلہ کرے۔

> "سائنسدانوں کے لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کائنات کے متعلق ابھی ہم اقل قلیل معلومات حاصل کر سکے ہیں اور یہ کہ ناقابلِ شمار دور ایسے گزر گئے جن میں کسی قسم کا علم نہیں تھا۔ اور غالباً آئندہ بھی بے شمار زمانہ ایسا گزرے گا جس میں ہمیں آگاہی حاصل نہ ہو سکے گی۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ سائنس جو نتائج نکالتی ہے وہ محض امکانات ہوتے ہیں۔" (یقینی نہیں ہوتے) [۱]

یہاں رسل نے بالکل واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سائنسی نتائج کوئی یقینی چیز نہیں بلکہ محض امکانی بات ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں غلط ثابت ہو جائے۔ اور یہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ آج اصول قائم ہوتا ہے کل اس کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی شخص یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے کہ چونکہ سائنس کے ذریعہ سے حیات بعد الموت کو ثابت نہیں کیا جا سکا اس لئے وہ کوئی چیز نہیں۔ اوّل تو سائنس خود امکانی چیز ہے۔ دوسرے سائنس نے اگر اس کا وجود ثابت نہیں کیا تو عدم بھی تو ثابت نہیں کر سکی۔ اگر کہیں عدم ثابت کر دکھایا ہو تو بلاشبہ آپ اس ثبوت کی طرف نشاندہی کریں تاکہ اس کو صحت کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے!

اس کے بعد میں ایک اور فلسفی کا قول پیش کروں گا جو کہتا ہے کہ حیات بعد الموت کا مسئلہ گو بہت مشکل ہے۔ لیکن کسی چیز کے مشکل ہونے کے یہ معنی کہاں ہوتے ہیں کہ اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ لکھتا ہے:-

> "حیات جاوداں کے وجود کے خلاف جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی افادیت کا منکر ہو۔ جس چیز کی یہ مخالفت کرتے ہیں وہ اس کا امکانِ وجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اشکالات کسی چیز کے وجود کو ناممکن نہیں بنا سکتے۔ اس لئے سائنس صرف اتنا کر سکتی ہے کہ اس مسئلہ کے مقدماتِ وجود کی ضرورت کو طلب کرلے۔" (یعنی وجود کو ثابت کرنے کے لئے جن مقدمات کی ضرورت ہے ان کا ثبوت طلب کرے) [۲]

جان ہکسلے نے بغیر کسی پس و پیش کے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ انسان کسی طرح ان ماورائی مسائل کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے ان کے متعلق رائے زنی کرنا بیکار ہے۔ کہتا ہے:-

> "ہم ان مسائل میں خود کو کیوں اُلجھائیں جن کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ کبھی جان سکتے ہیں؟" [۳]

غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ فلسفہ اور سائنس ہماری زندگی کے متعلق چند مسائل کو ابھی تک حل کر نہیں سکے ہیں۔ اس لئے کسی شخص کا یہ دعویٰ کر دینا کہ ان مسائل کا وجود ہی نہیں اور یہ کہ ان کا نہ ہونا ثابت ہو چکا ہے ایک قسم کی عالم فریبی اور خود فریبی ہے، بلکہ یہ کہوں تو بیجا نہ ہو گا کہ خاصی دیدہ دلیری ہے۔

۱ـ Human Knowledge. Its Scope and Limits

۲ـ The Realm of Ends - By James Ward - P. 388

۳ـ Collected Essays. V.1 P. 210

ان مسائل کی مشکلات کی وجہ سے ہی مختلف مذاہب میں اور خصوصاً اسلام میں ان کو حسب ضرورت حل کر کے پیش کر دیا ہے اور یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ اس معاملہ میں خالص عقل پر ہی بھروسہ نہ کریں بلکہ ایمان بالغیب سے بھی کام لیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے دوسرے مسائل میں بھی آگاہی و علم سے زیادہ اعتقاد کام کرتا ہے اور ہمارے بڑے بڑے سائنسداں اور فلسفی اس پر اعتماد کرتے ہیں اور دنیا کے بہت سے مسائل کو اس کی روشنی میں حل کرتے ہیں اور باقاعدہ اس کو ایک سائنٹیفک طریقہ تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ان مسائل نے کیا قصور کیا ہے کہ یہاں اعتقاد کو سرے سے داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

جیمس وارڈ نے اس مسئلہ کو بڑی خوبصورتی سے حل کیا ہے اور اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہماری زندگی کے ارتقاء میں ہر جگہ پیش قدمی اعتقاد نے کی ہے نہ کہ علم و آگاہی نے (اس علم و آگاہی سے مراد وجدانی آگاہی نہیں بلکہ کسبی آگاہی ہے) وہ کہتا ہے:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے ارتقاء میں جو قدم آگے بڑھایا گیا ہے وہ اعتقادی فعل تھا نہ کہ علمی۔ پیش قدمی کرنے والا اپنے وجدان کے زور پر آگے بڑھا ہے حالانکہ علم اس کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا"

علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آگے چل کر وارڈ اس کی ایک مثال ڈاروِن کے مسئلہ ارتقاء سے موافقت کرتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ مثلاً:۔

"جس وقت کہ ایک پرندنے پہلی مرتبہ ہوا میں پرواز کرنے کی کوشش کی ہوگی یقینی اس وقت اس کے علم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو اس کی گردن کو گر کر ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ضمانت ہو سکے۔ حالانکہ جب اس نے ہمت کر کے عملی طور پر اڑنا شروع کر دیا تو اس کے بعض اعضاء بڑھ کر اس کے پر بن گئے۔ اور وہ رینگنے والے جانور سے اڑنے والا پرند بن گیا"

(مسئلہ ارتقاء یہی کہتا ہے کہ رینگنے والے بعض جانوروں نے اڑنے کی کوشش کی اور کوشش کرتے ہی ان کو یکایک اتفاق الامر سے پر مہیا ہو گئے۔ ان کے اعضاء میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو گئی)

"اس میں شک نہیں کہ جب ہماری آگاہی مکمل ہو جائے گی تو یہ باتیں بدل جائیں گی لیکن اس وقت تک جب تک کہ ہماری معلومات محدود ہیں اعتقاد کے لئے ہمیشہ گنجائش موجود ہے اور اس کی ہر وقت ضرورت بھی ہے۔ اعتقاد کسی ایسی چیز کی تردید نہیں کرتا جس کو سائنس تسلیم نہ کرے لیکن جس چیز کے متعلق سائنس نہ تو حتمی طور پر انکار کر سکے نہ اقرار اور اس کے وجود کا امکان تو بہر حال ہو ہی سکتا ہے اور یہ امکانات ہی ہماری زندگی کی رہنمائی کرتے آئے ہیں اور اسی مفہوم میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایک خدا پرست اعتقاد کی روشنی میں راہ چلتا ہے نہ کہ آنکھوں سے

دیکھ کر۔ گو اس کو عین الیقین کا درجہ حاصل نہیں ہوتا (جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے) لیکن وہ بہتری کی توقع ضرور رکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔" لے

اب میں چاہتا ہوں کہ حیات جاوداں پر اس پہلو سے گفتگو کروں کہ ہماری اخلاقی زندگی کے لئے یہ عقیدہ کس قدر ضروری اور ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا، حیات بعد الموت اور احتساب عمل کا عقیدہ نہ ہو تو ہماری اخلاقی بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک ایک تار منتشر ہو جائے۔ دوسرے قسم کے اصول تو حکومت کے ذریعہ سے رائج کئے بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن اخلاقی قوانین اگر کوئی حکومت چاہے بھی تب بھی بہت کم اس کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ آج تک تو اُن کی گریز پائی مشہور ہے۔ آئندہ معلوم نہیں کیا صورت ہو۔ اخلاقی قوانین کے نفاذ کا زیادہ تر ذریعہ یہی اعتقادات (خدا۔ حیات بعد الممات وغیرہ) ہوتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتقاد صحیح اور پختہ ہو تو یہ وسائل بڑے کامیاب ہیں۔ اگر ان اعتقادات کا خاتمہ کر دیا جائے تو کوئی شخص کبھی اپنی روزانہ زندگی میں خصوصاً جہاں اس کا مفاد خطرے میں ہو، ان اخلاقی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اور جہاں جہاں ان اعتقادات کو بالکل اُٹھا دیا گیا ہے وہاں آپ دیکھ لیجئے کہ کیسا نفسی نفسی کا عالم پیدا ہو گیا ہے۔ کون سے اخلاقی اصول ہیں جن کو دن رات پامال نہیں کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان میں اگر ذرا سی بھی معقولیت باقی ہے تو وہ ہماری معاشرتی زندگی کے لئے اخلاقی قوانین اور اُن کے مؤثر اجرار کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کانٹ کہتا ہے:۔

"روح کا تصور ایک اخلاقی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اخلاقی زندگی کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاقی قوانین باہمی خیر سگالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور ایسی خیر سگالی جس کا عمل ہمیشہ ایک ایسے طریقہ پر ہو جس کو کم از کم فطری طور پر عالمگیر قرار دیا جا سکے۔ یہ خیر سگالی قابلِ عمل ہونی چاہیئے۔ لیکن انسان کلیتہً نیک کم از کم اس فانی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی نہیں ہو سکتا۔" ۲ے

حیات ابدی کا تصور ہمارے کردار میں بلندی، انضباط اور مضبوطی پیدا کرتا ہے۔ اور ہم مصائب دُنیا کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اگر خدا اور آخرت پر اعتقاد قائم کر لیں۔ خدا کی ہمہ بینی کا تصور ہمیں کبھی صحیح راستے سے نہ بھٹکنے دے گا۔ ہم آخرت میں اجر و انعام پانے کی توقع میں بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں۔ دُوسروں کی خاطر تکالیف اُٹھا سکتے ہیں۔ راہِ حق کے لئے جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ خدا اور آخرت کا تصور ہمیں کبھی زندگی سے اس قدر مایوس نہیں ہونے دے گا کہ ہم خودکشی پر آمادہ ہو جائیں۔ اور خودکشی کی واردات میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارا خدا پر اعتقاد اور اس کے رحیم و کریم ہونے پر اعتماد کُل باقی نہیں رہا۔ ہم یہ تصور نہیں کرتے کہ اگر کسی مصلحتِ خداوندی سے ہمیں اس زندگی میں تکلیف پہنچی ہے تو اس کا اجر ہمیں خدا

---

(1) The Realm of Ends. By James Ward P. 415, 416, 417.

(2) The Basic Teachings of great philosophers. P. 187

دُوسری زندگی میں ضرور دے گا۔

یہ ابدی زندگی کا تصور ہی ہے جو انسانوں کو دوسرے جانداروں کے مقابلہ میں فوقیت دیتا ہے۔ اگر یہ تصور نہ رہے تو انسان اور حیوان ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہم دُنیا کے مشہور لوگوں کی زندگی میں سے بہت سی مثالیں ایسی پیش کر سکتے ہیں جہاں دوسری زندگی کے تصور نے ان لوگوں کے قدم کو لغزش سے بچا لیا۔ مثال کے طور پر سقراط کو ہی لے لیجئے کہ کس آسانی اور خوشی سے زہر کا پیالہ محض اس امید پر پی گیا کہ آئندہ زندگی موجودہ زندگی سے بہتر ہو گی۔ اس سلسلہ میں رسل لکھتے ہیں:۔

"سقراط نے موت کا جس طرح مقابلہ کیا ہے اس کی بڑی اخلاقی اہمیت ہے۔ لیکن اس کا آخری وقت کا سکون محض اس کے اس اعتقاد کی وجہ سے تھا جو اس کو ابدی زندگی کے متعلق حاصل تھا۔ اُس نے اپنے آخری وقت میں وصیت کی تھی کہ "اپنی زندگی اور اپنے بچوں کی زندگی کا پہلے اور انصاف کا بعد میں خیال نہ کرو۔ بلکہ انصاف کا اُن تمام چیزوں سے پہلے خیال کرو۔ تاکہ تم معصومیت کی حالت میں اس دُنیا سے رخصت ہو سکو ایک مظلوم کی حیثیت سے نہ کہ ایک ظالم کے طور پر۔ مجھے عالمِ بالا سے کچھ ایسے نغمے سنائی دے رہے ہیں جیسے کہ کسی عارف کو سنائی دیتے ہیں۔" اُسے اپنی موت کا اس لئے کوئی افسوس نہ ہوا کہ "مجھے یقین ہے کہ میں ایسے خداؤں کے پاس جا رہا ہوں جو کہ عقلمند اور مہربان ہیں۔ اور دُوسرے اُن لوگوں کے پاس جا رہا ہوں جو کہ یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں اور جو اُن لوگوں سے بہتر ہیں جن کو میں یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔"[1]

پھر میں یہاں ذرا ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کر دوں تو بیجا نہ ہو گا۔ ضعیفی کی عمر میں جبکہ آدمی کو موت بہت قریب نظر آتی ہے اور اس دُنیا سے تمام رشتے منقطع ہوتے نظر آتے ہیں۔ دُنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے اور سوائے موت کے انتظار کے کوئی دوسرا کام باقی نہیں رہتا اس وقت زندگی کا سب سے بڑا اور عزیز ترین سہارا یہی حیات بعد الموت کا ہوتا ہے۔ وہ اس سختی کے الم انگیز زمانہ کو آئندہ زندگی کے تصور سے اگر خوش آیند نہیں تو گوارا ضرور بنا لیتا ہے۔ ذرا ان بوڑھوں کے دلوں سے پوچھئے جنہیں اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا کوئی سہارا نہیں کہ وہ موت آنے کے وقت کو کس قدر کرب و بے چینی کے عالم میں گزارتے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا۔ ہر طرف تاریکی۔ کہیں سہارے کے لئے روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ ہر طرف یاس، ہر سمت مایوسی۔ العیاذ باللہ! خدا ہم سب کو اس دل شکن آزار سے محفوظ رکھے۔ اس کے برخلاف میں نے ایسے بوڑھوں کو بھی دیکھا ہے کہ آخری دم تک مسکراتے رہے ہیں۔ اور محبوبِ حقیقی کی ملاقات کے شوق میں متبسّم لبوں سے موت کا استقبال کیا ہے اور مرنے کے بعد بھی اُن کے ہونٹوں پر تبسم کا خفیف سا خم باقی رہ گیا ہے۔ کیا واقعی یہ موت پر ایک عظیم فتح نہیں ہے؟ کیا محترم ایوریٹ صاحب جنہوں نے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں پر طنز کرتے ہوئے

---

(1) History of Western philosophy. By Russell. P. 154-155

کہا ہے کہ ان لوگوں نے حیاتِ ابدی کے اعتقاد سے موت کو شکست دینے کی کوشش کی ہے، اس کو کم از کم اس دُنیا کے لحاظ سے حیاتِ ابدی کے معتقدین کی موت پر مکمل فتح نہیں تسلیم کریں گے؟

ہماری زندگی میں جو ایک ہمہ گیر قسم کا انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کا بھی ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے خدا اور آخرت کے تصوّر کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ کوئی شخص دوسرے کے ساتھ سلوک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کوئی کمزور اور نادار کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس قربانی اور حُسنِ سلوک کا کوئی اجر ملنے کی اُسے توقع نہیں۔ وہ کس ترغیب و تحریک پر نیکی کرے۔ اُس کی اپنی سینکڑوں خواہشات اور آرزوئیں ہیں جن کی تکمیل سے اُسے فرصت نہیں، وہ کسی دوسرے کی طرف کیوں نظر اُٹھا کر دیکھے اور کیوں اپنا نقصان کرے، اس نقصان کو برداشت کرنے کیلئے کوئی تحریص کوئی تشویق ضرور ہونی چاہیئے۔ یہ دُنیا عالمِ اسباب ہے اس میں کوئی چیز بغیر سبب کے پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح نیکی کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہیئے ورنہ نیکی ہرگز پیدا نہ ہو سکے گی۔ جو لوگ اس خیال میں مگن ہیں کہ نیکی بغیر سبب کے بھی پیدا ہو سکتی ہے وہ احمقوں کی خیالی جنت میں رہتے ہیں اور انسانی نفسیات اور اس کے اجزائے ترکیبی سے سخت جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس خیال میں ہیں کہ بغیر اخلاقی تعلیم و تربیت کے وہ زندگی کو بھلائی کے ساتھ گزار لے جائیں گے، بڑی نادانی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بقول مسٹر کیرل کے:۔

"ذہانت کی صحت مندی اور اخلاقی انضباط کا تاثیری احساس اور روحانی ترقی یہ تمام چیزیں اتنی ہی ضروری ہیں جتنی کہ ہماری جسمانی تندرستی، اب انسان کو اپنی ذات کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ کرنی چاہیئے۔ اور ان اسباب کی طرف بھی جنہوں نے اس کی ذہانت اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ واقعی بالکل مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ایک ایسے طرزِ معاشرت کو ترقی دیتے چلے جائیں جو کہ ہماری اخلاقی تباہی کا باعث بن رہا ہو اور ہماری ذات کے اچھے اجزائے ترکیبی کو غارت کر رہا ہو۔ ...... یقینی بات ہے کہ مشینی اور کیمیاوی ترقیاں ہمیں اخلاقی انضباط، اعصابی توازن، امن اور سکون عطا نہیں کر سکتیں" [1]

اس دُنیا کے علاوہ کسی دوسری زندگی کی امید نہ ہونے کی وجہ سے اور اس دُنیا کی زندگی میں مصائب و آلام کے ہجوم دیکھ کر رسل جیسا ٹھنڈی طبیعت کا بنا ہوا فلسفی بھی انتہائی مایوسی کے عالم میں چیخ اُٹھتا ہے "آدمی ایسے اسباب کی وجہ سے وجود میں آیا ہے جن پر اس کا کوئی قابو نہیں چلتا اور جن کو خود نہیں معلوم کہ وہ اس کو پیدا کر کے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی آفرینش، اس کا نشو و نما، امید و بیم، اس کی محبت اور عقائد محض چند ذرات کے ایک خاص طرح سے مل جانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کسی قسم کی دلیری، تخیل کی بلند پروازی، حکمت آموزی، شدتِ جذبات اس کو مرنے کے بعد زندگی نہیں عطا کر سکتی اور یہ صدیوں کی کاوشیں، تمام عبادات، تمام تحریکیں، تمام انسانی عبقریت، فنا ہو جانے کیلئے مقدر کی جا چکی ہیں اور یہ کہ تمام انسانی فتوحات ایک دن اس دُنیا کی گرتی ہوئی عمارت کے کھنڈر کے ملبے کے نیچے دب جائیں گی۔ اس لئے انھیں حقائق کی مایوس کن بنیادوں پر ہم روحانی بقاء کی عمارت کو بھی قائم کر سکتے ہیں"۔ [2]

اور یہ رسل کی خطا نہیں بلکہ خدا کے اور حیاتِ ابدی کے وجود سے انکار ہر شخص کے دل میں اس قسم کے مایوس کن جذبات و تخیلات پیدا کر دیتا ہے، اس کو ہر طرف تاریکی نظر آتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ لیکن جو شخص خدا کے عفو و کرم پر بھروسہ رکھتا ہے۔ حیات بعد الموت کا قائل ہے وہ موت کو چنداں خاطر میں نہیں لاتا۔ اور کہتا ہے ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا   اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

یا پھر امیر کے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ؎   موت اک زندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

---

(1) Man The Unknown. By Alenis Carrer. (2) The Revolt against reason. Arnold Lumn. P 177

ابو منظور شیخ احمد
(ناندیڑ۔ دکن)

ایک خوشگوار یاد

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا آخری درسِ اقبالؒ

نواب بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور حیدر آباد دکن کی نہایت قابلِ قدر اور مشہور و مقبول ہستی تھے۔ آپ نے مذہبی، سیاسی، علمی، تنظیمی اور تبلیغی بہت سی بے نظیر خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کی علمی خدمات میں ایک نمایاں اور نہایت مفید خدمت درسِ اقبالؒ کی مجلس کا قیام تھا۔ آپ اقبال کے کلام کے عاشق و شیدائی تھے۔ اس کو خوب گہری نظر سے دیکھا تھا۔ اور اقبال فہمی میں اونچے اور ممتاز مقام کے مالک تھے۔ آپ کو اقبال کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے۔ جنہیں اپنی پُر اثر تقریروں میں برمحل نہایت روانی و برجستگی کے ساتھ استعمال کر کے تقریروں کی اثر انگیزی کو شراب دو آتشہ بنا دیتے تھے۔ آپ کو حضرت اقبالؒ کی ذاتِ گرامی اور اُن کے کلامِ معجز نظام سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اکثر فرماتے تھے:

"کسی کا مہدی کوئی اور ہو تو ہو میرا مہدی اقبال ہے۔"[ؔ]

اقبالؒ سے اسی عاشقانہ تعلق کا نتیجہ تھا کہ آپ کی روح نے جب جسم سے جدائی اختیار کی تو اس وقت بھی آپ کلامِ اقبال پر گفتگو فرما رہے تھے۔ آپ نے اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے، اپنی قوم کے نوجوانوں کو اُن کی تعلیمات کی صحیح اسپرٹ سے واقف کرانے اور لوگوں کے دلوں میں اُن مجاہدانہ ولولوں کو پیدا کرنے کے لئے، جن کی تمنا میں اقبال زندگی بھر تڑپتے رہے۔

ؔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا اصلی نام "بہادر خاں" تھا۔ نظامِ دکن کی موجودگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر آپ نے ایک ایمان افروز اور بصیرت آفریں تقریر فرمائی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر نظام نے آپ کو "بہادر یار جنگ" کا خطاب دیا تھا۔ اس خطاب کے علاوہ آپ حکومت کی جانب سے بہت سے اونچے اعزازات و امتیازات سے بھی بہرہ ور تھے۔ لیکن اس کے باوجود مرحوم ان تمام چیزوں سے فقیرانہ بے نیازی برتتے تھے۔ اور اگر کوئی اُن کے خطاب یا اعزاز پر کبھی کچھ زور دیتا تو وہ فرمایا کرتے کہ پیدا ہوتے ہی میرے ماں باپ نے میرا نام "بہادر خاں" رکھا تھا۔ میں صرف "بہادر خاں" ہوں اور کچھ نہیں۔ اور قیامت میں بھی "بہادر خاں" کے نام ہی سے پکارا جاؤں گا۔ میری تمنا ہے کہ مجھے موت آئے تو اس حالت میں کہ میں ان تمام بوجھل بیڑیوں سے آزاد ہوں۔ چنانچہ وفات سے پہلے انہوں نے اپنی جاگیر، اپنے منصب اور اپنے اعزازات کے ساتھ اپنا خطاب بھی حکومت کو واپس کر دیا تھا اور وفات کے وقت وہ صرف "بہادر خاں" تھے، اس کے باوجود وہ آج تک نواب بہادر یار جنگ کے نام سے ہی متعارف و معروف رہے ہیں۔

ؔ یہاں یہ بات لائقِ تذکرہ ہے کہ اگرچہ مرحوم نسلی اور خاندانی طور پر فرقۂ مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے اور وفات کے بعد بھی انہیں ان کے خاندانی قبرستان ہی میں دفن کیا گیا۔ لیکن اپنے ذاتی مطالعہ و تحقیق کی بناء پر وہ ان غالیانہ معتقدات سے بیزار تھے جن کی بناء پر فرقۂ مہدویہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے الگ ایک مستقل فرقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

درسِ اقبال کی ایک مجلس ترتیب دی تھی اور اس کے لئے بہترین اساتذہ کا انتخاب فرمایا تھا۔ طرز یہ تھا کہ جناب غلام دستگیر صاحب رشید (پروفیسر ادبیات فارسی نظام کالج حیدر آباد) اقبال کا کلام پڑھتے اور الفاظ و اصطلاحات کی تشریح کرتے۔ پھر مضمون پر گفتگو شروع ہوتی۔ تاریخی واقعات کی تشریح ڈاکٹر یوسف حسین خاں (پروفیسر تاریخ جامعۂ عثمانیہ) کرتے۔ طبعیات اور جدید علوم و فنون سے متعلقہ مسائل پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سابق پروفیسر ریاضیات وطبعیات جامعۂ عثمانیہ) روشنی ڈالتے۔ نواب مرحوم اگرچہ ہر موضوع و مضمون پر تقریر فرماتے۔ مگر بالخصوص قرآن کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات کے تعلق سے جب کلامِ اقبال کی تشریح فرماتے تو حدیث نبوی ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا کے مضمون کی جیتی جاگتی تصویر لوگوں کی نگاہوں میں پھر جاتی۔ اقبال کا حکیمانہ کلام اور بہادر خاں کا ساحرانہ بیان جب دونوں اکٹھے ہو جاتے تو غالب کے مشہور مصرعہ "ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا!" کا رنگ پیدا ہو جاتا اور حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے۔ اس درس کی نسبت ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے حسب ذیل الفاظ حقیقت بیانی کا جامع مظہر ہیں :-

> "بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر "نمک مرچ لگانا" شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دُنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے۔ اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ شاید کیا یقیناً کہیں اور نہیں ہوا ہوگا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور اُن کی تمناؤں کا مجسّم نمونہ تھے۔ اور درسِ اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔" (اخبار "تنظیم" حیدر آباد۔ قائد ملت نمبر)

یہ درس ہفتہ واری تھا۔ ہر اتوار کو شام کے وقت مرحوم کی ڈیوڑھی[1] پر تعلیم یافتہ اور اہلِ ذوق حضرات کا اجتماع ہوتا۔ اور اگرچہ کلام کی تشریح میں اساتذہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ سامعین بھی حصہ لے سکتے تھے۔ لیکن جب استاذ الاساتذہ نواب بہادر یار جنگ بہادر اپنے مخصوص اور پُر اثر انداز میں تشریح فرمانے لگتے تو حاضرین ہمہ گوش ہو جاتے اور ایک ایک بات پر سر دُھنا کرتے، اس درس میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" دو کتابیں بہ تمام و کمال پڑھی گئیں۔ جب رموز ختم ہوئی تو نواب نے حاضرین سے مشورہ لیا کہ اب کون سی کتاب شروع کریں؟ حاضرین نے مختلف کتابوں کے نام لئے، نواب نے فرمایا کہ میری رائے میں اقبال کا آخری چھوٹا سا رسالہ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!" شروع کرنا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ نواب صاحب! یہ مثنوی تو اقبال کی آخری مثنوی ہے۔ اسے اس ابتدائی مرحلہ میں پڑھانا تو زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ نواب نے فرمایا "اسے بلا تشبیہ[2] یوں سمجھئے کہ پارۂ عم قرآن کا آخری پارہ ہے۔ لیکن بچوں کو پہلے یہی پڑھایا جاتا ہے۔" یوں بھی نواب مرحوم سے زیادہ بہتر انتخاب اور کس کا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی "پس چہ باید" شروع ہوئی۔ اس کتاب کے ابتدائی چار اشعار بعنوان "بخوانندہ کتاب" "سمیت" دو نظمیں بعنوان "تمہید" و "خطاب

[1] نواب بہادر یار جنگ، مرحوم کی ڈیوڑھی کا نام "مہدوی منزل" تھا مگر آپ نے اُسے "بیت الامۃ" سے بدل دیا۔ نام کی یہ تبدیلی مرحوم کے عقائد کی تبدیلی کا پتہ دیتی ہے۔ [2] کوئی اور تشبیہ دیتے تو مناسب ہوتا (م۔ق)

بہ مہر عالمتاب" پڑھی جا چکی تھیں۔ تیسری نظم بعنوان "حکمتِ کلیمی" کا درس نواب مرحوم و مغفور کی زندگی کا آخری درس تھا۔ ہم اسی آخری درس کی روداد مختصر الفاظ میں یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اولاً اُن تمام اشعار کو یکجا درج کر دیتے ہیں۔ جو اس وقت زیرِ درس تھے، پھر اُن کا لفظی ترجمہ بھی لکھ دینگے۔ "حکمتِ کلیمی" کے زیرِ عنوان اقبال فرماتے ہیں:-

۱۔ تا نبوّت حکمِ حق جاری کند — پشتِ پا بر حکمِ سلطاں می زند
۲۔ در نگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر — غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر
۳۔ پختہ سازد صحبتش ہر خام را — تازہ غوغائے دہد ایّام را
۴۔ درسِ او اللہ بس باقی ہوس — تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس
۵۔ از دمِ او آتش اندر شاخِ تاک — در کفِ خاک از دمِ او جانِ پاک
۶۔ معنیٔ جبریل و قرآں است او — فطرت اللہ را نگہباں است او
۷۔ حکمتش برتر ز عقلِ ذو فنوں — از ضمیرش اُمّتے آید بروں
۸۔ حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج — بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج
۹۔ از نگاہش فرودیں خیزد ز دَے — دُردِ ہر خُم تلخ تر گردد ز مَے
۱۰۔ اندر آہِ صبحگاہِ اُو حیات — تازہ از صبحِ نمودش کائنات
۱۱۔ بحر و بر از زورِ طوفانش خراب — در نگاہِ اُو پیامِ انقلاب
۱۲۔ درسِ لا خوفٌ علیہم می دہد — تا دلے در سینۂ آدم نہد
۱۳۔ عزم و تسلیم و رضا آموزدش — در جہاں مثلِ چراغ افروزدش
۱۴۔ من نمی دانم چہ افسوں می کند — روح را در تن دگرگوں می کند
۱۵۔ صحبتِ او ہر خزف را دُر کند — حکمتِ او ہر تہی را پُر کند
۱۶۔ بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز — ہر کہن معبود را کن ریز ریز
۱۷۔ مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن — از دو حرفِ ربّی الاعلیٰ شکن

ترجمہ:- جب نبوّت حکمِ حق جاری کرتی ہے تو حکمِ سلطاں کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اس کی نگاہ میں شاہی محل ایک پُرانا بُت خانہ ہے۔ اس کی غیرت غیر کے حکم کو برداشت نہیں کرتی۔ اس کی صحبت ہر خام کو پختہ بنا دیتی ہے۔ زمانہ کو تازہ ہنگامہ دیتی ہے۔ اس کا سبق یہ ہے کہ اللہ بس باقی ہوس تاکہ مردِ حق کسی کے جال میں نہ گرے۔ اس کی نمی سے شاخِ تاک میں آگ بھر جاتی ہے۔ کفِ خاک میں اسی کے دم سے جانِ پاک آتی ہے۔ جبریل و قرآن کے معنی ہے وہ اور فطرت اللہ کی نگہبان ہے وہ۔ اس کی حکمت عقلِ ذو فنوں سے برتر ہے۔ اس کے ضمیر سے ایک اُمّت باہر آتی ہے۔ ایسا حکمراں کہ جو تخت و تاج سے بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کلاہ ہے، نہ فوج، نہ خراج۔ اس کی نگاہ سے دے (ٹھنڈک) سے فرودیں (گرمی) اُٹھتی ہے۔ ہر خم کی تلچھٹ شراب سے بھی زیادہ تلخ ہوتی ہے۔ اس کی آہِ صبحگاہ میں زندگی ہوتی ہے۔ اس کی صبحِ نمود سے کائنات تازہ ہے۔ اس کے زورِ طوفاں سے بحر و بر میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔

اُس کی نگاہ میں انقلاب کا پیام ہے۔ وہ لاخوفٌ علیہم کا درس دیتا ہے تاکہ سینۂ آدم میں ایک دل رکھ دے۔ اُسے عزم اور تسلیم و رضا سکھاتا ہے۔ دُنیا میں چراغ کی طرح اُسے چمکاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیا افسوں کرتا ہے جو جسم میں روح کو دگرگوں کر ڈالتا ہے۔ اُس کی صحبت ہر ٹھیکرے کو موتی بنا دیتی ہے۔ اُس کی حکمت ہر تہی کو پُر کر دیتی ہے۔ بندۂ درماندہ سے کہتا ہے کہ اُٹھ اور ہر پُرانے معبود کو ریزہ ریزہ کر ڈال۔ اے مردِ حق! اس دیرِ کہن کا افسوں ربّی الاعلیٰ کے دو حرف سے توڑ ڈال [1]

نظم میں آگے مزید اشعار ہیں مگر سترھویں شعر پر پہنچکر مرحوم نے فرمایا کہ بس یہیں ٹھہر جائیں اور کتاب لے کر اس شعر کے پاس حاشیہ میں دستخط کر دیئے اور تاریخ لکھ دی۔ اس آخری درس کا تاثر خود اس درس کے ایک مُدرس جناب غلام دستگیر صاحب رشید کے قلم سے پڑھنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:-

"حسبِ معمول ۲۵۔جون ۱۹۴۴ء اتوار کے دن شام کو "بیت الامت" (دولت کدہ بہادر یار جنگ مرحوم) میں درسِ اقبال کی حکمت آموز اور دلسوز صحبت جاری تھی حلقۂ اقبال کے بانی اور حکمتِ اقبال کے شیدائی، قائدِ ملّت، لسان الامّت، بہادر خاں مرحوم جن کی سراپا جہاد زندگی خود "درسِ اُو اللہ بس، باقی ہوس" کے مصداق تھی۔ اپنی تہی کو پُر اور خزف کو دُر کرنے والی شرکت سے اس میں

پختہ سازد صحبتش ہر خام را تازہ غوغائے دہد ایام را

کا رنگ پیدا کر رہے تھے۔

جب میں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی جلال آفریں نظم "حکمتِ کلیمی" کے اس شعر

مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن از دو حرفِ ربّی الاعلیٰ شکن

سے آگے بڑھنے لگا تو فرمایا "رشید صاحب! یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں ہیں آج یہیں ٹھہر جائیں"۔ میں نے کہا "بہت خوب!" آہ! کسے خبر تھی کہ یہ مردِ حق دو ایک ہی گھنٹوں کے اندر اس دیرِ کہن کے افسوں کو توڑ کر اپنا ترانۂ عشق شعرِ اقبالؔ سُناتے ہوئے ربّی الاعلیٰ سے جا ملیگا اور تعلیمِ اقبال کا یہ پیکرِ گل اپنے حریفانِ بادہ پیما کو

غیرتِ او برنتابد حکمِ غیر قصرِ سلطاں در نگاہش کہنہ دیر

کے مظاہر سے تا قیامت محروم کر دے گا!" (آثارِ اقبالؔ)

---

[1] حق یہ ہے کہ اقبالؔ کا کلام جامعیت و بلاغت کی رُو سے اتنا معیاری کلام ہے کہ وہ ترجمہ کا کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے یا تو ترجمانی درکار ہے یا تشریح و تفسیر۔ لیکن اس کے باوجود راقم الحروف کا تاثر یہ ہے کہ کلام کا اکثر و بیشتر حصہ اس کا بھی متحمل نہیں، ترجمانی و تشریح جس درجہ کی بھی ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشعار کا اصلی حُسن نکھرنے اور نمایاں ہونے کی بجائے غارت ہو جاتا ہے، بہتر اور صحیح تر یہی ہے کہ کلام کو اس کے اصلی رنگ ہی میں دیکھا جائے اور اصلی الفاظ ہی میں پڑھا اور سمجھا جائے۔ میں نے یہاں صرف غیر فارسی دانوں کیلئے لفظی ترجمہ کر دیا ہے تاکہ اُن مضامین کا سرسری اندازہ ہو جائے جن پر اقبال کا کلام مشتمل ہے!

۲۵ جون ۱۹۴۴ء مطابق ۳۔ رجب ۱۳۶۳ھ کا دن درسِ اقبال کا آخری دن بھی تھا اور خود مرحوم کی زندگی کا بھی آخری دن تھا۔ جب وقت مقررہ پر شائقین جمع ہو گئے تو رشید صاحب نے اشعار پڑھنے شروع کئے۔ سیدھی طرف کے صوفہ پر نواب صاحب تشریف فرما تھے۔ سامنے پورا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ صرف دو صوفے جو سب سے پیچھے رکھے ہوئے تھے خالی تھے۔ آخری قطار میں، ماہر القادری صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر رضی الدین صاحب بھی تشریف لائے اور خود نواب صاحب نے سلام میں پہل کی۔ پھر نواب صاحب کی نظر ماہر صاحب پر پڑی تو فرمایا کہ "اہا! نہیں معلوم ماہر صاحب کیوں پیچھے چپکے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آئیے نزدیک! میں نے آپ کو عصر کی نماز میں دیکھا تھا۔ پھر یکایک غائب ہو گئے اور اب نظر آرہے ہیں"۔ ماہر اُٹھے اور جا کر صدر صوفہ پر رضی الدین صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب چوتھا شعر پڑھا گیا تو نواب مرحوم نے اس کی تشریح میں صحابہ اور اولیاء کے بہت سے واقعات سنانے شروع کئے اور فرمایا کہ دیکھئے یہ حضرات کس طرح "اللہ بس باقی ہوس" کی زندہ تصویر تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ جنگ بدر یا جنگ اُحد میں حضرت عبدالرحمٰن کافروں کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کی یاد دلاتے ہوئے اپنے باوا سے کہا کہ اُس جنگ میں آپ عین میری زد میں تھے۔ چاہتا تھا کہ ایک ہی وار میں کام تمام کر دوں مگر محبتِ پسری غالب آگئی۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے اہا ہا کیا جواب دیا تھا۔ فرمایا۔ "ارے وہ تیری محبتِ پسری نہیں تھی بلکہ تیرے کفر کا ضعف تھا۔ اگر تو میری زد میں ہوتا تو ایمان کے سامنے میری محبتِ پدری ہرگز جوش نہ کھاتی اور ایسا بھرپور ہاتھ مارتا کہ تسمہ لگا نہ رہتا"۔

مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک اللہ اور اُس کی محبت ہی کافی تھی۔ اس کے سوا ہر چیز کو وہ ہیچ سمجھتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بڑے زبردست اور مالدار صحابی تھے اور تاجر تھے۔ ایک بار آپ کے مالِ تجارت کے سلسلہ میں غالباً پانسو اونٹ آئے۔ جس سے مدینہ میں ایک ہلچل مچ گئی۔ حضرت عائشہؓ نے جب یہ ہنگامہ دیکھا تو حال دریافت کیا۔ لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کا ذکر کیا۔ ام المومنین نے فرمایا۔ "مجھے حضور رسالت مآبؐ کا ایک ارشاد یاد آتا ہے کہ میرے تمام اصحاب جنت میں جائیں گے لیکن بعض گھسٹتے ہوئے جائیں گے۔ جب عبدالرحمٰن کے پاس اتنا مال ہے تو اُن کے دل میں اللہ کے لئے کیا جگہ رہی ہوگی"۔

کسی نے یہ بات عبدالرحمٰن سے آکر بازار میں کہہ دی۔ آپ بہت متاثر ہوئے۔ اور فوراً ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو قریب بلانا شروع کیا۔ چونکہ ملک التجار تھے اور بازار کے نرخ یہی بیان کیا کرتے تھے۔ اس لئے لوگ جوق جوق آنے لگے اور انہوں نے سمجھا کہ بازار کے اُتار چڑھاؤ سے واقف کرانا چاہتے ہیں۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے کہا کہ "میں نے اپنا یہ سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیا۔ جس کا جو جی چاہے اُٹھا لے"۔ اور فوراً ام المومنین کے پاس پہنچ کر عرض کیا کہ یا ام المومنین! میرے دل میں سوائے اللہ کے کسی کی جگہ نہیں ہے۔

غرض یہ حضرات عشقِ الٰہی اور عشقِ نبویؐ میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ دوسری ساری چیزیں انہیں "ہوس" نظر آتی تھیں۔ عشقِ نبویؐ کا ذکر آیا تو حضرت عمرؓ کا واقعہ سنایا۔ ایک بار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا تھا کہ جب تک کسی کے دل میں رسولؐ کی محبت ہر چیز سے زیادہ نہ ہو وہ کامل مسلمان نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! مجھے آپ سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہیں، بجز میری جان کے۔ اس پر حضورؐ نے

حضرت عمرؓ کو نزدیک بلایا اور اُن کے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ گویا عمرؓ کی قلب ماہیت کر دی۔ اُن کی روح کو بدل دیا۔ اور اُس میں قوت و نورِ ایمانی کا ایک دریا بہا دیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ قسم خدا کی اب بجز آپؐ کے دُنیا کی کوئی چیز مجھے عزیز نہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مرید نے ایک خوبصورت جڑاؤ کٹورا آپ کو نذر دیا تھا۔ جس کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ اس سے پانی پیتے تھے۔ ایک دن وہ چوری گیا۔ اس کی خبر آپ کو دی گئی تو آپ نے اپنے دل کی طرف توجہ کی اور الحمد للہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ لیکن اس وقت پاسِ ادب سے خاموش ہو رہے۔ کوتوال شہر آپ کے مُریدوں میں سے تھا۔ اُس نے تفتیش کی اور کٹورا برآمد کر لیا۔ جب کٹورا سامنے آیا تو آپ نے پھر دل کی طرف توجہ کی اور الحمد للہ کہا۔ لوگوں نے دونوں وقت الحمد للہ کہنے کا سبب پوچھا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ جب کٹورا گم ہو گیا تو میں نے یہ دیکھنے کے لئے دل کی طرف توجہ کی کہ کہیں غم کے آثار تو وہاں نہیں پائے جاتے۔ جب معلوم ہوا کہ غم کا کچھ اثر نہیں ہے تو خدا کا شکر ادا کیا۔ اسی طرح کٹورا مل جانے پر جب دل میں خوشی کا اثر نہیں پایا تو خدا کا شکر بجا لایا۔

یہ تھے مومن، ان لوگوں کا دل صرف اللہ ہی کا تصوّر و تخیل رکھتا تھا۔ اس کے سوا کوئی چیز اس میں جگہ نہ پا سکتی تھی۔

چھٹے شعر میں فطرۃ اللہ کا لفظ تھا۔ اس کی تشریح اپنے لاجواب انداز میں کی۔ فرمایا:

"ہر بچّہ اپنی فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے، ماں باپ کا اثر قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہندو کی اولاد ہندو ہی بن کر اٹھتی ہے اور آج ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہم "خاندانی مسلمان" بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم صرف اس وجہ سے مسلمان ہیں کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے۔ ورنہ عمل دیکھئے تو مسلمانی کا فقدان ہی فقدان ہے۔ اگر بچّے کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھ کر پرورش کیا جائے تو وہ بالکل فطرتِ صحیحہ پر رہے گا اور اس کی فطرتِ صحیحہ خود اس کو خدا کا ادراک کرا دے گی لیکن فطرتِ صحیحہ کا ایک افضل و بلند مقام بھی ہے اور وہ ہے خارجی اثرات اور ماحول کی مخالفت کے باوجود اپنی فطرتِ صحیحہ پر قائم رہنا۔ یہ مقامِ ابراہیمی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بالکل کافرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ لیکن اُن کی طبع سلیم و عقلِ سلیم نے انھیں ادھر اُدھر بھٹکنے نہ دیا۔ اور وہ برابر سیدھی راہ پر بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ خدا تک پہنچ گئے اور اِنّی وجہت وجھی ..... الخ پکار اٹھے فطرۃ اللہ افراط و تفریط کے درمیان ہوتی ہے۔ فطرۃ اللہ ہی اسلام ہے اور اسلام ہی فطرۃ اللہ ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات عین مطابقِ فطرت ہیں۔"

نویں شعر میں "فروردیں" اور "دَے" کا ذکر آیا تو نواب صاحب نے ایرانی مہینوں اور موسموں پر بھی سیر حاصل بحث کر ڈالی۔ اور کہا کہ ایران میں مہینے فروردی سے شروع ہوتے ہیں۔ یہاں حیدرآباد میں بھی جب یہ مہینے رائج کئے جانے لگے تو فروردی ہی سے رائج کئے گئے۔ لیکن اس سے یہاں کے موسم ٹھیک نہیں بیٹھتے تھے اور تیر میں سرما آتا تھا۔

لے مہینہ کا نام

اس لئے غالباً آبان سے شروع ہونے لگے۔ لیکن اس صورت میں بھی موسموں پر صحیح نہ بیٹھنے سے آخر مختار الملک کے زمانہ سے آذر سے سرکاری سال کا آغاز ہوا۔

دسویں شعر میں "آہِ صبحگاہ" کا ذکر آیا تو علامہ اقبال کا مشہور شعر پڑھا کہ:-

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو   کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی!

اور اُن سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے کہ اقبال دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم تھے۔ میں اُن سے ملنے گیا اور تعارف کرایا کہ "میں حیدر آباد سے آیا ہوں"۔ کہنے لگے "مجھے تم سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں، صبح کب اُٹھتے ہو؟" میں نے کہا "نماز کے لئے"۔ فرمایا "بس کافی ہے، نماز کے بعد سیدھے چلے آنا"۔ چنانچہ دوسرے دن صبح نماز کے بعد پہنچا۔ وفادار ملازم علی بخش نے کہا "آپ چپکے سے کرسی پر بیٹھ جائیے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اشعار لکھ رہے ہیں"۔ میں نے دیکھا کہ سر اقبال چادر اوڑھے تخت پر اکڑوں بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں کاغذ ہے اور اشعار لکھ رہے ہیں۔ میری طرف نظر پڑی تو کاغذ رکھ دیا اور باتیں شروع ہوئیں۔ اسی صحبت میں اقبال نے فرمایا تھا کہ وہ کبھی طلوعِ آفتاب کے بعد نہیں اُٹھے!

بارھواں اور تیرھواں شعر زیرِ درس آیا تو آیتِ کریمہ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون کی تفسیر نہایت ہی بلیغ و فصیح پیرایہ میں کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے لئے سب سے زیادہ اسباب حزن و ملال پیدا کرتا ہے لیکن وہ ان کو متاثر نہیں کر سکتے اور نہ اُن پر غالب آسکتے ہیں۔ اللہ کے قرب کا مقام بھی بڑا نازک مقام ہے کیونکہ جہاں انعام واکرام ہوا کرتا ہے وہاں نزدیک ہونے سے موردِ عتاب و خفگی ہونے کا بھی ہر دم اندیشہ رہا کرتا ہے، بلاتشبیہ بادشاہ کے قرب کا بھی یہی حال ہے۔ جس دن ہارون نے برمکی کو قتل کروایا تھا اُسی دن صبح میں اس کے پاس اتنے تحائف بھیجے تھے کہ زندگی میں کبھی نہ بھیجے تھے۔ اللہ کے مقبول بندے صرف اللہ کی رضا کے طالب ہوا کرتے ہیں۔ وہ اس سے اسی کو مانگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا جس کا ہو گیا اسے پھر کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی۔ ایک بادشاہ تھا، ایک دن خوشی کی ترنگ میں حکم دے دیا کہ ہمارے خزانے کھول دو اور اعلان کر دو کہ جو شخص جو چاہے مانگ لے، اُسے مل جائیگا۔ چنانچہ ہر شخص اپنی اپنی پسند کی چیزیں اُٹھانے لگا۔ اتنے میں ایک لونڈی آئی اور ہر چیز سے اپنا دامن بچاتی ہوئی بڑی احتیاط سے بادشاہ کے قریب پہنچی۔ اور اُسے آہستہ سے چھو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے اُسے دیکھا اور کہا کہ کھڑی کیوں ہے۔ کوئی چیز اُٹھا کیوں نہیں لیتی؟ لونڈی نے کہا۔ میں کوئی چیز کیا اُٹھاؤں، میں نے ان چیزوں کے دینے والے ہی کو لے لیا۔ یہ عشق کی بلندترین منزل ہے۔ اور اللہ و رسول کے عاشقوں کی یہی شان ہوا کرتی ہے۔ عشقِ رسولؐ کی کیفیت سے مرد تو مرد عورتیں تک متکیف رہی ہیں۔ چنانچہ حضور انورؐ کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مسلمان خاتون جو غالباً مکہ میں تھیں یہ سن کر کہ لڑائی میں حضورؐ کام آئے، بے تحاشہ مدینہ کی طرف دوڑ پڑیں۔ راستہ میں کچھ لوگ ملے اور انہوں نے کہا کہ تمہارے بھائی جنگ میں ختم ہو گئے۔ ان خاتون نے کہا کہ الحمدللہ۔ مگر یہ بتاؤ کہ رسولؐ اللہ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ اچھے ہیں۔ خوش ہو کر آگے بڑھیں۔ کچھ اور لوگ ملے اور انہوں نے ان کے شوہر کے شہید ہونے کی خبر سنائی۔ مگر اس پر بھی ان خاتون نے الحمدللہ کہا اور رسولؐ اللہ کی خیریت دریافت کی۔ یہاں تک کہ جب مدینہ پہنچیں تو رسولِ اکرمؐ کو زندہ اپنے سامنے دیکھ کر پکار اُٹھیں "یا رسول اللہ! دنیا کے سب مصائب آپ کے سامنے ہیچ ہیں"۔ یہ مقام ایمان کی بیش قوتی اور یقین کی پختگی کا ہے اور یہی مقام لاخوف علیہم ولاھم یحزنون کا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص مجسم عشق و یقین بن جاتا ہے، وہ اسباب خوف و ہراس کے

سامنے ناقابلِ شکست چٹان اور پہاڑ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ دوسرے خود اُس کی پناہ لے کر بچ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ غالباً غزوۂ احزاب میں ایسے زور کا رن پڑا کہ خود میرے پاؤں اُکھڑ گئے۔ حضورؐ تو یقین و ایمان کا لافانی پہاڑ تھے اپنے قریبی صحابی غالباً حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ "ارے یہ لوگ بھاگے کیوں جاتے ہیں، ان کو روکو، میری آواز بھاری نہیں ہے اس لئے تم انھیں پکارو کہ محمدؐ یہاں ہے، اور نعرہ لگاؤ کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ چنانچہ ان صحابی نے آواز دی۔ اور سب لوگ آپؐ کے اطراف جمع ہو گئے۔ لڑائیوں میں جب کبھی حالات ناسازگار ہو جاتے تو تمام صحابہ حضورؐ ہی کے اطراف پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ خود صحابہ فرماتے ہیں کہ "ہم خواہ کتنے ہی خوفزدہ ہوتے لیکن آپؐ کے نزدیک پہنچتے ہی ہم میں پھر سے یقین و ایمان کی زبردست قوت پیدا ہو جاتی"۔

نواب صاحب یہ واقعات سنا رہے تھے اور اشعار کی تعریف بھی فرماتے جا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ اہاہا شاعر ایسا ہوتا ہے کہ جس کا دل "عزم و تسلیم و رضا" کے جذبات سے معمور ہوا کرتا ہے۔ اصل میں اس کا دل مومن ہوتا ہے۔ پھر ماہر کی طرف اشارہ کر کے مزاحاً فرمایا۔ کہ "یہ تو نہیں لیکن ان کے گروہ کے لوگ عجیب ہیں۔ ان کے دل تو جہاں چاہتے ہیں، اٹک جاتے ہیں"۔ پھر ہنستے ہوئے کہا کہ "ایک صاحب تو بے دل ہی ہیں"۔ اس پر مجلس میں خوش طبعی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حاضرین میں سے ایک بڑے میاں نے کہا کہ "نہیں نواب صاحب! ماہر صاحب کو خدا اچھا رکھے، یہ ایسے نہیں ہیں"۔ نواب صاحب نے فوراً کہا کہ میں انھیں کب کہتا ہوں۔ میں تو ان کے گروہ سے متعلق کہہ رہا ہوں"۔

سولھواں شعر پڑھا گیا تو نواب صاحب مرحوم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام رسولؑ عمداً بے سروسامانی میں پیدا کئے گئے تاکہ یہ بتایا جائے کہ کس طرح بے سروسامانیوں میں سے سامان و اسباب پیدا کر کے اور مفلوج، مفلوک اور مغلوب لوگوں میں سے ہادی و پیغمبر کو اٹھا کر اللہ تعالیٰ انھیں دوسری اقوام پر غلبہ و تسلط بخشتا ہے۔ ابراہیمؑ اپنے بُت تراش چچا کے گھر میں بڑھتے ہیں۔ گھر کا ماحول ہی بتوں کا ہے۔ لیکن وہ بُتوں کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر خدا نہیں ہو سکتے۔ تاروں اور سورج چاند کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ غروب اور غائب ہونے والی چیزیں خدا نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح فطرتِ صحیحہ پر قائم رہتے ہوئے "فطرۃ اللہ" کو پا لیتے ہیں اور ایسے اُونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ دُنیا کی امامت انھیں سونپی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اپنے دشمن کے گھر میں پل کر جوان ہوتے ہیں، بڑے ہو کر ایک قبطی کو طمانچہ مارتے ہیں۔ جس سے وہ مر جاتا ہے۔ پھر بھاگ کر کنعان میں بارہ سال غائب اور پناہ گزیں رہتے ہیں۔ (غالباً اُس زمانہ کا قانون یہ تھا کہ بارہ سال کے بعد قتل کی سزا معاف ہو جایا کرتی تھی۔ یا پھر غالباً یہ خیال تھا کہ لوگ بھول گئے ہوں گے) بارہ سال کے بعد بیوی کو لے کر نکلتے ہیں اور راستہ میں آگ لینے جاتے ہیں اور پیمبری لے کر آتے ہیں۔ لیکن پریشان ہیں کہ میں اکیلا باغیوں اور طاغیوں کا مقابلہ کس طرح کر سکوں گا۔ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار و وزیر بنا دے۔ غرض یہ بے سروسامانیاں تھیں لیکن اللہ ان کو صرف ایک ڈنڈا دیتا ہے کہ جاؤ یہ تمہاری کافی مدد کرے گا۔ حضرت عیسیٰؑ عین بے سروسامانیوں میں بے باپ کے پیدا ہوتے ہیں۔ ماں بیچاری اکیلی اور بے سہارا ہے اور لوگوں کی دشنام طرازی سے پریشان۔ لیکن انھی بے سروسامانیوں میں پل کر وہ جوان ہوتے ہیں اور اسرائیلی بھیڑوں کو سیدھی راہ پر لانے کا کام انھیں سپرد کیا جاتا ہے۔ حضور اکرمؐ باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ماں اور دادا چھوٹی سی عمر میں مر جاتے ہیں۔ چچا بیچارا جس کے خود "ٹوکری بھر بچے" تھے۔ حتی الامکان مدد کرتا ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کرتے ہیں لیکن وہ برابر بڑھے جاتے

یں - اور اپنے مشن کو پورا کر دکھاتے ہیں - بہرحال تمام رسول جن کو اپنی شریعت دے کر بھیجا گیا تھا - اسی طرح بے سروسامانی
ں پیدا کئے گئے اور اسی میں سے اُن کے لئے سامان و اسباب فراہم کیا گیا - بجز اُن چند پیغمبروں کے جن کی اپنی شریعت
نہیں تھی - بلکہ وہ سابقہ پیغمبروں اور رسولوں کی تعلیم کی تجدید کے لئے بھیجے گئے تھے، انھیں بے سروسامانیوں میں پیدا نہیں
کیا گیا - مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ

مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا اس لئے رشید صاحب اشعار پر سے جلد جلد گزر رہے تھے - نواب صاحب نے فوراً کہا
کہ "جناب! یہ اشعار اتنے جلد گزرنے کے نہیں - آج پڑھ لیجئے - انشاء اللہ آئندہ صحبت میں اُن پر بحث کریں گے"، چنانچہ
درس ختم ہو گیا - گزشتہ اتوار کو مدراس کے ایک صاحب (جو حیدر آباد میں لیکچرار تھے) ایک تقریر لکھ کر یہاں پڑھنے کے
قصد سے آئے تھے - یہ تقریر انہوں نے مدراس میں پڑھنے کے لئے تیار کی تھی اور یہاں انھیں غالباً رضی الدین صاحب
یا رشید صاحب ساتھ لائے تھے - لیکن جب انہوں نے یہاں یہ عالمانہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو مرعوب ہو گئے - اور چونکہ دیر بھی
ہو گئی تھی اس لئے نواب صاحب نے فرمایا کہ "آج تو خیر دیر ہو گئی ہے - لیکن انشاء اللہ آئندہ اتوار اسے ضرور سنیں گے بلکہ
افتتاح اسی سے ہوگا" پھر اُن صاحب کی طرف دیکھ کر کہا کہ "دیکھئے! آپ بچ نہیں سکتے کیونکہ ایسے معاملوں میں ہم سُود در سُود
وصول کرنے کے عادی ہیں" مگر وہ اس اتوار کو نہیں آئے تھے اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب کی زبانی کہلوا دیا تھا کہ اجی جناب
اُن جیسے قابلوں میں تو میں کچھ تقریر نہیں کر سکتا اور اب آنا بیکار ہے کیونکہ اصرار ہوگا اس لئے معافی چاہتا ہوں - جب نواب
صاحب سے ڈاکٹر صاحب نے یہ بات کہی تو نواب صاحب ہنسے اور صوفہ سے اُٹھتے ہوئے کہا "بھوت اچھا حضرت بھوت
اچھا"[1] اب نماز مغرب کے لئے سب باہر نکل چکے تھے - پہلو کے کمرہ میں نماز کا انتظام ہو رہا تھا - نواب صاحب اُس وقت
ہلکا جوتا، چوڑی دار پاجامہ اور ناسی رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے تھے جو کفن پہنانے تک جسم پر رہی - سر کھلا تھا - اس وقت
چہرہ عجیب طور پر نورانی اور رعب دار معلوم ہوتا تھا - کلامِ اقبال کا نشہ سر میں سمایا ہوا تھا اور اقبال کے حسب ذیل اشعار
اور مصرعے بار بار نہایت ذوق سے پڑھ رہے تھے:-

"کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی"

"تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول"

"ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!"

اور یہ مصرعہ کہ "حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں" بار بار عجیب پُر اثر انداز میں پڑھتے جاتے تھے بلکہ دو چار
روز پہلے ہی سے یہ مصرعہ وردِ زبان تھا - جس کی معنویت اور حقیقت چند ہی گھنٹوں کے بعد ظاہر ہو گئی - جب یہ ذوقِ سفر کا
شیدائی قیدِ حیات سے آزاد ہو کر سفرِ آخرت اختیار کر گیا ـــــ نماز کے لئے سب کھڑے ہو گئے تھے، جانمازیں کم ہوئیں تو

[1] یعنی بہت اچھا حضرت بہت اچھا، نواب صاحب مرحوم کبھی کبھی بطور مزاح عوامی بولی خصوصاً حیدر آبادی عوام کی بولی
ایسی روانی اور بے تکلفی سے بول جاتے تھے کہ معلوم ہوتا جیسے سچ مچ دیہاتی ہی ہیں اور انھیں شہر کی ہوا تک نہیں لگی
مرحوم کو دیہاتی اردو اور اُس کے محاوروں میں بھی ایسا کمال حاصل تھا کہ گھنٹوں وہ اسی زبان میں تقریر کر سکتے تھے -
اور انہوں نے بعض دیہات میں تقریریں کی ہیں -

نواب صاحب نے اندر سے اپنی جانماز اور چادر منگوائی اور ایک صاحب کو جو وہاں اکثر مغرب کی نماز پڑھایا کرتے تھے، امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا۔ نواب صاحب نے دیسی رومال سے جو اکثر ساتھ رہتا تھا "پٹھانی طریقہ" پر اپنا سر لپیٹ لیا اور صفِ اوّل میں شریک ہوگئے ــــ یہ مرحوم کی حیاتِ دنیوی کی آخری نماز تھی ــــ نماز کے بعد نو دس آدمیوں کے سوا سب چلے گئے۔ رک جانے والوں میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب، رشید صاحب اور ماہر القادری بھی تھے۔ اب یہ سب برآمدہ میں چھوٹی میز کے اطراف کھڑے تھے اور متفرق گفتگو میں کر رہے تھے۔ جن میں بعض شہر کے مقامی مسائل سے متعلق تھیں۔

اسی دوران میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے اخبار "اقبال" ہفتہ وار مورخہ یکم رجب ۱۳۶۳ھ کی طرف نواب صاحب کی توجہ مبذول کرائی۔ اس اشاعت میں ایک نوٹ کے ذریعہ نواب صاحب کو جاگیر کی واپسی پر مبارکباد دی گئی تھی۔ نواب صاحب نے اس نوٹ کو باآواز بلند پڑھنا شروع کیا:-

"ذاتِ شاہانہ نے قایدِ ملت کے گزرانے ہوئے اعزازات کو واپس فرما کے نہ صرف قایدِ ملت بلکہ ملک پر ایک احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ حکیم السیاست سلطان العلوم اپنے خادموں کے اعمال، ان کی خدمات اور ان کے احساسات کو بلا امتیاز مذہب و ملت قدر کی نگاہ سے ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اور جب کوئی خادم کسی غلطی کا مرتکب ہو رہا ہو یا حد سے تجاوز کر رہا ہو تو فوری تنبیہ فرما کے اُس کو صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی ہدایت فرماتے ہیں ــــ (جب یہاں پہنچے تو مسکراتے ہوئے مزہ لے کر کہا کہ "ایں! میں نے غلطی کیا کی؟ اے لو! مجھ کو قصوروار بھی قرار دے دیا") تاکہ زمانہ کی اندھادھند تقلید سے وہ سپید و سیاہ میں کھو کر کہیں اپنے مقام سے نہ ہٹ جائے۔

وہ قایدِ ملت جو اپنے اندر ایک تڑپتا ہوا دل اور ملک و مالک کا درد رکھتا ہو اور جو تختِ آصفی کی بقا کے لئے جانی و مالی قربانی سے منہ موڑنا کفر و الحاد تصور کرتا ہو۔ اُس کی عقیدت مندی اور گفتار و کردار کو کچھ اس کا مالک ہی بہتر سمجھ سکتا ہے (اس جملہ کو پڑھ کر فرمایا کہ "خوب! مجھ سے مقاماتِ سلوک بھی طے کروائے گئے ہیں) دُور سے دیکھنے والے ان حقائق سے کس طرح صحیح طور پر واقف ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے سچ فرمایا ہے:-

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے ۔۔۔ پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

ہم ان اعزازات کی واپسی پر قایدِ ملت کو نہیں بلکہ سارے ملک کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔

توقع ہے کہ بہادر خاں، بہادر یار جنگ کے روپ میں پھر سے جلوہ گر ہو کر اپنے سوئے ہوئے طبقہ جاگیرداراں میں احساسِ خدمت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں جو مقامی اخبارات اور حکومتِ وقت کی روش سے متعلق تھیں۔ اب ساڑھے آٹھ بلکہ نو بج گئے تھے۔ نواب صاحب مرحوم بالعموم اُس وقت زنانے میں تشریف لے جاتے تھے لیکن آج انھیں میر ہاشم علی خاں صاحب جج ہائیکورٹ کے ہاں رات کے کھانے پر جانا تھا اس لئے زنانہ میں جانے کی بجائے وہ باہر ہی سے چل پڑے۔ شوفر سے کہا کہ شاید مجھے واپسی میں بہت دیر ہو جائے، تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوگی اور خود موٹر چلاتے ہوئے دعوت میں تشریف لے گئے۔ یہ دعوتِ طعام

تھی، اصل میں دعوتِ مرگ تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور دیگر اصحاب پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ کھانے میں کچھ دیر تھی، گفتگو وں کا
سلسلہ جاری تھا۔ کلامِ اقبال ہی کا تذکرہ تھا۔ مرحوم اپنے انوکھے انداز میں اُس کے محاسن پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اس دوران میں
ایک حقہ مرحوم کے قریب رکھ دیا گیا۔ ابھی دو ایک کش بھی نہ لے سکے تھے کہ ایک زبردست جھٹکا محسوس ہوا۔ اور اس کے معاً بعد
ایک تشنجی دورہ بھی۔ حقہ کی نَے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سر نیچے آ گیا۔ ابھی لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ روح نے بدن کو
چھوڑ دیا اور یہ "مردِ حق"۔ دیر کہن" کے" افسوں" کو توڑ کر ربی الاعلیٰ سے جا ملا۔ اِنَّا للہ وانّا الیہ راجعُون!

انتقال کی اطلاع بہت سے لوگوں کو رات میں مل گئی اور بہت سے لوگوں کو صبح اس کی خبر ملی۔ مولانا عبدالجبار صاحب
(سابق واعظ سرکار عالی) کا بیان ہے کہ انہوں نے شبِ وفات ایک خواب دیکھا۔ کسی بڑے ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال
بے قراری اور بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں، چہرہ سے بے حد رنج و ملال ٹپک رہا ہے۔ موصوف نے دریافتِ حال
کی تو علامہ نے فرمایا کہ "میرے بچے کا انتقال ہو گیا ہے"۔ یہ کہہ کر علامہ ایک طرف چلے، موصوف بھی ساتھ ہو گئے۔ سامنے
ریل کے ڈبہ میں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، اور وہ سب سوگوار و غمگین تھیں۔ اس کے معاً بعد خواب ختم ہو گیا۔ بیدار ہوتے ہی مولانا موصوف
کا ذہن علامہ اقبال کے فرزند جاوید کی طرف منتقل ہوا اور وہ اسی فکر و پریشانی میں صبح تک جاگتے رہے۔ لیکن فجر کی نماز کے
بعد انھیں بہادر خاں کی وفات کی دلخراش و جگر شگاف خبر ملی اور معلوم ہوا کہ آخری وقت وہ اپنے روحانی باپ ہی کا ذکر کر رہے تھے!

اللہ تعالیٰ اِن دونوں روحانی باپ بیٹوں اور اُستاد شاگردوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اُن پر اپنی رحمتِ کاملہ نازل کرے
ان کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ان کی باقیاتُ الصالحات سے مسلمانوں کو مستفید ہونے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

ہر القادری

صُبحِ نو

بارک اللہ! یہ طلوعِ سحر
سامنے ہے نشانِ راہگزر
چشمِ نرگس بھی ہو گئی بیدار
دیکھ کر بوئے گُل کو گرمِ سفر
نبضِ خس میں بھی روح دوڑ گئی
دلِ شبنم میں جاگ اُٹھے ہیں شرر
بلبلوں کی چہک میں سوزِ یقیں
طوطیوں کو کلامِ حق ازبر
شاخ لچکی ہوا کے نغموں سے
سبزہ جاگا ہے زمزمے سُن کر
صبح دم اُوس کے سکوروں میں
خندۂ گُل نے گھول دی ہے شکر
بادۂ پرتگال کے بدلے
لائے کوزوں میں زمزم و کوثر
شرم و غیرت کے ہیں لطیف حجاب
مہ وشوں کے حسین چہروں پر
سادگی بھی وقار و عصمت بھی
ایک سے ایک قیمتی زیور

اپنی محفل ہے اپنے جلوے ہیں
رخصت اے رونقِ متاعِ دگر
اپنے معدن ہیں اپنے گلشن ہیں
اپنے پھول اور اپنے لعل و گہر
ایک کشتی کے سب مسافر ہیں
ایک ہے ایک سب کا نفع و ضرر

بوریا، تخت کے مقابل ہے
اب نہیں کوئی طغرل و سنجر

یہ محبت کے ناوک دلدوز
یہ خلوص و وفا کی تیغ و سپر
عزمِ بیباک کی کمندیں ہیں
جوشِ خود دار کی زرہ بکتر
ہر مجاہد کی ہیں نگاہوں میں
بدر و یرموک و خندق و خیبر
ہمرکابی میں عزّت و اقبال
ہیں جلو میں نشانِ فتح و ظفر

جاگ اُٹھا ہے عزمِ ابراہیمؑ
اب نہ اُبھرے گی صنعتِ آذر
تجربہ نے یہ راز کھول دیا
بے یقینی ہے مرگِ قلب و نظر
جلوہ گر ہیں نشان سجدوں کے
اہلِ اخلاص کی جبینوں پر
اپنے اللہ پر بھروسا ہے
اب کسی کا نہ خوف ہے نہ خطر
کوئی عشوہ نہ دے سکے گا فریب
اب نظر ہے کتاب و سنّت پر
ہر نفس میں ہے نغمۂ تکبیر!
دل کی دھڑکن ہے یا اذانِ سحر

☆

شعلہ و شبنم

قابل اجمیری

وہ خیالوں میں کہیں شعلہ کہیں شبنم رہے ہے
ایک اندازِ کرم کے مختلف عالم رہے ہے

بات بھی تشنہ رہی الفاظ بھی مبہم رہے ہے
عہد و پیمانِ نظر لیکن بڑے محکم رہے ہے

سینہ چاکانِ چمن سے پوچھیے شانِ حیات
مسکرا کر بھی شریکِ گریۂ شبنم رہے ہے

تو یہ تو انداز سے آتا ہے ظالم سامنے
آدمی آخر کہاں تک بے نیازِ غم رہے ہے

ربطِ خاطر کی نزاکت کو سمجھ سکتا ہے کون
آرزو کی آپ نے، محوِ تجسس ہم رہے ہے

ہر نفس بھی حادثہ ہر آرزو بھی حادثہ
حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے ہے

انقلابوں سے ہماری سخت جانی پوچھیے
مٹتے مٹتے بھی نشانِ عظمتِ آدم رہے ہے

مجھ سے ہمدردی تو ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو
میری آنکھیں سوکھ جائیں تیرا دامن نم رہے ہے

جلوہ گاہِ ناز سے بھی تشنہ کام آئے ہیں لوگ
جانے امیدیں زیادہ تھیں کہ جلوے کم رہے ہے

قابل اپنا دردِ محرومی سمجھ سکتا ہے کون
عمر بھر طوفاں سے کھیلے تشنۂ شبنم رہے ہے

کوثر نیازی

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے
فریاد! کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے

کیا چیز ہے اللہ رے وہ شوخ تبسم
اب ایک بھی ظالم کی جفا یاد نہیں ہے

اب عشق بھلا بیٹھا ہے اخلاص کا انداز
اب حسن کو پہلی سی ادا یاد نہیں ہے

صیاد نہ کر نغمہ سرائی کے تقاضے
اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے

راہی بلند شہری

جس پہ گزرا ہی نہ ہو مرحلۂ گیسو و قد
وہ بھلا مرحلۂ دار و رسن کیا جانے

جس کے شانوں پہ نہ بکھری ہوں گھنیری زلفیں
وہ بھلا سایۂ شمشاد و سمن کیا جانے

جس نے لوٹی ہی نہ ہو جلوۂ عارض کی بہار
وہ بھلا جلوۂ گلرنگِ چمن کیا جانے

کوئی پُرکیف نغمہ چھیڑ مطرب!
یہ رنگیں شام پھر آئے نہ آئے

رات ڈھلنے کو ہے بجھنے کو ہیں محفل کے چراغ
اور کچھ دیر ذرا دور چلے اے ساقی

روحِ انتخاب

جو شخص کہتا ہے کہ اسلام آجانے کے بعد بھی ادیانِ سابقہ کا اتباع درست ہے، وہ در اصل اسلام سے دعوتِ عام کا حق
چھینتا ہے۔ کیونکہ جب اسلام کے سواء دوسرے طریقوں سے بھی ہدایت ممکن ہو تو تمام اقوام و ملل کو اسلام کی طرف دعوت
ایک فضول حرکت ہوگی اور جو شخص کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہر زمانہ کی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے
ترمیم اور اصلاح و اضافہ ہوسکتا ہے تو وہ در اصل اسلام سے دوام کا حق سلب کرتا ہے۔ کیونکہ جو دین ناقص
اور حذف و اضافہ کا محتاج ہو وہ ہمیشہ کے لئے ذریعہ ہدایت ہونے کا دعویٰ کرے تو اُس کا دعویٰ جھوٹا ہوگا۔ پھر جو
شخص کہتا ہے کہ اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی انبیاء کے آنے کی گنجائش ہے وہ درحقیقت اسلام کے
استحکام پر ضرب لگاتا ہے۔ نبوت کا دروازہ کھلا رہنے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی جمعیت ہمیشہ پراگندگی اور تفریق
کے خطرہ میں مبتلا رہے یا ہر نئے نبی کے آنے پر کفر اور اسلام کی ایک نئی تفریق ہو اور ہر ایسے موقع پر بہت سے وہ لوگ
اسلام سے خارج ہوتے چلے جائیں جو خدا پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والے ہیں!

پس اسلام میں نبوت کا فتح باب درحقیقت فتنے کا فتح باب ہے، اسلام کی بیخ کنی کے جتنے اسباب ممکن ہیں

ان میں سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام میں نبوت کا دعویٰ کرے!

اُمتِ مسلمہ کا نظامِ جمعیت اسی بنیاد پر تو قائم کیا گیا تھا جو لوگ محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لائیں وہ سب مسلم اور
مومن ہیں، ایک ملت ہیں، ایک قوم ہیں، آپس میں بھائی بھائی ہیں، رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں، اب
اگر کوئی شخص آئے اور کہے کہ محمدؐ اور قرآن پر ایمان لانا کافی نہیں ہے۔ جو مجھ پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اگرچہ وہ محمدؐ اور
قرآن پر ایمان رکھتا ہو۔ پھر اسی بناء پر وہ مسلمانوں میں کفر اور اسلام کی تفریق کرے اور اس قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے
جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم بنایا تھا، ان لوگوں کے درمیان برادری کے رشتے کو کاٹ دے، جنہیں قرآن نے

"اِنّما المؤمنون اخوۃ"

کہہ کر بھائی بھائی بنایا تھا، اُن کی نمازیں الگ کردے، اُن کے درمیان مناکحت کے تعلقات توڑ دے، حتیٰ کہ اُن میں عیادت
تعزیت اور شرکتِ جنازات کا تعین بھی باقی نہ رکھے، تو اس سے بڑھ کر اسلام، اسلامی قومیت، اسلامی تہذیب
اور اسلام کے نظامِ جماعت کے ساتھ اور کیا دشمنی ہو سکتی ہے!

(اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

سحر البیان از:- اثر زبیری لکھنوی۔ ضخامت ۶۲ صفحات (بڑا سائز) سرورق جاذب نظر، کاغذ، کتابت اور طباعت دیدہ زیب۔ فی جلد ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ۲/۷ زیارت لائنس ملیر کینٹ کراچی ۹۔

جناب اثر زبیری اسلام پسند شاعر ہیں۔ حمد، نعت اور مناقب اہلبیت و صحابہ اُن کی شاعری کا موضوع رہے ہیں۔ موصوف کئی سال سے قرآن پاک کے ترجمہ کو اُردو نظم کا لباسِ موزوں پہنانے میں مصروف ہیں۔ پارۂ عمّ (تیسویں پارے) کا ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ جس کو مشاہیر علماء نے سراہا ہے اور یہ تمام آراء "سحر البیان" کے آخر میں درج ہیں۔

قرآن پاک کے اُردو میں چند منظوم ترجمے ہوئے ہیں۔ پچھلے شاعروں میں آغا شاعر دہلوی کا منظوم ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اور دورِ حاضر میں جناب اثر زبیری لکھنوی کا منظوم ترجمہ بہت خوب ہے بلکہ بعض خصوصیات میں یہ تمام منظوم ترجموں پر فوقیت رکھتا ہے:-

وَإِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝

فلک جس وقت پھٹ جائے، ستارے جیسکہ گر جائیں   سمندر "جوش میں" جس دم حدوں سے اپنی بہہ نکلیں

فسوّٰىك   فعدلك

ترے اعضا کو پھر شانِ تناسب بخش دی اُس نے   خصائل میں ترے کامل ہم آہنگی رکھی اُس نے

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝   أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ

دھڑکتے ہوں گے کتنے قلب اُس دن خوف و دہشت سے   جھکی ہوں گی نگاہیں کس قدر فرطِ ندامت سے

ایک مصرعہ ہے:-

تمام عالم کی روحیں اور فرشتے سارے صف بستہ   (صفحہ ۵)

تقطیع میں عالم کا "ع" گر جاتا ہے۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ

بس اُن پر قہر کا کوڑا چلایا آپ کے رب نے   (صفحہ ۲۹)

اُردو روزمرہ "کوڑا گھمانا" ہے۔

اسی صفحہ ۲۹ پر "فَأَمَّا الْإِنْسَانُ" میں "ن" لکھنے سے رہ گیا۔ آئندہ ایڈیشن میں کتابت کی اس بھول چوک کی تصحیح کر دینی ضروری ہے۔

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝   حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝

تمہیں غافل بنایا ہے بہ ہر تقدیر کثرت نے یہاں تک کہ تم اپنے مرقدوں تک ہو پہنچ جاتے (ص۴۲)

ترجمہ میں "کثرت" پڑھ کر "قلّت و کثرتِ تعداد" کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ ترجمہ قریب قریب اس انداز پر ہونا چاہیئے تھا:-

ہوس اور حرص کی کثرت نے غافل کر دیا تم کو یہاں تک کہ تم اپنی قبریں اپنی آنکھ سے دیکھو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

"وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ"

"ہم نے نہیں سکھایا (محمد رسول اللہ) کو شعر اور یہ (شاعری) اس کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔"

جس چیز (شاعری) کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں نفی فرمائی ہے اور جسے نبوت کے شایانِ شان نہیں سمجھا اُس (قرآن) کا شعر میں ترجمہ کرنا کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ ترجمہ بہ ہر حال قرآن ہی کے لفظوں اور آیتوں کا ترجمہ ہے۔ لہذا جب متن اور اصل سے شاعری کی نسبت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے تو اُس کے ترجمہ سے بھی یہ نسبت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہو سکتی! حیرت ہے کہ بعض مفکّر علماء تک کی نگاہ اس طرف نہیں گئی اور انہوں نے اپنی رائے کے اظہار میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا!

دوسری بات یہ ہے کہ شاعری میں حُسنِ خیال اور نزاکتِ تصوّر کو بہت کچھ دخل ہے اور ترجمہ میں اور وہ بھی قرآنِ پاک کے ترجمہ میں شاعری فکر و تخئیل اپنے جوہر نہیں دکھا سکتی اس لئے منظوم ترجمہ لازماً "شعریت" سے خالی ہو گا۔ پھر اُس کے ترجمہ سے کیا فائدہ؟

منظوم ترجمہ کا نام ــــ سحرالبیان ــــ بھی محلِ اعتراض ہے۔ قرآن کے ترجمہ کو "بیان کا جادو" کہنا کسی طرح موزوں نہیں۔ قرآن کا ترجمہ اور اس سے "شاعری اور سحر" کی نسبتیں! توبہ۔ توبہ! پھر میر حسن دہلوی کی مثنوی "سحرالبیان" اُردو زبان میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اس مشہور نام کو اس طرح لے لینا اگر روا ہے تو کس قدر جراٴت آمیز روا ہے!

تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ از:- علامہ سید ابن حسن رضوی جارچوی۔ حصہ دوم۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت مجلّد تین روپے غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ حصہ سوم، ضخامت ۱۷۲ صفحات۔ قیمت مجلّد دو روپے آٹھ آنے۔ غیر مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ انیس، لالوکھیت، کراچی۔

جناب مولانا سید ابن حسن رضوی جارچوی ایک خوش بیان خطیب اور وسیع المطالعہ عالم ہیں۔ موصوف نے "تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ" کے عنوان سے تاریخ کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کی تین جلدیں اب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ علامہ جارچوی کا اندازِ نگارش دل نشین ہے۔ کتاب میں جا بجا تاریخی حوالے دیئے ہیں، مگر اُنہی حوالوں ــــ (Reference) سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے جن سے شیعی نقطۂ نگاہ کی تائید ہوتی ہے!

"آنحضرتؐ نے ابو طالب کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ اللہ نے یہ موقع دیا کہ چچا کے احسان کا کچھ بدلہ ادا ہو جائے۔" (ص۔)

اگر یہ عبارت لکھتے وقت مصنف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ابو طالب کی عظمت اور محبت کا غلبہ نہ ہو جاتا تو وہ ان الفاظ میں کہ "چچا کے احسان کا کچھ بدلہ ادا ہو جائے" اپنے مفہوم کا اظہار نہ کرتے!

"آنحضرتؐ اگر کوئی اور کام نہ کر سکتے اور صرف علیؓ ہی کو چھوڑ جاتے تو دنیا بجا طور پر کہہ سکتی تھی کہ انہوں نے علوم و فنون اور تمدن و معاشرت کو ایک گراں بہا عطیہ دیا اور انسانیت کو ایسا کامل نمونہ چھوڑا کہ جس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔" (ص...)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ جہاد فرماتے، نہ قرآن کی تعلیم دیتے، نہ صحابہ اور اہل بیت کا تزکیہ نفس کرتے.... بس صرف "علیؓ" ہی کو تنہا چھوڑ جاتے تو بھی...... ! یہ عقیدت کی کس قدر مبالغہ آمیزی ہے!

"مگر برسر اقتدار لوگ فوجوں کا رُخ آس پاس کے ملکوں کی طرف موڑے ہوئے تھے اور عرب کے پرانے لوٹ مار کے جذبہ کی تسکین روم و ایران کے خزانوں سے کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں سلطنت کے حدود بڑھ گئے اور حکمرانی کے حوصلے نکالنے کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا...." (ص۴۴)

عہدِ خلافتِ راشدہ میں کفار سے جو جہاد کیا گیا تھا اُسے "لوٹ مار" کہنا کتنی کھلی ہوئی ناانصافی، کٹ حجتی اور دھاندلی بلکہ قساوتِ قلبی کا ثبوت ہے۔ شاید مجوسیت کی تباہی اور ایران کی فتح کا زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوا؟ تاریخ اسلام کے درخشندہ ترین دور پر اس قسم کی بے جا طنزیں کرنا خود تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔ مہ و انجم پر جو یہ صدیوں سے خاک اڑائی جا رہی ہے اس سے خاک اڑانے والوں کے چہرے ہی گرد آلود ہو گئے، اُن روشن ستاروں کا کچھ نہیں بگڑا! (موتوا بغیظکم)

انجمن ترقی اردو پاکستان کے آرگن "اردو" میں معرکۂ کربلا کو "سیاسی اقتدار کی جنگ" لکھ دینے پر ایک وفد پاکستان کے اربابِ اقتدار سے جا کر ملا تھا اور اس مضمون کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اس احتجاج میں ہم عقیدت مندانِ حسینؓ اور حلقہ بگوشانِ اہلِ بیت کی تمنا میں بھی شریک تھیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کی جنگوں کو جو مسلمانوں سے نہیں کافروں سے لڑی گئی تھیں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں اُن کو "لوٹ مار" کہہ دینے سے نہ کسی شخصیت کی توہین ہوتی ہے، نہ کسی کا دل دکھتا ہے اور نہ کسی کی عقیدت کو ٹھیس پہنچتی ہے!!! یہ کیا انصاف ہے؟

حصہ سوئم میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ظاہری طور پر تو موٹا جھوٹا لباس پہنتے تھے مگر اس کے نیچے ملایم لباس ہوتا تھا۔ یہ صاحبِ کتاب کی نری دروغ بافی ہے۔ سفیان ثوری اُن چند صلحاءِ امت میں سے ہیں جن کا زہد و تقویٰ ضرب المثل بن چکا ہے اور اُن پر کسی نے بھی ریاکاری کا الزام نہیں لگایا!

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے صاحبزادے محمد المنتظر کی غیبتِ صغریٰ اور غیبتِ کبریٰ کا عقیدہ اور یہ کہ یہی امام مہدی ہیں جو قیامت سے پہلے ظہور بالسیف فرمائیں گے ـــــ خالص شیعی عقیدہ ہے اور اس کی جو تفصیل "تذکرہ محمد و آلِ محمدؐ" میں درج ہے اس میں تاریخ سے زیادہ افسانہ و حکایت کا رنگ غالب نظر آتا ہے!

"آٹھ مہینے پلک جھپکتے ہوئے گزر گئے" (ص...) "ہوئے" اس میں زاید ہے۔

(ص۱۸۷ حصہ دوم) "فرزدق" کی جگہ "فرزوق" (بجائے "دال" کے "واو") کتابت کی غلطی ہے۔

"حضرت اسمٰعیل، امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے تھے۔ اُن کا انتقال ہو گیا تو لوگ تعزیت کے لئے آنا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ شیخ صدوق علیہ الرحمہ عیون الاخبار میں لکھتے ہیں

کہ حضرت اسمٰعیل کی وفات کے دوسرے دن کچھ لوگ تعزیت کے لئے آئے تو حضرت نے اُن کیلئے کھانا منگوایا اور خود بھی سیر ہو کر کھانا کھایا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لوگوں کو تعجب تھا کہ چہرے پر غم کے آثار بالکل نمایاں نہ تھے۔ بعض لوگوں نے جرأت کر کے سوال کر ہی لیا کہ جوان بیٹے کی موت کا آپ پر کچھ اثر نہیں۔ فرمایا۔ موت برحق ہے، جلد یا بدیر سب کو مرنا ہے۔ جو دُنیا کی ناپائیداری سے واقف ہیں موت ہر وقت اُن کے سامنے رہتی ہے۔ اللہ جس کو چاہے اور جس وقت چاہے اُٹھالے، ہم خالقِ اکبر کے سامنے سر جُھکاتے ہیں" (صلا۳-۳۱ حصہ سوم)

بیشک صبر و ضبط اور تسلیم و رضا ہی اہلبیتِ کرام کی سنّت رہی ہے، جزع و فزع، سر و سینہ کو ہاتھوں سے پیٹنا، شارعِ عام پر سینہ کوبی کا مظاہرہ، بلکہ کرایہ پر لوگوں سے چھریوں اور چاقوؤں کا ماتم کرانا۔ گھوڑوں پر لہو چھڑک کر اور اُن کی زینوں میں تیر چھید کر گلی گلی گھمانا اور لاشے، جھولے اور مہندیاں نکالنا سب بدعات ہیں۔ اہلِ بیت نے یہ کام کبھی نہیں کئے۔ قیامت کے دن اہلِ بیت کرام اِس قسم کے غیر اسلامی عقائد اور مظاہروں سے اپنی براءت فرمائیں گے!

علامہ سید ابن حسن جارچوی معتدل شیعی عالم ہیں، اس لئے انہوں نے اپنے معتقدات کو نسبتاً نرم لہجہ میں ظاہر فرمایا ہے۔ مگر جو غالی ہیں وہ یہی باتیں "سب و شتم" کے انداز میں کہتے ہیں! یہ کتابیں تاریخی اعتبار سے ایک خاص فرقہ کی ترجمان بن کر رہ گئی ہیں!

اسلام کا نظامِ حکومت تالیف:- مولانا حامد الانصاری غازی۔ ضخامت ۴۵۶ صفحات سفید چکنا کاغذ۔ کتابت جلی، طباعت دیدہ زیب۔ جلد پر کتاب کا نام سنہری حرفوں میں منقوش ہے۔ خوبصورت گرد پوش، مجلّد سات روپے، غیر مجلد چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:- ندوۃ المصنفین۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

یہ کتاب سہ روزہ مدینہ (بجنور) کے سابق مُدیر شہیر مولانا حامد الانصاری غازی کی گرانقدر تالیف ہے۔ اور اُردو زبان میں اپنی جامعیت اور وسعتِ معلومات کے اعتبار سے اُونچے درجہ کی کتاب ہے۔ "اسلامی نظامِ حکومت" سے شغف لائق مصنّف کو اپنے والد علامہ منصور انصاری مرحوم سے ورثہ میں ملا ہے۔ یہ کتاب غازی صاحب کے سالہا سال کے غور و فکر اور تحقیق و تفحص کا حاصل ہے۔ تفسیر، حدیث، تاریخ، فقہ اور لُغت کی بیسوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ ایک کتاب تالیف کی گئی ہے۔ شاید ہی کتاب کا کوئی صفحہ کتابوں کے حوالوں سے خالی ہو۔ اس چیز نے کتاب کے وزن کو اور بڑھا دیا ہے۔ کتاب کے چند اہم عنوانات:-

حکومت کا مفہوم — حکومت کی پہلی تقسیم — حکومت کا قیام — زمانۂ تاریخ کی حکومتیں — شاہی، دستور شاہی، اعیانی، عمومی اور جمہوری حکومتیں — فیڈرل حکومتیں — فطری حکومت — اسلام سے پہلے کی تاریخی حکومتیں — اسلام اور حکومت — قرآنِ عظیم کے نظریات — اقتدارِ اعلیٰ — قانونی تشریحات و نظائر — انتخاب کے بُنیادی اصول — قانونِ حکومت — رئیسِ حکومت کے فرائض و اختیارات — فوج کی تشکیل — اسلامی حکومت کا موازنہ قدیم حکومتوں سے —!

کتاب کا مقصدِ تالیف عوام و خواص کو یہ بتانا ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام اور اس کے لئے جد و جہد کرنا

کوئی دنیا داری کا کام نہیں ہے، بلکہ کتاب و سنت کے عین منشاء کے مطابق ہے اور اسلامی حکومت زمین پر خدائے عرشِ عظیم کی قوتِ قاہرہ اور قدرتِ عادلہ کی نمایندگی کرتی ہے۔ اسلامی حکومت کس اساس پر قائم ہوتی ہے؟ اُس کے چلانے والوں کی قابلیت اور کردار کیسے ہونے چاہئیں؟ خلفائے راشدینؓ نے کس طرح حکومت کی؟ اسلامی حکومت کے محکمے اور صیغے اور اُن کے فرائض کیا ہیں؟ یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں ملتی ہیں۔

زبان و انشاء کا انداز یہ ہے:-

"حضرت عمرؓ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے صحابہ نے خود بخود قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا اور آپ کا اسلام لانا پیغمبرِ اسلام کی آرزوؤں میں سے بجائے خود ایک آرزو تھی۔"

تبلیغی جماعت کے اکابر اگر سرکہ جبیں نہ ہوں تو چند اقتباسات اُن کی نذر کئے جاتے ہیں:-

— "بظاہر نماز کی امامت کا منصب سیاسی امامت سے زیادہ اہم ہونا چاہیئے، لیکن ہمارے فقہاء اور علماء کسی ایک رائے کے اختلاف کے بغیر یہ کہتے ہیں کہ نماز کی امامت سے سیاسی امامت بڑی چیز ہے، اول الذکر امامتِ صغریٰ ہے اور ثانی الذکر امامتِ کبریٰ۔"

— "قرآن میں حکومت کے لئے امانت کا لفظ بھی موجود ہے۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو انسان کو یہ سمجھنے پر آمادہ کرتی ہے کہ حکومت انسان کے ہاتھ میں ایک سنگین امانت ہے۔" (شاہ ولی اللہ دہلوی)

— "امام کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق حکومت کرے، امانت کو ادا کرے، جب امام اس طرح حکومت کا فرض انجام دے تو عوام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کو سنیں اور اطاعت کریں، جب وہ میدانِ عمل میں بلائے تو اس کی آواز پر لبیک کہیں۔" (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

— "جو شخص حکومت کی ذمہ داریوں کو مناسب صورت میں تقسیم نہیں کرتا وہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کے حق اور اُن کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔" (فاروق اعظمؓ)

پوری کتاب اس کلیسائی نظریہ کی کہ "دین و سیاست جُدا جُدا ہیں" نفی کرتی ہے بلکہ اس راہبانہ تصور پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ یہ کتاب اس مقدس جذبہ کو اُبھارتی ہے کہ اللہ کی زمین کے حقیقی وارث صالحین ہیں اور جس جس جگہ خدا کے نافرمانوں اور باغیوں کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہے، وہ "غصب" ہے اور مالِ مغصوبہ کو غاصبین سے چھین کر اس کے حقداروں کے ہاتھوں میں پہنچا دینا دین ہی کا کام ہے بلکہ دین کا تقاضا ہے!

کتاب کا وہ حصّہ بہت اہم ہے جس میں قدیم و جدید حکومتوں سے اسلامی حکومت کا مقابلہ کرکے اُن کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ "اسلام کا اشتراکی دستور" یہ عنوان البتہ کھٹکا۔ مگر اسلامی حکومت اور اشتراکیت میں جو فرق دکھایا گیا ہے اس نے اس خلش کی تلافی کر دی!

صفحہ ۲۶ پر "ذی الاکناف" کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح "ذی الاکتاف" ہے، ("ت" کے ساتھ) "بنو غسان نے شام جاکر ڈیرہ آباد کیا" (صفحہ ۱)، "ڈیرہ لگانا" محاورہ ہے۔ شوریٰ سے "شورائی" کے بجائے بعض مقامات پر "شوروی" پڑھ کر طبیعت نے اجنبیت سی محسوس کی!

کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے خوب ہے، یہ دوسرا ایڈیشن ہے، کتاب غالباً دس بارہ سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ کتاب اب لکھی جاتی تو اس عرصہ میں عربی اور اردو میں "اسلامی حکومت" پر جو معلومات آفریں کتابیں آچکی ہیں، وہ فاضل مؤلف کی نظر سے گزر جاتیں تو استدلال زیادہ نکھر جاتا اور معلومات میں بھی خاصہ اضافہ ہو جاتا۔
ندوۃ المصنفین نے یہ کتاب چھاپ کر ادب و انشاء، دین و اخلاق اور علم و انسانیت کی مفید خدمت انجام دی ہے۔!

تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی

از:- منشی عبدالرحمٰن خاں۔ ضخامت ۲۶۸ صفحات۔ مجلد، رنگین گردپوش کیساتھ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- ادارہ نشر المعارف، چہل بیک، ملتان شہر

اس کتاب کے آغاز میں اُن اسباب و محرکات کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے، جن کو دیکھ کر مسلمانوں کو قیام پاکستان اور تقسیم ہند کا مطالبہ کرنا پڑا۔ ان تاریخی حقائق کا آغاز سیواجی مرہٹہ کی مسلم دشمنی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد رام راج کی مہم، راشٹریہ سیوک سنگھ کے قیام، آریہ سماج کی تحریک، گورکھشا، ہندو مہاسبھا اور شدھی کے فتنوں کا ذکر ہے!

اس کے بعد پاکستان کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اور اس سلسلہ کا سب سے بڑا انکشاف :۔

> "اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس (۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء) میں پیش کیا تھا، بالکل وہی خیال اُن سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے، بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔" (صفحہ ۵)

فاضل مصنف کی یہ ریسرچ قابل قدر ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور قائد اعظم مرحوم کی قیام پاکستان کے سلسلہ میں خط و کتابت رہتی تھی۔ تھانہ بھون سے مسٹر محمد علی جناح کی خدمت میں علماء کے وفود جاتے رہتے تھے۔ طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ قائد اعظم کو مولانا تھانوی وعظ و تلقین فرماتے رہتے تھے ـــــ یہ باتیں اس تفصیل کے ساتھ پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں۔ اس کے راویوں میں دیوبند کے بلند پایہ علماء شامل ہیں۔ لہٰذا ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان روایتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں!
قیام پاکستان میں علماء کرام کی جدوجہد کو اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کوئی شک نہیں کہ مطالبہ پاکستان کو علماء کرام کی تائید نے بڑی تقویت پہنچائی۔ ان میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔
اس کتاب کی ثقاہت کو جس چیز نے مجروح کر دیا ہے، وہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی بے جا مخالفت ہے علاوہ مصنف نے اُنہی پٹی ہوئی دلیلوں کو دہرایا ہے جو عوام و خواص کے نزدیک "تہمت و افتراء" ثابت ہو چکی ہیں ـــــ!
مثلاً جماعت اسلامی پر یہ الزام لگانا کہ وہ جہاد کشمیر کی مخالفت کرتی رہی (صفحہ ۲۵) کتنی سنگین تہمت اور افترا پردازی ہے۔ جماعت اسلامی نے جہاد کشمیر کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ اُس نے کشمیر کے معاملہ میں ہمیشہ حکومت پاکستان کے موقف کی تائید کی! مولانا مودودی نے ڈنکے کی چوٹ کہا تھا کہ آزاد قبائل اور خود کشمیر کے جو مجاہدین جنگ کر رہے ہیں، پاکستان کے مسلمانوں کو اُن کی دواؤں سے، روپے پیسے سے اور ہتھیاروں سے امداد کرنی چاہئے۔ لیکن جب تک پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں ایک دوسرے کی معاہد ہیں، ایسی حالت میں پاکستان کے مسلمانوں کا خود ہندوستان سے جنگ کرنا

درست نہیں۔ اگر مولانا مودودی کے اس اشارے کی اہمیت کو سمجھ لیا جاتا اور جب مجاہدین بارہ مولا تک پہنچ چکے تھے، اُس وقت حکومتِ پاکستان خود میدان میں آکر جنگ کے محاذ کو سنبھال لیتی تو ہندوستان کی فوجیں سری نگر کے ہوائی اڈے پر نہ اُتر سکتیں اور کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی گود میں آجاتا۔

جناب مصنف "جماعتِ اسلامی" کی "فردِ جرم" (؟) پر تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کے اقتباسات سے دلیل (ص۱۷۷تا ۱۷۸) لائے ہیں۔ اور یہ اُن کے مؤقف کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلے میں لاہور میں مارشل لاء نافذ ہوا تھا اور اس کی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس میں اسلام کی جو عجیب و غریب تعبیریں کی گئی ہیں اور جس فکر و نظر کا مظاہرہ فرمایا گیا ہے اس کو پڑھ کر اسلام پسندوں کا دل لہو لہو ہو گیا ہے۔ خود فاضل مصنف کے قلب کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ مگر جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کی خاطر وہ چیف جسٹس مسٹر منیر اور جسٹس مسٹر کیانی کے افکار کو سراہتے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ وہ ریت کے ڈھیروں پر اپنی کمیں گاہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں!

۱۹۴۸ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں محمد طفیل صاحب کو حکومتِ پاکستان نے سیفٹی ایکٹ کے تحت اس جرم میں گرفتار کیا تھا کہ یہ حضرات پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے داعی تھے۔ حکومت کے اس ظلم کو منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب ان لفظوں میں جائز ٹھہراتے ہیں:-

> "جماعتِ اسلامی بدستور پاکستان کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ جس کی تفصیل پیچھے پیش کی جا چکی ہے، اس لئے حکومتِ پاکستان نے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر..... (ان لوگوں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔) (ص۱۸۲)

اس سے اگلے صفحہ ۱۸۳ پر مودودی صاحب پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اُن کے فتووں نے سول سیکرٹریٹ میں گڑبڑ پیدا کر دی تھی اور جماعتِ اسلامی کی ریشہ دوانیوں سے آئندہ انتظامی مشینری میں تعطل پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔

اگر حکومت کے پاس جماعتِ اسلامی کی معاندانہ سرگرمیوں کی شہادتیں اور ثبوت موجود تھے تو دیانت و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ مولانا مودودی اور اُن کے رفقاء پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا۔ مقدمہ چلائے بغیر جماعتِ اسلامی کے ان اکابر کو نظر بند کر دینا ظاہر کرتا ہے کہ حکومت کے پاس کوئی ایسی شہادت اور ثبوت موجود نہ تھا جس سے عدالت میں ان حضرات کا مجرم ہونا ثابت ہوتا۔ اس لئے۔ ؎

اس خطا پر ہمیں مارا کہ خطا کار نہ تھے!

جماعتِ اسلامی نے اسلامی دستور سازی کے لئے آٹھ سال تک مسلسل مہم چلائی ہے اور جلوس نکالے ہیں مگر کہیں بھی کوئی انتشار تک پیدا نہیں ہوا۔ ایسا بھی ہوتا رہتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے جلسوں میں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے اور وقت کے وقت شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے مگر جماعتِ اسلامی کی طرف سے قانون شکنی نہیں کی گئی۔ جماعت کے امیر (مولانا مودودی) کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے، ایسے نازک ترین موقع پر بھی جماعتِ اسلامی مثالی صبر و ضبط اور قانون کے احترام کا مظاہرہ کرتی ہے! ایسی جماعت سے گڑبڑ اور انتشار کی نسبت کتنی دردناک تہمت ہے!

"جناب مودودی صاحب اس امر سے آگاہ ہو چکے تھے کہ سید صاحب (علامہ سلیمان ندوی مرحوم) کو تعلیماتِ اسلامی بورڈ کی صدارت کے لئے طلب کیا گیا ہے، وہ اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں

مبتلا تھے کہ اگر سید صاحب نے یہ پیشکش منظور نہ کی تو شاید یہ اعزاز انھیں بخشا جائے۔" (صفحہ ۲۰)

صرف یہی ایک اقتباس مصنف کی ذہنیت کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ مولانا مودودی کی ذات سے کس درجہ عناد رکھتے ہیں اور ایسی ایسی تہمتیں تراشتے ہیں کہ جن کا سر ہے نہ پیر۔ وکیلوں کے محرر اور بستہ بردار جب مفکر، مبلغ اور مصلح بن جائیں تو وہ جو شوشہ بھی چھوڑ دیں تھوڑا ہے! لاحول ولا قوۃ! توبہ!

"اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشا اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے، ایک حیات المسلمین شخصی اصلاح کے لئے اور دوسری صیانت المسلمین جمہوری نظام کے لئے" (ص ۵۵)۔ (حضرت تھانوی کا مکتوب)

اگر اپنی کسی کتاب یا تحریر کے بارے میں جماعت اسلامی کا کوئی فرد ان خیالات کا اظہار کر دیتا تو کس کس طرح سے انھیں مطعون کیا جاتا؟ اور ان لفظوں کو کیسے کیسے عجیب معنی پہنائے جاتے!

یہ بات عالم آشکارا ہے کہ پاکستان میں جماعت اسلامی نے اسلامی دستور سازی کے لئے جو جدوجہد کی ہے۔ اُسی کی بازگشت ہر طرف سے آئی ہے۔ مسلسل آٹھ سال تک "اسلامی دستور" جماعت اسلامی کی کوششوں کا موضوع رہا ہے۔ مگر اس کتاب میں جماعت اسلامی کے اس کارنامہ پر جان بوجھ کے پردہ ڈالنے اور جھٹلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتنی بڑی بد دیانتی، عناد اور بغض و عداوت ہے!

پاکستان "دو قومی نظریہ" کی بنا پر وجود میں آیا ہے، کانگرسی علماء "متحدہ قومیت" کے علمبردار تھے۔ اور اپنے نظریہ کی اصابت پر کتاب و سنت سے دلیلیں لا رہے تھے، اُس وقت مولانا مودودی ہی تھے جنہوں نے "متحدہ قومیت" کے طلسم پر شاہ ضرب لگا کر اُسے پاش پاش کر دیا اور اس طرح پاکستان کی راہ کا سب سے بڑا سنگ گراں دُور ہو گیا۔ مولانا موصوف نے یہ کام مسلم لیگیوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کیا۔ انہوں نے جس بات کو حق سمجھا اُس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس حقیقت کا بھی اظہار فرمایا کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کار "صالحین" ہونے چاہئیں۔ چنانچہ پاکستان میں غیر صالح قیادت کا خمیازہ ابھی تک ہم بھگت رہے ہیں! مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے "اقامت دین" کے لئے جس انداز پر "جماعت اسلامی" کی تربیت کی، پاکستان بننے کے بعد یہ جماعت پاکستان کی اسلامی بُنیادوں پر تعمیر کے لئے کس قدر کارآمد ثابت ہوئی! (اللہ کی نصرت ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ آمین!)

جماعت اسلامی کی مخالفت کر کے سرکار دربار کی خوشنودی منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کو حاصل ہو جائے تو ہو جائے۔ مگر ایسی تہمتوں اور غلط بیانیوں سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی انھیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور تصوف و طریقت کی جن نسبتوں پر اُنھیں بڑا ناز ہے، قیامت کے دن وہ بھی ان ناانصافیوں کی تلافی نہیں کر سکتیں!

QADIANI MOVEMENT

از :- پروفیسر محمد الیاس برنی (ایم اے، ایل ایل بی، ضخامت ۱۲۴ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ :-

Makki Publications, 100 Brickfield Road, Durban, South Africa.

اس کتاب پر جناب محمد مکی (چیف آرگنائزر جنوبی افریقہ انٹرنیشنل یونین آف اسلامک سرونٹس) نے تعارف لکھا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی افریقہ میں سیدھے سادے مسلمانوں سے اسلام کے نام پر چندہ جمع کیا جاتا ہے اور اس رقم سے

قادیانی لٹریچر کی اشاعت ہوتی ہے اور نائیجیریا میں قادیانی جماعت کا ہفتہ وار اخبار "The Truth" قادیانیت کا زہر پھیلاتا رہتا ہے۔ اس فتنۂ عظیم کے توڑ کے لئے پروفیسر محمد الیاس برنی نے یہ کتاب انگریزی میں لکھی ہے اور کوئی شک نہیں کہ نام نہاد "احمدیت" (؟) کو بالکل بے نقاب (expose) کر دیا ہے!

مولانا الیاس برنی اپنی طرف سے بہت کم لکھتے ہیں۔ قادیانی لٹریچر ہی سے اقتباس پیش کر کے اس جھوٹی نبوت کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ یہ انگریزی کتاب اسی قسم کے اقتباسات سے بھری پڑی ہے، ان میں کتابوں کے حوالوں کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی کتنی پیش گوئیاں غلط اور جھوٹی ثابت ہوئیں۔

افریقہ، سنگاپور اور ماریشس وغیرہ میں جو یہ قادیانی مبلغین مسلمانوں کو اپنے دام میں پھانستے رہتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب اس فرعونی لشکر کے لئے ضرب کلیم ثابت ہوگی۔ اور اس شجرِ خبیث کی نشو و نما رک جائے گی۔ کتاب میں ایک صفحہ پر مولانا محمد الیاس برنی کی تصویر ہے جو خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اور اس کے سامنے مرزا غلام احمد قادیانی کی تصویر ہے، جسے دیکھ کر۔ ع

آنکھیں ہوتی ہیں پشیماں کہ کہاں دیکھ لیا!

اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن دس ہزار کی تعداد میں چھپا ہے، پوری کتاب اعلیٰ درجے کے آرٹ پیپر پر ہے۔ چھپائی اتنی دیدہ زیب کہ آنکھوں میں چلا آتی ہے "make up" میں یہ کتاب امریکہ اور انگلستان کی حسین ترین کتابوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشر دونوں کو اس نیک کام کا دارین میں اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ کہ چودھویں صدی ہجری کے اس "مسیلمہ کذاب" کا انکار اور اس کے مشن کی مخالفت نبوتِ محمدی کا عین تقاضا ہے!

ماہنامہ "مہر نیمروز" خاص نمبر | ترتیب دینے والے، حسن مثنیٰ ندوی۔ ابو الخیر کشفی۔ اور علی اکبر قاصد۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی (فون ۷۱۶۶۶)

ماہنامہ "مہر نیمروز" کے چھ شمارے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ یہ ساتواں اور آٹھواں مشترکہ شمارہ اس کا خاص نمبر ہے۔ جو بڑے اہتمام کیساتھ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ سرورق رنگین اور دیدہ زیب ہے۔ مضامین میں تنوع اور ترتیب میں حسنِ سلیقہ پایا جاتا ہے۔ مرتبین کی محنت اور کاوش لائق داد ہے کہ انہوں نے اس گلدستہ کے لئے گلہائے رنگا رنگ فراہم کئے ہیں۔ "ملکی سیاست" پر ادارہ کی جانب سے یہ جرأت آمیز تنقید کتنی سچی اور بے لاگ ہے:۔

"سابق گورنر جنرل جناب ملک غلام محمد نے دستوریہ کو توڑ کر ملک کو ایک سیاسی بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔ بلکہ اخلاقی و معاشرتی بحران میں پاکستان کی دیانت دارانہ تاریخ جب بھی لکھی جائے گی اُس وقت مولوی تمیز الدین اس دور کے "ہیرو" کی حیثیت سے آنے والی نسلوں کے سامنے آئینگے۔"

"مہر نیمروز" کے فاضل مرتبین کو ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ یہ حضرات نہ "اشتراکی" ہیں اور نہ "ترقی پسند" ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ "خاص نمبر" میں نام نہاد "ترقی پسندی" اس قدر نمایاں طور پر جھلک رہی ہے کہ اُس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ جن دو شاعروں کے اس شمارے میں فوٹو دیئے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ کمیونسٹ ہیں بلکہ "انکار و الحاد" سے قریب تر ہیں۔

"اس دور کے سب سے بڑے نمائندے فیض احمد فیض ہیں"

"مہر نیمروز" نے جس شاعر کو اس دور کا سب سے بڑا نمائندہ کہا ہے، اس نمائندۂ اعظم کا ایک منتخب شعر بھی درج کر دیا ہے:۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے　　　تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

"ترے سربلند" کی ترکیب کی غرابت سے قطع نظر، مصرعہ اولیٰ میں "کو" غلط استعمال ہوا ہے۔ "تک" کا محل تھا۔ "کو" سے تو یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ "گلوئے عشق کے رتبہ کو دار و رسن نہ پہنچ سکے۔ اور اُس کی برابری نہ کر سکے"۔ حالانکہ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "دار و رسن گلوئے عشق تک نہ پہنچ سکے"! مگر اُس دَور کے سب سے بڑے نمائندے شاعر" کو کیا پڑی ہے کہ وہ لفظ و بیان کی ان نزاکتوں کا لحاظ رکھے اور ان باتوں میں اپنا سر کھپائے۔ جبکہ ان محاسن کے بغیر ہی اُسکے عقیدت مند تعریف کے پُل پہ پُل باندھتے چلے جا رہے ہیں!

"پاکستان" جس مقالہ کا عنوان ہے اس میں "اسلام" پہ کتنا کچھ لکھا جا سکتا تھا اور لکھا جانا چاہیئے تھا۔ مگر لائق مقالہ نگار کا اس معاملہ میں بخل کا یہ عالم ہے کہ "آزاد جمہوریہ پاکستان" کے ساتھ "اسلامیہ" کا لفظ بھی اُن کے قلم سے نہ نکل سکا۔

"دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح پاکستان میں مُصوری کو بھی اب تک خاطر خواہ سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوئی"۔ (ص۲۴)

فاضل مضمون نگار کو ان باتوں کا غم نہیں ہے کہ پاکستان میں صنعت و حرفت اور سائنس کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔ یہاں برسوں سے اقتدار کی جنگ جاری ہے۔ پاکستان میں اب تک صحیح اسلامی معاشرہ پیدا نہیں ہو سکا یہاں اخلاقی حدود ٹوٹتی چلی جا رہی ہیں —— انھیں غم اس بات کا ہے کہ "مُصوری" کو سرکاری سرپرستی اب تک کیوں حاصل نہیں ہوئی؟ اور "ایمانِ ابراہیم" کے مقابلہ میں "صنعتِ آذر" نے فروغ کیوں نہیں پایا۔ چنانچہ اسی مقالہ کے درمیان میں "رقص" کی تین تصویریں مزیّن کی گئی ہیں۔ اور ایک تصویر جس میں بیگم افروز بلبل چودھری رقص فرما رہی ہیں۔ اُس میں اُن کو "پاکستان کی مایہ ناز رقاصہ" کا خطاب "مہر نیمروز" نے عطا فرمایا ہے! ہائے وہ ملک جس کا فخر و ناز کتھکوں، ہیجڑوں، طبلچیوں، ڈوم ڈھاڑیوں اور ناچنے والیوں کے "آرٹ" سے وابستہ ہو! اور اہلِ قلم اور اربابِ فکر اس کو بڑھاوا اور شہ دے رہے ہوں! افسوس!

نمودِ این و آں مٹے سکونِ جاوداں ملے　　　فسردگی کے ذہن میں شعور کی سناں لئے (ص۲۳)

"نمودِ این و آں مٹے" نے مصرعہ کی بھرتی پوری کر دی ہے، خیر! اس پر بھی صبر کر لیا جائے مگر دوسرے مصرعہ کا بھی کوئی جواب ہے! پہلے "فسردگی کا ذہن" تصور میں قائم کیجئے۔ پھر "شعور کی سناں" کا خیال جمائیے۔ اور پھر "وجدان" کی خونچکانی کا منظر دیکھا کیجئے۔ شاعر کے قلم و زبان سے سوتے میں بھی ایسے مصرعے نہیں نکل سکتے! توبہ!

کھنڈر میں ہر سمت رینگتی خامشی کی زنجیر بے صدا ہے
سرکتے لمحے، شکستہ در و دیوار سے لپٹے چلے ہیں! (ص۳۷)

یہ تو سُنا تھا کہ "فلاں جگہ خامشی مسلّط ہے یا چھائی ہوئی ہے"، مگر "خامشی دوڑ کر چلا کرتی ہے اور رینگتی بھی ہے"۔ "مہر نیمروز" کی اس نظم سے پہلی بار اس کا انکشاف ہوا۔ اس پر مستزاد "...... لپٹے چلے ہیں"! یہ آخر کیا اندازِ بیان ہے۔ شعر میں کوئی لطف، کوئی تاثر، کوئی خوبی! بس ایک شخص ہے کہ جو جی میں آتا ہے کہتا چلا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی "تُک بندی" کی پذیرائی کے لئے رسالے موجود ہیں بلکہ فرشِ راہ ہیں!

مہکتے نکھرے ہوئے عارضوں پہ ہے یہ گماں　　　فضا کی سانس کا احساس ہو رہا ہے جواں (ص۶۷)

"یہ گماں" کا اشارہ آخر کس طرف ہے؟ پھر ایک تو "فضا کی سانس"۔ پھر اُس کا "احساس" اور اس پر مستزاد اُس کا "جواں" ہونا۔ اس شعر میں آورد و تکلف کے سوا اور کیا ہے؟

ایک خاصے مشہور نقاد کلیم الدین احمد ہیں جو انگریزی میں سوچتے اور اردو میں اس کا اظہار فرماتے ہیں۔ اُن کا بھی اس شمارے میں ایک مقالہ ہے جو جگہ جگہ گنجلک اور مبہم ہے۔ ایک نمونہ:۔

"ادب کی صحیح تفہیم اور ناقدانہ نظم و ضبط کے بغیر ادب میں غیر ادبی انہماک پیدا کر لینا بڑی تباہ کن بات ہے۔" (ص ۴۱)

آخر مضمون نگار کہنا کیا چاہتا ہے۔ ان لفظوں کو پڑھتے وقت وجدان کتنی گھٹن محسوس کرتا ہے۔

"اس اُجڈ، گنوار اور وحشی گاؤں میں......." (ص ۹)

اُجڈ، گنوار اور وحشی کسی انسان کی صفت ہو سکتی ہے۔ نہ کہ گاؤں اور بستی کی!

"اپنا جائزہ لے" منہ بنا، ناک سکیڑ[1] وہ بولی۔ (ص ۵)

"اپنا جائزہ لے" کیا یہ عورتوں کا "روزمرہ" ہے؟ اور جن ہلکے پھلکے جملوں کے درمیان اسے (اپنا جائزہ لے) لایا گیا ہے، وہاں تو یہ جملہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

مرنے جینے کی خود نگر قسمیں
نہ ابنا رخاک دفن کریں (ص ۶۵)

اس قسم کے بچکانہ شعر "مہر نیمروز" میں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی!

جن لوگوں نے دین و تقویٰ کے خانوادوں میں پرورش پائی ہے اور جو نیکی کی فضا میں پروان چڑھے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو نگارش و انشاء کی صلاحیتیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ اُن کی زبان و قلم کو جب دین و اخلاق کے تقاضوں سے کتراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو شدید اذیت ہوتی ہے۔ کانپور اور پھلواری شریف کی خانقاہوں اور سجادوں کے وارث جب رقاصاؤں کو "مایۂ ناز" کہنے لگیں تو مغرب زدہ نوجوان جس نچی سے نچی سطح تک بھی پہنچ جائیں تھوڑا ہے!

نام نہاد "ترقی پسندی" نے شاعروں اور ادیبوں کو لفظ و بیان اور زبان و اظہار کے معاملہ میں جو بے پروا بنا دیا ہے بلکہ لوگوں کا مذاق بگاڑ دیا ہے۔ اس کی اصلاح بہت ضروری ہے بلکہ یہی کرنے کا کام ہے۔ "مہر نیمروز" کے مرتبین یہ خدمت انجام دے سکتے تھے مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ "مہر نیمروز" نام نہاد "ترقی پسندی" کی بے اعتدالیوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر رہا ہے!

صبر و شکر از:۔ محترمہ تہنیت۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ مجلد (گرد پوش کے ساتھ) قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

محترمہ تہنیت النساء بیگم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے نعتیہ کلام کا یہ دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس پر پیش لفظ جناب ایم اسلم (لاہور) نے لکھا ہے، اس کا رنگ یہ ہے:۔

"کلام کے ہر لفظ سے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح مترشح ہو رہی ہے، جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں۔"

---

[1] "سکیڑ کر" لکھنا چاہیئے تھا "کر" کے حذف و سہو کا ذمہ دار نہ جانے کاتب ہے یا خود مضمون نگار۔

"مخمور" کی صفت یہاں زاید استعمال کی گئی ہے۔ پوری عبارت میں ناپختگی پائی جاتی ہے۔

"جس دل میں حضور اکرم کی محبت موجزن ہو۔ وہاں درد کا ہونا بھی ضروری چیز ہے"

یہ بات کیا ہوئی؟ اور یہ کیا "کلیہ" ہے۔ جس کو یہاں بیان فرمایا گیا ہے۔

تہنیت نے "نعت رسول" کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور یہ بہت بڑی سعادت اُن کے حصہ میں آئی ہے

خیال ہی میں تمہارے کٹے ہیں دن سارے　　تمہاری یاد میں راتیں گزار دیں ہم نے

ہر صبح درِ پاک کی رونق ہے نظر میں　　ہے شام حرم یاد جو دن ڈوب رہا ہے

پھر کلی دل کی کھل کے پھول ہوئی!　　شاید اپنی دعا قبول ہوئی

وہ فردوس گوش اور وہ آنکھوں کی جنت　　مناروں کی رونق، اذاں کی صدائیں

اب ایسے لطف سے شاید کبھی نہ گزرے گی　　مدینہ میں جو سرِ رہ گزار گزری ہے

حشر میں اُن کو منہ دکھانا ہے　　اس کو ایسا سیاہ بھی نہ کریں

عصرِ حاضر نے سجائی ہیں دکانیں کیا کیا　　عقل ملتی ہے مگر دل نہیں پایا جاتا

وہ سجدے وہ دعائیں، وہ کرم جب یاد آتے ہیں　　تو یوں لگتا ہے جیسے اب بھی سر اُس آستاں پر ہے

خواب ہی میں نظر آ جائے گا اُن کا جلوہ　　اسی امید میں ہر شب کی سحر ہوتی ہے

دوسرا رُخ :-

جائیں گے وہیں چھوڑ کے سب روضۂ رضواں　　یثرب کو جو وہ رشکِ ارم کرتے رہیں گے　　(صفحہ ۲۰)

شعر میں نہ کوئی معنوی کیف ہے اور نہ لفظوں ہی کا شکوہ ہے۔ "رشکِ ارم کرتے رہیں گے" کی ترکیب اس پر مستزاد!

آپ کی بخششوں کو کیا دیکھیں　　اپنی قسمت کو کم زمانے لگے

شوقِ دیدار میں تڑپتے ہیں!　　آپ تو اب بہت رُلانے لگے　　(صفحہ ۲۴)

اس قسم کے بچکانے شعر مجموعۂ کلام میں رکھنے نہیں چاہیئے تھے۔

لطفِ پیہم حرم میں ملتا تھا!　　لوٹ آئے بس اتنی بھول ہوئی　　(صفحہ ۳۱)

"بس" کا یہاں کیا محل تھا۔ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ زندگی میں یہی سب سے بڑی بھول ہوئی۔

شوق میں جی رہے ہیں تمہارے ۔۔۔ کوئی باقی نہیں اب سہارے (ص ۴۱)

" تمہارے " کی تعقید سے کسی طرح صرف نظر بھی کرلی جائے مگر " سہارے " کی جمع کیساتھ " کوئی " کو وجدان کس طرح گوارا کرے!

خدا بھی جس کی رعنائی پہ شیدا ہو گیا آخر ۔۔۔ اُسی محبوب کے ہم بانکپن کو یاد کرتے ہیں (ص ۵۶)

" آخر " بھرتی کا لفظ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعنائی پر شیدا ہو جانا۔ یہ عجیب عقیدہ ہے۔ پھر حضورؐ سے " بانکپن " کی نسبت بھی ناپسندیدہ ہے۔ چھب، بانکپن، عشوہ۔ یہ مجازی محبوبوں کی صفات ہیں۔

یہ تصوّر میں کون بستا ہے ۔۔۔ دیکھنے جس کو دل ترستا ہے (ص ۶۵)

" دیکھنے کیلئے " کہنا چاہیئے تھا۔ " کیلئے " کے بغیر یہ شعر ولی اور سراج کے زمانے کے کسی شاعر کا شعر معلوم ہوتا ہے اور یہ زبان اب بکسر متروک اور روزمرہ کے خلاف ہے۔

مثل یہ مشہور ہے کہ:-

" نقاش نقش اوّل بہتر کشد ز اول "

مگر " ذکر و فکر " کے مقابلہ میں محترمہ تہنیت کا یہ دوسرا مجموعہ کلام (صبر و شکر) نسبتاً پھیکا ہے۔

آئینہ تاریخ (حصہ اوّل)

مرتبہ:- افضل حسین ایم اے، ایل ٹی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور (بھارت)

آسان اور دل نشین زبان میں ہندوستان کی تاریخ اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

چند عنوانات:-

رامائن کی کہانی ــــ آریوں میں لگاؤ ــــ بدھ مت ــــ اشوک ایک مبلّغ راجہ ــــ کنشک اور بدھ مت کا زوال ــــ مسلمانوں کی آمد ــــ محمود غزنوی ــــ معین الدین چشتیؒ ــــ مسلمانوں کے ہند پر حملے ــــ درویش تاجدار التمش ــــ نیک دل سلطان ناصر الدین ــــ شاہ تغلق اور اُس کے جانشین ــــ!

تاریخی واقعات کافی چھان بین کرکے لکھے گئے ہیں۔ انداز بیان میں دلکشی ہے۔ زبان ٹکسالی اور منجھی ہوئی۔ بس دو ایک جگہ کھٹک سی پیدا ہوئی:-

" مگر جب انہوں نے دین کی وضاحت کی . . . . . . " (ص ۸۵)

اس جملہ میں کوئی غلطی اور سقم نہیں ہے مگر جس مفہوم کو ادا کرنا مقصود ہے۔ اس کے لئے دوسرے جاندار الفاظ استعمال کرنے چاہیئے تھے۔ یہ جملہ تو ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے۔

" پنجاب کے ملحقہ حصوں میں ذکریا اور شمس تبریزی . . . . . "

یہ روایت بالکل بے اصل ہے کہ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد حضرت شمس تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ملتان میں تشریف لائے تھے اور وہاں اُن کی قبر ہے۔ ملتان میں جن بزرگ کا مزار ہے وہ دوسرے " شمس " ہیں " شمس تبریزی " نہیں ہیں۔

سلاطین ہند کی علم پروری

از:- محمد حفیظ اللہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے۔ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- مسلم اکاڈیمی۔ پھلواری شریف پٹنہ۔

کتاب کا موضوع اُس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں محمود غزنوی سے لے کر میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن تک کے

مسلمان بادشاہوں اور حاکموں کی علم پروری اور معارف نوازی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ فاضل مصنف نے خاصی کدوکاوش اور تفحص سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر پہلی بار اس کا علم ہوا کہ سلطانہ رضیہ شعر کہتی تھی اور اس کا "شیریں" تخلص تھا۔ اور یہ بھی:-

"یہ واقعہ عجائب عالم میں شمار ہوگا کہ اورنگ زیب جس کلام مجید میں تلاوت کیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ملکیت ہے۔" (ص ۱۱۳)

"مقامی علماء کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے علماء و ادباء بھی یہاں علم و ادب کی مجلسیں گرمائے ہوئے تھے۔" (ص ۳۲) "مجلسیں گرم کئے ہوئے تھے۔" لکھنا تھا۔ "گرمائے ہوئے تھے" میں سنجیدگی نہیں پائی جاتی۔ "التمغا ہیں اور جاگیریں وقف کی گئی تھیں۔" (ص ۱۲۹) ریاست دکن کے سرکاری کاغذوں میں "التمغا" لکھا جاتا تھا۔ "رسدخانہ صرف اس خادم کے دم سے زندہ تھا۔" (ص ۱۶۵) "رصدخانہ" میں "ص" ہے!

"قاضی جلال عروسی بغداد سے دہلی آئے تو سلطان التمش کے لئے خلیفہ مامون کے ہاتھ کی ایک تحریر لائے جو اس نے "سفینۃ الخلفاء" میں لکھی تھی۔ سلطان اس تحریر کو پڑھ کر قاضی جلال عروسی سے اس قدر خوش ہوا کہ وہ اس تحفہ کے صلہ میں قاضی صاحب کو نصف مملکت دینے کے لئے تیار ہوگیا۔" (تاریخ فیروزشاہی)

یہ واقعہ مبالغہ سے خالی نہیں! اگر کسی صحابی یا تابعی کی کوئی تحریر ہوتی تو عقیدت کی بنا پر سلطان التمش کی زبان سے ایسا جملہ نکل سکتا تھا کہ "یہ تحریر میری نصف سلطنت سے بھی گرانقدر ہے۔"

"فتاویٰ عالمگیری" کو فقہاء کے جس بورڈ نے مدون کیا ہے اُن کے نام ضرور لکھنے چاہیئے تھے۔ حکومتِ آصفیہ نے علم و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اُن کا ذکر تفصیل چاہتا تھا۔ چار پانچ جملوں میں اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گزر جانا مناسب نہ تھا۔ حیرت ہے کہ "دائرۃ المعارف" کا ذکر تک نہیں کیا!

صحیح مقام حدیث اول و تدوین حدیث

از:- مولانا فضل احمد غزنوی۔ ضخامت ۳۲۸ صفحات۔ تدوین حدیث ضخامت ۲۴۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ:- مصنف سے فضل منزل حیدرآباد سندھ۔

مولانا فضل احمد غزنوی نے یہ کتاب منکرین حدیث کے رد میں لکھی ہے اور خاص طور سے چکڑالوی عقائد کے سرگرم مبلغ مسٹر پرویز پر بڑی سخت گرفت کی ہے۔ مولانا غزنوی اپنے اندر دینی حرارت رکھتے ہیں اس لئے "سنتِ رسولؐ" جو دین کا ستون ہے اُس پر کسی بدبخت کی دراز دستی برداشت نہیں کر سکتے۔ پوری کتاب میں حُبِ رسولؐ اور مدافعتِ دین کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور کہیں کہیں تو یہ حرارت شعلوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ منکرین حدیث کے دلائل کو اس کتاب میں پوری قوت کے ساتھ توڑا گیا ہے اور "سنتِ رسولؐ" کے دین میں حجت ہونے پر قرآن کریم سے دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔

"یقیناً جن احادیث کو سوا لاکھ صحابہ کرام نے لکھا وہ بھی قرآن پاک کی طرح محفوظ ہیں۔" (ص ۶۹) اس میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ لکھنا یوں چاہیئے تھا "جن احادیث کو ہزاروں صحابہ کرام نے لکھا اور یاد رکھا اُن کو بھی دین کا جزو سمجھ کر محفوظ رکھا گیا۔" ــــ "ابتداء میں حکم قرآن تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں کا مقابلہ کرے مگر بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ یہ حکم نازل ہوا کہ ایک مسلمان دو کافروں کا مقابلہ کرے۔" (ص ۲۰۷) ــــ نہ پہلی آیت کا حکم منسوخ ہے اور نہ

دوسری آیت ناسخ ہے۔ دونوں آیتوں کا حکم اپنی جگہ پر ثابت اور باقی ہے۔ آج مسلمان قوی ہوں تو بہت سی تعداد کا تھوڑے مسلمان مقابلہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیئے۔ کمزور ہوں تو بھی اپنے سے دُگنے کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے تو انھیں ہرگز نہ ہچکچانا چاہیئے!

"یا ایھا المزمّل" کا ترجمہ "اے قائد اسلام" اور "یا ایھا المدثر" کا ترجمہ "اے ماحیٔ کفر" (ص ۲۹۴-۲۹۵) پہلی بار نظر سے گزرا۔ اور جب تک اس ترجمہ کا "ماخذ" نہ معلوم ہو جائے دل کو تشویش ہی رہے گی ۔۔۔ "سید ابوالاعلیٰ مودودی جن کو میں پاکستان بھر میں، بس یہی ایک صحیح عالمِ دین ہیں، جنہیں شعورِ اسلام بھی ہے۔ مانتا ہوں اور مجھے سب سے بڑی کوفت یہی ہوتی ہے کہ آج پاکستان کے طول وعرض میں ایک بھی عالم ایسا نہیں ہے جسے صحیح معنی میں عالمِ دین کہا جا سکے" (ص ۲۴۲۔ حصہ دوم) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی علمی عظمت اپنی جگہ مُسلّم۔ مگر غزنوی صاحب نے اُن کی تعریف میں بے جا مبالغہ سے کام لیا ہے!

"قاری نظر آتا ہے حقیقت میں قرآں ہے مسلمان" (ص ۱۸)

"عقل کو کیا ہم نے سپردِ جنوں اور عمر بھر میں یہی دانائی کی (ص ۳۲۵)

"لرزتے تھے جن کی ہیبت سے شاہانِ جہاں
کون؟ یہی ہے تربیت اُونٹوں کو چرانے والے" (ص ۲۳ حصہ دوم)

"کہ تختِ کیاں راکستند آرزو تف بر تو اے چرخ گردوں تف" (ص ۲۳)

ان شعروں کو اس قدر مضحکہ خیز انداز میں غلط لکھ کر مصنف نے اپنے ادبی ذوق کا بُرا مظاہرہ کیا ہے!

"جو اس کائنات اور حواسِ کائنات سے بالا ...... ہے" (ص ۱۱۶) "حواسِ کائنات" کیا چیز ہے؟ "کوئی پوچھے تو بھلا رمضان کا نواں مہینہ اور نواں امام تک بندی چڑ گئی۔ مگر زکات اور اُستاد کا شاگرد کو پڑھانا تو کسی تک بندی سے کبھی گانٹھا نہیں جا سکتا" (ص ۱۳) یہ کیا زبان اور اندازِ بیان ہے ۔۔۔ توبہ! ۔۔۔ "نہ بیوی کو منہ دیا، جو میری زندگی کی بہترین متاعِ حیات ہے" (ص ۴) "بیوی کو مُنہ دینا" پہلی بار نظر سے گزرا۔ اس میں ذم بھی پایا جاتا ہے۔ اور "زندگی کی متاعِ حیات"۔ تو "شبِ لیلۃ القدر کی رات" والی ترکیب ہے۔ "ابن جوزی کی قدمبوسی میں مت پڑجانا" (ص ۳۳) یہ بھی عجیب زبان ہے۔ "اس سے زیادہ کیا ثابتی ہو" (ص ۱۵۰) "ثبوت" کو "ثابتی" کہنا۔ یا للعجب! "اور قیامت کے پدجھا امتِ محمدیہ کی طرف سے" (ص ۱۶۹) "پدم" (غالباً سنکھرب کا ایک پدم ہوتا ہے) کی جمع "پدجھا" بنانا بس غزنوی صاحب ہی کا حصہ ہے!

کتاب میں جگہ جگہ طنز بہت زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اس لئے ہمیں اندیشہ ہے کہ بعض طبیعتیں اس کا خوشگوار اثر نہ لیں گی۔ شاید غزنوی صاحب لکھتے وقت جذبات پر پورا قابو نہیں رکھ سکتے۔ کتاب میں مصنف نے جہاں جہاں اپنے ذاتی واقعات اور حالات کا ذکر کیا ہے وہ بھی پڑھنے والے کو ضرور کھٹکیں گے!

مولانا افضل احمد غزنوی کو ذاتِ رسالت مآب سے بے پناہ محبت ہے، مگر اس کے باوجود اُن کا دامن نہ صرف یہ کہ شرک و بدعت سے پاک ہے۔ بلکہ اُن کا قلم شرک و بدعت کے مقابلہ میں "برہنہ شمشیر" بن کر اپنا فرض انجام دیتا ہے۔

فروغ اردو مدیر اعزازی:- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی - معاونین:- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی - شجاعت علی سندیلوی ایم اے، سید امیر حسن نورانی - حکیم عبدالقوی دریابادی - مینیجر و نگراں:- محمد حسین بخش علوی - فی پرچہ چار آنہ - سالانہ دو روپے - ملنے کا پتہ:- ۱۲۷ امین آباد پارک لکھنؤ - (انڈیا) پاکستان میں:- مبارک بک ڈپو، بندر روڈ - بالائے نیشنل بنک کراچی نمبر ۲ -

"فروغ اردو" کا ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے، اس کے سرنامہ پر شمارہ کا نمبر ۵ لکھا ہوا ہے - یعنی یہ رسالہ پانچ سال سے نکل رہا ہے - اس حساب سے اس مجلّہ کا یہ چھٹا سال ہے اور اس کی اشاعت چودہ ہزار بتائی گئی ہے -

ماہنامہ "فروغ اردو" بڑے سلیقہ سے مرتب کیا جاتا ہے - اس کے مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے - یہ رسالہ کسی خاص ادبی جماعت سے متعلق نہیں ہے - شمارۂ زیر تنقید میں "لفظوں کی کہانی" ایک اچھوتا مضمون ہے - "باغِ رسالت کے چند پھول" نے اس رسالہ میں تقدیس کی شان پیدا کردی ہے -

"اس کی نوک پلک کے بعد اس کی گڑھن اس کی صورت گری ...." (ص ۹)

اردو کے معروف اور عام فہم ٹکسالی لفظوں کو "ہندیانے" کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے، "گڑھن" کی صورت میں نظر آتا ہے -

"...... سخن وہ تمام کام کرتے ہیں جو کلاسیکی روایت کے پابند شعراء بڑے اہتمام سے کرتے ہیں" (ص ۲۲)

اس عبارت میں ذم کا پہلو پایا جاتا ہے -

جمالِ یار کا آخر جواب کیا ہوگا   اب اور اتنا مکمل شباب کیا ہوگا (ص ۶۲)

"اتنا" کا "الف" بری طرح دب رہا ہے! خود شعر بھی بہت سطحی ہے، اس غزل کے دوسرے شعروں کا بھی یہی رنگ ہے! ہندوستان میں اردو زبان کی ترویج و بقا کے لئے "فروغ اردو" کا دم بسا غنیمت ہے -

انمول کلیاں مرتبہ:- حنیف صابری - ضخامت ۴۰ صفحات - قیمت دس آنہ - ملنے کا پتہ:- مکتبہ گلشن، چوک بازار ملتان

جناب حنیف صابری نے بچوں کے لئے ہلکی پھلکی نظموں کا یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے - سرنامہ کا یہ شعر کس قدر جاندار ہے ؎

زمیں سے پتھروں کو چننے والو!   ستارے بھی نکلتے ہیں زمیں سے

"ہمارا پاکستان" پرشکوہ نظم ہے - مگر بچوں کے لئے -

"جنت منظر، انجم طلعت، گردوں رفعت، عرش مقام"

جیسے مصرعوں کا سمجھنا اور یاد کرنا کس قدر دشوار رہے گا -

اے خدا ہم پہ اگر تیری عنایت ہو جائے   پھولنے پھلنے کی دنیا میں علامت ہو جائے (ص ۵)

"علامت" نے شعر کو کس قدر بے مزہ بنا دیا -

نیّر جھنجھانوی کی نظم سب سے اچھی ہے - اس نظم میں یہ مصرعہ - ع

مرے نام کی بولتے ہیں دہائی!

کھٹکا - "دہائی بولنا" نہیں "دہائی دینا" روزمرہ ہے -

توقع ہے کہ نظموں کا یہ گلدستہ بچوں میں مقبول ہوگا -

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۷

فاران

اکتوبر ۱۹۵۶ء ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ - کراچی ۱

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستانی سیاست کا سفینہ جو برسوں سے ڈانواڈول تھا اور دستور سازی کے بعد جس میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہو چلا تھا۔ پھر ایک زبردست ہچکولے سے دوچار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پتوار چلانے والے ہاتھ بدل گئے۔ اس طوفان نصیب سفینہ کے مسافروں کی بے بسی اور بے دست وپائی کا یہ عالم ہے کہ ناخداؤں کی تبدیلی کے بارے میں ان غریبوں سے کچھ نہیں پوچھا جاتا بلکہ "خداوندانِ سفینہ" کا توڑ جوڑ اور اُن کی غرض پرستیاں ہی انقلاب ناخدائی کا فرض انجام دیتی رہتی ہیں۔ جس کشتی کے ملاح جتھہ بندی، پارٹی بازی اور نزاعِ اقتدار میں مُبتلا ہوں، اُس بدنصیب سفینہ کو جو ہولناک سے ہولناک بھی حادثہ پیش آجائے، تھوڑا ہے!

کرسیوں کی اس جنگ نے پاکستان کی ساکھ کو بین الاقوامی دُنیا میں اتنا گرادیا ہے کہ شدید سے شدید اظہارِ تاسف بھی اُس کے لئے کم ہے۔ باہر وہ بے آبروئی اور اندر یہ انتشار و خلفشار اور زبون حالی کہ ؏

دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں!

اس ۹ سال کی مدّت میں یہ پانچویں وزیرِاعظم ہیں جو کرسیٔ اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ یہ داستانِ انقلاب بڑی ہی دردناک اور جگر خراش ہے مگر جب بات چھڑ گئی ہے تو کاغذ پر دل کی کچھ پھانسیں نکال کر رکھنی ہی پڑیں گی۔ حقائق سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا!

مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم تھے۔ جن کی شہادت کے بارے میں وقائع نگاری کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید اکبر نام کے ایک شخص نے اُنھیں راولپنڈی کے جلسہ میں قتل کر دیا مگر مسلم لیگ کے ذمہ دار رہنما

ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ لیاقت مرحوم کو اُن کے دشمنوں نے میدان سے ہٹا دیا - یہ دشمن کون تھے؟ اس پر ابھی تک رمز و اشاریت کے پردے پڑے ہوئے ہیں - نہیں کہا جا سکتا یہ پردے اٹھیں گے بھی یا نہیں اور اس افشائے راز کے لئے نہ جانے کس موزوں وقت کا انتظار ہے!

عوام میں طرح طرح کی افواہیں گرم ہیں:-

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!

کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ، جتنے مُنہ اُتنی باتیں! ایسے سنگین واقعات کے لئے صرف افواہیں "ثبوت" نہیں بن سکتیں۔ ہم فضا میں گونجنے والی افواہوں کی نہ تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب! ہمیں اس سلسلہ میں بس اتنا کہنا ہے کہ لیاقت علی خاں مرحوم کا خونِ ناحق پاکستان کو بہت مہنگا پڑا - اُن کی شہادت کے دن سے انقلاب در انقلاب کا جو چکر چلا ہے تو وہ آج تک چل رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پاکستان کا ستارہ کب تک گردش میں رہے گا!

خواجہ ناظم الدین صاحب ایک رسمی گورنر جنرل تھے، اصل طاقت مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھی - خواجہ صاحب ملکی معاملات میں دراندازی نہیں فرماتے تھے اس لئے نیک نام تھے - مگر لیاقت علی خاں مرحوم کی شہادت کے بعد نہ جانے خواجہ صاحب کو خود یہ بات سوجھی یا اُن کے کسی نادان دوست نے انھیں یہ خطرناک مشورہ دیا - یا اُن کے کسی چالاک دشمن نے انھیں پٹی پڑھائی کہ وہ گورنر جنرلی مسٹر غلام محمد کو سونپ کر خود وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہو گئے - خواجہ صاحب کی شرافت بھلمنساہت اور مرنجان مرنج ہونے میں دو رائیں نہیں ہیں - اسلام سے بھی انھیں محبت ہے - اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے بھی وہ ایک مذہبی آدمی ہیں اور سازش کا فن تو انھیں آتا ہی نہیں!

خواجہ صاحب کے دورِ حکومت میں ملک کے نظم و نسق میں جو ابتری پیدا ہوئی اُس سے اُن کی سادہ لوحی اور کمزوری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا - لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن کو بدنام اور ناکام کرنے کی تدبیریں بھی اختیار کی گئیں - ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ وزیر اعظم کمزور اور بے اثر اور گورنر جنرل طاقتور اور با اثر بلکہ مطلق العنان ہوتا چلا گیا - اُن کے مُرغی پالنے اور کھانے سے شغف رکھنے کے افسانے پھیلائے گئے، اُن کو "قاید قلت" کا خطاب دیا گیا - اُن کی کابینہ کے رکن مسٹر فضل الرحمن جیسے ذہین اور دیانت دار شخص کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا کہ اُن سے بڑھ کر ناسمجھ، ناکارہ اور غیر دانشمند آدمی شاید ہی کوئی اور ہو!

پنجاب میں ختم نبوت کی تحریک کا لاقانونیت تک پہنچ جانا ایک اتفاقی واقعہ نہ تھا - مسٹر ممتاز دولتانہ کا دماغ جانتا تھا کہ اس ہنگامہ آرائی کی زد خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمیٰ پر جا کر پڑے گی - قادیانی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خواجہ صاحب آمادہ بھی ہو جاتے مگر اِرد گرد جو "نوکر شاہی" گروپ تھا اُس نے خواجہ صاحب کو اس طرف نہیں آنے دیا - خواجہ صاحب کو ایک وہم یہ بھی ہو گیا تھا کہ سردار عبد الرب نشتر وزیر اعظم بننے کی تمنا رکھتے ہیں - اُن کے اس "وہم" سے بھی اُن کے چالاک مشیروں نے خوب فایدہ اٹھایا!

مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد یہ دوسرا حادثہ پیش آیا کہ خود وزارتِ عظمیٰ کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا اور یہ وہ وقت تھا جب اسلامی بنیادوں پر دستور قریب قریب تیار ہو چکا تھا - الزام یہ تھا کہ خواجہ صاحب کی وزارتِ عظمیٰ غذائی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی مگر اس انقلاب کی ظرفگی بلکہ ستم ظریفی یہ تھی کہ وزیر خوراک پیرزادہ عبد الستار صاحب کو

مسٹر محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں لے لیا گیا!

محمد علی بوگرہ کا اچانک امریکہ سے کراچی آنا اور خواجہ ناظم الدین کو معزول کر کے بوگرہ صاحب جیسے غیر معروف شخص کو وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سونپنا، یہ سب کچھ ایک سوچی ہوئی اسکیم کے تحت تھا۔ اس انقلاب نے گورنر جنرل کی طاقت میں "آمریت" کی جھلک پیدا کر دی اور نئے وزیر اعظم کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ گورنر جنرل کا حاشیہ بردار رہ کر اپنے فرائض انجام دے!

اس انقلاب کے بعد کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر خاں صاحب کو جیل سے لا کر وزارت کی کُرسی پر بٹھایا جاتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے اُن نظریوں کی تبدیلی کا کوئی اعلان نہیں کیا تھا جن کی بناء پر اُنھیں نظربند کیا گیا تھا۔ پھر اس دور میں "بڑے آدمیوں" کے اُن بیانات کو بھی ذہن میں رکھئے جن میں "ملّا ازم" پر پھبتیاں چُست کی گئی ہیں اور دین کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک "اسلامی نظامِ حکومت" بعض بڑے آدمیوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے۔ حالات کے دباؤ نے انھیں مجبور کر دیا ہے جو وہ کچھ نہیں کہتے۔ مگر انھیں جب بھی موقع ملے گا وہ اس پر وار کرنے سے چُوکیں گے نہیں!

پاکستان کی سیاست کا یہ خوفناک انقلاب بھی یادگار رہے گا کہ دستور سازی جبکہ بالکل آخری مرحلہ میں تھی مسٹر غلام محمد مرحوم نے دستور ساز اسمبلی ہی کا تیا پانچہ کر دیا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جس شاخ پر آشیاں بندی ہو رہی تھی باغباں نے اس شاخ ہی کو کاٹ کر پھینک دیا۔ جمہوریت کے خلاف یہ بہت بڑی سازش تھی!

"وَن یونٹ" کی تشکیل بھی اس دَور کا بہت اہم واقعہ ہے۔ اس کے لئے ہر قیمت ادا کی گئی۔ ہر بے اصولی کو گوارا کیا گیا یہاں تک کہ سندھ میں مسٹر کھوڑو کے کھلے ہوئے ظلم و ستم سے جان بوجھ کر صرفِ نظر کیا گیا۔ ع

زد وہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے!

مسٹر محمد علی بوگرہ نے بھی آخر آخر میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے پر پُرزے نکالے۔ مگر یہ روشنی طبع اُن کے لئے بلائے جان ثابت ہوئی۔ اُن کو بہ صد حسرت و یاس امریکہ کے لئے رختِ سفر باندھنا پڑا اور یہ نعمتِ عظمیٰ چودھری محمد علی صاحب کے حصہ میں آئی!

اسی دَور میں مسٹر غلام محمد اپنی صحت کی انتہائی خرابی کے باعث گورنر جنرلی سے سبکدوش کئے جاتے ہیں اور جناب اسکندر مرزا اس منصبِ بلند پر فائز ہوتے ہیں۔ مسٹر غلام محمد مر گئے، اب ہم اُن کو کیا کہیں؟ بہرحال پاکستان کی تاریخ پڑھ کر آئندہ نسلیں حیرت کریں گی کہ پاکستان کے عوام پر بے بسی کا ایک وہ دَور بھی گزرا ہے کہ ایک مفلوج شخص نے یہاں کئی سال تک مطلق العنان بن کر فرمانروائی کی ہے!

جائزہ

مسٹر محمد علی اس اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے کہ اُن کے پیش رو وزراء اعظم یہاں تک کہ مسٹر لیاقت علی خاں بھی عوام کی مخالفت اور طعن و طنز سے نہ بچ سکے۔ لیاقت علی خاں مرحوم پر اُن کی بیگم کی بے حجابی کے سبب جو نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ محمد علی صاحب اپنی شریکِ حیات کی بے پردگی کے ہوتے ہوئے بھی اُس نکتہ چینی سے محفوظ رہے۔ انھیں پاکستان کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کا جتنا تعاون حاصل رہا ہے اور کسی وزیر اعظم کو اتنا تعاون میسّر نہیں آیا!

مسٹر محمد علی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شراب، رقص و سرود اور اس قسم کی تمام بیہودگیوں اور عیش سامانیوں سے مجتنب ہیں۔ پاکستان کے وہ پہلے وزیر اعظم تھے جنہوں نے اپنے یہاں کی دعوتوں میں مرد و زن کے اختلاط کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دی۔ اُن کی دیانت اور فرض شناسی کو بھی سب لوگ مانتے ہیں۔ انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کا چارج سنبھالنے کے بعد پبلک میں جو تقریریں کی تھیں اور اُن میں اسلام کو جس قدر ولولہ انگیز انداز میں پیش کیا تھا۔ اُس نے مسلمانوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ اُن کے کردار کی عوام میں اچھی شہرت تھی!

مسٹر محمد علی کی ان تمام خوبیوں کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ مگر اس تصویر کا دُوسرا رخ یہ بھی ہے کہ قائد ملّت مرحوم کی شہادت کے بعد پاکستان میں جتنے بھی انقلابات آئے ہیں، توڑ جوڑ کے کسی کھیل سے محمد علی صاحب غیر متعلق نہیں رہے سیاست کی اس شطرنج میں مانا کہ وہ "فرزین" نہیں رہے مگر پیادہ کی حیثیت سے انہوں نے ضرور حصہ لیا ہے۔ وہ اس قدر گہرے واقع ہوئے ہیں کہ پاکستان میں جو خوفناک تبدیلیاں ہوئی ہیں اور سیاست کی چالیں چلی گئی ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک چال کا بھی محمد علی صاحب کے قریبی دوست آشنا تک اُن سے اُتا پتا معلوم نہ کر سکے۔ انہوں نے ہر انقلاب کا ساتھ دیا۔ ہر مشین میں اپنے کو فٹ کر دیا۔ اُن کی زبان سے کسی انقلاب کے خلاف کوئی لفظ نہیں نکلا!

مسٹر محمد علی کی دیانت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ مگر اُن کی وزارتِ خزانہ کے زمانہ میں غلام محمد مرحوم کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ پر جو اندھا دُھند مصارف ہوئے ہیں اور پاکستان کے بیت المال کو صرف ایک شخص کی ذات کے لئے جتنا زیر بار ہونا پڑا ہے، اس کی جواب دہی سے محمد علی صاحب بری الذمہ نہیں ہو سکتے!

دستور کا اُن کے دَور حکومت میں منظور ہونا یقیناً قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔ اور اُن کے اس فخر و امتیاز کو آنیوالا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اگر اپنے ذاتی اثر سے کام لیتے تو دستور کے بہت سے خلاخوش اسلوبی کے ساتھ پُر ہو سکتے تھے۔ دستور سازی کے دوران میں اُن کی روش یہ رہی ہے کہ کسی دفعہ میں اسلام اور جمہوریت کو کچھ فائدہ پہنچ گیا ہے تو کسی دوسری دفعہ میں اسلام اور جمہوریت کے مفاد کے "بقدر" کمی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر دستور سازی کے بعد دستور کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔ پُوری قوم اُن کے ساتھ تعاون کرتی اور "کاغذی دستور" حقیقی معنوں میں "دستورِ عمل" بن جاتا۔ اُن کے دَور حکومت میں یہ بھی ہوا کہ ایک طرف الجزائر میں فرانسیسیوں کے مظالم پر احتجاج کے لئے انہوں نے عوام کو یقین دلایا اور دُوسری طرف حکومت فرانس سے تجارتی معاہدہ بھی کر لیا!

مسلم لیگ کی بداعمالیاں اپنی جگہ مُسلّم ہیں۔ کھوڑو اور دولتانہ جیسے خود غرض کے بندوں کے کارنامے بھی سب پر روشن ہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ مسلم لیگ کے بعض چوٹی کے لیڈر محمد علی صاحب کو چرکے دیتے رہے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مسٹر محمد علی کی روش نے مسلم لیگ کو نقصان اور ری پبلکن پارٹی کو فائدہ پہنچایا ہے۔ انہوں نے ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کی اور اُن کی پچھلی کامیابیوں اور تجربوں کے برخلاف اِس بار اُن کا پانسہ اُلٹا پڑا!

ناظرین اپنے حافظہ میں اِس یاد کو تازہ کر لیں کہ ڈاکٹر خاں صاحب کو نظر بندی سے نکال کر وزارت پر لایا جاتا ہے۔ پھر "ون یونٹ" کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے توڑ پر ری پبلکن پارٹی وجود میں آتی ہے اور "عالم بالا" کے اشارے سے مسلم لیگ کے بعض لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر اس نومولود پارٹی میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ واقعات کی اِن

کڑیوں کو ملاکر سنجیدگی سے سوچیئے کہ ہمارے ملک میں پارٹی پالیٹکس کن بلندیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔

مسٹر محمد علی اگر پوری قوت کے ساتھ مسلم لیگ کا ساتھ دیتے اور تذبذب کی پالیسی اختیار نہ کرتے تو اُن کی پوزیشن بہت مضبوط رہتی۔ اُن کے انہی رجحانات کو دیکھ کر مسٹر فضل اللہ کو بار بار یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ وزیر اعظم مسلم لیگ کو چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہونے والے ہیں!

مسٹر محمد علی جب لندن میں تھے اور پھر وہاں سے حجاز گئے، تو اس دوران میں قائم مقام وزیر اعظم مسٹر چندریگر اور مسٹر نور الحق نے کراچی پولیس کی لرزہ بر اندام بے ضابطگیوں اور بے اعتدالیوں پر خوب کس کر گرفت کی تھی۔ اس احتساب کا پبلک نے بڑے پُر جوش انداز میں خیر مقدم کیا۔ مسٹر محمد علی جب اپنے سفر سے واپس تشریف لائے تو اُن کے ذریعہ ان واقعات کو دوسرے رنگ (!؟) میں پیش کیا گیا۔ یہ محمد علی صاحب کی فراست کے امتحان کا وقت تھا۔ انھیں پبلک کے جذبات اور صورتِ واقعات کا اچھی طرح اندازہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر انہوں نے بڑی بے دانشی کا ثبوت دیا۔ اور اپنے بعض جذباتی مشیروں کے کہنے میں آکر صورتِ حالات کو اس قدر غیر متوقع انداز پر بدلا کہ پبلک چیخ اٹھی:-

یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے!

مسٹر محمد علی کی ساری عمر دفتری ماحول میں گزری تھی۔ پبلک سے اُن کا کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ اس لئے عوام کے معمولی سے احتجاج نے انھیں ہلا دیا۔ اور انھیں اس کشمکش و اضطراب سے دامن چھڑانے ہی میں اپنی اور ملک و ملت کی بھلائی نظر آئی!

مسٹر محمد علی کی سبکدوشی پر عوام نے اطمینان کا سانس نہیں لیا۔ اس انقلاب نے سب کو ششدر سا کر دیا اور دل دھڑکنے سے لگے کہ:-

بما دا ازیں بتر گردد

نئے وزیر اعظم

مسٹر حسین شہید سہروردی اب ہمارے وزیر اعظم ہیں، اس منصب کے لئے وہ بہت دن سے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ:-

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں!

بلکہ یہ اُن کی دیرینہ تمنّا اور برسوں کی آرزو تھی جو ۱۹۵۶ء میں جاکر پوری ہوئی ہے۔ عوام کے لئے وہ کوئی نئے آدمی نہیں ہیں سہروردی صاحب کو عوام اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔

ہمیں جناب سہروردی صاحب کی خدمت میں چند گزارشیں کرنی ہیں۔ ان گزارشوں میں "پند و نصیحت" کی جہاں جہاں تلخی پیدا ہو گئی ہے اس کے لئے ہم معذور ہیں۔ خدا دلوں کا حال اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارا مقصد طنز و تعریض نہیں۔ بلکہ اصلاحِ حال ہے۔ ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ جو سب سے بڑی بھلائی کر سکتا ہے وہ کلمۂ حق کا اُس تک پہنچا دینا ہے!

سہروردی صاحب (بالقابہ) کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ فرانس اور لبنان کے نہیں پاکستان کی اسلامی جمہوریہ کے وزیر اعظم ہیں۔ اسلامی جمہوریہ کے وزیر اعظم کو لازمی طور پر اسلامی اخلاق کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ یہ کسی "مُلّا مولوی" کا قیاس یا رائے نہیں ہے۔ قرآن کریم عزت کا معیار "تقویٰ" کو ٹھہراتا ہے۔

مسٹر سہروردی نے اسلامی دستور سازی کے سلسلہ میں جو روش اختیار کی تھی، وہ پاکستان کے عوام مسلمانوں کی تمنّاؤں

کے مطابق نہ تھی۔ مگر اب وزیر اعظم بننے کے بعد اُن کا فرض ہے کہ جس دستور نے اُنھیں وزیر اعظم بنایا ہے اُس کا غبار اگر اُن کے دل میں باقی ہے تو اُسے دھو کر دستور کے آگے رضا و رغبت کے ساتھ سرِ اطاعت خم کر دیں۔ اور دستور کے عملی نفاذ کے لئے جدوجہد کریں۔ سہروردی صاحب میں فراست و دانائی ہے، تجربہ ہے اور جراٗت بھی ہے، اس لئے اگر وہ اپنی تمام اچھی صلاحیتیں اللہ کے دین کی سر بلندی کے لئے صرف کر دیں تو یہ پاکستان جنت نشان بن سکتا ہے!

بعض "بڑے لوگ" عام انتخابات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن کی کرسیاں خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ یہ لوگ انتخابات کو زیادہ سے زیادہ مدت تک ٹالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ سہروردی صاحب کو چاہیئے وہ اُوپر کے چند لوگوں کے زوالِ نعمت کی بدفالیوں اور اندیشوں کی پروا کئے بغیر عام انتخابات کے لئے جلد سے جلد اسباب مہیا کر دیں۔

سہروردی صاحب عہدوں کے زوال و کمال کی دھوپ چھاؤں بارہا دیکھ چکے ہیں۔ یقین ہے کہ "جی حضوریوں" کی قصیدہ خوانیاں اُن کو دھوکے میں نہ ڈال سکیں گی۔ کرسی پر آتے ہی گارڈ آف آنر، استقبالیہ، خیر مقدم اور زندہ باد کے نعروں کا ہنگامہ گرم ہو جاتا ہے۔ اخبارات کس اہتمام کے ساتھ کرسی نشینوں کی تصویریں چھاپتے ہیں۔ کیا کیا آؤ بھگت ہوتی ہے۔ مگر کرسی کے چھنتے ہی یہ سب مصنوعی نیاز مندیاں اور بناوٹی ہوا خواہیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ان "اُترے سنگھوں" سے اُن کے وہی نیاز مند ملتے ہوئے کتراتے ہیں۔ کرسیوں اور عہدوں کے ساتھ جو عزتیں وابستہ ہیں وہ سب اضافی ہیں اُن کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل اعتبار اُس عزت، محبت اور عقیدت کا ہے جو کوئی شخص اپنے کردار و عمل سے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دے۔ اس عزت و عقیدت کو کوئی زوال نہیں! اے وزیر گرامی مرتبت! آپ کو عمر دراز نصیب ہو۔ مگر سعدی کے اس قول پر ضرور نظر رکھیئے ؎

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند!

ڈھاکہ کے پبلک جلسہ میں جو تقریر آپ نے کی ہے وہ بہت شاندار اور حوصلہ افزا ہے۔ مگر آپ سے پہلے جو وزیر اعظم بھی آیا ہے اُس نے ایسی ہی شاندار تقریریں کی ہیں۔ محمد علی بوگرہ تو برسات کے زمانہ میں مہاجرین کی جھونپڑیوں کے سامنے کوٹ پتلون سمیت دلدل میں گھس گئے تھے اور "زندہ باد" کے نعروں نے انھیں خاصہ سرشار بلکہ فربہ کر دیا تھا۔ مگر وہ وقتی جوش ثابت ہوا۔ لوگوں کو تسلی دینے اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی تدبیریں —— آپ اپنے شاندار لفظوں کو شاندار عمل سے بدل دیجئے۔ گرجیئے کم، برسیئے زیادہ!

اے خانوادہ عالیہ سہروردیہ کے فردِ محترم! آپ نے یقیناً بڑے نازک زمانہ میں اس اہم ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔ پاکستان اندر اور باہر ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ ابتری و انتشار کی کوئی حد نہیں۔ آپ کو ان نازک حالات میں ملک کی شیرازہ بندی کرنی ہے۔ بے روزگاری، بھوک اور جہالت کو مٹانا ہے۔ رشوت، اقربا نوازی اور بددیانتی کو ختم کرنا ہے۔ لاکھوں آدمی ہیں کہ سر چھپانے کیلئے بانس کی کھپچیوں اور چٹائی کے ٹکڑوں تک کیلئے محتاج ہیں۔ اُنھیں بسانا ہے۔ کشمیر کی مہم ہے اور ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی حفاظت اور ناموسِ رسولؐ کے تحفظ کا مسئلہ ہے، پاکستان کی کمزوری اور انتشار کو دیکھ کر ان کم ظرفوں کو یہ ہمت ہوئی ہے۔ پاکستان آج مضبوط ہوتا تو انسانیت کے محسنِ اعظم اور ہمارے آقا و مولا حضور خاتم النبیینؐ (ہماری جانیں سرکار پر نچھاور ہوں) کی اہانت کا جواب احتجاج سے نہیں طاقت سے دیا جاتا!

پاکستان کی مادی ترقی کے ساتھ اُس نظریۂ حیات کی حفاظت، بقا اور ترقی و اشاعت سب سے زیادہ ضروری ہے۔

جس کی بناء پر پاکستان وجود میں آیا ہے۔ اس سے جو کوئی غفلت برتے گا پاکستان کے مقصدِ وجود کو نقصان پہنچائے گا۔ اور کوئی مادی ترقی اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی!

جناب سہروردی صاحب کی خدمت میں آخری گزارش یہ ہے کہ طریق انتخاب کے مسئلہ میں اگر آپ نے "مخلوط انتخاب" پر اصرار کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کے دورِ حکومت کا آغاز ہی ایک بہت بڑی کشمکش سے ہوگا۔ اس کشمکش سے خدارا اپنی وزارت کو بچائیے۔ پاکستان کے عوام مسلمانوں کے جذبات اور رجحانات کا احترام کیجئے۔ اقلیت کے حقوق کی حفاظت ایک اسلامی حکومت کا یقیناً فریضہ ہے مگر اقلیت کی دل دہی کیلئے اپنے معتقدات اور نظریوں کو تو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

مفاد پرستوں اور غرض کے بندوں سے عوام تنگ آ چکے ہیں۔ آٹھ نو سال سے جنگِ اقتدار کا تماشہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ صبر و ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ سیاست کے اس رُخ ہی کو بدل دیجئے۔ اس بساطہی کو اُلٹ دیجئے۔ آپ اس بساط کے ہر مُہرے کو خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں کہ کون کیا ہے؟ آپ جرأت کے ساتھ کوئی اصلاحی قدم اٹھائیں گے تو قوم آپ کا ساتھ دے گی۔ آپ سے محبت کرے گی اور آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے گی۔ یہ بات آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ عوام کے جذبات اور تمناؤں سے بے پروا ہو کر جس کسی نے اپنی چلتی چلائی اور من مانی کی اس کو ناکامی بلکہ رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم آپ کو کامیاب اور نیک نام دیکھنا چاہتے ہیں!

آپ افراد کا بھی جائزہ لیجئے۔ اور ملک کی پارٹیوں اور جماعتوں پر بھی نظر ڈالئے کہ کس جماعت کا کیا رول رہا ہے؟ کس نے کتنے رنگ بدلے ہیں۔ اور کیسے کیسے روپ بھرے ہیں اور کون جماعت اپنے مقصد کے ساتھ مخلص اور اپنی منزل میں ثابت قدم رہی ہے! اہلِ اخلاص کی طرف خود بڑھئیے اور اُن کی فکر و بصیرت اور عملی قوتوں سے فائدہ اٹھائیے۔

ہمارے سامنے اس وقت آپ کا ماضی نہیں مستقبل ہے۔ ہم یہ خوش گمانی رکھتے ہیں کہ حکومت کا بارِ گراں آپ میں انشاء اللہ تبدیلی پیدا کر دے گا۔ ذمہ داریوں کا احساس آپ کو وہ بنائے گا جو اسلامی حکومت کے سربراہ کار کو بننا چاہیے۔

بارِ الٰہا! جو تیرے دین کا بھلا چاہے، اُس کو اپنی بہترین نعمتوں سے نواز۔ اور اُس پر اپنی رحمتیں نازل فرما۔ اُس کی راہ کی تمام رکاوٹوں کو دُور کر دے۔ اور جو کوئی تیرے دین سے کد رکھتا ہو اس کو اصلاح کی توفیق عطا ہو اور اگر وہ اصلاح پر آمادہ نہ ہو تو اس کو پست و ذلیل بنا دے۔ نصرت اُن کے لئے جو اسلام کے مددگار رہیں اور خذلان و نامرادی اُن کے واسطے جو اسلام کی ناکامی کے درپے ہوں!

اے مالک الملک! فرعونی لشکروں کے لئے "ضربِ کلیم"۔ بُت کدوں کیلئے "تیشۂ ابراہیم"۔ شرارِ بولہبی کیلئے "چراغِ مصطفوی" اور فتنۂ باطل کے لئے عزمِ فاروقی عطا فرما!

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم!

ماہر القادری
۲۲ ستمبر ۵۶ء

خلیل حامدی

مصر کا دستور

جمہوریت اور اسلام کے ساتھ مذاق

مصر سے اور اُس کے عوام مسلمانوں سے ہمیں محبت ہے کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں۔ سویز کینال کے مسئلہ میں مصری حکومت کے جرأت مندانہ اقدام کے ساتھ ہماری ہمدردیاں وابستہ ہیں اور ہم اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مصر کو اس جدوجہد میں کامیابی نصیب ہو۔

اب رہا جمال ناصر کی ذات اور شخصیت کا سوال۔ تو اس کا صرف یہی ایک رخ نہیں ہے کہ اُس نے سویز کینال کے مسئلہ میں غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا ہے جمال ناصر کی اس جرأت کی تابناکی کے ساتھ اس تصویر کا دوسرا تاریک رخ بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس کے ظلم و ستم نے عرب دنیا کی سب سے زیادہ بااثر اور فعال جماعت "اخوان المسلمین" کو تباہ کیا ہے اور اس کے اکابر کو اشاعتِ حق کے جرم میں پھانسیاں دی ہیں اور آج تک ہزاروں "اخوان" قیدخانوں میں دردناک عقوبت کا شکار ہیں۔ جمال ناصر اسلامی تاریخ کی نامور شخصیتوں (Heroes) کے مقابلہ میں "فراعنہ مصر" کی شخصیتوں کو ابھار رہا ہے اور اسلام دشمنی کی حد ہے کہ مصر میں "فرعون" کے نام پر مصری مسلمانوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔

جمال ناصر نے مصر میں خودساختہ "دستور" پیش فرما کر دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ جناب خلیل حامدی نے اس آمرانہ دستور پر تنقید کر کے ناصر کے آمرانہ عزائم کو بے نقاب کر دیا ہے۔

(م۔ ق)

۱۶ جنوری ۱۹۵۶ء کی شام کو مصر کے وزیر اعظم جمال عبد الناصر نے قاہرہ کے الجمہوریہ میدان میں ہزارہا لوگوں کے جم غفیر کے سامنے ملک میں آئندہ نافذ ہونے والے دستور کا مجوزہ مسودہ پڑھ کر سنایا اور یہ اعلان کیا کہ ۲۳۔ جون ۱۹۵۶ء کو اس دستور کا پورے ملک میں ریفرینڈم کرایا جائے گا۔ درمیان میں پانچ ماہ کا وقفہ رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ملک اہلِ فکر و دانش حضرات کو اطمینان کے ساتھ دستوری سفارشات کا مطالعہ کرنے اور ان کے مالہٗ اور ماعلیہ کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔ اور استصواب سے پہلے پہلے عوامی حلقوں کے تاثرات منظرِ عام پر آ جائیں۔ یہ صورت نہ صرف اہلِ مصر کے لئے دل خوش کن تھی بلکہ دوسرے ممالکِ اسلامیہ میں بھی اسے استحسان کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس سے یہ امید بھی بندھ چلی تھی کہ اب مصر کو صحیح معنوں میں صدیوں کی غلامی سے نجات پانے اور جمہوری و آئینی نظام سے متمتع ہونے کا موقع نصیب ہو جائیگا۔ چنانچہ پورے پانچ ماہ کا عرصۂ مہلت ختم ہو گیا۔ ۲۳۔ جون ۱۹۵۶ء کو دستور پر رائے شماری کرائی گئی۔ صدر جمہوریہ کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔

اس پانچ ماہ کے طویل وقفہ میں ہم نے اپنی حد تک انتہائی کوشش اور جستجو کی ہے کہ دستور کے بارے میں مصر کی رائے عامہ کا ردِّ عمل (Reaction) معلوم ہو اور کوئی ایسی آواز کان میں پڑے جو دستور پر آزادانہ تنقید کہی جاسکتی ہو۔ مگر ہمیں نہایت حسرت آمیز کلمات کیساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ پورے ملک میں کم از کم ہمیں کوئی ایسا شوریدہ سر نظر نہیں آیا جس نے جرأت اور جگرداری کیساتھ دستور کا تجزیہ کیا ہو۔ اور اس کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو مفصل طور پر اجاگر کرنے کی سعی کی ہو۔ حالانکہ وہاں بڑے بڑے "عباقرہ" موجود تھے، جن کی زبانیں ہر سانس کے ساتھ استقلال و حریت کا ورد کرتی ہیں۔ مساوات، رواداری اور جمہوریت کا چرچا اُن کی محفلوں میں عام رہتا ہے۔ اُن کے قلم ہمیشہ موجودہ دُنیا کے جمہوری و آئینی ممالک کے نظام ہائے حکومت کی توصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ دستور کے معایب و محاسن کی شناخت میں انھیں پوری دستگاہ حاصل ہے۔ اگر کسی کی زبان نے مُہرِ سکوت توڑی ہے تو اس لئے نہیں کہ دستور کی اصل حقیقت و ماہیت سے اور اس کے منافع و مضرات سے عامۃ الناس کو روشناس کرانا مطلوب تھا۔ بلکہ اس لئے کہ مصر کے وزیر اعظم کو، جن کے متعلق انھیں کامل یقین تھا کہ "صدر جمہوریہ" بھی وہی بنیں گے ـــــ الروح العالمیہ (روحِ عالم) صانع التاریخ العربی (تاریخ ساز) اور رمز الثورۃ (رمزِ انقلاب) ثابت کریں۔ اور اُن کی زبان کو الہام ترجمان اور مسودۂ دستور کے ایک ایک لفظ کو عین حق و صداقت ٹھہرائیں۔ اس غیر مآل اندیشانہ کوتاہی (؟) کا ارتکاب صرف مصر کے عام اہلِ قلم اور اصحاب فکر و نظر نے ہی نہیں کیا۔ بلکہ ازہر کے پُرجوش علماء بھی اپنی روایتی گرمجوشیوں کے باوجود مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ اور شیخ الازہر عبدالرحمان تاج سے عام ازہری عالم تک کسی صاحب جبہ و طیلسان نے دستور کو کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ عین انہی ایام میں جو حکومت کی طرف سے دستور پر عام غور و خوض کے لئے بطور مہلت دیئے گئے تھے، اُن میں سے کچھ حضرات مسئلہ وحدت الوجود اور وجودیین کے ساتھ مناقشات میں اُلجھے ہوئے تھے اور کچھ ازہر کے سرکاری لباس (جبہ و قفطان) کے فضائل و مناقب میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اور اُن کی تنقیص کرنے والوں یا اس میں تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کی خبر لینے میں منہمک تھے۔ بلاشبہ محبّ الدین خطیب جیسے دین کے پُرانے مخلص، بے لوث عالم اور سنجیدہ و فہیم کارکن حلقۂ ازہر میں موجود ہیں۔ بلکہ مجلۃ الازہر (ازہر کا سرکاری آرگن) کے سرپرست ہیں۔ اور رسالہ کے اداریوں میں اپنی حد تک حکیمانہ انداز میں اصلاح احوال بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس طرح کی اِکا دُکا آواز زیادہ مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔ ممکن ہے انہوں نے دستور پر کھلا اور واضح تبصرہ کیا ہو مگر ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اس بند اور محبوس فضا میں صرف ایک دبی دبی سی آواز سنائی دی ہے۔ یہ آواز منبرالشرق کے معمّر مدیر علی الغایاتی کی ہے۔ جس نے دعائیہ انداز میں دستور ساز حضرات کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ملک کے اندر اسلامی طرز کا شورائی نظام حکومت قائم کریں۔ اور مصر کے اسلامی ملک ہونے کی لاج کو برقرار رکھیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں احمد الغزالی اور صالح عشماوی سے خاص طور پر شکوہ ہے۔ اُن کی دین پسندی کبھی آڑے ـــ نہ آئی ـــ

دستور سازی اور فوجی استبداد

سوال یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت مصر میں باضمیر انسانوں کا اس قدر قحط رُونما ہو گیا ہے کہ دستور جیسے اہم مسئلہ کو، جو قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے ـــ درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا اور اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کی تشخیص کر کے اچھے پہلوؤں کو اختیار کرنے اور تاریک پہلوؤں سے اجتناب کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اصل واقعہ یہ نہیں ہے اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم من حیث القوم

اس قدر بے شعور اور بے حس ہو جائے۔ بلکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ مصر کی پوری زندگی پر فوج چھائی ہوئی ہے۔ وزارت سے لے کر ایڈمنسٹریشن کے تمام ادنیٰ و اعلیٰ مناصب پر فوجی آفیسرز براجمان ہیں۔ محکمہ ہائے صحت، تعلیم و تربیت، زراعت مواصلات، تعمیرات، رفاہ عامہ، داخلہ و خارجہ پالیسی۔ حتیٰ کہ ادب و آرٹ پر بھی وہ لوگ بست و کشاد کے فرائض انجام دے رہے ہیں جو کل تک فوج کے اندر بکباشی (میجر) یوزباشی (کیپٹن) قائم مقام (لفٹننٹ کرنل)، صاغ (بریگیڈیر) — قائد الجناح (ونگ کمانڈر) اور لواء (جنرل) کے القاب سے پکارے جاتے تھے۔ اور انھیں فوجی قواعد و ضوابط کی بے چون و چرا اطاعت کے سوا ملکی نظم و نسق میں کوئی درک نہ تھا۔ ہمارے پاس ناموں کی پوری تفصیل کے ساتھ فہرستیں موجود ہیں (جن کی تائید مصر کے سرکاری اخبارات و رسائل بھی کرتے ہیں) جن سے پتہ چلتا ہے کہ بلدیاتی اور شہری نظم کے چھوٹے چھوٹے اداروں کی نگرانی کے لئے بھی فوج سے آدمی سپلائی کئے گئے ہیں۔ صحافت اور پریس پر نہ صرف فوج کا سنسر بیٹھا ہوا ہے (اگرچہ اعلان یہی ہوا ہے کہ ایک سال سے سنسر شپ ختم کر دیا گیا ہے مگر علی الغایاتی کا کہنا یہی ہے کہ "ابھی تک ہم آزاد نہیں ہوئے۔") بلکہ خود فوجی آفیسرز اخبار نویسی کی خدمت پر مامور ہیں۔ مثلاً کرنل انور السادات جو انقلابی عدالت کے تیسرے ممبر اور موتمر اسلامی مصر کے سرکاری طور پر جنرل سیکرٹری، الجمہوریہ پبلیکیشن کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اور الجمہوریہ اخبار کے مدیر مسئول ہیں۔ میجر حسن حافظ فہمی دار الہلال کے ادارتی عملہ میں ہیں اور انقلابی کونسل میں دار الہلال کے نمائندہ بھی ہیں۔ لفٹنٹ کرنل یوسف سباعی الرسالۃ الجدیدہ کے رئیس التحریر، کرنل عبد المنعم اخبار روز الیوسف کے نگران اعلیٰ اور رسالۃ التحریر (سرکاری آرگن) کے ایڈیٹر ہیں۔ میجر وجیہ رمضان رسالہ النورۃ کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ان کے علاوہ آٹھ مدیریات (ضلعوں) کے مدیر (انچارج) بکباشی ہیں۔ ازہر کے تمام اوقاف کی تولیت براہ راست انقلابی کونسل کے دست اختیار میں ہے۔ اس وقت تقریباً پچاس ایسے ایسوسی ایشن اور فیڈریشن ہیں جن کی زمام کار بکباشیوں اور میجروں کے ہاتھ میں ہے۔ بیرون مصر سفیروں اور قنصلوں میں بارہ کی تعداد میں صرف فوجی ہیں۔ ان تفصیلات سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حکومت مصر کی طرف سے دستوری مسودہ کی اشاعت اور اس پر تنقید کرنے کے حق کا اعلان ایسے حالات میں ہوتا ہے جبکہ پورے ملک پر فوجی اقتدار اپنی پوری ہمہ گیری اور قوت کے ساتھ مسلط ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے جان لیوا حالات میں کس نا عاقبت اندیش اور احمق کی شامت آئی ہے کہ وہ دستوری مسودہ پر "مرضی شاہ" کے خلاف زبان انتقاد کھول کر، اپنے جان و مال اور ناموس کو خطرے میں ڈال دے۔ جبکہ ایک سال پہلے اہل مصر کی آنکھیں فوجی اقتدار کی مخالفت کرنے والوں کا لرزہ خیز انجام دیکھ چکی ہیں اور ہنوز دیکھ رہی ہیں۔ بے محابا پھانسیوں کے مناظر بھی ان کے سامنے ہیں اور مصر کے جنگی جیلوں اور سینوہ کے صحراؤں کی ہولناکیاں بھی ان کے شب و روز کے مشاہدے میں ہیں!

صحت مند اور عوامی تقاضوں کے مطابق دستور کی وضع و تدوین کے لئے جس ماحول اور فضا کی ضرورت ہوتی ہے اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ تدوین دستور کے وقت ہر شہری کو دستور سازوں پر کڑی نگرانی رکھنے کے آزادانہ مواقع میسر ہوں تاکہ اگر کسی وقت دستور سازوں کی نیت میں فتور پیدا ہو جائے اور وہ راہ راست سے ہٹ کر ذاتی اغراض اور نفسانی مطالبات کے راستہ پر چل پڑیں تو جمہور کی طاقت بر وقت ان کا ہاتھ پکڑ سکے اور قومی مقتضیات کے مطابق دستور بنانے پر انھیں مجبور کر سکے۔ مگر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مصر میں یہ سب سے پہلی اور اہم شرط مفقود ہے۔ اگر ارباب اقتدار کے اندر خلوص و دیانت کی ذرا بھی رمق ہوتی تو ان کے لئے سب سے موزوں اور اقرب الی المقصود یہ شکل تھی کہ گزشتہ ہنگاموں

میں قوم کی جو خاصی تعداد گرفتاریوں کی نذر ہو چکی تھی - اور اُن کی گرفتاریاں بھی کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں - بلکہ سیاسی اختلاف کی بناء پر عمل میں آئی تھیں - اُن کو رہا کر دیا جاتا اور انھیں پوری سہولتیں فراہم کی جاتیں کہ وہ اپنا منشاء اور اپنی رائے منظرِ عام پر لا سکیں - اس کے ساتھ ہی ہنگامی قوانین کو یکسر منسوخ کر کے شہری آزادیوں کو بحال کر دیا جاتا اور ہر شخص کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے زبان و قلم کے استعمال کی غیر مشروط اجازت ہوتی - اس کے بعد یہ توقع تھی کہ دستوری خاکہ عوامی اُمنگوں کا آئینہ دار ہو گا - مگر یہ نہایت پُر فریب اور عدل و انصاف سے ہٹا ہوا راستہ ہے کہ فوج کے زیرِ سایہ اندرونِ خانہ بیٹھ کر ایک دستوری خاکہ ترتیب دے لیا جائے اور پھر ایک پبلک جلسہ منعقد کر کے عوام کے سامنے پڑھ کر سُنا دیا جائے - اور ایک طرف بہ بانگ دُہل دستور پر عام تنقید کی دعوت دی جائے اور دُوسری طرف سنسر شپ کو پہلے سے زیادہ ہوشیار اور چوکنا کر دیا جائے کہ اگر کسی من چلے اخبار نویس کی زبان کلمۂ حق نکال بھی دے تو اُسے عوام کے سامنے آنے سے پیشتر ہی حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے - اور ایک خاص منصوبہ بندی کیساتھ دستور کے معائب و محاسن سے بہرہ رکھنے والے عوام سے دستور کی منظوری پر ووٹ لے لئے جائیں، بلکہ دستور کے استصواب سے قبل دستوری خاکہ پیش کرنے والے "ہیرو" کو صدرِ جمہوریہ کی کرسی پر براجمان کرا لیا جائے - دستور سازی کی تاریخ میں ایسا عجوبۂ روزگار ڈرامہ آج تک چشمِ گردوں نے نہ دیکھا ہو گا - مکر و فریب کا یہ فنی شاہکار صرف مصر کی اسٹیج پر کھیلا گیا ہے - اس سلسلہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دستور پر لوگوں نے اتنے ووٹ نہیں دیئے جتنے صدر جمہوریہ کے انتخاب پر جناب ناصر کو دیئے ہیں - عوام کو دستور سے بڑھ کر "صدر جمہوریہ" سے کیوں والہانہ محبت ہے - اس کا انکشاف مستقبل کے ہاتھ میں ہے -

دوسرے عرب ممالک مثلاً شام، عراق، لبنان اور فلسطین کے اہلِ علم اور سیاست داں حضرات نے دستورِ مصر پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - اخوان المسلمین کے فاضل رہنما مصطفیٰ السباعی (جو شام کی دستور ساز کمیٹی کے ممبر رہ چکے ہیں) نے بھی مصری دستور اور شامی دستور پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے جامع اور مفصل موازنہ کیا ہے!

دستور ساز کمیٹی دستورِ مصر کی تدوین و ترتیب میں دوسری نادرہ کاری یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ جس "مجلس" نے دستور کی وضع و ساخت کی مہم سَر کی ہے - آج تک اُس کی ہیئت ترکیبی اور اُس کے ارکان و اعضاء پردۂ راز میں ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کونسی شخصیتیں ہیں جن کے ہاتھوں ملک کے مستقبل کی خاکہ بندی ہوتی ہے - براہ راست عوام کی طرف سے کسی ایسی نمائندہ اسمبلی کا انتخاب نہیں ہوا اور نہ عوامی تنظیموں کے نمائندوں پر مشتمل کوئی بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جسے دستور سازی کے فرائض سونپے گئے ہوں - ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۶ - جنوری ۱۹۵۶ء کی مبارک شام کو وزیرِ اعظم مصر کی طرف سے ایک مسودۂ دستور حسبِ وعدہ پڑھ کر سنایا گیا ہے - اور ہزارہا حاضرین نے (جن میں اکثریت شہری لباس میں ملبوس فوجی حضرات کی تھی) پُرجوش تالیوں کے درمیان نہ صرف دستور کو شرفِ سماعت بخشا ہے بلکہ بیٹھے بیٹھے شرفِ قبولیت بھی عطا کر دیا ہے!

انقلابِ ملک کے چھ ماہ بعد سے مسلسل انقلابی عناصر اعلان کرتے رہے ہے کہ ملک میں آزادانہ انتخاب کرائے جائینگے اور شہری آزادیوں سے پابندیاں ختم کر دی جائیں گی - اور آزادانہ انتخاب کے ذریعہ جو اسمبلی وجود میں آئے گی وہ ملک کیلئے دستور بنانے کی ذمہ دار ہو گی - لیکن عملاً یہ ہوتا رہا ہے کہ جب انتخاب کا "یومِ موعود" قریب آتا رہا ہے "ناسازگاریِ احوال" کا حوالہ دے کر اُسے نذرِ تعویق کیا جاتا رہا ہے - آخری اور حتمی وعدہ یہ کیا گیا تھا کہ جمال عبد الناصر بنڈوگ کانفرنس سے

واپس آکر سب سے پہلے اسی فرض سے سبکدوش ہوں گے، مگر "ناسازگاریٔ احوال" میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی - چنانچہ انقلابی حکام نے اس پیچیدگی کے حل کے لئے مؤثر گر یہ تجویز کیا کہ پارلیمانی الیکشن کا طویل اور دیر رس راستہ طے کرنے کے بجائے مختصر راستہ اختیار کر لیا اور انتخابات کے عوامی نتائج سے بچنے کے لئے خود ہی ایک تراشیدہ و خراشیدہ دستور عوام کی جھولی میں لاکر ڈال دیا - اس ضمن میں یہ بتا دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ انقلابی کونسل میں ۱۹۵۳ء میں سابق وزیر اعظم علی ماہر پاشا کی صدارت میں ایک دستوری کمیٹی تشکیل کی تھی - کچھ عرصہ تک کمیٹی دستور سازی کا کام کرتی رہی - کمیٹی کی ضمنی رپورٹوں کے جو حصے پریس میں آئے تھے اُس سے مترشح ہوتا تھا کہ کمیٹی نیک نیتی سے قومی تقاضوں کی ہم آہنگی کرنے والا دستور بنانے کا ارادہ رکھتی ہے - لیکن کمیٹی کا یہ خلوص یا "شوخیٔ طبع" انقلابی کونسلروں کو ناگوار گزری اور انہوں نے بہ لطائف الحیل اس کے راستہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیئے - حتیٰ کہ گزشتہ ہنگاموں میں علی ماہر پاشا اور ڈاکٹر عبد الرزاق سنہوری (ممبر دستور ساز مجلس) کے ساتھ سرکاری جماعت (ہیئت التحریر) کے لوگوں نے جو بدسلوکی کی ہے وہ اپنی شرمناکی میں اپنی آپ مثال ہے - انھیں اُن کے دفتر میں بُری طرح زدوکوب کیا - مگر حکام نے اس پر کوئی نوٹس نہیں لیا - کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ موجودہ مصری دستور دراصل وہی مسودہ ہے جو مذکورہ کمیٹی نے تیار کیا تھا، فوجی حکام نے اُسی مسودے کو اپنی مرضی اور منشاء کے قالب میں ڈھال لیا ہے، مگر ہم اسے صریح مغالطہ سمجھتے ہیں - نیا دستور موجودہ حکمرانوں نے خود وضع کیا ہے - اس میں کسی کا مشورہ شریک نہیں ہے، اس کا انکشاف خود مصر کے قومی رہنمائی کے وزیر فتحی رضوان نے کیا ہے - لبنان کے ماہنامہ الصیاد کے ایڈیٹر (جو انقلاب مصر اور حکام مصر کے بہت بڑے مداح ہیں) نے الصیاد کے شمارہ ۵۹۴ کے افتتاحیہ میں لکھا ہے :-

> "گزشتہ جمعہ کے روز پورا ایک گھنٹہ مجھے قومی رہنمائی کے وزیر فتحی رضوان کی صحبت میں گزارنے کا موقع ملا - اس مجلس میں ہماری گفتگو دستور کے موضوع پر ہوتی رہی - میں نے عزت مآب سے دریافت کیا "نیا دستور کس کیفیت کے ساتھ وجود میں آیا ہے، کیا اس کے بنانے میں انقلابی حکام اور وزراء کے علاوہ قانون دانوں نے بھی حصہ لیا ہے؟" فتحی رضوان نے جواب دیا "نئے دستور کی تدوین صرف انقلابی حکام ہی کی مرہون منت ہے - ہماری خواہش یہی تھی کہ دستور سازی کی ذمہ داری صرف ہم اپنے کندھوں پر اٹھائیں" میں نے پھر سوال کیا "ہم نے تو سُن رکھا ہے کہ بین الاقوامی عدالت کے نائب صدر ڈاکٹر عبد الحمید بدوی بھی اس مہم میں شریک رہے ہیں" عزت مآب کی طرف سے جواب ملا "انقلابی رہنماؤں کے علاوہ کسی دوسرے کے شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

اس تمہید کے بعد اصل دستور کا بعض پہلوؤں سے جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے :-

دستوری ڈھانچہ

پورا دستور چھ ابواب اور ایک سو ننانوے (۱۹۹) دفعات پر مشتمل ہے - شروع میں ایک دیباچہ ہے جس کی ابتداء "نحن الشعب المصری (ہم مصری قوم)" سے ہوتی ہے - دیباچہ میں نہایت مفتخرانہ انداز میں امپیریلزم اور بادشاہت سے گلو خلاصی کرنے اور ملک میں انقلاب برپا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے - اور ان تمام عزائم کا اظہار کیا گیا ہے جن کے تحت آئندہ ملک سے سرمایہ داری، جاگیرداری اور ذخیرہ اندوزی کا استیصال کیا جائے گا -

اور اجتماعی عدل اور صحت مندانہ جمہوریت کو فروغ دیا جائے گا۔ دیباچہ میں اسلام اور اسلامی اصولوں کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ بنیادی طور پر جس پہلو پر زور دیا گیا ہے، وہ نیشنلزم ہے اور بار بار "نحن الشعب المصری (ہم مصری قوم)" کے الفاظ دُہرائے گئے ہیں۔ اور مصری قوم کی سربلندی اور مصری قوم کی تمجید و تعلّی کو اصل خواہش قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچہ کے سرنامہ پر "بسم اللہ" لکھنے کے بجائے "ہم مصری قوم" کا جملہ نصب کیا گیا ہے۔ ابواب کی تقسیم درج ذیل ہے:۔

باب اول:۔ اس میں ریاست مصر کی تعریف۔ اقتدار جمہور اور سرکاری دین کی وضاحت کی گئی ہے۔

باب دوم:۔ اس میں "مصری سوسائٹی کے بنیادی ارکان" کے عنوان کے تحت معاشرے کی اساسات، قومی اقتصادیات، شخصی ملکیت، زرعی نظام، بنیادی ضروریاتِ زندگی، خدائی ثروت وغیرہ کے متعلق ریاست کا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم:۔ بنیادی حقوق کے ضمن میں شہری آزادیوں کی نوعیت بیان کی گئی ہے اور ان تمام حقوق کی تفصیلات متعین کی گئی ہیں جو شہریوں کی طرف سے ریاست پر اور ریاست کی طرف سے شہریوں پر عائد ہوتے ہیں۔

باب چہارم:۔ اس میں "اتھارٹیز" کا عنوان دے کر اس کی ذیلی فصلوں میں ان تمام اختیارات اور امتیازات کو بیان کیا گیا ہے جو صدر ریاست، مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کو دیئے گئے ہیں۔

باب پنجم:۔ اس میں متفرق امور (Miscellaneous) مذکور ہیں اور ریاست کے مرکزی مقام (دارالحکومت) جھنڈے، یونیفارم اور سرکاری گزٹ اور اُن کے قواعد و ضوابط کا ذکر ہے۔

باب ششم:۔ اس میں نفاذ دستور تک عبوری، اور عارضی اہتمامات (Transitional Provisions) کے لئے حدودِ کار کی تعیین اور انتخابات کا بیان ہے۔

عوام کا ردِ عمل

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے "خَوِّفْهُ بالموت حتى يرضى بالحمّى" یعنی حریف کو اگر موت کی دھمکی دی جائے تو وہ بخار پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی مثال آئینِ مصر پر صادق آتی ہے جس ملک میں فوجی ڈکٹیٹرشپ کا عفریت ناچ رہا ہو۔ ملک بھر کی حیات و ممات کا فیصلہ چند کرنلوں اور میجروں کے رحم و کرم پر موقوف ہو۔ سیاسی حریفوں کو، ان کے علم و فضل کا پاس کئے بغیر، پھانسی کے تختہ پر لٹکا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل تصور کیا جاتا ہو۔ قوم کی قوم کو ننگی کا ناچ نچا دینا تسکینِ خاطر کا سامان سمجھا جاتا ہو۔ آئین و ضابطہ، عدل و انصاف کا تمسخر اڑایا جاتا ہو۔ صبح و شام ریڈیو سے "ہامان و فرعون" زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہوں۔ ایسے ملک کے بارے میں صرف اتنا اعلان ہی کانوں میں پڑ جانا کہ وہاں بے آئینی کو ختم کر کے دستوری زندگی بحال کی جا رہی ہے۔ اطمینان کا سانس لینے کے لئے کافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شروع میں مصر کے سوا دوسرے عرب ممالک کے ہر طبقۂ خیال کے لوگوں نے مصر میں دستوری زندگی کی بحالی کا ذکر سنتے ہی کلمۂ شکر ادا کیا۔ اور یاس و ناامیدی کی اتھاہ تاریکیوں سے امید کی دھندلی کرنیں دکھائی دینے پر خوشی کا اظہار کیا۔ مگر افسوس! یہ تمام خوشی چند روز کی مہمان نکلی۔ جب دستور کا پورا متن سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ

اس میں اسلام کو تو باضابطہ فارغ خطی دے دی گئی ہے۔ جمہوریت کا گلا بھی گھونٹ ڈالا گیا ہے۔ پوری عرب دنیا میں مصر کے ماسوا ہر ذی شعور اور صاحبِ بصیرت شخص نے دستور کو "آمریت کے خطرناک ڈھانچے اور ڈکٹیٹرشپ کے ارد گرد مضبوط آہنی حصار بندی" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس وقت دستور کا پورا متن ہمارے سامنے ہے۔ عرب اخبارات اور اکثر اصحاب علم کے تبصرے بھی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت دستور کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لینا ہمارے لئے مشکل ہے۔ البتہ کسی حد تک اس کے اسلامی اور جمہوری گوشوں کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ کم از کم ان حضرات کی "غلط فہمی" کا ازالہ ہوسکے جنہوں نے پہلے ہی دن تاؤ میں آکر حکومتِ مصر کے نام مبارکبادی کے تار بھیج دیے تھے۔ گویا وہاں عملاً اسلامی نظام قائم ہوگیا ہے۔ مقام تعجب ہے کہ ہمارے ملک میں بھی کیسے کیسے سادہ لوح پائے جاتے ہیں جو چین گئے تو فتویٰ دے دیا کہ وہاں مذہبی آزادی ہے۔ مصر کی خبر آئی تو پکار اٹھے۔ سبحان اللہ۔ اسلامی حکومت قائم ہوگئی ہے!!

دستور مصر میں اسلام کا حصہ

دستور مصر کی پوری دستاویز میں جو ۱۹۶ دفعات پر مشتمل ہے، اسلام کا تذکرہ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک دفعہ ۳ (باب اول بعنوان "مصری ریاست") میں، جس میں کہا گیا ہے کہ "الاسلام دین الدولۃ" (ریاست کا مذہب اسلام ہوگا) دوسرا دفعہ ۵ (باب دوم بعنوان "مصری سوسائٹی کی بنیادیں") میں ذکر ہے۔ جس میں مصر کی معاشرتی تعمیر کا نقشہ بیان کرتے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے کہ "الأسرۃ اساس المجتمع قوامها الدین والاخلاق والوطنیۃ" (مصری سوسائٹی کی بنیادیں خاندانی سسٹم پر قائم کی جائیں گی اور خاندان کی عمارت دین، اخلاق اور وطن پرستی کے ستونوں پر تعمیر ہوگی)

ان دونوں مقامات کے علاوہ پورے دستوری ڈھانچہ میں کہیں اسلام، قرآن، سنت، فقہ اسلامی، اسلامی تعلیم وغیرہ کا ذکر نہیں۔ حتیٰ کہ مساوات، اجتماعی عدل (Social Justice) حریت وغیرہ کے اصولوں کے ذکر میں بھی اسلام کو مس تک نہیں کیا گیا۔ مساوات سے مراد عام مساوات۔ اور عدل اجتماعی سے مراد مغربی جمہوری تصور لیا گیا ہے۔ دفعہ ۳ میں بھی اسلام کا ذکر محض مجمل الفاظ میں کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور کسی جگہ ضمنی طور پر اشارۃً یا کنایتاً بھی نہیں بتایا گیا کہ اسلام کے ریاستی مذہب ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس دفعہ کے اضافہ سے کیا ممکنہ نتائج برآمد کرنے پیش نظر ہیں۔ اسلام کو ریاستی مذہب قرار دینے کے لئے کیا کیا عملی اقدامات کئے جائیں گے؟ کیا اسلام (کتاب وسنت) کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیا جائے گا؟ کیا رسولِ خدا کو حَکَم (FINAL AUTHORITY) مانا جائے گا؟ کیا قرآن وسنت کے خلاف قوانین واحکام پر خطِ تنسیخ پھیرا جائے گا؟ کیا بنیادی اور شہری حقوق کے تحفظ کی ضمانت اسلامی اصولوں کے مطابق ہوگی؟ کیا قانونی یکسانیت انہی اساس پر قائم ہوگی جو اسلام نے بیان کی ہے اور جس میں (Head of the state) سے لے کر ایک عام شہری اور بدوی تک ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں؟ کیا اسلام سرکاری مذہب بن کر اقامتِ "معروف" اور ازالۂ "منکر" کے بنیادی نظریہ کو جامۂ عمل پہنانے کی طاقت رکھے گا؟

الغرض اس طرح کی کوئی تشریح مثبت طور پر نہ منفی طور پر آئین کے کسی نقطہ میں جھلکتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ حتیٰ کہ یہ تک نہیں واضح کیا گیا کہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ کا مذہب کیا ہوگا۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائیگا۔

سرکاری مدارس میں دین کی تعلیم لازمی ہوگی یا نہیں؟ ان سب امور کے بارے میں دستور کی زبان یکسر گنگ ہے۔ بلکہ اس کے برعکس آگے چل کر صاف صاف ایسی دفعات بیان کی گئی ہیں جو اسلام کے سرکاری مذہب ہونے کی دھجیاں اڑا رہی ہیں۔ اور جن میں اسلامی حکومت کے ایک ایک نقش کو کھرچ کھرچ کر مٹا دیا گیا ہے۔ اور مذکورہ بالا اسلامی دستور کی لازمی خصوصیتوں کی پوری جسارت کے ساتھ علانیہ تردید کی گئی ہے۔

ریاست کا مذہب اسلام ہوگا!

یہ وہ دعویٰ ہے جس کا شرف صرف جناب ناصر کے دستور ہی کو حاصل نہیں بلکہ مصر کا سابق دستور بھی اس دعوے سے خالی نہیں تھا۔ مصر پر کیا منحصر ہے، ترکی کے علاوہ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کیا گیا ہے۔ اس رسوائے عالم دعویٰ کی جو حقیقت تاریخی تجربات نے مہیا کی ہے اُس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر وہ انسان جسے قدرت نے ذرہ بھر بھی عقل وشعور کی نعمت سے نوازا ہے، اس کے کھلے پن پر شک وشبہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔ خود مصر کا ماضی شاہد عادل ہے کہ جب سرزمین کنانہ پر شاہنشاہیت کا عفریت ناچ رہا تھا، اس وقت بھی یہ دفعہ دستور کے سرنامہ پر منقش تھی۔ حالانکہ بجائے خود شاہیت اسلام کے منافی تھی۔ یہ بے جان اور نام نہاد دفعہ اپنے اندر قوت کا اتنا سرمایہ بھی نہ رکھتی تھی جتنی کہ بادشاہ کے اشارۂ ابرو میں ہوتی ہے۔ اسی دفعہ کی دستوری حکمرانی کے زیرِ سایہ مصر میں ناجائز جاگیرداریاں پنپتی رہیں۔ اسلام کے صریح محرمات، شراب، سود، اور فحش کاری کا ارتکاب کیا جاتا رہا۔ طاغوتی قوانین کا اجراء عمل میں آتا رہا۔ دشمن دین طاقتوں کے ساتھ محبت والفت کے پیمان استوار کئے جاتے رہے۔ اخلاق وآداب کی سربازار مٹی پلید کی جاتی رہی۔ امر بالمعروف کے بجائے "امر بالمنکر" اور نہی عن المنکر کے بجائے "نہی عن المعروف" کا علانیہ مظاہرہ ہوتا رہا۔ عدل وانصاف کے ادارے صریح طور پر غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلے نافذ کرتے رہے۔ ملکی ایڈمنسٹریشن کی پالیسی بے خدا ریاست کی بنیادوں پر مرتب کی جاتی رہی۔ سیاسی ڈراموں کے کردار اسلام کا جامہ تار تار کرتے رہے۔ بے بس رعیت فقر وفاقہ کے ہاتھوں سرِراہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑتی رہی۔ مگر شاہی محلات کے پردوں کے پیچھے جلوہ فروشی، ساقیوں اور نغمہ زن مطربوں پر زر وجواہر نچھاور ہوتے رہے۔ اور ناخدایانِ مصر مدہوشیوں کے عالم میں:-

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیة من عرار[1]

کا نعرہ الاپتے رہے اور اخلاق وکردار، شرافت ودیانت اور حریت وانصاف کے تمام اصولوں کے گریبان تار تار ہوتے رہے۔ جسے دیکھ کر اسلام تو کجا انسانیت کا بھی شرم کے مارے سر جھکتا رہا۔ مگر اس کے باوجود "دین الدولة الاسلام" کے اندر یہ سکت نہ تھی کہ وہ اپنی دستوری قوت کو بروئے کار لا کر خلافِ اسلام اور خلافِ عدل عناصر کا ہاتھ پکڑ کر انھیں سیدھے راستہ پر ڈال دیتا!

دفعہ ۵ میں "دین" کو خاندان کا اساسی عنصر تجویز کیا گیا ہے، بلاشبہ موجودہ دستور میں یہ مبداء امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے سابق دستور خالی تھا۔ اور اس دفعہ کی اہمیت اور تاثیر سے بھی مجالِ انکار نہیں۔ جس معاشرے کا خاندانی نظام دین اور اخلاق سے عاری ہو اس کے انحطاط پذیر ہونے میں کوئی معقول انسان شبہ نہیں کر سکتا۔ واضعین دستور فی الواقع اس احتیاط وحزم پر ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے خاندان کے استحکام وانصرام کو دستور سازی کے موقع پر پیشِ نظر رکھا۔

---

[1] ترجمہ: نجد کے نرگس صحرائی کی خوشبو جتنا لطف اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ آج رات کے بعد یہ پھول دوبارہ کہاں نصیب ہوں گے۔

مگر "دین و اخلاق" کے دستوری کلمات سے گزر کر جب ہم اس کی عملی تعبیر کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمارے ذہن سے حسنِ ظن کے وہ تمام محلات جو ظاہری الفاظ نے تعمیر کئے تھے، اگر کر زمین پر آرہتے ہیں۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین کا ذکر محض قلم کی رواداری اور زبان کے تعلق کی وجہ سے کر دیا گیا ہے۔ اسی بے اطمینانی اور غیر یقینی کیفیت میں اس چیز سے بھی اضافہ ہوتا ہے کہ عدلیہ (judiciary) مقننہ (legislature) اور انتظامیہ (Executive) تک کی تمام فصول (chapters) دین کے ذکر سے خالی گزر گئی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دستور ساز حضرات (جن میں خود وزیر اعظم کرنل ناصر پیش پیش ہیں) نے اعلانِ دستور سے قبل اور اعلانِ دستور کے بعد معاشرتی زندگی میں اخلاق و آداب کی جو "تجدید" کی ہے، اُس سے مغربی معاشرہ کی صحیح جھلک سامنے آجاتی ہے۔

ارباب حل و عقد (جو واضعین دستور بھی ہیں) نے اب تک اپنے دینی تصور اور اخلاقی معیار کی جو عملی مثالیں فراہم کی ہیں وہ اس امر کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ ان حضرات کے نزدیک دین و اخلاق کا تصور اور مفہوم وہ نہیں ہے جو اسلام کی تعلیم کے مطابق ایک عامی مسلمان تک کو ہوتا ہے۔ اُن کا تصور دین "تجدد و تسامح" کے جدید اصولوں پر مبنی نظر آتا ہے۔ عورتوں کا بے محابا نیم عریاں ہو کر بھری مجلسوں میں شرکت کرنا۔ غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز و تکریم میں لوک ناچ اور لوک گانوں کا بندوبست کرنا (جیسا کہ مارشل ٹیٹو کے اعزاز میں قاہرہ کے قصر عابدین میں رقص و سرود کی شب گیر محفل منعقد کی گئی تھی) کلب گھروں کے اندر ورائٹی پروگراموں کا اہتمام کرنا۔ (دستور کی رات کو "ہولیلد کلب" میں انوار السادات نے مجلس رقص منعقد کی۔ مثلاً اس میں اُم کلثوم کے نغمات اور کلب کی دوشیزاؤں کے رقص و سرود کے بعد مؤتمر اسلامی کا جام صحت نوش کیا گیا - انوار السادات مؤتمر اسلامی کے جنرل سیکرٹری ہیں) ملک کی فاحشہ عورتوں کو اُن کے رقص و غنا کے "بلند فنی مظاہروں" پر قومی ثروت شمار کرنا۔ آزادیٔ نسواں کے نام پر اُٹھنے والی مغرب زدہ عورتوں کی ٹولی (بنات النیل وغیرہ) کی حوصلہ افزائی کرنا۔ اخلاق سوز۔ گھٹیا اور متبذل لٹریچر کو سرکاری طور پر شائع کرنا۔ (آجکل مصر کے سرکاری اخبارات و رسائل جس طرح بے حیائی اور عریانی کے فحش مناظر سے لبریز ہوتے ہیں۔ اُس کا ذکر کرنے سے تو یہی بھلی) فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے وفود غیر ممالک میں بھیجنا (پاکستان میں بھی حال ہی میں ایک فلمی ڈیلیگیٹ آیا تھا۔ بلکہ چند روز ہوئے قاہرہ یونیورسٹی کی طالبات کا ایک وفد شام کے دورے پر گیا تھا اور انہوں نے وہاں جا کر کلاسیکی اور لوک ناچ کے مختلف نمونے پیش کئے۔ اس پر شام کے اخبارات نے حکومتِ شام سے سخت احتجاج کیا۔ اور غیرت دلائی کہ ایک طرف یہودیوں کی سنگینیں مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہی ہیں اور دوسری طرف قوم کی غیرت و حمیت کو مصر کی "فرعون زادیاں" سبوتاژ کر رہی ہیں۔ مطالبہ کیا کہ انھیں جلد از جلد واپس بھیجدیا جلئے) دین کے مسلمہ اصولوں مثلاً روزہ وغیرہ کو منہدم کرنے والے شر انگیزوں کو کھلی چھٹی دیئے رکھنا (جیسے شیخ بخیت نے فرضیت صوم پر حملہ کیا تھا۔ ازہر کی عدالت نے اُس پر مقدمہ چلا کر اُسے مجرم ثابت کیا مگر قومی مجلس نے اُسے آزادیٔ رائے قرار دے کر بری کر دیا) ان حضرات کے تصورِ دین اور تصورِ اخلاق کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتا۔

تہذیب فرعون کی آبیاری

خاندانی اساس کا تیسرا عنصر وطنیت بیان کیا گیا ہے۔ وطنیت سے مراد اگر اصولی اور فطری طور پر وطن کی محبت، وطنی اور جغرافی عوامل کو ایک حقیقت تسلیم کرنا اور معاشرے کے میٹریل (خاندان) میں اُن کے طبعی اثرات کا اعتبار کرنا ہے تو اس حد تک اس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے مفید ہے۔ اور اگر وطنیت کی تہ میں وطن پرستی اور وطنی بالاتری کا وہی احساس کارفرما ہے جو

مغرب کے طرزِ فکر کی اُپج ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مصر کے آئین میں ایک ہی فقرے میں تضاد و تناقض کی ایسی لاجواب مثال پائی جاتی ہے جو شاید دُنیا کے کسی دستور میں ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ کیونکہ ایک طرف اُسی فقرے میں دین کو عنصرِ اساسی بتایا گیا ہے اور دوسری طرف ساتھ ہی وطن پرستی کو بھی من حیث الاساس شامل کیا گیا ہے۔ مگر ہم کسی قسم کی غلط فہمی اور بد اندیشی کا شکار ہوئے بغیر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مصری حکمران جس طرح کی وطنیت اور قومیت کے احیاء کے خواہشمند ہیں وہ مغرب کی کوتاہ دامنی وطنیت اور قومیت سے کسی صورت کم نہیں۔ اس وقت حکومت مصر کے ذریعہ سے، اخبارات کے ذریعہ سے اور پبلک جلسوں کے ذریعہ سے مسلسل یہ کوشش کر رہی ہے کہ قوم کے اندر یہ شعور بیدار کرے کہ اس کا سلسلۂ نسب مصر کے "ذی المجد والعزۃ" فراعنہ کے ساتھ جا کر ملتا ہے۔ اور رعمسیس، تحوتمس، توت، عنخ آمون وغیرہم فرعونی دَور کے اکابر اس کے قومی رائل ہیرو ہو گزرے ہیں۔ "العزۃ للّٰہ" کے پہلو بہ پہلو "المجد لمصر" کا نعرہ اُن کے انہی عزائم کی غمازی کرتا ہے! مصری قومیت کو اُبھار دینے کا یہ جوش ایک نہایت ہی خطرناک فتنہ ہے۔ یہ ایک زبردست سازش ہے جو اسلامی تاریخ کے نامور اکابر اور "ہیروز" کے خلاف کی گئی ہے کہ اُن کے سیرت و کردار اور تقدیس و عقیدت کی طرف جو مصری مسلمانوں کا اب تک رجحان رہا ہے اُس کا رُخ فراعنۂ مصر کی طرف ہو جائے۔ ؎

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

صدرِ جمہوریہ

آئینِ مصر کا سب سے دلچسپ حصہ صدرِ جمہوریہ یا صدرِ ریاست کے اختیارات و اوصاف ہیں۔ صدرِ جمہوریہ گویا پورے دستور کی روح اور محور ہے۔ آئین کے اس حصہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے بیسویں صدی کا صدرِ جمہوریہ نہیں بلکہ دَورِ ملوکیت کا "ظلِّ سبحانی" ہے۔ جس کی ذات قدسی صفات معصوم، مبرّا عن الخطاء اور ہر قسم کے اختیارات کی مالک ہے۔ ذیل میں ہم مصر کے صدرِ جمہوریہ کے اختیارات و اوصاف کا ایک خلاصہ آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ لگا لیں گے کہ مصر کے صدرِ جمہوریہ کے اختیارات میں اور نازی جرمنی اور فاشی اطالیہ کی آمریت کے اختیارات میں کیا فرق ہے۔ بیشک نام جمہوریت کا ہے مگر سارا نقشہ خالص آمریت کا کھینچا گیا ہے۔ اور ملک کو ایک شاہی خاندان سے نجات دلا کر دوسرے شاہی خاندان کے حوالے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صدر کے اختیارات پر ایک نظر

دستور کی دفعہ ۱۱۱ کی رُو سے صدرِ جمہوریہ کو یہ علی الاطلاق حق حاصل ہے کہ وہ نیشنل اسمبلی کو جب چاہے توڑ دے۔ اسمبلی کی تحلیل میں وہ کسی شرط کا اور کسی مشورے کا پابند نہیں کیا گیا ہے۔ اگر نیشنل اسمبلی صدر کو معزول کرنا چاہے تو اُسے نہایت طویل راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور پھر بھی اس امر کا کوئی یقین نہیں کہ وہ اسے معزول کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ مثلاً صدر کی معزولی کے لئے لازم ہے کہ اولاً اس تجویز کو اسمبلی میں لانے کے لئے ½ ارکانِ اسمبلی کا اتفاق ہو۔ اور تجویز میں یہ تصریح کی گئی ہو کہ صدر نے بہت بڑی بد عنوانی کی ہے یا اُس نے نظامِ جمہوری (دستور کی نہیں) کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کے بعد معزولی کی قرارداد کو پاس کرنے کے لئے ⅔ ارکانِ اسمبلی کی حمایت حاصل ہونا ضروری ہے۔ (جبکہ اس کے انتخاب کے لئے مطلق اکثریت کی شرط لگائی گئی ہے۔ دفعہ ۱۲۰)

علاوہ ازیں دفعہ ۲۷ صدر کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ اسمبلی کے اجلاس کو کسی وقت بھی برخاست کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس اسمبلی کی گردن ہر وقت صدر کے ہاتھ میں ہو کہ وہ جب چاہے اُسے dissolve کر دے اور جب چاہے اُس کا اجلاس برخاست کر دے۔ وہ صدر کی معزولی کا کیا اختیار رکھتی ہے۔ اُس کی شامت آئی ہے کہ وہ صدر کو رخصت کرنے کی

حماقت میں خود اپنے ہی وجود سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاکستان میں بھی صدر کو تحلیلِ اسمبلی کے لئے پارلیمنٹ کے مشورہ کا پابند کیا گیا ہے، خود مصر کے پڑوسی ملک (شام) میں صدر کو کلی اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ جب ترنگ میں آئے اسمبلی کا تیا پانچہ کر دے۔ بلکہ پارلیمنٹ کی منظوری اُس پر لازم کر دی گئی ہے۔ صدر جمہوریہ مصر یا صحیح لفظوں میں کرنل ناصر ہی وہ واحد صدر ہیں جو اسمبلی کو چاہیں تو موت کے گھاٹ اُتار دیں اور چاہیں تو زندہ رہنے دیں ؎

مار بھی جلاؤ بھی آسان ہے سب تم کو　　آنکھوں میں ہلاہل ہے ہونٹوں میں مسیحائی

ڈکٹیٹرشپ کے خدوخال

(۱) صدر جمہوریہ افواج مصر کا کمانڈر انچیف ہے۔ (دفعہ ۱۳۹) کمانڈر انچیف وزیر دفاع کے منصب پر بھی فائز ہو سکتا ہے اور بیک وقت دونوں عہدوں پر رہ سکتا ہے (دفعہ ۱۷۱)

(۲) وزیر اعظم بھی صدر جمہوریہ ہی ہوگا۔ پارلیمنٹ کے تمام وزراء کا نصب و عزل صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں ہوگا (دفعہ ۱۴۶)

(۳) ہنگامی حالات (ایمرجنسی) کا اعلان بھی صدر محترم ہی فرمائیں گے۔ اعلان کے پندرہ روز کے اندر اُسے اسمبلی میں پیش کرنا ضروری ہوگا۔ اور اگر اسمبلی موجود نہ ہو (یعنی اُسے قبل از وقت صدر محترم نے توڑ دی ہو) تو یہ آرڈیننس توثیق کے لئے نئی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں پیش ہوگا۔ (دفعہ ۱۴۴)

(۴) "دفاع وطن" کے نام سے ایک مجلس بنائی جائے گی جس کی زمام صدارت صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں ہوگی۔ اور اس مجلس کا کام پبلک کے اندر امن عام اور سلامتی کو قائم رکھنے والے وسائل و ذرائع پر خصوصی نگاہ رکھنا ہوگا۔ (دفعہ ۱۶۸) غالباً اس احتیاطی تدبیر کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے اندر اگر کوئی فرد یا چند افراد حکمران طاقت کے خلاف ہو جائیں تو اُن کی سرکوبی کے لئے "قانونی" ذرائع موجود ہوں۔

(۵) صدر جمہوریہ سزاؤں کو کلیتہً معاف کرنے کا مجاز ہے اور اُن کے اندر تخفیف بھی کر سکتا ہے (دفعہ ۱۴۱) البتہ عام معافی قانون کے مطابق ہوگی۔

(۶) صدر جمہوریہ کو حق حاصل ہے کہ وہ از خود قوانین کی سفارشات (تجاویز) پیش کرے۔ مجوزہ قوانین پر اعتراض کر سکے۔ قوانین کو صادر کرے۔ (دفعہ ۱۳۲)

(۷) سول اور فوجی ملازمین اور سیاسی نمائندوں کی نامزدگی صدر جمہوریہ کی طرف سے ہوگی۔ اور وہی حسب قانون انھیں معزول کرنے کے مجاز ہیں۔ (دفعہ ۱۴۰)

(۸) مصر کی تنظیمی وحدتوں کی نمائندہ مجالس کو صدر جمہوریہ اپنے آرڈیننس سے توڑ سکتے ہیں۔ اور ان کی تحلیل کے بعد عبوری دور کے لئے ایک باڈی نامزد کر سکتے ہیں جو اُن کی قائم مقام ہوگی (دفعہ ۱۶۶)

(۹) جس زمانہ میں نیشنل اسمبلی کا اجلاس منعقد نہ ہوا ہوگا۔ یا نیشنل اسمبلی ٹوٹ چکی ہوگی۔ اس دوران میں صدر جمہوریہ ضرورت محسوس کرے تو آرڈیننس جاری کر سکتا ہے۔ جن کی پاور قانون کی ہوگی۔ یہ آرڈیننس تاریخ اجراء کے بعد پندرہ دن کے اندر اندر منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش کئے جانے لازم ہیں۔ اگر اسمبلی باقی ہو۔ اور اگر نیشنل اسمبلی dissolved ہو چکی ہو تو نئی اسمبلی کے پہلے سیشن میں پیش کئے جائیں گے۔ اگر یہ آرڈیننس نیشنل اسمبلی میں توثیق کے لئے پیش نہیں کئے جائیں گے تو اُن کی قانونی قوت از خود ختم ہو جائے گی۔ اگر نیشنل اسمبلی ان آرڈیننس کو مسترد کر دیتی ہے تو اُن کے سابقہ اثرات بھی کالعدم سمجھے جائیں گے۔ اِلّا یہ کہ اسمبلی ان کے سابقہ اثرات پر اعتماد کی رائے دے یا کسی اور طریقہ سے سابقہ اثرات

کو صحیح قرار دے دے (دفعہ ۱۳۵)

(۱۰) صدر جمہوریہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ ہنگامی حالات میں آرڈیننس جاری کر سکے۔ جو قانون کی قوت رکھیں گے، یہ حق صدر کو نیشنل اسمبلی کی طرف سے تفویض کیا جائے گا۔ ایسے آرڈیننس کا زمانۂ اجراء اور ان کی نوعیت محدود ہوگی (دفعہ ۱۳۶)

(۱۱) صدر جمہوریہ مصلحت عوام کے تحت ضروری آرڈیننس کا اجراء عمل میں لا سکتا ہے۔ اور اُن کی عملی نوعیت پر نگرانی کر سکتا ہے (دفعہ ۱۳۷)

(۱۲) تمام انتظامی اختیارات مصر کے صدر جمہوریہ کی ذات میں مرکوز رہیں گے (دفعہ ۱۱۹)

(۱۳) صدر جمہوریہ کو دستور کی کسی ایک دفعہ کو یا متعدد دفعات میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔

رسالہ "الحضارۃ الدمشقیہ" کا مقالہ نگار دستور کی انہی دفعات کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:۔

> "مصر کا نیا دستور فی الحقیقت آمرانہ نظامِ حکومت کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں کسی عقلمند کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں صرف ایک نیابتی طرزِ حکومت پر ہی اطمینان ہو سکتا ہے۔ جس میں وزراء کی مجلس اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہو"

صدر جمہوریہ بننے کی ایک دلچسپ شرط اور اس کا پس منظر

جمہوریۂ مصر کی صدارت کے لئے جس شخص کو منتخب کیا جائے گا۔ اُس کے اندر اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے کہ وہ ابوین اور جدین سے مصری النسل ہو۔ اور مصر کے اندر اُسے شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہوں۔

— اس کی عمر ۳۵ سال (سن عیسوی کے لحاظ سے) سے کم نہ ہو۔

— شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ (دفعہ ۱۲۰)

دستور مصر کی اس سب سے اہم دفعہ پر ہم نے کافی غور وخوض کیا لیکن شروع میں تو ہم نہ سمجھ سکے کہ صدر جمہوریہ کے لئے دو پشتوں سے مصری النسل ہونے کی قید لگانے کا آخر پس منظر کیا ہو سکتا ہے، مگر بعد میں اس کی وجہیں معلوم ہوئی اور الشہاب (دمشق) نے بھی اس کی تائید کر دی کہ صدر جمہوریہ مصر کے لئے ابوین وجدین سے مصری ہونے کی سخت ترین شرط صرف اس بناء پر لگائی گئی ہے کہ کرنل جمال عبدالناصر کے سخت جان حریف اور مصر کی محبوب ترین شخصیت جنرل محمد نجیب کو جمہوریۂ مصر کی صدارت سے ابد الآباد تک کے لئے محروم قرار دے دیا جائے۔ اس لئے کہ جنرل نجیب کی ماں مصری نہیں، سوڈانی ہے۔ اب جنرل نجیب از روئے دستور (جب تک مصر کے اندر یہ دستور باقی ہے) صدارت کے لئے منتخب نہیں ہو سکے گا۔!

جمال عبدالناصر کی عاقبت اندیشی کی داد دینی چاہیئے۔ کہ اس نے اپنے حریف کو، جس کے متعلق اُسے ہر وقت یہ سخت اندیشہ لاحق رہتا تھا کہ فوج میں ہردلعزیز ہونے کی وجہ سے وہ کسی وقت بھی دوبارہ ریاستِ مصر پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس خوش اسلوبی سے میدان سیاست سے نکال دیا ہے کہ اس کے دوبارہ آنے کے امکانات ہی ختم کر دیئے ہیں۔ اور اس سے بڑا ظلم شاہی خاندان پر کیا ہے جس کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اسی خاندان میں قیامت تک کے لئے وطن کے غدار ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس فرضی جرم کی پاداش میں از روئے دستور فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ قیامت تک کے لئے کوئی اس خاندان کا فرد صدارت کی کرسی پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔ یہ شرط اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اور جمہوری نقطۂ نظر سے بھی

سراسر ناملائمانہ اور جابرانہ ہے۔

۳۵ سال کی تحدید بھی بڑی معنی خیز ہے، دنیا کے تمام دستوروں میں غالباً کسی صدر کی عمر ۴۰ برس سے کم نہیں ہوگی۔ مصر کا دستور اس سلسلہ میں بڑا وسیع النظر ثابت ہوا ہے کہ اس نے ۳۵ سال کے امیدوار کو بھی صدارت کے انتخاب کی اجازت دے دی ہے۔ یہ جامہ دراصل جس ہستی کو پیشِ نظر رکھ کر سیا گیا ہے۔ وہ کرنل ناصر ہیں۔ کرنل ناصر کی عمر اس وقت ۳۶ برس کے لگ بھگ ہے، اگر دنیا کے دوسرے دستوروں کی تقلید میں مصر کے صدر کے لئے بھی ۴۰ سال کا ہونا ضروری قرار دے دیا جاتا تو اس کا صاف مدعا یہ تھا کہ مصر کے "رمز الثورۃ، صانع التاریخ العربی، الروح العالمیۃ" کرنل ناصر صدارت کے لئے منتخب نہ ہو سکتے۔ ایسی صورت میں دستور بنانے سے کیا حاصل تھا۔ اس قباحت سے بچنے کے لئے جامۂ عمر کو ۵ سال کم کر کے ۳۵ سال کر دیا گیا ہے تاکہ "روحِ دستور" (ناصر) کے بدن پر بلا تشبیب و فراز پورا آسکے!

جمہوریت کے تابوت میں آخری کیل

باب ششم میں عارضی احتیاطات (Transitional Provisions) کے تحت یہ دفعہ رکھی گئی ہے:۔

"ملکی عوام ایک نیشنل یونین کی تشکیل کریں گے جو "انقلاب" کے اغراض و مقاصد کو جامۂ عمل پہنائے گا۔"

"نیشنل اسمبلی کے امیدوار نامزد کرنے کا حق صرف ۔ اور صرف نیشنل یونین کو حاصل ہوگا۔"

"نیشنل یونین کی تشکیل کا طریقہ اور قواعد وضوابط صدر جمہوریہ اپنے ایک آرڈیننس کے ذریعہ واضح کریں گے۔"

اس دفعہ کا بنظر تعمق مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مصر عارضی عسکری حکومت کے شکنجۂ استبداد سے نکل کر دائمی ڈکٹیٹر شپ کی گود میں جا رہا ہے۔ اس دفعہ کا صاف مفہوم یہ ہے کہ آئندہ مصر پر صرف ایک پارٹی کی حکومت ہوگی!

نیشنل یونین کی تجویز اس لئے رکھی گئی ہے کہ ملک میں کسی دوسری جماعت کا وجود باقی نہ رہ سکے، اور اگر کوئی پارٹی قائم بھی ہو جائے تو اسے دستوری حیثیت سے اپنے نمائندے اسمبلی میں بھیجنے کا سرے سے موقع ہی نہیں مل سکیگا۔ دستور کی رو سے صرف نیشنل یونین ہی اپنے نمائندے اسمبلی میں بھیج سکتی ہے، جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں۔ اس وقت ملک بھر میں فوج کی حکومت ہے۔ عام نظم و نسق سے لے کر ادب و صحافت تک کے ادارے فوجی آفیسرز کی تحویل میں بنے ہوئے ہیں تمام ایسوسی ایشنز کے کرتا دھرتا بکباشات وصاغات ہیں۔

مجوزہ نیشنل یونین (جسے عوام منتخب کریں گے اور جس کی ہیئت ترکیبی صدر جمہوریہ اپنے ایک آرڈیننس سے واضح کریں گے) میں جن لوگوں کو نمائندگی حاصل ہوگی بلکہ جو نمائندگی کے واحد حقدار ہوں گے اور ان کے علاوہ کسی دوسرے کو جرأت نہیں ہوگی، وہ فوجی آفیسر ہی ہوں گے۔ یا وہ لوگ جنہیں فوج کی تائید اور حمایت حاصل ہوگی۔ کسی آزاد امیدوار کے لئے یا کسی آزاد جماعت کے لئے نیشنل یونین میں بار پانا حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ نیشنل یونین ہی اس امر کی مختار کل ہے کہ وہ نیشنل اسمبلی کے لئے نمائندوں کی نامزدگی عمل میں لائے، گویا نیشنل اسمبلی کی زینت اور رونق بھی انہی حضرات کے دم قدم سے ہوگی جو نہ صرف فوج کے محبوب اور مؤید ہوں گے بلکہ جناب ناصر کو بھی اپنا واحد اور لاشریک آقا تسلیم کرتے ہوں گے۔

اس پوری منطق کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ نیشنل اسمبلی اپنی مطلق اکثریت سے صدر جمہوریہ کا انتخاب کرے گی اور پھر

منتخب کردہ صدر کا عام استصواب کرائے گی، حقیقت یہ ہے کہ نیشنل اسمبلی کے انتخاب اور صدر کے انتخاب کی یہ اُلٹی منطق کسی ڈکٹیٹر کے ذہن کی پیداوار ہی ہو سکتی ہے۔ دُنیا کے جمہوری ممالک میں اس کا نمونہ گزشتہ اور موجودہ کسی دَور میں نہیں نظر آتا۔ یہ طرزِ حکومت صرف فاشی اور نازی حکومتوں کے اندر (یا موجودہ روسی حکومت کے اندر) ہی پایا جا سکتا ہے۔ جہاں صرف ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے۔ اُس پارٹی کو اسمبلی کے نمائندے نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہی ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو منتخب کرتی ہے۔ اور پھر عوام سے پُوچھتی ہے کہ بتاؤ تم میں سے کسی ناعاقبت اندیش کو ہمارے منتخب کردہ شخص کے بارے میں چون و چرا کرنے کی جسارت ہو سکتی ہے!

مصر کے ہفتہ وار اخبار منبر الشرق نے اپنی ۱۷ فروری ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں انقلابی کونسل سے سوال کیا ہے:-

"کیا نیشنل یونین ہیئت التحریر ہی کا دوسرا نام ہے یا اُسے جداگانہ بنیادوں پر تشکیل دیا جائے گا؟"

ہیئت التحریر وہ باڈی ہے جو اس وقت مصر پر حکمران ہے اور انقلابی حکومت کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ منبر الشرق کا یہ استفسار دراصل اپنی استفہامی زبان میں اس امر واقعی کی غمازی کر رہا ہے کہ وہی کھلاڑی جو اب تک فوجی حکومت کے نام سے مصر کے اسٹیج پر دندنا رہے تھے۔ اب جمہوری قبا کے پردے میں استبداد کے کرتب دکھائیں گے!

ایک نہایت خطرناک دفعہ

باب پنجم دفعہ ۱۹۱ میں بیان کیا گیا ہے:-

(ا) وہ تمام فیصلے جو انقلابی کونسل کی ہائی کمان کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔

(ب) وہ تمام آرڈیننس جن کا تعلق انقلابی ہائی کمان سے ہے اور وہ اس کی تکمیل اور تنفیذ کے لئے جاری کئے گئے ہیں۔

(ج) وہ تمام آرڈیننس اور قوانین جو ان اداروں سے جاری کئے گئے ہیں جن کی تشکیل کا حکم انقلابی ہائی کمان کی طرف سے دیا گیا تھا۔

اور

وہ تمام اقدامات، تصرفات اور جملہ کاروائیاں جو مذکورہ اداروں کی طرف سے یا کسی بھی ایسی باڈی کی طرف سے جو انقلاب کی حمایت اور نظامِ حکومت کی حفاظت کے لئے قائم کی گئی تھی، عمل میں آئی تھیں اُن پر کسی قسم کی:-

(۱) نکتہ چینی اور تنقید نہیں کی جا سکے گی۔

(۲) اُن کی تنسیخ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکے گا۔

(۳) اُن میں ترمیم و تغیر (amendment) کرنے کی اجازت نہیں ہو گی!

اس ظالمانہ دفعہ نے نہ صرف اہلِ مصر بلکہ تمام عرب ممالک کے عوام کے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہیں۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال کی حکومت نے بھی اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے اور اپنی بد عنوانیوں پر نقاب ڈالنے کے لئے اسی طرح کی دستوری تدابیر اختیار کی تھیں۔

اس دفعہ کا مفہوم یہ ہے کہ فوجی حکمرانوں نے مصر کے اندر فوجی انقلاب لانے کے بعد جو کچھ صحیح یا غلط اقدامات کئے

ہیں ۔ براہ راست کئے ہیں، یا مختلف باڈیز کو تشکیل دے کر کئے ہیں۔ انھیں زیر بحث لانے کے تمام دروازے بند کئے جائیں۔ انقلابی حکمرانوں نے عنانِ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں اُن سے ساری دُنیا باخبر ہے، انقلاب اس لحاظ سے مستحسن تھا کہ مصر کے اندر سے شاہیت کی جڑیں اُکھاڑ کر عوام کو اس کے ظلم و جور سے نجات دلائی گئی تھی۔ مگر خود انقلاب لانے والوں نے اہلِ ملک کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ اس شاہی استبداد سے بھی بدتر ثابت ہوا ہے۔ جنرل نجیب کو جس کے سر پر انقلاب لانے کا سہرا ہے اور جو کرنل ناصر سے پہلے صدارت کی کرسی پر تھا، نہ صرف صدارت سے برطرف کر دیا گیا بلکہ عملاً اس کے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کیا گیا ہے کہ اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ابھی تک وہ اپنے گھر میں نظر بند ہے۔ اسے کسی قسم کی سرگرمی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اُس پر جرم کی جو فرد قرارداد عائد کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ آمریت کے بجائے جمہوری حکومت کے حق میں تھا اور ملک کی زمام فوج کے ہاتھ سے نکال کر عوام کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ جنرل نجیب کے حامیوں کو چُن چُن کر فوج سے نکال دیا گیا۔ رائے عامہ کو سختی سے دبا دیا۔ سول اداروں میں جتنے لوگوں نے جنرل نجیب کی برطرفی پر احتجاج کیا یا افسوس کیا انھیں ڈسچارج کر دیا۔

اسی طرح مصر کی دینی جماعت الاخوان المسلمون کے ساتھ جو ڈرامہ کھیلا گیا ہے وہ ہر صاحبِ خرد انسان کو خون کے آنسو رلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی مقتدر علمی شخصیتوں کو کسی جرم و گناہ کے بغیر تختۂ دار کی نذر کر دیا گیا۔ ہزاروں انسانوں کو جیلوں میں بند کر دیا اور وہاں سخت سزاؤں کا تختۂ مشق بنایا۔ اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اُن کی املاک کو ضبط کر کے فوجی حکومت کے قبضہ میں دے دیا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ عالمِ عرب و اسلام کے شدید احتجاج کے باوجود اُن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ ان تمام بے ضابطگیوں اور بد کرداریوں کے ہوتے ہوئے انقلابی حکمران پاداشِ عمل سے کیونکر بچ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس گرفت سے جان بخشی کرانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھا ہے کہ دستور میں کوئی ایسا تحفظ کر لیں جس کی زد سے آئندہ بھی اُن کی حماقتوں کے خلاف کسی کو چارہ جوئی کرنے کی اجازت نہ ہو۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ انقلابی عدالت نے آج تک جو اندھا دھند فیصلے صادر کئے ہیں وہ باقاعدہ نافذ رہیں گے۔ اُن کے خلاف کسی ادارے کے سامنے اپیل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جنرل نجیب نظر بند رہیں گے۔ اُن کے حامی فوجی علیٰ حالہم برطرف رہیں گے۔ اخوان المسلمون کے عودہ و فرغلی اور باقی اصحاب پھانسی پا چکے ہیں تو یہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ ہزاروں جیل میں پڑے سسک رہے ہیں اور سسکتے رہیں گے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور نظم و نسق کے اداروں میں سے معتد بہ تعداد نجیب و اخوان کی حمایت کے اشتباہ میں معزول کر دی گئی ہے تو اسے کوئی دوبارہ نہیں لا سکتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ دستور یہ کہتا ہے کہ انقلابی کونسل اور انقلابی کونسل کی ماتحت باڈیز (انقلابی عدالت وغیرہ) نے جو فیصلے صادر کر دیئے ہیں اُن پر تنقید کی جا سکتی ہے نہ انھیں کسی کے سامنے زیر بحث لایا جا سکتا ہے اور نہ اُن میں کسی تبدیلی و ترمیم کی گنجائش ہے!

مصر کے دستور ساز ممکن ہے کہ اس دفعہ کو دستور میں داخل کر کے مطمئن ہو گئے ہوں کہ اُن کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کائنات میں اللہ کی سنت بھی جاری و ساری ہے۔ اُس کے سامنے مصر کے موجودہ فوجی حکمران کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ خود مصر کے اندر فرعون و ہامان کے نعرہ ہائے "انا ربکم الاعلیٰ" کے باوجود سنت اللہ نے اُن کا ایسا نام و نشان مٹایا کہ رہتی دُنیا تک عبرت و موعظت بنا رہیگا۔ ترکی کا ماضی اُن کے سامنے ہے۔ کمال اتاترک نے اپنے بچاؤ کے لئے ایسے ہی ذرائع اختیار کئے تھے۔ مگر تاریخ نے بہت جلد اُن کا بودا پن ثابت کر دیا۔ وہی اتاترک جو "قوم کا باپ" کہلاتا تھا، وہی آج

اپنے "بیٹوں" کے ہاتھوں اپنے کئے کی سزا پا رہا ہے۔ اس کے مجسمے ترکی میں بکثرت مقامات پر توڑ دیئے گئے ہیں۔ اور اس کی تمام تصویروں کو (دو ایک کے سوا) پھاڑ دیا گیا ہے۔ اور اب "تحفظ اتاترک" اور "تحفظ انقلاب" کے نام سے قانون نافذ کئے جا رہے ہیں۔" (المسلمون قاہرہ) ۵۶ء

الحذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

ملکی عدالت سے بالاتری اولاً تو یہ تصور کرنا ہی محال ہے کہ نیشنل اسمبلی، صدر کا محاسبہ کرنے اور اُسے مجرم قرار دینے میں کامیاب ہو سکتی ہے، اور اگر بالفرض (جیسے عنقا، کا وجود فرض کر لیا گیا ہے) صدر کے خلاف ارکانِ اسمبلی کی ۲/۳ اکثریت بہت بڑی بدعنوانی یا نظام جمہوری سے عدم دلچسپی کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کرے تو مقدمہ کی سماعت، کا حق سپریم کورٹ کو بھی نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کے لئے ایک خاص عدالت قائم کی جائیگی جو اس کی تحقیقات کرے گی۔ ثبوتِ جرم پر زیادہ سے زیادہ اُسے منصبِ صدارت سے معزول سمجھا جائے گا اور دوسری کوئی سزا اُسے نہیں دی جاسکے گی۔

"دین الدولۃ الاسلام" کا تقاضا تو یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں۔ کسی کو کسی پر تفوق نہ ہو۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور متدین خلیفہ کا ایک بوڑھیا سرِ بازار محاسبہ کر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صدر ریاست کو حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ اونچا درجہ دیا جائے۔ مگر "دین الدولۃ الاسلام" کی دفعہ اس لئے دستور میں نہیں رکھی گئی کہ صدر جمہوریہ مصر کے اختیارات کو محدود کر دے اور قدم قدم پر اسلام کی عائد کردہ پابندیوں کا احساس دلاتی رہے بلکہ اس دفعہ کے شاملِ دستور رکھنے (کیونکہ یہ پہلے دستور میں بھی تھی) کا مقصد محض عوام کو بیوقوف بنانا ہے!

بنیادی حقوق "شہری آزادیاں"۔ دستور کے اندر اہم ترین حصہ شہریوں کے بنیادی حقوق کا ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دستور کی ضرورت ہی اس لئے محسوس کی گئی ہے کہ ایک شہری کو اس کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت بہم پہنچائی جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔ مصری دستور میں بنیادی حقوق و واجبات کی وضاحت کی گئی ہے، جن کا ملخص یہ ہے:-

(۱) ہر شہری کو عقیدہ و مذہب اور عبادات و شعائر دینیہ کی آزادی ہو گی۔ بشرطیکہ ان سے عام نظم و نسق میں خلل واقع نہ ہو اور نہ آداب کے منافی ہو۔

(۲) ہر شہری کو آزادی اظہار رائے، آزادی تحریر و تقریر۔ آزادی بحث و مباحثۂ علمی کی ضمانت دی جائے گی۔ مگر ان آزادیوں کو "قانونی حدود" میں پابند رکھا جائے گا۔

(۳) آزادیٔ نشر و اشاعت اور آزادیٔ صحافت کی ضمانت، مصالح عامہ اور قانونی حدود کے تحت بہم پہنچائی جائیگی۔

(۴) آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع (اسلحہ کے بغیر) "قانونی حدود" میں رہ کر جائز ہو گی۔

اخبار "منبر الشرق" نے "قانونی حدود" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"قانونی حدود" کے الفاظ کے اضافہ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دستور دائیں ہاتھ سے آزادی دیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے واپس لے لیتا ہے۔"

تعلیم

(۱) تعلیم آزادانہ ہو گی اور اسے قانون، عام نظم و نسق اور آداب کی حدود میں محدود ہو گا۔

(۲) تعلیم مصریوں کا حق ہے، حکومت تربیتی، ثقافتی ادارے اور مدارس جاری کر کے اُن کے اس حق کو پورا کرے گی۔

(۳) ہر قسم کی تعلیم پر حکومت نگراں ہو گی اور اس کے لئے قانونی تدابیر عمل میں لائے گی۔

(۴) سرکاری مدارس میں تعلیم مختلف مرحلوں میں مفت ہوگی۔ مگر اُن حدود کے تحت جنہیں قانون متعین کرے گا۔

(۵) ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ جسے سرکاری مدارس میں مفت رکھا جائے گا۔

صحت صحت کی دیکھ بھال مصریوں کا حق ہے۔ ریاست مصر اپنے مختلف اداروں کے ذریعہ سے اس حق کی نگرانی کرے گا۔

مساوات عامہ:۔ (۱) تمام شہری قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے۔ قومیت، نسل، زبان اور دین و عقیدہ کی بنا، پر اُن کے حقوق میں تفاوت نہیں کیا جائے گا۔

(۲) جرم و سزا قانون کی بنا پر ہوگا۔

(۳) کسی شہری کی گرفتاری اور نظر بندی قانونی احکام کے موافق ہوگی۔

(۴) کسی شہری کو کسی معین جگہ پر رہنے کے لئے مجبور کرنا۔ کسی معین جگہ پر رہنے سے منع کرنا ناجائز ہوگا۔ مگر ان احوال کے تحت جو قانون میں واضح کر دیئے جائیں گے۔

مصر کے دستور پر یہ بہت ہی مختصر اور مجمل تنقید ہے۔ اس اجمال سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصر کے "دستور" نے ملک میں آمریت کی جڑیں کس قدر مضبوط کر دی ہیں اور وہاں جمہوریت کتنے سخت فولادی شکنجہ میں کسی ہوئی ہے۔

اسعد گیلانی

راہِ حق میں رشتہ اور ناتہ کی حیثیت

(سید احمد شہید کی تحریک کے واقعات کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کیا گیا تھا۔ در اصل یہ میری کتاب "شہیدین کی تحریک کا انقلابی پہلو" کا ایک باب ہے۔) (اسعد گیلانی)

دُنیا کے بندھنوں میں جو انسان کو ہر انقلابی کام سے روکتے، ہر اونچے مقصد سے باز رکھتے اور ہر ظاہری نقصان سے گریز کرنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ رشتہ اور ناطہ کے بندھن سب سے زیادہ سخت اور مضبوط ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا اصول پسند اپنے اصول کی خاطر جان کی بازی لگاتا ہوا جب اپنے بچے کی صورت کو بے رونق دیکھتا ہے تو ایک دفعہ دھک سے رہ جاتا ہے اور اپنے ارادوں پر نظرِ ثانی کرنے پر تیار ہو سکتا ہے!

انقلاب کی راہ میں قدم قدم پر خطرے ہیں۔ لہٰذا اس راہ کے مسافر کو سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکلنا چاہیئے۔ دُنیا کی آرائشوں کی تمنا سے پہلے اپنا دل خالی کرے، بعد میں کسی انقلابی کام کے لئے قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔ جو شخص بعض مفاد سامنے رکھ کر کسی انقلابی تحریک کا ساتھ دیتا ہے وہ عین منجدھار میں پہنچکر پسپا ہوتا ہے، عین مقابلے کے وقت پیٹھ پھیرتا ہے اور عین مخالف کی دعوتِ مبارزت پر معذرت کا ہاتھ بڑھاتا ہے، ایسے آدمی کے لئے کسی انقلابی کام کے لئے اُٹھنا ایک احمقانہ حرکت ہے۔

انقلابی تو وہ ہے جو غیروں کو کشتیٔ حق میں بٹھا کر تیرتا ہوا لے جاتا ہے۔ اور اپنے بیٹے کو عین لہروں میں ڈوبتا دیکھ کر مُنہ پھیر لیتا ہے۔ دل بیٹھتا ہے، باپ کی محبت جوش مارتی ہے، ارحم الراحمین سے تڑپ کر التجا و دعا کرتا ہے اور وہ بھی عُذر کے ساتھ اور جب اُدھر سے سخت الفاظ میں تنبیہ ہوتی ہے تو پورے عجز و تضرع کے ساتھ عفو کا طالب ہوتا ہے انقلابی تو وہ ہے جو میدانِ جنگ میں باپ کے سامنے بیٹا اور بھائی کے سامنے بھائی اور چچا کے سامنے بھتیجا تلوار سونت کر آجاتا ہے اور اپنے عمل سے بتا دیتا ہے کہ حق کی تلوار سب رشتے کاٹ سکتی ہے۔ انقلابی تو وہ ہے جو بدر کے اسیروں کو سامنے دیکھ کر مشورہ دیتا ہے کہ ماموں کو بھانجا قتل کرے، بھتیجے کو چچا قتل کرے۔ ہر دشمنِ حق کو اس کے رشتہ کا عزیز قتل کر کے ثابت کرے کہ اب مادی رشتوں کی لاگ راہِ حق کے مسافروں سے دُور ہو چکی ہے!

جب بھی کبھی کوئی انقلابی تحریک اُٹھتی ہے تو رشتہ اور ناتہ کے بندھن ضرور ہی اس کے کارکنوں کے دامنگیر ہوتے ہیں۔ باپ، ماں، بیوی، بچے، بھائی کتنے ہی لوگ ہیں جو مختلف مفادات کے پھندے لے کر اس کو اس حرکت سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک اس کی دُنیا کی تباہی ہوتی ہے اور چونکہ اُن کی دُنیا اس کے ساتھ کسی نہ کسی پہلو سے وابستہ ہوتی ہے اور متاثر ہوتی ہے، اس لئے وہ اسے خود اپنے مفاد کے جوئے سے نکل کر بھاگتے دیکھ کر ہر پہلو سے اس کو روکتے، تھامتے، پھانستے، بہلاتے اور دباتے ہیں۔ یہ صورت اُن کو بھی پیش آئی جو باطل کا علم لے کر

اُٹھے، اُن کو بھی پیش آئی جو حق کے خواہاں ہوئے اور راُن کو بھی پیش آئی جو سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں آگے بڑھے، ایک بار مولانا عبدالحی نے سورۂ المجادلہ کی بعض آیات کی تفسیر کی :-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ -

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں انھیں تم اس حال میں نہ پاؤ گے کہ وہ اللہ اور رسُول کے مخالفوں سے محبت کریں چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا کنبے والے!

تفسیر سُنتے ہوئے اچانک سید صاحبؒ سنبھل کر دو زانو ہو گئے اور فرمایا :-

"میں خدا کا بندہ اُس کے رسُولِ پاک کا فرمانبردار ہوں۔ میں خدا اور اس کے رسُول برحق کی اطاعت میں عزیزوں، رشتہ داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہ کروں گا، کسی کی خوشی و ناخوشی کو خاطر میں نہ لاؤں گا، اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب عزیز ہے۔ دُنیا کی چیزوں میں سے وہ جو چاہے لے لے لیکن اللہ اور اس کے رسُول کے احکام بجا لانے میں اُس کی بھی رعایت نہ کروں گا میرے تمام رشتہ دار صاف صاف سُن لیں کہ جو اللہ اور رسُول کی فرمانبرداری میں میرے شریک حال ہوں، حکموں کو پورا کرنے اور منع کی ہوئی باتوں سے دُور رہنے میں کسی کے طعن و ملامت کا خیال تک دل میں نہ لائیں وہ میرے عزیز ہیں اور مجھے محبوب ہیں۔ اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں اُن کو میری طرف سے جواب ہے اور مجھے اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔ صاف کہتا ہوں جو اللہ کی راہ میں مستعد ہو وہی میرا ساتھی ہوگا۔ جسے یہ منظور نہ ہو وہ مجھ سے الگ ہو جائے"!

ایک دوسرے موقع پر اپنی خوشدامن سے کہہ دیا :-

"آپ پر واضح رہے کہ مجھے خاندان کے چھوٹے یا بڑوں سے جو تعلق ہے صرف خدا کے لئے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی خدا کے احکام کے خلاف قدم اُٹھائے گا تو میرے دل میں اُس کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔" (وقائع ص ۱۵۸)

چنانچہ سید صاحبؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اگر تعلق رکھا تو صرف اپنے معبودِ حقیقی سے۔ باقی لوگوں سے اتنا ہی تعلق رکھا جتنا کہ ان کا تعلق حق کے ساتھ قائم ہوا۔ انہوں نے ہمیشہ حق کی راہ اختیار کی۔ اور اس کی رضا کو پیشِ نظر رکھا اور اس مقصد کے لئے اگر رشتہ اور ناتہ کو قطع کرنا پڑا۔ تعلقات کو کاٹنا پڑا اور اقرباء کی امیدوں کا خون کرنا پڑا۔ تو وہ خون کے اس دریا میں سے بھی بے دریغ گزر گئے۔ اور اس بے نیازی سے گزرے گویا یہ اُن کی منزل کا لازمی تقاضا تھا۔ چنانچہ جب سید صاحبؒ نے میدانِ جہاد کے لئے گھر سے ہجرت کی تو اہل و عیال کو بعد میں کسی وقت اپنے پاس بُلا لینے کا ارادہ تھا۔ لیکن اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ ملاقات اس دُنیا میں آخری ہے۔ اس وقت دونوں بیویوں اور معصوم بچوں کو اللہ کے سپرد کر کے گھر سے نکل گئے۔ اور یہ اُن سے اُن کی آخری ملاقات تھی۔ اس جدائی کے بعد اس دُنیا میں اُن سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ بات صرف کہہ کر گزر جانا آسان ہے۔ لیکن عمل میں لانے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے جسم کے ٹکڑوں اور اپنے

قریب ترین رشتوں کو اس طرح نوچ نوچ کر راہ حق میں پھینکتے چلے جانا اور آگے ہی آگے رُخ رکھنا اُنہی لوگوں کا کام ہے جو اپنے مالک کی رضا کے بدلے اس طرح بک گئے ہوں جس طرح بکنے کا حق ہوتا ہے۔

چنانچہ سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے رفقاء میں شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کا واقعہ ہے کہ اس کے باوجود کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور اُن کی دیکھ بھال والا کوئی نہ تھا۔ لیکن جب راہ حق کی پکار سُنی اور اپنے فرض کا احساس پیدا ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر حمیت دین کے جوش میں سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اور یہ اُنہی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے سینکڑوں ساتھیوں کا حال یہی تھا۔ اس کے باوجود اُنھیں اخلاص وایثار پر غرّہ نہ تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایک وعظ میں جب وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ کی تفسیر بیان کی تو شیخ صاحب حجرے کا دروازہ بند کرکے لیٹ رہے۔ کھانا بھی نہ کھایا۔ جب سید صاحب نے کیفیت پوچھی تو عرض کیا:۔

"میری بد قسمتی ہے کہ آپ جیسے شیخ کامل کی صحبت میں بھی گمراہ ہی رہا۔ اب مولانا کے وعظ سے معلوم ہوا کہ جس دل میں خدا کی محبت دوسروں کی محبت پر غالب نہ ہو۔ وہ ایمان کی لذت سے محروم ہے۔ میرے دل سے بیوی بچوں کا خیال محو نہیں ہوتا۔ ہوسکے تو یہ نکال دیجئے"

مولانا نے پوچھا کیا یہ ممکن ہے کہ بیوی بچوں کی محبت کے جوش میں جہاد کے اس کام کو چھوڑ کر واپس وطن چلے جاؤ۔؟ شیخ نے کہا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا "پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے دل میں اللہ کی محبت بیوی بچوں کی محبت پر غالب ہے" تب شیخ کو اطمینان ہوا اور انہوں نے کھانا کھایا"۔ (سید احمد شہید جلد دوم صلا)

حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنوں کی بے وفائیوں پر بھی پوری طرح صبر سے کام لیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو صبر کرنا سکھایا۔ چنانچہ مجاہدین جو ہندوستان سے چل کر سرحد پہنچتے تھے تو راستے میں ایک افغان رئیس خادے خاں کا علاقہ عبور کرنا پڑتا تھا۔ وہ ظالم انھیں گرفتار کرکے اُن سے اکثر مال واسباب چھین لیتا۔ پریشان کرتا۔ دریا میں غوطے دیتا۔ اور پریشانی کا سبب بنا رہتا۔ لیکن سید صاحبؒ نے ہمیشہ صبر کیا اور اپنے ساتھیوں سے یہ کہتے کہ بھائی صبر کرو اور اپنی شکایتیں اللہ کے حوالے کردو!

خادے خاں جو ابتداء میں سید صاحب کا سب سے پہلا مؤید اور حامی تھا۔ اب اسلام کی پابندیوں اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیش نظر جا و بیجا مخالفت کر رہا تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے اسے بلا کر سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی۔

"خاں بھائی آپ ہی نے ہم کو اس ملک میں ٹھرایا تھا۔ اور آپ ہی ہمارے سب سے پہلے انصار بھی بنے تھے۔ آج علماء کی مجلس مشورت سے منحرف ہوکر اٹھ گئے۔ یہ بات آپ کی دانشمندی سے بعید تھی۔ آپ کو لازم تھا کہ اگر کوئی منحرف ہوکر اٹھتا تو آپ اس کو سمجھاتے۔ آپ کو چاہیئے کہ جس بات پر علماء نے اتفاق کیا ہے اُس کی مخالفت نہ کریں۔ اس میں دین دنیا کی بہتری ہوتی ہے اور اس کے خلاف دُنیا وعقبیٰ کی خرابی ہے۔ ہم آپ کی خیر خواہی کے لئے کہتے ہیں"

اُس نے جو جواب دیا وہ بگڑے ہوئے مسلمان کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ وہ بگاڑ جو مسلمان ارباب اقتدار میں گھس آیا کرتا ہے:۔

"حضرت ہم پٹھان لوگ کاروبار ریاست کا رکھتے ہیں اور (جہاد کا) یہ مشورہ ملاؤں نے ملکر کیا ہے۔ یہ لوگ ہمارے خیرات کے کھانے والے ہیں۔ کاروبار ریاست میں انھیں کیا شعور ہے اُن کا جو مشورہ ہمارے ذہن میں آتا ہے تسلیم کر لیتے ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتا نہیں مانتے اُن کے مشورے کی ہمیں کچھ پروا نہیں۔ خود ہماری قوم اور جمعیت بہت ہے۔ کسی طور پر اُن کا دباؤ نہیں ہے یہ ہمارے تابع ہیں ہم ان کے تابع نہیں۔ (صفحہ ۹۲ جلد دوم سید احمد شہید)

خادے خاں کا جواب مدت سے مسلمان قوم کے اندر پرورش پانے والے ارباب اقتدار کا جواب تھا جو اسلام سے بے نیاز اور اہلِ علم سے بے پروا صرف اپنی مفاد پرستی کے اشارے پر زندگی بھر کام کرتے رہے ہیں۔

لیکن سید صاحب رح جس دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے تھے اس میں مداہنت نہیں ہے حق پرستی ہے، جرأت اور صداقت ہے، اور بڑی سے بڑی باغی قوت سے ٹکرا جانے کا داعیہ ہوتا ہے۔ چنانچہ خان کی اس بوالعجبی پر انہوں نے اُسے صاف صاف متنبہ کر دیا:-

"خان بھائی آپ نے حد شریعت سے قدم باہر نکالا صرف اس خیال سے کہ آپ ملک کے خان ہیں، قوم و جمعیت کے مالک ہیں، کوئی کیا کر سکیگا۔ یہ محض گمراہی ہے اور شیطان کا فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا قادر ہے، اُس نے کروڑوں پیدا کئے۔ اور کروڑوں کو نابود کر ڈالا۔ کیا معلوم کہ کس صبح آپ کی آنکھ کھلے تو انتظام کی باگ ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو"

اس طرح سید صاحب رح نے ایک ایسے شخص کو جو مدت تک دوست رہنے کے بعد اب حق کے خلاف جا رہا تھا۔ اس کی قوت و طاقت کے باوجود کاٹ کر الگ پھینک دیا۔

اس کے جواب میں خادے خاں نے ایک دوسرے موقع پر شاہ اسمٰعیل شہید سے جو باتیں کیں وہ بھی بگڑے ہوئے مسلمان اقتدار پرست کے ذہن کا بہترین نمونہ ہے۔ اُس نے کہا:-

"مولانا خفا نہ ہونا ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں۔ سید بادشاہ کی طرح ملا مولوی نہیں ہیں ہمارا طریقہ جدا ہے اُن کا راستہ جدا۔ سید بادشاہ کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کیونکر چل سکتے ہیں۔ ہمارے حق میں جو کچھ اُن سے ہو سکے درگزر نہ کریں" (جلد ۲، صفحہ ۱۴۲ سید احمد شہید)

چنانچہ جب معاملہ جنگ و جدل تک پہنچا تو حق کی تلوار نے سارے رشتے الگ کر دیئے۔ خادے خاں کے ایک عزیز مقرب خاں کو سید صاحب رح نے لکھا:-

"یکسو ہو جاؤ۔ ہمارا ساتھ دو۔ یا مخالفت کا اعلان کر دو۔ اسلام کی خیر خواہی میں پدر و مادر اور فرزند و برادر کی جانب داری جائز نہیں ہے"

اُس نے جواب دیا۔ "میں حضور کا فرمانبردار ہوں نہ کہ خان ہنڈ کا"

اور جب خادے خاں کے بھائیوں نے مقرب خاں سے کہا کہ اپنی قومی ہمدردی میں ہمارا ساتھ دو تو مقرب خاں کے بھائیوں نے جواب دیا:-

"خادے خاں سید صاحب کا دشمن ہے۔ تم لوگ دین کے دشمن ہو۔ مقرب خاں ہمارا بھائی ہے

اگر وہ تمہارا ساتھ دے گا تو ہم اس سے بھی بیزاری کا اعلان کر دیں گے۔"

جنگ بھولکڑہ میں سید صاحبؒ کا بہت محبوب بھانجا سید احمد علی شہید ہوا۔ قاصد خبر لایا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھتے ہوئے فرمایا۔ الحمد للہ وہ جو مراد لے کر آئے تھے اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مراد کو پہنچایا۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھ ڈالے۔

یہ ہر تحریک کا فطری تقاضا ہوتا ہے کہ جب کوئی اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو جن لوگوں کو اس دعوت سے محبت ہوتی ہے انھیں اس داعی سے بھی قلبی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ انھیں زندگی کا ایک نصب العین دیتا ہے۔ ان کے سامنے شاہراہ حیات کھولتا ہے۔ ان کی زندگیوں کا رخ ایک طرف سے موڑ کر دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔ انھیں نئے دوست نئے ساتھی اور نئے عزائم دیتا ہے۔ نیا ولولہ، نئی تڑپ اور نئے حوصلے دیتا ہے۔ چونکہ اس کی دعوت نے ان کے سارے ہی وجود پر گہرے نقوش ثبت کئے ہوئے ہیں اس لئے وہ خود بخود ان کی دلچسپیوں اور توجہات کا مرکز بن جاتا ہے سارے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اور اس سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ ساری محبتیں دھیمی پڑ جاتی ہیں۔ اور اسکے ساتھ لگاؤ بڑھ جاتا ہے۔ وہ دراصل تسبیح کے اندر اس مضبوط ڈوری کی طرح ہوتا ہے جس سے ایک ایک دانے کا سینہ پیوست ہوتا ہے۔ وہ سب کے قریب ہوتا ہے، سب کو ایک رشتہ میں پروتا ہے۔ سب کے لئے یکساں تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ سب کو ایک معنوی حیثیت دیتا ہے۔ اور سب کو جوڑ کر بکھرے ہوئے دانوں سے ایک تسبیح بناتا ہے!

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریک اٹھائی اس میں بھی تحریک کے کارکنوں کو سید صاحبؒ سے گہری محبت اور لگاؤ تھا۔ چنانچہ فرصت کے اوقات میں مجاہدین سید صاحب کے پلنگ کے ارد گرد بیٹھ جایا کرتے، اکثر بیٹھے رہتے اور بعض وہیں سو رہتے تاکہ ان کے ارشادات سے مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ:-

"ہم سید صاحبؒ کے پلنگ کے اردگرد اکثر لوگ آپ کی باتیں سننے کے لئے جمع رہا کرتے تھے۔ اور اس کثرت سے ہوتے تھے کہ کسی کا سر، کسی کا پیر، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ۔ کسی کو کسی بات کا کچھ تکلّف نہ تھا۔ جس نے جہاں کہیں جگہ پائی وہیں بے تکلف سو رہا۔"

اور یہ اس لئے ہوتا تھا کہ کتنے ہی رشتے گنوا کر اور توڑ کر یہ نیا رشتہ جوڑا تھا۔

اس سلسلہ میں امیر سے محبّت اور فدائیت اور سارے ہی رشتوں سے بڑھ کر مضبوط رشتہ کی مثال مولانا عبدالحی صاحب کی وفات ہے، مولانا بوڑھے تھے، اس پر جہاد کے شدائد۔ بیمار رہ گئے، آخری وقت آ گیا۔ سید صاحب مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ مولانا نے آنکھیں کھولیں اور سید صاحب کو پہچان لیا۔ مزاج پوچھا تو کہنے لگے:-

"نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں اور میرے سینہ پر پاؤں رکھ دیں شاید اس کی برکت سے میری مشکل آسان ہو جائے۔"

سید صاحبؒ نے فرمایا:-

"مولانا آپ کا سینہ علوم کتاب و سنّت کا گنجینہ ہے۔ میں اس پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔"

سید صاحبؒ پاس بیٹھ گئے اور سینہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس سے تسکین ہوئی گویا ساری سکینت اس ہاتھ سے وابستہ تھی۔!

بالاکوٹ کی آخری شہادت گاہ میں شاہ اسمٰعیل شہید کا حال یہ تھا کہ اُن کی پیشانی پر گولی لگی تھی۔ زخم سے خون بہ رہا تھا۔ ڈاڑھی خون سے رنگی ہوئی تھی۔ لیکن آپ ننگے سر بندوق لبلبی چڑھائے پُوچھتے پھر رہے تھے۔

"امیرالمومنین کہاں ہیں؟ امیرالمومنین کہاں ہیں؟"

پھر ایک طرف اشارہ پا کر جہاں گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اُس طرف یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ "بھائی میں تو ہیں جاتا ہوں" اور وہاں جا کر پھر واپس نہ آئے!

برخیز و بہ تیغ تیز بہ نشین — یا از سرِ راہِ دوست برخیز!

رشتہ اور ناتہ کا اس دُنیا میں اس سے بڑھ کر اور کیا مسافرانِ راہِ دوست کا نمونہ ہو سکتا ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں مجاہدین ہزاروں میل کے راستے پیدل چل چل کر مہینوں میں پہنچتے، مصائب برداشت کرتے، لڑتے اور شہید ہو جاتے۔ ان میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ میں ان گھر والوں کو، ان عزیزوں اور دوستوں کو، بیوی اور بچوں کو، ان مکانوں اور جائیدادوں کو، آخری بار الوداع کہہ رہا ہوں۔ پھر مجھے جا کر تلوار کا کھیل کھیلنا ہے۔ اور رضائے الٰہی کے حصول کی جدوجہد کرنا ہے۔ اور تلوار کے کھیل سے واپس آنا یقینی نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ وہ حضرات برسوں اور مہینوں وطن سے دُور، گھروں سے بے نیاز، بچّوں کی خیریت سے بے خبر مسلسل جہاد کرتے رہے، انہوں نے اپنے عمل سے دکھا دیا کہ وہ اس نصب العین کو اپنے سارے جسم، ساری روح اور سارے وسائلِ حیات کے ساتھ اپنا چکے تھے، اور سارے رشتوں کو جہاد کی تلوار سے کاٹ کر صرف ایک مقصد یعنی حصول رضائے الٰہی سے رشتہ جوڑ لیا تھا!

چنانچہ جہاں انہوں نے اپنی کسی عزیز ترین ہستی کو بھی اس راہ سے ڈگمگاتے دیکھا تو اس سے محبت کے تعلقات توڑ لئے جب اس تحریک پر مقدمات کا دَور چلا تو اکثر و بیشتر کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ بعض میدانِ جہاد میں تھے۔ مولانا ولایت علی کے صاحبزادے مولوی محمد حسن جو سولہ سالہ نوجوان تھے انہوں نے تنہا گھر بار کا بوجھ اُٹھایا اور مقدمات کی پیروی کیلئے انگلینڈ تک سے وکلاء منگوائے اور خبر گیری کے لئے انڈمان تک گئے۔ لیکن انہوں نے ساتھ ہی خاندان کی تعلیمی پالیسی ذرا بدل کر حالات کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ حکومت کے انتقامی طرزِ عمل سے بچا جا سکے۔ اُن کی اتنی سی بات پر خاندان کے بیشتر افراد اُن سے ناراض ہو گئے اور حد یہ ہے کہ مولانا عبدالحکیم صادق پوری تو اتنے سخت ثابت ہوئے کہ انہوں نے مولوی محمد حسن کی نمازِ جنازہ تک میں شرکت سے انکار کر دیا!

سید صاحب کی تحریک کے ایک مجاہد محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے بھی اپنی کتاب "کالا پانی" میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"میں اپنی والدہ سے آخری ملاقات کر کے اور بیوی بچّوں کو ساتھ لیکر بہ سواری ایک عمدہ بہلی صبح ہوتے ہی ۲۲ کوس پانی پت پہنچا، میں پانی پت شہر کے اندر نہیں گیا سڑک پر سے اپنے بیوی بچّوں کو رخصت کر دیا۔ اس وقت میں جس کسی سے رخصت ہوتا تھا مجھ کو اس زندگی میں دوبارہ اس سے ملنے کی امید نہ تھی"۔ (کالا پانی۔ صفحہ ۲۲-۲۳)

"میں نے بہلی والے سے کہا کہ تم میرے بیوی بچّوں کو پانی پت میں چھوڑ کر مع بہلی جمنا پار چلے جانا۔

یہ پہلی مع بیلوں کی جوڑی کے ہم نے تم کو اس شرط پر بخش دی کہ تم کسی شخص کو ہمارے بال بچوں کا پتہ نشان نہ بتانا جس وقت ڈاک خانہ پانی پت کے سامنے میں نے ساری عمر کے واسطے اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑا اور اُن سے جدا ہوا اور میرا بکہ ان کے سامنے دہلی کو چلا وہ حادثہ قابلِ تحریر نہیں ہے۔" (کالا پانی صـ۲۳)

پھر جب مقصد کی اس راہ میں وہ جیل میں چلے گئے تو:۔

"میرا گیروا لباس اور کمبل کا کُرتہ اور پاؤں میں بیڑی دیکھ کر میرے اقربار بہت متعجب اور غمگین ہوئے۔ مگر میں نے اُن کی بہت تسلی کی اور ایمان اور صبر کا مضمون اُن کو سمجھایا۔ اس دن کوئی سوا برس کے بعد میں نے اپنے بیٹے محمد صادق کو بھی دیکھا وہ ایسا بڑھ گیا تھا کہ میں نے مشکل ہی سے اس کو پہچانا۔ یہ گویا اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ پھر میں نے دوبارہ اُس کو اس دُنیا میں نہیں دیکھا۔" (کالا پانی صـ۶۲)

ایک موقع پر جب مولانا عبدالحئی صاحب نے حق کے مقابلہ میں رشتہ اور ناتہ کی کم وقعتی پر وعظ فرمایا اور ساتھ ہی علماء و مشائخ کے اعمال اور مختلف خاندانوں کی کمزوریاں گِن گِن کر بیان کیں اور ساتھ ہی سید صاحبؒ کے خاندان میں جو باتیں اس کے خلاف پائی جاتی تھیں اُن کا ذکر کیا تو سید صاحبؒ بیتاب ہو کر اپنی جگہ اُٹھ بیٹھے اور دوزانو ہو کر فرمایا:۔

"میں خدا کا بندہ ہوں، اُس کا اور اس کے رسُول کا تابع ہوں۔ اس سے پہلے سہارنپور وغیرہ میں میں نے مولانا سے کہا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں عزیزوں، رشتہ داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہیں، اس کا حکم بے کم و کاست ادا کروں گا اور کسی کی خوشی اور ناخوشی کا خیال نہ کروں گا۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب (برادر زادہ) عزیز ہیں۔ دُنیا کی چیزوں میں سے جو چاہیں لے لیں۔ لیکن اللہ کی اطاعت میں اُن کی بھی رعایت نہیں کروں گا۔ میرے تمام رشتہ دار صاف صاف سُن لیں کہ اللہ اور رسُول کی اطاعت میں میرے شریک حال ہوں، ادائے اوامر و اجتناب میں کسی کی طعن و ملامت کا خیال نہ کریں۔ وہ میرے عزیز اور مجھے محبوب ہیں۔ اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں اُن کو میری طرف سے جواب ہے اور مجھے اُن سے کوئی واسطہ نہیں صاف کہتا ہوں کہ جو اللہ کے راستہ میں مستعد ہو میرا شریک ہو اور جو چاہے مجھ سے جدا ہو جائے۔ (سیرت سید احمد شہید صـ۱۱۶)

یہ تھا وہ معیار رشتہ و ناتہ جو خدا کے ان دالہ و شیدا بندوں نے قائم کیا تھا۔ رشتہ اُن کے نزدیک رشتہ نہ تھا۔ اگر وہ خدا کے رشتہ میں حائل ہوتا تھا اور محبت ان کے نزدیک محبت نہ تھی جو خدا کے حقوق کے آڑے آتی تھی، انہوں نے سب کو چھوڑا اور ایک کو پکڑا۔ سب کچھ سے مُنہ موڑا اور اس ایک کی طرف رُخ کیا۔ اللہ نے اُن کو اپنے لئے مخصوص کر لیا اور شیطان اُن کا راستہ روک نہ سکا۔ آج ہر شخص یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ اللہ والے تھے اور انہوں نے اللہ کی سپردگی میں کوئی لاگ باقی نہیں رکھی تھی ــــ!

ماہرالقادری

منقبت

درود تجھ پہ ہو گُل کر کے اپنے گھر کے چراغ
حُسینؑ! دی ہے زمانے کو روشنی تُو نے

غمِ حسینؑ تری تازگی کا کیا کہنا!
نفس نفس کو عطا کی ہے زندگی تُو نے

اُسی نماز کی ہیں جستجو میں دیدہ و دل
بنا دیا جسے معراجِ بندگی تُو نے

سلام کوثر و تسنیم کی طرف سے تجھے
لبِ حسینؑ کو چُوما ہے تشنگی! تُو نے

ترا کرم حق و باطل کے درمیان لکیر
خود اپنے خون کی سُرخی سے کھینچ دی تُو نے

(شبنم سبحانی)

ترا خیال تری یاد لے کے اُٹھے ہیں
دلوں میں جذبۂ فرہاد لے کے اُٹھے ہیں
وہ فتنہ جس سے ہوا بارہا چمن برباد
وہ فتنہ پھر ستم ایجاد لے کے اُٹھے ہیں
جہاں اُڑے نہ طائرِ فضا کی وسعت میں
وہیں پہ دام بھی صیاد لے کے اُٹھے ہیں
کوئی تو شیشہ گری کا شعور لے کے اُٹھے
ہزاروں بازوئے فولاد لے کے اُٹھے ہیں
جو بارِ اُٹھ نہ سکا سارے کائنات سے آج
ہمیں وہ شاد کہ ناشاد لے کے اُٹھے ہیں

(جبریل صدیقی)

عرضِ شوق کر چل کر وقت ہے یہ پروانے
اب تو شمع روشن ہے صبح تک خدا جانے
یُوں تو ہر قدم پر ہیں سرحدیں منازل کی
حوصلہ مسافر کا دیکھتے ہیں ویرانے
ہے ترے تصوّر میں کتنی کیف سامانی
ہر نفس ہیں ساغر ہیں ہر قدم پہ میخانے
ذرّے جگمگاتے ہیں مہر و ماہ کی صورت
کوچۂ محبت کی خاک تو کوئی چھانے

☆

تسکین قریشی

دو آتشہ

بے خودی میں نہ محبت میں کمی ہے ساقی
دورِ صہبا نہ سہی دل تو وہی ہے ساقی

زندگی میکدۂ آتش نہ لبی ہے ساقی
پیاس دل کی نہ بجھے گی نہ بجھی ہے ساقی

بے خودی میں بھی یہ احساسِ خودی ہے ساقی
تو نے خود اٹھ کے پلائی ہے تو پی ہے ساقی

بادہ و ساغر و میخانہ سب اس دل کے نثار
جس کو نسبت تری آنکھوں سے رہی ہے ساقی

اب وہ لغزشِ مستی ہے نہ وہ جرأتِ شوق
تجھ سے کیا کیا گلہ کم نگہی ہے ساقی

اہلِ دل رسم و رہِ اہلِ جہاں کیا جانیں
عاشقی سادگی و سادہ دلی ہے ساقی

لغزشوں میں بھی قدم اٹھتے ہیں تیری طرف
کتنی معصوم مری بادہ کشی ہے ساقی

دیر سے آج جو وہ گرمیٔ ہنگامہ نہیں
کیا تری بزم میں تسکیں کی کمی ہے ساقی

کچھ ایسا دل کا عالم ہو گیا ہے
کہ اب ہر غم، ترا غم ہو گیا ہے

تصوّر جب مجسّم ہو گیا ہے
بس اک عالم ہی عالم ہو گیا ہے

تغافل کے تو پہلو اور بھی تھے
ستم ہی کس لئے کم ہو گیا ہے

نہ دن دیکھے نہ صبح و شام دیکھے
تجھے کیا چشمِ پُرنم ہو گیا ہے

جہاں راہِ طلب میں گم ہوا ہوں
وہیں کچھ فاصلہ کم ہو گیا ہے

مسرت کی دعا کیا کہہ کے مانگوں
جب اس کا نام ہی غم ہو گیا ہے

مبارک عشق کی خودداریوں کو
غرورِ حسن کچھ کم ہو گیا ہے

تری محفل سے کیا آئے ہیں اٹھ کر
یہ عالم اور عالم ہو گیا ہے

جب اہلِ عشق مل بیٹھے ہیں تسکیں
دگرگوں رنگِ عالم ہو گیا ہے

غزلیں

ابر احسنی گنوری

عنایت اُن کی پرسش نے یہ فرمائی تو کیا ہوگا
دلِ مجروح کی ہر چوٹ اُبھر آئی تو کیا ہوگا

نظر کی ضد پہ تابِ حُسن اُتر آئی تو کیا ہوگا
تجلّی خود ہی نظّارے سے ٹکرائی تو کیا ہوگا

یقیں تو وعدۂ وعدہ شکن کا آ نہیں سکتا
مگر بات احترامِ حُسن تک آئی تو کیا ہوگا

بہاروں کی دعا کے ساتھ یہ بھی تھی خلش دل میں
بہار آئی مگر ہم کو نہ راس آئی تو کیا ہوگا

تری سازش ہے جس سے باغباں میری تباہی کی
وہ بجلی تیرے خرمن پر بھی لہرائی تو کیا ہوگا

صدائے لن ترانی کی کشش کی بھی ہے خبر تم کو
اسی آواز پر دُنیا سمٹ آئی تو کیا ہوگا

عالم اکبر آبادی

محسوس ہو رہا ہے طبیعت پہ بار سا
ابکی بہار میں ہے جنوں سازگار سا

اُس کیف کو شراب ابھی تک نہ پا سکی
آنکھوں میں تیری بن کے رہا جو خمار سا

اے اہلِ جستجو کوئی نازک مقام ہے
منزل کے آس پاس ہے گرد و غبار سا

جانے یہ کیا مقامِ تمنا ہے عشق کا
گزرا ہے انتظار ترا ناگوار سا

عاشق ذبیحی

چمن کی یاد سے کیوں دل کو داغدار کریں
خزاں کے دور میں کیا شکوۂ بہار کریں؟

ابھی تو جوشِ جنوں کم نہیں بہاروں سے
ذرا یہ کم ہو تو اندازۂ بہار کریں

تمہیں تو فکرِ نشیمن ہے ہم کو فکرِ چمن
تمہارا غم کریں یا ہم غمِ بہار کریں

مذاقِ دید میں اتنا تو حُسن پیدا کر
کہ جلوے طور پہ خود تیرا انتظار کریں

بدلا ہوا ہے کتنا اندازِ مطربانہ
سازوں میں لے حرم کی نغمے ہیں ملحدانہ

دُہرائے گا زمانہ برسوں مرا فسانہ
شعلوں پہ لکھ رہا ہوں تاریخِ آشیانہ

سُنتی نہیں ہے دُنیا کیوں میرے دل کی دھڑکن
اُن کی نوازشوں کا میں بھی ہوں اک فسانہ

رمز گنوری

گناہِ عشق کی اس رہبری کے میں صدقے
کہ مجھ کو یہ سوئے راہِ نجات لے آیا

سرشکِ خوں کی قسم بزمِ ناز سے اُن کو
میں آب و رنگِ رخِ کائنات لے آیا

حرم نشیں ہے نہ اب کوئی سومنات نشیں
اُٹھا کے سب کو ترا التفات لے آیا

شعورِ عشق جنہیں ہے وہ کیا کہیں گے مجھے
زبانِ شوق پہ میں دل کی بات لے آیا

روحِ انتخاب

دُنیا اور آخرت کی بھلائی ان پانچ باتوں میں ہے۔ دل غنی ہو۔ ایذا رسانی سے پرہیز رہے۔ حلال کی روزی حاصل ہو۔ پرہیزگاری ہو اور ہر حالت میں صرف خدا پر بھروسہ ہو۔ بہت زیادہ سفارشیں کرنا وقار کھو دیتا ہے۔ جو شخص بغیر سمجھے بُوجھے علم حاصل کر بیٹھتا ہے، اُس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص رات کو لکڑیوں کا گٹھا باندھے اور اس میں کوئی سانپ اس کو کاٹ لے۔ علماء کی زینت پرہیزگاری ہے اور زیورِ حُسنِ اخلاق ہے! علم پڑھ کر جو بُرائی سے نہ بچا اس کو علم نے کیا فائدہ پہنچایا۔؟ جو تمہارے سامنے اوروں کی بُرائیاں کرتا ہے وہ تمہاری بُرائی بھی دوسروں کے آگے کرتا ہے۔ تین کام بہت دشوار ہیں۔ تنگی میں سخاوت۔ خلوت میں تقویٰ اور جہاں سے امید لگی ہو یا کچھ خوف ہو وہاں سچ سچ بات کہنا۔ اپنے عزیز کو تنہائی میں نصیحت کرنا اور سمجھانا بھی شرافت اور اس کی اصلاح کا راز ہے۔ اور سب کے سامنے نصیحت کرنا باعثِ رسوائی و بدنامی ہے تواضع اہلِ کرم کی نشانی ہے اور تکبّر لئیم اشخاص کی۔ **امانت رکھنے کے شوقین یا تو چور ہوتے ہیں یا احمق۔**

جب تمہارے سامنے کام کی کثرت ہو تو پہلے سب سے اہم کام شروع کرو۔ علم کی فضیلت یہ کیا کم ہے کہ بے علم اسکے مدعی ہیں۔ اور جہل کی بُرائی یہ کیا کم ہے کہ جاہل اپنے جہل کا مُنکر ہے۔ اگر جاہل کہدو تو وہ برافروختہ ہو جاتا ہے۔ دل زبان کی کھیتی ہے اس سے اچھی باتوں کی تخم ریزی کرو اگر سب دانے نہ اُگیں گے تو کچھ تو ضرور اُگیں گے۔ زبان سے جو (ناشائستہ) بات نکلتی ہے وہ پتھر سے زیادہ سخت، سوئی سے زیادہ چُبھنے والی۔ ایلوے سے زیادہ کڑوی۔ چکّی کے پاٹ سے زیادہ پھرنے والی۔ اور نوکِ سناں سے زیادہ تیز ہوتی ہے! (نثر)

خدا کے احکام کے نافذ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سمجھدار تکلیف میں مُبتلا ہے اور احمق عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں وہ شخص سب سے زیادہ قابلِ ہمدردی ہے جو باوجود تنگ حالی کے ہمّت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اے دُنیا، اور دُنیا کی زینت پر دھوکا کھانے والے یاد رکھ کہ زمانہ، مکان اور مکان بنانے والے دونوں کو برباد کر دے گا۔ جس کو دُنیا کی عزت و وجاہت پسند ہو اُس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ عزت جلد مٹ جانے والی ہے۔ یاد رکھو کہ دُنیا کے خزانے تو سونے سے بھرے جاتے ہیں مگر تم اپنا خزانہ ایمان اور نیکی سے بھرو!

میں نے طمع کو چھوڑ کر خود کو آرام پہنچایا۔ نفس میں جس قدر لالچ بڑھتا جاتا ہے وہ خود ذلیل ہوتا جاتا ہے۔ قناعت کی زندگی ہی میں میری عزت کی حفاظت ہے۔ تمہاری عمر کی قسم گھر کا گر جانا کوئی بڑی مصیبت نہیں ہے، نہ اونٹ اور بکری کا مرجانا۔ بلکہ سب سے بڑی مصیبت ایک شریف کی موت ہے۔ جس سے ایک جہان مردہ ہو جاتا ہے!

اے اہلِ بیتِ رسُول اللہ! تمہاری محبّت قرآن کی وجہ سے فرض ہے۔ تمہاری جلالتِ شان کے لئے یہی کافی ہے کہ جس نے تم پر درود نہ پڑھا اس کی نماز قبول نہیں ہوتی! (نظم)

(حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

لکھنؤ سے ایک ماہواری رسالہ نکلتا ہے۔ جس کا نام ہے "سُنّی"۔ اور ایڈیٹر صاحب کا اسم گرامی ہے:-

"ابوالنصر حافظ محمد عمر قادری الوارثی برکاتی نوری ہدایت رسولی"

اور یہ تو ایڈیٹر صاحب کی کسرِ نفسی ہے جو انہوں نے کنیت، نام اور نسبتوں کے سلسلہ میں اس قدر اختصار سے کام لیا ہے ورنہ یہ "ہدایت رسولی" صاحب اگر اپنی تمام نسبتوں کو زیب قرطاس فرما دیتے تو یہ سلسلہ محبوب کی زلفِ شبگوں کی طرح دراز ہو جاتا اور پڑھنے والے یہ فیصلہ ہی کرتے رہ جاتے کہ:-

زلفیں دراز ہیں کہ شبِ غم دراز ہے!

چونکہ اس رسالہ کا نام "سُنّی" ہے تو اُسے دُوسرے رسالوں کے مقابلہ میں مقدّس اور صاحبِ کرامت ہونا ہی چاہیئے — اس لئے چندہ کی جگہ "نذرانہ سالانہ" اور قیمت کی جگہ "ہدیہ فی پرچہ" لکھا ہے!

رسالہ کی اشاعت کا مقصد "دیوبندیت" کی تردید ہے۔ پُورے رسالہ کا ایک ہی آہنگ ہے۔ کہیں دیوبندیوں کے خلاف مناظرہ بازی کا اعلان ہے، کسی صفحہ پر "دیوبند" کے نام کی ترکیب پر عجیب و غریب پھبتیاں ہیں۔ دیوبند کیا ہے؟:-

"صدقہ وخیرات بند" "گیارھویں و میلاد بند" "کان بند" - "زبان بند"۔

اگر کوئی یہ کہہ دے کہ "دیوبند" میں شرک و بدعت کے دیو، بند کئے جاتے ہیں تو "ہدایت رسولی" صاحب غصّہ کے مارے "پر کھولالی" ہو جائیں گے!

پاکستان میں ایک صاحب ہیں "حاجی لق لق" اُنہی کے توڑ پر ہندوستان میں "حاجی حق حق کو ٹلوی" پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کی ایک نظم رسالہ "سُنّی" میں چھاپی گئی ہے جس کا ایک ایک مصرعہ "ہدایت رسولی" صاحب کے ادبی ذوق پر فاتحہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے۔ "دیوبندی" فرماتے ہیں:-

سُنّی بن کر سُنّیوں کو لُوٹنا ہے اس کا کام　　　نجدیوں کے دام سے بھی ہے مُضرتر اس کا دام

اس "مُضرتر" کا بھی کوئی جواب ہے؟ اس شعر سے رسالہ "سنی" کے ادبی مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہو گا اور ہونا چاہیئے!

دین اور شریعت کے نام سے جب اس طرح کا ادب منظرِ عام پر آرہا ہو اور اُسے پڑھ کر آج کل کا نوجوان طبقہ دین سے بیزار ہو جائے تو "ہدایت رسولی" قسم کے دین داروں اور "عاشقانِ رسُول" (؟) سے نوجوانوں کی اس گمراہی اور اسلام بیزاری کی کیا باز پرس نہ ہو گی:-

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

جمہوریت کی تاریخ میں شاید اس قسم کی یہ پہلی ٹولی ہے۔ جو "ری پبلکن پارٹی" کے نام سے وجود میں آئی ہے۔ جس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پارٹی کی بنیاد ہی سرکاری عہدوں اور منصبوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بھان متی نے کنبہ جوڑ کر اس حقیقت کو اچھی طرح اُبھار دیا کہ مسلم لیگ میں کس قدر بودے کردار کے لوگ شامل ہو گئے تھے۔ جن کے پیش نظر جلب منفعت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا۔ مگر جن ہوا پرست ملاحوں نے مسلم لیگ کے بیڑے کو ڈبویا ہے وہ ری پبلکن پارٹی کے "بجرے" کو کب صحیح سلامت رہنے دیں گے۔ بس ذرا ہوا کا رُخ بدلنے دیجئے پھر دیکھئے کہ "ری پبلکن پارٹی" کے یہ عقیدت مند ڈاکٹر خاں صاحب کو "ہم منجدھار میں چھوڑ کر کس" طوطا چشمی" کا ثبوت دیتے ہیں!

وفاداری مدار از بلبلاں چشم — کہ ہر دم بر گلِ دیگر سرایند!

حسن محمود، قاضی فضل اللہ۔ امیر اعظم۔ کیانی۔ مسلم لیگ کے کیسے کیسے چہیتوں اور لاڈلوں نے مسلم لیگ سے بے وفائی کی ہے۔ پاکستان میں شاید ہر "کرسی" اپنے اندر گرگٹوں کی ایک ٹولی کو چھپا ہوا رکھتی ہے کہ رنگ بدلتے رہنا ہر "کرسی" کے لئے ایک طرح کا دستور بن گیا ہے!

جی بھر کر کھیلیں اے "خداوندانِ نعمت" عوام کے زخموں سے۔ پاکستان کی مظلومیت اور بے کسی سے!..... مگر.....

حذر اے چیرہ دستو! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

کیا طنطنہ تھا اسٹالن کے سطوت وجبروت کا، روس کے "سُرخے" اُس کی سیج پُج پُوجا کرتے تھے! بڑی بڑی حکومتوں کے سفیر اور نمائندے یہ حسرت ہی جی کی جی میں لے کر رہ گئے کہ کسی طرح "حضور اسٹالن" کے درشن ہو جائیں۔ مگر اسٹالن کا کبر و ناز اس سطح تک بھلا کہیں اُترنے والا تھا۔ مگر اب اُسی روس میں اسٹالن کے مجسمے توڑے جا رہے ہیں اور اسٹالن کی شہرت اور عزت و ناموری پر کیچڑ اُچھالی جا رہی ہے۔ اور یہ کیچڑ وہی ہاتھ اُچھال رہے ہیں جو کل تک اسٹالن جی مہاراج کو "پرنام" کرتے تھے!

ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن ان تین جھوٹے خداؤں کی خدائی کا حشر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا! مگر حیرت ہے اُن پر کہ جو یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور ان واقعات سے عبرت نہیں پکڑتے اور جو اس غلط فہمی میں اپنے کو مبتلا کئے ہوئے ہیں کہ اُن کے جاہ و جلال پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آسکتی۔ اے شتر مرغو! اس نفس فریبی کا انجام تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائیگا۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ جب حالات کو بدلتا ہے تو پھر اس کی زد سے نہ قلعے بچ سکتے ہیں اور نہ قصر و ایوان! زمانہ بڑے بڑوں سے کان پکڑوا کر اُٹھک بیٹھک کرا کے چھوڑتا ہے اور کسی کسی کو تو ناک رگڑنی پڑتی ہے!

ایک خمیدہ کمر بوڑھے کو دیکھ کر ایک نوجوان ہنستے ہوئے بولا "بڑے میاں! یہ کمان کتنے میں مول لی ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "میاں! کچھ دن اور انتظار کرو، یہ کمان تمہیں قیمت دیئے بغیر مفت ہی مل جائے گی!"

"آپ کے ملک کی آمدنی کیا ہے، اخراجات کتنے ہیں؟ یعنی میں بجٹ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں" کراچی کے ہوائی اڈے پر ایک شخص نے حکومتِ نجد و حجاز کی ایک ذمہ دار شخصیت سے پوچھا۔ "واللہ اعلم بالصواب" جواب دیا گیا۔

سیرت نمبر کے بعد "فاران"

کا

توحید نمبر

★ توحید کے تقاضے کیا ہیں؟ ★ توحید کیا مطالبہ کرتی ہے؟

● کتاب وسنت نے "توحیدِ خالص" کو کس انداز میں پیش کیا؟

★ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی "توحید" کی تبلیغ وتعلیم تھی!

اور

شرک ایمان کیلئے زہر قاتل ہے۔ یہ "ظلم عظیم" ہے جس سے بڑا نہ کوئی گناہ ہے نہ کوئی برائی ہے نہ کوئی ظلم وجہالت ہے۔ کتاب وسنت پر ایمان رکھنے والا شرک کی پرچھائیں سے بھی منزلوں دور رہیگا۔ شرک وبدعت کی رسموں نے ملت کو کیا نقصان پہنچایا۔ دین خالص پر عجمی تصورات نے بدعات کے روپ میں کس طرح شب خون مارا۔

فاران کے "توحید نمبر" میں ان موضوعات پر گرانقدر مضامین ہوں گے

فاران کا توحید نمبر شرک و بدعت کے بتانِ عجم پر فیصلہ کن ضرب لگائے گا!

ہماری نظر میں

انتخاب صحاح ستہ

ضخامت ۲۵۶ صفحات (بڑا سائز)، مجلد۔ رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت پانچ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب و مالکان کتب سعیدی۔ قرآن محل۔ مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ صحیح کتابوں (صحاح ستہ) سے آٹھ سو احادیث منتخب کرکے اردو ترجمہ کے ساتھ "انتخاب صحاح ستہ" کے نام سے شائع کی گئی ہیں۔ ترجمہ عام فہم ہے۔ اس سے اردو جاننے والے فائدہ اٹھاکر دین و دنیا کی بھلائی حاصل کرسکتے ہیں۔ مولانا امجد العلی صاحب استاذ الحدیث مدرسہ عربیہ مطلع العلوم رامپور نے اس ترجمہ کے نوک پلک درست کئے ہیں۔

مقدمہ میں صفحہ ۲۸ پر "حدیث کا علم اور اس کی حفاظت" کے عنوان کے تحت جو چند سطریں لکھی گئی ہیں۔ وہ حدیث کی پوزیشن کو کمزور کرنے والی ہیں۔ صفحہ ۳۲ پر علامہ ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کا سن ولادت ۳۰۲ھ ہجری لکھا ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ ۲۰۲ھ ہجری سن ولادت ہونا چاہیئے کہ ۲۷۵ھ میں تو ان کا انتقال ہوا ہے!

کتاب اللہ کے بعد سنت رسول ہی دین کا سب سے بڑا ماخذ اور منبع ہے۔ اس دور میں جبکہ بعض جاہلوں نے "انکار حدیث" کا فتنہ کھڑا کر دیا ہے، احادیث کے زیادہ سے زیادہ چرچے اور تذکرے کی ضرورت ہے!

علم الحدیث

از:۔ علامہ عبد اللہ العمادی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (سرورق رنگین)
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد دکن۔

علامہ عبد العمادی مرحوم جون پور کے ایک علمی خانوادہ میں ۱۲۹۶ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی۔ مولانا ہدایت اللہ جون پوری اور قاضی زین العابدین لکھنوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے اکابر علماء اور قابل فخر اساتذہ سے حاصل کئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ مرحوم نے عرب جاکر صنعاء۔ زبید اور حدیدہ کے علماء سے علمی استفادہ کیا اور پھر مصر پہنچ کر مفتی شیخ محمد عبدہ کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، تاریخ، فلسفہ، منطق، اقلیدس اور طب و ہیئت میں علامہ عمادی کو دستگاہ کامل حاصل تھی۔ صحافت کی طرف قدم بڑھایا تو البیان۔ الوکیل، زمیندار اور الہلال کو اپنی قابلیت اور قلم کی قوت سے چمکایا۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم مولانا عمادی کے خاص قدر شناسوں میں تھے!

تاریخ عرب قدیم، صناعۃ العرب، فلسفۃ القرآن اور کتاب الزکوٰۃ مولانا عمادی مرحوم کی تصنیفات شائع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ابن خلدون کا آپ نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور پھر علامہ مرحوم حیدر آباد دکن کے دار الترجمہ کے رکن بن گئے۔ اور طبقات ابن سعد، ابن حزم اندلسی کی الملل والنحل، التنبیہ والاشراف،

اور تاریخ یعقوبی کو اردو میں منتقل فرمایا۔

علامہ عمادی فارسی کے شاعر بھی تھے اور اردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں شعر آپ کو یاد تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا، نام و نمود کی کبھی تمنا ہی نہیں کی۔ اس لئے اپنے علم و فضل کے مقابلہ میں گمنام ہی سے رہے۔ زیر نظر کتاب علم الحدیث اسی گمنام فاضل اجل کی تالیف ہے۔ جس کے مرکزی عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

علم حدیث کی تنقیح ـــ اصولِ حدیث ـــ درایت ـــ حدیث کے اجتماعی و عمرانی فوائد ـــ شبہات ـــ روایت ـــ اسناد ـــ جرح و قدح ـــ صحیح حدیثیں پہچاننے کے اصول ـــ!

کتاب اپنے موضوع پر مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔ فاضل مؤلف نے بڑی تحقیق اور تدقیق و مطالعہ کے بعد قلم اٹھایا ہے اور تدوین حدیث کی صرف تاریخ ہی بیان نہیں کی بلکہ احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کے اصول بھی قلمبند کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک اقتباس:۔

"...... علم حدیث کا ایک عظیم الشان سرمایہ موجود ہے، موضوعات کی کتابوں میں جعلی حدیثیں الگ کر دی گئی ہیں۔ صحیح حدیثوں کا ایک جداگانہ ذخیرہ ہے۔ اور بایں ہمہ محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ممکن ہے "صحاح" کی کتابوں میں بھی ضعیف حدیثیں ہوں لیکن اس کے لئے انہوں نے اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ جس حدیث کی تنقیح کرنا ہو۔ اسی معیار پر جانچ لو۔ ع

کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں"!

اس سے ملتی جلتی کوئی بات مولانا مودودی کی زبان و قلم سے نکل جائے تو بعض لوگ ان پر "منکر حدیث" کی پھبتی چست کر دیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان کی اس شدتِ احتساب کی زد علم حدیث کے کتنے بڑے مویدین اور اعاظم رجال پر جاکر پڑتی ہے!

نعمت عظمیٰ

کشکولِ قلندری:۔ ملفوظات و ارشادات شاہ سید اسد الرحمٰن قدسی۔ مرتبہ سید زمرد حسین شاہ جیلانی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ گوشۂ ادب، چوک انارکلی لاہور۔

قلندریہ خاندان کے کوئی بزرگ جناب سید اسد الرحمٰن قدسی ہیں۔ جن کے ملفوظات و ارشادات بہد زمرد حسین صاحب شاہ جیلانی نے مرتب کر کے شائع فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا رنگ یہ ہے:۔

"حدودِ شریعت سے متجاوز اور قیودِ طریقت سے ماوری بھی ایک شاہراہ ہے جس کو حق الیقین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کے اسرار و رموز وہبی طور سے حاصل ہوتے ہیں۔" (صفحہ ۱۸)

حالانکہ حدودِ شریعت سے ماوری کوئی شاہراہ ہو ہی نہیں سکتی اور ہوگی تو وہ صراطِ مستقیم نہ ہوگی!

حضرت موسیٰ اور جناب خضرؑ کے قصہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"مذکورہ قصہ سے یقیناً یہ سبق ملتا ہے کہ کتاب و سنت کی راہ سے جداگانہ بھی کوئی راہ ہے۔ جس کے طے کرنے کیلئے صبر و استقلال اور خدمت و اطاعتِ مرشد ضروری ہے۔" (صـ ۲۳)

"عالمِ تکوین" کے واقعات مشاہدہ کرائے کو "کتاب وسنت" کی راہ سے جداگانہ راہ کہنا عجیب فکر ہے!

"وہ علمِ لدنی جس کا شہر ذاتِ نبی کریمؐ اور دروازہ سینۂ حیدرؓ تھا صرف ساداتِ کرام ہی کے لئے مخصوص ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ علمِ اسرار اولادِ اطہار حیدرِ کرارؓ تک ہی محدود ہے۔" (صہ ۴۰)

یہ اسلام میں "پاپائیت" کا عقیدہ داخل کرنے کی تدبیریں ہیں۔ خود صاحبِ ملفوظات بھی تو "سید" واقع ہوئے ہیں۔

"حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چار سو اصحابِ صفہ نے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔" (صہ ۴۲)

کتاب وسنت میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہو کہ اصحابِ صفہ کو حضورؐ نے "طریقت" کی تعلیم دی تھی۔ اگر "تزکیۂ نفس" کو صاحبِ ملفوظات "طریقت" کہتے ہیں تو تزکیہ نفس کی تعلیم عام تھی۔ اصحابِ صفہ کے لئے مخصوص نہ تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور میں "دین" کو شریعت، طریقت اور حقیقت کی شاخوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا!

"کتاب وسنت کی وہ راہ جو فقہاء و محدثین کی خود ساختہ اور مجتہدین کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے۔ قلندرانِ حق پرست اس پر نہیں چلتے بلکہ وہ نظریات ومسلمات کے پس پردہ حقائق معانی پر نظر رکھتے اور اس کی پیروی کرتے ہیں جو من جانب حق تعالیٰ اُن کے قلوب پر القا ہوتے ہیں۔ وہ ان اونٹ بھری درسی کتابوں کو جو اہلِ جہل نے باوجود قرآن حکیم جیسی جامع ومکمل ومفصل کتاب کی موجودگی کے محض اپنے زعمِ باطل کی بناء پر تالیف کی ہیں، قابلِ مطالعہ نہیں سمجھتے۔" (صہ ۵۶)

تفسیر اور حدیث وفقہ کی تمام کتابوں کو اہلِ جہل کی تالیف کردہ کتابیں کہنا اور اپنے قلوب پر القاء کئے ہوئے حقائق معانی پر اعتماد کرنا۔ کتنی گمراہیوں اور جہالتوں کا دروازہ کھول دینے کی ترغیب ہے۔ اس قسم کے "تصوف" سے "جذب وسوز" سے اور "علمِ لدنی" سے ہزار بار خدا کی پناہ!

"جو باہمت اہلِ ذوق مسلک قلندری اختیار کرتے ہیں اُن میں سے بعض تو اپنے نفس کو زیر کرنے کے لئے طریقہ ملامتیہ پسند کرتے ہیں اور بعض آہنی طوق وزنجیر کے بھاری بوجھ سے خود کو جکڑتے ہیں تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب کے لئے طریقہ قلندریہ کے معمولاتِ خصوصی میں صومِ الوصال ہے جسے روزہ طے بھی کہتے ہیں۔ یہ روزہ تین تین۔ پانچ پانچ دن اور سات سات دن کا ہوتا ہے، ان روزوں کے ایام میں آگ پر پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے۔" (صہ ۵۷)

عیسائی اور یہودی، فریسیوں اور راہبوں نے اسی قسم کے تکلفات کی بیڑیاں لوگوں کو پہنادی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان "اصر واغلال" کو اُتار دیا تھا بلکہ کاٹ دیا تھا۔ مگر دین میں یہ ٹریجڈی بھی ہو کر رہی کہ تزکیۂ نفس کے نام پر اسی انداز کی طوق اور بیڑیاں (معنوی اور مادی) پھر بنادی گئیں!

"بعض اہلِ خدمات، کوئی قطب ہوتا ہے، کوئی غوث، انتظامیہ امور قطب سے متعلق ہوتے ہیں اور عدلیہ کا تعلق غوث سے ہوتا ہے۔ عسکری تنظیم اور دفاعی امور ان حضرات (قلندروں) سے متعلق ہوتے ہیں۔" (صہ ۵۸)

یہ کیا عقیدہ ہے؟ یہ کیسا اندازِ فکر ہے؟ نہ جانے یہ سراسر غیر اسلامی خیالات "تصوف" کے نام سے مسلمانوں میں

کس طرح بار باگئے۔ یہ جو جگہ جگہ شہروں میں "شاہ ولایت" کے مزارات ہیں۔ اور اُن کے بارے میں بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس بستی اور شہر کا انتظام فلاں صاحبِ مزار (شاہ ولایت) کے سپرد ہے۔ تو یہ عقیدہ شرک سے قریب تر ہے۔ اور ایک مسلمان شرک کی پرچھائیں سے بھی کوسوں دُور بھاگتا ہے!

کتاب و سنت اور اسوۂ صحابہؓ سے بے نیاز ہو کر، خود اپنے ذہن و قلب کے واردات کو "الہام و القاء" سمجھنے سے جو گمراہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں وہ دین و اخلاق کے لئے ایک مستقل فتنہ ہیں۔ اور ان فتنوں پر جس "فن" کی تشکیل ہوئی ہے اس کی جسے ہوا بھی لگ جائے گی تو وہ بے راہ روی سے بچ نہیں سکتا!

حقیقت | مولانا حسین احمد مدنی اور بعض دیگر علماء دیوبند کے جماعتِ اسلامی سے اختلافاتِ عقیدہ و مسلک کی حقیقت
از:- مولانا عامر عثمانی (فاضل دیوبند) ضخامت ۱۴۲ صفحات قیمت صرف دس آنے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر ملت چوک بازار ملتان شہر۔

جماعتِ اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلہ میں مخالفین کا کئی سال سے بازار گرم ہے افترا پردازیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طوفانِ بدتمیزی ہے جو قریب قریب ہر طرف سے اُٹھ رہا ہے!

اُن ایکٹر قسم کے مولویوں سے ہمیں زیادہ شکوہ نہیں ہے جو ہمیشہ یہی کھیل کھیلتے رہے ہیں اور شریفوں کی ٹوپیاں اچھالنا ہی جن کا شیوہ رہا ہے۔ ان "مرغانِ بادنما" کو عوام اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ انتہائی اذیت اور قلبی کوفت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ وہ علماء، جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بھی قابلِ احترام ہیں اور جن کے زہد و تقویٰ کی بھی اچھی شہرت ہے! جماعتِ اسلامی کے خلاف مورچے لگائے ہوئے ہیں۔ اور جن کے نزدیک جماعتِ اسلامی کو مطعون کرنے بلکہ مٹانے کی کوشش کرنا دین و ایمان کا سب سے بڑا تقاضا ہے!

پاکستان میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور ہندوستان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، جماعتِ اسلامی اور مودودی صاحب کو گمراہ اور دشمنِ اسلام ٹھہرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بزرگوں کا ہمارے دل میں احترام ہے مگر یہ احترام مجروح ہونے سے کب تک بچا رہے گا جبکہ یہ حضرات اور اُن کے عقیدت مند جماعتِ اسلامی پر تہمتیں جوڑتے میں ذرہ برابر باک محسوس نہیں کرتے اور یہ بزرگ عناد و مخالفت کی اُس نیچی سطح تک اُتر آئے ہیں کہ جو سطح بر سبیلِ تنزل بھی اُن کے منصب کے شایانِ شان نہیں ہے!

"رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو"

یہ جماعتِ اسلامی کے دستورِ اساسی کی ایک دفعہ (clause) ہے۔ جو کسی اعتبار سے بھی محلِ اعتراض نہیں ہے۔ اور اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو نزاع و جدال کا موضوع بن سکے۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ کی ذہانت کو داد دیجئے کہ انہوں نے جماعتِ اسلامی کے دستور کی اس دفعہ سے ایسے ایسے نکتے پیدا کئے ہیں اور وہ معنی نکالے ہیں کہ عقل حیران ہے اور ضمیر ششدر رہ ہے!

مولانا عامر عثمانی دیوبند کے فاضل ہیں۔ بلند پایہ مجلہ "تجلی" کے مدیرِ اعلیٰ ہیں اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ کے برادر زادے ہیں۔ صاحبِ موصوف نے مولانا حسین احمد مدنی کے اُن اعتراضات کا جائزہ لیا ہے جن کی رُو سے جماعت

اسلامی کے دستور کی مندرجہ بالا دفعہ کو گمراہی ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ بلند پایہ مقالہ ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) میں چند مہینے پہلے چھپا تھا۔ اب اسے مکتبۂ تعمیرِ ملت ملتان نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

زورِ استدلال، حسنِ نگارش، خلوصِ تحریر اور اندازِ بیان، غرض وہ تمام خوبیاں اس مقالہ میں موجود ہیں، جو کسی تحریر کو وزنی، یادگار اور اثر انگیز بناتی ہیں۔ مولانا مدنی کے اعتراضات اور دلیلوں کو کھنگال کر رکھ دیا ہے۔ اور اس مضمون میں نری ادبیت ہی نہیں پائی جاتی۔ اس میں خالص علمی اور عقلی استدلال کی بھی فراوانی ہے۔ یہ "شیوخ عرب و عجم" علم و فضل کی جس بلندی پر متمکن ہیں۔ وہاں "قبولِ حق" کی رسائی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم اُن کی خدمت گرامی میں کچھ عرض معروض کرنے کی اپنے میں جرأت نہیں پاتے۔ ہاں! عوام مسلمانوں سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں تاکہ حقیقت کھُل کر سامنے آجائے۔ کہ جن کو گمراہ ٹھہرایا جا رہا ہے اُن کا کیا مقام ہے! اور جو اپنے کو زہد و شریعت کا ٹھیکیدار سمجھے ہوئے ہیں وہ کس سطح پر ہیں؟ اتنے سنجیدہ اور باوقار علمی مقالے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے خود دیوبند ہی میں ایک ایسے اہلِ فکر عالم کو پیدا کر دیا ہے، جس نے اس ادارے کے بڑے بڑے ستونوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے!

کنیز (ناول) از:- نظر زیدی۔ ضخامت ۳۰۸ صفحات۔ مجلد (رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت تین روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- ادارۂ خواتین۔ اچھرہ۔ لاہور۔

یہ ایک نیم تاریخی اسلامی ناول ہے۔ جو شہرت و نمود اور جلبِ زر کے لئے نہیں بلکہ اخلاق و پاکیزگی کی ترویج و اشاعت کے لئے لکھا گیا ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک پلاٹ مربوط ہے۔ بعض مقامات پر نفسیات کی ترجمانی اور مناظر کی عکاسی خاصی دلچسپ اور اثر انگیز ہے۔ ناول نگار اپنے مافی الضمیر کو ہم آہنگ الفاظ میں ادا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں ان کے رہوارِ قلم کو ٹھوکریں بھی لگی ہیں:-

سوقِ عکاظ کا جو سماں کھینچا گیا ہے اس میں "شاعری" کی جگہ "عروض" (صفہ ۸) نظر آیا۔ سوقِ عکاظ میں شاعری کے معرکے تو ضرور گرم ہوتے تھے مگر "عروض" کی بحثیں نہیں چھڑتی تھیں۔ (ایام جاہلیت میں "عروض" کا فن مرتب ہی کب ہوا تھا!

"اس کے علاوہ بمقابلہ اس تقریب کی آخری شق بھی سمجھی جاتی تھی۔" (صفہ ۱۱)

"شق" کی جگہ کوئی اور لفظ ہوتا تو افسانوی زبان کا آہنگ باقی رہتا۔

"مردوں کی یہ عظیم بھیڑ (صفہ ۱۲) بھیڑ جیسے ٹھیٹ ہندی لفظ کے ساتھ "عظیم" کس قدر بے جوڑ ہے۔" ادھیڑ چاند" (صفہ ۱۶) چاند کو "بچہ"۔ "جوان" اور "ادھیڑ" کہنا جدت تو ہے مگر نامانوس جدت۔ "سردار ابو خالد اپنے بھاری وجود کو سمیٹ کر ایک گینڈے کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔" (صفہ ۴۱) "بھاری جسم" لکھنا چاہیئے تھا۔ "درندہ اپنا جبارہ چیرے کھڑا ہو (صفہ ۴۲) "جبڑا" بولا جاتا ہے۔ "بڑی بڑی بوٹیاں چھچھوڑ رہے تھے۔" (صفہ ۹۶) صحیح تلفظ اور املا "چچوڑنا" ہے۔ دونوں جگہ "ھ" زاید ہے۔ "اور پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔" (صفہ ۱) لڑکھڑاتے ہوئے" لکھنا چاہیئے تھا۔ "سیدی شحنہ نے تقریباً لجاجت کے انداز میں کہا۔" (صفہ ۱۶۱) اردو میں "تقریباً" اس مفہوم میں نہ بولا جاتا ہے اور نہ لکھا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے "تقریباً" ایسے محل پر بار بار استعمال کیا ہے۔" یہ مختصر سا قافلہ

بڑے بڑے سفر کر رہا تھا۔" (صلہ ۱۶۲) "مزے مزے" کے بعد "سے" لانا ضروری تھا۔

"قد، کاٹھ اور رعب دبدبے میں زبیدہ سے بڑھا ہوا۔" (صلہ ۱۶۶-۱۶۷) "کاٹھ" تو لکڑی کو کہتے ہیں۔ "کاٹھی" بولتے ہیں۔

"کیوں یہ منہ بچھڑنے کا کونسا موقع ہے۔" (صلہ ۲۲) "منہ بچھیڑنے" پہلی بار نظروں سے گزرا۔ ان حقیر کیڑوں میں سے پہلے کسے مسلنا مناسب ہوگا۔" (صلہ ۲۷) یہ ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے۔

ہُبل (بُت کا نام) کی جگہ "ہبل" ("ح" کے ساتھ) لکھا ہوا نظر آیا۔ اسی طرح "ہدف" بھی (حدف)! "پھرتی دکھانے کے لئے" جگہ جگہ "چیتے کی سی پھرتی" کی تکرار کچھ بھلی نہیں لگتی!

"ابلیت" یہ عجیب نامانوس سا عربی نام افسانے کے لئے تلاش کیا گیا ہے۔ ناول بہرحال مجموعی طور پر کامیاب ہے!

قدیم خورجہ

از:- خان بہادر نقی محمد خاں۔ ضخامت ۷۴ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- ۱۲۱ لاجپت رائے روڈ۔ جمشید کوارٹرس۔ کراچی۔

جناب نقی محمد خاں صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں بھی موصوف کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے وطن خورجہ (ضلع بلند شہر) کے قدیم تمدن اور احوال و کوائف کو دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔ حب الوطن ایک ایک سطر میں جھلکتی ہے۔ کہیں کہیں تو اس لے میں شیون و فریاد کا رنگ آ گیا ہے!

صفحہ ۲۰ پر عراقی کے دو شعر درج ہیں۔ جن کے پہلے مصرعے غلط درج ہوئے ہیں:-

"نخستیں" کی جگہ "نخستن" اور "چو خود کردند" کے بجائے "چو خوش کردند" اور صلہ پر "بیادار" کو "بہ یاددار" لکھا گیا ہے!

"سوانگ" کو بلند شہر کے نواح میں "سانگ" بولتے ہیں۔ مگر اس کا املا "سوانگ" ہی ہونا چاہیئے۔ صلہ ۲۳ پر "سانگوں" (سوانگ کی جمع) اور "چبولوں" کا املا کھٹکا۔ "چبولوں" لکھنا چاہیئے تھا۔ "ختنوں" کا املا "خطنوں" (صلہ ۴۴) دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی!

"علاج میں شفا تھی اور اعتقاد تھا" (صلہ ۵۹) "اعتقاد" بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ خورجہ کے وہ مسلمان جو ہجرت کر کے پاکستان آ گئے ہیں اُن کی آئندہ نسلیں اس کتاب کو پڑھیں گی تو انھیں ایک ایک واقعہ خواب سا نظر آئیگا!

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۲۱۶ صفحات۔
قیمت دو روپے آٹھ آنہ ملنے کا پتہ۔ اسلامی مکتبہ ۲۳-۷-بی کلاس معظم پورہ۔ حیدر آباد دکن۔

اب سے تیئس ۲۳ سال قبل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی پر ایک سلسلۂ مضامین رسالہ ترجمان القرآن میں شائع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا موصوف حیدر آباد دکن میں مقیم تھے اور وہیں سے "ترجمان القرآن" نکالتے تھے۔ اسلامی مکتبہ (حیدر آباد دکن) نے اس سلسلۂ مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ چند عنوانات:-

اسلامی تہذیب کی خصوصیات —— زندگی کا اسلامی تصور —— زندگی کا نصب العین —— ایمان ——

ـــ ایمان باللہ ـــ ایمان بالرسل ـــ ایمان بالکتب ـــ ایمان بالیوم الآخر ـــ اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر ـــ دنیا پر آخرت کی ترجیح ـــ اسلامی تہذیب میں ایمان کی اہمیت ـــ تہذیب اسلامی کا خاکہ ـــ نفاق کا خطرہ ـــ

جن لوگوں نے مکانوں کی محرابوں، قبروں کے گنبدوں اور لباس و آرائش کی چیزوں ہی کو تہذیب و تمدن سمجھ رکھا ہے، یہ کتاب ان سطحی تصورات کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب کی اساس "ایمان" اور تقوی ہے اور مسلمانوں کے تہذیبی عوامل اسی محور کے اردگرد گھومنے چاہئیں!

اندازِ بیان اور استدلال کے کیا کہنے! ایک ایک سطر پر مصنف کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ کہ اس اسلامی مفکر نے چودھویں صدی ہجری میں کتنا عظیم الشان تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مولانا مودودی اپنی اس دینی فکر کی اصابت اور پھر اس کے سحر انگیز اظہار و بیان اور اس کی بے پناہ مقبولیت کے سبب محسودِ روزگار بن گئے ہیں۔ مگر یہ بیابانی بگولے کیا اس کاروانِ فکر و نظر کو روک بھی سکیں گے!

مولانا مودودی کی یہ تحریر تقریباً ربع صدی قبل کی ہے۔ اس عرصہ میں ان کے اندازِ نگارش میں بہت کچھ بناؤ اور حسن و خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ افکار و نظریات بھی اس مدت میں نکھرے ہیں۔ اس لئے مولانا مودودی کی بعد کی تحریروں کے مقابلہ میں یہ کتاب کہیں کہیں اُترتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر مجموعی طور پر یہ کتاب اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے۔

مقامِ حسینؑ

از:۔ پیام شاہجہان پوری۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ۔ ملک دین محمد اینڈ سنز۔ اشاعت منزل۔ لاہور۔

حضرت سیدنا حسین علیہ السلام نے جبر و استبداد کے خلاف کلمۂ حق بلند فرما کر جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا ہے، وہ گوناگوں خصوصیتوں کی وجہ سے اپنی آپ مثال ہے۔ جس کے دل میں ایمان ہوگا، اس کو حسینؑ سے اور اہلِ بیت سے لگاؤ ضرور ہوگا۔ رفض کی طرح خارجیت بھی دین و ایمان کا فتنہ ہے!

جناب پیام شاہجہان پوری نے حضرت حسین علیہ السلام کی سیرت اور واقعاتِ کربلا کو مؤثر انداز میں پیش فرمایا ہے۔ کتاب کے عنوانات:۔

سیرت و کردار ـــ تعلیمات و ارشادات ـــ تلواروں کے سایوں میں ـــ خطباتِ حسینؑ پر ایک نظر ـــ شہادت ـــ مقامِ حسینؑ ـــ حسینؑ غیروں کی نظروں میں ـــ

بعض کم سواد اور کم نظر لوگ حضرت حسینؑ کے اس جہاد کو "جنگِ اقتدار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کتاب میں اس لغو اعتراض کی فاضل مصنف نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ حُبِ اہلِ بیتِ اطہار کی خوشبو ہر ورق سے آتی ہے!

غالی مؤرخین اور غیر محتاط ذاکروں نے افسوس ہے کہ واقعاتِ کربلا کو تاریخ سے زیادہ حکایت و افسانہ کا رنگ دے دیا ہے۔ اور جذبۂ عقیدت ان افسانوں کو پرکھنے اور جانچنے سے کتراتا رہا ہے، اس لئے غزوات و سرایا اور خلافتِ راشدہ کی جنگوں کو جو تاریخی حیثیت حاصل ہے، کربلا کے افسانوی واقعات اس درجے کے نہیں ہیں۔

MUSLIM

انگریزی ہفتہ وار۔ ایڈیٹر:۔ فروغ احمد۔ مینیجر۔ سید فیاض الدین۔ فی پرچہ چار آنہ۔ چندہ سالانہ بارہ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی بازار ڈھاکہ۔

یہ نوطلوع انگریزی ہفتہ وار ہے۔ جس کی عمر ایک سال سے بھی کم ہے۔ مگر مضامین کی بلندی اور تنوع و ترتیب، فکر کی اصابت اور اظہار حق کی جرأت میں بہت سے پرانے اخباروں اور رسالوں سے منزلوں آگے ہے۔ ہفتہ وار "مسلم" اسلامی فکر و نظر کا ترجمان ہے۔ اس لئے اس کے مضامین پاکیزہ اور سنجیدہ دبا وقت رہتے ہیں۔ گندی سیاست پر طنز اور سازشوں کی بے نقابی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

یہ اخبار ہر طرح کی حوصلہ افزائی اور امداد و تعاون کا مستحق ہے۔ پاکستان کے وہ گھرانے جن میں انگریزی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے اُن میں ہفتہ وار "MUSLIM" کا بار پانا ضروری ہے۔ ہم اس اخبار کی ترقی، مقبولیت اور استحکام کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ــــ !

بچوں کیلئے کہانیاں

(۱) "چوکیدار" از:- محمود پرویز کاکوی۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ اشاعت اُردو۔ کوٹری۔

بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔ کہانیاں دل چسپ اور عام فہم ہیں۔

"مجھے کنگھی کردو" (ص۱) "میرے کنگھی کردو" لکھنا چاہیئے تھا۔ "ماں کے دُلار سے یہ اور بھی کوڑی کا تین ہوگیا تھا" (ص۱۳) "کوڑی کا تین ہونا بے قیمت اور ارزاں ہونے کے معنی میں بولتے ہیں۔ اور حکایت نگار نے اس ضرب المثل کو "آوارہ اور پست کردار ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ (ص۱۹) "آئرن سیف کھلا ہوا تھا" "آئرن سیف" کی جگہ "لوہے کی تجوری" لکھنا چاہیئے تھا۔ (ص۲۵) "اور جس وقت وہ (ہاتھی) جھومتے تو بے حد سہانا منظر معلوم ہوتا" ہاتھیوں کے جھومنے کے منظر کو "سہانا" کہنا کتنی بے جوڑ بات ہے۔ یہاں "عجیب" کا محل تھا۔

(ص۲۵) "اس کی مونچھیں کڑی کڑی سی تھیں یہ ہاتھی کا کاروبار کرتا تھا" سخت مونچھوں کو "کڑی" لکھنا وجدان کو کھٹکتا ہے۔ "ہاتھی کا کاروبار" بھی محلِ نظر ہے۔ "ہاتھیوں کی تجارت کرتا تھا" لکھنا چاہیئے تھا۔

(۲) لالچی فقیر:- از۔ محمود پرویز کاکوی۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ اشاعت اُردو، کوٹری۔

اس کتاب میں بھی۔ بچوں کے لئے ہلکی پھلکی کہانیاں ہیں۔ جو دل چسپ ہیں: (ص۲۵) "دونوں کے دونوں بالکل جھٹ ہی تو گئے" یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ مشغول ہونے کے معنی میں "جُٹ گئے" بولتے ہیں۔ اس لفظ میں "ہ" نہیں ہے۔

(۳) "ایک بادشاہ اور قصاب" از:- محمود پرویز کاکوی۔ قیمت پانچ آنہ:- ملنے کا پتہ۔ مکتبہ اشاعت اُردو کوٹری (حیدرآباد)

اس کتابچہ میں بھی دل چسپ کہانیاں بچوں کی نفسیات کے مطابق ہیں۔ "مگر اس کے انگ انگ میں شرافت بھری ہوئی تھی۔" (ص۱۷) "انگ انگ" کی جگہ "نس نس" زیادہ عام فہم اور فصیح تر تھا۔ "پولس کے کئی افراد" (ص۲۳) بچوں کے سمجھنے کے لئے "افراد" کی جگہ "آدمیوں" لکھنا تھا۔ "سفید رنگ کا ایک طویل قامت کتا" (ص۲۵) "طویل قامت" بھی بچوں کے لئے مشکل لفظ ہے۔

(۴) "بچوں کے ترانے" از۔ محمود پرویز کاکوی۔ ضخامت ۱۶ صفحات۔ قیمت تین آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ اشاعت اُردو، کوٹری (حیدرآباد)

اس کتابچہ میں۔ بچوں کے لئے مختلف موضوعات پر گیارہ نظمیں ہیں۔

"محبت کو رگ رگ میں ڈالے ہوئے (صفحہ ۳) یہ کیا زبان ہے؟

"سعادت کا نغمہ سنانے کو آیا۔ (ص ۹) "سعادت کا نغمہ" کیا ہوتا ہے؟

"سحر ہو گئی" جس نظم کا عنوان ہے۔ اس کا آخری بند شروع کے تین بندوں سے مختلف بحر میں ہے۔
جناب وفا راشدی کی کوشش سے یہ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ موصوف اردو زبان کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔

اسلام اور انسانی قانون

از:۔ عبد القادر عودہ شہید۔ مترجم:۔ عمر بن اللہ ایم اے عثمانیہ۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ قیمت پندرہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اسلامک بک سینٹر (مسجد چوک) حیدر آباد دکن۔

حضرت عبد القادر عودہ شہید رحمتہ اللہ علیہ "اسلامی دستور" اور "دینی شریعت و قانون" پر سند (authority) مانے جاتے تھے۔ ظالم ناصر نے اُن کو پھانسی دے کر ایک بہت بڑی سعادت اور نعمت سے ملت اسلامیہ کو محروم کر دیا۔ عبد القادر عودہ ایک فرد کا نام نہ تھا۔ وہ اپنی ذات سے علم و فضل کا ایک مستقل ادارہ تھے بلکہ ایک امت تھے۔

عبد القادر عودہ شہید کے ایک معرکہ آرا مقالہ کا اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ جس میں انہوں نے قانونِ شریعت پر بڑا سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ اور مغربی تعلیم یافتہ گروہ کے فکر و نظر کا بڑی خوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ نومبر کے "فاران" میں انشاء اللہ العزیز اس کتابچے کے بعض اقتباسات "روح انتخاب" میں دیئے جائیں گے۔

"اسلام اور انسانی قانون" بڑے کام کی چیز اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ جس کا مطالعہ ذہن و فکر کو تنویر بخشتا ہے۔ مصنف، مترجم اور ناشر سب کے سب ملتِ اسلامیہ کی طرف سے تشکر و امتنان کے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جزاءِ خیر کے مستحق ہیں۔

حقیقت عیسائیت

مولفہ:۔ حکیم شمس الدین احمد قریشی۔ ضخامت ۴۲ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت و التبلیغ ٹیکسلا۔

اس کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی مشنریاں شروع شروع میں تو صلح کل اور رواداری کے انداز پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتی ہیں۔ مگر قابو پانے کے بعد اُن کی زیادتی و اکراہ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ صرف الجزائر شہر میں بڑی بڑی مساجد ایک سو ساٹھ کی تعداد میں تھیں۔ جن میں سے اکثر کو عیسائیت کے جور و ستم نے کلیساؤں، سرکاری دفتروں اور اصطبلوں میں تبدیل کر دیا اور بعض ڈھا دی گئیں۔

پاکستان میں بھی عیسائی مشنریاں پر پُرزے نکال رہی ہیں اور عیسائیت کی تبلیغ زور و شور کے ساتھ کر رہی ہیں۔ اور یہ بات عالم آشکارا ہے کہ عیسائی مشنریوں کے پاس مذہبی لٹریچر کے علاوہ لوگوں کی تحریص و ترغیب کے دوسرے ذرائع بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھے۔

اس کتابچہ کے آخری حصہ میں عیسائیوں کے عقائد (۱) عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں —— (۲) عیسیٰ علیہ السلام تین خداؤں میں سے ایک خدا ہیں۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے گناہوں کے بدلے میں اپنے اکلوتے بیٹے کو سُولی دی —— کی فیصلہ کن دلیلوں سے تردید کی ہے۔ اور عیسائی عقائد کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے!

الفاروق حصہ اول و دوم (کامل) از:- علامہ شبلی نعمانی - ضخامت ۶۷۶ صفحات، مجلد رنگین، دیدہ زیب گرد پوش کے ساتھ - قیمت چار روپے آٹھ آنے - ملنے کا پتہ:- مالکان کتب خانہ صدیقیہ ملتان -

علامہ شبلی نعمانی کی معرکہ آرا اور بے مثال تالیف الفاروق کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے - یہ کتاب سیرت نگاری اور تاریخ کا سنگ بنیاد ہے۔ انگریزی، فارسی اور ترکی میں اس کے ترجمے ہو کر قبول ہو چکے ہیں۔ کتب خانہ صدیقیہ ملتان نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اور قیمت بازار کے عام نرخوں سے بہت کم رکھی ہے۔

کتاب پر "جملہ حقوق محفوظ" دیکھ کر طبیعت میں کھٹک سی پیدا ہوئی - کیا دار المصنفین اعظم گڑھ سے کتب خانہ صدیقیہ ملتان نے باضابطہ حقوق طباعت حاصل کرلئے ہیں - اگر نہیں کئے تو پھر "جملہ حقوق محفوظ" کا "انتباہ" کوئی وزن نہیں رکھتا -

"الفاروق" سے کسی اُردو شناس مسلمان کا گھر خالی نہیں رہنا چاہیئے - علمی اور دینی ہر اعتبار سے یہ کتاب مطالعہ اور توجہ و عمل کی مستحق ہے -

دو ہفتہ ترکی میں از:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - ضخامت ۱۱۶ صفحات - کتابت، طباعت، کاغذ، ہر چیز دیدہ زیب - مجلد - خوبصورت گرد پوش کے ساتھ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ -

ملنے کا پتہ:- مکتبہ اسلام - گوئن روڈ - لکھنؤ (بھارت)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تھے - اور دمشق سے لگے ہاتھوں ترکی بھی ہو آئے - یہ کتاب اسی سفر کے مشاہدات، واردات اور تاثرات سے عبارت ہے۔ سفر نامہ انتہائی دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ تنقید نگار نے اسے شروع کیا اور ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیا - انشا کی سلاست و روانی کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے :-

"گاڑی اُس سرزمین پر جارہی ہے جس کے دشت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں
سے بار بار گونجے اور جس کی خاک پاک عرب شہسواروں اور ترک مجاہدوں کے
گھوڑوں کی ٹاپوں سے بار بار پامال اور حق یہ ہے کہ مالا مال ہوئی"

ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک زمانہ میں اپنی ناواقفیت کے سبب مصطفےٰ کمال پاشا کی ذات سے کس قدر والہانہ محبت بلکہ عقیدت تھی - راقم الحروف نے بھی اتاترک کی مدح میں اشعار کہے ہیں اور اپنی اس غلطی پر سخت متاسف ہے - اتاترک کمال نے ترکی کو دین سے بیگانگی اور بیزاری کے جس پاتال میں گرایا ہے۔ اُس پر خون کے آنسو رونے کو جی چاہتا ہے - مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ترکی پھر اسلام کی طرف لوٹ رہا ہے اور مصطفےٰ کمال کی محبت بیزاری سے بدلتی جارہی ہے - مولانا علی میاں نے گلہانہ پارک میں اتاترک کے مجسمہ کو دیکھ کر جو یہ کہا :-

"ماوَلَدَتِ الاُمَّةُ التركيه اشأم منه" (مادرِ ترکیہ نے اس سے زیادہ منحوس آدمی کو جنم نہیں دیا!) تو یہ حقیقت کی ترجمانی کی -

---

ا۔ صفحہ ۸۴ پر "گوارا" کا املا "گوارہ" دیکھ کر حیرت ہوئی -

مولانا علی میاں کا یہ سفر کوئی تفریحی سفر (Excursion) نہ تھا۔ دینی تقاضے اُن کے ہمہ وقت پیش نظر رہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اور زیادہ قدر کے قابل ہے!

"عفت" کا سالنامہ ادارۂ تحریر:۔ عبدالوحید خاں۔ حمیدہ بیگم، رخشندہ کوکب۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات۔ اس خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ عام پرچہ کی قیمت آٹھ آنہ۔ سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "عفت" ادارۂ خواتین اچھرہ۔ لاہور۔

ماہنامہ "عفت" کا سالنامہ بڑے حُسن اہتمام سے منظر عام پر آیا ہے۔ جیسا نام ویسا کام۔ عفت و پاکیزگی ایک ایک سطر سے جھلکتی ہے۔ مضامین دل چسپ اور متنوع ہیں۔ نظمیں بامقصد اور ولولہ انگیز ہیں۔ افسانے مفید اور کارآمد ہیں۔

"عفت" کا یہ شاندار شمارہ ہر اُردو داں مسلمان گھرانے میں بار پانے کا مستحق ہے۔ تدبیر منزل سے لے کر ادب و انشا، اور دینی افکار تک ہر چیز اس میں ملتی ہے۔ مغرب زدہ غیر صالح لٹریچر کے مقابلہ میں پاکیزہ ادب پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اشاعتِ پاکیزگی و اخلاق کی ایک مثبت کوشش۔ سرورق دیدہ زیب اور سادہ و پُرکار ہے۔ جو ظاہری طور پر بھی الماریوں اور میزوں کی زینت بن سکتا ہے!

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۸

فاران

نومبر ۱۹۵۶ء ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ ... چھ روپے
فی پرچہ ... آٹھ آنے

مقام اشاعت
دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ اوّل

انگریز کے دور میں عوام اور حکومت کے درمیان نزاع و کشمکش ناگزیر تھی کہ "غلام رکھنے" اور "آزاد ہونے" کی دو متضاد کوششوں کا ٹکراؤ تھا۔ اُس زمانہ میں حکومت کے خلاف احتجاج، قانون شکنی اور پولیس اور عوام کے درمیان جھڑپ کی خبریں سُن کر دل کو کیا کیا خوشی ہوتی تھی کہ گورنمنٹ کے خلاف بیزاری، بددلی بلکہ نفرت و عداوت بڑھتی چلی جا رہی ہے اور آزادی کے شیدائی ایک نہ ایک دن حکومت کا تختہ اُلٹ کر رہیں گے!

انگریز سے نفرت اس لئے نہ تھی کہ وہ عیسائی مذہب کا پیرو ہے۔ انگلستان کا رہنے والا ہے اور اس کا رنگ اور نسل ہم سے مختلف ہے۔ نفرت و بیزاری کا سبب انگریز کے وہ منصوبے اور عزائم تھے جو عوام کی تمناؤں کے خلاف وہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ اور وہ صرف ذہنی عزائم اور خیالی منصوبے نہ تھے۔ عملی دُنیا میں بھی اُس کے آثار و علائم سب کو دکھائی دیتے تھے۔

انگریز نے اپنے اقتدار کی عمر بڑھانے اور عوام کی جدوجہد آزادی کو ناکام بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سبز باغ اُس نے دکھائے، قرطاسِ ابیض کے جال اُس نے بچھائے، آزادی کی قسطیں اُس نے مقرر کیں، دھونس اُس نے جمائی۔ لالچ اُس نے دیا۔ یہاں تک کہ جبر و تشدّد پر اُتر آیا۔ انگریز کو بہت سے حاشیہ بردار اور "جی حضوری" بھی ہاتھ لگ گئے تھے جو اپنے بھائی بندوں کے خلاف مخبری کرتے اور ہر جا و بے جا بات میں اپنے سفید فام آقاؤں کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے!

مگر اس کشمکش کا نتیجہ کیا نکلا؟ وہی جو نکلنا چاہیئے تھا۔ یعنی عوام کی جیت اور حکومت کی ہار! انگریز کی تمام چالیں بیکار ثابت ہوئیں، اُس کی ڈپلومیسی فیل ہو گئی، اُس کی تدبیریں زیادہ دیر تک نہ چل سکیں۔ اب رہا قوّت کا استعمال، تو اُس نے یہ کر کے بھی دیکھ لیا کہ جبر و تشدّد سے عوام کے جذبات کو تھوڑی دیر کے لئے دبایا تو جا سکتا ہے مگر اُن کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ اور دُنیا کی کوئی طاقتور سے طاقتور حکومت بھی عوام کے مقابلہ میں اُن کی حریف اور فریق مخالف بن کر زیادہ دن تک قائم

نہیں رہ سکتی۔ اختیار و اقتدار پر گھمنڈ کرنے والے اگر انگریز کے زوال سے اتنی سی بھی عبرت نہ حاصل کریں تو پھر اُن کو اسی انجام کے لئے تیار رہنا چاہیئے!

اگر عوام کے مقابلہ میں مکر و فریب کی چالیں اور سیاست کی شیشہ گری کامیاب ہو سکتی تھی تو انگریز سے بڑھ کر اس فن میں اور کون مہارت رکھتا تھا مگر بساطِ سیاست کے اس سب سے بڑے شاطر کو بالآخر زچ ہونا پڑا۔ اگر عوام کو طاقت سے مغلوب کیا جاسکتا تھا تو انگریز کی طاقت کا بھلا کوئی ٹھکانا تھا، عوام کی تمنّاؤں کے سامنے انگریز کی طاقت کو بھی سپر انداختہ ہونا پڑا!

انگریز کو ہندوستان کی قوموں میں سب سے زیادہ دشمنی مسلمان قوم سے تھی۔ اس لئے یہ کینہ پرور ظالم چلتے چلتے مسلمانوں پر وار کر گیا۔ مسلمانوں کے قتل و غارت گری میں پیش پیش جیسے مہاسبھائی سنگدلوں کا تو ہاتھ تھا ہی مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی انگلیاں بھی اس ہاتھ کو شہ دے رہی تھیں۔ آخر میں ریڈ کلف پاک و ہند کی سرحدوں کی نا منصفانہ تقسیم کر کے پاکستان کو مصیبت میں پھنسا گیا!

انگریز کے جانے کے بعد مسلمان خوش اور مطمئن تھے کہ پاکستان، ان تمام پچھلے صدموں کی تلافی کر دے گا اور مسلم قوم کے کلیجہ پر اگرچہ بڑے کاری زخم آئے ہیں مگر پاکستان کا وجود اپنی جگہ ان زخموں کا مرہم ہے! خوش خیالی یہ تھی کہ حکومت اپنے نمائندوں اور بھائی بندوں کے ہاتھوں میں ہوگی، جو قوم کے مزاج سے، نظریوں سے، تمنّاؤں اور اس کے مطالبوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے انگریز کے زمانہ میں رعیت و راعی اور حاکم و محکوم کے درمیان جو نزاع و کشمکش جاری رہتی تھی۔ اُس کا پاکستان میں موقع ہی نہیں آئے گا۔ سب مل جُل کر، ایک دوسرے کے دست و بازو بن کر بلکہ یک دل و جان ہو کر اس سفینہ کو چلائیں گے۔ انگریز کے دورِ منحوس میں حاکم و محکوم کے جو امتیازات قائم تھے، وہ مٹ جائیں گے، چھوٹے اور بڑے، غریب اور مالدار سب کے سب اخلاص و محبت کے ساتھ پاکستان کی خدمت کریں گے اور یہ نو مولود مملکت دنیا کی باوقار مستحکم سلطنت بن جائیگی ایسی سلطنت جس کے اندر امن و اطمینان ہوگا اور بین الاقوامی دنیا میں جس کا وزن محسوس کیا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس آئیڈیالوجی (اسلام) نے اس حکومت کو وجود بخشا ہے، وہ یہاں عملی طور پر متشکل اور نافذ ہوگی!

ہندوستان کی تقسیم بڑی رواروی اور انتہائی عجلت میں عمل میں آئی تھی۔ انگریز نے جلد بازی کی یہ پالیسی جان بوجھ کر اختیار کی کہ دلّی میں تو مرکزی حکومت کا سب کاروبار جما جمایا موجود تھا، ساری پریشانی حکومتِ پاکستان کو لاحق ہوتی۔ کراچی میں کلرکوں کو بیٹھنے کے لئے کرسیاں تک میسر نہ تھیں، اس افراتفری میں کسی تعمیری منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا بہت دشوار تھا۔ جبکہ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین پاکستان میں آئے چلے جا رہے تھے!

تقریباً ایک سال تک پاکستان کے عوام صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کرتے رہے، اُس کے بعد انہوں نے اندازہ کیا کہ پاکستان جس مقصد کیلئے وجود میں آیا ہے، اُن خطوط پر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اُوپر سے لے کر نیچے تک وہی انگریزی دَور کی روایات اور رجحانات کام کر رہے ہیں۔ اس احساس کے بعد عوام میں حرکت پیدا ہوئی، جس کے نتیجہ میں "قرار دادِ مقاصد" دستور ساز اسمبلی کو منظور کرنا پڑی۔ لیاقت علی خاں مرحوم کے دورِ وزارت کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ "قرار دادِ مقاصد" کا دستورِ پاکستان کا سرنامہ اور حرفِ آغاز بننا ہے! پاکستان کو بنے ہوئے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی اس لئے موقع پرست (opportunists) اور کمزور کردار کے مسلمان لیڈروں تک میں مذہبی ولولہ موجود تھا۔ اور "منافقین" کو اتنی مدت نہیں مل سکی تھی کہ وہ ان موقع پرست اور زمانہ ساز مسلمان لیڈروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر سکیں!

"قرار دادِ مقاصد" کا عوام مسلمانوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا جیسے اُن کے دل کی مُراد بر آئی اور بھٹکے ہوئے قافلہ کو نشانِ منزل مل گیا - مگر اہلِ نفاق کے لئے "قرار دادِ مقاصد" ایک المناک سانحہ تھی - اِن میں سے کسی کسی نے تو اپنے دل کی جلن کا اظہار بھی کر دیا اور دُوسرے منافقین اس بُغض و نفاق - بلکہ یُوں کہئیے "زخمِ دل" کو چھپائے بیٹھے رہے!

اسلامی دستور سازی کو روکنے کے لئے اہلِ نفاق نے جو جو چالیں چلی ہیں اور جو حربے استعمال کئے ہیں، وہ سب پر روشن ہیں - مگر اللہ کے فضل سے کوئی دھمکی اور جور و ظلم عوام کے عزم کو متزلزل نہ کر سکا - پاکستان کے ایک ایک گوشہ سے یہی صدا بلند ہوئی - کہ ع

اپنا مقصد، اپنی منزل اسلامی دستور!

پاکستان کے مسلمان ان "بڑے لوگوں" کی بے تدبیری، غرض پرستی اور آپس کی جنگِ اقتدار کے سبب طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا رہے ہیں - کپڑا، روٹی، مہنگائی، بے روزگاری، خانماں بربادی، ان میں کا ہر مسئلہ ان بیچاروں کے لئے ایک مستقل مُصیبت تھا اور ہے - مگر اُنہوں نے ان میں سے کسی مسئلہ کو بھی موضوعِ احتجاج نہیں بنایا - اُنہوں نے احتجاج اُس کے لئے کیا جس کا تعلق اُن کے دین و ایمان اور آخرت سے تھا - ان جفاؤں کو وہ کسی نہ کسی طرح سہہ گئے اور سہہ رہے ہیں - مگر اسلامی نظام کے مقابلہ میں لادینی نظام اُنھیں کسی قیمت پر گوارا نہ تھا - نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور آج بھی جب کوئی یہ کہتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ اور ہندو قومیت کو "ایک قوم" (one - nation) قرار دے کر، اسلام کے مقابلہ میں وطنیت اور لادینیت کو اُبھارا جائے - تو اس کے صرف تصور سے پاکستانی مسلمان کا دماغ جل اُٹھتا ہے!

چودھری محمد علی کی وزارتِ عظمٰی کے زمانہ میں دستور کا مسئلہ جب اسمبلی میں پیش ہوا تو پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی ٹریجڈی تھی کہ بعض مسلم ارکان نے ہندو ممبروں کے ساتھ یک زبان ہو کر دستور کی اسلامی دفعات کی پُوری قوت اور شدت کے ساتھ مخالفت کی - لوگ حیران تھے کہ یہ کیسے مسلمان ہیں جو کانسٹی ٹیوشن کی اسلامی دفعات سے اس قدر بیزار ہیں اور جن کو دستور میں اسلام کا نام تک لانا گوارا نہیں ہے!

آتے ہی!

چودھری محمد علی صاحب کے بعد مسٹر شہید سہروردی وزارتِ عظمٰی کی مسند پر متمکن ہوتے ہیں اور مُسلم عوام کی امن پسندی اور خوش فہمی کی انتہا ہے کہ سہروردی صاحب کے وزیرِ اعظم ہونے پر کسی اسلام پسند طبقہ کی طرف سے مخالفت نہیں کی جاتی - اس لئے نہیں کہ عوام نے ڈر کے مارے صدائے احتجاج بلند نہیں کی، یا نئے وزیرِ اعظم صاحب کی خوشامد مقصود تھی - اس سکوت، گوارائی اور برداشت کا سبب یہ تھا کہ پاکستان کے مُسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جناب شہید سہروردی صاحب پر جب حکومت کا بار پڑے گا، عوام کے حقیقی مطالبے اُن کے سامنے آئیں گے، خود کانسٹی ٹیوشن کی رُوح جب اُن کے سامنے ہو گی تو وہ اپنی پچھلی روش پر جمے رہنے پر اصرار نہ کریں گے - وہ اپنے کو بدل دیں گے اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیں گے کہ وہ اُس حکومت کے وزیرِ اعظم ہیں جس کے دستور کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہے اور اسلام جس کا نام ہے، اسلام جس کی رُوح ہے - اسلام جس کی اساس ہے اور اسلام جس کے وجود کا سببِ تخلیق ہے!

ہم جیسے خاک نشینوں نے اپنے نئے وزیرِ اعظم صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کی تھی کہ:-

"ہمارے سامنے آپ کا ماضی نہیں مستقبل ہے - ہم یہ خوش گمانی رکھتے ہیں کہ حکومت کا

بارِ گراں آپ میں انشاء اللہ تبدیلی پیدا کر دے گا۔ ذمہ داریوں کا احساس آپ کو وہ
بنا دے گا جو اسلامی حکومت کے سربراہ کار کو بننا چاہیئے۔" (فاران۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

سہروردی صاحب کا ماضی کیا رہا ہے؟ اس بحث کو ہم نے قصداً نہیں چھیڑا کہ مقصود بلاوجہ کی چھیڑ نہ تھا۔ یہ بحث درمیان میں لائی جا سکتی تھی مگر ہم نے اس سے عمداً گریز کیا۔ تاکہ سہروردی صاحب کی وزارت عظمیٰ کا آغاز تنقید و تعریض کی بجائے خوش فہمی، خیر اندیشی اور محبت کے جذبات سے ہو! ہمیں سہروردی صاحب کے وسیع تجربہ، سیاسی زندگی اور اُن کی ذہانت و دانائی سے توقع تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ کو ہرگز نہ اٹھائیں گے، جو چاہے اُن کے رجحانات کے عین مطابق ہو مگر پاکستان کے عوام مُسلمان جس کو ناپسند کرتے ہوں!

حیرت سے زیادہ افسوس اور افسوس سے زیادہ حیرت ہے کہ مسٹر سہروردی نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کا آغاز ہی اُس مسئلہ سے کیا کہ جس کو اگر درست مان لیا جائے تو پاکستان جس نظریہ کی بناء پر وجود میں آیا ہے وہ ایک غلط اقدام بلکہ "بنارفاسد" قرار پاتا ہے۔ اُنہوں نے پبلک کے بڑے بڑے جلسوں میں "دو قومی نظریہ" کی تردید اور مخلوط انتخاب کی تائید فرمائی اور ہندوؤں اور مُسلمانوں کی متحدہ قومیت کا بڑے جوش کے ساتھ پرچار کیا۔ اور سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سہروردی صاحب نے ان جلسوں میں اپنے خیالات کا ردِّ عمل دیکھنے اور عوام کے خیالات کا اندازہ کرنے کے بعد بھی اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی نہ کی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی ناراضگی اور برہمی نے اُن کے اندر ضد پیدا کر دی، حالانکہ سیاست میں ضدم ضدا کی پالیسی ناتجربہ کاری کا ثبوت ہے، تجربہ کار لیڈر کسی قومی مسئلہ کو اپنی ذاتی فتح و شکست اور شخصی عزت و ذلت کا سبب قرار نہیں دیا کرتے۔ اور نہ تُنک مزاج عورتوں کی طرح ہٹ پر اُتر آتے ہیں کہ جو بات مُنہ سے نکل گئی ہے، چاہے زمین آسمان کیوں نہ ٹل جائیں وہ پُوری ہو کر رہے گی!

مسٹر شہید سہروردی پاکستان کے وہ پہلے وزیر اعظم ہیں۔ جن کی وزارت کا آغاز ہی پبلک کی برہمی و ناخوشی سے ہوا ہے! پاکستان کے عوام مُسلمانوں کو سہروردی صاحب کی ذات سے کوئی کد نہیں ہے۔ اگر کد ہوتی تو جس دن صاحب موصوف نے قلمدانِ وزارت سنبھالا ہے اُسی دن اُن کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو سکتی تھی۔ پاکستان کے عوام مُسلمانوں کی برہمی اور ناخوشی کی دعوت خود وزیر اعظم صاحب بہادر نے دی ہے! انہوں نے پبلک جلسوں میں "دو قومی نظریہ" کو چیلنج کر کے مخلوط انتخاب کی حمایت فرمائی ہے۔ یہ وہ ناوک تھا، جو مُسلم عوام کے دلوں کو برماتا چلا گیا۔ وہ صبر نہ کر سکے۔ شدتِ درد سے چیخ اُٹھے کہ یہ اُن کی قومی غیرت کا سوال تھا!

مُسلم عوام کی اس فریاد، واویلا اور احتجاج کا جواب سہروردی صاحب کی عوامی لیگ نے ہندو اور کمیونسٹ غنڈوں کی مدد سے ڈھاکہ کے جداگانہ انتخاب کے حامیوں کے جلسہ میں جس طرح دیا ہے۔ وہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ عوامی لیگ والے تو سب سے زیادہ اوچھے، اُتھلے اور کم ظرف نکلے اور ان حرکتوں پر اُتر آئے جو بازاری لوگوں کو زیب دیتی ہیں۔ بادۂ اقتدار کے دو چار چلوؤں ہی نے عوامی لیگ کو "بازاری لیگ" بنا دیا۔

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ نیشنل اسمبلی میں مشرقی پاکستان

کیلئے مخلوط انتخاب کی منظوری کی منحوس اور جگرخراش اطلاع ملی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

ناوک نے اُن کے صید نہ چھوڑا زمانے میں
یہ ابتداء ہے تو پھر اسکی انتہا معلوم

اور یہ فیصلہ اس زمانہ میں ہوا ہے جبکہ پاکستان کا گوشہ گوشہ "جداگانہ انتخاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور مخلوط انتخاب سے اس طرح عوام نفرت کر رہے ہیں جس طرح کوڑھ کی بیماری سے طبعی نفرت ہوتی ہے!

عوام کے اس قدر ملک گیر احتجاج اور اتنے عظیم الشان متفقہ مطالبہ کو وہی لوگ اتنی بے دردی اور سفاکی سے ٹھکرا سکتے ہیں۔ جن کو اقتدار کے نشہ نے بالکل بے خود و سرشار بنا دیا ہو اور جو عواقب سے قطعاً بے پرواہوں۔ اور جن کو بے جا خود اعتمادی اور غلط فہمی کا مرض لاحق ہو گیا ہو کہ ہم طاقت کے بل پر جو بھی کر گزریں گے، ہمارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا!

تاریخ بتاتی ہے کہ وقت کے جابر غلط کاروں نے ہمیشہ اپنی طاقت کے گھمنڈ پر انسانیت کی بنیادی قدروں کو کچلا ہے۔ اور عوام کو مور و ملخ سمجھ کر روندا ہے۔ مگر اللہ کی دی ہوئی ڈھیل جب ختم ہو چکی ہے اور جب قدرت نے انھیں پکڑا ہے تو پھر بڑے بڑوں کی کبریائی (؟) کے تخت اوندھے ہو گئے ہیں اور بلندیاں آن کی آن میں خاک بسر ہو کر رہ گئی ہیں ؎

تجھ کو یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ "قراردادِ مقاصد" کو بعض "منافقین" نے ایک المناک سانحہ کی طرح محسوس کیا تھا اور وہ اُس وقت سے اب تک اسی اُدھیڑ بن میں لگے رہے کہ کسی طرح اسلامی دستور کا بنیا پانچہ ہو جائے اور یہ جو پاکستان پر "اسلامیہ جمہوریہ" کی چھاپ لگی ہوئی ہے یہ کسی عنوان باقی نہ رہے۔ "مخلوط انتخاب" کی تجویز کو منظور کرانے میں ان "منافقین" کا بہت کچھ ہاتھ ہے قصر و ایوان میں لالچ اور دباؤ نے کیا پارٹ انجام دیا ہے؟ یہ اسرار جب بے نقاب ہوں گے تو دُنیا دیکھ لے گی کہ ان میں ننگِ ملّت کون تھا، ننگِ دین کون تھا اور ننگِ وطن کا لقب کسے زیب دیتا تھا؟

ری پبلکن پارٹی کے ارکان نے وعدہ شکنی، زمانہ سازی، جاہ پرستی، ملک و ملّت سے بے وفائی اور کھلی ہوئی ضمیر فروشی کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے، اُسے توڑنے کے لئے ان جیسے بے ضمیر انسان شاید پھر پیدا نہ ہو سکیں! رہے ڈاکٹر خان صاحب، تو وہ ہر اُس گٹھ جوڑ کا ساتھ دیں گے جس سے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچتا ہو۔ کیونکہ اُن کے ضمیر نے پاکستان کو قبول ہی نہیں کیا!

چودھری محمد علی کے دور وزارت عظمیٰ میں مولاناؤں اور ملاؤں پر فقرہ بازی اور پھبتیاں بند رہیں مگر سہروردی صاحب جو اسلام پسندوں کے مقابلہ میں تمام سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کا غالباً بیڑا اٹھا چکے ہیں، اُنہوں نے اس آگ کو پھر سے بھڑکایا ہے اور مولویوں اور مولاناؤں کے خلاف اُنہی پٹی ہوئی دلیلوں کو دُہرایا ہے، جن میں اب کوئی وزن نہیں رہا۔ اور چشم بد دُور! وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھتے ہی اسرارِ شریعت بھی آپ پر منکشف ہوگئے ہیں اور دینی مسائل میں اجتہاد کا منصب بھی آپ کو مل گیا ہے۔ شریعت کے بارے میں سہروردی صاحب نے اسمبلی میں جو کچھ کہا ہے وہ اتنا بڑا بول ہے جو اب تک کسی نے نہیں بولا۔ افسوس ہے کہ اقتدار کے نشہ میں "عزت مآب" اس قدر بے قابو ہوگئے ہیں کہ شریعت کے بارے میں انہوں نے اس قدر لغو اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ ڈالی ہیں جو اُن جیسے ذمہ دار اور اعلیٰ منصب کے حامل انسان کو کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔ ؎

کم کن زکبر و ناز کہ دیدا است روزگار چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہ کے

جب سے پاکستان بنا ہے یہ پہلا سانحہ ہے کہ کمیونسٹ غنڈوں اور مہاسبھائی ہندوؤں کی یہ جرأت ہوئی ہے کہ انہوں نے اسلام پسند طبقہ کی کھلم کھلا اہانت و تفضیح کی ہے، اُن پر جارحانہ حملے کئے ہیں اور بھرے جلسہ میں اُن کی ڈاڑھیاں نوچی ہیں۔ سہروردی صاحب پہلے وزیر اعظم ہیں جنہوں نے اُس "دو قومی نظریہ" کو باطل قرار دیا ہے۔ جس کی بنیاد پر ہندوستان تقسیم ہوا ہے اور پاکستان وجود میں آیا ہے۔ یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ اُن کی موجودہ سیاسی روش نے پاکستان میں اسلام پسند طبقہ کو نقصان پہنچایا ہے اور ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے مؤقف کو مستحکم بنا دیا ہے، ایسا وہ کیوں کر رہے ہیں؟ یہ تو وہی جانتے ہوں گے مگر ہم وہ کہہ رہے ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں اور یہ بات سب سے زیادہ خطرناک ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ جداگانہ انتخاب سے مسلم عوام دست بردار نہیں ہوں گے، یہ تحریک جاری رہے گی۔ تو اس کے جواب میں سہروردی صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے خلاف برابر کی مہم شروع کرا دی جائے گی۔ ملک کے وزیر اعظم کے اور یہ خوفناک عزائم اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس ملک میں کیا ہونے والا ہے؟

مسٹر سہروردی نے اپنی جماعت — عوامی مسلم لیگ — کے نام سے لفظ "مسلم" نکال دیا، دوسرے ناموں کیساتھ بھی اُنھیں لفظ "اسلام" کی نسبت پسند نہیں ہے۔ ہر حال یہ اُن کی ذاتی پسند اور شخصی رجحان کا معاملہ ہے مگر اپنی اس پسند اور ناپسند کو جو وہ دوسروں پر ڈنڈے کے زور سے مسلط کرنا چاہتے ہیں اس کا تو اُنھیں حق نہیں پہنچتا۔ اس پاکستان میں دس بیس لاکھ نہیں کروڑوں ایسے انسان بستے ہیں جو "مسلم"۔ "اسلام" اور "دین و شریعت" کی نسبتوں کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، جس کیلئے وہ اپنا گھر بار لٹا سکتے ہیں اور اپنے سر کٹا سکتے ہیں مگر ان مقدس نسبتوں کو نہیں چھوڑ سکتے، کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے، اگر ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے بے غیرت ارکان اس "شدھی" کو قبول کر لیتے ہیں تو اسکے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ عام مسلمان بھی "مسلم" اور "اسلام" کی نسبتوں کو چھوڑ کر لفظی اور اصطلاحی "ارتداد" گوارا کرلیں!

پچھلے بڑے لوگوں نے مہینوں اور برسوں میں پبلک کی برہمی کے جو حالات پیدا کئے ہیں سہروردی صاحب نے چند دنوں میں اُن سے بڑھ کر خراب حالات پیدا کر دیئے ہیں، اُن کی جرأت اور ذہانت کا یہ بڑا افسوسناک مظاہرہ ہے۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد اُن کے بولنے کا انداز اس قدر تحکمانہ ہو گیا ہے جیسے اُن کی زبان سے پولیس کی لاٹھیاں اور سنگینیں بول رہی ہیں!

سہروردی صاحب بیشک انگریزی قانون میں مہارت رکھتے ہیں اور وکالت اُن کا پیشہ اور ذریعہ معاش رہا ہے۔ مگر دین و شریعت میں جو اپنی ذہانت اور قانونی مہارت کی دخل در معقولات کی ذمہ داری وہ اپنے سر بلا وجہ لے رہے ہیں، یہ اُن کی ذہانت کا بیجا

استعمال ہو، اس طرح وہ ذہنی انتشار تو پھیلا سکتے ہیں مگر دین و شریعت کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اور ان کی "جرأت" جو کمیونسٹ مفسدوں اور مہاسبھائی غنڈوں کو میدان میں لے آئی ہے، یہ بڑے خوفناک کھیل کا آغاز ہے!

آخری گزارش

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ انگریز کے زمانہ میں جو عوام اور حکومت کے درمیان تصادم ہوا کرتا تھا تو اس سے طبیعت کو مسرت ہوتی تھی مگر پاکستان میں عوام اور حکومت کے مابین ذرا سی بھی تلخی اور برہمی دیکھ کر دل کو بڑا دکھ پہنچتا ہے کہ اس ٹکراؤ سے پاکستان کو برابر نقصان پہنچ رہا ہے، پاکستان میں ارباب اقتدار اور عوام کے درمیان جو کشمکش اب تک برپا رہی ہے اور سہروردی صاحب نے اس کو تیز کر دیا ہے، اُس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے حاکم عوام کی مرضی سے بے پروا ہو کر اپنی چلتی چلانا چاہتے ہیں۔ اُن کو عوام کے رجحانات، معتقدات، مطالبے اور تمنائیں رتی رتی بھر معلوم ہیں مگر پھر بھی وہ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ طاقت کے زور پر یا ڈپلومیسی کے داؤں پیچ سے عوام پر اپنی مرضی کو مسلط کر دیں!

پاکستان میں اب تک عوام کو آئینی جدوجہد کے ذریعہ کامیابی ہوئی ہے اور اب بھی انشاء اللہ ہوگی، دوسروں کی اشتعال انگیزی اور غیر قانونی حرکتوں کے باوجود عوام مسلمانوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے جوش کیساتھ ہوش کا رہنا ضروری ہے۔ فساد و انتشار کمیونسٹوں کے حربے ہیں، مسلمانوں کو ایسی باتوں کے پاس بھی نہیں، پھٹکنا چاہیے!

عوام مسلمان حالات کی اس نئی کروٹ کو دیکھ کر بددل اور پریشان نہ ہوں، ان جابروں کی نمود بھی بس کوئی دن کی بات ہے، انشاء اللہ سطح پھر ہموار ہو جائیگی، حق کو ایک نہ ایک دن غالب آنا ہے۔ اس قسم کے اضطراب و برہمی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمانا چاہتا ہے کہ کس کے پاس اخلاق و ایمان کی کتنی قوت ہے اور حق و باطل کی کشمکش میں کون کیا پارٹ انجام دیتا ہے؟

یہ حقیقت سورج کی روشنی اور چاند ستاروں کی چمک سے زیادہ روشن ہے کہ پاکستان کے سات کروڑ مسلمان پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں، اس لئے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ چند مٹھی بھر انسان اپنی مرضی طاقت کے زور سے سات کروڑ مسلمانوں پر مسلط کر دیں! پاکستان میں اللہ کا قانون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی چلیگی، ناچ گھروں اور شراب خانوں سے جاری کئے ہوئے فرمانوں اور ہدایت ناموں کو پارہ پارہ کر دیا جائیگا کہ مسلمان اللہ اور رسولؐ کے منشور کا پابند ہے اور یہی اسکی زندگی کا مقصود اور غایت ہے!

آخر میں ہم یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کی آئیڈیالوجی پر بنا ہے، اقتصاد و معیشت کی بنیاد پر نہیں بنا۔ اگر چیزوں کی قیمت کا سستا ہونا اور پوشاک و خوراک کے مسائل کا حل ہی مقصود تھا تو پھر متحدہ ہندوستان میں کیا برائی تھی، انسانی ضروریات کی فراہمی میں آسانیوں کا پیدا ہونا بہت اچھی بات ہے اور ہر فرض شناس حکومت کو یہ کام کرنا چاہیئے لیکن ان سہولتوں اور منفعتوں کیلئے مسلمان اپنے اسلامی تقاضوں سے دست بردار نہیں ہو سکتا، مسلمان اپنے شکم کی سیرابی بیشک چاہتا ہے مگر ایمان کی قیمت پر نہیں! مسلمان "بندۂ شکم" نہیں ہے، اُس نے اپنے معدہ سے نہیں بلکہ اللہ سے پیمان وفا باندھا ہے اور اس پیمان کے مقابلہ میں تمام دُنیا کی نعمتیں اُس کی نگاہ میں پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں!

روٹی۔ کپڑا، مکان، روزگار ۔۔۔ اسلام کے سایہ میں

یہ ہے مُسلمان کا مطالبہ اور اُس کی دلی تمنا! دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی دُنیوی منفعت بھی ایمان کی قیمت نہیں ہو سکتی، مسلمان کے اندر جب تک ایمانی احساس زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہیگا، اسوقت تک کسی طاقت، دھمکی اور چیلنج سے وہ مرعوب نہیں ہو سکتا اور نہ اُس کی فراست کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، باطل چاہے کسی روپ اور بھیس میں کیوں نہ آئے مُسلمان کی فراست "انداز قد" ہی سے سب کچھ پہچان لیتی ہے کہ کون کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم ساری دُنیا کو امن و اخلاق اور صلح و آشتی سے معمور کر دیں۔ یہاں تک کہ اللہ کی زمین اُس کے نور سے جگمگانے لگے۔ (آمین!)

ماہر القادری ۱۳ / اکتوبر سنہ ۵۶ء

مولانا محمد یعقوب (لائلپور)

مناظرہ بازی

فن مناظرہ کی مشہور عربی کتاب (رشیدیہ) میں مناظرہ کی غرض وغایت اور شرائط مناظرہ پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ دورِ حاضر کے مناظرہ باز حضرات بوقت مناظرہ ان شرائط کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھتے۔ بلکہ آجکل کے فنی مناظرین مناظرہ کی بجائے مشاجرہ ومخاصمہ کرتے ہیں۔ مناظرہ کے دوران شرافت ومتانت وسنجیدگی ان سے کوسوں دور ہو جاتی ہے۔ جب ایک فریق اپنی شکست محسوس کرتا ہے تو وہ اپنی خفت وندامت کو مٹانے کے لئے مقابل مناظر پر طرح طرح کے الزام اور تہمتیں لگا دیتا ہے۔

اب میں مذکورہ بالا کتاب سے مناظرہ کی تعریف، غرض وغایت اور شرائط تحریر کر کے فیصلہ قارئین کی رائے پر چھوڑتا ہوں:۔

تعریف مناظرہ:۔ ھُوَ علمٌ یُعرفُ بہٖ کیفیۃ آداب اثبات المطلوب او نفیہ او نفی دلیلہ مع الباحث المخاصم۔ یعنی مناظرہ ایک ایسا علم ہے جو مطلوب کے اثبات ونفی اور مقابل مخاصم کے دلائل کی تردید کے طور وطریق پر سکھاتا ہے۔

مقصد مناظرہ:۔ اظہاراً للصواب ان یکون نیۃ المناظر من المناظرۃ اظہار الصواب وان لم یظھر عصبیۃ:۔ یعنی مناظرہ کا مقصد حق کو ظاہر وغالب کرنا ہے یعنی مناظر کا ارادہ یہ ہو کہ حق اور صحیح بات ظاہر ہو اور غلط اور باطل مٹ جائے۔ دلائل وبراہین میں دیانت سے کام لیا جائے۔ استنباط واستدلال کا صحیح اور معقول طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر مخالف حق پیش کر رہا ہو اور اس کے دلائل بھی وزنی ہوں تو پھر تعصب کو بالائے طاق رکھ کر قبول حق میں تاخیر نہ کی جائے اور عین مناظرہ کے دوران اپنے دعاوی سے رجوع کر کے فریق ثانی کے دعاوی کے تسلیم کر لینے کا پوری جرأت وہمت کے ساتھ کھلا اعلان کر دیا جائے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ آجکل کا مناظر خواہ کسی قدر حق پرست، متقی، پرہیزگار، بااخلاق اور نیک نیت ہی کیوں نہ ہو۔ اگر یہ اس کی مطابق خیال نہیں بنتی ہیں تو وہ فریق ثانی کے مناظر کی پیش کردہ صحیح سے صحیح اور سچی سے سچی دلیل کو نخوت و استکبار کے ساتھ ٹھکرا دے گا۔

شرائط مناظرہ:۔ الاول انہ یجب علی المناظر ان یحترز عن الاختصار فی الکلام عند المناظرۃ کیلا یخل بالفھم۔ یعنی مناظر پر لازم ہے کہ مناظرہ کرتے وقت مختصر کلام سے اجتناب کرے اپنے مطلب ومدعا کو اچھی طرح پبلک پر واضح کرے۔

والثانی:۔ ان یحترز عن التطویل لئلا یودی الی الاملال۔ دوسری شرط یہ ہے کہ لمبی تقریر بھی نہ کرے تاکہ سامعین اکتا نہ جائیں۔

الثالث:۔ ان لا یستعمل الالفاظ الغریبۃ۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اجنبی اور غیر مانوس الفاظ استعمال نہ کرے بلکہ عام فہم اور سادہ ودلنشین الفاظ کے ساتھ مطلب بیان کرے۔

الرابع:۔ ان لا یستعمل المجمل المحتمل المعنیین بلا قرینۃ معینۃ للمراد۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ تقریر میں ایسے

جملے قطعاً نہ استعمال کرے جو ذومعنی ہوں یعنی جن جملوں کے کئی معنی مراد لئے جاسکتے ہوں۔ ہاں البتہ ایسا جملہ جس کے ساتھ کوئی قرینہ ہو جو اس کے مفہوم کو واضح کردے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

والخامس:۔ ان یحترز عما لا دخل له فی المقصود ولئلا یخرج الکلام عن الضبط ولئلا یلزم البعد عن المطلوب۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ مناظر غیر متعلق کلام نہ کرے یعنی ایسا کلام نہ کرے جو اس کو مقصود و مطلوب سے بہت دور پھینک دے اور جس کا دعوے کے ساتھ کوئی قریب و بعید کا تعلق بھی نہ ہو۔

والسادس:۔ ان لا یضحک ولا یرفع الصوت ولا یتکلم بکلام السفہاء عند المناظرۃ لانہما من صفات الجہال ووظائفہم لانہم یستترون بہا جہلہم۔

چھٹی شرط:۔ مناظر کو دوران مناظرہ ہنسا نہیں چاہیئے اور نہ بلند آواز سے تقریر کرے۔ مناظرہ کرنے وقت کوئی خلاف عقل بات منہ سے نہ نکالے۔ بیوقوفوں کی حرکات وعادات سے پرہیز کرے کیونکہ یہ جاہلوں کی صفات ہیں اور ان جیسی حرکات سے وہ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ طنز واستہزاء جاہل لوگوں کا شیوہ ہے۔

یہ شرط تو تقریباً تمام مناظر حضرات میں مفقود ہے۔ ہر مناظر اپنے مقابل کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے برسر مجلس ہر قسم کا استہزاء کرتا ہے۔ بعض لوگ ان حرکات مذبوحی کو ظرافت وخوش طبعی اور حاضر جوابی پر محمول کرتے ہیں۔ الغرض ان مذکورۂ بالا شرائط میں سے کسی ایک شرط پر بھی عمل نہیں کیا جاتا۔ تعلّی وتفاخر ومسابقت مناظر حضرات کا عام شیوہ بن گیا ہے۔

حالانکہ اسی کتاب کے آخری صفحہ پر مناظر کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ بوقت مناظرہ درویشانہ وفقیرانہ صورت وہیئت بنا کر بیٹھے نہ کہ امیرانہ ومتکبرانہ شان وشوکت کے ساتھ۔ کیونکہ تواضع وانکسار پر اللہ تعالٰی کی نصرت وتائید شامل حال ہوتی ہے۔ اپنے سے زیادہ صاحب علم سے مناظرہ کا تصور بھی نہ کرے اور نہ کسی کو مناظرہ کے لئے چیلنج دے۔ کیونکہ اس مشغلہ میں تعمیری پہلو کی بجائے تخریبی پہلو نمایاں ہے۔ تعمیری اور اصلاحی کام کرنے والے مناظرہ بازی سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ اور اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔

مناظرہ کا مشغلہ دراصل ذہنی عیاشی ہے۔ جسے عباسی خلفاء نے اپنایا۔ عباسیہ کے دربار میں پارسی، مانوی، یہودی عیسائی، ہر فرقہ اور ہر ملت کے افراد علماء موجود تھے۔ دربار ہی میں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اکثر اوقات خلیفہ خود مناظرہ کا ایک فریق ہوتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ نہایت آزادی وبے باکی اور دلیری سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے کہ خلیفہ کا کیا مذہب اور کیا اعتقادات ہیں۔ بنو امیہ کے زمانہ تک یہ مباحثے اور مناظرے مسلمانوں میں محدود رہے۔ لیکن عباسیوں کے عہد میں یہ دائرہ اور وسیع ہوا۔ عباسیہ کے زمانہ میں تعلیم کو نہایت وسعت ہوگئی۔ مجوسی، یہودی، عیسائی وغیرہ اسلامی درس گاہوں میں علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اس وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی خیالات و اعتقادات سے واقف ہونے کا انھیں موقع ملتا تھا۔ اس کے ساتھ عباسیوں نے لوگوں کو مذہبی آزادی بھی دے رکھی تھی۔ ہر شخص جو چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ اس طرح دوسری قوموں کو موقع ملا کہ لوگوں میں الحاد و زندقہ پھیلائیں اور اسلامی عقائد پر ردّ وقدح کریں۔ چنانچہ اس دور میں اسلامی اصول وعقائد پر شبہات واعتراضات شروع ہوگئے۔ اہل اسلام کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے غیر مسلم اقوام کے رہنماؤں اور مناظرہ بازوں نے باقاعدہ منظم مہم جاری کردی۔ اب خلفائے عباسیہ کو ہوش آیا۔ غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے۔ اسلام پر پُرزور حملوں کی

مدافعت کے لئے زمانہ کے مشہور ترین علماء فضلاء کو جمع کیا اور اُنھیں جوابات لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ علمائے دین نے خلوصِ نیت اور مقدس ارادہ کے ساتھ بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں مخالفین کے شبہات کا عقلی و نقلی دلائل سے مدلل و معقول طرز سے ردّ کیا گیا۔

یہ تو تحریری مناظرے تھے۔ بعد ازاں تقریری مناظرے بھی شروع ہو گئے۔ اُس وقت کے حالات اس فن کے متقاضی تھے۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں سکوت کی پالیسی اسلام کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ منطق و فلسفہ کو بھی عروج نصیب ہو رہا تھا۔ منطقی طرزِ استدلال کا رواج روز افزوں ترقی پر تھا۔ مگر افسوس کہ یہ اسلحہ جو اغیار کے لئے ایجاد ہوا تھا اب اپنوں پر استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مسلمان متعدد فرقوں میں بٹ گئے اور ہر فرقہ نے دوسرے فرقہ کو ضال و مضل کہنا شروع کر دیا۔ پھر اپنے عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک دوسرے کو چیلنج دیئے گئے۔ سنجیدگی و متانت غائب ہوتی گئی۔ جدال و مخاصمت نے زور پکڑ لیا۔ بر سرِ بازار ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی گئی۔ اور یہ افہام و تفہیم رفتہ رفتہ مجادلہ اور مخاصمہ بن گئی۔

علمی دُنیا میں نظریوں کا اختلاف اور پھر اُس اختلاف پر فریقین کا گفتگو کرنا کوئی بے جا بات نہیں ہے۔ اگر مقصد احقاقِ حق ہو تو پھر اس قسم کے مناظرے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں اور بہت سے مسائل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہوتا یہ رہا ہے کہ لوگ اپنی بات کی پچ کے لئے وزنی سے وزنی دلیلوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور کتاب و سنّت تک سے اعراض برتنے میں اُنھیں باک نہیں ہوتا۔ اس قسم کے مناظروں سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے؛ مناظرہ کرنے والے جب پہلوانوں کی طرح اکھاڑے میں اُترنے لگیں تو پھر ان کشتیوں کا انجام معلوم!!

ماہر القادری

حرفِ آخر

نئے رسالوں اور کتابوں پر "فاران" میں جس طرح تبصرہ ہوا کرتا ہے، اسی طرح نو مولود ماہنامہ "تاج" پر بھی ماہ جون کے شمارے میں ریویو کیا گیا تھا اور اس رسالہ کے ان مضامین پر جو دینی نقطہ نگاہ سے قابلِ اعتراض تھے نرم سے نرم لفظوں میں گرفت کی گئی تھی۔ احتساب ماہنامہ تاج کی مندرجہ ذیل عبارتوں پر تھا:-

(۱) "...... افسوس اور کمال افسوس ہے کہ علماء کبار نے شرق سے لے کر غرب تک، سلف سے لے کر خلف تک، کیا محدث، کیا مفسر، کیا مجتہد، کیا متکلمین، کیا متفقہین، سب نے کلمہ طیبہ کی اس ... مقام سے تحریف کر ڈالی اور اس کو محکم سے متشابہ کی طرف لوٹا دیا۔ پس انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہہ کر شرک سے بچایا اور لا الٰہ غیر اللہ کا اعتقاد رکھ کر دل سے شرک کیا اور نہ جانا کہ یہ غیریت اور تفرقہ کہ جس کے وہ معتقد ہیں "لا الٰہ الا اللہ" کے مخالف ہے۔"

اس عبارت کی رُو سے سلف سے لے کر خلف تک کے تمام علماء، کیا محدثین، کیا مفسرین اور محدثین، کیا مجتہدین اور ائمہ فقہ، سب کے سب (خاک بدہن گستاخ) ارتکاب شرک کے مجرم اور کلمہ کے محرفین قرار پاتے ہیں۔ اس عبارت میں کوئی اینچ پینچ بھی نہیں ہے۔ اور یہ اس قسم کے الفاظ ہیں کہ کسی کے دل میں ذرا سا بھی خدا کا خوف ہوگا تو وہ ان لغو اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ لفظوں کی تاویل کرنے کی بجائے ان سے اپنی برأت اور بیزاری ظاہر کرے گا، اس قسم کے ہذیانات کی تاویل "بناء فاسد علی الفاسد" کا مصداق ہو گی۔ مگر ماہنامہ "تاج" کے مدیر اعلیٰ نے جو اپنے رسالہ کو "اُردو زبان میں تصوفِ اسلام کا پہلا ترجمان" کہتے ہیں اور خود بھی معارف و اسرار کی عقدہ کشائی کے دعویدار ہیں۔ اس لغو عبارت کی تاویل فرمائی۔ بلکہ اُسے درست قرار دیا۔

اور پھر حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ جو خدا کے نیک بندے توحید خالص کے مبلغ و منادی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مشکل کشا ہے اور نہ داتا اور غریب پرور ہے، اُن پر اولیاء اللہ کی "معادات" کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ مگر اس کے برخلاف جو خلف سے لے کر سلف تک کے تمام محدثین، مفسرین اور ائمہ فقہ کو کلمہ کا محرف اور مرتکب شرک قرار دے کر اولیاء اللہ اور صلحاء اُمت کی کھلی ہوئی توہین کرتے ہیں۔ ان کو "عالم ربانی" اور "قطبِ عالم" سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے عقائد کو، ملفوظات کو کشف و الفاء کو دین کی بہت بڑی ضرورت قرار دے کر "احسان" کی تفسیر کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔

جو لوگ اس قسم کے لطائف و شطحیات میں اُلجھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اس قسم کے انتہائی خطرناک نکات

اور غیر ذمہ دارانہ شوخ افکار کی تبلیغ کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہو تو وہ اللہ کے دین اور کتاب و سنت کے ساتھ جو سلوک بھی کر گزریں تھوڑا ہے

(۳) "وہ خدائے پاک ذات ہی ہے جو مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے۔ اور جو فرائض و واجبات حقوق الٰہیہ کی صورت میں مخلوق پر متعین فرمائے ہیں وہ اپنے آپ پر ہی متعین فرمائے ہیں۔" (فتوحات مکیہ)

اس پر فاران میں یہ تبصرہ کیا گیا تھا:-

"ان جملوں کی خطرناکی کی کوئی انتہا ہے! اگر یہ "حقائق و اسرار" ہیں اور کشف و وجدان کی نزاکتیں ہیں تو کیا اس طرح اُن کا افشاء مناسب ہے۔" (فاران۔ ماہ جون ۵۶ء)

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ "وہ مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے"۔ کیا اس سے "حلول و تجسم" کی بو نہیں آتی۔ کیا اس قسم کی فکر و وجدان کی شوخیاں اسلامی فکر کی سادگی سے مطابقت رکھتی ہیں؟ ایسی باتوں سے اس کے سوا اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوں اور عبد و معبود کے درمیان جو عبدیت کا تعلق ہے، اُس پر آنچ آئے۔

تصوف کی کتابوں میں سے اس قماش کی خطرناک عبارتوں کو چھانٹ چھانٹ کر عوام کے سامنے پیش کرنا کیا صلاح کا موجب ہوگا یا فساد کا؟ اگر اس قسم کے شطحیات کو بفرضِ محال "اسرار و غوامض" ہی سمجھ لیا جائے تو عوام کیا اس کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ خود ماہ اگست کے "تاج" میں صفحہ ۴۴۔ اور ۴۵ پر یہ عبارت ہمیں ملتی ہے:-

"حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کہ میں اس آیت کی تفسیر بیان کروں تو مجھے تم کافر کہو گے یا سنگسار کر دو گے۔ یہ قول بھی اس امر کا مؤید ہے کہ عوام اسرار و معارف کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ..... "

جب حضرت ابن عباسؓ کے زمانہ کے عوام جن میں تابعین بھی شامل تھے "اسرار و معارف" قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ نے "اسرار و معارف" کے افشاء کو مصلحت کے خلاف سمجھا تو کیا چودھویں صدی ہجری کے عوام میں اس کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ "اسرار و معارف" کو سمجھ سکیں۔ حالانکہ حضرت ابن عباسؓ کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت عہد سے بالکل متصل تھا۔ اُس دور کے خیر و برکت اور دینی فہم کا کیا کہنا۔ اُس دور کے عوام ہمارے خواص سے بہتر تھے اور ہمارے زمانہ میں تو فتنے گھاس کی طرح اُگ رہے ہیں اور عوام سچ مچ "کالانعام" ہو گئے ہیں! "اسرار و غوامض" کے افشاء کے لئے یہ دور کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس سے نقصان ہی نقصان پہنچے گا!

رسالہ "تاج" تصوفِ اسلام کے نام پر جس خطرناک تعلیم کا مبلغ و ناشر بن کر منظر عام پر آیا ہے۔ وہ نہ دین کی کوئی ضرورت ہے اور نہ دنیا کا اس سے کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ اس تعلیم و تلقین میں خطرناک قسم کی الجھنیں اور وسوسہ پیدا کرنے والے رموز و ابہام ہیں۔ رسالہ "تاج" کا حال اس طبیب کا سا ہے جو مریضوں کا علاج سنکھیا اور کچلے سے گھٹ کر کسی دوا سے نہ کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہا پسندانہ طریق علاج مریضوں کے حق میں مضرت رساں اور خطرناک ہی ثابت ہوگا۔ اور اس مریض کی نادانی پر ہر انسان کو ترس آئے گا جو اپنے کو ایسے خطرناک اور انتہا پسند طبیب کے حوالے کر دے!

(۴) ماہ جون کے "فاران" میں بابا تاج الدین ناگپوری کو "شہنشاہ ہفت اقلیم" کہنے پر بھی گرفت کی گئی تھی کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسان کو بھی " بادشاہوں کا بادشاہ " کہنے کی ممانعت فرمائی ہے!

عقیدت کا یہی وہ غلو ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیرایہ میں روکا ہے:۔

" مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو "۔

صحابہ کرام سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدائی اور عقیدت مند اور کون ہو سکتا ہے انہوں (رضی اللہ عنہم) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو " مالکِ دوجہاں " اور " شہنشاہ کونین " جیسے غیر محتاط القاب سے نہ رسول اللہ کی حیات میں حضورؐ کو مخاطب کیا اور نہ وفات کے بعد!

کسی پیر، فقیر یا عالم کو " شہنشاہ ہفت اقلیم " کہنا اسلام کی تعلیم کے مزاج کے خلاف ہے! یہ " لقب " اپنی تفصیلات میں جاکر ان گمراہ عقائد تک پہنچتا ہے کہ فلاں بزرگ کا ہفت اقلیم میں حکم چلتا ہے اور وہ مرنے کے بعد۔ لوگوں کی فریاد سنتے ہیں اور حاجت روائی کرتے ہیں!

عقیدت کے اس غلو کی کم سے کم مضرت یہ ہے کہ بعض لوگ انبیاء کرام اور صحابہ عظام کے اسمائے گرامی کے ساتھ تو " حضرت " لکھتے ہیں مگر اپنے بزرگوں کو " اعلیٰ حضرت " لکھتے ہیں۔ یہی عقیدت کا غلو تھا جس نے خدا کے بندے مسیح (علیہ السلام) کو " ابن اللہ " بنا ڈالا۔ اور بادشاہوں کو مالکِ رقابِ امم اور قدرِ قدرت کا لقب دیا گیا!

(۵) " ...... (بابا تاج الدین ناگپوری نے) جبہ مبارک اتار دیا اور ہماری طرف پھینک کر فرمایا:۔

" لے تیری شریعت تجھے مبارک "۔

اور

(۶) " ایک روز فرمایا بتاؤ بابا کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ ہم کو حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ " پیشِ خبیر کیا مجھے حاجت خبر کی ہے "۔ فرمایا۔ کوئی ولی قوسِ ولایت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک جناب سیدہ اس کی تربیت نہ فرمائیں "۔ ......

قوسِ ولایت میں بابا کی تربیت جناب سیدہ نے فرمائی تو آپ مرتبہ ولایت پر فائز ہوئے ..... "

ان عبارتوں پر بھی " فاران " میں تنقید کی گئی تھی۔ ہم اہلِ فکر و نظر کے انصاف سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان عبارتوں کو پڑھیں اور پھر فیصلہ فرمائیں کہ یہ اقتباسات قابلِ گرفت ہیں یا نہیں ہیں!

ماہنامہ " تاج " کے مدیر اعلیٰ نے ان اقتباسات میں سے کسی ایک اقتباس کی مضرت یا کم سے کم ان کی بے احتیاطی کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ان کی وہ وہ تاویلیں کیں اور ایسے ایسے عجیب و غریب معنی پہنائے کہ شرح و تفصیل میں جاکر ان داغ دھبوں کی سیاہی پھیکی ہونے کے بجائے اور پھیلتی اور گہری ہوتی چلی گئی!

ہر برائی، ہر لغزش اور ہر فاسد عقیدہ کی تاویل کی جا سکتی ہے اور کی جاتی رہی ہے۔ کونسا گمراہ عقیدہ ایسا ہے جس کے لئے کتاب و سنت سے دلیلیں نہ لائی گئی ہوں۔! قادیانی جو تمام مسلمانوں کے نزدیک بالاتفاق کافر اور خارج از اسلام ہیں، وہ تک اپنے فاسد عقاید کے لئے قرآن و حدیث ہی سے دلیلیں لاتے ہیں۔ اور شیخ محی الدین ابن عربی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریریں اپنے موقف کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ جس قرآن سے لوگوں نے " تجسم " ثابت کیا ہے، اسی سے " وحدت الوجود " کے لئے بھی دلیلیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔ اور کی گئی ہیں۔ مگر ان کا وزن کیا ہے؟

اب رہا مخصوص عقاید کا پھیل جانا اور چل پڑنا تو اس دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ اور یزید کو بہت بڑا آدمی بلکہ اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ اور ان تمام گمراہیوں کے لئے طرح طرح کی تاویلیں، نکتہ آفرینیاں اور دلیلیں یہ لوگ رکھتے ہیں! مسلمانوں کی کس بدعت اور مشرکانہ رسم کے لئے دلیلیں نہیں تراشی گئیں۔ اور ان کو کتاب و سنت کے مطابق ثابت نہیں کیا گیا!

اندازِ فکر

ماہ ستمبر کا ماہنامہ "تاج" ہمارے سامنے ہے۔ جس میں "فاران" کے تبصرہ پر بڑے پُرجوش انداز میں پھر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے سرنامہ پر اقبال کا یہ شعر درج ہے ؂

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس شعر کی لفظی صنعت اور معنوی محاسن اپنی جگہ مُسلّم! لیکن اس مقالہ میں جو مضامین پیش فرمائے گئے ہیں اور جیسی جیسی تاویلیں کی گئی ہیں۔ اُن کے لحاظ سے یہ شعر اس مقالہ کے ساتھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ افسوس!

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی! (جمیل مظہری)

اس مقالہ میں کہیں "صالح ادب" پر چوٹیں ہیں۔ کہیں مولانا مودودی پر طنز و تعریض ہے۔ کسی جگہ "مدیر فاران" کی تبدیلیٔ عقائد پر پھبتیاں ہیں۔! ...... عفاک اللہ نکو گفتی"! میں ذہین صاحب کو یہ تفصیل کس طرح سمجھاؤں کہ عرس و مزار اور پیر پرستی کے نام پر جو کھیل تماشے اور بدعتیں ہو رہی ہیں، میں نے ایک زمانہ میں ان سب کا جائزہ لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ میری لغزشوں کو معاف فرمائے، میں خود ان میں مبتلا رہا ہوں۔ لیکن جب کتاب و سنت اور آثار و باقیات[1] کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ میں اب تک بڑی تاریکی میں تھا۔ ان میں کی بہت سی رسمیں نری بدعتیں ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حال سیرت کی کتابوں میں پڑھا۔ اور اس میں یہ کہیں نظر نہیں آیا۔ کہ صحابہؓ نے آپ کا تیجا، دسواں یا چالیسواں کیا ہو۔ یا کھانے پر حضور کے نام کی فاتحہ دلائی ہو۔ یا مزارِ مبارک پر پھولوں کی چادریں ڈالی ہوں یا بارہ ربیع الاول کو صحابہ نجد و حجاز اور یمامہ و یمن سے چل چل کر حضورؐ کے عرس میں شرکت کے لئے آتے ہوں اور قبرِ اقدس کے سامنے لوگ دف اور نفیری بجا بجا کر نعتیہ اشعار گاتے ہوں اور رقص کرتے ہوں۔ اس کے بعد دوسری باتوں کا تفحص کیا اور کھوج لگایا تو حقیقتِ حال واضح ہوتی چلی گئی یعنی کیا اصل ہے اور کیا اُس پر زیادتی ہے!

میں اللہ کے فضل و کرم پر اعتماد کر کے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ مشرکانہ رسموں اور بدعتوں میں سے اگر کوئی ایک بدعت کی اصل حقیقت کا پتہ لگانے پر اپنا وقت صَرف کرے تو نفسِ حقیقت کا انکشاف ہو کر رہے گا۔ اور یہ ایک ہی گرہ دوسری گرہوں کو بھی کھول دے گی۔ اس حقیقت کے انکشاف سے اہلِ بدعت کے استدلال، طرزِ فکر اور ذوق و وجدان کھل کر سامنے آجائیں گے۔

اہلِ بدعت کا یہ عجیب اندازِ فکر ہے کہ جہاں کسی نے کہا کہ "من دون اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا، کسی غیر سے چاہے وہ انبیاء و اولیاء ہی کیوں نہ ہوں، استعانت اور استخانہ کی اللہ نے ممانعت فرمائی ہے۔ تو وہ جھٹ سے اعتراض جڑ دیتے

[1] تابعین کرام کے اقوال و افعال کے لئے میں یہ لفظ "باقیات" استعمال کرتا ہوں۔

ہیں کہ یہ شخص بڑا ہی منہ زور اور گستاخ ہے کہ اس نے پتھر کے بتوں، مورتیوں اور دوسرے انسانوں کے درجے میں انبیاء و اولیاء کو لاکر رکھدیا۔ اور اسی قیاس پر وہ عجیب عجیب عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ چونکہ .... لہٰذا .... پس یہ ثابت ہوا ......!

حدیث بتاتی ہے کہ شیطان آدمی کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ تو کیا اس حدیث کی بناء پر یہ اعتقاد بھی رکھنا چاہیئے کہ اولیاء اللہ بھی انسانوں کے جسموں میں خون کی طرح گردش کرتے ہیں اور جو کوئی یہ اعتقاد نہیں رکھتا وہ اولیاء اللہ کو شیطان سے بھی کمتر سمجھتا ہے، اس لئے "معادات اولیاء" کا مرتکب ہے پس وہ گمراہ اور راندہ درگاہ ہے! یہ کیا اندازِ فکر ہے؟

آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ مگر وہ دریائی جانوروں کی طرح سمندر اور دریا میں نہیں رہ سکتا۔ تو انسان کے مخلوقات پر اشرف ہونے کے وصف کو ثابت کرنے کے لئے کیا اس کا ماننا بھی ضروری ہے کہ اُس میں دریائی جانوروں کی قدرت بھی ثابت کی جائے یا اُس میں لازماً یہ قدرت ہونی ہی چاہیئے اور جو کوئی انسان میں اس قدرت کو نہ مانے وہ انسان کے رتبہ کو گھٹاتا ہے اُسے مچھلیوں اور مگر مچھوں سے بھی کمتر سمجھتا ہے!

آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ مگر ہاتھی اور اونٹ اور گھوڑے کی برابر جسامت نہیں رکھتا۔ پرندوں کی مانند ہوا میں نہیں اُڑ سکتا۔ ہرن کی طرح تیز نہیں دوڑ سکتا۔ تو کیا انسان میں یہ مادّی اوصاف نہ پائے جانے سے اُس کے شرف میں کوئی کمی آجاتی ہے؟ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ یہ شرف تمام محاسن و اوصاف پر بھاری ہے!

ہدہد ملک سبا کی خبر لے کر آتا ہے اور کہتا ہے:۔

"فقال احطت بما لم تحط به وجئتك من سبا بنبا يقين" (النمل)

کہا، میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ جس کی تجھ کو اُس کی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لے کر

ہدہد کا سلیمان علیہ السلام سے یہ کہنا کہ "میں ایسی چیز کی خبر لایا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی"۔ کیا اس سے خدانخواستہ حضرت سلیمانؑ نبی پر ہدہد کی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ اولیاء اللہ تمام کائنات کے احوال کی خبر اور تمام مقامات پر نظر رکھتے ہیں۔ اُن پر قرآن کا یہ بیان گراں گزرے گا!

یہ سوچنے کا انداز ہی غیر اسلامی ہے کہ فلاں مخلوق میں یہ قوت پائی جاتی ہے تو انسان میں بھی اُس قوت کا پایا جانا لازمی ہے۔ ورنہ انسان اس مخلوق سے کمتر سمجھا جائے گا۔ یا حضرت میکائیل علیہ السلام رزق کا پیمانہ رکھتے ہیں۔ تو انبیاء کرام جو فرشتوں سے بھی افضل ہیں، اُن کو بھی رزق کے بندوبست اور تقسیم پر دسترس ہونی چاہیئے۔ اور جو کوئی انبیاء کرام کی یہ قدرت اور صفت تسلیم نہ کرے گا وہ اُن کی شان گھٹانے کا مجرم ہوگا۔ اس انداز کی منطق یونان و روما کے اہلِ دانش اور بھارت کے گیانیوں اور بدھ مانوں کی ہو تو ہو مگر اسلامی مفکرین نے ان مسائل کو اس طرح نہیں سوچا!

خطرناک اندازِ بیان

"هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ عليم"

اس آیت سے جو حضرات "وحدت الوجود" ثابت کرتے ہیں اور پھر یہ نظریہ اُن کو اس حد تک پہنچا دیتا ہے:۔

"وہ خدائے پاک کی ذات ہی ہے جو مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے، اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے اور جو فرائض و واجبات حقوق الٰہیہ کی صورت میں

مخلوق پر متعین فرمائے ہیں وہ اپنے آپ ہی متعین فرمائے ہیں"۔ (رسالہ "تاج" اردو ترجمہ فتوحات مکیہ)

اس پر نظر کرتے ہوئے ایک شخص جو "وحدت الوجود" کو دین کا مسئلہ نہیں سمجھتا، "وحدت الوجود" کی خطرناکیوں کو ذہن میں رکھ کر اس آیت کا ان لفظوں میں مطلب بیان کرے:-

"اللہ تعالیٰ کی ذات ہی (ہر) اول و آخر اور (ہر) ظاہر و باطن کی خالق و رب ہے"۔

تو اس میں الحاد و زندقہ کی کیا بات ہے؟ مندرجہ بالا عجیب و غریب کا نظریہ ہے، اس کی خطرناکی اور پیچیدگی اور اس "مطلب" کی سادگی کا ناظرین مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ہم نے اپنے مضمون میں اس آیت کے اس ترجمہ:-

"وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے"۔

کی صحت سے خدا نخواستہ انکار نہیں کیا؟ ہمارا اس آیت پر اسی طرح ایمان ہے، جس طرح یہ نازل ہوئی ہے۔ یہ اُن آیتوں میں سے ہے جس کے الفاظ معلوم ہیں مگر اس کی کیفیت مجمل ہے، مکشوف نہیں ہے۔

جبر و قدر کا مسئلہ کتنا نازک ہے، اس کی تفصیلات نے کس قدر پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ صحابہ کرام ان مسائل میں نہیں الجھتے تھے۔ مگر جب جبر و قدر کی بحث کا ہنگامہ برپا ہوا تو بندہ کے فعل میں "خلق" و "کسب" کا امتیاز قائم کیا گیا۔ یعنی یہ کہ بندہ کے فعل کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر کاسب بندہ ہے اور اسی "کسب" پر اُسے جزاء و سزاء ملے گی! جو لوگ "جبریین" تھے وہ اس انتہا تک پہنچ گئے تھے کہ کائنات میں محض جبر ہی جبر ہے اور بندہ سے کسی اختیار و تکلیف کی نسبت ہی درست نہیں۔ تو اُن کی اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے "خلق" و "کسب" کا تعین کیا گیا تھا۔

نظریہ "وحدت الوجود" کی خطرناکیوں کے پیش نظر ہم نے اس آیت (ھوالاول ..... والاخر .....) کا جو مطلب بیان کیا تھا، اس کی شرح یہ ہے۔ کہ بندہ ایک کام کا آغاز کرتا ہے تو اس آغاز کا اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ وہ اللہ جو "ھوالاول" بھی ہے اور جب کام ختم ہو جاتا ہے تو اس کے "آخر و اختتام" کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق و ربوبیت سے ہے۔ اُس اللہ سے جو "ھوالآخر" بھی ہے اور آغاز سے اختتام تک کوئی مرحلہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر "شے" کے ظاہر کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اللہ جو "ھوالظاھر" ہے اور اس "شے" کے باطن کا بھی اللہ تعالیٰ ہی خالق و رب ہے۔ وہ اللہ جو "ھوالباطن" ہے۔ ہر شے کے اول و آخر اور ہر شے کے ظاہر و باطن کا اللہ تعالیٰ کو خالق ماننا کس آیت اور کس حدیث کے مخالف ہے! یہ ارض و سمٰوات اللہ تعالیٰ نے خلق فرمائے ہیں۔ تو جب بھی یہ عدم سے وجود میں آئے ہیں وہی ان کا "آغاز و اول" ہے اور اس کا خالق اللہ کے سوا کون ہے۔ ہر شے کے اول و آخر اور ظہور و خفا کا اللہ کی صفتِ خلق و ربوبیت اور شانِ تسخیر و احاطہ ہی سے تعلق ہے کہ وہی "علیٰ کل شیءٍ" ۔۔۔ "قدیر و محیط" اور "بکل شیءٍ علیم" ہے! اور کائنات کے اول و آغاز کا اللہ تعالیٰ کو "خالق ماننے سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اللہ خود اپنا خالق ہے، اسی طرح سے آخر، باطن اور ظاہر کی سادہ جزئیات پر غور کیا جا سکتا ہے:-

"الاول جل شانہٗ - الآخر جل شانہٗ - الظاھر جل شانہٗ - الباطن جل شانہٗ - اللہ کے اسماء مبارکہ ہیں - سب جانتے ہیں صفاتِ الٰہیہ حادث نہیں قدیم ہیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو وہ یہ کلماتِ کفر کہنے کی کبھی جرأت نہ کرتے کہ

اللہ اپنی صفات کا خالق اور رب ہے، استغفر اللہ (نقل کفر کفر نباشد)" (تاج ۔ ستمبر ۵۶ء)

یہ مدیر "تاج" کی نکتہ آفرینی ہے، ہم نے اللہ تعالیٰ کی صفت کی عینیت وغیر عینیت اور حدوث وقدم کی بحث ہی نہیں چھیڑی تھی اور نہ ہمارا یہ منصب ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کی کلامی بحثوں نے سلجھایا کم ہے اور اُلجھایا زیادہ ہے۔ اور ہم نے یہ بھی نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا خالق ہے۔ "خلقِ قرآن" کی بحث ہی نے کتنے فتنے پیدا کئے ہیں۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفت کے تعلق کی بحث کا آغاز کیا جائے اور اُسے موضوعِ گفتگو بنایا جائے۔

ہم نے اول و آخر اور ظاہر و باطن کا سادہ مفہوم لیا تھا۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ (ہر شئے کے) اوّل اور (ہر شئے کے) آخر اور (ہر شئے کے) ظاہر اور (ہر شئے کے) باطن کا اللہ تعالیٰ خالق ہے تو اُس وقت حاشا وکلا یہ خطرہ ہمارے ذہن میں نہیں گزرتا کہ خود اللہ نے اپنی صفات کو خلق کیا ہے (......) ! مدیر "تاج" کے قلب و دماغ میں ایسے اندیشے پیدا ہوتے ہوں تو وہ خود پر دوسروں کا کیوں قیاس کرتے ہیں۔

"اسمِ آخر نے موجودات ممکنات کے حدوث وفنا و زوال کو متحقق کیا اور الظاہر نے اس تکوینی دُنیا کو اپنی تکوینی تجلیوں سے آباد فرمایا...... " (ماہنامہ "تاج" ستمبر ۵۶ء)

لفظوں کی ہیر پھیر کی دوسری بات ہے، ورنہ جو ہم نے کہا ہے مدیر "تاج" بھی اُس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ کہ "الظاہر نے اس تکوینی دُنیا کو اپنی تجلیوں سے آباد فرمایا۔" تو "آباد فرمانے" کا یہ فعل کیا "خلق" کی تعریف میں داخل نہیں ہے، اور اُن کی منطق کے مطابق اُن کی اس عبارت پر بھی یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے خود اللہ کو آباد فرمایا۔

وحدت الوجود کی دعوت پر "تاج" میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ :-

"یعنی اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر تم ڈول کو رسّی باندھ کر زمین زیریں تک لٹکاؤ تو وہ ڈول اللہ پر گرے گا۔" اس کے بعد بطور استشہاد آپ نے یہ آیت "**ھو الاول والآخر والظاھر والباطن و ھو بکل شیئٍ علیم**۔" تلاوت فرمائی"۔

قرآن پاک میں "ید اللہ" آیا ہے، مگر اللہ تعالیٰ تجسم و تجسد سے منزہ ہے۔ اس لئے "ید اللہ" سے اللہ کی قدرت مراد لی جاتی ہے۔ اور یہ مراد قرآن کے منشاء کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی شانِ تنزیہ و تجرید کے عین مطابق ہے، اسی طرح یہ حدیث جو اُوپر نقل کی گئی ہے، اس میں "اللہ پر ڈول گرنے کا" کوئی بھی یہ مفہوم نہیں لیتا کہ اللہ کوئی جسم ہے، جس پر ڈول جا کر گرتا ہے۔ اگر حدیث کے ظاہری الفاظ سے کوئی یہی مفہوم نکالتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم جو زمین پر چلتے ہیں تو معاذ اللہ ــ معاذ اللہ ــ معاذ اللہ ــ ہمارے پاؤں اللہ پر جا کر پڑتے ہیں۔ پس جس طرح "ید اللہ" سے اللہ کی قدرت مراد ہے اسی طرح "اللہ پر ڈول گرنے" سے یہ مراد ہے کہ زمین کی آخری حد تک کوئی شئے اللہ کے احاطۂ علم و قدرت سے باہر نہیں ہے اور پاتال میں بھی کوئی چیز جا کر گرے گی تو وہ اللہ ہی کی حکومت، ربوبیت اور خلق و قدرت کے احاطہ میں جا کر ہی گرے گی۔ قرآن پاک میں اس کیفیت کو "سخر" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس حدیث سے ممکنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عینیت مراد لینے میں ہمیں اس لئے تامل ہے کہ قرآن پاک میں ممکنات کیساتھ اللہ تعالیٰ نے خلق و ربوبیت اور علم و تسخیر کی صفت کا بہ تکرار اظہار فرمایا ہے۔ "عینیت" کا لفظ قرآن میں ایک جگہ بھی نہیں ملتا ہاں! شعر و تصوف میں اس طرح کی اصطلاحیں اور نکتے البتہ ملتے ہیں۔ جو کتاب و سنت کے سمجھنے میں مدد کم دیتے ہیں اور اُلجھنیں زیادہ ڈالتے ہیں۔

اور یہ آیت :-

"ھوالاول والآخر، والظاھر والباطن وھو بکل شئ علیم"

جس سے "وحدت الوجود" پر دلیل لائی جاتی ہے، اس میں خود "وحدت الوجود" کی نفی موجود ہے۔

"وھو بکل شئ علیم"

سے ظاہر ہے کہ "شئ" اور "علیم" میں تعلق وحدتِ وجود کا نہیں بلکہ علم (اور خلق و ربوبیت) کا ہے۔ جیسا کہ بعض یونانی فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو خلق کیا۔ اس کے لئے ایک طبعی قانون بنایا۔ اور اب کائنات کے چلانے اور بنانے بگاڑنے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، سب کچھ طبعی قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے اللہ تعالیٰ اشیاء کا خالق ہے اور خلق کرنے کے بعد اس کا علم و ربوبیت اور قدرت اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر شے سے پہلے اللہ تعالیٰ ہے اور اس سے پہلے کوئی شئے نہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ہر شئے کے آغاز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شئے خلق ہوتی ہے تو وہی اس کا آغاز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق سے ہے ہم نے "ھوالاول ـ والآخر" کو جس طرح سمجھا ہے اور اس کا اظہار کیا ہے اگر مفکر علماء ہماری اس توجیہہ کو اقرب الی المفہوم قرار دیں تو پورے شرح صدر کیساتھ ہم اپنے مدیر تاج کا یہ کہنا۔ "ہر اسم کا مظہر ازلی و ابدی ہے" ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ تصوف کے یہی وہ شوخ نکتے ہیں، جس کے نہ سمجھنے ہی میں ہم جیسے سادہ مزاج لوگوں کے دین و ایمان کی خیر ہے۔

بعض تصوف پسند شاعروں نے بھی ان نازک مباحث میں اس قدر احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے:-

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عینِ اوست

امانمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

شاعر اس نزاکت سے واقف ہے کہ کائنات سے اللہ کی عینیت کے تعلق کا ڈنکے کی چوٹ اظہار ایک حدیثِ نازک اور حکایتِ مشکل ہے!

ذہین شاہ صاحب کو کون سمجھائے کہ حضرت شیخ محی الدین اکبر اور دوسرے صوفی بزرگوں کی وہ تحریریں جو انتہائی نازک، کمال درجہ کی پیچیدہ بلکہ خطرناک ہیں اور ان کا اظہار نہ کوئی دینی ضرورت ہے اور نہ دنیوی ضرورت ہے۔ اُن کو اردو زبان میں منتقل کرکے وہ ایک بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھول رہے ہیں!

اس آخرت فراموش دور میں ہم جیسے گناہگار مسلمانوں کو شاہ صاحب اسلامی اخلاق کی تعلیم دیں۔ آخرت کو یاد دلائیں۔ عذابِ قبر اور عذاب دوزخ سے ڈرائیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون الرشید کو جس طرح نصیحت نامہ بھیجا تھا۔ اس طرح وہ بھی پاکستان کے حاکموں کو ٹوکیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ کام ہے آج کل کے مُصلحین اور راسخون فی العلم کے کرنے کا! اتنے ضروری مسائل کو چھوڑ کر شاہ صاحب جو تصوف کے انتہائی نازک، خطرناک اور غیر ضروری مسائل کو لے بیٹھے ہیں تو اس طرح نہ وہ دین کی کوئی مفید خدمت کر رہے ہیں نہ دنیا کی کوئی ابتری اس سے دور ہو رہی ہے!

اقوال سے رجوع کرنے کیلئے تیار ہیں۔

؎ اس لئے کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کو کائنات کا خالق اور رب فرمایا ہے۔

ایک شمع کو سامنے رکھیے، اُسے روشن کیجیے اور پھر اُسے گُل کر دیجیے - اب اس طرح بحث کا دروازہ کھولیے کہ "جلنے سے پہلے یہ شمع کا شعلہ کہاں تھا اور اب کہاں چلا گیا" - اس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں اور اصطلاح و معانی کا ایک پورا "فن" تیار ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی شمع میں شعلہ کے ہونے اور نہ ہونے کی حقیقت پوری طرح منکشف نہ ہو گی ؎

ہر چند فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل کے مجمع البحرین تھے اور ارشاد و تصوف کے خانوادے کے چشم و چراغ تھے، وہ بھی "وحدت وجود" کو صوفیا کے کشف و شہود کا ایک مسئلہ سمجھتے ہیں:-

"مسئلہ وحدت وجود در شرع صراحۃً نیامدہ نہ در کتاب نہ در حدیث۔ حضرات صوفیہ برائے تائید کشف و شہود خود کہ مدار ایں مسئلہ برہماں است از کتاب و سنت اشارات بر آوردہ اند" (فتاویٰ عزیزی ص۲۸)

اور صوفیاء کا کشف و شہود کوئی "دینی حجت" نہیں ہے - یہ بات ملحوظ رکھیے کہ شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرح تصوف کے مخالف نہیں ہیں بلکہ خود صاحبِ ارشاد و تصوف ہیں - اُن کا یہ فرمانا کہ "وحدتِ وجود کی صراحت نہ کتاب اللہ میں آئی ہے نہ احادیث میں" اس باب میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے -

اگر "وحدتِ وجود" کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ اس سے توحید نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور دھندلکا نہیں رہتا — تو بھی ایک بات تھی - اور "وحدتِ وجود" کی تفصیلات کی تمام خطرناکیوں کے باوجود اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا تھا - مگر رسالہ "تاج" تو "وحدتِ وجود" کو اس شدت کے ساتھ پیش کر رہا ہے کہ جس نے وحدتِ وجود کی روشنی میں "لا الٰہ الا اللہ" کو نہ سمجھا اس نے ارتکابِ شرک کیا - چنانچہ صوفی عبد الرحمٰن لکھنوی کی کتاب کا اقتباس ہم اوپر درج کر چکے ہیں - جو رسالہ "تاج" میں شائع ہوا ہے -

کیا کوئی معمولی عقل بھی اس کو باور کر سکتی ہے کہ کتاب اللہ میں کسی ایسی بات کی صراحت ہونے سے رہ گئی ہو - جس پر مدارِ ایمان ہو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کی صراحت نہ فرمائیں - اور صحابہ کرام کو بھی اس کا "کشف و شہود" نہ ہو - ان حقائق کے ہوتے ہوئے وحدتِ وجود کے مسئلہ میں صوفیا کے "کشف و شہود" کی کیا دینی حیثیت رہ جاتی ہے۔

پھر جو لوگ صوفیاء کے "کشف و شہود" کی مزید صراحت، تشریح اور ترجمانی کر رہے ہیں، وہ ایک ایسا کام کر رہے ہیں - جس کی صراحت نہ کرنے ہی میں اللہ اور رسولؐ کی مصلحت نے انسانوں کے حق میں بھلائی دیکھی۔

"اگر می گوید کہ مراد من آنست کہ در ہر چیز ظہور صفات اوست مثل ظہور صورت رائی در مرآت پس کفر نیست لیکن ترویج ایں کلام کہ موہم خلافِ شریعت ہے در مجالس و محافل خصوصاً در مجمع عوام کہ بغور سخن نمی رسند بسیار مذموم و قبیح است" (فتاویٰ عزیزی ص۲۸)

ترجمہ:- اگر کوئی کہے کہ میری مراد اس (یعنی وحدتِ وجود) سے یہ ہے کہ ہر چیز میں اُس (یعنی اللہ تعالیٰ) کا ظہور اس طرح ہے جیسے دیکھنے والے کی صورت کا ظہور آئینہ میں ہوتا ہے تو یہ کفر نہیں ہے مگر اس کلام کو رواج دینا (یعنی پھیلانا) جو موہم خلافِ شریعت ہے - محفلوں اور مجلسوں میں کہ جہاں عوام کا جمگھٹا ہوتا ہے اور جو بات کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتے، بہت زیادہ مذموم و قبیح ہے -

تو مدیر "تاج" "وحدت الوجود" کے ان خطرناک مسائل کو جن کا رواج دینا شریعت کے مزاج کے خلاف اور انتہائی

مذموم و قبیح بھی ہے، لوگوں میں پھیلا کر ایک فعل مذموم و قبیح کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

معجزہ و کرامت

"مدیر فاران" نے اسی جوابی مقالہ میں لفظی صراحت سے نہ سہی معنوی صراحت سے یہ بتا دیا ہے کہ معجزہ کرامت کا اظہار کسی نبی و ولی سے اعلانِ قرآنی کے خلاف ہے۔" (رسالہ "تاج")

یہ بہت بڑی تہمت ہے جو ہم پر جوڑی گئی ہے۔ "دروغ گویم بر روئے تو" اب تک کتابوں میں پڑھا اور لوگوں کی زبانی سنا تھا۔ اس کی معنویت "مدیر" تاج" کی اس تحریر کو پڑھنے کے بعد سمجھ میں آئی۔ ہماری تحریر میں کوئی معنوی قرینہ اور رمز و اشارہ بیت تک اس بات کی نہیں نکلتی کہ ہم خدانخواستہ معجزہ و کرامات کے صدور کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں انبیاء کرام کے معجزات کا ذکر واضح طور پر پایا جاتا ہے تو کوئی منافق ہی ہوگا جو قرآن پاک پر ایمان بھی رکھے گا اور معجزات کے صدور کو خلافِ قرآن بھی سمجھے گا۔ (نحن براءٌ من ھذہ الھفوات)

لیکن اس کو کیا کیجیے کہ مدیر "تاج" "معجزات و کرامات کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء قبر و برزخ کے مقامات سے لوگوں کی فریاد سنتے اور ان کی دستگیری فرماتے ہیں۔ جو کوئی ان کے اس عقیدہ کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ اُسے وہ بزعمِ خویش معجزات و کرامات کا منکر سمجھتے ہیں۔ اس "قیاس مع الفارق" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے!

کجا می نائی کجا می زنی!

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت خود معجزہ تھی۔ آپ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا بھی معجزہ ہے۔ اور پھر آپ کا دوبارہ دنیا میں آنا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی آیت (نشانی) ہوگا۔ اور یہ بھی سو فی صدی درست ہے کہ آپ کوڑھیوں، اندھوں اور بیماروں کو اچھا کر دیا کرتے تھے اور اللہ کے حکم سے مُردوں کو جِلا دیا کرتے تھے۔ لیکن کیا اس کا بھی کتاب و سنت سے کوئی حکم یا اشارہ نکلتا ہے کہ بیماروں کی شفا کے لئے حضرت مسیح کا نام لے کر دہائی دینی جائز ہے کہ :-

"اے عیسیٰ روح اللہ! اس بیمار کو اللہ کے حکم سے شفا دیدیجئے اور اس مرے ہوئے آدمی میں جان ڈال دیجئے"

اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس طرح کا استغاثہ کرنے کو درست نہیں سمجھتا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی عنوان بھی قرینِ صواب ہے کہ اس عقیدہ کا رکھنے والا سرے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہی کا منکر ہے!

"...... اغناھم اللہ ورسولہ" جو قرآن پاک میں آیا ہے تو جہاں تک حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے۔ اس کا سیدھا، صاف اور واقعات کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے مدینہ میں غلہ کی فراوانی ہوئی۔ وہاں کے باشندوں کے عام مالی حالات درست ہوئے۔ اس سے مومنین صادقین کے ساتھ منافقین بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ اور عام مسلمانوں میں ملے جُلے رہنے کے سبب غنائم سے بھی منافقین فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں دنیا کے پردے پر جس کسی کو آسودگی اور مال و دولت ملتا تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے۔ یا قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کو غنا و آسودگی دینے کا منصب اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کو سپرد فرما دیا ہے۔ یہ مفہوم نہ اس آیت سے نکلتا ہے، نہ مفسرین نے ایسا سمجھا ہے!

تاریخ و سیر کے واقعات سے ثابت ہے کہ حضورؐ کے پاس مال ہوتا تھا تو عطا فرماتے تھے اور نہیں ہوتا تھا تو نہیں دیتے تھے۔ ایک بار ایک سائل آیا اور حضورؐ سے سوال کیا تو آپ نے امہات المومنین کے گھروں میں معلوم کرایا کہ کچھ دینے کے لئے ہو تو سائل کو دے دیا جائے۔ پتہ لگا کہ پانی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لئے آپؐ نے اُسے دوسرے صحابی کے پاس بھیجدیا۔

ایسا بھی ہوا کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک وفد آیا۔ اُس کے ایک نوجوان نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے لئے قناعت کی دعا فرمایئے۔ حضورؐ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا فرمائی۔ وفد چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُدھر کے لوگ پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے اُس نوجوان کا حال پوچھا۔ اہلِ وفد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اُس نوجوان کی سیر چشمی اور قناعت کا یہ عالم ہوگیا ہے کہ ساری دُنیا کی دولت اُس کے سامنے رکھ دی جائے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم وارواحنا لہ الفداء)

غزوات کے لئے اسلحہ، زادِراہ اور سواریوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ تو حضورؐ اس کے لئے چندہ کی اپیل فرماتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا۔ اور تمام مجاہدین کے ہاتھوں میں اسلحہ اور رانوں کے نیچے گھوڑے آگئے۔

پھر "اغناھم اللہ ورسولہ" کی تفسیر میں کیا یہ بھی کہیں ملتا ہے کہ صحابہ کرام نے فقر و احتیاج کی حالت میں اپنے گھروں میں بیٹھ کر یا مدینہ سے باہر دُور بستیوں میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ "یا رسول اللہ! ہماری محتاجی دُور کر کے ہمیں غنی بنا دیجئے"۔ اور جب صحابہ کرام تک کو ہم فقر و فاقہ اور دُنیوی مشکلات میں مبتلا پاتے ہیں۔ تو اولیاء اللہ کے بارے میں ہم کس طرح یہ عقیدہ قائم کرلیں کہ فلاں بزرگ کے پاس اللہ کے دیئے ہوئے خزانے ہیں اور وہ اُن میں تصرف فرما کر جس کو چاہیں مالا مال کردیں۔

"اللہ یعطی وانا قاسم" کا شروع کا حصہ نہ جانے فاضل مدیر نے قصداً حذف فرمایا ہے یا لکھنے سے سہواً رہ گیا ہے۔ اصل حدیث یہ ہے۔

"من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین و انما انا قاسم واللہ یعطی"۔

(جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے۔ اس کو دین کی سمجھ عطا کردیتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے)

حدیث کے خود الفاظ بول رہے ہیں کہ یہاں "عطا" سے مال و دولت کی تقسیم نہیں ہے۔ حافظ فضل اللہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"قولہ انما انا قاسم — قال التورپشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقولہ وانما انا قاسم الی ما یلقی الیھم من العلم والحکمۃ ویقول واللہ یعطی ای انھم الذی یھتدی بہ الی خفیات العلوم فی کلمات الکتاب والسنۃ وذلک انہ لما ذکر التفقہ فی الدین وما فیہ من الخیر"۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت عطا فرماتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی حکمت صحابہ کو بتاتے (تقسیم فرماتے) تھے۔ اسی کو حدیث میں "تفقہ فی الدین" کہا گیا ہے اور یہی وہ "فہم" ہے جو کتاب و سنت کے نکات و معانی کی طرف ہدایت اور رہنمائی کرتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم و حکمت میں اللہ تعالیٰ کی عطا یقیناً ثابت ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضورؐ اس دولتِ علم و حکمت کو تقسیم بھی فرمایا کرتے تھے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کے سمجھنے میں

کہیں اشکال واقع ہو تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کریں کہ آپؐ اس عقدہ کو حل فرما دیجئے۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں کیسے کیسے فقہی مسائل پیش آئے ہیں۔ کیا صحابہ ان دینی مسائل میں حل مشکل کے لئے حضورؐ کی وفات کے بعد آپؐ سے استغاثہ کیا کرتے تھے؟

"انا اعطینک الکوثر" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خیر کثیر" کا عطا کیا جانا ہے۔ اس میں جو شک کرے وہ منافق ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قیامت میں "حوضِ کوثر" سے حضورؐ پیاسوں کو سیراب بھی فرمائیں گے۔ اور "خیر کثیر" یہ بھی ہے جو حضورؐ کی نبوت و رسالت کی صورت میں قیامت تک جاری و ساری رہے گا کہ نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اور اب جس کسی کو ہدایت و نجات ملے گی وہ حضرت خاتم النبیین (روحی لہ الفداء) کی اطاعت و فرمانبرداری ہی میں ملے گی کہ جس راہ میں سرکارؐ کے نقش قدم نظر آتے ہیں، وہی "صراطِ مستقیم" ہے۔ ع

باہر ترے گھر کے تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے!

اور حضورؐ کو جو "تکثیر" کا معجزہ عطا ہوا تھا کہ بعض اوقات تھوڑی چیز بہت سی ہو جایا کرتی تھی، یا طشت میں حضورؐ کی انگشتان مبارک سے پانی کے فوارے سے جاری ہو گئے تو یہ بھی اسی "خیر کثیر" کا اظہار تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ان تمام معجزات و عطایا سے کس کو انکار ہے۔ مگر "انا اعطینک الکوثر" سے یہ مفہوم کہاں نکلتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلبِ خیر کے لئے استغاثہ کریں اور رزق کی تکثیر کے لئے حضورؐ کو پکاریں کہ یا رسول اللہ! ہمارے رزق کو کثیر و وافر فرما دیجئے! فریاد و استغاثہ اللہ تعالیٰ ہی سے کیا جائے گا۔ کہ وہی مصیبتوں کا کھولنے والا، غموں کا دور کرنے والا اور ہر مصیبت میں کام آنے والا ہے۔

قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہے۔ وہی رزق دیتا ہے، وہی مصیبتیں کھولتا ہے، وہی لوگوں کو غنی اور آسودہ بناتا ہے۔ تو ان تمام آیتوں سے صرفِ نظر کر کے "اغنا" کے لفظ سے ذہن کو اس طرف لے جانا کہ تمام مخلوقِ خدا کو "غنی بنانے" کا منصب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپ دیا ہے، عجیب انتقالِ ذہنی ہے!

"من انصاری الی اللہ"

میں "انصاری" کا لفظ آ جانے سے کیا یہ معنی لئے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی "مددگاروں" کی ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے اور "انصار اللہ" اللہ کی مدد کیا کرتے ہیں (معاذ اللہ)!

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم جب آپس میں ایک دوسرے سے مدد چاہتے ہیں، استعانت کرتے اور مدد کے لئے پکارتے ہیں، تو اس پر "یدعون من دون اللہ" کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا؟ تو یہ وہی علمِ کلام ہے جو نمرود نے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے مجادلہ میں استعمال کیا تھا کہ اپنے اختیار کی ظاہری مشابہت کو دلیل بنا کر کہنے لگا کہ (تمہارا خدا مارتا اور جلاتا ہے) تو میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں:" اس جاہلانہ استدلال کا جواب نہ دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا اندازِ استدلال اختیار فرمایا اور کفر کو ششدر و حیران اور لاجواب کر دیا۔

اس دیدہ دلیری کا بھی کوئی جواب ہے کہ "بدعات" جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہو، سجدۂ تعظیمی کی اباحت کی طرف جن کا رجحان ہو۔ منصور و سرمد جیسے مجہول اور غیر ذمہ دار لوگوں کو جو اپنا پیشوا سمجھتے ہوں۔ "انا الحق" جیسے لغو اور خلافِ توحید نعرے کو جو جذب و سوز اور کشف و شہود کا مظہر جانتے ہوں اور اپنے کو بہ باطن "رب الکریم" کہتے ہوں (اس عقیدہ سے ہزار بار خدا کی پناہ) اور بندوں کو خدائی صفات میں شریک کرنے پر اصرار کرتے ہوں۔ وہ اُن لوگوں پر "اہواء پرستی اور بدعت" کی پھبتیاں چست کرتے ہیں۔ جن کا مسلک ہی شرک و بدعت کی تردید ہو اور جو کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی کے ذوق و وجدان اور کشف و شہود کو ترجیح نہ دیتے ہوں۔

رسالہ "تاج" میں ایک حدیث پیش کی گئی ہے:-

"اُوتیتُ مفاتیح خزائن الارض"

یہ پوری حدیث نہیں ہے، حدیث کا ایک ٹکڑا ہے اور چونکہ اس واقعہ کا تعلق خواب سے ہے، اس لئے حدیث کا اتنا حصہ فاضل مدیر "تاج" نے درج نہیں فرمایا، ممکن ہے انھیں سہو ہو گیا ہو۔ مگر ایسے مواقع پر اُن کو نہ جانے کیوں سہو ہو جاتا ہے — حدیث کا متن یہ ہے:-

"وعن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعثت بجوامع الکلم ونصرت بالرعب وبینھا انا نائم رأیتنی اُوتیتُ بمفاتیح خزائن الارض فوضعت فی یدی" (متفق علیہ)

(ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جوامع الکلم کیساتھ مبعوث کیا گیا ہوں اور رعب کیساتھ میری مدد کی گئی ہے اور جب میں سو رہا تھا تو مجھے دکھایا گیا کہ مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے)

مگر قرآن کی اس محکم آیت کے بارے میں کیا کہئے گا:-

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ"

(اے نبی! تم کہہ دو کہ میرے پاس اللہ کے (دیئے ہوئے) خزانے نہیں ہیں)

اور ظاہر ہے کہ جو حدیث قرآن کے مخالف ہو اُسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اور صحیح حدیث قرآن کے مخالف ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آیت میں "خزائن اللہ" آیا ہے، صرف "خزائن" نہیں کہا گیا۔ یعنی اس میں "اللہ کے دیئے ہوئے خزانوں" کی بھی نفی کی گئی ہے۔ "ذاتی" اور "عطائی" کی تاویل کے لئے بھی اس میں گنجائش نہیں ہے۔

مگر حدیث قرآن کی مخالف نہیں ہے۔ ہاں! قرآن کی مخالف اُس وقت ہوگی جب اس کے وہ معنی لئے جائیں جو مدیر "تاج" کے ذہن میں ہیں اور عام طور پر اہلِ بدعت اسی حدیث سے استدلال کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے خزانوں کی کنجیاں رسول اللہ کو عطا فرمادی ہیں۔ حالانکہ قرآن جس کی نفی کرتا ہو، حدیث اُس کا اثبات کرے، یہ ناممکن ہے!

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر اپنے اُمتیوں کے قبضہ وتسلط اور حکومت کی طرف اشارہ اور پیشگوئی ہے جو عالمِ مثال میں آپ کو دکھایا گیا تھا۔ خود حضورؐ کے دورِ مبارک میں بھی عرب پر آپؐ کا قبضہ ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسا بھی دور گزرا ہے کہ اُس وقت کی دُنیائے معلوم کا بہت بڑا رقبہ اُمتیانِ نبی آخر کے زیرنگین تھا۔ اور تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے اور اس انحطاط کے عالم میں بھی آج لاکھوں میل کے رقبہ پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ جن میں کم و بیش تیس کروڑ انسان بستے ہیں!

مشکوٰۃ کی حدیث کے اس ٹکڑے:-

"...... واُحلت لی الغنائم واُحلت لی الارض مسجداً وطھوراً"

(اور میرے لئے غنیمتیں حلال کی گئیں اور زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی)

"اُحلّت لی" (میرے لئے حلال کئے گئے) میں وہ تمام غنائم شامل ہیں جو آپ کے اُمتی جہاد کے ذریعہ حاصل کریں گے۔ اور "زمین میرے لئے مسجد بنائی گئی" میں وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے۔ جو حضورؐ کے اُمتی قیامت تک اپنے سجدوں سے معمور کرینگے۔ اسی طرح "اوتیت بمفاتیح خزائن الارض" میں عرب کے علاوہ وہ تمام رقبۂ زمین (اُس کے خزائن کے ساتھ) شامل ہے۔ جو آپؐ کے اُمتیوں کے قبضہ میں آیا اور قیامت تک آتا رہے گا۔

اگر یہ حدیث خواب کا واقعہ نہ ہوتی تو بھی اُس کے یہی معنیٰ لئے جاتے کہ کتاب اللہ سے ٹکراؤ نہ ہو مگر حضورؐ کا یہ فرمانا "وبینھا انا نائمٌ رایتنی" "جب میں سو رہا تھا تو مجھے یہ دکھایا گیا" اس نے معاملہ کو آسان تر بنا دیا۔ اس پر شاید یہ اعتراض وارد کیا جائے کہ انبیاء کرام کے خواب سچے (رویاء صادقہ) ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ اُن کو آنے والے واقعات عالمِ مثال میں دکھائے جاتے ہیں۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ مجھیں سجدہ کر رہے ہیں اور یہ مثالی واقعہ اس طرح سچا ہو کر رہا۔

"ورفع ابویہ علی العرش وخروا لہٗ سُجّدا"

شاید کہا جائے کہ یوسف علیہ السلام نے جب خواب دیکھا تھا تو وہ اُس وقت بچے تھے، نبوت جب تک کہاں ملی تھی! اس کے جواب میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ خواب میں حضورؐ کو جو شے نظر آئی ہے، اُس کی خود حضورؐ نے تاویل فرمائی ہے:۔

"عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رایت ذات لیلۃٍ
بینما یری النائم کانا دارِ عقبہ بن رافع فاتینا برطبٍ من رطب ابن طاب
فاولت ان الرفعۃ فی الدنیا والعاقبتہ فی الاٰخرۃ وان دیننا قد طاب"

(میں نے ایک رات اُس حالت میں جس حالت میں سونے والا دیکھا کرتا ہے، دیکھا گویا کہ عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ہمارے سامنے رطب (تازہ کھجور) لائے گئے۔ تو میں نے اُس کی یہ تاویل کی کہ ہمارے لئے دُنیا میں رفعت ہے اور آخرت میں انجام (اچھا) ہے اور ہمارا دین مکمل اور احسن ہو گیا)

مدیر "تاج" نے مشکوٰۃ باب الکرامات کی جو روایت درج کی ہے، اُس میں حضورؐ سے استغاثہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، ہاں! حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کہنے سے روضۂ انور سے ایک روشندان آسمان کی طرف بنا دیا گیا۔ اور اس کے بعد خوب بارش ہوئی۔

ابن السنی سے جو روایت ہے، اُس کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"واذا خدرت رجلہ فلیذکر احب الناس الیہ"

(اگر کسی کا پیر سُن ہو جائے، تو جو شخص اس کو سب سے زیادہ محبوب ہو تو اس کا ذکر کرے (یا نام لے)

یہ "اثر" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو موقوفاً ہے مرفوعاً نہیں ہے۔ اس "اثر" کے متن میں یہ درج نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نام لیا جائے۔ اور عبارت میں احتیاط کا یہ عالم ہے کہ پکارنے اور ندا دینے کی جگہ "فلیذکر" کا لفظ ہے!

اس "اثر" (متن) کے حاشیہ پر البتہ دو واقعات (قولہ) لکھے ہیں۔ جن میں ایک واقعہ میں "یا محمداہ" بھی ملتا ہے۔ کہ جس کے زبان سے دہرانے بلکہ زبان کو معطر و معنبر بنانے کے بعد پاؤں درست ہو گیا اور حضرت عبد اللہ ابن عمر کے ہمراہی صحابی چلنے لگے۔

مگر دونوں واقعات کے بعد یہ الفاظ بھی ساتھ ہی درج ہیں :-

"وإذا بلّ الانسان بريقه اظافيره والرجل التي خدرت زال عنه ذلك مجرب"

(جب آدمی اپنے ہاتھ اور پیر کے ناخنوں کو تھوک سے تر کرلے تو سُن اس سے جاتا رہیگا اور یہ مجرب ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور اسم گرامی کی برکت سے کس کو انکار ہے۔ مگر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو "اثر" منقول ہے، اس کی حیثیت ایک "عمل" ــــ "رقیہ" (جھاڑ پھونک) کی ہے! جب "رقیہ" میں بعض دوسرے الفاظ دُہرانے سے بیماریوں کو فائدہ ہوجاتا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور متبرک ہے۔ مگر اس "عمل" سے "استغاثہ یا ندا" کا استدلال کرنا۔ کسی طرح درست نہیں۔

زمانہ فاروقی کی جو روایت ماہنامہ "تاج" میں نقل کی گئی ہے اُس کے متن میں "استغاثہ" کا لفظ نہیں ملتا۔ یعنی روضۂ رسول پر حاضر ہوکر یہ نہیں کہا گیا کہ "آپ پانی برسا دیجئے یا پانی برسوا دیجئے"۔ متن میں لفظ "استسق" ہے۔ یعنی آپ اللہ سے پانی طلب کیجئے!

اگر صحابہ کرام کا یہ معمول تھا کہ روضۂ حضورؐ پر حاضر ہوکر صلوٰۃ وسلام کے علاوہ استغاثہ اور عرض و معروض بھی کیا کرتے تھے۔ تو ایک دو نہیں سینکڑوں روایتیں ان واقعات کی ملنی چاہیئں تھیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد ہی ارتداد کا کتنا بڑا فتنہ پیش آیا ہے۔ یہ وہ نازک وقت تھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ روضۂ رسول پر استغاثہ کرتے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کا فروں سے کیسی کیسی معرکہ آراء جنگیں ہوئی ہیں اور فاروق اعظم رضؓ مجاہدوں کے لئے بڑے مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ روضۂ رسول پر استغاثہ کے لئے یہ سب سے زیادہ مناسب مواقع تھے! حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا مشہد روضۂ رسول سے بہت ہی قریب ہے۔ جب بلوائیوں نے آپ پر نرغہ کیا تھا تو حضور کو خطاب کرتے ہوئے دُہائی، استغاثہ اور عرض و معروض کا اس سے بڑھ کر اور کونسا نازک وقت ہوسکتا تھا۔ صحابہ کرامؓ طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہوتے تھے مگر مصیبت اور مشکل میں وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور اُسی سے دعا کرتے تھے۔ روضۂ رسول پر حاضر ہوکر صلوٰۃ وسلام تو عرض کرتے تھے مگر استغاثہ اُن کا معمول نہ تھا!

قبروں سے اس قسم کے معاملات ــــ استغاثہ اور عرض و معروض ــــ کی اگر اجازت ہوتی تو قرآن پاک میں کسی ایک نبی و رسول یا مومن صالح کی قبر کا ذکر تو آتا۔ کہ وہاں جاکر اس اس طرح معروض کی گئی اور یہ یہ واقعات و حالات پیش آئے۔ احادیث میں زیارت قبر رسول کے لئے حضورؐ کا فرمان ملتا ہے مگر استغاثہ و فریاد کے لئے، نہ حکم ہے اور نہ اجازت ہے۔ روضۂ رسول پر حاضری اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس کی برکتوں کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مسلمان جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر صلوٰۃ وسلام عرض کرتا ہے تو ہر بُن مُو سراپا خلوص و عقیدت بن جاتا ہے اور محبت کے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوتی ہے۔ اور روایتوں میں یہ تک ملتا ہے کہ حضورؐ اپنے اُمتی کے صلوٰۃ وسلام کا جواب عطا فرماتے ہیں۔ مگر وہاں بھی دعا اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے کہ وہی سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے!

صحابہ کرام نہ قبر رسول کو چومتے تھے۔ نہ اس پر چراغ جلاتے تھے۔ نہ قبر مبارک کا طواف کرتے تھے۔ نہ وہاں حاضر ہوکر آپ کے نام کی دُہائی دیتے تھے۔ نہ زیارت قبر کے بعد اُلٹے پاؤں واپس ہوتے تھے۔ نہ چادریں چڑھاتے تھے اور پھول ڈالتے تھے۔ جب تعظیم و عقیدت کے یہ مظاہر قبر رسول تک سے متعلق نہیں رہے۔ نہ ان کے لئے احادیث میں کوئی اجازت آئی ہے اور نہ صحابہ کرام نے اظہار عقیدت

کے لئے یہ طریقے اختیار کئے ہیں۔ تو پھر دُنیا کی وہ کونسی قبر ہے۔ جس کے ساتھ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مقدس سے بڑھ کر عقیدت کا اظہار کریں!

سماع و غنا

سماع اور غنا کا مسئلہ بہت زیادہ طویل الذیل ہے۔ اُس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی تو "فاران" کے صفحے کے صفحے بھی اس تفصیل کو اپنے دامن میں نہ سمیٹ سکیں گے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر پہلی بار مدینہ تشریف لے گئے ہیں تو یہ صحیح ہے کہ بنو نجار کی کمسن لڑکیاں اشعار گا رہی تھیں:-

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا   ما دعا للہ داعٍ

عید کے موقع پر بھی لڑکیوں کے "لے" کے ساتھ اشعار گانے کو حضورؐ نے نہیں روکا اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ مگر یہ کہیں نہیں ملتا کہ حضورؐ کے دَور میں "سماع" کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ گانا سُننا حضورؐ کے معمولات میں داخل رہا ہو۔ حضورؐ کے حکم یا اشارے سے گانے بجانے کے لئے کوئی اجتماع ہوا ہو۔ صحابہ کرام کا عہد اور خلفاءِ راشدین کا دَور بھی گانے بجانے کی محفلوں سے خالی نظر آتا ہے۔ گانے بجانے کو قلب کے تصفیہ اور تزکیہ کا سبب نہ رسُول اللہ نے سمجھا اور نہ صحابہؓ نے۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں "غنا" اور "مزامیر" پر حدیث کی کتابوں میں نکیر ہی ملتی ہے!

بے شک اربابِ تصوف میں بعض بزرگوں کو سماع سے رغبت رہی ہے اور وہ "سماع" سُنا کرتے تھے۔ ہم اُن پر طعن نہیں کرتے مگر اُن کے اس عمل کو سُنّت بنانا کہاں تک جائز ہے۔ یہ عمل اُن کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ہمارے سامنے جو اسوۂ حسنہ زندگی کے لئے معیار اور نمونہ ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہے!

تصوف کے بعض خانوادوں میں "سماع" کو جو . . . معمولات میں داخل کر لیا گیا ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور اُس پر جو زیادتیاں اور اضافے ہوتے چلے گئے ہیں، اُس نے "سماع" کو سادہ غنا ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس پر "ملاہی" کی تعریف صادق آتی ہے۔ اور آج کل جو "سماع" کی محفلیں برپا ہوتی ہیں، وہ تو سراپا لہو و لعب ہیں۔ یہ مزامیر کا تنوع، یہ گانے میں سگلے بازی اور گٹکریوں کے ساتھ تالیاں بجانا ـــ کہ جو عبادت میں "کفار" کا شیوہ رہا ہے۔ یہ ڈھولک کی تال اور ہارمونیم کی گت پر ناچنا اور پھر ان خرافات کو تزکیہ قلب کا سبب سمجھنا۔ بناء فاسد علی الفاسد کا مصداق ہے۔ اور اس کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہے کہ اب یہ قوالی کی محفلیں راگ رنگ کے جلسے اور "سماع شریف" کے جمگھٹے بعض لوگوں کی دکانداری چمکانے کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس طرح ان تاجر پیروں کی محفلوں کی رونق بڑھتی ہے!

ڈھول کی گت پہ رقص ہوتا ہے
نغمہ چاندی میں ہاتھ دھوتا ہے

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے جس "سماع" کے جواز کی "اہل" کے لئے شرط لگائی وہ یہ "سماع" ہرگز نہ تھا جو ان دنوں رائج ہے اور آجکل کے موسیقی مزاج پیر جس کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ امام غزالیؒ آج زندہ ہوتے اور وہ دیکھتے کہ مجاہیل اور نا اہلوں کو اعلان کے ذریعہ گانے بجانے کی ان محفلوں میں اکٹھا کیا جاتا ہے، تو وہ شاید اپنی رائے بدل دیتے کہ میری "رخصت و توسّع" نے سادہ غنا کو لہو و لعب کی کن حدود تک پہنچا دیا!

مدیر "تاج" لکھتے ہیں:-

"ائمہ احناف میں صاحب بدائع صاحب ہدایہ شمس الائمہ سرخسی اباحت غنا کی تصریح کرتے ہیں۔"

حالانکہ ہدایہ میں یہ عبارت ملتی ہے:۔

"ان الملاهی کلها حرام حتی التغنی بالضرب القضیب۔"

(ہر قسم کا لہو ولعب حرام ہے یہاں تک کہ لکڑی پر لکڑی مار کر گانا بھی)

ہدایہ فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب ہے، ہدایہ کی اس تصریح کے بعد وہ لوگ جو فقہ حنفی کے مقلد ہیں اُن کو پھر کچھ اور کہنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے!

اباحتِ غنا کے سلسلہ میں امام ابن طاہر کا مدیر "تاج" نے بار بار نام لیا ہے۔ امام موصوف کے علم و فضل کے اعتراف کے باوجود اُن کے بارے میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ وہ "اباحتیہ ملامتیہ" تھے اور "امرد" پر نگاہ ڈالنے تک کے جواز میں انہوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے!

یہ کون کہتا ہے کہ لحن کے ساتھ ترنم و نشید حرام ہے، اس کی اجازت ہے، نفسِ غنا کی اباحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے سرود و غنا کو جس میں مزامیر کا استعمال نہ ہو مباح[1] لکھا ہے۔ اور یہ بھی تصریح فرمادی ہے کہ دف مزامیر سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فتاویٰ عزیزی جلد اوّل (صفحہ ۶۵) میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"ودر مدارک گفتہ کہ ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ قسم میخوردند کہ لہو الحدیث غنا است و در در المعانی گفتہ کہ لہو الحدیث غنا و مزامیر است و در کشاف ذکر کردہ کہ لہو الحدیث مانند غنا و تعلیم و موسیقات است و در تفتیؔ گفتہ کہ لہو الحدیث غنا است و آں حرام است بایں نص مستحلّ آں کافر است و در تفسیر ثعلبی آوردہ کہ لہو الحدیث غنا و ضرب بربط و دف و اوتار و طنبور ست و آں ہمہ بایں نص حرام اند۔ من استحلہ فقد کفر۔"

"طبرانی و خطیب بغدادی روایت نمودہ اند کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نہی کرد از غنا و استماع آں و فی جامع الفتاویٰ استماع الملاهی والجلوس علیها وضرب المزامیر والرقص کلها حرام ومستحلها کافر۔"

(جامع الفتاویٰ میں ہے کہ لہو و لعب کا سننا اور ایسی محفل میں بیٹھنا اور مزامیر کا بجانا اور رقص کرنا یہ سب باتیں حرام ہیں اور ان کو حلال ٹھہرانے والا کافر ہے)

مدیر "تاج" جس "غنا" کی نہ صرف اباحت کے قائل ہیں بلکہ اس کے داعی اور سرپرست ہیں۔ یہ وہی غنا ہے جس کے بارے میں شعب الایمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث آئی ہے:۔

"الغنا ینبت النفاق، کما ینبت الماء النبات۔"

(غنا نفاق کو اس طرح اگاتا ہے۔ جیسے پانی نباتات کو اگاتا ہے)

---

[1] شاہ صاحب نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ "و اولیاء اللہ خصوصاً اکابر چشتیہ سماع ہمیں غنا فرمودہ اند کہ بحضور مزامیر و آلات نبود۔"

اعتراض برائے اعتراض

مدیر "تاج" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب "تفہیم القرآن" پر اتنے برسے اتنے برسے ہیں کہ خدا کی پناہ! مودودی صاحب کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے "یدعون من دون اللہ" میں اصحاب قبور کو کیوں شامل کر دیا!

"فاران" میں تفہیم القرآن کا جو اقتباس درج کیا گیا تھا۔ اس کو "تاج" میں پورا نقل نہیں کیا گیا۔ اور وہ حصہ جان بوجھ کر حذف کر دیا گیا ہے۔ جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ مشرکین نے صالحین کے ناموں پر بتوں (ودّ سواع یغوث، نسر، اساف، نائلہ) کے نام رکھے تھے!

البدایہ والنہایہ میں علامہ ابن کثیر نے صفحہ ۱۰۶ پر راویوں کے ناموں کے ساتھ روایت نقل کی ہے:-

"ودّ رجلاً صالحاً وکان محبباً فی قومہ فلما مات عکفوا حول قبرہ ....."

(ودّ ایک مرد صالح تھا جو اپنی قوم میں محبوب تھا۔ جب وہ مرگیا تو اس کی قبر کے ارد گرد لوگ گھومنے لگے)

البدایہ والنہایہ کی اس روایت کو پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ مولانا مودودی نے "یدعون من دون اللہ" سے جو اصحاب قبور مراد لئے ہیں اس پر تفسیر بالرائے اور خارجیت کی پھبتی چست کرنا کس قدر بغض و عناد اور جاہلانہ عصبیت کی دلیل ہے!

اس روایت میں تفصیل ملتی ہے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو بہکایا اور ان لوگوں نے آگے چل کر ودّ کی تمثال کی پوجا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ:-

"..... حتیٰ اتخذوہ الٰھاً یعبدونہ من دون اللہ"

پھر آگے چل کر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

"ومقتضیٰ ھذا السیاق ان کل صنم من ھذہ عبدہ طائفۃ من الناس"

(اس سیاق عبارت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کے تمام بت انسانوں کے گروہوں میں سے تھے)

قبر پرستوں پر اگر قرآن کا یہ انداز بیان (یدعون من دون اللہ) گراں گزرتا ہے تو ان کی دل دہی کے لئے اہل حق سچی بات کے اظہار سے صرف نظر تو نہیں کر سکتے!

"یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں"۔ مولانا مودودی کے اس جملہ پر مدیر "تاج" نے گرفت کرکے اپنے نزدیک بڑی دقت نظر اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "آیات قرآنیہ کو "الفاظ" بولنا سخت بے ادبی ہے۔ آیات و کلمات بولنا چاہیئے"۔ یہ اعتراض محض برائے اعتراض ہے اس میں کوئی وزن نہیں! افہام و تفہیم کے لئے قرآن کریم کے کلمات و آیات سے "حرف، لفظ، سوابق و لواحق، عبارت، سیاق و سباق، مضمون، تقریر وغیرہ" کی نسبت دینے میں آخر بے ادبی کی کیا بات ہے؟

اردو مفسرین قرآنی کلمات کے لئے "الفاظ" بھی استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں:-

(۱) "...... فاخذتھم الصیحۃ مشرقین" (الحجر) اس آیت کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں:-

"...... شاید یہ مطلب ہو کہ صبح ہوتے ہی عذاب شروع ہو جائے گا اور اشراق تک سب معاملہ ختم کر دیا جائیگا۔ یہی نکتہ دوسری جگہ "مصبحین" کے بجائے "مشرقین" کا لفظ آیا ہے"۔ (صفحہ ۳۴۴۔ مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور)

(۲) " اے ایمان والو تم (لفظ) " راعنا " مت کہا کرو (اور اگر اس کے ظاہری مطلب عرض کرنے کی ضرورت پڑا کرے تو (لفظ) " انظرنا " کہہ دیا کرو۔ (بیان القرآن۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ صفحہ ۴۲ ۔ مطبوعہ تاج کمپنی)

(۳) " لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ " رب العلمین کے لفظ میں یہ اشارہ آگیا کہ دعوت ایسے قانون کی اطاعت کی دی جارہی ہے (تفسیر ماجدی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (صفحہ ۲۹۶)

(۴) تفسیر ابن کثیر کا اُردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ " ...... ولا تتبعوا السُّبُل " اس نکتہ کو نہ بھولیئے کہ اپنی راہ کیلئے " سبیل " کا لفظ اور گمراہیوں کی راہ کے لئے " سُبُل " جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

قرآنی آیات و کلمات کی تشریح میں " لفظ " کی نسبت سے کوئی کہاں تک بچے گا۔ " عرش " قرآن پاک میں آیا ہے۔ اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہی جائے گا۔ اور لوگ کہتے ہی چلے آئے ہیں کہ " عرش " کے لفظی معنی " تخت " کے ہیں۔ اور اس کی معنوی کیفیت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔

قرآن کی عبارتوں کو " آیات " ہی کہا جاتا ہے۔ " جملے " نہیں کہا جاتا۔ مگر یہ آیات جن کلموں سے عبارت ہیں۔ اُن کو افہام و تفہیم میں " الفاظ " بھی کہتے اور بولتے ہیں۔ اور کلمۂ " لفظ " (word) میں نہ کوئی ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔ نہ " لفظ " کسی کے قول و کلام کی تخفیف و اہانت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ خود " لفظ " بولتے وقت کسی کے ذہن میں اس کے لغوی معنی نہیں ہوتے کہ بولنے والا زبان سے " حرفوں کو پھینک رہا ہے " اس طرح تو قدیر۔ غفار۔ مُعید۔ غنی۔ سمیع۔ رسول۔ محمدؐ۔ ملک۔ یوم الجزاء۔ صوم و صلوٰۃ وغیرہ کلمے جن لغات میں درج ہیں اور اُن پر " الفاظ " لکھا ہوا ہے۔ تو اُن کے لکھنے والے اور پڑھنے والے سب کے سب بے ادبی کے مُرتکب ہوتے ہیں۔ چشم بد دُور کیا نزاکتِ فہم اور کیا احساسِ شعور ہے۔ اور یہ اعتراض وہ غیر محتاط لوگ کر رہے ہیں ــــ جو:-

مثنویٔ مولویٔ معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

پڑھ پڑھ کر وجد کرتے ہیں!

مولانا مودودی کی تحریروں کے ساتھ یہی دردناک سلوک کیا جارہا ہے۔ کہ لوگ اُن کی تحریروں سے وہ وہ نکتے پیدا کرتے ہیں جو مودودی صاحب کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتے اور اپنے وہم و نفس سے پیدا کی ہوئی تہمتیں اُن پر جوڑتے ہیں۔

اہلِ بدعت کا مزاج

اہلِ بدعت کا یہ مزاج ہے۔ ذوق ہے اور طبیعت و رجحان ہے کہ ایسے تمام نکتے جو " عبد و معبود " اور " خالق و مخلوق " کے تعلق پر:-

" من تو شدم، تو من شدی "

کا رنگ چڑھاتے ہوں۔ انھیں مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ توحید کے تقاضوں سے اُن سے زیادہ بے پروائی شاید ہی کوئی اور برتتا ہو۔ اور ایسے لطائف، اشاروں اور نکتوں سے جن سے شرک و توحید میں التباس پیدا ہوتا ہو۔ ان حضرات کو خاص شغف ہے۔ بلکہ اُن کے ذوق کی چیز ہے۔ مثلاً " احمد بلا میم " اور " عرب " بلا " ع " پر یہ لوگ جھومنے لگتے ہیں۔

" قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ...... "

کے ترجمہ میں " ی " کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ نے فرمایا۔

تم کہو کہ " اے میرے بندو......." (یعنی محمد رسول اللہ کے بندو) صرف اپنے ذوق کی بناء پر قرآن پاک میں ایسی کھلی ہوئی معنوی تحریفیں کرتے ہیں اور ذرہ برابر نہیں شرماتے۔ بلکہ اتنی بڑی مجرمانہ جسارتیں کرکے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم "عشق رسول" کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اولیاء اللہ کو انہوں نے انبیاء کرام کے برابر پہنچا دیا ہے بلکہ اُن سے بڑھا دیا ہے اور انبیاء کرام کو خدائی منصب دے دیا ہے۔ (نعوذ باللہ) ان کا تمام علم کلام انہی معتقدات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ غلو ان کا شیوہ ہے اور فرق مراتب کی حدوں کو توڑنا ان کا مسلک ہے!

"یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ" (مائدہ)

کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

"تقویٰ کا حکم ہو رہا ہے اور وہ بھی اطاعت سے ملا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے منع کردہ کاموں سے رُکا رہے اس کی طرف قربت یعنی نزدیکی تلاش کرو۔ یہی معنیٰ **وسیلہ** کے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہیں اور حضرت مجاہد، حضرت ابووائل، حضرت حسن، حضرت ابن زید اور بہت سے مفسرین (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) سے بھی مروی ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی اطاعت اور اس کی مرضی کے اعمال سے اُس سے قریب تر ہوتے جاؤ۔ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی:-

"اولئک الذین یدعون، یبتغون الی ربھم الوسیلہ"

جنہیں یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ان ائمہ نے وسیلے کے جو معنی اس آیت میں کئے ہیں، اس پر سب مفسرین کا گویا اجماع ہے۔ اس میں کسی ایک کا بھی خلاف نہیں۔[1]"

(اُردو ترجمہ۔ صفحہ ۹۳)

مگر اہل بدعت " وابتغوا الیہ الوسیلہ" سے نہ صرف یہ کہ انبیاء و اولیاء کا توسل ہی مراد لیتے ہیں بلکہ اس توسل کو یہاں تک وسعت دیتے ہیں کہ اُن کے نزدیک بزرگانِ دین سے استمداد، استعانت، استغاثہ، سب اسی آیت کے تحت "الوسیلہ" کے مفہوم میں داخل ہے۔ قرآن کے مقابلہ میں یہ اُن کی جرأتیں اور جسارتیں ہیں۔ اُن کی اس خود تراشیدہ تفسیر پر کوئی گرفت کرے تو اُسے اولیاء اللہ کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

مشرکانہ عقائد، بدعت آمیز تصورات اور عجمی خرافات شعر کے اس قالب میں ڈھل گئے ہیں:-

وہ جو کہ مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر   اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفا ہو کر

---

[1] "وسیلہ" جنت کی اس اعلیٰ منزل کا نام بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور عرش سے قریب تر ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے جو شخص اذان سن کر "اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ..... الخ" پڑھے اس کے لئے میری شفاعت حلال ہو جاتی ہے۔ مسلم شریف میں ہے "جب تم اذان سنو تو جو موذن کہہ رہا ہو۔ وہی تم بھی کہتے جاؤ۔ پھر مجھ پر درود بھیجو۔ ایک درود کے بدلے اللہ تعالیٰ دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ پھر میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ طلب کرو، وہ جنت کا ایک درجہ ہے۔ جسے صرف ایک ہی بندہ پائے گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ پس جس نے میرے لئے وسیلہ طلب کیا اُس کے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی!

اور :- اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام رکھ لیا خواجہ غریب نواز

(معاذ اللہ ! نقل کفر، کفر نہ باشد) اس قسم کے شعر کہنے والے سلوک و تصوّف کے خانوادوں کے سجادہ نشین تھے۔ اور مریدوں کی خاصی تعداد اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل رہی ہے ! اس شعر کی :-

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

اہلِ بدعت کیا کیا تحسین کرتے ہیں ! جس طرح ہم آپس میں کہا کرتے ہیں کہ ہم تم دوست دوست، جو تمہارا مال وہ ہمارا مال۔ محبوب و محب میں اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا۔ کیا اللہ اور رسولؐ کے ساتھ بھی اس قسم کی بے تکلفی کے محاوروں کی نسبت جائز ہے ؟ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جو اس قسم کے عقائد رکھتے ہیں اُن کے ناموں کے ساتھ "حامئ سنّت" اور "ماحئ بدعت" کے القاب استعمال کئے جاتے ہیں۔

اہلِ بدعت قرآن کی آیتیں نقل کرتے ہیں اور اُن کے ذیل میں اپنے مزعومہ عقائد و تصورات درج کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً :-

"الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

کو عنوان بنا کر اولیاء اللہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کی نسبت دیتے ہیں ۔۔ یہ کہ اولیاء اللہ وفات پانے کے بعد استغاثہ کرنے والوں کی فریاد سن لیتے ہیں۔ قبر کے پاس ہی نہیں، ہزاروں کوس کی دُوری سے بھی۔ اور مصیبت زدوں کی مصیبتوں کو دُور فرماتے ہیں۔ قبر و برزخ سے لوگوں کی روحانی تربیت کرتے ہیں۔ اور عالم کے تمام احوال و مقامات اُن پر منکشف ہیں۔ اس آیت سے اہلِ بدعت کے ان خود تراشیدہ مفاہیم و معانی کا دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اپنی اس عجیب و غریب تفسیر پر اُنھیں اصرار ہے کہ وہ جو کچھ کہتے، سمجھتے اور اعتقاد رکھتے ہیں، وہی صحیح ہے !

جس طرح اہلِ بدعت کی پیش کی ہوئی آیاتِ قرآنی اور اُن کے مزعومہ معتقدات کے درمیان کوئی ربط نہیں ہوتا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ساتھ بھی اسی قسم کا دردناک سلوک کرتے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث ہے، جس کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہوں ۔۔ کہ حضورؐ دو قبروں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ان قبروں پر عذاب ہو رہا ہے۔ آپ نے درخت کی دو شاخیں قبروں میں گاڑ دیں اور فرمایا کہ جب تک یہ شاخیں ہری رہیں گی ان کے لئے طلبِ مغفرت کرتی رہیں گی !

یہ حدیث قبروں پر پھول ڈالنے کے جواز میں بطور دلیل پیش کی جاتی ہے۔ حالانکہ قبروں پر پھول چڑھانے سے اس حدیث کا کوئی ربط و توافق نہیں ہے، حضورؐ نے ان قبروں پر پھول کب چڑھائے تھے۔ بلکہ دستِ مبارک سے درخت کی شاخیں نصب فرمائی تھیں کہ اُن شاخوں کے خشک ہونے تک استغفار کرنا تخفیفِ عذاب کا سبب ہوگا۔ جو لوگ بزرگوں کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ کیا ان قبروں کا راز اُن پر مکشوف ہو چکا ہے کہ ان اہلِ قبور اور صاحبانِ مزار پر (معاذ اللہ) عذاب ہو رہا ہے۔ نیت سَو فیصدی ہدیۂ عقیدت و تعظیم گزراننے کی ہوتی ہے۔ جو کھُلی ہوئی بدعت بلکہ جہالت ہے ! اور پھر عذاب زدہ قبروں پر شاخیں گاڑ دینے سے عذاب میں تخفیف ہونا یہ حضورؐ کے لئے مخصوص تھا !

قرآن کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے اہلِ بدعت ایسی ہی دلیلیں لاتے ہیں جن کا اُن کے معتقدات اور معمولات سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ مگر استدلال کا یہ آرٹ وہ اکثر دکھاتے رہتے ہیں !

ایک تو "تصوّفِ خالص" ہے جس کی بنیاد "احسان" پر ہے اور اس میں اور شریعت میں ٹکراؤ نہیں ہو سکتا اور ایک وہ نام نہاد "تصوّف" ہے۔ جو بدعات اور عجمی فلسفہ کا معجون مرکب ہے۔ اس بدعت زدہ اور عجم پرور تصوّف کے مبلغین "شریعت" کو

ظاہری رسوم کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور طریقت سے کمتر جانتے ہیں! اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے وہ "اکابر" جن کی مجذوبیت، قطبیت اور باطنی شہنشاہی کے یہ قایل ہیں۔ اُن کی خلاف شریعت حرکتوں کو اُس وقت تک سندِ جواز مل ہی نہیں سکتی جب تک شریعت کے "ظاہر" کے مقابلہ میں طریقت کے "باطن" کو ترجیح نہ دی جائے! جب گفت ر و کردار کا معیار شریعت نہ رہی تو پھر چرس اور بھنگ پینے والوں کو "ولایت" کی مسند پر بٹھایا جا سکتا ہے اور مجنوط الحواس اور لاالعقل لوگوں کی ہفوات کی رموز اور کشف وشہود کا نام دے کر اُن کی ملفوظات تیار کی جاسکتی ہے!

ہم نے تکیوں میں خود ایسے چرسیوں، مدکیوں اور سلفہ پینے والوں کو دیکھا ہے کہ نشہ میں جن کے تمتمائے ہوئے چہروں اور چڑھی ہوئی پتلیوں کو دیکھ کر عقیدت مند یہ سمجھ رہے ہیں کہ حضرت قبلہ پر جذب کی کیفیت طاری ہے اور چہرۂ انوار پر جلال کے آثار نمایاں ہیں۔

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مکتوب (۳۲ بنام مولانا حسن علی) کا اقتباس ہم درج کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ سچے صوفیوں اور اہل اللہ کے شریعت و طریقت کے بارے میں کیا رجحانات رہے ہیں:۔

"میرے ایک مکتوب بنام عبید اللہ بیگ (مکتوب ۲۹) پر ایک شبہ تحریر کیا ہے اور اس کا جواب مانگا ہے۔ شبہ یہ ہے کہ "حُسن وقبیح" کا امتیاز مقام شریعت میں ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک رسالہ میں لکھا دیکھا ہے کہ:۔

> "طریقت میں سب سے صُلح اور ہر کسی سے دوستی ہوتی ہے بخلاف شریعت کہ وہاں دشمنوں سے جنگ اور دوستوں سے صلح ہوتی ہے۔ ...... الخ

(یہ) عجیب واہیات شبہ ہے۔ بھلا طریقت کا شریعت سے کیا تقابل؟ اور ان دونوں میں مساوات کہاں سے آئی؟ شریعت تو ایسی قطعی وحی سے ثابت ہوتی ہے جس میں شک وریب کی بالکل گنجائش نہیں۔ اس کے احکام میں "نسخ وتبدیل" نہیں، تا قیام قیامت یہ احکام باقی رہیں گے۔ شریعت کے تقاضے پر عمل کرنا تمام عوام وخواص کے لئے ضروری ولابدی ہے۔ **طریقت کی یہ مجال نہیں کہ وہ شریعت کے احکام کو اُٹھا دے اور اہلِ طریقت کو "تکالیفِ شرعیہ" سے آزاد کردے۔** اہلِ سنت وجماعت کے "عقائد قطعیہ" میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ بندہ (بحالتِ ہوش وحواس) ہرگز ایسے درجہ پر نہیں پہنچتا کہ تکالیف شرعیہ اس سے ساقط ہو جائیں۔ جو اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے وہ جرگہٗ اسلام سے باہر ہے"۔ (اُردو ترجمہ)

عقیدت ومحبت کا غلط معیار

انبیاء کرام، اولیاء عظام اور صلحاءِ اُمت کی ایک تو وہ حیثیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا فرمائی ہے اور دوسری وہ حیثیت ہے جو اُن کے غالی معتقدین اور اہلِ بدعت نے دے رکھی ہے۔ حضرت عیسیٰ اللہ کے مقدس نبی تھے، روح اللہ تھے اور صاحب آیات تھے۔ مگر حضرت مسیح کے اُمتیوں نے اُن کی مدح میں وہ غلو کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" بنا دیا۔ اللہ کے نزدیک عیسیٰ اُس کے بندے ہیں اور باوقار نبی ہیں کہ نبوت سے بڑھ کر انسانیت کے لئے اور کوئی روحانی مقام نہیں۔ مگر عیسائیوں نے جس عیسیٰ مسیح کی شخصیت کا تصور اپنے ذہن میں قائم کیا ہے، وہ اس حیثیت سے مختلف ہے جو درجہ اللہ نے اُن کو عطا فرمایا ہے اور جس واقعی منصب پر وہ فائز ہیں۔ اب اگر کوئی عیسیٰ مسیح کو وہ نہیں سمجھتا جو عیسائی سمجھتے ہیں۔ تو کیا وہ اہانتِ مسیح کا معاذ اللہ مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن عیسائی یہی سمجھتے ہیں کہ چونکہ مسیح کی الوہیت کا قایل نہیں ہے اور اُن کو

نہیں مانتا۔ وہ مسیح کے رتبہ کو گھٹاتا ہے! حالانکہ حضرت مسیح کے شرف و مجد کا مسئلہ اُن کی الوہیت اور بنیت کے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اسی پر اُن لوگوں کے عقاید و تصورات کا قیاس کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کے منصب و اختیار کا ایک "تخیل" اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے کہ وہ ان صفات اور اختیارات کے مالک ہیں۔ اور جو کوئی ان لوگوں کے خود تراشیدہ "عقیدہ و تخیل" کو نہیں مانتا، اُس پر بزرگانِ دین کی اہانت و عداوت کا الزام لگایا جاتا ہے۔

حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کے بعض غالی بلکہ گمراہ معتقدین نے حضرت علیؓ سے الٰہی صفات منسوب کردی تھیں تو مولا علیؓ نے ان لوگوں کو سزائیں دیں۔ نُصیری تو ڈنکے کی چوٹ علی مرتضیٰ کو "خدا" کہتے ہیں (معاذ اللہ) اور اب بھی ایسی شرک پسند ذہنیتیں موجود ہیں۔ جو "نُصیریوں" کے اس مشرکانہ عقیدہ کو اشاروں اور کنایوں میں سراہتی ہیں!

"محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا نبی بنایا اور نبوت کے سلسلہ کو آپ کی ذات پر ختم کردیا۔ اطاعتِ رسولؐ ہر مومن پر فرض عین ہے، آپ کی اتباع پر دین و دُنیا کی سعادت، فلاح اور نجات کا دارو مدار ہے۔ حضورؐ کی محبت کا معیار ہی یہ ہے کہ جس کو سرکارؐ کی ذات سے جتنی زیادہ محبت ہوگی، اُتنا ہی وہ سنتِ رسولؐ کے اتباع میں سرگرم ہوگا۔ جس کے دل میں معاذ اللہ رائی کے دانہ کے کروڑواں حصہ برابر حضورؐ کی ذات سے (خاک بدہن گستاخ) کدنہیں بے تعلقی ہوگی اُس کا ایمان معتبر نہیں، وہ ناشدنی منافق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عالم کیلئے رحمت ہیں۔ نذیر و بشیر ہیں، سراج منیر ہیں، صاحب قابِ قوسین ہیں۔ افضل الانبیاء ہیں۔ حضورؐ سے بہتر انسان پر آج تک آفتاب طلوع نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ قیامت کے دن لواء الحمد حضورؐ ہی کے دستِ مبارک میں ہوگا۔ اور جبکہ بڑے بڑے رتبہ والے انبیاء، اللہ کے عظمت و جلال کے آگے سکتہ میں ہوں گے، حضورؐ ہی شفاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض کریں گے!

غالب! ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کآں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

مگر مشکل اور مصیبت میں فریاد اللہ تعالیٰ ہی سے کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں کی جائے گی کہ کتاب و سنت کا یہی حکم ہے۔ اب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ و فریاد نہ کرنے اور اُسے درست نہ سمجھنے پر یہ فتویٰ لگادے کہ ایسا شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے، تو یہ کس قدر بے بنیاد الزام ہے۔ اور کتنی بے سرو پا تہمت ہے! حضورؐ کی عظمت و عزت اور مراتب و درجات اس سے وابستہ نہیں ہیں کہ آپؐ کو حلاّلِ مشکلات اور مستغاثِ سمجھا جائے۔ اور جو حضورؐ کو ان صفات کا حامل تسلیم نہیں کرتا وہ گستاخ ہے اور حضورؐ کے درجہ کو گھٹانے والا ہے (معاذ اللہ) یہ منطق ہی غیر عقلی ہے۔ اور سوچنے کا طرز ہی جاہلانہ ہے!

حضورؐ کے معجزات سے کون مسلمان ہے جو انکار کی جرأت کرسکتا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ مکہ میں دو آدمی تنہائی میں خفیہ مشورت کرتے ہیں اور مدینہ میں اللہ تعالیٰ آپ کو وحی خفی کے ذریعہ اُس کی خبر پہنچا دیتا ہے۔ یہ اللہ کی آیت ہے۔ جسے کلامی زبان میں "خرقِ عادت" اور عام اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ انہی سیرت کی کتابوں میں یہ واقعات بھی ملتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگائی جاتی ہے تو وحی کے آنے تک حضورؐ شدید مضطرب رہتے ہیں۔ ورنہ اتنے دن مضطرب

ہنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضورؐ تہمت کی افواہ سُنتے ہی فرما سکتے تھے کہ میں نبی ہوں اور نبی کے سامنے مشرق و مغرب کے تمام احوال و مقامات
منکشف ہوتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے، عائشہؓ اس تہمت سے پاک اور بری ہیں!

مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی افواہ سُن کر آپؐ صحابہؓ سے بیعت
نا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ عالم کہ مکہ کی خفیہ مشورت کی سینکڑوں
میل پر مدینہ میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ خبر پہنچا دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ کیفیت کہ مکہ سے چند میل کے فاصلہ کی حقیقت حال سے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام باخبر نہیں ہو پاتے۔ انہی واقعات سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بندہ کی بے اختیاری کا امتیاز
ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ چاہے نبی ہی کیوں نہ ہو، تمام عالم سے افضل ہونے کے باوجود بندہ ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و دستگیری کا
محتاج ہے۔ احتیاج بندگی کی ایسی صفت ہے جو کسی حالت میں جُدا نہیں ہو سکتی!

ایک طرف حضورؐ احوالِ قیامت کا پتہ و نشان دیتے ہیں اور دُوسری طرف قرآن کہتا ہے:۔

"وممن حولکم من الاعراب منٰفقون ط ومن اھل المدینۃ (قف) مردوا
علی النفاق (قف) لاتعلمھم نحن نعلمھم (توبہ)

(تمہارے آس پاس کے بادیہ نشینوں میں منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے
ہیں، انھیں تُو نہیں جانتا، ہم انھیں جانتے ہیں)

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب فرما کر کہ "اُن (منافقین کو) تُو نہیں جانتا ہم اُنھیں جانتے ہیں"۔ کیا (معاذ اللہ)
رسول کی شان کو گھٹانا چاہتا ہے۔ یہ آیت اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتا رہے ہیں کہ "علمِ کُل" خاص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ وہی
عالم الغیب والشہادہ" ہے اور اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں تک کو جن حالات و کوائف کی اطلاع دینی مناسب سمجھی دی ہے۔ اور
جن کی اطلاع مناسب سمجھی نہیں دی۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے انبیاء، ملائکہ، اولیاء، اور خواص و عوام سب سربسجود ہیں!

حدیث کی کتابوں میں یہ تک ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہو جاتا ہے، اور یہ بھی کہ حضورؐ ضعفِ بیماری
کے سبب کئی دن تک مسجدِ نبوی میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف نہیں لا سکے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امامت فرماتے ہیں ——
مستند واقعات بتاتے ہیں کہ بندہ کی فریاد کو وہی پہنچ سکتا ہے کہ جو حی و قیوم ہے، جس کی ذات پر زمانہ کی گردش اثر نہیں کر سکتی۔
جس کو نہ بیماری لاحق ہوتی ہے اور نہ نیند اور اونگھ آتی ہے، جس کی شان "الآن کما کان" ہے اور اس کے آستانہ پر ہر بلند
سے بلند پیشانی کا خاک آلود ہونا ہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔ (جل جلالہ وعم نوالہ)

قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء کرام تک کی بعض دعائیں قبول نہیں کی گئیں۔ حالانکہ ان سے بڑھ کر اللہ کا مقرب اور محبوب اور کوئی
نہیں ہو سکتا۔ سورۂ یوسف میں حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں اُن میں ایک طرف تو یہ ملتا ہے کہ
آپ بہت دُور سے پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی قرآن ہی بتاتا ہے کہ برسوں تک حضرت یعقوبؑ کو
اپنے سب سے زیادہ چہیتے بیٹے یوسفؑ کے حالات کی خبر نہیں ہوتی۔ اور اس غم میں آپ کی آنکھیں روتے روتے سفید ہو جاتی ہیں!

جب انبیاء کرام تک کے ساتھ یہ حالات پیش آئے ہوں، تو ہم کس دل، قطب، غوث اور شاہ ولایت صاحب کے بارے میں
یہ عقیدہ قائم کر لیں کہ اُن پر ہمہ وقت چودہ طبق روشن رہتے ہیں! اور ہر مضطرب کی فریاد وہ سُن سکتے ہیں۔ اور تمام انسانوں کے
احوال اُن پر روشن ہیں۔ اور وہ جس کیلئے جو دعا کر دیں گے وہ لازماً پوری ہو کر رہیگی۔ اُن کے کسی کہے کو اللہ تعالیٰ ٹال ہی نہیں سکتا۔ جو کوئی ایسا

عقیدہ رکھتا ہے، وہ کتاب و سنت کی بنیادی تعلیمات کا مذاق اڑاتا ہے!

بعض بزرگوں کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اُن پر "کشفِ قبور" ہوا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمام دُنیا کی قبریں اُن کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں اور اپنی وفات کے بعد اپنے ہر مرنے والے مُرید کی قبر میں جا کر اس کی قبر کو منوّر فرمایا کرتے ہیں۔ کسی بزرگ پر اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل کے کسی خطرے یا کیفیت کو منکشف فرما دیا۔ اس کرامت کے کیا یہ معنی ہیں کہ وہ بزرگ دُنیا کے تمام انسانوں کے دلوں کی خبر رکھتے ہیں یا جو کوئی بھی اُن کے پاس آتا ہے اُس کے دل کا حال جان لیتے ہیں!

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ہزاروں میل دُور کے ایک مقام کو منکشف فرما دیا تھا آپ نے "یا ساریہ! الی الجبل" کا نعرہ بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ساریہؓ کو حضرت عمرؓ کی آواز سُنوا بھی دی ـــ تو کیا اس کرامت سے یہ اصول وضع کیا جانا قرینِ صواب ہے کہ مملکتِ اسلامیہ کا ایک ایک گوشہ حضرت عمرؓ کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ اور اسلامی فوجوں کو جب بھی کہیں خطرہ پیش آتا تھا۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں بیٹھے کر اُسے دیکھ لیا کرتے تھے۔ اور وہیں سے فوج کے کمانڈروں کو کرامت کے ذریعہ مُطلع فرمایا کرتے تھے ـــ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے اور ٹھیک بتاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس لشکر گاہ سے خبر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو آپ انتہائی مضطرب رہا کرتے تھے۔ اور بعض گورنروں کی جب شکایتیں آپ کو ملی ہیں تو آپ تحقیقِ حال کے لئے سینکڑوں میل کے دشوار گزار سفر کی صعوبت برداشت فرما کر صوبہ کے صدر مقام پہنچے ہیں!

مسلمانوں کا ایک فرقہ واقعہ کربلا کی یاد اس طرح مناتا ہے ـــ کہ تعزیے ہیں، عَلَم ہیں، جھنڈیاں اور جھولے ہیں۔ چاقوؤں اور چھریوں سے ماتم ہے۔ زینوں میں تیر چھدے ہوئے گھوڑوں کا گشت ہے۔ یہ حضرات اس قسم کے تمام مظاہروں کو حُبِّ حسینؓ، عظمتِ اہلبیت اور واقعہ کربلا کی اہمیت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے دوسرے فرقے ان مظاہروں سے اجتناب کرتے ہیں اور انھیں بدعت سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر اس انداز سے شہادت کے واقعات کی یاد منائی جانی جائز ہوتی تو سب سے پہلے بدر و خیبر اور خندق و احد کے غزوات ان مظاہروں کے مستحق تھے۔ اُن جنگوں کی عظمت و اہمیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے، جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک رہے ہوں اور جو کافروں سے لڑی گئی ہوں۔ غزوۂ احد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کتنا بڑا دردناک واقعہ ہے کہ خود رحمۃ للعالمینؐ کا کلیجہ ہل گیا۔ مگر حضرت حمزہؓ کی شہادت کی یاد میں کیا کوئی تابوت، کوئی علم اور کوئی ضریح نکالی گئی؟ واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرنے کے لئے صدیوں تک اہلبیتؓ نے اس قسم کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ تمام عجمی بدعتیں ہیں جن سے حُبِّ حسینؓ اور اہمیتِ واقعہ کربلا وابستہ کر دی گئی ہے! بالکل اسی طرح قبروں پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ بدعات بلکہ خرافات ہیں۔ یہ چراغاں۔ یہ مزاروں کی گلپوشی اور صندل مالی۔ یہ چادروں اور گاگروں کے جلوس۔ یہ مزامیر کے ساتھ قوالیوں کے جمگھٹے، یہ آستاں بوسی اور گنبدوں کا طواف! ان کے لئے کتاب و سنت، صحابہ اور اہل بیت کے آثار میں کوئی دلیل اور نظیر نہیں ملتی۔ یہ سب بزرگوں کی محبت اور عظمت کے نام پر دین میں زیادتیاں اور اضافے ہیں!

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:-

> "اگر تو مشرکین عرب کے عقائد اور اُن کے اعمال اور ان کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اس زمانہ کے عوام اور جہلاء کو دیکھ لو کہ وہ قبروں اور تھانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جس میں اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی

اور اس کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی۔ خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔ (ملتقطاً۔ اردو ترجمہ)

حضرت ملّا علی قاری شرح مناسک میں فرماتے ہیں :۔

"لا یطوف ای لا ید ور حول البقعہ الشریفہ لان الطواف من مختصات الکعبہ المنیفہ فیحرم حول القبور الانبیاء والاولیاء الاعبرۃ بما یفعلہ الجھلہ ولو کانوا فی صورت المشائخ والعلماء۔

(مزار مبارک کے اردگرد نہ گھومے کیونکہ طواف کعبہ کے لئے مخصوص ہے، لہذا انبیاء و اولیاء کی قبروں کے گرد گھومنا حرام ہے اور ان جہلا کے فعل کا اعتبار نہیں اگرچہ وہ علماء اور مشائخ کی صورت میں ہوں)

مجمع البحار میں ہے :۔

من قصد لزیارۃ قبور الانبیاء والصلحاء ان یصلی عند قبورھم و یدعو عندھا ویسئلھم الحوائج فھذا لایجوز عند احد من علماء المسلمین فان العبادۃ وطلب الحوائج والاستغاثہ حق للہ وحدہٗ۔

(یعنی جس شخص نے اس غرض سے قبور انبیاء و صلحاء کی زیارت کا قصد کیا کہ اُن کی قبروں کے پاس نماز پڑھے اور اُن سے دعا مانگے اور اُن سے اپنی حاجتیں طلب کرے تو یہ علماء مسلمین میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ عبادت اور طلب حوائج اور استعانت اللہ ہی کا حق ہے)

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد سلطان العارفین قاضی حمید الدین ناگوری "توشیح" میں فرماتے ہیں :۔

"منھم الذین یدعون الانبیاء والاولیاء عند الحوائج والمصائب باعتقاد ان ارواحھم حاضرۃ تسمع النداء وتعلم الحوائج وذلک شرک قبیح وجھل صریح قال اللہ تعالیٰ ومن اضل ممن یدعون من دون اللہ ......"

(بعض وہ لوگ ہیں جو انبیاء اور اولیاء کو حاجت اور مصیبتوں کے وقت اس اعتقاد سے کہ اُن کی ارواح حاضر ہو جاتی ہیں اور اُن کی ندا کو سُنتی ہیں اور اُن کی حاجتوں کو جانتی ہیں، پکارتے ہیں، یہ شرک قبیح اور جہل صریح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں اُن سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر چراغ جلانے کو منع فرمایا ہے اور چراغ جلانے والے پر لعنت کی ہے۔ شیخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج النبوۃ میں لکھا ہے :۔

؎ ایک مشہور عالم کا یہ شعر پڑھئے :۔

اس میں روضہ کا سجدہ ہو کہ طواف ہوش میں جو نہ ہو وہ کیا نہ کرے

کہا جائیگا کہ مصرعہ ثانی میں "ہوش میں جو نہ ہو" جو کہہ دیا گیا ہے۔ مگر یہ شعر ذہن کو کس طرف لے جاتا ہے !!

"و بوسہ دادن قبر را و سجدہ کردن آنرا و کلہ نہادن حرام و ممنوع است و در بوسہ دادن قبر والدین روایت فقہی نقل می کنند و صحیح آنست کہ لا یجوز۔"

(قبر کو بوسہ دینا اور سجدہ کرنا اور رخسارہ رکھنا حرام و ممنوع ہے اور والدین کی قبر کو بوسہ دینے کے بارے میں فقہی روایت نقل کرتے ہیں مگر ٹھیک بات یہ ہے کہ (یہ بھی) جائز نہیں ہے۔" (بہ حوالہ الجنۃ لاہل السنۃ از صفحہ ۳۶ تا صفحہ ۳۸)

اگر ان تمام بدعات و خرافات کو کچھ لوگ اولیاء اللہ کی محبت اور عظمت کی نشانی سمجھتے ہیں تو یہ اُن کے خود تراشیدہ معتقدات اور اُن کا اپنا بنایا ہوا معیار ہے، ان بدعات کو اولیاء اللہ کی محبت اور عظمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کی خلاف شریعت باتیں خدا و رسول اور اولیاء کرام کی ناخوشی کا باعث ہوں گی۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل میں کچھ موافق اقوال، اشارات یا تاویلیں بھی ملتی ہیں۔ تو اُن کے بارے میں یہ عرض ہے کہ دینی مسائل میں صوفیاء کے ارشادات کے مقابلہ میں علماء کے اقوال کا وزن بہت زیادہ ہے کہ تصوف، شریعت کا پابند ہے۔ شریعت، تصوف کی پابند نہیں ہے۔ اوّل تو ان میں سے بعض بنیادی مسائل میں علماء متقدمین کے مابین اختلاف نہیں ہے، بعد کے علماء میں جو اختلافات نظر آتے ہیں اُسے کثرتِ آراء اور شخصیتوں کے وزن سے تولا جا سکتا ہے۔ انشاء اللہ حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی۔ اگر اس پر بھی کوئی اُلجھن باقی رہے تو کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کسوٹی پر کھوٹے کھرے کا بھید کھل جائے گا۔

قبروں کی زیارت کی اجازت ہے مگر میلے لگانے، چراغ جلانے، چادر چڑھانے اور مرادیں مانگنے کے لئے نہیں۔ وہاں جانے کی اجازت اس لئے ہے کہ صاحبِ قبر کے لئے دعائے مغفرت کرے، موت کا دھیان جمائے، اور عبرت حاصل کرے کہ یہ دن مجھے بھی دیکھنا ہے اور ایک دن قبر کا کونا مجھے بھی بسانا ہے۔ اور یہ سب منزلیں نیک اعمال کے ساتھ ہی آسان ہو سکتی ہیں اور ساتھ ہی اللہ کی رحمت پر نظر رکھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نے فرمایا ہے کہ میری بخشش بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کے سبب ہو گی — !

دین کے معاملہ میں جب یہ صورت پیش آئے کہ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہو اور دوسری طرف کسی بزرگ کا معمول۔ تو غیرتِ ایمانی کا یہ تقاضا ہے کہ سنتِ رسُول ہی پر عمل کرے۔ معیارِ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے !

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جب "سماع" شروع ہوتا تھا تو آپ کے مُرید حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ وہاں سے اُٹھ جاتے تھے اور مُرشد کے "معمول" پر اتباعِ سنت کو ترجیح دیتے تھے !

اللہ کی کتاب جوں کی توں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حضورؐ کی احادیث کتابوں میں محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام نے کتاب و سنت پر کس کس عنوان سے عمل کیا اُس کی تفصیل بھی موجود ہے۔ ائمہ فقہ کی دینی مسائل میں تشریح، تعبیر اور اجتہادات بھی ملتے ہیں۔ ہم کسی بزرگ اور عالم کے قول، فعل، معمول اور طریقہ کو ان پیمانوں سے ناپ سکتے ہیں۔ جس کسی کا کوئی قول و فعل یا معمول یا کشف و شہود اس کسوٹی پر پُورا نہ اُترے اُس کا رد کر دینا ہی اللہ اور رسُول کی محبت، غیرتِ دینی اور فراستِ ایمانی کی نشانی ہے !

بے نقاب!

حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد سراپا حق اور مجسمہ واقعیت ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ اسی طرح انسان اپنے قول و فعل سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم نے پچھلے ہزاروں انسانوں کو نہیں دیکھا۔ لیکن جب تاریخ و سیر میں اُن کی زندگیوں کو ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا تھا؟ چنگیز کو ظالم ہم اس لئے کہتے ہیں کہ اُس کے کارنامے جو تاریخ بتاتی ہے وہ انتہائی ظالمانہ اور بہیمانہ ہیں۔ نوشیرواں کے عدل کی شہرت اُس کے انصاف کی وجہ سے ہے، تاریخ میں اُس کے عادلانہ فیصلے اور اقوال ہمیں ملتے ہیں۔ اور انھیں پڑھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ جس شخص کا معاشرے کے ساتھ یہ سلوک ہو، اُسے عادل ہی ہونا چاہئیے۔

کسی شخص کے ماتھے پر شریف اور رذیل لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص کے کردار سے اُس کی شرافت اور رذالت کا پتہ چلتا ہے۔ کوئی ولی اور صالح آدمی اپنے ساتھ آسمانی وثیقہ، ربّانی سند اور غیب سے لکھا ہوا کوئی سارٹیفکٹ نہیں رکھتا کہ جسے پڑھ کر دُنیا یہ جان جائے کہ یہ شخص ولی ہے اور نہ کسی کی ولایت اور صالحیت کی غیبی آوازوں کے ذریعہ تصدیق ہوتی ہے اور نہ اُس کے نام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اولیاء اللہ اور صلحاء اُمت کی زندگیوں کو پڑھ کر ہم اُن کی صالحیت اور ولایت کا اعتراف کرتے ہیں اور اُن کی محبت اور احترام سے ہمارا دل معمور ہو جاتا ہے۔ اولیاء کرام اور صلحاء اُمت کی زندگیوں کو پڑھ پڑھ کر اور ان کے حالات سُن سُن کر خود ہم سب کے ذہن میں ولایت و صالحیت کا ایک معیار قائم ہو گیا ہے اور جب کوئی نئی اور اجنبی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم اُسی معیار پر اُس کے اقوال و افعال کو پرکھتے ہیں!

جن اولیاء اور صلحاء اُمت کو ہم جانتے ہیں، اُن کو اللہ نے دین کی فہم عطا فرمائی تھی۔ اُن کی زندگیاں پاکیزہ اور بااخلاق تھیں۔ اُن کی رفتار و گفتار میں وقار اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں غیرت اور شرم و حیا تھی کہ "حیا کو ایمان کی شاخ" فرمایا گیا ہے! اُن کی باتوں میں ربط و توازن تھا اور جہاں کہیں سوز و جذب کی جھلک آگئی ہے تو وہاں بھی اُن کے اقوال چاہے مبہم اور دقیق ہو گئے ہوں مگر غیر سنجیدہ نہیں ہونے پائے!

اور اولیاء اللہ اور صلحاء اُمت تو بڑی ہستیاں ہیں، عام شریف انسانوں سے دُنیا اخلاق، سنجیدگی اور وقار و غیرت کی توقع رکھتی ہے، جو آدمی خفیف حرکتیں کرتا اور گالیاں بکتا ہے۔ اُس کو معاشرت میں عزت و احترام کا مقام نہیں دیا جاتا۔ بازاری اور شریف آدمی میں امتیاز اور فرق کیا جاتا ہے۔

اگر کسی آدمی کے بارے میں یہ اطلاع ملے کہ فلاں آدمی عورتوں کے سامنے کھُلے خزانے پیشاب کر دیا کرتا ہے اور کبھی کبھی ہوا میں بھی اُڑنے لگتا ہے، تو کوئی ہوشمند شخص اُس آدمی کو ولی اللہ تو کجا، اُسے ایک مرد معقول بھی نہ سمجھے گا۔ اب رہا ہوا میں اُڑنا۔ تو ہوا میں اُڑنا اور دریا میں چلنا یہ ولایت کا کوئی لازمی نشان نہیں ہے کہ یہ کام ایک جادوگر بھی کر سکتا ہے۔ ہاں! زہد و تقویٰ، غیرت و حیا، وقار و سنجیدگی اور اتباع شریعت ولایت کے خواص و لوازم ہیں۔

ہم نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے کہ یہ کوئی مابہ النزاع مبحث اور اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ اس باب میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں بس یہ مقدمات ذہن میں رکھئے اور آگے بڑھیے:۔

اگست کا رسالہ "تاج" ہمارے سامنے ہے، اُس میں "تذکرہ تاج الاولیا" کے عنوان سے ایک مضمون ہے، جو محمد یوسف شاہ تاجی کی تالیف کا ایک جزو ہے۔ اس کا ایک اقتباس:۔

"حضور تاج الاولیاء، تاج الملت والدین شہنشاہ ہفت اقلیم سید محمد بابا تاج الدین ادام اللہ برہانہ

کی ذات ستودہ صفات موجودہ زمانہ میں حضور رحمۃ للعٰلمین کا مجسمہ ہے جس کی تعریف نہ کوئی کرسکا نہ کرسکے "

اس مبالغہ کے تیور ذرا دیکھتے جائیے ۔ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

"مجذوب کیلئے چند درجے ہیں ۔ بعض مجذوب کو ایک تہائی نبوت دیتے ہیں، بعض کو آدھی نبوت بعض کو چوتھائی نبوت، بعض کو آدھی سے زائد، جس کو آدھی سے زیادہ نبوت دی جاتی ہے تو وہ مجذوب صفت نبوت کے سبب تمام مجاذیب سے بڑھ جاتا ہے ۔ اور خاتم الاولیاء ہوتا ہے اور تمام ولیوں کا، مجذوبوں کا سردار ہوتا ہے ۔ جیسے ہمارے پیغمبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور سب کے سردار ہیں ۔ نبوت کا خاتمہ آپؐ پر ہوا ۔ اسی طرح ولایت کا خاتمہ اس مجذوب پر ہوا ۔ جذب پیمبری کا جزو ہے "

مرزا غلام احمد قادیانی دوسرے باطل دعووں کے علاوہ اپنی ذات میں نبوت کی ظلیت اور بروزیت کا بھی اعلان کرتا رہا ۔ مگر یہاں "ظل" و "بروز" کے اس موہوم پردے کو بھی اٹھا دیا گیا اور کسی ابہام اور لاگ لپیٹ کے بغیر صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ تاج الدین ناگپوری کو آدھی سے زیادہ نبوت دی گئی تھی ۔ ہم اس عبارت کو لکھ رہے ہیں اور قلم کانپ رہا ہے اور زبان بار بار "استغفراللہ" دہرا رہی ہے ۔ اس شخص کی جراٴت کو کیا کہئے جس نے یہ عبارت لکھی ہے ۔ اور اس کی جسارت پر کن لفظوں میں ملامت کیجئے جو ان خرافات کی اشاعت کر رہا ہے !

جس "خاتم الاولیاء" (؟) کو مدیر ماہنامہ "تاج" کے پیرو مرشد یوسف شاہ تاجی صاحب ۱/۲ یا ۳/۴ نبی سمجھ رہے ہیں ۔ ان کی زندگی کی چند جھلکیاں ناظرین نے دیکھ لیں ۔ تو پھر "سلسلۂ تاجی" اور "خانوادۂ ناگپوری" کھل کر سامنے آجائے گا ۔

"تذکرۂ تاج الاولیاء" ۔ ایک کتاب کا نام ہے ۔ جس کے مؤلف کوئی صاحب "محمد حسام الدین" ہیں ۔ مؤلف کے تعارف میں لکھا ہے ۔ "ہمشیرزادۂ حضرت بابا صاحب قبلہ" ۔ کتاب کی پیشانی پر آیت کریمہ "الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون" ثبت ہے ۔ اور کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا ہے :-

"یعنی تاج الاولیاء، رئیس المجاذیب المتاخرین حضرت سیدنا بابا تاج الدین ناگپوری قدس سرہ العزیز کی سیرت پاک اور ملفوظات طیبہ کا بیش بہا مجموعہ "

اس "سیرت پاک" (؟) اور "ملفوظات طیبہ" (؟) کے چند اقتباسات :-

"کبھی جنگل میں، کبھی بستی میں گشت لگاتے، کبھی مکان آجاتے تو نانی صاحبہ آپ کے لئے کھانا پیش کرتیں، تو آپ کھانا پھینک دیتے اور کنکر پتھر یہ فرماتے ہوئے نوش فرماتے "دیکھو نانی جی! آج کل ہم یہی کھاتے ہیں" کبھی ایسا ہوتا کہ جب آپ گھر تشریف لاتے اور نانی صاحبہ کھانا پیش کرتیں تو حضور فرماتے "میرے ساتھ آؤ، کھانا کھاتا ہوں" تو یہ بےچاری آپ کے ہمراہ گھنٹوں پھرتیں اور جب حضور آپ سے مخاطب ہوتے تو یہ کھانا آگے بڑھاتیں تو ارشاد

---

[1] ان اقتباسات اور حوالوں کیلئے ہم جناب مولوی ابومنظور شیخ احمد (ناندیڑ ۔ دکن) کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

ہوتا کہ "یہاں نہیں کھانا"۔ کسی مقام کو بتلا کر فرماتے "وہاں کھاتا ہوں"۔ غرض حضور آپ کو بہت پھراتے۔ جب پھرتے پھرتے یہ تھک جاتیں تو حضور کھانا لے کر زمین میں دفن فرما دیتے اور مٹی، پتھر تناول فرماتے"۔ (صفحہ ۲۵-۲۶)

پکے پکائے کھانے کو دفن کر دینا، کھانے کا بیجا استعمال اور کفرانِ نعمت ہے۔ بوڑھی نانی کو اس طرح حیران پریشان کرنا اور پھرانا۔ اگر شانِ جذب ہے تو اس سے قساوتِ قلبی کی بُو آتی ہے اور مٹی پتھر کھا لینا کسی انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ پکا پکایا کھانا بھی اُسے میسّر ہو۔ یہ بالکل فاتر العقل لوگوں کی باتیں ہیں۔

یہ تو "سیرتِ طیبہ" کا ایک سادہ سا ورق ہے، اوراقِ رنگا رنگ تو اب آپ کے سامنے آ رہے ہیں:-

"ایک روز حضور ایک درخت پر جو سرِ راہ تھا بیٹھے تھے کہ ایک مارواڑی درخت کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ حضور نے اس پر پیشاب کر دیا۔ مارواڑی نے پلٹ کر حضور کی جانب طیش سے دیکھا تو حضور نے ارشاد فرمایا "دیکھتا کیا ہے مقدمہ جیت کر لے آ"۔ (اس کے بعد مارواڑی کے مقدمہ جیتنے کا ذکر ہے) (صفحہ ۲۸)

ایک راستہ چلتے آدمی پر درخت پر بیٹھ کر پیشاب کر دینا اگر جذب و کرامت ہے تو پھر تہذیب و شائستگی کو چاہیئے کہ اپنا گلا گھونٹ کر مر جائیں!

"ایک یورپین عہدہ دار کی بیوی باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ حضور نے اس کے سامنے جا کر پیشاب کیا۔ ایسا ہی چار پانچ دفعہ حضور نے اس کی بیوی کے سامنے پیشاب کیا" (صفحہ ۳۰)

"ایک روز حضور بالکل برہنہ یورپین لیڈیز کلب میں گھس گئے۔ اسی طرح آپ نے دوسرے روز بھی کلب میں گھس کر پیشاب فرمایا"۔ (صفحہ ۳۰)

ایک طرف یہ کھلی ہوئی بے حیائی۔ اور دوسری طرف صاحبِ ملفوظات کا یہ دعویٰ کہ "مجھے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے"۔ بہ فرضِ محال اس کو مان بھی لیا جائے کہ بابا تاج الدین ناگپوری کی واقعی نورِ ولایت میں حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تربیت فرمائی تھی اور اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا تھا ـــ تو وہ سیدہ فاطمۃ الزہرا!-

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اس ردائے نجابت پہ لاکھوں سلام

اور

آسیا گردان و لب قرآں سرا

کہ شرم و حیا اور غیرت و وقار جن پر ختم تھا، کیا اُن کا تربیت یافتہ اور پیغامبر ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ کہ عورتوں کے مجمع میں ننگا گھس جائے اور ان کے سامنے بار بار پیشاب کرے۔ حضرت خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا اس کردار کے ایک غیر ذمہ دار آدمی کی مُربّی ہوں اور اسے اپنا قاصد اور پیغامبر بنا کر بھیجیں۔ یا اللہ! یہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں ـــ تیرے غضب اور جلال کی دہائی!

"حیا" پر حضور کی (ان ناگپور کے مصنوعی "حضور" کی نہیں۔ اُن کی جو واقعی حضور ہیں۔ اُن پر درود و سلام ہوں) دو حدیثیں

ناظرین کے غور وفکر کے لئے پیش کی جاتی ہیں :-

"عن ابن عمر اَنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الحیاء والایمان قُرنا ءُ جمیعاً فاذا رُفع اَحدُھما رُفع الآخر"

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور ایمان یہ دونوں ہمیشہ ساتھ اور اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک اُٹھا لیا جائے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے)

(صدقت یارسول اللہ)

"عن ابی ھریرہؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحیاء من الایمان والایمان فی الجنہ والبذاءُ من الجفاء والجفاءُ فی النار"

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے (یا ایمان کا ثمرہ ہے) اور ایمان کا مقام جنت ہے اور بے حیائی و بے شرمی بدکاری میں سے ہے اور بدی دوزخ میں لے جانے والی ہے)

(صدقت یا نبی اللہ)

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات واقوال کہ جو معنوی تقدیس اور اخلاقی بلندیوں کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اپنا آپ جواب ہیں۔ ایک ایک لفظ کس قدر متوازن اور دل نشین ہے۔ اور دوسری طرف اس "بڑ" کو ملاحظہ کیجئے :-

"جب حضور وسط ندی میں پہنچے تو آپ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے فرمانے۔ ہو! حضرت اللہ کے پاس ساڑھے تین پیسے ہیں۔ تین پیسے لے لیا۔ آدھا پیسہ لیا، جب شاہ تاج الدین" (ص۷۲-۷۳)

اور

"حضور کبھی کبھی گالیاں ارشاد فرمایا کرتے تھے" (ص۵)

جی! "حضور"؟ جب عورتوں کے سامنے برہنہ ہو کر پیشاب کر دیا کرتے تھے تو "گالیاں ارشاد فرمانا" اُن کے نزدیک کیا بڑی بات تھی —— حضور (؟) ہی جو ٹھہرے!

تذکرہ تاج الاولیاء کے تین صفحوں (ص۱۳۶ تا ص۱۳۸) پر بابا تاج الدین ناگپوری کی ایک کرامت درج ہے کہ ایک مُردہ لڑکی کے مُنہ میں باباصاحب کا جھوٹا پانی ڈالا گیا اور لڑکی اُٹھ کر بیٹھ گئی — پھر![1]

"حضور نے شبانہ روز گانا سُنا اور اُس کو خوب نچوایا"

اور "جب رنڈیاں حضور کے دربار میں گانے اور ناچنے لگتیں تو آپ فرماتے "میں بھی ناچوں، ناچوں، گاؤں"

---

[1] اپنی اس "کرامت" کی کچھ قیمت بھی تو وصول کرنی تھی۔

اور گاتے تو آپ کا چہرہ اس قدر سُرخ ہو جاتا کہ لوگ آپ کے چہرہ پر نظر نہ جما سکتے تھے" (صفحہ ۱۵۳)

کیا عجب ہے کہ "تصوف اسلامی" (؟) کے یہ دعویدار بلکہ ٹھیکہ دار رنڈیوں کے ناچ دیکھنے اور گانا سُننے کو "سماع" کی وہ ...م قرار دے دیں، جس کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ "اہل کو حلال اور نااہل کو حرام ہے"۔

"داس گرو مہاراج ـــــ آپ برہمن ہیں۔ حضور کے خاص نظر کردہ ہیں، ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں، صاحب دل ہیں اور صاحب کشف ہیں، ہمیشہ اشعار ذیل حضور باباصاحب قبلہ کی شان میں پڑھتے اور حضور کے نام کی مالا جپتے ہیں اور بعد میں پوجا کرتے ہیں:۔

بابا رحم کرنا، بچوں کا پالن کرنا ۔۔۔ میں اندھا ہوں بندہ تیرا مجھ کو پربھو دکھلانا

(صفحہ ۱۸۳ و صفحہ ۱۸۴)

یہ وہ عجمی "تصوف" ہے جو کفر و ایمان کو گلے ملاتا اور دیر و حرم کے فرق کو مٹاتا ہے۔ جس میں صاحب کشف اور صاحب ...ل ہونے کے لئے "ایمان" کی قید نہیں۔ اور "تذکرہ تاج الاولیاء" کے صفحہ ۴۷ پر تو جو گالی تاج الدین ناگپوری صاحب سے ...سوب ہے وہ اس قدر فحش ہے کہ اُسے ہم شرم کے مارے دُہرا نہیں سکتے!

ایک طرف یہ زندگی ہے، جس کی چند جھلکیاں آپ دیکھ چکے ہیں۔ دُوسری طرف آپ کے سامنے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور کلمات طیبہ کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جو ماہ اکتوبر کے ماہنامہ "تجلّی" (دیوبند) سے ماخوذ ہیں:۔

"ایک بار آپ نے دیکھا کہ خلیفہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی ڈاڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ جب اُس نے نماز ختم کی تو آپ نے اُسے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح کی نماز، نماز نہیں ہے۔ یہ نماز قیامت کے روز ناپاک گیند کی صورت میں تیرے مُنہ پر ماردی جائے گی"۔

یہ ہے اہل اللہ کا **"جذب و سوز"** جو وقت کے مسلمان بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو اس طرح ٹوکتا ہے اور ایک وہ جذب" ہے جو کافروں کی روحانی تربیت کرتا ہے۔

"ایک روز آپ (سفیانؒ ثوری) حمام میں گئے۔ اتفاق سے ایک بے ڈاڑھی مونچھ کا لڑکا وہاں آگیا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی اسے باہر نکال دو۔ کیونکہ ہر ایک عورت کے ساتھ تو ایک ہی شیطان رہتا ہے۔ لیکن اس قسم کے لڑکوں کے ساتھ اٹھارہ شیطان رہتے ہیں جو اُن کو لوگوں کی نظروں میں مزین کر کے پیش کرتے ہیں"۔

ایک طرف تصوف کا یہ اخلاق و تقویٰ ـــ دوسری طرف "جذب و تصوف" (؟) کی وہ بے راہ روی کہ رنڈیوں کا گانا سنا ...دران کا ناچ دیکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ "تذکرہ تاج الاولیاء" کے مؤلف کے بقول ایک مری ہوئی لڑکی[1] کو اپنی کرامت سے ...ندہ کر کے اُس بیچاری کو بھی نچوایا جاتا ہے۔

ایک طرف وہ ملفوظات کہ جن میں نہ صرف یہ کہ بدحواسیاں اور بے ربطیاں بلکہ گالیاں تک پائی جاتی ہیں اور دُوسری

---

[1] نہ جانے اصل واقعہ کیا ہے؟

طرف اخلاق و شائستگی اور عرفان و حکمت کے یہ گہرہائے شب چراغ ملتے ہیں۔

"آپ فرمایا کرتے تھے کہ اے حدیث کے جاننے والو! حدیث کی زکوٰۃ دو۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت حدیث کی زکوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا "دو سو حدیثوں میں سے پانچ پر عمل کرنا"۔

"فرمایا — اگر ایک سال میں آنکھوں سے آنسو ایک ہی قطرہ نکلے۔ لیکن وہ ہو، خدا ہی کے لئے تو یہ بھی بہت ہے"۔

"فرمایا — جو درویش کسی امیر و سلطان کا فریفتہ ہو، جان لو کہ وہ چور اور ریاکار ہے"۔

"فرمایا — پہلی عبادت خلوت نشینی ہے، پھر طلب علم ہے۔ اس کے بعد علم پر عمل اور اس کے بعد اس کی اشاعت"۔ (ملفوظات، حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ)

یہ ہیں وہ اہل اللہ جنہوں نے عرفان و ہدایت اور سلوک و تصوف کی شمعیں روشن کی ہیں۔ جن کا "جذب" بھی شریفانہ اور شائستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمتیں نازل ہوں۔

ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے، جنہوں نے بے حیائی کی باتوں کو "کرامت" اور گالیوں کو "کلمات طیبات" سمجھ رکھا ہے۔ اور اس خرافات کو عرفان و تصوف کا بہت بڑا کارنامہ سمجھ کر منظر عام پر لا رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ وہ اس طرح اسلام کے نام کو بٹہ لگا رہے ہیں!

اگر اس قسم کی خلافِ شریعت اور خلافِ اخلاق باتوں کو ہی "جذب" کہتے ہیں اور اس مزاج و کردار کے آدمی "مجذوب" کہلاتے ہیں، تو یہ پورا فلسفۂ جذب و سوز اسلام کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا اور اس قسم کے لایعقل لوگوں کی حرکات پر "جذب" کا ٹھپہ لگا کر "جذب" کے بارے میں یہ تک کہہ دینا کہ:-

"جذب پیمبری کا جزو ہے"۔

حضورؐ کی "سیرت مقدسہ" پر کتنا گمراہ کن الزام ہے!

ایک آدمی کسی دماغی مرض کی وجہ سے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ مخبوط اور مجنون ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی سے شریعت کی پابندیوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کوئی ان غیر ذمہ دارانہ حالات کو "جذب" اور ایسے ہوش و حواس کھوئے ہوئے آدمی کو "مجذوب" ہی کہنے پر اصرار کرتا ہے، تو وہ کہہ سکتا ہے۔ مگر جب اس قسم کے مجذوب کو یہ سمجھا جائے:-

"شہنشاہ ہفت اقلیم سید محمد بابا تاج الدین انار اللہ برہانہ کی ذات ستودہ صفات موجودہ زمانہ میں رحمۃ للعٰلمین کا مجسمہ ہے، جن کی تعریف کوئی کر سکا نہ کر سکے"۔

تو ان "مبالغوں" کو کوئی غیرت مند کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔ اس ہوش و حواس، مزاج، اخلاق اور گفتار و کردار کے آدمی کو "حضور رحمۃ للعٰلمین کا مجسمہ" کہنا کتنا بڑا بول ہے۔ جس کے تصور سے ایمان لرز جاتا ہے کہ یا اللہ! یہ ہم کیا سن رہے ہیں اور یہ ہو کیا رہا ہے؟

اگر غیر مسلموں کے سامنے تاج الدین ناگپوری کے سوانح حیات پیش کر کے یہ کہا جائے کہ "یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجسمہ تھے" تو خود حضورؐ کی ذات کے بارے میں غیر مسلم کیا رائے قائم کریں گے؟

ہم نے "جذب و تصوف" کی بے اعتدالیاں بھی دیکھی ہیں۔ شرح و بیان میں بھی اور قول و عمل میں بھی۔ مگر رسالہ "تاج" نے

تو تمام حدوں کو توڑ دیا ہے:۔

جنہیں دیکھا ہے میں نے بھی، جنہیں پوجا ہے میں نے بھی
وہی آقا وہی سرکار، تاج الدین بابا ہیں! (رسالہ "تاج" ماہ اگست ۵۶ء)

خود ایک شعر ذہین شاہ تاجی مدیر "تاج" کا بھی اس شمارے میں شائع ہوا ہے:۔

حقیقت ثم وجہ اللہ کی ہے منکشف ہم پر
جدھر منہ کیجئے سرکار تاج الدین بابا ہیں (استغفر اللہ)

اگر یہ "وحدت الوجود" ہے تو پھر "شرک" کسے کہتے ہیں۔

خود بابا تاج الدین ناگپوری کا یہ دعویٰ کہ:۔

"مجھے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔"

مرید بابا تاج الدین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو "آدھی سے زیادہ نبوت دی گئی تھی"۔ اور "وہ حضور رحمۃ للعلمین کے مجسمہ تھے"۔۔۔ اور۔۔۔ "جن کی تعریف نہ کوئی کر سکا نہ کر سکے"۔

حالانکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے سزاوار ہیں۔۔۔ پھر بابا تاج الدین سے "پوجنے" اور "ثم وجہ اللہ" کی صفات کی نسبت۔۔۔ ان کڑیوں کو ملا کر سوچئے کہ گمراہی کی کس حد تک یہ معاملہ پہنچ چکا ہے!! توبہ!

مدیر "تاج" کے مسلک و مشرب کو ہم ایک حد تک جانتے تو تھے۔ مگر اس کا پتہ نہ تھا کہ یہ حضرت ان بھول بھلیوں کی اس آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر صرف "وحدت الوجود" ہی کا مسئلہ ما بہ النزاع ہوتا تو اس پر گفتگو ہو سکتی تھی۔ مگر "سلسلۂ تاجی" کے "فکر و عمل" اور معتقدات کی جو چند جھلکیاں اوپر پیش کی گئی ہیں اس کے بعد ہم کہیں تو کیا کہیں؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے!
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

ہم "تبصرہ پر تبصرہ" اور "جواب علی الجواب" کے اس سلسلہ کو بند کرتے ہیں۔ ہم نے اس فرصت میں خاصی شرح و بسط کے ساتھ جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ ارباب بصیرت کو اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے بہت کافی ہے کہ کس کا کیا موقف ہے!

ہم دعا کرتے ہیں کہ جس "جذب و سوز" کا ماہنامہ "تاج" مبلغ و ناشر ہے، اس کی پرچھائیں سے بھی مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ بچائے رکھے، اور مسلمانوں کو اس انسانِ کامل اور داعیٔ برحق کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے، جن کی زندگی غیرت و شائستگی، وقار و سنجیدگی، شرم و حیا اور پاکیزگی و تقویٰ کے پھولوں سے معطر ہے۔ اور جن کی نعلین مبارک کے ذرّے بھی جس انسان کو چھو جائیں گے وہ شائستہ اور غیرت مند ہو جائے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور ہر بے حیائی، فحاشی اور بے راہ روی سے برأت کا اعلان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے صحتِ جسم و روح، اصابتِ فکر و نظر، غیرت و نیکوکاری، خوش اخلاقی اور اتباعِ سنّت کی توفیق طلب کرتے ہیں (آمین!)

ہادئ اکبرؐ

ساقی جاوید بی اے

خوشا وہ ہادئ اکبرؐ وہ رہنمائے عظیم
نظر نظر میں تجلی نفس نفس میں شمیم

خوشا زمیں پہ وہ بھیجا ہوا خدا کا رسولؐ
حجاز و نجد کے صحرا میں زندگی کا وہ پھول

وہ بزمِ قدس رسالت کی آخری مشعل
وہ سلسبیلِ ہدایت کا جگمگاتا کنول

وہ جس نے لات و ہبل کا طلسم توڑ دیا
فضائے قدس سے رشتہ زمیں کا جوڑ دیا

وہ جس کی گود میں لی رحمتوں نے انگڑائی
محیطِ خلد بنی اِس زمیں کی پہنائی

وہ جس نے کاکلِ ہستی کے پیچ کھول دیئے
مئے حیات میں مشک و عبیر گھول دیئے

وہ جس نے تیرہ ضمیروں کو مہر و ماہ کیا
صنم کدوں کے غلاموں کو عرش جاہ کیا

چراغ سطوتِ شاہی کے گُل کئے جس نے
سیاہ رات کے پردے اُلٹ دیئے جس نے

وہ دوشِ پاک پہ ڈالے ہوئے دریدہ گلیم
اُٹھا جلو میں وہ لے کر اک انقلابِ عظیم

وہ انقلاب جو ہے سنگِ میلِ بدر و حنین
زمیں کو جس نے پلایا ہے خونِ گرمِ حسینؓ

وہ انقلاب کہ قرآنِ پاک جس کی دلیل
دلوں میں جس نے جلادی یقین کی قندیل

وہ انقلاب کہ جس سے ہے گرم نبضِ حیات
چمک رہی ہے ابھی تک جبینِ نیل و فرات

کھلے ہیں جس کی ہواؤں سے مصر و شام کے پھول
ہوا ہے فارس و روما پہ زندگی کا نزول

لیا ہے سطوتِ کسریٰ و کے سے جس نے خراج
بدل دیا ہے زمانے کا تلخ و ترش مزاج

اُس انقلاب کی شمعیں جلیں گی ہستی میں
زمانہ کتنا ہی ڈوبے خرد کی پستی میں

افکار

عاصی کرنالی

کہیں دُنیا میں مروت کی نظر ہے کہ نہیں
یہ نیستاں ہے، یہاں کوئی شرر ہے کہ نہیں

حُسن نے ڈال لیا عارضِ رنگیں پہ نقاب
کہ کوئی واقفِ آدابِ نظر ہے کہ نہیں

لوگ سورج کے نکلنے کو سمجھتے ہیں سحر
سوچتا ہوں کہ یہ مفہومِ سحر ہے کہ نہیں

جن کی کرنوں سے ہیں تقدیر کی راہیں روشن
اُن ستاروں کو کچھ اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں

پھول کے بعد ذرا خارِ گلستاں کو بھی دیکھ
وہی نظارہ بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں

موجِ دریا کی طرح چاہیئے ہستی کا سفر
یہ نہ دیکھو کہ کوئی راہ گزر ہے کہ نہیں

چمنِ شوق کی افسردہ کلی ہیں ہم لوگ
اِس طرف بادِ مروّت کا گزر ہے کہ نہیں

اشکِ اخلاص جسے کہتے ہیں لے دیدۂ تر
تیرے دریا میں وہ انمول گہر ہے کہ نہیں

آدمی عیب سے بچتا رہے، یہ بھی ہے ہنر
آپ انصاف سے کہیئے، یہ ہنر ہے کہ نہیں

عرضِ نیاز

فضا ابن فیضی

الٰہی مجھ کو بینائی عطا کر
خدائی کو تماشائی عطا کر

مرا نالہ رہینِ خاک کیوں ہو
اسے تو عرش پیمائی عطا کر

رہے تیری طلب، پا کر بھی تجھ کو
وہ ذوقِ ناشکیبائی عطا کر

مرے ذرّوں کی تقدیرِ زبوں کو
طرازِ انجم آرائی عطا کر

لبِ قلزم کو وسعت دینے والے
اس اک قطرے کو پہنائی عطا کر

مری دنیا کی پیرانہ سری کو
توانائی و برنائی عطا کر

ہیں ہنگاموں سے اب اُکتا گیا ہوں
مجھے محفل میں تنہائی عطا کر

ہیں محرومِ بصیرت دل کی آنکھیں
عطا کر ان کو بینائی عطا کر

ہنر کے بربطِ خاموش کو پھر
ہوائے نغمہ پیرائی عطا کر

طبیعت ہو جو غواصِ معانی
تو دُرِّ نکتہ آرائی عطا کر

سوادِ خطِ طغرائے جبیں کو
فروغِ روئے دانائی عطا کر

تخیل کو بلندی کی سند دے
تفکّر کو توانائی عطا کر

رہے حسنِ بیاں میں دلفریبی
زباں کو لطفِ گویائی عطا کر

فضا کے ناتراشیدہ قلم کو
تمیزِ نکتہ آرائی عطا کر

نقشِ تازہ

ماہر القادری

منزلیں ہی منزلیں ہیں کارواں کے سامنے
گرد ہیں لیکن یہ سب عزمِ جواں کے سامنے

میرے شکوے اُس بُتِ نامہرباں کے سامنے
آبگینے جس طرح کوہِ گراں کے سامنے

اب نہیں ہے کچھ بھی سعیِ رائیگاں کے سامنے
ایک نقشِ سجدہ پھر بھی اُن کے آستاں کے سامنے

رکھ دیئے کس شوخ نے کچھ جھلملاتے سے چراغ
ماہ و انجم کے مقابل، کہکشاں کے سامنے

خندۂ گل، گریۂ شبنم، چمن کی دھوپ چھاؤں
کتنے نازک مسئلے ہیں باغباں کے سامنے

چوٹ کھانے کو ترستا ہے بڑی مدت سے دل
لے چلو مجھ کو کسی ابرو کماں کے سامنے

زمزمہ سنجانِ گلشن، خوشنوایانِ بہار
دم بخود ہیں سب مری طرزِ فغاں کے سامنے

روحِ انتخاب

عبدالقادر عودہ شہید

ہم مسلمان اس بات پر تو بہت خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ ہم اسلام سے منسوب ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم اسلام کے اہم ترین احکام سے ناواقف ہیں اور اس کی عظیم ترین بنیادوں سے لاپروائی برتتے ہیں!

اسلام کے احکام عبارت ہیں اُن مبادی اور نظریات سے جن کو لے کر قرآن نازل ہوا اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس لائے، انہی مبادی اور نظریات کو ہم اسلامی شریعت کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے شریعت مجموعہ ہے اُن مبادی و نظریات کا جس کو اسلام نے توحید، ایمان، عبادات، شخصی احوال، جرائم، معاملات اجتماعی، ادارات اور سیاست، غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جاری و نافذ کیا ہے!

اسلام کی بنیادوں میں عظیم ترین بنیاد اس کے احکام کو روبہ عمل لانا ہے۔ کیونکہ اسلام اپنے احکام کی تعلیم و دعوت اور اپنے شعائر اور ضابطوں کی اقامت کے بغیر پایا نہیں جاسکتا۔ اس طرح یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جس نے شریعتِ اسلامی پر عمل کی طرف سے لاپروائی برتی یا اس کو معطل کردیا تو گویا اس نے اسلام ہی سے غفلت برتی اور اس کو معطل کردیا۔

اسلامی احکام دو نوں نوعیت کے حامل ہیں۔ ایک تو وہ احکام ہیں جن سے "مذہب" کی اقامت ہوتی ہے اور یہ مشتمل ہیں عقائد و عبادات کے احکام پر۔ اور دوسرے وہ احکام ہیں جس کے ذریعہ سلطنت و جماعت کی تنظیم ہوتی ہے۔ اور افراد اور جماعت کے باہم روابط کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اور یہ احکام معاملات، تعزیرات، شخصی حالات، دستوری اور حکومتی ضوابط و قوانین وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اس طرح گویا اسلام مسجد و ایوان، عبادت و قیادت سب کو اپنے دائرہ میں لے کر ان کے درمیان امتزاج پیدا کرتا اور دین و دُنیا کی تفریق کو مٹاتا ہے۔ جس طرح مذہبی احکام اسلام کا جزو ہیں اسی طرح حکومت اس کا دوسرا اہم جزو ہے۔ اور بالکل سچ فرمایا عثمان غنیؓ نے کہ:-

اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ!

(اللہ تعالیٰ اقتدار کے ذریعہ اس شر کو دفع فرماتا ہے جو قرآن کے ذریعہ دفع نہیں کرتا!)

اسلام کے احکام اپنے تنوع اور کثرت کے باوجود محض دُنیا و آخرت میں انسان کی سعادت و فلاح کے مقصدِ وحید کے لئے ہیں یہیں سے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر دُنیوی عمل کا اُخروی پہلو ہوتا ہے۔ پس کوئی تعبدی فعل ہو کہ مدنی، جنائی ہو کہ دستوری یا حکومتی، اس کا ایک اثر ادائے فرض کے پہلو سے یا مسائل کے حل و عقد کے تعلق سے یا کسی کا حق دلوانے یا ساقط کرنے کی رُو سے یا کسی سزادہی کی خاطر یا جواب دہی کے ضابطوں کے معاملہ میں دُنیا میں مترتب ہوتا ہے۔ لیکن وہی فعل جس کا اثر اس طرح دُنیا میں مترتب ہوتا ہے اس کا ایک دوسرا اثر آخرت کی زندگی پر بھی مترتب ہوتا ہے اور وہی آخرت کا عذاب و ثواب کہلاتا ہے۔

جب شریعت کا مقصد ہی دُنیا و آخرت میں لوگوں کی سعادت و فلاح ٹھہرا تو وہ ایک ایسی وحدت ہے جو تجزیہ کو

قبول نہیں کرتی اور ایک ایسا تسلسل ہے جو کبھی ٹوٹتا نہیں تو پھر اس کا کچھ حصہ لے لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا اس کے مقصد کو فوت کر دینے کے مترادف ہے !

شریعتِ اسلامی کے احکام دُنیا و آخرت کے لئے یونہی عبث شروع نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ خود شریعت کی منطق ہی اس کی مقتضی ہوئی ہے۔ شریعت کے اصول اس نظریہ پر قائم کئے گئے ہیں کہ یہ دُنیا آزمائش و فنا کی جگہ ہے۔ اور آخرت بقاء اور جزاء کا گھر۔ انسان اپنے اعمال کے لئے دُنیا میں مسئول ہے اور آخرت میں جزاء و سزا کا مستحق۔ اگر اس نے یہاں اچھے کام کئے تو اپنا بھلا کیا اور اگر بُرے کام کئے تو اپنا بُرا کیا۔ نیز یہ بات کہ صرف دُنیوی سزا اُخروی سزا کو روک نہیں دیتی کہ وہ اس سے خود بخود ساقط ہو جائے اِلّا یہ کہ انسان سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے اور اس کی طرف رجوع لائے۔

شریعتِ اسلامی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے بالکل ممتاز ہے۔ کیونکہ اس نے دین و دُنیا کی تفریق کو ختم کر کے دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ اور وہ دُنیا و آخرت دونوں کے لئے شروع کی گئی ہے اور یہی وہ بات ہے جو شریعت پر ایمان رکھنے والوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کی اطاعت علانیہ اور پوشیدہ ہر حال میں کریں۔ مشکلات میں بھی کریں۔ اور آسانی و فراغت کے وقت بھی کریں کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور احکامِ شریعت کے پابند ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ اطاعت بھی عبادت ہی کی ایک نوع ہے جو اُن کو اللہ تعالیٰ کا قرب بخشتی ہے اور یہ کہ اس قانونِ الٰہی کی اطاعت کے نتیجہ میں اُن کو اس کا بہترین صلہ ملے گا !

یہ سب چیزیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ایک ایسے معاشرے میں جو مذکورۂ بالا تصورات کی بُنیاد پر قائم کیا گیا ہو۔ کم سے کم جرائم ہوں، اس میں امن کی محافظت اور نظمِ اجتماعی کی صیانت وجود میں آئے۔ برخلاف اس کے انسان کے خود ساختہ قوانین کا کیا حال ہے؟ ان لوگوں کے باطن میں جن پر کہ یہ منطبق ہوتے ہیں عام طور پر کوئی اندرونی محرک ایسا نہیں ہوتا کہ از خود انھیں ان قوانین کی اطاعت پر آمادہ کرے۔ وہ صرف ان کی اتنی ہی اطاعت کرتے ہیں جتنا کہ ان کی ظاہری گرفت کا اُنھیں اندیشہ ہوتا ہے اور اگر کوئی کسی بھی جرم کے ارتکاب کی طاقت رکھتا ہے اور اس کا موقع پاتا ہے اور قانون کی پکڑ کا اندیشہ بھی نہیں رکھتا تو پھر اس کو اس جرم کے ارتکاب سے روکنے کے لئے واضعانِ قانون کے ہاں نہ کوئی اخلاقی ضابطہ ہے، نہ طریقہ کار، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان ممالک میں کثرت سے جرائم ہو رہے ہیں اور روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ جہاں قانون کا اطلاق تو وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے مگر اخلاق کمزور سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور مجرموں کی تعداد "روشن دماغ" تعلیم یافتہ طبقات میں اخلاقی فساد کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس گروہ کے افراد خود اپنے قانون کی گرفت سے بچ نکلنے میں انتہائی کمال کا مظاہرہ کرتے ہیں !

احکامِ شرعی ناقابلِ تقسیم ہیں اور تفریق کو ہرگز قبول نہیں کرتے۔ یہ محض اسی لئے نہیں جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے کہ تفریق شریعت کے مقصد کو فوت کر دیتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ شریعت کے نصوص میں اس بات کی سختی سے ممانعت آئی ہے کہ اس کے بعض حصوں پر عمل کیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ ایسا ہی جیسے کہ اس کے بعض حصوں پر ایمان اور بعض حصوں کے انکار کی ممانعت آئی ہے۔ اس لحاظ سے سارے احکامِ شریعت پر عمل اسی طرح واجب ٹھہرتا ہے جس طرح کہ ان ساری چیزوں پر ایمان جن کو شریعت لے کر آئی ہے۔ لہٰذا جو کوئی اس کُل پر ایمان نہیں لائے گا اور عمل نہیں کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت آئے گا:۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ۔

(کیا تم کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو اور جو کوئی تم میں سے ایسا کرے اس کی جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں وہ رسوائی کا شکار رہوا اور آخرت میں ایسے لوگ سخت ترین عذاب میں ڈالے جائیں گے۔

شریعت کے بعض حصوں پر عمل کر کے بعض حصوں کے چھوڑنے کو حرام قرار دینے والے کئی نصوص وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (البقرہ ۱۵۹-۱۶۰)

یقیناً وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی کھلی حقیقتوں اور ہدایتوں کو چھپاتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کے لئے کتاب میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت بھیجنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ . . . . !

شریعت اسلامی کسی خاص وقت کے لئے نہیں آئی کہ دوسرے وقت سے اس کا تعلق نہ ہو۔ کسی خاص دور سے وہ متعلق نہیں کہ اس کے سوا دوسرے ادوار میں وہ کام نہ دے سکے، اس کا دامن کسی خاص زمانہ کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے، وہ تو ایک دائمی شریعت ہے جس کا تعلق ہر زمانہ سے ہے اور اس وقت تک کے لئے ہے جبکہ اللہ تعالیٰ زمین اور اس کی ساری چیزوں کا بذات خود بجا طور پر وارث ہو جائے گا اور شریعت کے نصوص کچھ اسی طرح مرتب کئے گئے ہیں کہ ان پر زمانہ کے تغیرات کا نہ تو کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ زمانے کے تغیرات اور نیرنگیوں سے ان کی جدت اور تازگی میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ اس کے عام اصول اور بنیادی نظریات تغیر کا مطالبہ ہی نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ نصوص اپنے عمومیت اور قابلیت عمل کی حیثیت سے اس طرح ہیں کہ ان کا اطلاق ہر جدید حالت پر ہوتا ہے۔

اسی لئے نصوص شریعت تغیر اور تبدیلی و ترمیم کو قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ غیر الٰہی قوانین کے نصوص تغیرات اور ترمیمات کا آئے دن نشانہ بنتے رہتے ہیں!

شریعت اسلامی قانون وضعی سے تین پہلوؤں سے بنیادی اختلاف رکھتی ہے:۔

(۱) شریعت اللہ کی طرف سے ہے، اس کے برخلاف قانون انسانی دماغ کا ساختہ ہے اور دونوں چیزیں شریعت اور قانون اپنے اپنے صانعین اور واضعین کے صفات کی جھلک اپنے اندر رکھتی ہیں۔ چونکہ قانون انسانی عقل کی پیداوار ہے (۲) لئے وہ اپنے اندر بشری نقائص اور بشری مجبوریوں اور بے تدبیریوں کو نمایاں کئے ہوئے ہے، تب ہی وہ بار بار تبدیلیوں اور ترمیمات کا نشانہ بنتا رہتا ہے، چاہے آپ اس کا نام "ارتقاء" رکھ لیں۔ جب کبھی انسانی سوسائٹی ایک ایسے مرحلہ پر پہنچتی ہے جو پہلے سے متوقع نہیں تھی یا اس کے حالات اتنے بدل جاتے ہیں کہ پہلے اس کا ذہن میں تصور بھی واضح نہیں تھا تو قانون میں ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس طرح قانون ہمیشہ ناقص اور نامکمل ہی رہتا ہے اور اس کے لئے کمال کی حد کو اس وقت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں جب تک کہ اس کے واضعین کمال سے متصف نہ ہو جائیں لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن سی

ت ہے۔ کیونکہ آدمی ماضی پر نگاہ ڈال سکتا ہے مگر مستقبل کے حالات کی پیش بینی اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے برخلاف شریعت
شارع اللہ تعالیٰ ہے اور شریعت اپنے اندر خالق کی قدرت، اس کے کمال، اس کی عظمت اور اس کے علمی احاطہ کا جو گزشتہ و آئندہ
سب کو شامل ہے، زبانِ قال و زبانِ حال دونوں سے اعلان کرتی ہے۔ پس شریعت کو علیم و خبیر ہستی نے بنایا ہے جو کہ حال
مستقبل کی ساری ضروریات سے پوری طرح آگاہ ہے!

اس شریعت پر تیرہ سو برس سے زیادہ کا زمانہ گزرا ہے، جس کے دوران میں لوگوں کے طریقہ ہائے زندگی بدل گئے، اُن کے
آراء و افکار اور علوم و فنون میں عظیم الشان انقلابات آگئے۔ ایجاد و اختراع کے میدان میں ایسی حیرت انگیز چیزیں دنیا کے
سامنے آئیں کہ انسان کے حاشیۂ خیال میں نہ آئی تھیں۔ اور قانون وضعی کے اصول و نصوص کئی مرتبہ بدل گئے تاکہ جدید حالات
اور نئے ظروف کے ساتھ مطابق ہو سکیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس قانون کے ان اصول و قواعد میں جو آج انسانی زندگیوں پر
منطبق کئے جاتے ہیں اور ان اصول و قواعد میں جو اُس دَور میں منطبق کئے جاتے تھے جبکہ شریعت کا نزول ہوا تھا۔ زمین و
آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے، مگر ان سب تغیرات و انقلابات کے درمیان شریعتِ اسلامی اپنے مقام پر اٹل ہے، نہ اس نے
کسی تغیر کو قبول کیا ہے نہ ترمیم کو۔ اس کے مبادیات اور نصوص میں اب بھی انسانی سوسائٹی کی تنظیم اور اُن کی ضروریات کی کفالت
اور ترقی کا مکمل انتظام ہے۔ وہ ان کی فطرت اور طبائع سے اب بھی اتنی ہی قریب ہے جتنی پہلے تھی۔ وہ ان کے امن و سکون کی
سب سے بڑی محافظ ہے!

یورپی قوانین کا بلادِ اسلامیہ میں داخلہ کا پہلا اثر یہ مترتب ہوا کہ ان ممالک میں خاص قسم کی عدالتیں وجود میں آئیں جو
مغربی طرز کے قوانین کو جاری کرنے والی تھیں اور ان عدالتوں میں یا تو یورپین جج مقرر ہوئے یا وہ مقامی جج جنہوں نے ان قوانین
کی تعلیم تو خوب حاصل کی تھی مگر شریعت کی تعلیم سے کورے تھے اور ان نئی عدالتوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک مخصوص
دائرہ سے باہر ہر چیز سے بے نیاز سمجھتی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شریعت عملاً معطل ہو گئی۔ کیونکہ وہ لوگ سوائے اپنے وضع کردہ
قوانین کے کسی اور قانون کو لوگوں کی زندگی پر منطبق نہیں کرتے تھے!

اس طرح سے تعلیم کے ذمہ داروں نے بھی اس قانون کی تعلیم کے لئے خاص مدارس قائم کر دیئے اور وہاں بڑے اہتمام کیساتھ
ان مغربی قوانین کی تعلیم دی جانے لگی اور شریعت کے ساتھ بے نیازی اور لاپروائی کا ثبوت دیا گیا۔ البتہ چند مسائل شریعت
پر توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً وقف وغیرہ کے احکام اور اس کا جو افسوسناک نتیجہ نکلنا تھا وہ نکلا کہ تقریباً سارے قانون دان
حضرات جو کہ اس تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق تھے، شریعتِ اسلامی کے احکام و قوانین سے بالکل بے بہرہ اور ان کو زندگی
کے مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے، یہ حضرات اسلام کے احکام سے انتہائی افسوسناک حد تک بے خبر تھے۔
اس دین سے بے خبر تھے جس کی پیروی کا یہ مسلمان حکومتیں دعویٰ کرتی تھیں۔ بالآخر شریعت سے اس بے خبری نے یہ گل کھلایا
کہ شریعت سے ماخوذ چند نصوص کی تفسیر اس انداز سے کی جانے لگی جو اُن کے قوانین وضعی سے تو اتفاق کریں مگر شریعت کی
رو سے بعض احوال میں بالکل متغائر ہوں۔

(اُردو ترجمہ از عمر بن عبد اللہ ایم اے عثمانیہ)

سیرتِ نمبر کے بعد "فاران" کا

توحید نمبر

★ توحید کے تقاضے کیا ہیں ؟

★ توحید کیا مطالبہ کرتی ہے ؟

★ کتاب و سنت نے "توحید خالص" کو کس انداز میں پیش کیا ؟

★ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی "توحید" کی تبلیغ و تعلیم تھی !

اور

شرک ایمان کے لئے زہر قاتل ہے۔ یہ "ظلم عظیم" ہے جس سے بڑا نہ کوئی گناہ ہے نہ کوئی بُرائی ہے نہ کوئی ظلم و جہالت ہے۔ کتاب و سنت پر ایمان رکھنے والا شرک کی پرچھائیں سے بھی منزلوں دُور رہے گا۔ شرک و بدعت کی رسموں نے ملّت کو کیا نقصان پہنچایا۔ دین خالص پر عجمی تصورات نے بدعات کے روپ میں کس طرح شب خوں مارا۔

فاران کے "توحید نمبر" میں ان موضوعات پر گرانقدر مضامین ہوں گے۔ فاران کا توحید نمبر شرک و بدعت کے بُتانِ عجم پر فیصلہ کن ضرب لگائے گا !

ہماری نظر میں

افکارِ صدا

از:- سید ذاکر حسین صدا لکھنوی (ایم اے) کتابت، طباعت، کاغذ دیدہ زیب اور معیاری۔ ضخامت ۱۳۲ صفحات
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ طلعاستان، پیر کالونی کراچی۔

جناب صدا لکھنوی خاموش اور نمود و شہرت کے معاملہ میں ایک قناعت پسند شاعر ہیں۔ اُن کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ خود کراچی کے ادبی حلقوں میں وہ پوری طرح متعارف نہیں ہیں۔ صدا صاحب کو حضرت آرزو لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اُن کے "سلاموں" کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، موصوف "دو تخلصوں" کے شاعر ہیں۔ سلاموں میں ذاکر اور غزلوں میں صدا تخلص کرتے ہیں۔

صدا کے کلام میں سادگی اور زبان کی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ موصوف غزل میں فلسفہ اور تصوف لانے کی کوشش نہیں کرتے کہ شعر میں جب کوئی چیز خود بخود نہیں آتی بلکہ "لائی" جاتی ہے تو اُس میں آورد کی بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صدا کے کلام میں واردات کی ترجمانی قرینہ کے ساتھ ملتی ہے اور وہ اظہارِ خیال کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ چند نمونے:-

نسیم صبح کا انداز یہ بتاتا ہے ـــــ اٹھا اٹھا یہ سرا پردۂ بہار اٹھا
اپنی سی کر کے دیکھے یہ حوصلہ ہے جی کا ـــــ شاید نصیب میں ہو منہ دیکھنا خوشی کا
اک پتنگے میں بھی جب تک دم رہا ـــــ شمعِ محفل کا وہی عالم رہا
ہوش اتنا ہے کہ بُت خانہ میں رکھا تھا قدم ـــــ اب خدا جانے رہا یا مرا ایمان گیا
آنکھ سے اشکِ ندامت اس طرف دامن تک آئے ـــــ اور اُدھر فردِ گنہ کا ہر ورق سادا ملا
خطروں سے کھیلتے تھے کبھی اب یہ حال ہے ـــــ پتہ بھی ہل گیا تو کلیجہ دہل گیا
وہ کیا پھیر سمجھیں گے راہِ وفا کے ـــــ جو اوروں کے نقشِ قدم دیکھتے ہیں
حالِ دل کا نہ پوچھ اے ہمدم ـــــ اب تو غم بھی نہیں خوشی کیسی
بات وہ بھی تھی جو رہی دل میں ـــــ لب تک آئی تو اور بات ہوئی
دے دیا دل آپ کو پہچان کے ـــــ چوٹ یہ کھائی ہے ہم نے جان کے
ہم ہیں وہ چوبِ خشک کہ پوچھا نہیں کبھی ـــــ آتی ہوئی خزاں نے نہ جاتی بہار نے
بیمار کی منت ہے کہ بیٹھے ہی رہیں آپ ـــــ وہ تو یہ کہے جائے گا آرام نہیں ہے
جب دل نہ رہا دل اُسے کیا کہہ کے پکاریں ـــــ ٹوٹے ہوئے شیشہ کا کوئی نام نہیں ہے
باغباں! ساری بہاریں ہیں ہمارے دم سے ـــــ خاک اُڑتی نظر آئے گی اگر ہم نہ رہے

دوسرا رخ:- تقریر اُن کی سُن کے ہم اتنا سمجھ سکے ـــــ باطن میں انکسار بظاہر غرور تھا (صدا)

بالکل سپاٹ اور بے مزہ شعر ہے۔

ہم سادہ دل پرستش کرتے ہیں بس اُسی کی　　　جو خلق کا ہو پُتلا، جو بُت ہو سادگی کا　　(صفحہ ۵)

"مجسم سادگی یا سراپا سادگی" کہنا چاہیئے تھا۔ "جو بُت ہو سادگی کا" یہ کیا اندازِ بیان ہے۔ کاش! مصرعہ ثانی یوں ہوتا:-

"جو خلق کا ہو پُتلا، پیکر ہو سادگی کا"

دل کی اُلجھن وہ گئی اور وہ پہچان گیا　　　چارہ گر! درد تجھے دیکھ کے پہچان گیا　　(صلا)

"دل کی اُلجھن وہ گئی" میں "وہ" کی تعقید بہت کھٹکتی ہے، چارہ گر کے آنے سے پہلے "درد" کی بس یہی حالت تھی کہ دل کو اُلجھن تھی اور ہیجان تھا — یہ تو بڑے معمولی درجہ کا "دردِ دل" ہوا۔

میدان حشر بن گیا ہے عرصۂ حیات　　　کس کو یہاں ہے فکر کہ اوروں پہ کیا ہوا۔　(صلا)

"بن گیا" میں "الف" بُری طرح دب رہا ہے۔ "اوروں پہ کیا ہوا" بھی محلِّ غور ہے!

فصلِ گل کیا آگئی گلزار تک!　　　ہو گئے جو سبز سُوکھے خار تک　　(ص۳۶)

اس قسم کے سپاٹ شعر مجموعہ کلام سے چھانٹ دینے چاہیئے تھے۔

جس کے دل ہے وہی سمجھتا ہے　　　جلنا کچھ اور ہے جلانے سے　　(ص۱۰۰)

مصرعہ ثانی زبان اور اظہار کے اعتبار سے کس قدر کمزور ہے اور بندش کی سُستی اُس پر مستزاد!

"ماہنامہ تخلیق" ترتیب:- مشفق خواجہ۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت فی پرچہ بارہ آنہ۔ سالانہ آٹھ روپے۔
ملنے کا پتہ:- دفتر "تخلیق" ۲۲/۳ جہانگیر روڈ۔ کراچی ۵

ماہنامہ تخلیق بڑی آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ مضامین کا تنوع اور پھر حُسنِ ترتیب غرض شروع سے لے کر آخر تک رسالہ دل چسپ ہے۔ لکھنے والے مشاق، نومشق، مشہور اور گمنام، جدید و قدیم، ہر طبقہ اور ہر حلقہ کے ہیں۔ اس شمارے کے سب سے زیادہ وزنی تنقیدی مضامین ہیں۔ جو فاضل مُدیر نے اپنے مجلّہ کے لئے خاص طور سے حاصل کئے ہیں۔ اور یہ اُن کی بڑی کامیابی ہے!

مذہب سے غالباً جان کر دامن بچایا گیا ہے۔ مگر یہ بھی بڑی بات ہے کہ "تخلیق" کا رجحان لامذہبیت اور تشکیک و افکار کی طرف بھی نہیں ہے، ورنہ مذہب پر طنز و تعریض آج کل فیشن ہو گیا ہے۔

"مغنی نامہ" غالب کی مثنوی کا دل چسپ اُردو ترجمہ ہے، مگر اس قسم کے شعر جہاں جہاں آگئے ہیں نظم بے رنگ سی ہو گئی

جبھی خود ستا بے محابا ہیں وہ　　　کہ جانے یہ دُنیا کہ دانا ہیں وہ

تھا لب تشنگاں سے دغا کوش وہ　　　ہوا اپنی ہی لے سے مدہوش وہ

وہ آوارہ نظروں کو دے گوشمال　　　ہوس کو ہے سرمایۂ انفعال

"دے گوشمال" درست نہیں "گوشمالی کرنا" بولتے ہیں۔

تپش سے جلے اسپ کا مغز سر　　　ہو زخمی پئے گرگ بھی سربسر

اس ترجمہ میں شعریت کا دُور دُور پتہ نہیں۔

نہیں گنجی پھر بھی ہوں مایہ دار　　　بہت ہے جو غم سے ہوں یوں نغمہ بار

آخر یہ بات کیا ہوئی؟ پھر شعر میں تاثیر کا نام و نشان تک نہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی آخر کی دو رباعیوں میں نری "آورد" ہی پائی جاتی ہے۔ "اعتراف شکست" کے یہ شعر کتنے بے مزہ ہیں :-

آنچ آتشِ گل کی ـــــ مدوجزر سینہ ہے

"آتشِ گل" کی "آنچ" تو "لیلۃ القدر کی رات" والی بات ہوئی۔

زندگی کے اشکوں سے آستینِ جاں نم ہے

"آستینِ جاں" کس قدر نامانوس ترکیب ہے۔ اور جاں کی آستین کا تصور کرتے ہیں سامع اور قاری کو کتنا تکلف ہوتا ہے۔

کرنوں کی دمکتی آہٹ تک نظارہ آخر شب ہی سہی

"کرنوں کی آہٹ" ہی ایک اعجوبہ سے کم نہ تھی کہ "دمکتی" نے اس اعجوبگی میں اور اضافہ کر دیا۔

شعلہ زن صرصرِ غم ہے یا سموم صحرا (صہ ۴۷)

ہم سمجھتے ہیں یہ کتابت کی غلطی ہے کہ "یا" ـ "کہ" کی جگہ چھپ گیا۔ اور اگر شاعر نے "یا" ہی نظم کیا ہے تو "یا" کے الف کا اس بُری طرح گرنا، اُن کے ذوق نے گوارا کس طرح کر لیا۔

کوئی زنجیرِ در ٹوٹی نہ آوازِ صبا آئی کوئی تاریک سایہ پھر نہ کلیوں کو مسل جائے

"تاریک سایہ" کا کلیوں کو "مسلنا" کتنی غرابت رکھتا ہے۔

تمھارے ذہن میں بھی نقشۂ تغیرِ جہاں وہ تحیّر تھا کہ میں قادرِ اظہار نہ تھا (صہ ۱۰)

"قادرِ اظہار" کی ترکیب نے رہی سہی شعریت کو غارت کر دیا۔

"اپنے بزرگوں کے تمغات اور انگریزی افسروں کے سرٹیفکٹ" (صہ ۲۷)

تمغہ کی جمع "تمغات" کتنی عجیب اور نامانوس ہے۔

"اس کے رُوکھے سیاہ بال ...." (صہ ۸۱)

بال اور رُوکھے ـــ یہ کس قدر ناروا بلکہ مضحکہ خیز جدت ہے۔

مدیر کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ نثر و نظم کے مضامین کو پڑھے اور کم سے کم لفظوں کی اُونچ نیچ کو ہموار کر دے!

"تخلیق" کے مُرتّب کا کسی ادبی جماعت سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا مگر ترقی پسند اُن کے ادارے کے مُشیر ضرور ہیں اور ان لوگوں کی رائے و مشورت ادب میں جب اور جہاں بھی ہو گی ٹیڑھ پیدا ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی!

FARAN Karachi Regd. No. 1262

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۹

فاران

دسمبر ۱۹۵۶ء ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت
دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

مصر سے ہمارا قلبی تعلق اس بناء پر نہیں ہے کہ اس خطہ میں سویز کینال اور دریائے نیل واقع ہیں۔ وہاں کے عجائب خانوں میں فراعنۂ مصر کی حنوط شدہ لاشیں۔ ممیاں۔ رکھی ہوئی ہیں۔ اور اہرام کو تاریخی عظمت حاصل ہے۔ مصر سے اور اہلِ مصر سے ہمارے ربط و اتحاد اور محبت کی بُنیاد اسلامی رشتۂ اخوت ہے۔ اُس ملک کی غالب اکثریت اللہ کے فضل سے اسلام کی حلقہ بگوش ہے۔ اس لئے ہم اور مصری عوام ایک ہی زنجیر کی کڑیاں، ایک ہی تسبیح کے دانے ایک ہی درخت کی شاخیں۔ ایک ہی جسم کے اعضاء اور ایک ہی ملت کے فرد ہیں۔ اُن کا غم ہمارا اپنا ذاتی غم اور اُن کی خوشی ہماری اپنی خوشی ہے!

مصر سے روس اور بھارت کے تعلقات کی بنیاد اِن حکومتوں کے محض سیاسی مفادات ہیں۔ جس دن یہ حکومتیں یہ محسوس کریں گی کہ مصر سے تعلقات باقی رکھنے میں اُن کے مفادات پر آنچ آرہی ہے، اُسی دن مصر کے یہ غرض پرست دوست مصر کے لئے وہ نہ رہیں گے جو اب ہیں۔ اُن کو طوطے کی طرح آنکھیں بدلنے میں کچھ دیر نہ لگے گی کہ ڈپلومیسی کا یہی مزاج واقع ہوا ہے۔ اور صدیوں سے سیاست باز اسی کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مگر اس کے برخلاف مصر سے ہمارا دلی تعلق اور دینی رشتہ کسی عنوان نہیں ٹوٹ سکتا۔ چاہے ہمارے سیاسی اغراض اور تجارتی مفاد پر زد ہی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔ اسلامی حکومتوں کے اربابِ حل و عقد مصر کے بارے میں سیاسی حالات کا اندازہ لگا کر اپنی پالیسی اور موقف میں اُونچ نیچ پیدا کرلیں تو کرلیں مگر مصر کے ساتھ مسلم عوام کے رابطہ، محبت و اخوت میں بال برابر فرق نہیں آسکتا۔ اگر غیروں کے جھانسے میں آکر مصر کے مسلمان ہم سے رُوٹھ بھی جائیں گے تو ہم اُن کو منانے کی پوری کوشش کریں گے۔ بھائی، بھائی سے آخر کب تک کھنچا رہے گا۔ دینی اخوت اپنا اثر دکھا کر رہے گی۔ اور اخلاص و محبت کی ایک ہی نگاہ میں سارے گلے شکوے دُور ہو جائیں گے!

روس اور بھارت، مصر کے سیاسی حلیف ہیں اور ہم اہلِ مصر کے دینی بھائی ہیں۔ "سیاسی حلیفیاں" قائم ہوتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ مگر دینی رشتہ کسی حالت میں بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ اسلامی اخوت کی وہ زنجیر ہے جو شکست وریخت سے نا آشنا ہے!

حکومتِ مصر نے سویز کینال کمپنی (Suez Maritime Canal Company) کو جن شرائط پر خاکنائے سویز (Isthmus of Suez) کو کاٹ کر جہاز گزرنے کے لئے موزوں بحری راستہ بنانے کی اجازت دی تھی اور اس کے بعد جو معاہدات ہوئے تھے۔ اُن کے قانونی مضمرات پر بحث ونزاع کا طویل باب کھل سکتا ہے مگر بالکل سامنے کی بات یہ ہے کہ سویز کینال حکومتِ مصر کی حدودِ ریاست میں واقع ہے۔ حکومتِ مصر نے کمپنی کو فرمان کے ذریعہ "Concession" عطا کیا تھا۔ حقِ ملکیت نہیں دیا تھا۔ اس لئے حکومتِ مصر کمپنی کو "نیشنلائز" کرنے (قومیانے) اور کمپنی کو دی ہوئی مراعات واپس لینے کا حق رکھتی ہے۔ لہٰذا حکومتِ مصر نے اپنے حاکمانہ اور مالکانہ حقوق کا جو استعمال کیا، اُس کے لئے اُس کے پاس وجہ جواز موجود ہے!

امریکہ اور برطانیہ نے ایسے ہی موقعوں پر عرب ملکوں کو پریشانی میں ڈالنے کے لئے اسرائیلی حکومت کو قائم کرایا تھا۔ چنانچہ اسرائیلی افواج نے مغرب کی سامراجی حکومتوں کے دیئے ہوئے جدید ترین اسلحہ کی پُوری قوت کے ساتھ مصر پر ہلّہ بول دیا۔ اُدھر یہ فوجیں غازہ کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ دُوسری طرف سے برطانیہ اور فرانس نے مصر کے شہروں پر خوفناک بمباری شروع کردی اور اپنی فوجیں مصر کے ساحلی علاقہ میں اُتار دیں۔ طہران کانفرنس کے ارکان کو اگر صحیح واقعات نظر نہ آسکے تو وہ اپنی بصیرت اور بصارت کا علاج کرائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل تینوں کی تینوں حکومتیں مصر پر جارحانہ حملہ اور ظالمانہ اقدام کی مجرم ہیں۔ جو کوئی ان ظالموں، مفسدوں اور شرارت پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے یا دبا دبا نرم لہجہ اختیار کرتا ہے، وہ خود بے ضمیر ہے اور اس کے دل ودماغ اور زبان وقلم کہیں اور سے ہدایت حاصل کرنے کے بعد "ہزماسٹرس وائس" کا فرض انجام دیتے ہیں۔

امریکہ کی سیاست اور تجارت پر یہودی سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا خاصہ اثر ہے۔ برطانیہ کی رہی سہی چودھراہٹ بھی امریکہ کو کھلتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی اُسے پسند نہیں ہے کہ برطانیہ اور فرانس کمزور ناکارہ اور بالکل بے اثر ہو کر رہ جائیں، ان حکومتوں کی قوت واثر کو امریکہ اشتراکیت زدہ ریاستوں کے مقابلہ میں دباؤ، چھیڑ چھاڑ اور قوتوں کا توازن قائم رکھنے کے لئے باقی رہنے دینا چاہتا ہے۔ اس لئے امن وصلح کے تمام مواعظ (؟) اور ثالثی کی تمام کوششوں کے باوجود مصر کی مظلومیت کا اُس کے دل میں رمق برابر درد نہیں ہے اور اسرائیل اور فرانس وبرطانیہ کے عزائم اور اُن کی سازشوں سے امریکہ کو ہم بے خبر اور بالکل بے تعلق نہیں سمجھتے!

روس جو آج مصر کا بڑا ہمدرد اور دمساز نظر آتا ہے۔ کل یہی روس تھا جس نے شائیلاکوں کی اس اسرائیلی حکومت کو تسلیم کرکے اپنے سفارتی تعلقات اُس سے قائم کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ اور اس میں اُس کی دُور اندیشی، پیش بینی، مفاد پرستی اور ڈپلومیسی یہ تھی —— روس اچھی طرح جانتا تھا کہ اسرائیلی حکومت ایک خطرناک پستول ہے جسے امریکہ اور برطانیہ نے عرب ممالک کے سوسینہ کے مقابل رکھ دیا ہے۔ اس لئے اسرائیلی حکومت کا وجود عرب ممالک کے لئے ہمیشہ پریشانی اور اضطراب وانتشار کا سبب بنا رہے گا اور ملکوں، حکومتوں اور قوموں کے اضطراب وانتشار سے روس فائدہ اُٹھانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ امن وسکون اور صلح وآشتی کی فضا اشتراکیت کو سازگار آہی نہیں سکتی!

یہ فتنہ دُنیا و دین تو ملکوں کے انتشار، سیاسی رقابت اور حریفانہ کشمکش کے ماحول ہی میں پر پُرزے نکالتا ہے۔ روس کی پیش بینی اور ڈپلومیسی کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ آج مصر، روس سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہے! اور:-

یہ ابتداء ہے تو پھر اس کی انتہا معلوم!

۵

بھارت کے مہاسبھائی اسرائیلی حکومت سے ساز باز رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے تباہ کرنے کا جو پروگرام انھوں نے بنایا ہے اُس کی کامیابی کے لئے اسرائیل کی "اسلام دشمنی" سے وہ ہر وقت فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ بھارت میں عملاً مہاسبھا کا راج ہے۔ گاؤ کشی اور اُردو زبان کے مسئلوں میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بے اختیاری اور بے اثری ظاہر ہو چکی ہے۔ مہاسبھائیوں کی جیت اسی میں ہے کہ جس طرح ممکن ہو سکے مسلم ممالک کا اتحاد نہ قائم ہونے دیں اور اسلامی حکومتیں کمزور ہوتی چلی جائیں۔ پنڈت نہرو اپنی لادینیت اور وسیع مشربی کے باوجود ہندو قوم کے ایک فرد ہیں اور مہاسبھائی عزائم کے خلاف وہ جا نہیں سکتے!

عرب ممالک میں "اسلام" کے مقابلہ میں "عرب قومیت" کے احیاء کی جو غیر اسلامی تحریک چلائی جا رہی ہے، اسلامی ملکوں میں ہندوستانی سفارت خانے اُس سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں۔ پنڈت نہرو اور اُن کی حکومت نے یہ جان کر جمال ناصر کو سویز کینال کے معاملہ میں شہ دی ہے کہ یہ جرأت مندانہ اقدام مصر کو بہت زیادہ مہنگا پڑے گا اور اُس کا نتیجہ اسلامی ممالک میں انتشار و افتراق کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ خود مسلم عوام اور حکومتوں کے مابین کشمکش برپا ہوگی اور عالمگیر اسلامی اتحاد پر اس کی ضرب آکر پڑے گی!

ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے جمال ناصر کو اپنے اعتماد میں لے رکھا ہے اور دوسری طرف مہاسبھائی لیڈر اسرائیلی حکومت سے ساز باز کئے ہوئے ہیں۔ یہ دو دھاری تلوار ہے جس سے مظلوم اور سادہ لوح مصر کو سابقہ پڑا ہے! سویز کینال کے واقعہ کے بعد اسلامی ممالک جس پریشانی و ابتری سے دوچار ہیں۔ اور اُلجھنیں بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں —— اس سے بھارت بہت خوش اور مطمئن ہے۔ یہ سب کچھ اُس کی تمناؤں کے مطابق ہو رہا ہے!

یہ اقدام!

اگر کوئی "ممولا" شہباز سے لڑنے کی جرأت کرتا ہے تو اُس کی یہ جرأت لائقِ تحسین ہے، جرأت و حوصلہ مندی اور بیباکی ہی نے قوموں کی تقدیروں کو بدلا ہے اور دنیا میں انقلاب پیدا کئے ہیں — کشورکشائی اور فاتحانہ اقدام کا سہرا عقلِ مصلحت اندیش کے نہیں، جنونِ باک کے سر رہا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "جنونِ بے باک" کے اظہار کے لئے بھی وقت اور موقع کی ضرورت ہے —— جوش کے ساتھ ہوش کا رہنا بھی ضروری ہے!

حیدرآباد دکن میں "جوشِ بے خرد" کے خونیں نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ بلند بانگ دعووں کے غبارے ہوا کی موج کے ذرا سے اضطراب کو بھی نہ سہار سکے! کسی جرأت مندانہ اقدام کے وقت عواقب سے بالکل آنکھیں بند کر لینا، ہر بڑی سے بڑی خطرناکی کا سبب بن سکتا ہے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام آتشِ نمرود میں بے دھڑک کود پڑے تھے، اس لئے کہ وہ اُن کے دین و ایمان کا معاملہ تھا۔ اور جب کسی کے دین و ایمان کو یہ جوکھم پیش آئے تو اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مسلمانوں کا جرار لشکر لے کر تبوک جا پہنچے تھے۔ اس لئے کہ غنیم کے فوجیں جمع کرنے اور حجاز پر حملہ آور ہونے کی خبر گرم تھی!

آج بھی حملہ آور دشمن کو اسی طرح مرعوب کیا جا سکتا ہے، مراکش اور الجزائر کے مسلمان اپنی آزادی کے لئے بجا طور پر اپنی جانوں کی بازی لگا رہے ہیں۔ اس لئے :-

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

مصر میں ایسی کوئی صورت درپیش نہیں تھی۔ نہ تو اہلِ مصر کا دین و ایمان خطرے میں تھا۔ نہ اُن پر کوئی حملہ کر رہا تھا۔ اور نہ وہ کسی غیر ملک کے غلام تھے۔ جس سے چھٹکارا پانے کے لئے اقدام ناگزیر تھا۔ ہم اس کو مانتے ہیں کہ فرانس اور برطانیہ کا سویز کینال پر عمل دخل مصر کے مفاد کے قطعاً منافی تھا۔ ان مفسدوں اور شرارت پسندوں کے اختیار و تصرف سے نہر سویز کو آزاد ہونا ہی چاہئیے تھا۔ مگر چند سال کے بعد سویز کینال کمپنی کے معاہدہ کی میعاد ہی ختم ہو رہی تھی۔ سویز کمپنی کو اختتام معاہدہ سے پہلے اپنے اختیار و تصرف میں لینے کی یہ تدبیر تھی کہ حکومتِ مصر کمپنی کے اکیس فی صدی حصے اور خرید لیتی۔ اس طرح کمپنی میں اُس کے اکیاون فی صدی (۲۱ + ۳۰) حصے ہو جانے سے کمپنی کے نظم و نسق کی زمام حکومتِ مصر ہی کے ہاتھوں میں آجاتی !

تمام عرب ممالک کے لئے اور اُن میں بھی خاص طور سے مصر کے لئے سویز کمپنی سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک اور مضرت رساں وجود اسرائیلی حکومت کا ہے۔ جمال ناصر صاحب کو جرأت ہی دکھانی تھی تو اللہ تعالیٰ کی اس مغضوب قوم سے ٹکر لینی تھی۔ اس مسئلہ کا سب سے زیادہ قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ سویز کمپنی کو نیشنلائز کرنے کے بعد کتنے ہی دن تک مذاکرے ہوتے رہے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس مصر کی دھمکی سے مرعوب بھی تھے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے بعد جو یہ دفعۃً ملا تھا۔ اور دشمن پر جو مرعوبیت طاری تھی بس اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئیے تھا۔ اُس وقت کوئی معاہدہ ہو جاتا تو فرانس و برطانیہ کو بہر حال جھکنا پڑتا اور مصر کا پلّہ بھاری رہتا۔ مگر حکومتِ مصر نے گفت و شنید کی تمام دعوتوں اور مذاکروں کو اس طنطنہ کے ساتھ ٹھکرا دیا جیسے اُس کے قبضہ میں کوئی ایسا خفیہ ہتھیار ہے کہ فرانس و برطانیہ نے ذرا بھی حرکت کی تو ان حکومتوں کے دھوئیں اڑا دیئے جائیں گے !

طنطنوں، دعووں اور دھمکیوں کا وہ فلک شگاف غلغلہ اور اپنی قوت کا یہ عالم کہ اسرائیلی لشکر کسی مؤثر مزاحمت کے بغیر یلغار کرتا ہوا مصر میں داخل ہو گیا۔ ادھر فرانس اور برطانیہ نے ہنستے کھیلتے اپنی فوجیں مصر کے ساحل پر اتار دیں وہ جو کسی دل جلے شاعر نے کہا ہے کہ :-

ہمارا ابھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر ؎

تو مصر نے سچ مچ اپنے گریبان ہی پر زور چلایا کہ سویز کینال کو ناقابلِ گزر بنانے کیلئے اپنے ہی جہازوں کو ڈبو دیا۔ پنڈت نہرو سے ذاتی تعلقات پر جمال ناصر کو بڑا ناز تھا۔ مگر پنڈت جی ہندی کی اس کہاوت :-

"پڑھ جا بچہ! شولی پر رام بھلی کرے گا!"

کے اثرات کا خاموشی کے ساتھ مشاہدہ فرماتے رہے۔ اب رہا روس، تو اُس نے برطانیہ اور فرانس کو جنگ بند کرنے کی دھمکی اُس وقت دی ہے جب اُن کی فوجیں مصر کے ساحلی علاقہ پر اتر چکی ہیں۔ اور اسرائیل کا مصر کے سینکڑوں میل کے رقبہ پر قبضہ ہو چکا ہے !

برطانیہ اور فرانس، مصر کے چپہ چپہ سے واقف ہیں۔ ان ظالموں نے چُن چُن کر فیکٹریوں، پلوں، ریلوے اسٹیشنوں

اور دوسرے اہم تجارتی، صنعتی اور فوجی مرکزوں کو تہس نہس کیا ہے۔ سویز کینال کی دسیوں سال کی آمدنی بھی مصر کے اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی جو چند دن میں اُسے اُٹھانا پڑا۔ اور جانوں کے نقصان کی تلافی تو کسی عنوان ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسروں کے بل بوتے پر اقدام کر بیٹھنے کے ایسے ہی تباہ کن نتائج نکلا کرتے ہیں!

اس چند دن کی جنگ میں یہ تماشا بھی دُنیا نے دیکھ لیا کہ شام، شرق اردن اور حجاز کی فوجوں کی اپنے ہی علاقوں میں پس پیش قدمی اور مارچنگ کی خبریں آتی رہیں۔ اسرائیلی حکومت کے کسی درخت کے پرندے کی طرف بھی گولی نہیں چلائی گئی!

وہ جو "بند مٹھی کے بھرم" کی پُرانی کہاوت ہے۔ تو سویز کینال کے اس قضیہ نے عرب ملکوں کے اس بھرم کو کھول دیا، اور ان کے مقابلہ میں اسرائیلیوں کی جرأت کو بڑھا دیا۔ اسرائیلی آج فاتحانہ پوزیشن میں ہیں۔ اب تک وہ عرب ممالک سے خوف زدہ تھے کہ یہ حکومتیں مل جُل کر یلغار پر آمادہ ہو گئیں تو اسرائیلی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گی۔ اب یہودیوں کا یہ ڈر نکل گیا۔ علمائے ازہر کے جہاد کے فتووں کی کارفرمائی بھی یہودیوں اور نصرانیوں نے دیکھ لی۔!

اس قضیہ سے پہلے مصر بالکل آزاد تھا۔ مگر اب اُس کی آزادی اپنے محافظ و دستگیر اور بچانے والے سوویٹ روس کی پناہ میں ہے! اور جو ملک روس کی پناہ اور حمایت میں آ جاتا ہے، وہ "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" بن کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ رہنا پڑتا ہے۔ روس ہمدردیوں کے بیج ہر طرف یونہی نہیں بکھیرتا پھرتا۔ وہ اسی زمین میں تخم ریزی کرتا ہے جہاں کی زمین اُس کے مفادات اور نظریوں کے لئے زرخیز ہوتی ہے۔ روس کے ٹینک، راکٹ اور جٹ پلین کسی ملک کی حمایت و امداد کے لئے تنہا نہیں آتے۔ اُن کے ساتھ روس کے افکار و نظریات بھی آتے ہیں!

روس کے مقابلہ میں مصر کی پوزیشن اب "حلیف حکومت" کی بلندی سے گر کر نیازمندی اور حاشیہ برداری کی سطح تک پہنچ چکی ہے۔ اور دوسری طرف جس سویز کینال پر بلاشرکتِ غیرے اپنا قبضہ و تسلط جمانے کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا، اُس پر انٹرنیشنل فوج کی نگرانی خود مصر کو قبول کرنی پڑی۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی خطرے نہیں ٹلے بلکہ ان میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے!

جمال ناصر نے کیا کیا؟

شاہ فاروق کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد مصر کے اربابِ کار کو اپنے ملک کو ترقی دینے کے لئے بڑا زرین موقع مل گیا تھا۔ مگر جمال ناصر جو مصر کا ڈکٹیٹر بننے کی تمنّا اپنے اندر رکھتا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے جنرل نجیب کو سازش کے زور سے بے اثر بنا کر اپنی مطلق العنانی کیلئے راستہ صاف کیا۔ پھر اُس نے عرب دُنیا کی سب سے زیادہ منظم اور بااقتدار دینی جماعت "اخوان المسلمون" کو ٹھکانے لگایا۔ اُن کے اکابر کو پھانسیاں دیں اور اُن کے ارکان پر وہ ظلم کئے کہ نیرو اور حجاج جیسے ظالموں کے کارنامے ان عقوبتوں کے آگے ماند پڑ گئے اور آج بھی ہزاروں "اخوان" قید و بند کی مصیبتوں میں گرفتار ہیں! آج یہ ہزاروں سرفروش آزاد ہوتے تو کم سے کم اسرائیل کو مصر پر یلغار کی جُرأت نہ ہوتی۔ اور ہوتی تو جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ "اخوان" مصر کے قوّتِ بازو، اسلام کے سرفروش خدمت گزار اور ملّت کے حوصلہ مند مخلص فرزند تھے۔ اُن کو ناصر نے تباہ کر کے مصر کے سب سے زیادہ قوی بازو کو بیکار بنا دیا!

شاہ فاروق کے دور میں مصر جن عیش پرستیوں اور نفس کی دراز دستیوں میں مبتلا تھا۔ جمال ناصر کی حکومت نے ان بدکاریوں اور بداخلاقیوں کی سرپرستی کی، فوجی کلب گھروں میں نادٔ نوش کی پارٹیاں اور نیم برہنہ رقص کی محفلیں جمائی گئیں اور جب بدکاری کی یہ محفلیں رنگ پر آئی ہوئی تھیں تو فوجی افسروں کو مخاطب کرکے فرمایا گیا کہ یہ خشک ملّا اور قدامت پرست "اخوان" تم سے عیش و مسرت کی یہ نعمتیں چھین لینا چاہتے تھے!

جمال ناصر نے ایک طرف مصر میں بے اخلاق معاشرت کی حوصلہ افزائی کی اور دوسری طرف اسلامی اُخوت اور وحدتِ ملّی کے مقابلہ میں "مصری قومیت" کو اُبھارا۔ "نحن ابناء الفراعنۃ"۔ "ہم فراعنۂ مصر کی اولاد ہیں۔" یہ اُسی کا دیا ہوا "قوانہ نعرہ" ہے۔ وہ فرعون جس کی مذمّت اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے اور اہلِ ایمان نے جس نام (فرعون) کو اپنے لئے آج تک گالی سمجھا ہے۔ اُس کو جمال ناصر اور اس کے حواریوں نے مقبول اور محبوب بنانے کی تحریک شروع کی ہے۔ جو شخص "فرعونیت" کو زندہ کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ وہ اس مملکت سے کس طرح خوش رہ سکتا ہے، جو صرف "اسلام" کے نام پر وجود میں آئی ہے۔ جس کے دستور میں کتاب و سنّت کو قانون کی اساس تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اسلامی روایات کی تجدید و احیاء جس کے پروگرام میں شامل ہے!

تہران کانفرنس میں پاکستانی اکابر نے جو پارٹ ادا کیا ہے، اُس سے پاکستانی عوام اپنی بیزاری کا اظہار کر چکے ہیں اور پاکستان کے وزیرِ خارجہ مسٹر فیروز خاں نون کے احمقانہ بیان پر تو ہر طبقہ نے لعنت بھیجی ہے!

وزیرے چنیں شہریارے چناں!

حکومتِ مصر کے لئے ہمارے اربابِ اقتدار کی یہ روش جائز طور پر وجہِ شکایت ہو سکتی ہے مگر جمال ناصر کی حکومت نے پاکستان کے ساتھ شروع ہی سے بیگانوں جیسا سلوک کیا ہے۔ کشمیر کے مسئلہ میں اُس نے ہماری حمایت نہیں کی۔ پنڈت نہرو سے اُس نے دوستی کی پینگیں بڑھائی ہیں۔ مصر میں پاکستانی سفارت خانہ کے مقابلہ میں بھارت کے سفارت خانہ کو زیادہ سے زیادہ اہمیت بلکہ عزّت دی گئی ہے! انگلستان اور فرانس سے سفارتی تعلقات توڑنے کے بعد مصر نے اپنے مفادات کی نگرانی بھارت کو سونپی ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلامی اخوت کا رشتہ ہی پاکستان اور مصر کو مربوط کئے ہوئے ہے۔ جب جمال ناصر صاحب "مصری وطنیت" اور "فرعونی قومیت" کی مقراض سے اس رشتہ ہی کو کاٹ دینے پر تُلے بیٹھے ہیں تو پھر پاکستان کے ساتھ بیزاری اور بیگانگی کا جو سلوک بھی وہ کر گزریں تھوڑا ہے!

پاکستان کے ساتھ جمال ناصر کی حکومت نے جو ذلّت آمیز برتاؤ کیا ہے، اُسے مصر کے عوام کیا وہاں کے بہت سے خواص کو بھی ناگوار گزرا ہوگا۔ مگر وہ بیچارے ناصر کی جابرانہ آمریت کے آگے دم نہیں مار سکتے!

پریشانی اور مصیبت کے وقت بڑے بڑے سرکشوں اور نافرمانوں کو خدا یاد آتا ہے۔ مگر جمال ناصر کی حکومت کی اللہ تعالیٰ سے غفلت اور بیزاری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ مصائب کے اس خوفناک ہجوم میں جو قرطاسِ ابیض (white paper) حکومتِ مصر نے شائع کیا ہے۔ اس کا آغاز "اللہ کے نام" کے بجائے "قوم کے نام" (In the name of Nation) سے ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات ہماری اس تنقید پر چیں بہ جبیں ہوں کہ جمال ناصر کی شان میں قصیدہ خوانی کے

جو نقارے بج رہے ہیں اُس میں یہ طوطی کی آواز کہاں سے آئی؟ ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ لوگ ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ کریں کہ سویز کینال کے قضیہ کے بعد مصر اور دوسرے عرب ممالک کی پریشانیاں بڑھ گئی ہیں یا گھٹ گئی ہیں؟ انٹرنیشنل فوج کی نگرانی نے سویز کینال کے مسئلہ میں اور پیچ ڈال دیئے ہیں یا کم کر دیئے ہیں؟ مصر کے روس کی حمایت اور پناہ میں آجانے کے بعد مصر کی اپنی سیاسی پوزیشن کیا رہ گئی ہے؟

مصر جمال ناصر کا نام نہیں ہے، جمال ناصر پاکستان کو چاہے کتنا ہی ٹھکراتا رہے۔ مگر اس کی نادانی اور حماقت کے سبب اپنے مصری بھائیوں کو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ مصر عہد فاروقی کی زندہ یادگار ہے۔ اس یادگار کی حفاظت کے لئے ہم کسی ممکن قربانی سے انشاء اللہ گریز نہ کریں گے!

جمال ناصر کو مصر میں "فرعونیت" کو اور پاکستان میں عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کو "متحدہ قومیت" کو زندہ کرنے کا اگر حق حاصل ہے تو اسلام پسند بھی اللہ کے دین کو، کتاب وسنت کو اور اسلامی روایات کو زندہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جس کو جس سے محبت ہوگی وہ اسی کے لئے دوڑ دھوپ کرے گا۔ وقت خود فیصلہ کر دے گا کہ ان میں سے کس کو زندہ رہنا چاہیئے اور کس کے لئے موت مقرر کر دی گئی ہے!

اللہ تعالیٰ اسلامی ممالک اور اُن کے عوام کو اپنوں اور غیروں کے شر سے محفوظ رکھے اور اُن کو اقامتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے، یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب ہو کر تمام دنیا کو امن وآسودگی کا گہوارہ بنا دے!! ع

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

ماہر القادری

۲۱ نومبر ۵۶ء

ابو منظور شیخ احمد
(نانڈیڑ دکن)

ایک ایمان افروز یادداشت

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا آخری درسِ تفسیر

مولوی بہادر خاں حیدر آبادی (المعروف بہ نواب بہادر یار جنگ) کی علمی و مذہبی خدمات میں ایک نمایاں اور نوعیت کے اعتبار سے ایک نہایت اہم خدمت اُن کا درسِ تفسیر تھا۔ مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت اس طرز پر ہوئی تھی کہ انھیں بچپن ہی سے قرآن کے ساتھ ایک گہرا قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے آگے چل کر انھیں علوم و معارفِ قرآنی کا ایک جید عالم اور اس کی اشاعت کا ایک پُرجوش مبلغ بنا دیا۔ مرحوم کو اس سرائے فانی میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ اپنی نانی کے زیرِ تربیت آ گئے۔ اور چودہ سال تک انہی کے زیرِ تربیت رہے۔ اُن کی نانی صاحبہ ایک دین دار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے نواسے پر مذہبی رنگ چڑھانے کی پوری پوری کوشش فرمائی اور کامیاب رہیں۔ وہ ادائے نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کی پابندی کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ چنانچہ کسی دن مرحوم تلاوتِ قرآن کے بغیر نانی کی خدمت میں جاتے اور سلام کرتے تو وہ نہ سلام کا جواب دیتیں نہ کوئی بات کرتیں۔ مرحوم پوچھتے تو فرماتیں کہ:۔

"تم نے اللہ میاں سے آج باتیں نہیں کیں اس لئے نہ میں تم سے بات کروں گی اور نہ تمہارا سلام لوں گی"

خود مرحوم جب مادری تربیت کی اہمیت کا ذکر فرماتے تو اپنا یہ واقعہ ضرور بیان کرتے اور کہتے کہ:۔

"میرے اندر جو کچھ ہے وہ اسی چودہ سالہ کمائی کا حاصل ہے"

اس کے بعد آپ نے حیدر آباد کے دو اساتذہ مولوی سعد اللہ خان صاحب (مدرس مدرسۂ دار العلوم) اور مولوی سید اشرف شمسی صاحب (صاحب "تفسیرِ شمسی") سے عربی ادب، تفسیر، حدیث اور فقہ کی باضابطہ تعلیم کا آغاز کیا۔ اور خصوصاً علامہ شمسی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے۔ مرحوم کی عمر چودہ سال کی تھی کہ ایک دن اُن کے والد بزرگوار (نواب نصیب یاور جنگ ثالث) انھیں حضرت علامہ کے پاس لے گئے۔ وہ مسجد سے نماز پڑھ کر گھر لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں نواب نصیب یاور جنگ بہادر نے روک لیا اور بہادر خاں کو پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ:۔

"اس خانہ زاد کو مذہبی تعلیم کا شوق ہے۔ یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا"

حضرت علامہ نے ایک نظر بہادر خاں کو دیکھا اور فرمایا کہ:۔

"اچھی بات ہے۔ کل صبح یہیں اسی مقام پر آ جانا"

دوسرے دن بہادر خاں وہاں موجود تھے۔ حضرت علامہ نے اُن کو وہیں مسجد کی نکڑ کے قریب زمین پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

یہ فوراً بیٹھ گئے۔ بچپن میں بہت زیادہ جسیم تھے اس لئے دوزانو بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی اور خاندانی جاگیردار ہونے کے باعث، زمین پر اس طرح بیٹھنے میں عار ہونا چاہیے تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی شرم محسوس نہ کی اور اُستاد کے حکم کی فوراً تعمیل کردی۔ متواتر تین چار روز تک یہی عمل ہوتا رہا۔ بہادرخاں جاتے اور حضرت علامہ اُن کو زمین پر بٹھا دیتے۔ جب کسی نے حضرت علامہ سے اس برتاؤ کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

"میں بہادرخان کا امتحان لے رہا تھا، چونکہ یہ نواب زادہ ہے اس لئے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے اندر فی الواقع علم کا حقیقی ذوق موجود ہے یا نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ امتحان میں کامیاب اُترا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کو مذہبی علم کی سچی لگن لگی ہوئی ہے"۔

باضابطہ تعلیم کا یہ تعلق جلدی ہی ختم ہوگیا۔ لیکن آگے چل کر جو وسعتِ معلومات انہوں نے بہم پہنچائی وہ دراصل اُن کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ معمولاً روزانہ ڈھائی سو صفحات کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد جب جاگیر کی ساری ذمہ داریاں اُن کے کاندھوں پر آپڑیں تو اس زمانہ میں بھی اُن کا مطالعہ نہ چھوٹا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"جاگیر کے مقدمات کے سلسلہ میں میں جب وکلاء صاحبان کے پاس جایا کرتا تو بگھی میں بیٹھے ہوئے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا کرتا"۔

اُن کا کتب خانہ[1] بہت وسیع تھا اور اس کا بڑا حصہ مختلف قدیم وجدید تفاسیر اور دیگر مذہبی کتب پر مشتمل تھا۔ ان کتابوں میں اکثر عربی زبان میں تھیں جن کا مطالعہ وہ پورے غور و تفحّص کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مطالعہ کے نشانات اُن کی تقریباً ہر کتاب پر آج تک موجود ہیں۔ مرحوم کی عالمانہ حیثیت کی نسبت اُن کے بچپن کے ساتھی اور قریبی دوست ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سابق پروفیسر ریاضیات و طبعیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) نے اپنے ایک مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح اور کامل تعارف کے لئے ہر طرح کافی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"مرحوم کی طالب علمانہ زندگی بہت جلد ختم ہوگئی۔ اور وہ ابتدائی عمر ہی میں دُنیا کے دھندوں میں پھنس گئے یہی وجہ ہے کہ وہ علمی اداروں کی باضابطہ تعلیم یا امتحانوں کی کامیابی کی اسناد نہیں رکھتے تھے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ علم محض مدرسوں یا کالجوں میں حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مکتب اور ملّا انسان کی صلاحیتوں کو، جو اکتسابِ علم کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہیں۔ نقصان پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتے ہیں سے

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق ‌ ‌ ‌ نہ خرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گراں

تاریخ عالم میں اور خصوصاً مشرق کی تاریخ میں اکثر علماء نے باضابطہ مدرسوں میں نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی کوششوں سے علم و فن میں کمال حاصل کیا۔ مولوی محمد بہادرخاں مرحوم کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے فطری ذوقِ علم کی تشفی خود اپنے طور پر مطالعہ سے کی اور علم کی جن

---

[1] مرحوم کی وفات کے بعد اس کتب خانہ کو ان کی بیگم صاحبہ نے "قائدِ ملت لائبریری" کے نام سے افادۂ عامہ کیلئے وقف کردیا ہے۔

شاخوں سے ان کو دلچسپی تھی اُن میں اس قدر ید طولیٰ حاصل کیا کہ باضابطہ اسناد رکھنے والوں سے بدرجہا آگے بڑھ گئے - وہ مطالعہ کرتے تھے، مشاہیر علماء سے بحث کرتے تھے اور خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے - اکتسابِ علم کے یہی تین ضروری اجزاء ہیں اور مرحوم ان تینوں سے بہرہ ور تھے - اُن کا ذاتی کتب خانہ ملک کے معدودے چند کتب خانوں میں سے ہے - جن میں مختلف علوم و فنون کی معیاری اور نایاب کتابیں موجود ہیں - انہوں نے ان میں سے اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کتابوں پر جا بجا اُن کے مطالعہ کے نشانات موجود ہیں۔ بلادِ اسلامیہ کے سفر میں اور ہندوستان کے متعدد دوروں میں اُن کی ملاقات بڑے بڑے علماء سے ہوئی اور اپنی ذکاوت اور ذہنِ رسا کی بدولت وہ ان علماء کی گفتگو اور بحث مباحثہ سے بہترین طور پر استفادہ کر سکے - اُن کی قوّتِ فکر کا اظہار اُن کی تقریروں اور علمی صحبتوں میں اچھی طرح ہوتا تھا - غرض ایک عالم کے لئے جتنی ضروری صفات ہیں وہ اُن میں کافی موجود تھیں - اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے مختلف النوع کمالات میں اُن کے علمی کمالات کو بھی جگہ دینا لازمی ہے - دُنیائے اُردو کے تو وہ سب سے بڑے خطیب تھے۔ اس لئے اُن کی اُردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی اُن کی مہارت مسلّمہ تھی اور تفسیر کا انہوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔"

("مولوی بہادر خاں مرحوم و مغفور ایک عالم کی حیثیت سے"۔ مندرجہ اخبار "تنظیم" حیدرآباد دکن۔ "قائدِ ملّت نمبر")

مرحوم کو عربی میں جس درجہ کی مہارت حاصل تھی - اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے سلسلہ میں مصر پہنچے تو نحاس پاشا سے ملنے گئے - چونکہ گفتگو چند خاص اہم مسائل پر ہونے والی تھی - اس لئے گمان ہوا کہ شاید ٹھیک طور پر عربی زبان میں اظہارِ خیال نہ کر سکیں گے - اس لئے ایک قادیانی مبلّغ کو جو وہاں موجود تھے ترجمان کی حیثیت سے ساتھ لے گئے - مرحوم فرماتے تھے کہ :-

"چند منٹ تک گفتگو ہوتی رہی - مَیں نے محسوس کیا کہ میرے ترجمان صاحب میری ٹھیک ترجمانی نہیں کر رہے ہیں - اس لئے مَیں نے اُن کو درمیان سے ہٹا دیا اور نحاس پاشا سے کہا کہ مَیں عجمی ہوں - اگر جمع کو واحد - واحد کو تثنیہ اور مذکر کو مونث کہہ جاؤں تو معاف فرمائیے اور مطلب سمجھ لیجئے - اس کے بعد راست گفتگو شروع ہوئی اور بہت دیر تک ہوتی رہی - دوسرے دن مَیں نے دیکھا کہ مصر کے اچھے اخباروں میں میری تصویر چھپ چکی ہے اور ایک تعارفی نوٹ لکھا گیا ہے - جس کا عنوان تھا "حیدرآباد کا ایک نواب جو عربی فصاح میں گفتگو کرتا ہے"۔"

مرحوم محض گفتگو ہی نہیں بلکہ عربی میں پوری فصاحت اور روانی کے ساتھ تقریر بھی کر سکتے تھے - چنانچہ اُن کے انتقال سے ڈیڑھ دو سال قبل جب مصر کے قونصل جنرل حیدرآباد آئے ہوئے تھے تو مرحوم نے بھی اُن کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا - مدعوین میں وزیرِ اعظم اور دیگر حکام کے علاوہ شہر کے تمام علماء و مشائخ بھی تھے - اس موقع پر مرحوم نے عربی میں ایک پُر جوش اور اثر آفرین تقریر فرمائی تو سب لوگ متحیّر ہو گئے اور خود قونصل جب جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

"ہندوستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عربی میں اس بے تکلفی اور فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں۔"

جن لوگوں نے مرحوم کی یہ تقریر سنی تھی، اُن کا بیان ہے کہ اُن کی اُردو تقاریر میں جو روانی اور تاثیر پائی جاتی تھی بالکل وہی کیفیت اُن کی اس تقریر میں موجود تھی۔

مرحوم نے فنِ تجوید و قرأت کو باضابطہ قاری روشن علی[1] صاحب سے حاصل کیا تھا۔ اور اس فن سے اس درجہ واقف تھے کہ اکثر قاری، مرحوم سے داد حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ پھر اس فن سے دلچسپی بھی اس قدر تھی کہ ہر سال شبِ قدر میں قرأت کا جلسہ اپنی ڈیوڑھی میں منعقد کیا کرتے۔ جس میں ملک کے بڑے بڑے اہلِ فن مدعو کئے جاتے اور وہ قرأت سبع و فنِ تجوید کے سلسلہ میں اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے۔ خود مرحوم اس میں حصہ لیتے اور قرأت خوانی کا یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا۔

مرحوم اگرچہ بہ سیاستِ حاضرہ میں دخیل ہو کر سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے تھے۔ لیکن قرآن کی تعلیم و تبلیغ کو انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ کیا۔ مجلس اتحاد المسلمین کے جلسۂ سالانہ منعقدہ ۱۳۶۰ھ میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:-

> "یہ بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی قوم زندگی کے اہم مراحل میں اپنی بنیادوں کے استحکام کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر زمانہ قوموں کی تعمیر کے لئے چند لوازمات چاہتا ہے اور ان لوازمات کے بغیر اگر کوئی قدم اُٹھایا بھی گیا تو وہ استوار اور مضبوط نہیں ہو سکتا۔ خود مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اُن کی انقلابی ترقیاں جن کو دیکھ کر دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ چند خصوصیات کی سرمایہ دار تھیں اُن میں سب سے پہلی چیز اپنی حیاتِ اجتماعی کے مقاصد و منشاء کی نسبت مسلمانوں کا وہ صحیح تصوّر و ایقان تھا جو قرآن نے اُن میں پیدا کر دیا تھا۔ انسان کا تصوّر و ایقان ہی اس کے عمل کی اصل اور بنیاد ہے۔ اور وہ بلندیٔ تخیل اور رفعتِ تصوّر جو قرآن نے مسلمان کو عطا کیا۔ اس کی ذلتوں کو عزّت سے اور محکومیوں کو حکومت سے بدلنے کا باعث ہوا۔ قرآنی تعلیمات کے سوا اور کونسی چیز تھی جس نے ایک بدوی کو تاجِ خسرو اور تختِ کسریٰ کا مستحق بنا دیا تھا۔ **مجلس اتحاد المسلمین ہر اس سیاست کو جو قرآن کے منبعِ فیض سے سیراب نہیں ہے، سراب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی۔** یہی وجہ ہے کہ انتہائی تنظیمی وسعت کے بعد بھی اس نے جو دستور اپنے لئے مرتب کیا۔ اُس میں اپنے وجود کی پہلی غرض اعتصام بحبل اللہ قرار دی۔ زمانے ممکن ہے راستوں میں کچھ تبدیلی کر دی ہو۔ لیکن منزل اگر قرآنی منزل نہیں ہے تو وہ ذلت و خواری کے جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں آپ کے منتخب کردہ خادم اور اس مجلس کے صدر کی حیثیت سے آپ سب ارکانِ مجلس اتحاد المسلمین پر عموماً اور ارکانِ عاملہ و شوریٰ ملکی مجلس، صدر صاحبان و عہدہ دارانِ مجالسِ ضلع و ابتدائی اور مبلغینِ مجلس اتحاد المسلمین پر خصوصاً، رکنیتِ مجلس کی شرطِ اولین کے طور پر یہ پابندی عائد کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک، عمل کی

---

[1] موصوف حیدر آباد دکن کے ممتاز قاری ہیں اور اپنے فن کے ایسے یکتا و یگانہ ہیں کہ ان کی شہرت عرب تک پہنچ چکی ہے۔

نیت سے اور معنی و مطلب کو سمجھ کر قرآن مجید کی کم از کم تین آیتیں روز تلاوت کیا کرے اور اس پر نہ صرف اپنے خدا کو گواہ ٹھہرائے بلکہ ماہواری تحتنۃ رپورٹ میں، جو مملکتی مجلس کو روانہ کیا جاتا ہے - بہ صداقتِ دل اطلاع دے کہ وہ کس حد تک اس شرط کا پابند رہا ہے۔ میری اس عمل پر مزاولت نے ثابت کیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح و صلاحِ انفرادی و اجتماعی کے نئے نئے دروازے کھولتا ہے - ہماری بدقسمتی سے ہم میں بہت بڑی جماعت اُن لوگوں کی ہے جو بے علمی کے باعث قرآن اور اس کے تراجم سے استفادہ نہیں کرسکتے - اُن کے لئے ہماری ہر شاخ کا فرض ہے کہ آبادی کی کسی مسجد میں، کسی پڑھے لکھے مسلمان کے ذریعہ قرآن اور اس کا کوئی مستند ترجمہ سنانے کا انتظام کرے - میری اور مملکتی مجلس کی تنقیحوں میں آئندہ سب سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس شرط کی کس حد تک تکمیل کی جا رہی ہے - میں اس سلسلہ میں اُن مساعی کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مولوی محمد عبدالرحیم صاحب واعظ سرکار عالی کی طرف سے جاری ہیں - اُن کے تفسیری رسالے اس مقصد کی تکمیل کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں، کیا سررشتۂ امور مذہبی سے میری یہ خواہش بیجا ہوگی کہ وہ تمام ائمہ مساجد پر نماز فجر یا مغرب کے بعد ان رسالوں کو سبقاً سبقاً مصلیوں کو پڑھ کر سنانا حکماً لازمی قرار دے دے۔"

اسی طرح انتقال سے صرف ایک ماہ پہلے مجلس کے سالانہ اجلاس منعقدہ شہر ورنگل میں آپ نے اپنے صدارتی خطبہ کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا :-

"آپ چاہے مجھے رجعت پسند کہیں مگر میں آپ کے موجودہ مسائل کا واحد علاج آپ کے مسلمان ہوجانے میں سمجھتا ہوں - مسلمان ہوجانے سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کا زاویۂ فکر اور نقطۂ نظر اسلامی ہوجائے - آپ حالات کا اسلامی نظر سے مطالعہ کرنے لگیں اور معاملات کو اسلامی فکر سے سوچنے لگیں - اس کیفیت کے پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قرآن حمید کی بامعنی تلاوت کو اپنا وظیفۂ حیات بنائیے اور روز سونے سے پہلے سوچئے کہ آپ آج اسلام سے کس قدر قریب یا دُور ہو رہے ہیں - میری دعا ہے کہ خدا ہم سب کو صراطِ مستقیم کی طرف رہبری فرمائے اور اس پر ثابت قدم رکھے - آمین!"

قرآن حمید کی بامعنی تلاوت کو وظیفۂ حیات بنانے کا یہی شدید جذبہ تھا - جس کے زیر اثر مرحوم نے صرف ذاتی مطالعہ پر اکتفا نہ کیا بلکہ باقاعدہ درس تفسیر کا آغاز کردیا - یہ درس روزانہ بعد نماز فجر اپنے محلہ کی چھوٹی سی مسجد میں (جو ڈیوڑھی کے عقب میں واقع ہے) ایک گھنٹہ تک پابندی کے ساتھ دیا کرتے - یہ درس صرف انہی دنوں میں ناغہ ہوتا جن میں وہ حیدرآباد سے باہر دورہ پر جایا کرتے تھے ورنہ کڑکڑاتے جاڑے، پریشان کن گرمیوں اور موسلادھار بارش تینوں موسموں میں یہ عیش کا پروردہ اور دولت کا آفریدہ نواب روزانہ مسجد میں چٹائی پر بیٹھ کر اپنے آقا کے کلام کو سمجھایا کرتا - حتیٰ کہ طبیعت ناساز بھی ہوجاتی تب بھی یہ شغل جاری رہتا - مرحوم نے لوگوں سے یہ کہہ رکھا تھا کہ اگر میں کبھی تساہل برتوں تو آپ کو حق حاصل ہے کہ مجھے گھر سے کھینچ نکالیں - آخری تین چار برسوں میں مسلسل جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور قلبی موثرات نے مرحوم کی صحت کو بہت زیادہ خراب کردیا تھا اور نزلے اور گلے کے مرض نے مستقل صورت اختیار کرلی تھی - حتیٰ کہ سردیوں میں صبح دس بجے تک بلند آواز سے بات بھی نہ کرسکتے تھے -

اس کے باوجود درسِ تفسیر میں ہرج واقع نہ ہونے دیا۔ لوگوں کو اپنے سے بہت قریب کر لیتے اور انتہائی پست آواز میں چشم و ابرو کو وضاحت کا آلہ بنانے ہوئے تفہیم و تشریح فرمایا کرتے۔ آپ اپنی بے شمار خدمات میں سب سے زیادہ اہم اور اشرف خدمت اسی خدمت کو خیال فرماتے تھے۔ کہتے تھے:۔

"مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہ یہی قرآن کی خدمت ہے۔"

ایک مرتبہ درس ختم ہونے کے بعد حسب عادت دعائے ماثورہ (اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ الخ) پڑھی۔ نہ معلوم کیا خیال آیا کہ گریہ طاری ہو گیا۔ فرمانے لگے:۔

"خانۂ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لئے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں، جلسہ آرائیوں اور ساری ہمہ ہمی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے، یہی اُن کی پناہ گاہ ہے۔"

اسی لئے اُن کو شکایت تھی کہ جو لوگ میری تقریروں کو اتنی دلبستگی سے سننے کے عادی ہیں وہ تفسیر میں کیوں شرکت نہیں کرتے۔ حالانکہ میری یہ گفتگو ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہاں تک کہہ جاتے کہ:۔

"اب میں ان جلسوں وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔ بس یہی کرو کہ ہر شخص انفرادی کوشش کرے۔ یہاں پندرہ بیس آدمی اللہ رسولؐ کی باتیں سنتے ہیں۔ اب یہ لوگ جا کر اپنے گھر میں بیان کریں۔ اس طرح پورے شہر میں تبلیغ ہو جاتی ہے۔ اور یہی چیز زیادہ مفید ہے۔"

مرحوم اور تقریروں کے لئے نوٹ بہت ہی کبھی تیاری کرتے تھے۔ لیکن تفسیر بڑے اہتمام سے سناتے تھے۔ رات میں سونے سے قبل ایک گھنٹہ یا صبح نمازِ فجر سے پہلے[1] جس آیت کی تفسیر بیان کرنی ہوتی اس سے متعلق مختلف نئی پرانی تفسیریں دیکھ ڈالتے تھے اور ساتھ ہی مختلف ترجمے پیش نظر رکھتے تھے۔

جب مرحوم نے یہ کام شروع کیا تو ساتھیوں نے اور ایک آدھ بڑی طاقت نے یہ باور کرایا کہ یہ تمہارا مقام نہیں۔ خود بھی فرماتے تھے کہ "یہ میرا مقام نہیں" لیکن دونوں کے کہنے میں مشرق و مغرب کا فرق تھا۔ وہ منع کرتے تھے اس لئے کہ چٹائی پر بیٹھنا اور عوام سے اس طرح ملنا "جاگیر داریت" کے خلاف ہے۔ اور یہ فرماتے تھے اس نقطۂ نظر سے کہ مفسر کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بارہا فرمایا کہ:۔

"میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سُناتا ہوں۔ میں تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزانہ صبح پڑھی ہوئی چیزوں پر غور کر لیا کرتا ہوں۔ خیال آیا کہ اگر یہی کام مسجد میں ہو اور بجائے خاموش سوچنے کے، باآواز بلند کہتا جاؤں[2] تو دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ بس اس وجہ سے یہاں بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا ہے۔"

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب "تدبر قرآن" میں فرمایا ہے کہ قرآن کے تدبر و مطالعہ کا بہترین وقت تہجد کا وقت ہے۔
[2] اس مطلب کو مرحوم اکثر Loud Thinking کے لفظ سے ادا کیا کرتے تھے۔

ان الفاظ میں فی الواقع کوئی تصنع نہیں تھا۔ ورنہ پندرہ بیس آدمیوں کو ایک گھنٹہ تک تفسیر نہ سنائی جاتی۔ انھیں کبھی شرکاء تفسیر کی تعداد کا خیال نہ آیا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ صرف دو ہی سامعین رہے۔ لیکن مرحوم برابر تفسیر سناتے رہے اور اسی طرح مطالب بیان کرتے رہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جس کی تقریروں کے لئے لوگ ہزاروں کی تعداد میں دوڑے دوڑے چلے آتے ہوں۔ اس کا دو، ایک آدمیوں کے آگے اس مستقل مزاجی سے قرآن سنانے رہنا نفسیاتی اعتبار سے بڑا مشکل کام ہے!

ایک مرتبہ تفسیر میں اسی قسم کے اعتراض کو دہراتے ہوئے کہنے لگے۔

"عموماً "بڑے طبقہ" کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ارے نصیب یار جنگ کے گھر میں تو ہمیشہ گانا بجانا ہوا کرتا تھا، آج یہ بہادر خاں کو کیا سوجھی ہے کہ جو قرآن پڑھانے بیٹھا ہے۔ تو میں جواب دیتا ہوں کہ ارے میاں جب تک تم لوگوں کے ہاں قرآن خوانی ہوتی تھی، ہمارے ہاں گانا ہوا کرتا تھا۔ اب تم لوگ گانے بجانے لگے ہو تو میں قرآن لئے بیٹھا ہوں۔"

اس پر سب حاضرین بے اختیار ہنس پڑے اور خود مرحوم بھی ہنسی کو ضبط نہ کرسکے!

درس تفسیر کے لئے مرحوم پوری سادگی کے ساتھ کرتہ اور کشمیری دوپلی ٹوپی پہنے، شیخ الہند کے ترجمہ والی حمائل ساتھ لئے مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ کبھی جناح کیپ بھی پہنتے تھے۔ سردی کے دنوں میں شب خوابی کا لباس جسم پر ہوتا۔ جس پر غالباً اون کا ایک ڈھیلا ڈھالا جبہ پہنے ہوتے۔ پاؤں میں پمپ شوز، ہلکا جوتا یا جوتے کو کاٹا ہوا سلیپر ہوتا۔ نماز خود ہی پڑھاتے اور نماز کے بعد نہایت رقت و صدق دل سے دعائیں مانگتے۔ اور "ربنا اتنا فی الدنیا" والی دعا کی تکرار چار چار پانچ پانچ بار کرتے۔ پھر دعا ختم کرکے بڑی دیر تک سر جھکا کر رونے اور گڑگڑاتے۔ اس کے بعد کلام پاک کھولا جاتا۔ تلاوت آیت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف انداز میں سناتے۔ حتیٰ کہ انگریزی ترجمہ بھی بتا دیتے۔ سامعین کو ہدایت تھی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھے۔ جب خود ترجمہ کرچکتے تو پوچھتے کوئی ترجمہ چھوٹ تو نہیں گیا؟ پھر فرماتے کہ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ قابل ترجیح ہے۔ آپ جسے چاہے اختیار کریں۔ اس کے بعد قواعد کے موٹے موٹے اصول بتا دیئے جاتے۔ لغات کی تشریح ہوتی اور پھر مطالب و مسائل زیر بحث آتے۔ درس میں بڑے بڑے کلامی مسائل حل ہوتے۔ فلسفہ کی گتھیاں سلجھائی جاتیں۔ فقہ کے نکات بیان کئے جاتے اور عارفانہ باتیں سنائی جاتیں۔ اگر کوئی خاص پتہ کی بات بتانی ہوتی یا کوئی نکتہ بیان کرنا ہوتا تو فرماتے:-

"دیکھ میاں! ایک بات بولتوں، یاد رکھو اور باندھ رکھو مگر بڑے مولی صاب سے نکو بولنا۔"[۱]

---

[۱] یعنی "دیکھو میاں! ایک بات کہتا ہوں۔ یاد رکھو اور باندھ رکھو مگر بڑے مولوی صاحب سے نہ کہنا۔" اس فقرے کے الفاظ اور انداز بیان میں مزاحی رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں ایک امر واقعی پر متنبہ کیا گیا ہے۔ مقصود بیان یہ ہے کہ عام مولوی صاحبان کی ذہنیت اور نفسیات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ مناسب نہیں ہے کہ کسی کا حوالہ دے کر ہر قسم کے نکات ان کے سامنے بیان کیے جائیں۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ان نکتوں پر نکتہ چینی ہوگی اور معقول استدلال کی بجائے خواہ مخواہ انھیں نزاعات و اختلافات کا موضوع بنا دیا جائیگا۔ اور اس طرح بات کہیں سے کہیں جا پہنچے گی۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ہر اچھی اور مفید بات اخذ کرلی جائے۔ وہ جہاں سے ملے لیکن مدرسی علماء کے سامنے بیان کرنے میں احتیاط کی جائے!

آیات کو پڑھ کر بار بار وجد کرتے اور فرماتے "اہاہا کیا بات فرمائی گئی ہے"۔ روزانہ بالعموم ایک ہی آیت کی تفسیر ہو سکتی تھی اور بعض دفعہ تو ایک ایک آیت کی تفسیر چار چار پانچ پانچ روز تک بیان ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً سورۂ فتح کی آیت هُوَ الَّذِی اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ۔ زیر تفسیر آئی تو صرف "اظہار دین" یعنی دین اسلام کے دیگر ادیان پر غلبہ کی تفسیر پانچ روز تک ہوتی رہی۔ ایک روز تعلیمات اسلام کے غلبہ کا ذکر ہوا۔ دوسرے روز عبادات کا۔ تیسرے دن فرائض و معاملات کا۔ چوتھی نشست میں اخلاقیات کا اور پھر آخری مرتبہ ظاہری غلبہ کی وضاحت کی گئی اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہمیں قرآن ختم کرنا ہے ورنہ ابھی فلسفیانہ پہلو رہ گیا اور دوسرے نقاطِ نظر سے تشریح نہ ہو سکی۔ فرماتے تھے۔ "بڑی مشکل ہوتی ہے قرآن کے حرف حرف کا یہ عالم ہے کہ ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست!

اسی طرح بیعتِ رضوان کا ذکر آیا تو ایک نشست میں تو صرف واقعۂ بیعت سُنایا گیا۔ اور دوسرے دن عارفِ رومیؒ کے بعض اشعار سے اس کی نہایت بلند اور عارفانہ توضیح کی گئی۔ جب کوئی سورت ختم ہو جاتی تو اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا۔ تاکہ ایک اجمالی مفہوم ذہن میں محفوظ رہے۔ غرض اسی ڈھنگ اور اسی رفتار سے تفسیر بیان ہوتی تھی۔ اور اسی لئے چھ برس میں پورے کلام پاک کی تفسیر بیان کی جا سکی۔ اس درس کی نسبت مرحوم کے ایک سوانح نگار مولوی غلام محمد صاحب بی اے نے بالکل صحیح کہا ہے:-

"وہ، جسے نام نہاد علماء، عالم کہتے ہوئے عار محسوس کرتے تھے ایسی جامع و مانع تفسیر سُنایا کرتا جو اُن جیسے پچاسوں کے لئے بصیرت کا باعث تھی۔ کاش شریک ہو کر استفادہ کرتے لیکن نفس پرستی کی بیڑیاں تھیں، سند کی فصیل حائل تھی۔ اُن کو توڑنا کوئی آسان بات تو نہ تھی!"

تفسیر میں جب ایک پارہ ختم ہو جاتا تو بڑی ہی احسان مندی سے اللہ کی جناب میں حمد و ثنا کرتے اور شکر کرتے کہ اُس نے اپنے ایک حقیر بندے سے اتنی تفسیر سُنانے کا کام لیا، پھر اپنی طرف سے تمام سامعین کی مٹھائی سے تواضع فرماتے۔ مرحوم شرکائے تفسیر کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ اکثر فرماتے کہ:-

"اگرچہ ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ لیکن ہمارا یہ بھائی چارہ جو یہاں مسجد میں بنتا ہے، بہت پُر خلوص ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی غرض شامل نہیں ہوتی۔ میرا سگا بھائی جائداد پر لڑے گا لیکن آپ لوگ نہیں لڑیں گے۔ لڑائی جھگڑے، بغض و عناد، حسد، لالچ یہ سب ڈنڈیاں درمیں سڑک پر مسجد سے باہر رُک جاتی ہیں اور آپ لوگ خالص و مخلص بن کر مسجد میں آتے ہیں اور اس طرح صحیح دینی اُخوت کی بنا پڑتی ہے۔"

قرآن مجید پڑھنے اور پڑھانے کے دوران میں شدتِ تاثر کا یہ عالم ہوتا کہ بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ ادھر قرآن مجید کی آیتوں پر ایک نظر ہی پڑی تھی اور اُدھر دل کی کیفیتیں آنکھوں کی زبانی ظاہر ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور جب کافی وقت گزرنے پر بھی قابو نہ حاصل کیا جا سکا تو اسی حالت میں گھر کی راہ لی۔ ایک روز رمضان کے مہینے میں حسب دستور درس کے لئے مسجد میں آئے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ آتے ہی نماز کے لئے کھڑے ہو گئے ادھر نیت باندھی اور اُدھر گگھی بندھ گئی۔ بڑی مشکل سے نماز ختم کی۔ تھوڑی دیر تک حسب عادت مراقبہ میں رہے پھر درس شروع ہوا۔

لیکن آنسو برابر جاری تھے۔ جب تک تفسیر سناتے رہے اشکوں کا سیلاب بہتا رہا۔ تفسیر ختم کرکے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دل کا درد ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا۔ دعا ختم کرکے حاضرین کو مخاطب کیا اور صرف اتنا کہا کہ "میاں قرآن پڑھو"۔ ان الفاظ میں معلوم نہیں کیا جادو بھرا ہوا تھا کہ سب کے سب زار وقطار رونے لگے۔ تفسیر ختم کرکے ایسے لاجواب انداز اور اس درجہ خلوص ورقت سے دعا کرتے کہ اس کی قبولیت کا یقین ہو جاتا۔ کہتے کہ "ربنا ہمارے قلوب کو تو قرآن کے معانی ومطالب کیلئے کھول دے ہم کو سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ خدایا ہم کو سیدھے اور غلط راستہ میں امتیاز کرنے کی توفیق دے۔ ہم وہی کریں جو تیرا حکم ہے اور جس پر تیرے نیک بندے چلتے رہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد عربی میں ایک لمبی چوڑی دعا پڑھتے اور منہ پر سیدھا ہاتھ پھیر کر اٹھتے اور السلام علیکم کہہ کر مکان کی طرف چلے جاتے۔

جب چھ سال کی طویل مدت کے بعد قرآن مجید ختم ہو سکا تو مسرت وانبساط کا جو عالم مرحوم پر طاری تھا۔ اس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے۔ خوشی سے بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے۔ اسی مسرت میں اس روز تمام سامعین کو کھانے پر بھی مدعو کیا۔ اور پر تکلف دعوت دی۔ باوجود نوکروں کی موجودگی کے، خود ہی سربراہی میں مصروف تھے۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے پھولوں کے ہار پہنائے تو مرحوم فرمانے لگے:۔

"پہنائیے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ہی دن رہے ہیں۔ ایک وہ جبکہ زیارت بیت اللہ سے مشرف کیا گیا تھا۔ اور ایک آج جبکہ اس کے فضل وکرم سے چھ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں"۔

ایک صاحب نے عرض کیا "نواب صاحب! یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے"۔ مرحوم نے فرمایا:۔

"آپ کو یہ کیسے گمان ہو گیا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا۔ اور انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہیگا"۔

چنانچہ دوسرے ہی روز سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور یوم وفات تک جاری رہی۔ ۳۔ رجب ۱۳۶۳ھ بروز اتوار آپ کی تفسیر کا آخری دن تھا۔ سورہ بقر کے چوبیسویں رکوع (پارہ دوم کے آٹھویں رکوع) کی ابتدائی چار آیتوں تک کی تفسیر بیان کی جا چکی تھی۔ آج پانچویں آیت زیر درس تھی۔ وقت مقررہ پر مسجد میں تشریف لائے تو تفسیر سے پہلے کہنے لگے کہ:۔

"آج میں زیادہ تیار نہیں ہوں۔ اور روزانہ جو مطالعہ رات میں کرکے یہاں آتا تھا وہ آج نہیں کر سکا۔ گذشتہ دو راتوں سے سالگرہ[1] کے عشائیوں میں وقت گزرا اور یہ ہماری ایمانی کمزوری ہے کہ ہم کبھی کبھی اللہ کی طرف سے ہٹ کر اس طرح دنیوی کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ خدا ہمیں بھلائی کی توفیق دے"۔

پھر قرآن کھولا اور یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

---

[1] واضح رہے کہ یکم رجب نظام دکن میر عثمان علی خان کا یوم پیدائش ہے۔ اس زمانہ میں اس موقع پر سرکاری وغیر سرکاری بڑے پیمانے پر جلسے منعقد ہوتے تھے۔ اور پارٹیاں دی جاتی تھیں۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ [۱]

اور ترجمہ کے بعد الفاظ و مطالب کی تشریح فرمانے لگے۔ لفظ فِتْنَةٌ کے متعلق فرمایا کہ اردو میں اس کے معنی شرارت اور خرابی کے لئے جاتے ہیں۔ مگر عربی میں اس کے اصل معنی ہیں "آزمانا اور امتحان کرنا" اور اس مقام پر لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کے الفاظ کے ساتھ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ کے الفاظ اس حالت کو واضح کرتے ہیں جس کو "فتنہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جب دین اللہ کے لئے نہ ہو۔ کفار برسر اقتدار ہوں۔ کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں۔ اور مسلمان اُن کے قہر و غلبہ کی وجہ سے خدا کے احکام پر پوری طرح عمل نہ کر سکتے ہوں۔ تو یہ در اصل فتنہ کی حالت ہے۔ اس حالت کو "فتنہ" اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ فتنہ کا قطعی استیصال کرو اور اس کے قطعی استیصال تک لڑو۔ اُس وقت تک لڑو جب تک اللہ کے نام اور احکام کا بول بالا نہ ہو جائے۔ اور اس کی حمایت میں لڑنے والی قوتوں کو کامل غلبہ اور تسخیر حاصل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ باز آجائیں تو ہاتھ روک لو اور زیادتی نہ کرو۔ اور پناہ دو۔ بجز چند ظالمین کے جن کے خمیر ہی میں شر موجود ہے۔ چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر حضورؐ انور نے فتح مکہ کے بعد تلوار میان ڈال دینے والوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور ابو سفیان کے مکان میں پناہ لینے والوں اور خانہ کعبہ و مسجد حرام میں گھسنے والوں کو پناہ دی۔ بجز پانچ یا چھ ظالمین کے جن کے متعلق حکم تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں کو بھی لپیٹ لیں اور حرم میں بھی گھس جائیں تب بھی اُن کو وہاں قتل کر دو۔

اس سے آگے کی آیات میں چند حرام مہینوں کا ذکر ہے [۲]۔ تمہیدی طور پر اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ :۔

"عرب میں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرّم اور رجب مقدس مہینے سمجھے جاتے تھے، چونکہ ذی الحجہ کے مہینے میں لوگ حج کے لئے دور دور سے آتے تھے اور سفر میں تقریباً ایک مہینہ صرف ہو جاتا تھا اس لئے اس اثناء میں امن کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور آپس کی خانہ جنگیاں موقوف کر دی جاتی تھیں۔ اسی طرح محرّم کا مہینہ واپس ہونے کے لئے پُر امن بنا دیا جاتا تھا اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لئے خاص تھا۔ اس لئے اس مہینہ میں بھی جنگ ملتوی کر دی جاتی تھی۔ اور اسی بناء پر ان چار مہینوں کو حرام (یعنی حرمت والے) مہینے کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ نالائق عرب اگر کسی سے انتقام لینا یا غارت گری کرنا چاہتے تو حرام مہینوں میں بھی جنگ کا اعلان کر دیتے۔ اور کہتے کہ ہمارے لئے یہ مہینے مقدس نہیں ہیں۔ مقدس مہینے بعد میں آئیں گے جب ہم صلح کر لیں گے یا لڑائی ختم کر دیں گے۔ اس طرح جب چاہتے مہینوں کو اور اُن کی ترتیب ہی کو بدل دیتے"

یہاں تک بیان کر کے فرمایا کہ :۔

"آج یہیں تک رہنے دیجئے۔ باقی انشاء اللہ کل کریں گے"

لیکن آہ! وہ ایسا آج تھا کہ جس کی کل قیامت اور روز جزا ہی ہے۔ یہ بات کس کے خیال میں آ سکتی تھی کہ "کل" نمودار نہ ہوگا

---

[۱] ترجمہ :۔ "اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں۔ مگر ظالموں پر" (بالفاظ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ)

[۲] اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ٥

لیکن اس "کل" میں چھپانے والا عندلیب اور اپنی طرز میں بیان کرنے والا مفسر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائے گا اور "کل" نمودار تو ہوگا لیکن ایک عالم کو جانے والے کے غم میں سوگوار دیکھے گا۔

ایک دن پہلے یعنی ہفتہ کے روز بارش ہو رہی تھی اور مرحوم سمیت درسِ تفسیر میں صرف چار آدمی تھے اس لئے وَقَاتِلُوهُم والی آیت کی تفسیر ختم ہونے کے بعد گزشتہ دو آیتوں کی تفسیر کا خلاصہ بھی بغیر فرمائش بیان کر دیا تاکہ سب لوگ مستفید ہوں۔ اس سے حاضرین بہت خوش ہوئے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ اُن کی آخری تفسیر ہے۔ گزشتہ دو آیتوں کے الفاظ یہ ہیں:-

"وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۚ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ" [1]

ان آیات کے متعلق فرمانے لگے کہ "کتنے کھلے اور صاف احکام ہیں فرمایا ہے کہ جب وہ لڑائی چھیڑ دیں، معاہدہ توڑ دیں اور خود ابتدا کریں تو مارو اُن کو جہاں وہ نظر آئیں اور اگر موقع ہو اور ضرورت محسوس ہو تو ان کو مکہ سے بھی نکال دو جہاں سے تم کو انہوں نے نکالا اور اب بھی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ فتنہ قتل سے بری چیز ہے۔ اگر چند آدمیوں کو قتل کر دیا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن "فتنہ" کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے قتل ہو جانے کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے اگر وہ فتنہ برپا کریں اور اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے چند آدمیوں کو مسلمان قتل کر دیں تو یہ عین رحمت ہے" پھر سرسید کی تفسیر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "بعض فتنے ایسے اٹھے تھے کہ مسلمانوں کو "جارحانہ" اقدام کرنا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ معلوم کتنے بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے"۔ پھر "مسجد حرام" کے معنی بتاتے ہوئے فرمایا کہ کعبہ کے اطراف کی مسجد کو مسجد حرام کہتے ہیں۔ یہ حرمت والی مسجد بھی ہے اور یہاں بعض حلال اور جائز باتیں حرام بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شکار کرنا اور عوام الناس کے بقول "جانوروں کے سید" کبوتر تک کو مارنا جو وہاں بہت پایا جاتا ہے۔ گھاس اکھیڑنا وغیرہ۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ پھر حکم ہے کہ مسجد حرام میں اپنے ہاتھ کو ابتداء سے روکو لیکن اگر وہ وہاں بھی لڑنے لگیں تو ان سے وہاں بھی لڑو اور کاٹ ڈالو کیونکہ منکروں کی یہی سزا ہے۔ ہاں اگر کفار باز آجائیں اور لڑنا بند کر دیں تو اُن سے کہو کہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ باری تعالیٰ کے ابر کرم سے سرسبز وادیاں اور خشک چٹانیں برابر سیراب رحمت پاتی ہیں۔ چنانچہ ابو سفیان۔ عکرمہؓ بن ابوجہل۔ ہندہؓ اور وحشیؓ اسی حکم کے تحت معاف کیے گئے۔

تفسیر ختم ہوئی تو ایک صاحب نے مرحوم سے شیعہ سنی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔ آپ نے جواب دیا کہ میں واقعات و حقائق اور مختلف لوگوں کی رائیں بتا سکتا ہوں۔ لیکن آپ یہاں اس مسجد میں میری ذاتی رائے دریافت نہیں کر سکتے۔ یہاں مجھے بالکل غیر جانبدار رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ شیعہ حضرات حضرت علیؓ کو افضل اور دیگر خلفاء کو غاصب کہتے ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ہمیں کسی کو کسی پر فضیلت دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ اُن میں سے

---

[1] ترجمہ:- "اور مار ڈالو اُن کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو اُن کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا۔ اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ لڑو اُن سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ۔ پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو اُن کو مارو۔ یہی ہے سزا کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے"
(دیباچہ حافظ شیخ الہند)

تم جس کسی کی اقتدا کرو گے، ہدایت پاؤ گے، رہا میرا ذاتی حال تو میں تمام صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ سے زیادہ متاثر ہوں۔ اور مجھے اُن کی طرف خاص کشش ہے، بلکہ اُن کے نام ہی سے مجھ پر خاص اثر ہوتا ہے۔ پھر بات کو مختصر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب جھگڑوں اور تُو تُو میں میں سے کیا فائدہ۔ جبکہ جو ہونا تھا۔ ہو گیا۔

مرحوم کا خیال تھا کہ آج سب حاضرین کا نام پوچھیں گے اور ضروری تعارف کرائیں گے۔ اس سے پہلے ایک دن انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ کسی دن آپس میں تعارف کرائیں گے۔ لیکن طبیعت کی ناسازی کے باعث سارے حاضرین سے نام نہ پوچھ سکے۔ صرف ایک شخص سے نام دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا "تفسیر علی"[1]۔ نام بڑا معنی خیز تھا۔ لیکن کچھ عجیب سا۔ اس لئے اس پر ایک خفیف سا قہقہہ پڑا! اور مرحوم نے بھی سنجیدگی سے تبسم فرمایا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ایسے بہت سے نام ہوتے ہیں چنانچہ ایک شخص کا نام "محمد عبد الرب العالمین" ہے۔ مرحوم نے سنجیدگی کے ساتھ مسکرا کر کہا "ایک عالمین بڑھا دیا گیا ہے۔ عبد الرب تو ہوا ہی کرتا ہے"۔ اس کے بعد دوسروں کا نام پوچھے بغیر سلام علیکم کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس دن بارش کی وجہ سے مرحوم نے اپنا ہلکا جوتا مسجد کے اندر رکھا تھا۔ جب باہر نکلنے لگے تو چپکے سے جوتا ہاتھ میں اُٹھایا اور باہر لے جا کر نیچے ڈال کر پہن لیا۔ میرے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں جوتے کے بالکل قریب تھا لیکن اس پر میری نظر نہ پڑی۔ جب انہوں نے جوتا اُٹھا لیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ہائے اتنا اچھا موقع کھو دیا۔ کاش! میں جوتا لے جا کر باہر رکھ دیتا۔ تاہم میں نے فوراً ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی روز ضرور کوشش کر کے جوتا اُٹھانے کی سعادت حاصل کروں گا۔ مگر آہ! یہ کسے خبر تھی کہ وہ موقع آخری اور بالکل آخری تھا"۔

مسجد کے باہر دو مسلمان طالب علم سامنے آ گئے۔ اور کتابیں طلب کیں۔ مرحوم نے پوچھا کیا آپ لوگوں کا امتحان ہو گیا؟ کیا پہلی کتابیں واپس کر دیں؟ طالب علموں نے جواب دیا۔ جی ہاں! فرمایا "چلو میرے ساتھ! کتابیں ضرور ملیں گی۔ ارے بھئی! یہ بچے بڑے اچھے ہیں"۔ پھر حاضرین کی طرف دیکھ کر کہا "یہ بچے تو مجھ سے زیادہ قابل ہیں"۔ یہ کہہ کر بچوں کو ساتھ لئے گھر کی طرف چلے گئے۔ مگر بارہ پندرہ گھنٹوں کے اندر دُنیا ہی سے چلے گئے۔

(رحمۃ اللہ وطاب ثراہ)

---

[1] تفسیر علی ادھیڑ عمر کے ایک انتہائی غریب شخص تھے۔ موز کیلے بیچا کرتے تھے۔ مسجد ننگے پیر آیا کرتے۔ سب سے پہلے آتے اور نماز روزانہ جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے۔ درس تفسیر کے وقت نہایت ادب اور عقیدت سے بیٹھتے تھے۔ اور غالباً تلنگی زبان میں کچھ نوٹ بھی کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی مرحوم سے کوئی سوال بھی کیا کرتے تھے۔ میرے ایک محب صادق جناب صادق احمد صاحب بی اے (حیدر آباد) کا بیان ہے کہ "مرحوم کی وفات پر پندرہ بیس دن گزرے تھے۔ میں کالج جا رہا تھا۔ جب ریزیڈنسی روڈ سے میرا گزر ہوا تو میری نظر تفسیر علی پر پڑ گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک لکڑی میں آگے پیچھے دو ٹوکریاں لٹکائے اور اُن میں کیلے رکھے ہوئے اپنی دھن میں کچھ آواز سے قرآن حمید کی بعض سورتیں پڑھتے اور ورد کرتے چلے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا اور رقت طاری ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا کہ جس شخص نے مرحوم کی تفسیر سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا اور اس پر عمل کیا وہ یہی ہیں جو اب ننگے پیر ہیں۔ لیکن حلال کی روزی اللہ کی راہ میں کما کر کھلاتے ہیں اور جب ہم حشر کا تصور قیامت کے دن ایک گروہ کی شکل میں گزریں گے تو ہماری صف میں آگے یہی تفسیر علی ہوں گے"۔

سعید رمضان ترجمہ:- آباد شاہ پوری

حسن البنّاء

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما ساز گار آمد

"یہ میرے وہ دلی تاثرات ہیں جنہیں میں عمر بھر فراموش نہیں کروں گا"

۱۳- فروری سنہ ۱۹۴۹ء

حادثہ فاجعہ۔

نماز فجر ادا کر کے میں موتمر اسلامی کے کچھ کاغذات ٹائپ کرنے بیٹھ گیا۔ اٹھا تو حادثہ فاجعہ کی خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ خدا کرے یہ خبر سچی نہ ہو .... میرا ہاتھ بے سکت ہے اور قلم جامد ہو کر رہ گیا ہے...... حسن البناء قتل کر دیے گئے ...... اس خبر کی صداقت کو دل نہیں مانتا۔ جھوٹ ہے!! نہیں! نہیں! خبر سچی ہے۔ ریڈیو پر نشر ہوئی ہے۔ اس مردِ عظیم پر کل شام گولی چلائی گئی۔ پھر اُسے اپنے پاک خون میں غلطاں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جہاں رات کے وقت اس کی روح جنت کو پرواز کر گئی۔ اور ہمیں زمین پر اس کی شر سامانیوں اور تلخیوں کا سامنا کرتے رہنے کے لئے چھوڑ گئی۔ اس عظیم انسان کو ایک مجرم ہاتھ نے قتل کر دیا....... اسلام کے حق میں اس نے بُرا کیا...... بہت بُرا۔

یا فضیلتہ المرشد! آپ جنت میں اپنے جس پاک اور بلند مقام پر بھی ہوں۔ آپ پر سلامتی ہو اور اللہ تعالیٰ آپ کو وہ جزائے خیر عطا فرمائے جو وہ ایک امام کو اس کے شاگردوں اور پیرو کاروں کی طرف سے عطا کر سکتا ہے!

حسن البنّاء امام تھے، امامت کے ہر مفہوم کے اعتبار سے۔ وہ ہر بات میں ایک اعلیٰ نمونہ تھے، اپنے علم میں، اپنے ایمان میں اپنے اخلاص میں۔ اپنی زندہ دلی میں، اپنی تیز فہمی میں، اپنی باریک بینی میں، اپنی وسیع القلبی میں اور اپنی پاک روح میں۔

حسن البناء اللہ کی حجت تھے۔ میرا خیال ہے کہ اسلام انسان کی آخیرا اعلیٰ نمونہ پر کرتا ہے اور گوشت اور خون کے اس مجسمہ کو پاکیزہ و شفاف نورانی سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ حسن البناء ایک باہیبت و جلال عقل تھے اور ایسی روح تھے جو سرِ بلند سے رابطہ رکھتی تھی؛ اور اللہ کے ذکر سے نہیں تھکتی تھی۔ وہ پہاڑ کی ایک بلند و بالا چوٹی تھے، جس میں علو اور ثبات تھا اور جس میں قوم کی قوت پنہاں تھی۔ وہ بڑے تجربہ کار تھے۔ اُن کا اندازہ اکثر غلط نہ ہوتا تھا۔ وہ سوز و گداز، سحر بیانی اور جرأت کے لحاظ سے ایک نجیر خیز شخصیت کے حامل تھے، انہوں نے ہمارے دل اللہ کی محبت سے بھر دیئے تھے اور ہمارے سینوں میں اسلام کی آتشِ عشق بھڑکا دی تھی۔ اور ہمیں پاکیزہ کوٹھالی میں اس طرح پگھلا دیا تھا کہ ذرا کھوٹ باقی نہ رہا تھا۔

حسن البنا جس روز قتل ہوئے وہ تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ اُن کے تلف ہو جانے سے انسانیت تلف ہو گئی۔ وہ ان انسانوں میں سے تھے جنہیں مادرِ گیتی شاذ و نادر ہی جنم دیا کرتی ہے!

حسن البناء اللہ کی راہ میں مسلسل تگ و دو اور شب و روز کے متواتر جہاد کے بعد قتل کر دیئے گئے!

مجھے اُن کا ملک کے طول و عرض میں سیماب وار گھومنا اور دورے کرنا کبھی نہ بھولے گا۔ وہ دن بھر میں دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سوتے تھے۔ وہ مرکزِ عام یا اپنے گھر میں اللہ کی عبادت اور "الشہاب" کے لئے دعوتی مضامین لکھنے میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے۔ مجھے ان کے وہ آنسو ہمیشہ یاد رہیں گے جو وہ مسلمانوں کی تغافل کیشی اور اسلام فراموشی پر اکثر بہایا کرتے تھے۔ یہ وہ گہری اور شیریں آواز تھی، یہ وہ زندہ اور پُر شوق ایمان تھا اور یہ وہ سوزاں روح تھی جس کے ذریعہ میں نے اللہ کو پہچانا۔ جس کی شعاعوں نے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ——— وہ ایک بُردبار اور ارجمند شخصیت تھی۔

یہ وہ حیرت انگیز انسان تھا جس نے امّت کو پستیوں سے اُبھارا، اسے جھنجوڑ جھنجوڑ اٹھایا اور اس کی روح وضمیر میں زندگی کی رَو دوڑادی۔ اور آج جبکہ وہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکا ہے اپنے پیچھے شریف اور زندہ قوم چھوڑ گیا ہے۔ جو اپنے رب کو پہچانتی ہے اور اپنے فرض کو ادا کرتی ہے!

امام حسن البنا، اُس فاسد و تاریک زمانہ میں ایک امید درخشاں تھے جنہیں اللہ کی رحمت اس دُنیا میں لائی تھی۔ اُن کا قتل مصر اور اہلِ مصر کی پیشانی پر ہمیشہ ایک رسوا کن داغ رہے گا۔

جمعہ ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۹ء

آپ فوت نہیں ہوئے!

میں ابھی ابھی سرتاج ہوٹل کراچی میں اپنے بالاخانہ کی گیلری سے باہر جھانک رہا تھا۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو قدرے جھک کر چل رہا تھا۔ اُس کی چال نے مجھے اخوان مصر میں سے ایک محترم اخ (بھائی) کی یاد دلادی!

اے اخوان مصر! اے نورِ نبوت سے مستنیر پاک نوجوانو! اے عظمت رفتہ کی یادگارو! اور اے دلِ مجروح کے عزادارو! کس کے وہم و گمان میں تھا کہ اس مردِ عظیم کے سایۂ طاعت میں نسیم حسن و حریت کی اٹھکھیلیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تند آندھیاں اپنے دامن میں اس گھٹاؤنے گناہ کی جھاڑی لئے ہم پر اُمنڈ آئیں گی!

حسن البنا نسیم خوشگوار تھے، جو اللہ کی رحمت کو لئے پیاسی انسانیت پر چلی اور ہمیں برتر و اولیٰ انسانوں کے دَور ——— انبیاء و مرسلین اور اللہ کے محبوب بندوں کے دَور ——— کی یاد دلا کر اور جنت و نیکی کا مشتاق بنا کر گزر گئی۔ وہ ایک ایسا چشمہ تھے جس سے ہم جی بھر کر سیراب ہوتے تھے۔ لیکن اس کا پانی کم ہونے میں نہ آتا تھا۔ وہ ایک ایسا پاکیزہ و صاف دریا تھے جس میں ہماری ساری میل کچیل دُھل جاتی تھی۔ اور وہ اسی طرح پاک و صاف اور بے پایاں رہتا تھا۔ نہ تنگ ہوتا تھا نہ غلیظ۔

یا فضیلۃ المرشد! کیا کہنے والے سچ کہتے ہیں کہ آپ وفات پا گئے .... اور یہ کہ آپ نے قاہرہ کی ایک سڑک پر قتل ہو کر وفات پائی۔ مسجدِ قیسون میں چند لوگوں نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی اور آپ دفن کر دیئے گئے اور یہ کہ آپ کو الوداع کہنے والا آپ کے اہلِ بیت اور چند اقرباء کے سوا اور کوئی نہ تھا؟ .... نہیں اے فضیلۃ المرشد! آپ نے وفات نہیں پائی۔ اس ذاتِ پاک کی قسم جس نے آپ کو پیدا کیا .... آپ نہیں مرے .... اُس خدائے لایزال کی قسم جس نے ہمیں آپ کی ذات سے نوازا اور آپ کی صحبت سے بہرہ ور فرمایا۔ آپ فوت نہیں ہوئے۔ آپ نے ہمارے دلوں کو قرآن کے نور سے آگاہ کیا۔ ہمیں اسلام کے راستہ پر ڈالا اور ہماری شیرازہ بندی کی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ہم دعوت و تربیت کا وہ کام جاری رکھیں گے جو آپ شب و روز انجام دیا کرتے تھے۔ منگل کے درس۔ مرکزِ عام کے خزینے

خصوصی مذاکرات، عام خطابات اور رات دن کے دعوے اسی طرح جاری رہیں گے...... یہ سب ہمارے دلوں میں رچ بس چکے ہیں اور اللہ کی امانت ہماری گردنوں کا قلادہ بن چکی ہے۔

یا فضیلۃ الاستاذ! آپ ہمیں اس حال میں چھوڑ کر گئے ہیں کہ آپ نے سخت بوجھ ہم پر لاد اور اسے ہمارے رگ و ریشہ اور اعصاب میں پگھلے شہد کی صورت پیوست کر دیا۔ پس اے روح حبیب! باغ بہشت میں شادان و فرحاں رہ......!

جمعۃ المبارک ۱۰ / جون ۱۹۴۹ء

سرگوشی!

(فاطمہ جناح ہسپتال کراچی کے ایک بلند کمرے میں ــ دس بجے صبح کے قریب)

سیدی فضیلۃ الاستاد المرشد!

السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اے عظیم انسان! اللہ آپ کو صبح مبارک کرے۔ اور...... کیا جنت میں بھی صبح و شام ہوا کرتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا ــ کہ آپ ہمیں یہاں نور و ظلمت کے درمیان حیران و سرگردان چھوڑ کر جنت میں جا بسیں ــ یا فضیلۃ الاستاذ! ہم آپ کی معیت میں ان پرندوں کی طرح تھے، جنہیں آپ نے اپنے اللہ کے اذن سے ان کے قفس سے رہا کیا تھا اور جو رہائی پاتے ہی مسرت کے مارے آزاد فضا میں پرواز کرنے لگے۔ لیکن ابھی وہ آپ تک لوٹ نہ پائے تھے تاکہ آپ انہیں اللہ کی راہ میں اڑائیں کہ آپ ان کو چھوڑ کر سب سے متاثر پڑوس اور سب سے سچی منزل کی طرف چلے گئے۔ چنانچہ آندھیوں نے انہیں گھیر لیا ہے اور اب انہیں ایک ایسے آشیانے کی تلاش ہے جس میں وہ جمع ہو سکیں...... اللہ کے سوا کسی کو خبر نہیں کہ وہ آشیانہ کہاں ہے۔ یا سیدی! زمانہ اپنے دامن میں ہماری خاطر جو کچھ بھی چھپائے ہوئے ہے، ہم اللہ سے اپنے عہد پر ثابت قدم رہنے کی دعا کرتے ہیں......

یا سیدی! آپ کی روح کہاں ہے؟ جو ہمارے دلوں سے حرماں نصیبی کو زائل کر دے۔ آپ کی آنکھیں کہاں ہیں، جن کے آسمانی نور کا پرتو ہم اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیں۔ آپ کا وہ حیرت ناک ضمیر کہاں ہے جو ہمیشہ ہمارے اندر یہ اعتماد قائم رکھتا تھا کہ ہم اپنے راستے پر گامزن رہیں۔ اور یہ کہ حسن البنار کے پیش نظر اللہ کی رضا اور خوشنودی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ یا سیدی! آپ وہ انسان تھے جس نے ہمیں ایمان کی راہ دکھائی تھی، جس پر اعتماد کیا جاتا تھا اور جس کے دامنِ صداقت میں راحتِ کامل ملا کرتی تھی۔

ہم آپ کے یہ کلمات ہمیشہ یاد رکھیں گے۔" اے اخوان! مجھے تمہارے بارے میں تم پر ٹوٹ پڑنے والی دنیا کا ڈر نہیں ہے کیونکہ اللہ کے اذن سے تم اس سے کہیں طاقتور ہو۔ لیکن مجھے تمہارے متعلق دو باتوں کا خوف ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم کہیں اللہ کو بھول نہ جاؤ اور اپنے آپ پر بھروسہ نہ کرنے لگو۔ یا کہیں تم اپنی اخوت کو فراموش نہ کر دو اور اس طرح تم میں سخت جنگ نہ چھڑ جائے۔"

یا فضیلۃ الاستاذ! ہم اللہ کو کبھی نہیں بھولیں گے اور اپنی اخوت کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ اور اللہ کے دشمن جو کچھ بھی کریں گے، ہم ان دونوں باتوں کو یاد رکھیں گے۔

سیدی الاستاذ! اس دن کو یاد کیجیے جب فلسطین کے پہلے معرکے میں محترم اخوان کی شہادت کی خبر آپ کو ملی تھی۔ اور یاد کیجیے کہ اس وقت آپ نے کہا تھا۔ "اے اللہ ہمیں جنت کا اشتیاق ہے...... اس کی حوروں اور اس کے فواکہات کی

خاطر نہیں بلکہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور صحابہ کرام سے ملاقات کی خاطر۔ اور یہ سب معزز ترین شہداء ہیں۔ اللہ نے آپ کی سن لی ہے۔ کیا آپ کی ان حضرات سے ملاقات ہوئی؟ اور آپ نے انہیں کس حال میں پایا؟ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں جس عزت وعظمت سے نوازا۔ خدا کرے آپ اس سے لطف اندوز ہوں۔ فآتاهم الله ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرۃ۔

آہ، یا استاذ! آپ واپس نہیں آئیں گے کہ میں آپ سے دریافت کروں۔ اور ہم آپ کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتے کہ آپ کی باتیں سنیں۔ خدا کرے ہم زندگی کا ایمان اور عزم کے ساتھ سامنا کر سکیں اور جو بیج آپ نے بویا تھا جلد پھل لے آئے۔ فمنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ اور اے روح حبیب الجھبر اللہ کی طرف سے سلامتی اور اس کی برکات نازل ہوں!

منگل ۱۱ر جولائی ۱۹۴۹ء

آخری ملاقات

(شام کے نو بجے ہیں میں ابھی چند منٹ ہوئے افطاری سے فارغ ہوا ہوں اور اب ایک واشنگ ٹب میں ہاتھ دھو رہا ہوں جہاں سے آرام باغ کے سامنے کی سڑک دکھائی دے رہی ہے)

میری نظر ایک کار پر جا پڑی ہے جو ہو بہو فضیلۃ المرشد کی کار کی طرح ہے جس میں وہ سوار ہوا کرتے تھے۔ میرا دل دھڑکنے اور سینے میں اچھلنے لگا ہے۔ مجھے وہ آخری لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے جب میں نے فضیلۃ المرشد الشہید (اللہ ان کے اعزاز کو دوبالا کرے) کو دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لمحات کو گزرے ابھی چند گھنٹے ہوئے ہیں یا جیسے زمانہ کی گردش رک گئی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے جامد ہو کر رہ گئے ہیں اور ریڈیو پر جتنی خبریں نشر ہوئی ہیں، سب جھوٹی، لاحاصل اور بے حقیقت ہیں۔

مرشد حبیب سفید لباس پہنے اور سفید دھاریدار کمبل اوڑھے مرکز عام کی مسجد کے قریبی کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے ہیں۔۔۔ پیارا سرخ چہرہ۔۔۔ نرم وشیریں آواز جس میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آب دہن کی گھلاوٹ ہے اور خوش آئند آسمانی جرس کا ترنم ہے۔۔۔ اور۔۔۔ فضیلۃ الاستاذ اپنی اس تقریر سے ابھی فارغ ہوئے ہیں جس میں آپ نے اخوان کو الوداع کہا ہے کیونکہ آپ اگلی صبح حجاز کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔

مجھے اپنے پاس بلاتے ہیں اور شرق اردن کے سفر کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دیتے ہیں۔ مجھے اپنے بیش بہا اعتماد میں لیتے ہوئے ایک کار خاص میرے سپرد کرتے ہیں۔ میں اپنے اس اعزاز پر زندگی بھر نازاں رہوں گا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہ ہماری اس دنیا میں آخری ملاقات ہے۔ اور اب ہمیں شاید اللہ تعالیٰ اگلی دنیا ہی میں ملائے گا۔

اے اللہ! حسن البناء کو بہترین شرف قبولیت عطا فرما۔ تو خوب جانتا ہے کہ وہ ایک صدق شعار بندے اور مخلص مجاہد تھے اور ایک ایسے امام تھے جنہوں نے پراگندہ امت کی ایک بڑی تعداد کو ایک مرکز پر جمع کیا اور انہیں نجاست سے پاک کیا اور تیرے اذن سے انہیں گمراہی سے نکال کر راہ ہدایت پر چلایا۔ اے اللہ! اپنی بارگاہ میں ان کے درجات بلند کر اور انہیں انبیاء اور صدیقین کے زمرہ میں شامل کر اور اپنے رخ جلیل پر نظر ڈالنے کی سعادت عطا کر، اور ہماری طرف سے انہیں وہ نیک بدلہ عنایت فرما جو تیرے دامن جود وکرم میں ان کے لئے ہو سکتا ہے اور ان کو ہر قسم کی عزت وعظمت سے نواز۔ اے اللہ! انہیں سعادت سے بہرہ ور کر۔ خداوندا! انہیں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کر۔ بارالہا! انہیں مسرت وشادمانی عطا کر۔ اور اے اللہ! ہمیں ان کے ساتھ صالحین کے زمرہ میں شامل کر۔ اور جو عہد ہم نے ان سے باندھا تھا اس پر ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں ان کی طرف سے نیک بدلہ دے اور ہمارے دلوں میں وہ نور ڈال دے جو ہماری راہ کو روشن ومنور کردے۔ اللّٰهم آمین۔ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وسلم۔ (المسلمون)

علامہ محمد اسد لیوپولڈ
مترجم:- سرور خاں بی ایس سی

دینِ فطرت

شاہراہِ حیات

بیسویں صدی کے طرۂ امتیاز نعروں میں سے ایک نعرہ اس "فضائے بسیط کی فتح" ہے۔ ذرائع نقل وحرکت میں اس قدر انقلاب آیا ہے جس کا تصور گذشتہ نسلیں نہیں کرسکتیں۔ تاریخ انسانی میں زمانۂ ماقبل کے مقابلے میں اپنی ذرائع کے طفیل مال واسباب کے انتقال کا پیمانہ وسیع تر اور اس کی رفتار تیز تر ہوگئی ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ قوموں کی معاشی زندگی میں باہمی رابطہ وتعاون ہے۔ آج کوئی قوم یا جماعت یا گروہ زیادہ عرصہ تک دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا، معاشی ترقی نے مقامی حیثیت سے آگے بڑھ کر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور سیاسی فاصلے اور جغرافیائی دوریاں سمٹتی جارہی ہیں۔ یہ نہ صرف اسباب تجارت بلکہ افکار اور تہذیبی اقدار کی بڑھتی ہوئی اہمیت بھی اپنے ساتھ لئے پھرتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں طاقتیں یعنی، معاشی اور ثقافتی اقدار ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں تاہم ان کے جاذب نظر اصولوں میں کافی فرق ہے۔ معاشیات کے اساسی قوانین کا تقاضا تو یہی ہے کہ قوموں کے مابین مال واسباب کا انتقال باہمی ہونا چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی قوم صرف خریدار بن کر نہیں رہ سکتی۔ دراں حالیکہ دوسری قوم ہمیشہ فروخت کنندہ رہے۔ انجام کار ان میں سے ہر ایک کو بیک وقت دونوں یعنی "اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" کا پارٹ ادا کرنا ہے۔ چاہے یہ کام بالواسطہ طریق سے ہو یا معاشی طاقتوں کی تمثیل میں اور کرداروں کے وسیلہ سے ہو۔ لیکن ثقافتی میدان میں تبادلے کے اس ٹھوس قانون کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ کم سے کم یہ ظاہری شکل میں نہیں ہوتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افکار اور تہذیبی موثرات کا تبادلہ لازماً "لینے اور دینے" کے اصول پر مبنی نہیں ہوا کرتا بشریت کا خاصہ ہے کہ جو اقوام اور تہذیب سیاسی اور معاشی لحاظ سے زیادہ قوی ہوتی ہیں وہ کمزور یا کم جفاکش قوموں پر جادو کی طرح اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ ان کمزور قوموں سے خود متاثر ہوئے بغیر وہ زندگی کے مجلسی اور علمی پہلوؤں میں ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آج ہم عالم مغرب اور دنیائے اسلام کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہی کچھ نظر آتا ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔

تاریخ کے ایک مبصر کے نقطۂ نگاہ سے آج مغربی تہذیب جس یک طرفہ طریق سے دنیائے اسلام پر اثر انداز ہو رہی ہے وہ قطعاً حیران کن نہیں کیونکہ یہ ایک تاریخی عمل کا صریح نتیجہ ہے۔ جس کے لئے بہت سی توجیہات پیش کی جاسکتی ہیں۔ شاید کوئی تاریخ داں اس سے مطمئن ہو۔ لیکن ہمارے لئے یہ مسئلہ جہاں نقادوں کا رہین رہتا ہے۔ ہماری حیثیت محض باذوق و دلچسپی رکھنے والے تماشائیوں کی نہیں بلکہ اس ڈرامہ میں حقیقی کرداروں کی ہے۔ ہم نبی آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ ہمارے لئے فی الحقیقت یہ مسئلہ اسی مقام سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کے برعکس نہ صرف ذہن کے اس ذہنی رجحان کا نام ہے جو مختلف تہذیبی شکلیں اپنانے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ بذات خود تہذیب کا مکمل دائرہ ہونے کے علاوہ ایک ایسا نظام ہے جس کے خدوخال واضح طور سے متعین

ہیں۔ جب کوئی پردیسی تہذیب ہمارے درمیان شعاع ریزی کرتی ہو — جیسا کہ آج ہو رہا ہے — اور ہماری تہذیبی ہیئت میں خاص نوعیت کے تغیرات پیدا کرنی چاہتی ہو تو اس وقت ہم پر یہ جاننے کا فرض عائد ہوتا ہے کہ آیا یہ اجنبی اثرات ہمارے تہذیبی کمالات سے میل رکھتے ہیں یا ان کے خلاف پڑتے ہیں۔ آیا یہ اسلامی تہذیب کے جسم میں توانائی پذیر خوناب کا پارٹ ادا کرتے ہیں یا زہر کا سا عمل کرتے ہیں۔

اس سوال کا جواب ہمیں صرف تجزیہ کرنے سے مل سکتا ہے۔ ہمیں دونوں یعنی مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے تحریک انگیز مقاصد دریافت کرنے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ معلوم کرنا ہے کہ ان میں تعاون کہاں تک ممکن ہے۔ چونکہ اسلامی تہذیب بہ لحاظ بنیاد ایک مذہبی تہذیب ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں یہ بتانا چاہئے کہ حیات انسانی میں مذہب کیا پارٹ ادا کرتا ہے۔

جس چیز کو ہم "مذہبی رجحان" کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ انسان کی عقل اور حیاتیاتی ساخت کا فطری نتیجہ ہے انسان میں اتنی قابلیت نہیں کہ وہ خود کو موت وحیات، لامحدودیت اور ازل وابد کا راز سمجھائے۔ یہاں اس کی قوت ادراک سرا نا ختہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے سامنے حل کی دو راہیں ہیں۔ اولاً زندگی کو بحیثیت "کل" کے سمجھنا ترک کر دے۔ انسان اس صورت میں صرف ظاہری تجربات کی شہادت پر ایمان لائے گا اور اپنے نتائج کو صرف ان کی وسعت تک محدود رکھیگا پس وہ زندگی کے اجزاء کے ذہن نشین کرنے میں کامیاب ہوگا اور جس رفتار سے اس کا علم فطرت ترقی کرے گا اسی نسبت سے اس کا علم اجزاء حیات بھی مقدار میں بڑھے گا۔ لیکن با ایں ہمہ اس کا علم اجزاء تک محدود رہے گا۔ کلیت کی گرفت بذاتِ خود انسانی منطق کے مقررہ لوازمات کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ طبعی علوم کا نتیجہ یہی کچھ ہے۔ دوسری راہ مذہب ہے جس کو سائنس کے شانہ بہ شانہ اچھی طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔ مذہب ایک باطنی اور بیشتر وجدانی احساس کے ذریعہ زندگی کی توحیدی تشریح کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ عقیدہ ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے کہ ایک ایسی مختار کل تخلیقی قوت (خدا) موجود ہے جو نہ صرف ساری کائنات پر پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق حکمرانی کر رہی ہے بلکہ وہ انسان کی قوت مدرکہ سے بالاتر بھی ہے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے ضروری نہیں کہ یہ نظریہ انسان کو ایسے حقائق ومعارف اور زندگی کے ایسے اجزاء کی جانچ پڑتال سے روکے جو اپنے آپ کو ظاہری مشاہدہ کے لئے پیش کرے۔ کیونکہ خارجی یعنی سائنسی اور باطنی یعنی مذہبی تصور میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن موخرالذکر فی الاصل زندگی کو ذات اور تحریک انگیز قوت کی آمیزش یا بالفاظ دیگر ایک متناسب اور ہم آہنگ کلیت کی حیثیت سے سمجھنے کے لئے واحد نظریاتی امکان ہے۔ گو "متناسب" کا لفظ بہت غلط استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا مطلب انسان کا بذات خود ایک متبادل رویہ ہے۔ دین دار آدمی جانتا ہے کہ جو کچھ اس کو پیش آتا ہے یا اس کے دل میں گزرتا ہے وہ کبھی بھی بیکار طاقتوں کے اندھا دھند عمل کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ وہ اس کو صرف خدا کے باخبر ارادہ کا نتیجہ مانتا ہے۔ اس لئے وہ بلحاظ ساخت ایک عالمگیر پلان کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اس طرح آدمی میں اپنی خودی (یعنی شخصیت) اور حقائق اور اشکال کی ظاہری دنیا جس کو دوسرے الفاظ میں نیچر کہتے ہیں کے مابین اختلاف کو دور کرنے کی قابلیت آجاتی ہے۔ روح کی دقیق ساخت کے باوجود اور اپنی خواہشات، اپنے خطرات، اپنے جذبات اور اپنے غیر مصدق شکوک کے ہوتے ہوئے انسان اپنے آپ کو ایسی فطرت سے دوچار ہوتے ہوئے پاتا ہے جس میں جود اور سفاکی، خوف اور تحفظ حیرت انگیز اور ناقابل طور سے ملائے گئے ہیں۔ اور جو انسانی ذہن کی بناوٹ اور اسالیب سے بالکلیہ جدا خطوط پر کام کر رہی ہے۔ اس نزاع کے ختم کرنے میں نہ تو خالص عقلی فلسفہ کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور نہ تجرباتی سائنس کو۔

ٹھیک یہی مقام ہے جہاں مذہب اپنا کرشمہ دکھاتا ہے۔

مذہبی تصور اور تجربہ کی روشنی میں بشری اور رازِ خود آگاہ ذات اور بے زبان مگر ظاہراً غیر ذمہ دار فطرت کو روحانی تناسب کے رشتہ میں پرو دیا جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں یعنی انسان کی شخصی آگاہی (معرفت) اور فطرت جو اس کے گرد وپیش اور اس کے اندر رہتی ہے ایک ہی تخلیقی قوت (خدا) کے مظہر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگرچہ شکل وصورت میں مختلف ہی سہی۔ پس مذہب کی وجہ سے انسان کو جو بے پایاں فائدہ ملتا ہے وہ اس بات کا علم ہے کہ وہ (انسان) تخلیق کے ابدی سلسلہ کی ایک سوچی سمجھی کڑی ہے اور اس کی یہ پوزیشن کہ وہ عالمگیر قیدو بند کی لامحدود ساخت کا ایک مخصوص حصہ ہے ہمیشہ برقرار رہیگی اس نظریہ کا نفسیاتی نتیجہ روحانی تسکین کا ایک گہرا احساس ہے۔ یعنی امیدوں اور خطرات کے درمیان ایسا تناسب جو ایک عابد کو چاہے وہ کسی مذہب کا پیرو ہو ایک لامذہب سے ممتاز کرتا ہے۔

یہ بنیادی وصف تمام بڑے مذاہب میں مشترک ہے۔ چاہے ان کے مخصوص عقائد کچھ بھی ہوں۔ اس کے علاوہ ان میں دوسری مشترک خاصیت وہ اخلاقی اپیل ہے جو انسان سے خدا کے حکم کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن یہ فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ اس نظریاتی تشریح اور پندو نصائح سے ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسلام نہ صرف ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی بلحاظ اکثریت ایک اکائی ہے۔ خدا کی وحدانیت اس کا بیّن ثبوت ہے۔ بلکہ یہ عملاً ہمیں دکھاتا ہے کہ کس طرح ہم میں سے ہر ایک اپنی شخصی اور دنیاوی حیات کے حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنے علم (عرفان) میں عمل وفکر کا اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ زندگی کے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اسلام میں کسی کو رہبانیت پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ روحانی طہارت کی خاطر کسی چور دروازہ کو ڈھونڈنے کے لئے نفس کشی اور تپسیا کی ضرورت تسلیم نہیں کی جاتی۔ نجات حاصل کرنے کے لئے بعید الفہم عقائد ماننے پر زور نہیں دیا جاتا۔ درحقیقت اس قسم کی باتیں اسلام سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ نہ تو عقائد معرفت کے لئے بنیاد بن سکتی ہیں اور نہ فلسفۂ حیات کے لئے۔ اسلام قوانینِ قدرت کے عین مطابق زندگی کا ایک پروگرام ہے جس کو اللہ نے اپنی مخلوق پر عائد کیا ہے۔ اس کا منتہائے مقصود بشری حیات، روحانی اور مادی پہلوؤں میں کامل تناسب ہے۔

اسلام میں عبادت کا نظریہ دوسرے مذاہب کے نظریہ ہائے عبادت سے مختلف ہے۔ یہاں اس کا دائرہ صرف دینی اشغال مثلاً نماز یا روزہ تک محدود نہیں بلکہ انسان کی تمام عملی زندگی پر حاوی ہے۔ اگر بلحاظ مجموعی ہماری حیات کا مقصد خداوند تعالیٰ کی پرستش کرنا ہے تو لازماً ہمیں اس زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں کی کل حیثیت میں ایک پیچیدہ اخلاقی ذمہ داری سمجھنا چاہئے۔ پس ہمیں اپنے تمام افعال کو چاہے وہ ظاہراً حقیقت ہی کیوں نہ ہوں امورِ عبادت سمجھ کر کرنا چاہئے یا بالفاظ دیگران کو خدا کے عالمگیر پلان کا ایک جز مانتے ہوئے پورا کرنا چاہئے۔ ایک اوسط درجہ قابلیت رکھنے والے آدمی کو یہ باتیں خواب وخیال معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کا مقصد نصب العین کو عملی جامہ پہنانا نہیں ہے؟

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کی پوزیشن شکوک وشبہات سے بالاتر دکھائی دیتی ہے۔ اوّلاً یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی حیات کے گوناگوں افعال میں اس زندگی کا مقصدِ وحید خدا کی پرستش کرنا ہے۔ ثانیاً اس غرض وغایت کا حصول اس وقت تک ناممکن رہے گا جب تک ہم اپنی زندگی کو دو یعنی روحانی اور مادی حصوں میں تقسیم کرنے پر مُصر ہوں گے۔ کیونکہ ان دونوں کو ہمارے عمل اور فکر وعلم میں ایک ہی متناسب ذات میں یکجا ہو جانا چاہئے۔ ہمارا نظریہ توحید

ہماری زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو یکجا کرنے اور متوازن بنانے کی کاوشوں میں منعکس ہونا چاہئے۔

اس خیال کا منطقی نتیجہ اسلام اور دیگر معلوم مذاہب کے درمیان مزید اختلاف کا انکشاف ہے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلام بلحاظ تعلیم و تربیت نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان مابعدالطبیعی تعلقات کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ اتنے ہی اصرار کے ساتھ فرد اور اس کے معاشرے کے مابین دنیاوی تعلقات کی نوعیت بھی بیان کرتا ہے۔ اسلام اس دنیوی زندگی کو محض ظاہری وجود و Empty shell) یا آنے والی زندگی کا ایک بے معنی ظل (پرتو) نہیں سمجھتا بلکہ اُسے ایک کامل اور واضح شخصیت گردانتا ہے۔

خدا خود بھی نہ صرف ذات (جوہر، اصلیت Essence) بلکہ مقصد اور انجام کے لحاظ سے بھی ایک ہے۔ اس لئے اس کی مخلوق تو ذات کے لحاظ سے شائد مگر مقصد اور انجام کے لحاظ سے یقیناً ایک ہے۔

پس اسلام انسان کی زندگی کا مطمع نظر اس وسیع معنیٰ میں ہے جس کی تشریح اوپر ہو چکی ہے خدا کی عبادت قرار دیتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو ہم کو انسان کی مجرد دنیاوی زندگی کے اندر اندر کمال تک پہنچنے کا امکان یقین دلاتا ہے۔ تمام مذاہب کو چھوڑ کر صرف اسلام کا دعوےٰ ہے کہ اس آب و گل کی زندگی میں بشری تکمیل ممکن ہے۔ اسلام عیسائیت کے برعکس اس دعوے کی تکمیل کو جسمانی (دنیوی) خواہشات کے مغلوب کرنے تک ملتوی نہیں رکھتا اور نہ ہندومت کی طرح ترقی پذیر سطح پر آواگون کے لاتناہی سلسلہ کا یقین دلاتا ہے۔ اور نہ بدھ مت کے ساتھ اس امر پر متفق ہے کہ کمال اور نجات کا حصول اپنی شخصیت اور دنیا کے ساتھ اپنے جذباتی تعلقات کے مٹانے پر منحصر ہے بلکہ اسلام کو اپنے اس دعوے پر اصرار ہے کہ انسان اپنی مجرد دنیاوی زندگی میں اُس کی تمام ممکنہ خوبیوں کو بروئے کار لا کر کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

غلط فہمی دور کرنے کی خاطر مناسب ہو گا کہ لفظ "کمال" کو ہم نے جن معنوں میں استعمال کیا ہے اس کی تشریح بھی کریں جب تک ہمارا واسطہ حیاتیاتی لحاظ سے محدود انسانوں کے ساتھ ہے ہم یقیناً کمالِ مطلق کا خیال تک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر مطلق چیز کا تعلق صرف خدا کی صفات سے ہے۔ انسانی کمال اپنے صحیح نفسیاتی اور اخلاقی معنوں میں لازماً ایک مشروط انداز اور محض مخصوص ڈھنگ رکھتا ہے۔ اس سے مُراد نہ تو متصورہ اچھے اوصاف کی تحصیل ہے اور نہ ان نئی خوبیوں کا تدریجاً حصول ہے جو کسی کے استعداد کے بغیر حاصل کئے جائیں بلکہ کسی فرد کے قبل الوجود اچھے اوصاف کی اس طریقہ سے افزائش مراد ہے جو اس کی جبلی مگر خوابیدہ صلاحیتوں کو جگا دے۔ چونکہ مظہر حیات فطری لحاظ سے تغیر پذیر ہے۔ اس لئے ہر انسان میں پیدائشی قوتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ تمام انسانوں کو کمال کا صرف ایک ہی نمونہ بننا چاہئے یا ان میں بننے کی صلاحیت ہے ایسی بے جوڑ بات ہو گی جیسی کہ ہم رتبہ اوصاف والے گھوڑوں کے متعلق فرض کر لیا جائے کہ ان میں سے ایک کو دوڑ میں کمال حاصل ہو اور دوسرے کو بھاری بوجھ کھینچنے میں! اس کا امکان ہے کہ دونوں کمال کے درجے تک پہنچے ہوئے ہوں مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے کیونکہ ان کی اصلی خوبیاں مختلف ہیں۔ انسان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر "کمال" کو کسی مخصوص وضع میں معیار مانا جائے جس طرح عیسائیت نے تارک الدنیا راہب کو معیار قرار دیا ہے تو انسانوں کو اپنا ذاتی تشخص ترک کرنا پڑے گا یا بدلنا ہو گا اور یا اس کو مغلوب کرنا ہو گا۔ اس کا صریح نتیجہ خدا کے اس قانون سے روگردانی ہو گی جو ذاتی تشخص کو تسلیم کرتا ہے۔ جو اس سطح ارضی کے تمام جانداروں پر حاوی ہے اس لئے اسلام جو جور و استبداد کا مذہب نہیں، انسان کو اپنی ذاتی، شخصی اور مجلسی زندگی میں وسیع اختیارات دیتا ہے

تاکہ مختلف افراد کے مختلف اوصاف، طبائع اور نفسیاتی میلانات ان کی مخصوص جبلی خواہش کے بموجب شاہراہ ترقی پر گام زن ہوں۔ پس ایک آدمی تارک الدنیا بھی ہوسکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو جائز حدود کے اندر اندر نفس پرستی کی زندگی سے پورا پورا حظ اُٹھا سکتا ہے۔ وہ صحراؤں میں گھومنے والا خانہ بدوش بھی ہوسکتا ہے جس کے پاس کل کے لئے روٹی نہ ہو۔ یا ایک متمول تاجر بھی ہوسکتا ہے جس کے گرد دولت کے انبار لگے ہوئے ہوں۔ جب تک وہ اخلاص سے اور جان بوجھ کر خدا کے عائد کردہ احکامات کو بجا لاتا ہے۔ اُس کو اپنی ذاتی زندگی اپنی فطرت کے اقتضا کے مطابق ڈھالنے کی آزادی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی جدوجہد اور کاوشوں کے ذریعہ خدا کی عطا کردہ زندگی کی توقیر کرے۔ اور اس طرح اپنی ارتقا کے طفیل اپنے بھائیوں کی روحانی، مجلسی، اور مادی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

اسلام میں اس "آزادی" کی بنیاد اس تصور پر مبنی ہے کہ اس کی اصلی فطرت آغاز پیدائش (ابتداہی) سے نیک ہے۔ عیسائیت انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دیتا ہے۔ ہندومت کی تعلیمات اس کو لحاظ اصلیت کمینہ اور ناپاک مانتی ہیں۔ اس لئے نجات کے حصول کی خاطر تناسخ کے لاتناہی سلسلہ میں اس کے لئے ٹھوکریں کھانا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ان سب کے برعکس اسلام اس کو پیدائشی پاکیزہ اور استعداد ذاتی کے لحاظ سے۔ جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔ کامل مانتا ہے۔ اللہ تعالے قرآن پاک میں فرماتا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ترجمہ (یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے۔ ثمّ رددناہ اسفل سافلین الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات (ترجمہ) اس کے بعد ہم اس کو ذلیل ترین بنا دیتے ہیں ماسوا ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ سورۃ ۹۵: ۴،۵

اس آیت میں یہ نظریہ بتلایا گیا ہے کہ انسان ابتدا سے نیک اور پاک ہے۔ مزید برآں یہ کہ لادینیت اور نیک اعمال کی کمی اس کی پیدائشی کاملیت کو ختم کرسکتی ہے۔ برعکس اس کے وہ اس ابتدائی اور ذاتی کاملیت کو نہ صرف برقرار رکھ سکتا ہے بلکہ دوبارہ بھی حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر خدا کی وحدانیت پر اعتقاد رکھے اور اس کے قوانین کے سامنے مطیع (فرماں بردار) ہو۔ پس اسلام کے نزدیک برائی نہ تو ناگزیر ہے اور نہ ازلی۔ یہ تو صرف انسان کی بعد کی زندگی کا ثمرہ ہے اور خدا نے جس جبلی اور اچھے اوصاف سے انسان کو نوازا ہے ان کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ وہ خوبیاں ہر فرد میں مختلف ہوتی ہیں۔ مگر استعداد ذاتی کے لحاظ سے کامل ہوتی ہیں۔ ان کی مکمل ارتقا اس دنیائے خاکی میں انسان کی ذاتی زندگی کے مقررہ عرصہ میں ممکن ہے۔ ہم یہ بات تسلیم شدہ مانتے ہیں کہ حیات بعد ممات جذبہ (نظر) کے بالکل بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہمیں مزید اوصاف اور نئی صلاحیتیں عطا کرے گی۔ جن سے کہ طفیل انسانی روح کی مزید ارتقاء ممکن ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس کا تعلق صرف ہماری آنے والی زندگی سے ہے۔ اس دنیوی زندگی میں بھی اسلامی تعلیمات کا یہ دعویٰ مطلق ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے نیک اور قبل الوجدان خصوصیات کو ترقی دے کر کمال کے مدارج طے کرسکتا ہے جن سے ہماری شخصیتیں مرکب ہیں۔

تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ دین ہے۔ جس نے انسان کے لئے اس کی روحانی خوشی ایک لمحہ بھر کے لئے بھی ضائع کئے بغیر دنیوی (بنیادی) زندگی سے لطف اُٹھانا ممکن بنا دیا ہے۔ یہ تصور اُس مسیحی تصور سے کس قدر مختلف ہے جس کی رو سے انسانیت ایک موروثی گناہ جس کا ارتکاب آدمؑ اور حوّا نے کیا جس کے بھاری بوجھ کے نیچے برابر لڑکھڑا رہی

کھارہی ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کم از کم نظریاتی حیثیت سے زندگی آلام و مصائب کی ایک تاریک وادی تصور کی جاتی ہے۔ گویا یہ دو متضاد طاقتوں یعنی برائی جس کی علامت شیطان ہے اور نیکی جس کی نمائندگی عیسےٰ مسیح کرتے ہیں اُس کی رزم گاہ ہے۔

شیطان جسمانی ترغیبات کے ذریعہ انسانی روح کو خدا تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ روح کا تعلق عیسےٰ علیہ السلام سے ہے جبکہ جسم شیطانی اثرات کی آماج گاہ ہے۔ ہم اس مطلب کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ مادہ کی دنیا لازماً طاغوتی ہے مگر روح کی دنیا قدسی نژاد اور اچھی ہے۔ بشریت سے متعلقہ چیز خواہ مادی ہو یا نفسانی۔ جس کو مسیحی مذہب کی اصطلاح میں نفسِ امّارہ کہتے ہیں۔ آدم کے اس فعل کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ جب اس نے مادہ اور تاریکی کے جہنمی شہزادہ یعنی ابلیس کے آگے سر ڈال دی۔ اس لئے تحصیل نجات کے لیئے آدمی کو اس گوشت و پوست کی دنیا سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ بلکہ آنے والی روحانی دنیا کو ہر وقت پیش نظر رکھے جس میں انسانیت کے گناہ کا کفارہ عیسےٰ کے صلیب پر چڑھنے سے پورا کیا جاتا ہے۔

ہر چند اس عقیدے پر عمل نہ بھی کیا جائے جیسا کہ اس پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا ہے۔ تب بھی اس قسم کی تعلیمات کا وجود مذہب سے رغبت رکھنے والے آدمی میں بُرے ضمیر کا ایک دائمی احساس پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اس دنیا کو ترک کرنے کے حکمِ ناطق اور اس زندگی کو گزارنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی فطری خواہش کے مابین ڈانوا ڈول رہتا ہے۔ ایک موروثی اور ناگزیر پاپ اور عیسےٰ کے صلیب پر چڑھنے سے اُس کے پُر اسرار لعید الفہم نجات کا نظریہ جس کو ایک متوسط فہم والا شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی روحانی آرزوؤں اور اس کی جائز خواہشاتِ زیست کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے

اسلام میں ہمیں کسی پیدائشی گناہ کا علم نہیں کیونکہ یہ خدائی نظریۂ انصاف سے مطابقت نہیں رکھتا۔ خداوندِ ارض و سما کسی بچے کو اس کے باپ کے افعال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ وہ کس طرح انسانوں کی ان لاتعداد نسلوں کو ایسے گناہ کا ذمہ دار قرار دے سکتا ہے جو ہمارے جدِ اول کی نافرمان برداری کی وجہ سے سرزد ہوا۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ اس عجیب مفروضہ کی فلسفیانہ تشریحات پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن آلائش سے پاک ذہن کے لیئے یہ نظریہ عقیدۂ تثلیث کی طرح ہمیشہ بناوٹی اور ناقابل اطمینان رہے گا۔ اسلامی تعلیمات میں جس طرح موروثی گناہ کا ذکر نہیں اسی طرح تمام انسانوں کی ہمہ گیر نجات کا اقرار بھی نہیں۔ نجات اور عذاب کا تعلق ذات (فرد) سے ہے (نجات اور عذاب فرداً فرداً ہونگے) ہر مسلمان اپنا کفارہ خود ادا کرے گا۔ وہ اپنے قلب میں روحانی کامیابیوں اور ناکامرانیوں کی تمام ممکنات کا حامل ہے۔ انسان کی شخصیت کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ لہا ما اکتسبت و علیہا ما اکتسبت۔ ایک دوسری آیت میں کہا گیا ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ

اگرچہ اسلام عیسائیت کی طرح زندگی کے پژمردہ پہلو کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی زندگی کو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دینے کی تعلیم بھی نہیں دیتا جو جدید مغربی تہذیب اس کے ساتھ منسوب کرتی ہے۔ اگر مسیحی فکر دنیوی حیات کو گھاٹے کی تجارت سمجھتی ہے تو جدید مغرب عیسائیت کے عین برعکس زندگی کی پرستش بعینہٖ اسی طرح کرتا ہے۔ جس طرح پیٹو اپنی خوراک کی پرستش کرتا ہے۔ اسلام اس کے خلاف دنیوی حیات کو نہایت سکون و ادب سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کو پوجتا نہیں بلکہ ایک بلند تر زندگی تک پہنچنے کے لئے ایک ضروری منزل سمجھتا ہے۔ اور چونکہ یہ ایک ضروری منزل ہے اس لئے آدمی کو اپنی دنیوی زندگی سے نفرت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اور نہ اس کی تحقیر کرنے کا!

اس دنیا میں ہمارا سفر حیات خدا کے پلان میں ایک ضروری اور اہم کڑی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی بے پایاں قدر و قیمت
رکھتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ صرف ایک مددگار (Instrument) قیمت ہے۔ اسلام میں نہ
جدید مغرب کی اس مادی نرش امیدی (optimism) کے لیے گنجائش ہے۔ جس کا دعویٰ ہے کہ "میری بادشاہت
اس دنیا تک محدود ہے" اور نہ عیسائیت کے اس عقیدہ کے لیے جو زندگی سے نفرت کرنے کا درس دیتا ہے اور جس کا کہنا ہے۔
"میری بادشاہت اس عالم سے متعلق نہیں"۔ اسلام نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔ قرآن پاک ہمیں یہ دعا کرنے کی
تعلیم کرتا ہے۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة (سورہ ۲: ۲۰۱) (ترجمہ) اے میرے پروردگار! مجھے
اس دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی) پس اس دنیا اور اس کے مال و متاع کی قدردانی کسی صورت میں بھی ہماری روحانی
کوششوں کی راہ میں سنگِ گراں نہیں بن سکتی۔ مادی ترقی ہمیں مرغوب ضرور ہے مگر مقصد بالذات نہیں۔ ہماری تمام عملی
کاوشوں کا مدعا ایسے شخصی اور مجلسی حالات کی تخلیق اور ابقا ہونا چاہیے جو بنی نوع انسان میں اخلاقی قوت کی افزائش و
ارتقا میں ممد و معاون ہو۔ اس اصول کے بموجب انسان کو ہر بڑے اور چھوٹے عمل میں اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔
اسلامی دینیات میں انجیل مقدس کی اس مشہور ہدایت (حکم کے لیے) کوئی جگہ نہیں کہ "سیزر یعنی حاکم وقت کے حقوق بھی ادا
کرو اور خدا کے حقوق بھی (Give Caesar That which belongs to Caesar and give
God That which belongs to God) کیونکہ اسلام زندگی کے اخلاقی اور مجلسی، معاشی ضروریات کے مابین
تقسیم کے وجود کو نہیں مانتا۔ ہر چیز میں آپ کو صرف ایک دفعہ انتخاب کی آزادی ہے۔ چاہے حق کو اپنالیں یا باطل کو۔ بیچ کے سارے
حقوق انتخاب سلب کر لیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عمل چونکہ علمِ اخلاق کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ اس لیے اس پر شدید اصرار
کیا گیا ہے۔

ہر مسلمان فرداً فرداً اپنے گرد و پیش کے واقعات کا ذمہ دار ہونے، اور ہر وقت اور ہر سو حق کے نفاذ اور باطل کی تنسیخ
کے لیے جد و جہد کو فرض کیا گیا ہے۔ اس حکم کا جواز قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں مل سکتا ہے:۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتؤمنون باللہ (سورہ ۳: ۱۱۰)
(ترجمہ) تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی بھلائی کی تلقین کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)
یہ آیت اسلام کے جنگ جویانہ معرکوں یعنی ابتدائی فتوحات اور اس کے نام نہاد امپیریلزم کا اخلاقی جواز ہے!
اگر دشمنانِ اسلام کو اس کے امپیریلسٹ ہونے پر ہی اصرار ہے تو ہم ایک لمحہ کے لیے (اس مفروضہ کو) مانے لیتے
ہیں کہ اسلام امپیریلسٹ تھا۔ مگر یاد رہے کہ اس قسم کا امپیریلزم ہوسِ ملک گیری کا نتیجہ نہ تھا اور نہ اس کا معاشی
یا قومی خود غرضیوں کے ساتھ کوئی علاقہ تھا تاکہ دوسری قوموں کو نقصان پہنچا کر مسلمانوں کے آرام و آسائش میں اضافہ
ہو۔ اسی طرح اس کا مدعا غیر مسلموں کو بالجبر آغوشِ اسلام میں لانا بھی نہیں تھا۔ اس کے پیشِ نظر انسان کی ممکنہ ترقی کے
لیے موزوں معاشرت کی تشکیل رہی تھی۔ اور اب بھی ہے۔ کیونکہ تعلیماتِ اسلام کے بموجب علمِ اخلاق کی وجہ سے
مسلمانوں پر اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ حق و باطل میں ارسطو کی طرح محض تمیز کرنا جس کے ساتھ حق کی
اشاعت اور باطل کی تنسیخ کا جذبہ نہ ہو بذاتِ خود ایک عظیم بداخلاقی ہے۔

منظر غازی آبادی

سلام اے رسولِ پاکؐ

دُنیا میں آہ و اشک ہیں عام اے رسولِ پاکؐ
گمراہ مقتدی ہیں کہ بھٹکے ہیں خود امام

عالم رہینِ درد تمام اے رسولِ پاکؐ
رہرو بھی دم بلب ہیں کہ رہبر ہیں تشنہ کام

محوِ فغاں ہیں آج عوام اے رسولِ پاکؐ
کرتے ہیں کفر و شرک شب و روز صبح و شام

اُمّت کی ہر سحر ہوئی شام اے رسولِ پاکؐ
وہ لوگ! جن کے لب پہ ہے "دینِ مبیں" کا نام

بدلے گا کب جہاں کا نظام اے رسولِ پاکؐ
بدنام ہو رہا ہے یہ نام اے رسولِ پاکؐ

ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ
ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ

سلام اے رسولِ پاکؐ
سلام اے رسولِ پاکؐ

اچھے ہیں طور آج گدا کے نہ شاہ کے
دُنیا سمجھ رہی ہے اندھیرے کو شمعِ طور

خوگر ہیں لوگ جرم کے عادی گناہ کے
باقی نہیں رہا ہے دلوں میں یقیں کا نور

سوتے ہیں خشک چشمۂ فیض و رفاہ کے
اُلجھے ہوئے دماغ ہیں کھوئے ہوئے شعور

زر کے، ہوس کے، نام کے، منصب کے، جاہ کے
پہنچا گئے تھے نوعِ بشر کو جہاں حضور

ہیں آپ کے غلام۔ غلام اے رسولِ پاکؐ
انسان کھو چکا وہ مقام اے رسولِ پاکؐ

ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ
ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ

سلام اے رسولِ پاکؐ
سلام اے رسولِ پاکؐ۔

فضا ابن فیضی

عشق

چہرۂ صبح کو دیتا ہے شعاعِ خورشید　　رات کی گود کو مہتاب عطا کرتا ہے
چشمِ نرگس کو سکھاتا ہے یہ آدابِ نظر　　سینۂ گل کو زرِ ناب عطا کرتا ہے
جوئباروں کو بناتا ہے ہم آہنگِ خرام　　سینۂ بحر کو سیلاب عطا کرتا ہے
عقلِ کوتاہ نظر کو یہ ستاروں کی طرح　　بینشِ دیدۂ بیخواب عطا کرتا ہے
یہ حیات اور تمدّن کے ہر افسانے کو　　ایک عنوانِ نظر تاب عطا کرتا ہے
سوزِ انفاس سے آذر کے صنم خانے کو　　یہ حرم کے در و محراب عطا کرتا ہے
وہ شبانی ہو، کلیمی ہو کہ خیر البشری　　عشق ہر ساز کو مضراب عطا کرتا ہے
آئینۂ صبحِ ازل اس کی اُفق تابی سے　　لالہ گوں شامِ ابد اس کی شفق تابی سے

تسکین قریشی

سوز و ساز

کس سے پوچھیں ہم نے کہاں وہ چہرۂ روشن دیکھا ہے　　محفل محفل ڈھونڈ چکے ہیں گلشن گلشن دیکھا ہے
کس کو دیکھیں کس کو نہ دیکھیں پھول بھی ہیں کلیاں بھی مگر　　جس سے لگائی آنکھ اُسی کو دل کا دشمن دیکھا ہے
حسنِ بہارِ صحنِ گلستاں، کیا دیکھے وہ دیوانہ　　جس کی نظر نے ایک ہی گُل میں سارا گلشن دیکھا ہے
ہم کو دیکھو، منزل منزل لُٹ کے ہوئے ہیں خاک نشیں　　ہم سے پوچھو کیسا کیسا، ہم نے رہزن دیکھا ہے
آج انہیں جو چاہو سمجھو ورنہ یہی تسکیں ہیں جنہیں　　کل تک ہم نے کوئے بتاں میں خاک بدامن دیکھا ہے

شفقت کاظمی

کوئی مونس کوئی ساتھی نہ رہا تیرے بعد　　یاد آتی ہے مجھے تیری وفا تیرے بعد
اب مجھے خندۂ عشرت سے سروکار نہیں　　اپنی تقدیر پہ ہوں نوحہ سرا تیرے بعد
کس سے اُمید رہ و رسمِ محبت رکھوں　　کون دیتا ہے مجھے دادِ وفا تیرے بعد
میں نے تدبیر تو کی اپنی طرف سے لیکن　　کوئی تسکین کا پہلو نہ ملا تیرے بعد
نہ رہا کوئی مرے ذوقِ نظر کا ساماں　　سُونی سُونی ہے زمانے کی فضا تیرے بعد
نہ سہی اپنا مقدر جو مجھے راس نہیں　　میں بھی ہوں اپنے مقدر سے خفا تیرے بعد
اپنی محرومیٔ قسمت کو دعا دیتا ہوں　　نہ شکایت ہے کسی سے نہ گلا تیرے بعد
کچھ ادا ہو نہ سکا حق ترے احسانوں کا　　تیرے شفقت کو ہے اقرارِ خطا تیرے بعد

رنگا رنگ

زکی زاکانی ـــــ

یہ کس نے میری اسیری کا انتظام کیا — فضا میں رنگ بکھیرے ہوا کو دام کیا
وہی شراب مرے حق میں ہو گئی ہے زہر — وہ جس شراب نے ساقی کو لالہ فام کیا
ہمیں نے جام پئے زہرِ غم کے ہنس ہنس کر — ہمیں نے دعوتِ ساقی کا احترام کیا

خیال رامپوری ـــــ

یادِ گیسو میں کیوں رواں ہیں اشک — رات ہے کارواں ٹھہر جائے
گام زن ہیں رہِ وفا پر ہم — اب جہاں تک یہ رہگزر جائے

غنی احمد غنی ـــــ

گلوں میں رنگ ہے کلیوں میں تازگی تم سے — بہار مانگ کے لائی ہے دل کشی تم سے
اُمنگ دل میں ہے نظروں میں دلکشی تم سے — خدا گواہ عبارت ہے زندگی تم سے
نہ آؤ خلوتِ غم میں یہاں وہ لُطف کہاں — ملوں گا آکے سرِ جوئبار ہی تم سے
ہزاروں شعر اسی کش مکش میں کہہ ڈالے — نہ حرفِ شوق مگر کہہ سکا ابھی تم سے

اثر انصاری ـــــ

کم حوصلے بھی ہو گئے غم ہو گیا جو کم — منزل قریب آئی تو رکنے لگے قدم

صابر دہلوی ـــــ

جستجوئے دوست آخر جستجوئے دوست ہے — رہبرِ راہِ طلب گم کردۂ منزل سہی

محشر بدایونی ـــــ

چٹک اے کلی لیکن آہستگی سے — یہ آواز گوشِ خزاں تک نہ پہنچے

ماہر القادری ـــــ

ایک ایک گام پہ دنیا مجھے ٹھکراتی ہے — مجھ کو اس زحمتِ بے جا پہ ہنسی آتی ہے

یہ چہرہ بے رنگ یہ ویران نگاہیں — اے دوست! مرے غم کو شکایت نہ سمجھنا

کسی آوارۂ غربت کی تمنا کے نجوم
ڈوب جاتے ہیں سرِ شام تجھے کیا معلوم

روحِ انتخاب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک مبغوض ذلیل ترین نام اس آدمی کا نام ہے جو ملک الاملاک (بادشاہوں کا بادشاہ یعنی شاہنشاہ) کہلائے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کا لباس اختیار کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کا لباس پہنتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس بندے کے قدم اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہو لیں تو آگ اُس کو نہیں چھو سکتی۔

حضور نے فرمایا۔ دو آنکھوں کو آگ نہیں چھو سکتی۔ ایک وہ جو آنکھ اللہ کے ڈر سے روئی۔ دوسری وہ جو اللہ کے راستہ میں پہرہ دیتی رہی۔

حضور نے فرمایا۔ فتنہ وفساد کے زمانے میں عبادت کرنا میری طرف ہجرت کرکے آنے کے مثل ہے۔

حضور نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو خرید وفروخت اور مطالبہ کرنے میں نرمی سے کام لے۔

حضور نے فرمایا۔ مومن بھلائی سے (یعنی علم سے) کبھی سیر نہیں ہوتا۔ حتّٰی کہ اُس کی انتہا جنت ہوتی ہے۔

فرمایا۔ قیامت میں وہ لوگ مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوں گے جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس آدمی جاسوس بھیجے اور اُن پر عاصم بن ثابت انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ یہ لوگ مقام ہدآۃ پہنچے، بنی لحیان کو خبر ہو گئی۔ تقریباً سو آدمی تیرانداز اُن کی تلاش میں متفرق ہو کر نکل پڑے اور نشانِ قدم دیکھتے ہوئے چلے، جب حضرت عاصمؓ اور اُن کے ساتھیوں کو معلوم ہوا تو ایک جگہ محصور ہو گئے اور اُن کو لوگوں نے گھیر لیا اور کہا تم اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کر دو اور اُتر آؤ۔ ہم تم سے عہد کرتے ہیں کہ ہم تم کو قتل نہ کریں گے۔ حضرت عاصمؓ نے کہا۔ اے قوم! کافر کی ذمہ داری پر نہ اُتروں گا اور کہا یا اللہ! اپنے نبی کو ہمارے حال سے مطلع فرما دے پھر اُن پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اور حضرت عاصمؓ شہید ہو گئے۔ اور خبیبؓ اور زید بن دثنہ اور ایک مرد اُن کے عہد وپیمان پر نکل آئے۔ جب یہ تینوں حضرات اُن کے قابو میں آگئے تو تینوں کی مشکیں کس لیں اور اپنی کمانوں کی زہ کھول دی تو اس تیسرے شخص نے کہا۔ یہ پہلی بد عہدی ہے۔ واللہ! میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔ میرے لئے ان شہیدوں کی تقلید اچھی ہے۔ میں ان کی اقتدا کروں گا۔ کافروں نے ان کو بزور کھینچا لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کھائی۔ تو کافروں نے ان کو بھی شہید کر دیا اور ان دونوں کو لے کر چلے گئے۔ مکہ پہنچ کر مکہ والوں کے ہاتھ اُن کو فروخت کر ڈالا (یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے۔ حارث کے بیٹوں نے حضرت خبیبؓ کو خریدا تاکہ اپنے باپ کا بدلہ لیں۔ جس کو حضرت خبیبؓ نے بدر میں قتل کیا تھا)

حضرت خبیبؓ کچھ عرصہ تک قید رہے۔ پھر سب نے اُن کے شہید کرنے کا فیصلہ کیا۔ . . . . . پھر وہ لوگ ان کو شہید کرنے حدِ حرم سے باہر لے گئے۔ تو حضرت خبیبؓ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر کہا۔ واللہ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ تم گمان کرو گے کہ موت کے

ڈر کی وجہ سے نماز میں دیر کر رہے ہیں تو میں دیر تک اطمینان سے نماز پڑھتا۔ پھر دعا کی کہ ان کو گن گن کر مار اور کسی کو نہ چھوڑ۔ پھر یہ شعر پڑھے۔

فلستُ اُبالی اقتل مسلما
علی ای جنبٍ کان فی اللہ مصرعی
وذالک فی ذات الالہ وان یشاء
یُبارک علیٰ اوصالِ شلوٍ ممزّعٍ[1]

جب میں اسلام پر مر رہا ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں، میرا گرنا اللہ کے لئے ہے چاہے جس پہلو گروں ــ یہ اللہ کی قدرت ہے۔ اگر وہ چاہے تو کھال کے ٹکڑے ٹکڑے میں برکت عطا کر دے۔

حضرت خبیبؓ نے شہادت کے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کی سنت نکالی۔ حضورؐ نے اپنے اصحاب کو ان لوگوں کی شہادت کی اطلاع دی۔

جب قریش کو حضرت عاصمؓ بن ثابت کے قتل ہونے کی خبر ملی تو کچھ لوگوں کو بھیجا کہ ان کا مثلہ کر کے لاؤ۔ کیونکہ عاصمؓ نے ان کے کسی بڑے شخص کو قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصمؓ کی حفاظت فرمائی۔ شہد کی مکھیاں ابر کے مانند ان کے گرد جمع ہو گئیں، کافروں کو جرات اُن کے پاس آنے تک کی نہ ہوئی۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ بات نہ کیا کرو۔ زیادہ بولنا دل کو سخت کر دیتا ہے اور سخت دل آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت دُور ہے۔

حضرت عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ میں نے حضور سرورؐ کائنات سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کس بات سے نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ اپنی زبان کو روکو اور گھر[2] تمہارے لئے کافی ہو۔ اور اپنی خطاؤں پر رویا کرو۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نامحرم عورت کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ۔ ہاں! اس کے محرم کے ساتھ جا سکتے ہو۔

حضورؐ نے فرمایا ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھوں کا زنا بدنگاہی ہے۔ کانوں کا زنا (حرام آواز کا) سننا ہے۔ زبان کا زنا (حرام) گفتگو ہے۔ ہاتھ کا زنا ناجائز استعمال ہے۔ پاؤں کا زنا (حرام چیز کی طرف) قدم اٹھانا ہے۔ قلب خواہش اور تمنا کرتا ہے اور انسان کی شرمگاہ اُس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب[3]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ شہید کو شہادت کے وقت اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے چٹکی لینے سے ہوتی ہے۔

---

[1] یہی اشعار عبدالقادر عودہ شہید نے پھانسی کے تختہ پر چڑھتے ہوئے پڑھے تھے۔

[2] یعنی اپنی زبان کے شر سے لوگوں کو بچانے کے لئے گھر میں بیٹھے رہنا زیادہ بہتر ہے۔

[3] یعنی عمل کر لیا تو اس خیال کی تصدیق ہو گئی ورنہ تکذیب۔

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

عوامی لیگ والے اپنی حرکتوں کے سبب پاکستانی عوام میں انتہائی نامقبول ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ اپنی اُکھڑی ہوئی ہوا کو جمانے اور باندھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کر رہے ہیں۔ مگر ہر تدبیر اُلٹی ہی آ کر پڑتی ہے۔ پولیس کی سنگینوں کے سایہ میں ان کے جلسے ہوتے ہیں، مگر کس قدر ناکام، ویران اور اُداس! لیکن شاباش ہے ان کی "بے غیرتی" کو، اتنی کچھ ذلتیں دیکھنے کے بعد بھی نہ یہ لوگ عبرت پکڑتے ہیں اور نہ ان کو اپنے کرتوتوں پر پشیمانی ہوتی ہے۔

لاہور کے ایک جلسہ کی رُوداد تماشائی کے کانوں تک اس طرح پہنچی ہے — کہ عوامی لیگ والوں نے پولیس کی مدد سے لاہور کے ایک محلّہ میں جلسہ کیا۔ یوں سمجھ کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا۔ کربھان متی نے کنبہ جوڑا "سامعین میں تعداد غالب پولیس کے سپاہیوں اور کرایہ کے آدمیوں کی تھی۔ تھوڑے سے تماشائی بھی جمع ہو گئے تھے۔ مگر "مخلوط انتخاب" کی حمایت میں تقریر کے آغاز ہی پر لوگ اُٹھنا شروع ہو گئے اور آخر میں دس پندرہ آدمی رہ گئے۔

—— بھائیو! ہمیں سامعین کی تعداد کی کمی پر افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ہزار تماشائیوں اور غیر ذمہ دار آدمیوں کے مقابلے میں دس سنجیدہ اور معقول آدمی زیادہ وزن رکھتے ہیں۔ آپ چند سامعین اس محلّہ کی آبادی کا مکھن ہیں . . .

اور . . . . . مقرر نے کہا

—— جی! ہم تو "محمد دین" ٹینٹ والے کے آدمی ہیں۔ شامیانے اُکھاڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں - - - "

مجمع سے آواز آئی۔

وہ جو پرانی کہاوت اور قدیم ضرب المثل ہے کہ "بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"، تو مصر کے واقعات کو ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ والے اپنے حق میں "نعمتِ غیر مترقبہ" سمجھ رہے ہیں کہ اس ہنگامہ کے آگے "جداگانہ انتخاب" کی مہم دب کر رہ گئی اور عوام کی توجہ دوسری طرف مڑ گئی مگر "بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی" مخلوط انتخاب کا تو ایک نہ ایک دن جھٹکا ہو کر ہی رہے گا۔ ان "مخلوطیوں" کا کچا چٹھا قوم کے سامنے آ چکا ہے۔ اب وہ اِن کے فریب میں نہیں آ سکتے۔ کاٹھ کی ہنڈیا بس ایک ہی بار چولھے پر چڑھتی ہے اور کاغذ کی ناؤ توجوانوں کے تھپیڑے کو بھی نہیں سہار سکتی! شاعروں کو چاہئے کہ اس "گٹھ جوڑ" کی وفات کے قطعے اور مرثیے ابھی سے تیار کر رکھیں۔

کراچی کی سعید منزل کے سامنے جونٹ پاتھ ہے وہ نجومیوں، رمّالوں اور جوتشیوں کا گڑھ ہے۔ وہ نر لانگ تک یہی لوگ اپنی چٹائیاں اور دریاں بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لوگ آتے ہیں اور اُن سے فال کھلواتے ہیں، ہاتھ دکھاتے ہیں۔ رمل کے پانسے پھینکے جاتے ہیں قسمت کے نوشتے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

ایک نجومی اور اُس کے "گاہک" کی بات چیت تماشائی "فاران" کے پڑھنے والوں کی دل چسپی کے لئے پیش کرتا ہے :—

— تمہارا کہیں دل اٹکا ہوا ہے۔

— (آہ بھر کر) مگر کامیابی کب تک ہوگی۔

— اب کی برسات تک! لیکن اُس کا بھائی تمہارے خلاف ہے اُس سے بچے رہنا۔

— اُس لڑکی کا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہے وہ ...... !

— (لبوں پر زبان پھیر کر) وہ اپنے محلہ میں ایک نوجوان کو "بھائی جان" کہتی ہے۔ میری مراد اُسی شخص سے ہے! علم جھوٹا نہیں ہو سکتا ... میاں! اور ہاں! پانچ سال پیچھے تمہیں ایک بیماری لگے گی، مگر تم اچھے ہو جاؤ گے۔ بس پندرہ بیس دن دکھ رہے گا۔

— اور ... جی ...

— (بات کاٹ کر) تمہاری قسمت میں دریا کا ایک سفر لکھا ہے۔" اس سفر میں تمہارے وارے نیارے ہو جائینگے اور شادیاں تمہاری — ڈھائی ہوں گی (ڈھائی شادیاں ... حیرت کے ساتھ) ہاں! ڈھائی شادیاں — ایک شادی ادھوری، یعنی کسی جگہ بات چیت چل کر رہ جائے گی۔ اور دو پوری شادیاں! تمہاری دوسری بیوی کے بائیں رخسار پر تل ہوگا۔ اُس کے آتے ہی تمہارے بھاگ کُھل جائیں گے۔ کالے کُتے کو سال میں دو بار دہی چٹا دیا کرو سب بلائیں دُور ہو جائیں گی۔

— مگر مجھے تو کُتے سے بڑا ڈر لگتا ہے؟

— تو کالی بلی ہی سہی۔

— اور کالی بلی نہ ملے — تو

— چتکبری سہی، اُس کے بدن پر کالے دھبے ہونے چاہئیں!

— (دو آنے نجومی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے) کوئی اور بات تو بتانے سے نہیں رہ گئی!

— دو آنے دے رہے ہو — ایں! کیا مجھے بھکاری سمجھ رکھا ہے!

— میرے پاس یہی دو آنے ہیں جو آپ کی نذر کر دئے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو میری جیب کی تلاشی لے سکتے ہیں۔

— دو آنے کے پیسے جیب میں ڈال کر فال کھلوانے کے لئے آئے تھے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو تم سے بات بھی نہ کرتا۔

— ایک بات عرض کروں، بُرا تو نہ مانئے گا ... جی! آپ کو اتنی تک خبر نہیں ہے کہ میری جیب میں کیا ہے؟ تو آپ آنے والی زندگی کا حال کس طرح بتا سکتے ہیں؟

نجومی نے خفیف ہو کر گنڈیریاں بیچنے والے کو آواز دی اور وہ آدمی اُٹھ کر چلا گیا

"فاران" کے عظیم الشان

توحید نمبر

کی تیاریاں شروع ہوگئیں

مشاہیر علماء اور ارباب فکر توحید نمبر کے لئے مقالے لکھ رہے ہیں

نظمیں بھی اپنے موضوعات پر ان شاء اللہ اچھوتی اور بلند پایہ ہوں گی۔

شرک و بدعت کے بتان عجم کیلئے تیشۂ ابراہیم اور ضرب کلیم

اس انقلابی نمبر کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں عام کرنے کے لئے ابھی سے کوشش شروع فرما دیجئے۔

"فاران" کے خریدار صاحبان کی خدمت میں

جن حضرات کی میعادِ خریداری ماہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں ختم ہو رہی ہے۔ اُن کی خدمت میں دفتر سے اطلاعی کارڈ بھیجے گئے ہیں۔ پاکستانی خریدار اپنا سالانہ چندہ منی آرڈر کے ذریعہ ارسال فرمادیں۔ اور اس میں "توحید نمبر" کے ڈاک کی رجسٹری وغیرہ کے مصارف کی رقم آٹھ آنے کا بھی اضافہ کردیں۔ ورنہ وی پی اُن کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ اور اُس کا چھڑانا اُن کا اخلاقی فرض ہوگا۔ جن حضرات کو خریدار رہنا منظور نہ ہو وہ دفتر فاران کو اطلاع ضرور دے دیں۔

بھارت کے خریدار صاحبان

دفتر "الحسنات" رام پور (یوپی) کو اپنا چندہ فوراً بھیجدیں۔ اور سالانہ چندہ (چھ روپے) میں آٹھ آنے کا مزید اضافہ فرمادیں۔ یہ "توحید نمبر" کے ڈاک کی رجسٹری وغیرہ کے مصارف کی رقم ہے۔ شکریہ!

منیجر "فاران"

ہماری نظر میں

مقدمہ مشکوٰۃ شریف

از:- شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، ترجمہ:- خواجہ محمد علی، ضخامت ۱۱۲ صفحات
قیمت ایک روپیہ دو آنہ، ملنے کا پتہ:- مکتبہ اسلامی ۲۳ ربانی روڈ، پرانی انارکلی لاہور

احادیث کے مشہور و مقبول اور قابل اعتماد مجموعہ "مشکوٰۃ شریف" کے مقدمہ کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی افادیت، ثقاہت اہمیت اور علمی منزلت مسلّم ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز اس کے مصنف ہیں۔ یہ مقدمہ تیرہ فصول پر مشتمل ہے جن میں سند و روایت کے اعتبار سے احادیث کی اقسام سے بحث کی گئی ہے۔

مشہور اور متواتر، غریب و عزیز میں کیا فرق ہے؟ شذوذ، نکارت، تعلیق، انقطاع، تدلیس و اضطراب کسے کہتے ہیں؟ صحیح حسن اور ضعیف حدیثوں کی کیا تعریف و قیود ہیں؟ حدیث کے مدارج کیا ہیں؟ —— یہ تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں! کتب حدیث کے مراتب کا بھی ذکر ہے، صحاح ستہ کے علاوہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم کا بھی اجمالی تذکرہ ہے۔

اس مقدمہ کو پڑھ کر محدثین کرام کے لئے بے اختیار دعا نکلتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی صحت کو جانچنے کے لئے ان بزرگوں نے کس قدر احتیاط و دیانت، دقّتِ نظر اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ اُردو داں طبقہ کو اس کتاب سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہئے!

آنحضرتؐ اور جوانی

از:- ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ضخامت ۳۳ صفحات، رقیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ: ——
دارالادب پاکستان، ۶۵ پٹیل پاڑہ، کراچی ۵!

جناب حسام الدین صاحب غوری نے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اسلامی بنیادوں پر ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے اپنی نگرانی میں ایک ادارہ قائم کیا ہے، یہ مفید کتابچہ اسی ادارہ کی طرف سے افادۂ عام کی غرض سے شائع ہوا ہے۔

اس کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جوانی کس قدر عفت و پاکیزگی اور دیانت و امانت کے ساتھ گزاری، یہاں تک کہ قریش آپ کو "امین" کہنے لگے! پھر نبوت ملنے کے بعد حضورؐ نے مسلم نوجوانوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت فرمائی اور اُنہیں بڑے بڑے کام سونپے! کتاب پڑھ کر یہ خیال اُبھرتا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو اگر اسلامی بنیادوں پر صحیح تربیت دی جائے تو تقدیر ملت کا ڈوبا ہوا ستارہ اُفق پر آج بھی طلوع ہو سکتا ہے۔

حُسنِ معاشرت

از:- محترمہ خیر النساء بہتر، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت دس آنہ، ملنے کا پتہ: ——
کتبہ اسلام، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ (بھارت)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی والدہ محترمہ کی یہ قابل قدر تصنیف ہے۔ اللہ کے فضل سے یہ گھرانے کا گھرانا ہی دین کی خدمت میں مصروف ہے (اللّٰھم کثّر امثالھم)

مسلمان لڑکیوں کو گھریلو زندگی، پرورشِ اولاد، خانہ داری اور حُسنِ اخلاق کا سبق دینے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور

ے موضوع پر بہت مفید کتاب ہے۔ نو ابواب ہیں:۔ میکہ ۔ سسرال ۔ خانہ داری[1] اور اُس کے طریقے ۔ تربیت اولاد ۔ چھوٹے بچوں کا علاج ۔ مہمان کی خاطر مدارات ۔ چند پند ۔ دعا ۔ معمولات ۔

زبان انتہائی سادہ اور عام فہم، اندازِ بیان دل نشین اور فکر خالص اسلامی ہے! دین و دنیا کو کس اعتدال کے ساتھ سمویا ہے۔ بچیاں، دلہنیں، مائیں اور بڑی بوڑھیاں سبھی اس کتاب سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں!

وجدانِ حافظ

از:۔ منور لکھنوی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، مجلّد رنگین گرد پوش کے ساتھ ۔

قیمت دو رُپے۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، اُردو بازار، دہلی

جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی وسیع المشرب، علم دوست اور خوش فکر شاعر ہیں۔ کالی داس کی "کمار سمبھو" تم بدھ کی تلقینات "دھمپد" اور بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ وہ کر چکے ہیں۔ اور یہ کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ب اُنھوں نے حافظ شیرازی کے بعض منتخب اشعار کو اُردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی جو بلند پایہ ناقد اور بے مثال نثر نگار ہونے کے علاوہ نغز گو شاعر بھی تھے اس نزاکت اور دشواری جانتے تھے کہ کسی زبان کے شعر کا منظوم ترجمہ "شعریت" کو کس قدر گھٹن اور ضیق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی لئے انھوں نے شعر العجم میں فارسی شعروں کا نثر میں ترجمہ کیا!

جناب منور لکھنوی کی ہمت کو آفرین ہے کہ انہوں نے اتنی خطرناک ذمہ داری اپنے سر لی۔ اور ایسے کام کو ہاتھ لگایا ہے کہ جو اگر سلیقہ سے انجام نہ پائے تو خود مترجم کی اپنی ذاتی شاعرانہ شخصیت کے زوال کا اندیشہ ہے۔

منظوم تراجم سے ہم خوش گمانی نہیں رکھتے اس لئے "وجدانِ حافظ" بے دلی کے ساتھ اُٹھائی۔ مگر کتاب کے دوسری شعر کے ترجمہ پر طبیعت کو انشراح ہونے لگا:۔

جاں فدائے تو کہ ہم جانی وہم جانانی
ہر کہ شد خاکِ درت رست ز سر گردانی (حافظ)

ترجمہ

تجھ پہ قربان کہ تو جان بھی جاناں بھی ہے
جو بنا خاک ترے در کی، پریشاں نہ رہا

کچھ اور شگفتہ نمونے:۔

فرد اکہ پیش گاہ حقیقت شود پدید	حقیقتِ باطنی کا جلوہ کہیں بھی جب آشکار ہوگا
شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد	مجاز پر ہے نگاہ جس کی وہ راہرو شرمسار ہوگا
خاطر کے رقم فیض پذیرد ہیہات	دل ترا فیض کی تاثیر کرے خاک قبول
مگر از نقش پراگندہ ورق سادہ کنی	یہ ورق نقش پریشاں سے اگر صاف نہیں

---

[1] صفحہ ۹۰ پر "جنس کی تعداد" پانچ نفر کے لئے جو لکھی ہے وہ محل نظر ہے۔ ایک مہینے کی خوراک کے لئے گیہوں تین سیر کم اور پندرہ سیر دال دو من گیہوں کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔

گدائی درِ جاناں بہ سلطنت مفروش
کسے ز سایۂ ایں در بہ آفتاب رود

سلطنت کیا درِ جاناں کی گدائی کے عوض
چھوڑ کر چھاؤں کہیں دھوپ میں جاتا ہے کوئی

گر دیگراں بعیش و طرب خرم اند و شاد
ما را غمِ نگار بود مایۂ سرور

ہم کو تو غمِ دوست ہے سرمایۂ صد عیش
دنیا ہو کسی بات سے مسرور ہمیں کیا

چناں بزی کہ اگر خاک رہ شوی کس را
غبارِ خاطرے از رہگذار ما نہ رسد

جی اس طرح کہ خاک بھی ہو جائے تو اگر
ثابت نہ ہو غبار کسی کی نگاہ میں

بہ خرمنِ دو جہاں سر فرو نمی آرند
دماغِ کبر گدایانِ خوشہ چیناں ہیں

لاتے نہیں نظر میں خرمن کو دو جہاں کے
جو خوشہ چیں گدا ہیں اُن کے جگر تو دیکھو

"دماغ" کو جگر سے بدل کر شعر کا لطف ہی غارت کر دیا، کاش! ترجمہ میں دوسرا مصرع اس طرح ہوتا:-

ع جو خوشہ چیں گدا ہیں اُن کے دماغ دیکھو!

دشمن بہ قصدِ حافظ اگر دم زند چہ باک
منت خدائے را کہ نیم شرمسارِ دوست

دشمن اگر ہے جان کا گاہک تو خوف کیا
شکر خدا کہ دوست کے احساں سے پاک ہوں

"نیم شرمسارِ دوست" ہی میں شعر کا سارا طلسم بند ہے، اسی کا ترجمہ نہ ہو سکا!

نظیرِ دوست ندیدم اگرچہ از مہ و مہر
نہادم آئنہ ہا در مقابلِ رخِ دوست

چاند سورج کے آئنوں میں بھی
دوست کا سا حسیں نہیں دیکھا

"نہادم آئنہ ہا" کا ترجمہ نہ ہونے سے شعر کا " ـــــــ " ہی جاتا رہا۔ اصل شعر کتنا شگفتہ اور رواں ہے اور ترجمہ ـــــ بس ترجمہ ہے!

جناب منور لکھنوی کی یہ کوشش بہرحال قابلِ قدر ہے اور ترجمہ میں اُن کی قادر الکلامی کا جگہ جگہ ثبوت ملتا ہے!

اقبال کا مردِ قلندر

از:- جلال کرٹوپی (چیف لیکچرار اردو فارسی، اسلامیہ کالج وانمباڑی) ضخامت ۱۲ صفحات قیمت دو آنہ، ملنے کا پتہ:- مکتبہ مظفری، نیو ٹون وانم باڑی، ضلع شمالی ارکاٹ (مدراس)

اس کتابچہ میں وہ اشعار جمع کئے گئے ہیں جن میں علامہ اقبال نے "مردِ قلندر" کا ذکر کیا ہے۔ فاضل مرتب نے اُن اشعار کی شرح بھی فرمائی ہے۔

"اصطلاح عام میں ریچھ اور بندر کھلانے والا"

"قلندر" کی یہ تعریف "فیروز اللغات" کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ "کھلانے والا" پڑھ کر طبیعت سخت مکدر ہوئی۔

اگر "فیروز اللغات" میں الفاظ کے اسی انداز پر معنی لکھے گئے ہیں تو یہ بڑی کمزور لغت ہے "ریچھ اور بندر نچانے والا" لکھنا چاہیے تھا!

تعمیری قاعدہ (مکمل)

از :- عبدالغنی اصغر و عبدالواحد رحیمی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت چھ آنے —
ملنے کا پتہ :- مکتبہ تعمیرِ ادب، ۳۸ دل محمد روڈ، لاہور

بچوں کے لئے جدید اسلوب پر یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں دینی اسپرٹ بھی پائی جاتی ہے چھوٹے بچوں کی فہم اور نفسیات کو اس قاعدہ کے مرتبین نے ملحوظ رکھا ہے!

عقیدۂ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو

از :- پروفیسر عبدالحمید ایم اے، ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت دس آنہ —
ملنے کا پتہ :- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور

عقیدہ ختم نبوت پر یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتی ہے۔ فاضل مصنف نے عمرانی نقطۂ نگاہ سے بتایا ہے کہ نبوت کے سلسلے کو اگر ختم نہ مانا جائے تو اس سے امت میں کس قدر تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اور امتِ واحدہ کو کتنے شدید تفرق و انتشار سے دوچار ہونا پڑے گا "ختم نبوت" کا عقیدہ جو کتاب و سنت کے عین مطابق ہے امتِ مسلمہ کی سالمیت اور وحدت کا ضامن ہے!

شادی کمیشن کی رپورٹ پر ایک نظر

از :- شہزادی عابدہ سلطانہ، ضخامت ۱۸ صفحات، قیمت فی کاپی ڈھائی آنہ —
ملنے کا پتہ :- ادارۂ خواتین اچھرہ، لاہور

شادی کمیشن کی بدنام اور مغرب زدہ رپورٹ پر شہزادی عابدہ سلطانہ نے انگریزی زبان میں تبصرہ کیا تھا۔ جو روزنامہ "ڈان" میں بالاقساط شائع ہوا تھا، ادارہ خواتین لاہور نے اس معرکہ آرا مضمون کا اردو ترجمہ خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ شہزادی عابدہ کو اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے کہ انھوں نے "شادی کمیشن رپورٹ" کی خلافِ شریعت دفعات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ استدلال، اندازِ بیان اور زبان ہر چیز خوب سے خوب تر ہے!

گناہِ بے لذت

از :- مفتی مولانا محمد شفیع صاحب، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت بارہ آنہ —
ملنے کا پتہ :- ادارۂ اسلامیات انارکلی، لاہور

مسلمان کا مذاق اڑانا — اپنا نسب بدل کر ظاہر کرنا — پاجامہ ٹخنوں سے نیچا پہننا — امام سے آگے نکل جانا — نماز میں کپڑوں سے کھیلنا — مدد دے کر احسان جتانا — غیر اللہ کی قسم کھانا (وغیرہ) ایسے گناہ ہیں جن کے کرنے میں نہ کوئی دنیاوی نفع ہے اور نہ لذت ہے۔ اس کتاب میں ایسے تمام گناہوں کا ذکر اور ان کے متعلق احکام ہیں۔ کتاب اپنے موضوع پر کامیاب اور سو فیصدی مفید ہے!

تعمیر ادب (حصہ اول)

از :- عبدالغنی اصغر، و عبدالواحد رحیمی، ۱۴۴ صفحات، قیمت تین آنہ —
ملنے کا پتہ :- مکتبہ تعمیرِ ادب ۳۸ دل محمد روڈ، لاہور۔

بچوں کے لئے ہر اعتبار سے مفید قاعدہ ہے۔ جس سے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں فائدہ اٹھانا چاہیے!

خوش رنگ پھول

از :— نذیر احمد ناظرؔ۔ ضخامت ۳۲ صفحات ، قیمت چھ آنے —
ملنے کا پتہ :— آسان کتاب گھر، تقصور

اس کتابچہ میں بچوں کے لئے ہلکی پھلکی نظمیں درج ہیں ۔

چال صبا کی ہے متوالی   وجد میں ہے ہر نخل کی ڈالی صفحہ ۱۸

"صبا" "وجد" "اور نخل" بچوں کے لئے کتنے مشکل لفظ ہیں ، دوسرا مصرع کاش اس طرح ہوتا :—

ع جھومتی ہے ہر پیڑ کی ڈالی

خوشبو سے مخمور فضا ہے   فرحت سے معمور ہوا ہے صفحہ ۱۸

یہ شعر بھی بچوں کے لئے مشکل ہے —— اور خوشبو سے فضا کا مخمور ہونا بے جوڑ سی بات ہے ۔

پھٹا پڑتا زمیں کا ہے جوبن   اور پھولوں سے ہیں اٹے گلشن صفحہ ۲۰

پہلا مصرع کسی عشقیہ مثنوی کے لئے موزوں تھا ۔ بچوں کو "جوبن کا پھٹا پڑنا" سمجھانے میں کتنی دشواری پیش آئے گی ۔ مصرع ثانی میں "اٹنا" بالکل غلط استعمال ہوا ہے "اٹنا" گرد و غبار کے لئے بولتے ہیں ۔ یہاں "پٹے" کا محل تھا !

سدّ باب ذریعہ

از :— علامہ ابن قیم ، ترجمہ :— مولانا عبداللہ العمادی ، ضخامت ۴۸ صفحات ، قیمت دس آنہ
ملنے کا پتہ :— مکتبہ نشاۃ ثانیہ ، معظم جاہی مارکیٹ ، حیدرآباد دکن ۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہی کتاب کی افادیت اور ثقاہت کی سب سے بڑی شہادت اور ضمانت ہے

"سدِ باب ذریعہ —— اصول شریعت میں سے اس اصل عظیم کی تشریح پر مشتمل ہے کہ اللہ تعالےٰ جب کسی شے کو حرام قرار دیتا ہے تو اس تک پہنچانے والے تمام وسائل و ذرائع کو بھی ممنوع کر دیتا ہے تاکہ اس شے کی تحریم مضبوط اور مستحکم ہو جائے اور لوگ اس کے پاس تک نہ پھٹک سکیں ۔ اس کو علامہ موصوف نے مدلل بحث کے ساتھ ۹۹ مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ اسلام نے ان تمام امور کو ممنوع قرار دیا ہے جو خواہ بجائے خود مباح ہوں لیکن جنھیں کسی گناہ کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے ، جو کسی انسان کو بلا ارادہ کسی مفسدہ میں مبتلا کر سکتے ہوں " (ناشر)

کتاب اپنے موضوع پر بے مثال ہے ۔ ترجمہ بھی سادہ ، عام فہم اور دل نشیں ہے ۔ اللہ تعالےٰ مصنف ، مترجم اور ناشر کو اجر جزیل عطا فرمائے (آمین)

قادیانیت کا آغاز و انجام

مولفہ —— پروفیسر الیاس برنی ۔ ضخامت ۳۲ صفحات (بلا قیمت برائے تقسیم عام)
ملنے کا پتہ :— مطبع ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ ، کٹلمنڈی ، حیدرآباد دکن (بھارت)

پروفیسر الیاس برنی (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ) نے قادیانیت کے خلاف جو قلمی جہاد کیا ہے ۔ اس کا ان کو آخرت میں اتنا اجر ملے گا " کہ یہ خود اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے " !

اس کتابچہ میں جناب برنی نے قادیانیوں کی کتابوں ہی کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ —

قادیانیت سرکار انگریزی کا خود کاشتہ پودا ہے —— یہ انگریزوں کی نمک پروردہ جماعت ہے ——

قادیانیوں نے انگریزی راج میں مسلمانوں کی مخبری کی ہے —— مرزائے قادیان نے بیسیوں کتابیں سلطنت انگریزی

کی تائید اور جہاد کی مخالفت میں لکھی ہیں ۔۔۔ مرزا غلام احمد حکومت برطانیہ کو قادیانی تلوار کہتا تھا ۔۔۔ گورنمنٹ برطانیہ ایک ڈھال ہے جس کے نیچے احمدی جماعت آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے ۔۔۔ قادیانی عام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں ۔۔۔۔۔۔!

یہ کتابچہ اگرچہ "بقامت کہتر" ہے مگر "بقیمت بہتر" ہے، یہ چند صفحے ہی قادیانیت کا پول کھولنے کے لئے بہت کافی ہیں!

پھلجھڑے

از: ۔۔۔ نذیر احمد ناظر، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت پانچ آنہ ۔۔۔

ملنے کا پتہ: ۔۔۔ آسان کتاب گھر دارالادب لاہور

بچوں کے لئے مزاحیہ نظمیں جناب نذیر احمد ناظر نے کہی ہیں۔ مقصد ہنسی ہنسی کی باتوں میں اخلاق کا درس دینا بھی ہے۔

ؔ ڈھب کوئی ایسا کیجئے (صفحہ ۵)

"ڈھب کرنا" روزمرہ نہیں ہے۔ شعروں میں کہیں کہیں بندش بہت سست ہوگئی ہے!

یادگارِ صفی

مرتبہ ۔۔۔ خواجہ حمید الدین شاہد ایم۔ اے، ضخامت ۶۲ صفحات، (بڑا سائز) قیمت دس آنہ۔

ملنے کا پتہ: ۔۔۔ سب رس کتاب گھر، ادبیات اردو، رفعت منزل۔ خیرت آباد، حیدرآباد دکن

بہبود علی صفیؔ اورنگ آبادی، دکن میں مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ داغؔ کے رنگ میں غزلیں کہتے تھے وضع اور مشرب رندانہ تھا۔ کلام میں صفائی، روزمرہ اور سادگی کی فراوانی ہے:-

کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے
شب کو اک آواز آتی ہے "الٰہی کیا کروں"

ہوا تڑکا الٰہی ! ذرہ ذرہ دہر کا جاگا
مری سوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا
بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

جب اس نے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا
زباں پر نہیں صورت پہ اعتبار کیا

تیری مژگاں کے تصور نے جگایا رات بھر
ہم تو سنتے تھے کہ کانٹوں پر بھی آجاتی ہے نیند

سب کو کیا کیا بندھی ہیں امیدیں
وہ ذرا بھی جو مسکرایا ہے

چراغِ زندگی مدھم ہے لیکن
چراغِ آرزو مدھم نہیں ہے

رعنائے دوست پر مرمٹنے والے سمجھ کر کیا کریں گے خیر و شر کو

اچھے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

عاشقی میں وہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا

اس یاد کے پورے کو دلائے کوئی کیا یاد میراجی کہا یاد نہ اپنا ہی کہا یاد

حضرت صفی اورنگ آبادی کے سالانہ یادگار جلسہ میں جو مضامین نظم و نثر اُن کی شخصیت اور شاعری پر پڑھے گئے تھے وہ اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں! مضامین سطحی زیادہ اور بلند کم ہیں!

ارمغانِ امجد

مرتبہ — خواجہ حمیدالدین شاہد ایم۔ اے، ضخامت ۸۸ صفحات (بڑا سائز)، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل، خیرت آباد، حیدر آباد دکن (بھارت)

حضرت امجد حیدر آبادی دکن کے مشہور رباعی گو شاعر ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے امجد صاحب کو "حکیم الشعراء" کا خطاب دیا تھا اور ٹھیک دیا تھا کہ اُن کی رباعیاں حکمت و معرفت کی ترجمان ہوتی ہیں۔ امجد قلندر صفت شاعر ہیں۔ قدیم صوفی شعراء کی جیتی جاگتی یادگار! جس رنگ میں وہ رباعیاں کہتے ہیں۔ اُس میں اُن کا کوئی حریف نہیں ہے — چند نمونے: —

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے مانندِ حباب اُبھر کے اِتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

ہمراہِ کرم حُسنِ عمل تمکتا ہے احسان سے بابِ معرفت کھلتا ہے
ہمدردیِ غیر میں ہے اپنا بھی بھلا کپڑا دھونے سے ہاتھ بھی دُھلتا ہے

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز کرتے نہیں پرہیز، دوا کھاتے ہیں

اے قطرۂ آب پھیل دریا ہو جا اے طائرِ روح مرغِ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر اے تودۂ خاک اُٹھ بگولا ہو جا

جناب خواجہ حمید الدین شاہد کی یہ ادب دوستی اور جوہر شناسی اُردو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ کہ اُن کی تحریک پر حضرت امجد حیدرآبادی کی علمی خدمات کے اعتراف کے لئے بڑے پیمانہ پر ایک تقریب منائی گئی۔ جس میں امجد صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ اور کیسۂ زر پیش کیا گیا۔

اس کتاب (ارمغانِ امجد) میں حضرت امجد حیدرآبادی کے جشن الماسی (Diomond Jubilee) (منعقدہ ... جنوری ۱۹۵۵ء) کے مقالات، نظمیں، مشاہیر کے پیام، سپاس نامہ اور جواب سپاس نامہ اور اس تقریب کی مکمل روداد شامل ہے، حکیم الشعراء کی شاعری پر بعض مقالے خاصے وزنی اور دلچسپ ہیں۔ اس تقریب کے سات فوٹو گروپ بھی کتاب کی زینت ہیں!

ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں

از:- مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، ضخامت ۸۰ صفحات (قیمت درج نہیں)

ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی، لاہور

اس کتاب میں کتاب وسنّت اور اقوال ائمہ کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ کفر، ایمان اور مسلمان کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اور اعتقاد وعمل کا کیا رویہ رکھنے سے کفر وایمان اور فسق وزندقہ کا کیا حکم لگایا جا سکتا ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ فاضل مصنف نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے!

فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو

(جلد اوّل) مرتبہ:- مولوی غلام رسول و مولوی محمد اکبر الدین صدیقی (ایم - اے) صفحات ۲۹۵ ڈبل سائز، قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ ادبیات اُردو، رفعت منزل خیرت آباد، حیدرآباد دکن (بھارت)

ادارۂ ادبیات اُردو ۱۹۳۱ء میں قائم کیا گیا تھا، اس چھبیس سال کی مدت میں اس ادارے نے اُردو زبان وادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ "ادارۂ ادبیات اُردو" کی کامیابی میں ڈاکٹر محی الدین زور کی انتھک کوششوں کا بڑا حصّہ ہے کہ موصوف اس کے بانی ہیں اور نفس ناطقہ اور روح رواں بھی!

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو کی اس کتاب کا نمبر ۲۰۲ ہے! ادارۂ مذکور کے کتب خانہ کے مخطوطات کے دو تفصیلی تذکرے شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ اس کتب خانہ کی پانچ ہزار کتابوں کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔

فلسفہ ومذہب — علوم طبیعی — فنون (باغبانی، لاسلکی، عطر سازی وغیرہ) — اجتماعیات — لسانیات — ادبیات — تاریخ وتذکرہ — متولات[1] (ڈائرکٹریاں، اخبارات ورسائل، رپورٹیں وغیرہ) ان عنوانات کے تحت کتابیں فہرست میں درج کی گئی ہیں، ایک نمونہ:—

---

[1] یہ عنوان "کھٹکا، کوئی اور موزوں عنوان ہوتا تو بہتر تھا — نیز کتاب کے سامنے اُس کی قیمت بھی درج ہوتی تو اچھا تھا!

نشان سلسلہ	مؤلف	کتاب	مقام و مطبع	سنہ	صفحات	معطی	کیفیت
۱۱	عبدالباری ندوی (مترجم)	حدیقۂ نفسیات	حیدر آباد دارالطبع جامعہ عثمانیہ	۱۹۲۸	۷۷۵	جامعہ عثمانیہ	ترجمہ کتاب "مینول آف سائیکالوجی" از جے۔ ایف۔ اسٹوٹ

یہ فہرست بڑے کام کی چیز ہے، عوام و خواص سبھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں!

اسلام اور تھیاکرسی

از:۔ عبدالحمید صدیقی ایم۔ اے، ضخامت ۱۷۵ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ، دلکھائی، چھپائی اور کاغذ ہر چیز دیدہ زیب، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ چراغِ راہ، لاہور

پاکستان میں ڈاکٹروں اور پروفیسروں کی کمی نہیں ہے مگر ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے فکر و عمل کا محور "اسلام" ہے اور جو اقامتِ دین کی تڑپ اپنے اندر رکھتے ہیں! پروفیسر عبدالحمید صدیقی (ایم۔ اے) کو علم کے ساتھ عمل کی بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہے، اسلام پسند اربابِ قلم اور اہلِ فکر میں آن کو ممتاز و بلند مقام حاصل ہے، موصوف کا قلم اشاعتِ دین کے لئے وقف ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ "تھیاکرسی" اصل میں کسے کہتے ہیں؟ پھر اس سے بحث کی ہے کہ "اسلام میں تھیاکرسی کیوں نہیں ہے"؟ اس کے بعد "اسلام اور تھیاکرسی" کے اساسی تصورات اور دونوں کے مقاصد کا تقابل کیا ہے

دلائل قوی، تنقید محتاط و معتدل اور اندازِ بیان سنجیدہ اور شگفتہ ہے، کتاب اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ گروہ میں زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے۔ تاکہ لوگوں کے شکوک کا ازالہ ہو سکے۔ اور یورپ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں دور ہو سکیں! کتاب کے آخر میں "کتابیات" پڑھ کر مصنف کی کاوش و عرق ریزی کا اندازہ ہوا کہ انہوں نے اردو، انگریزی اور عربی کی درجنوں کتابیں پڑھنے کے بعد یہ کتاب مرتب فرمائی ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء

نادرشاہ اور اتحادِ سنی و شیعہ

از:۔ حافظ محمد اسلم جیراج پوری، ضخامت ۲۴ صفحات، (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ حسن احمد صاحب مہتمم مدرسہ فیض الاسلام کوڈیور، جولاپیٹ (مدراس)

جب رسالہ "طلوعِ اسلام" دہلی سے نکلتا تھا تو ۱۹۳۶ء میں ایک مضمون حافظ محمد اسلم جیراج پوری مرحوم کا اس میں چھپا تھا۔ یہ کتابچہ اسی مقالہ سے ماخوذ ہے۔

اس کتابچہ میں سنی اور شیعہ علماء کے ایک مناظرہ کی روداد درج ہے، یہ مناظرہ نادرشاہ کے ایماء سے ہوا تھا، مناظرہ کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ شیعی مناظر نے "سبِّ شیخین" کے چھوڑنے کا اعلان کیا، متعہ کی تحریم تسلیم کی، تمام صحابہ کرامؓ کو "عدل" کہا، اور مناظرہ کے آخر میں شیعی، حنفی اور شافعی علماء نے ایک دوسرے سے معانقہ اور مصافحہ کیا۔

"صاحب جہاں کشائے نادری نے لکھا ہے کہ نادرشاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفائے اربعہ کا نام داخل کریں، اور سارے ملک میں اس محضر کی اشاعت کی جائے۔" (صفحہ ۲۴)

واقعہ بھی یہ ہے کہ "شیعیت اہلِ بیت اطہار سے والہانہ محبت کا نام ہے"، "سبِّ صحابہ" "شیعیت نہیں" "رفض" ہے! افسوس ہے کہ ایران کے مجوسی نہاد اہلِ علم نے "شیعیت" کے پردے میں "رفض" کی داغ بیل ڈال کر دین میں ایک مستقل

...فرقہ پیدا کردیا۔

آسان درسِ قرآن (حصۂ دوم)

مؤلفہ:- مولوی حافظ محمد یعقوب، ضخامت ۴۸ صفحات (قیمت درج نہیں)

ملنے کا پتہ:- محمد انیس انصاری نیاباز ار کامٹی (ایم پی)

لائق مؤلف نے قرآن پاک کی دس سورتوں کی عام فہم زبان میں تشریح کی ہے۔

...جذبۂ ایمانی کی کتاب میں فراوانی ہے۔

"داخل ہوگا اس میں وہی بدبخت جو جھٹلایا ——— اور دور دور رہے گا اس سے وہ متقی جو اپنا مال خرچ ...کیا" (صفحہ ۱۷)

"اس نے جھٹلایا" اور "جس نے اپنا مال خرچ کیا" لکھنا چاہئے تھا کہ یہی روزمرہ ہے!

MILLAT HIGH SCHOOL MULTA...
Plans and observes
SIRAT PROJECTS

ضخامت ۲۰ صفحات! (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:—
ملت ہائی اسکول، ملتان شہر

ملت ہائی اسکول ملتان، اس اعتبار سے اپنی طرز کا واحد ادارہ ہے۔ ...جس میں محکمہ تعلیمات پاکستان کے مجوزہ نصاب کی تعلیم کے علاوہ اخلاقی اور اسلامی بنیادوں پر بھی طلباء کی تربیت ...کی جاتی ہے۔ اس مدرسہ کے اساتذہ اور منتظمین سب کے سب اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس ہائی اسکول کے ...طلباء کے رگ وریشہ میں اسلامی اخلاق پیوست کردیا جائے!

اس مقصد کے لئے ملت ہائی اسکول ملتان میں "پندرہ روزہ" اور "ہفتہ وار" دینی پروگراموں کا انتظام کیا جاتا رہتا ...ہے۔ اس سال ربیع الاول کے شروع کے پندرہ دنوں میں "سیرت" کا پروگرام رکھا گیا، ہم نے اس مقدس پروگرام کی ...ایک جھلک اپنی آنکھ سے دیکھی ہے۔ اور ملت ہائی اسکول کے ارباب حل وعقد کے لئے دل سے دعائیں نکلی ہیں!

اس کتابچہ میں "پڑھنا"، "لکھنا"، "بولنا"، اور ساتھ ہی گرامر کی مشق، سیرت نبوی ہی کے اسباق سے کرائی گئی ...ہے، ہر سوال اسی مقدس موضوع پر ہے! دینی تربیت کا یہ ایک مثالی طریقہ ہے جس کو پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں ...میں عام ہونا چاہیئے!

ملت ہائی اسکول کے کارکنوں کی دینی فکر کی اس اپج پر رشک آتا ہے، یہی وہ "فراستِ مومن" ہے جس کے ...سامنے یونان وروما کی عقل ودانش گرد ہے! پاکستان کے لئے وہ دن کتنا مبارک ہوگا جب اس دینی فکر اور مضبوط کیریکٹر کے ...افراد کی مشورت سے یہاں کا نظام حکومت چلے گا! اللہ! یہ دن کب آئے گا؟ (اللّٰھم انصرھم)

مشرقی پاکستان کے حالات ومسائل کا جائزہ

از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۵۰ صفحات (قیمت درج نہیں) —

ملنے کا پتہ:- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور

اسی سال مارچ کے مہینہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تھا، اور وہاں کے بڑے بڑے شہروں کے تاریخی اجتماعات میں تقریریں کی تھیں، مشرقی پاکستان ...کے مسلم عوام کی محبت وعقیدت کا یہ عالم تھا کہ اپنی بستیوں سے پیدل چل چل کر مولانا مودودی کی تقریر سننے اور انہیں ...دیکھنے کے لئے پہنچتے تھے!

۲ رمارچ ۱۹۵۶ء کو مولنا موصوف نے ڈسٹرکٹ بورڈ ہال ڈھاکہ میں جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے کارکنوں کو خطاب کیا تھا، مولنا کی یہ تقریر کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔ اس تقریر کے چند ذیلی عنوانات سے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

مہاجرین کی خدمات اور اُن کی غلطیاں ــــ شکایت کے حقیقی اسباب ــــ زبان کا مسئلہ ــــ شکایات کا ناجائز فائدہ اُٹھانے والے عناصر ــــ کمیونسٹ ــــ ہندو ــــ سیاسی قسمت آزما ــــ اربابِ حکومت کی بے تدبیری ــــ متحدہ محاذ کا انجام اور اُس کے نتائج ــــ اصلاح کا موقعہ ــــ اصلاح کی تدابیر ــــ کارکنانِ جماعتِ اسلامی کو ہدایات!

"خوب سمجھ لیجئے کہ جماعتِ اسلامی کی طاقت کا انحصار جن چیزوں پر ہے ان میں اولین چیز اللہ اور اُس کے دین سے تعلق ہے، جماعتِ اسلامی کوئی ایسی سیاسی پارٹی نہیں ہے جو کوئی سیاسی کھیل کھیلنے کے لئے بنائی گئی ہو، اسے اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے، اور یہ انقلاب زندگی کے ہر شعبہ اور گوشہ میں برپا کرنا ہے، فکر و نظر میں، اخلاق و تمدن میں، سیاست و حکومت میں، معاشرت و معیشت میں، یہ کام جماعت اُس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اُس کے کارکنوں میں اخلاص نہ ہو اور جو اخلاص اس کام کے لئے درکار ہے وہ صرف تعلق باللہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے! (صفحہ ۲۹)

اُن لوگوں کو کیا کہئے کہ حق و صداقت کے اس مبلغ و منادی پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑتے ہیں اور نہ بندوں سے شرم کرتے ہیں اور نہ اللہ سے!

WHAT AGITATES THE MIND OF THE EAST

از:- عبدالحمید (ایم - اے)، ضخامت ۳۲ صفحات (قیمت درج نہیں) -
ملنے کا پتہ:- مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور

برطانیہ کے مشہور مزدور لیڈر مسٹر بیون (ANEURIN BEVAN) نے روزنامہ "ڈان" (کراچی) کے خصوصی نمائندہ سے ایک انٹرویو میں اس دینی جدو جہد کا مذاق اُڑایا تھا جو مسلم ممالک میں مذہبی دیوانے (Religious Enthusiasts) جاری کئے ہوئے ہیں! مسٹر بیون نے کہا کہ مصر اور دوسرے عرب ممالک میں "اخوان"، ایران میں "فدائیانِ اسلام"، اور پاکستان میں "جماعتِ اسلامی" ــــ یہ عناصر دراصل ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے ہیں، جس طرح یورپ کے "مذہبی دیوانے" یورپ میں ناکام ہو گئے، اسی طرح مسلم ممالک میں یہ مذہبی لوگ بھی ناکام ہو جائیں گے"

جناب پروفیسر عبدالحمید نے مسٹر بیون کے ان اعتراضات کا بڑی وزنی عقلی دلیلوں کے ساتھ جواب دیا ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ مسٹر بیون عیسائیت کو یورپ میں ناکام پاکر اور کلیسا کو بے دست و پا دیکھ کر "اسلام" کو بھی اسی فیتہ سے ناپنا چاہتے ہیں، یہ اُن کا زاویۂ نگاہ ہی سرے سے غلط ہے، اسلام ایک زندہ تحریک اور ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے تہذیب و تمدن کی تمام مفید ترقیوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی اسلام صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے یہ عظیم ترین انقلابی تحریک ناکام نہیں ہو سکتی" انگریزی پڑھے لکھے لوگ اس کتابچہ کو پڑھیں تو ان کو اس سے روشنی ملے گی!

اقبال اور مسٹر

از:- منشی عبدالرحمٰن خاں، ضخامت ۹۶ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ ــــ
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- گوشۂ ادب، انارکلی، لاہور

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) کے صدر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے "اقبال اور ملّا" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں "ملّا" کی آڑ میں علمائے دین پر خوب پھبتیاں چُست کی ہیں بلکہ یوں کہئے کہ اپنے دل کا بخار نکالا ہے! اور سب سے بڑی جسارت بلکہ تحریف و خیانت یہ کی ہے کہ اپنے ان مزعومہ خیالات کا جوڑ علامہ اقبال کے شعروں سے ملا دیا ہے۔

منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اقبال کے مکاتیب اور اُن کے مضامین کے بعض اقتباسات کے ذریعہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے ان الزامات کی تردید کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقبال علما و دین کا بہت احترام کرتے تھے، اور بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی ——

"اقبال نے بے شک مُلّا پر نکتہ چینی کی ہے لیکن مُلّا سے ان کی مُراد ہمیشہ "کٹھ ملا" سے ہے"

"اقبال اور مسٹر" جس نیک مقصد کے ساتھ لکھی گئی ہے اُس کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی کتاب کے جواب کے لئے جس انشاء، اسلوب نگارش اور فلسفیانہ فکر و بصیرت کی ضرورت تھی۔ اُس کی افسوس ہے کہ کمی محسوس ہوتی ہے!

مُصنّف کو مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے خاص کد ہے، اس کتاب میں مولٰنا مودودی کے تذکرہ کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر انہوں نے "اینٹی فرنٹ مُلّا" کے تحت مسٹر پرویز کے ساتھ مولانا مودودی صاحب کا بھی ذکر کر ہی ڈالا اور اس طرح انہوں نے اپنی کتاب کی ثقاہت کو بلا وجہ داغ دار کر لیا! یہی وہ "کٹھ ملاؤں" کی ذہنیت ہے جس کے لئے اقبال نے کہا تھا: —

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

"زیر بحث رسالہ "اقبال اور ملّا" کے مُصنّف **ماشاء اللہ** ایم اے، پی، ایچ، ڈی ہیں" (صفحہ ۲۸)

اس عبارت سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ مُصنّف کا نام "ماشاء اللہ" ہے!

"اگر شجر و ہجر، آفتاب و ماہتاب ۔ ۔ ۔ ۔" (صفحہ ۱۵)

"حجر" کا املا "ہجر" کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے —— "صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسّم علامہ اقبال کو ملنے گئے" (صفحہ ۹۴) "سے ملنے گئے" لکھنا تھا کہ یہی روزمرّہ ہے!

دینِ خالص

از: — مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت آٹھ آنہ —— ملنے کا پتہ: — کتب خانہ انجمن ترقی اُردو جامع مسجد دہلی۔

اس کتاب کے عنوانات ہی سے کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے: —

اللہ اور رسُول کا اتباع —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا معیار —— امتہ محمدیہ کے تین گروہ مُحدّثین، فقہاء، اولیاء اللہ —— اللہ اور رسُول کی اطاعت کا معیار —— اللہ اور رسُول کی عظمت و محبت —— محبت و عظمت کی علامات!

"حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ فقہ حنفی کی پابندی کرتے ہوئے کتاب و سنت کا اتباع کرنا ہی راہِ نجات ہے اور باقی جہالت و ضلالت ہے" (صفحہ ۵۸)

تقلید کا یہی وہ غلو ہے جس نے مسلکِ تقلید کو بدنام کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو افراط و تفریط سے بچاتا ہے!

پیغامِ رحمت

مرتبہ — محمد خلیل الرحمٰن بلتستانی! ضخامت ۳۲ صفحات،
جناب سید سردر شاہ گیلانی ایڈیٹر "الجماعت" کراچی ۳ سے مفت طلب کی جا سکتی ہے!

اس کتابچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک اور اخلاق و عادات کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے "شمائلِ مقدس" کے اکثر واقعات حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام سے مروی ہیں!

مجموعۂ نظمِ حالی

مرتبہ: — ظہیر احمد صدیقی ایم۔ اے، ضخامت ۱۷۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ پندرہ آنہ،
ملنے کا پتہ: — ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن حامد علی بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ ۲

جناب ظہیر احمد صدیقی (ایم۔ اے) نے مولانا حالی کی پندرہ نظموں کو ایڈٹ کیا ہے اور ہر نظم کی خصوصیات دل نشین انداز میں بیان کی ہیں۔ اُن کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔

حالی اپنے اشعار اور نثر کی طرح بے داغ اور عظیم تھے (صفحہ ۱۰) مفہوم تو سمجھ میں آگیا مگر انداز بیان صحتِ وجدان کو کھٹکتا ہے — "تمکین" (صفحہ ۱۶۲) کے معنیٰ "بردبار" محلِ نظر ہے "تمکین" کے معنیٰ رکھ رکھاؤ، قدر و منزلت اور جگہ پکڑنے کے ہیں — "ناتی" (صفحہ ۱۷۱) "ساقتی" کو نہیں رشتہ دار کو کہتے ہیں — "لعبت" (صفحہ ۱۰۳) کے معنیٰ "حسین اور خوبصورت" پڑھ کر حیرت ہوئی، "لعبت" تو کھلونے اور گڑیا کو کہتے ہیں — "ودیعت" (ص ۱۶) "بخشنے اور عطا کرنے" کو نہیں "امانت اور سپردگی" کو کہتے ہیں: — "فرہنگِ الفاظ" کتاب کا کمزور حصہ ہے!

مولانا حالی کے مسدس موسوم بہ "ننگِ خدمت" کے اس مصرعہ میں: —

حق نے شائستہ ہربات بنایا تھا ہمیں

"شائستہ ہربات" کی ترکیب پڑھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے "شائستہ ہرباب" ہوگا!

رسالہ نجاتیہ

از: — مولانا محمد فاخر زائر اللہ آبادی (متوفی ۱۱۶۴ھ) مع اضافات نواب صدیق حسن خاں (متوفی ۱۳۱۷ھ)
ترجمہ: — مولانا حافظ محمد اسحٰق صاحب، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ: —
جمعیۃ اہلِ حدیث شیش محل روڈ، لاہور

سلفی مسلک کے عقائد پر یہ ایک معلومات آفریں اور ایمان افروز رسالہ ہے، ہر صفحہ پر متن کے نیچے اُردو ترجمہ ہے! کتاب کے آغاز میں مصنف کے سوانح حیات درج ہیں!

مصری افسانے

مترجمہ: — مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی (بہ نظر ثانی نعیم احمد ملک ایم۔ اے) ضخامت ۱۴۳ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ: — انجمن ترقی تعلیم خوشاب دھقل،

عربی کے سات افسانوں کا اُردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، افسانوں کے عنوانات: —
سفرِ حیات — چاندی کے تیس سکّے — لاپتہ مجرم — نورِ مثال — موت کا تعاقب — خداوندا! اسے گھڑی بھر کے لئے پلٹا دے — مکافات!

ہر افسانہ میں دین و اخلاق کی جھلک ملتی ہے، ترجمہ شگفتہ اور رواں ہے، علامہ محمد سورتی مرحوم کے فرزند ارجمند سے ایسے ہی ترجمہ کی توقع تھی!

"گھبرایا ہوا" کی جگہ "گبھرایا ہوا" (صفحہ ۵۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ـــــ "قدموں کی چاپوں کو بغور سنتی رہی" (صفحہ ۵۶) "چاپ" کی جمع "چاپوں" عام طور پر سننے میں نہیں آئی ـــــ "یہ ایک قدیم محل ہے جو زمانہ کے چکر میں آکر تباہ حال ہوا" (صفحہ ۶۶) اس جملہ کا انداز بیان کسی "آدمی کی تباہ حالی" کے لئے زیادہ موزوں تھا! ـــــ اصل افسانوں کے ساتھ اُن کے لکھنے والوں کے نام ضرور دینے چاہیے تھے!

تحقیق گیارہویں

مرتبہ:- شعبۂ تبلیغ جماعت غرباء اہل حدیث، محمدی مسجد، بنس روڈ، کراچی (مفت مل سکتا ہے)

اس کتابچہ میں حنفی مذہب کی مشہور کتاب ـــــ ردّ المحتار ـــــ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "خدا کے سوا اوروں کی نذر کے حرام ہونے پر اُمّت کا اجماع ہے، نہ یہ نذر ماننی جائز ہے اور نہ اس کا پورا کرنا ضروری ہے، بلکہ حرام اور قطعی حرام ہے" ـــــ اور ـ ـ ـ ـ یعنی اس کے حرام ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ نذر نیاز مخلوق کے لئے ہے اور مخلوق کے لئے نذر جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت کے لائق کوئی مخلوق نہیں، دوسری وجہ یہ کہ جس کے لئے یہ نذر کی گئی ہے وہ میّت ہے اور میّت کسی چیز کی ملکیت یا اختیار نہیں رکھتی، تیسری وجہ یہ ہے کہ نذر نیاز کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میّت نفع نقصان پہنچا سکتی ہے، اور ایسا عقیدہ صریح کفر ہے" (اردو ترجمہ ـــــ عبارت ـــــ ردّ المحتار)

آخر میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کا فتویٰ درج ہے جس میں "گیارہویں" کو بدعت بتایا ہے! افسوس! حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مبلغ توحید کو اُن کے نادان عقیدت مندوں نے "اللہ کا شریک" بنا کر چھوڑا ہے (معاذ اللہ)

باوقار تنظیم کی پہلی پرافٹ شیئرنگ سکیم

کیا ہے ؟ یہ ایک باہمی بچت کی پراوٹ شیئرنگ سکیم ہے جس کا کوئی تعلق "طالع آزمائی" جوئے یا لاٹری جیسے غیر اسلامی اور ناجائز طریقوں سے قطعاً نہیں ہے جس کی وجہ سے آجکل کی عام "امدادی کمیٹیاں" بدنام ہیں بلکہ یہ ایک عام کاروبار کی طرح "شرکت نفع و نقصان" و صول مضاربت کے عین اسلامی اصول کے تحت جاری کی گئی ہے۔ اور اس کے متعلق اہل الرائے اور مقتدر علماء کرام سے تسلی کر لی گئی ہے۔

اغراض و مقاصد اچھے کام جب برے طریقوں اور برے ذرائع سے سرانجام دیئے جائیں تو وہ کبھی بھی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ اچھے کاموں سے اچھے نتائج پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طریقے اور وسائل اچھے اختیار کئے جائیں۔ باہمی بچت کو اجتماعی صورت دیکر بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنا اور فالتو روپیہ کو نفع بخش تجارت میں جائز طور پر لگاکر اس کے شرکا کو فائدہ پہنچانا کسی طرح بھی معیوب نہیں ہو سکتا۔ مگر آجکل کی نام نہاد "امدادی کمیٹیوں" نے ایسی اچھی اجتماعی سکیموں کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ باوقار تنظیم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ اس اچھے کام کو اچھے طریقے اور جائز ذرائع سے کیا جائے تاکہ اس میں حصہ لینے والے اس کے اچھے نتائج سے کما حقہٗ صحیح فائدہ حاصل کر سکیں۔ پس اندازی کی عادت بلاشبہ ایک نیک عادت ہے، ایک دوسرے کی بوقت ضرورت مدد کرنا جذبہ اخوت کا سرچشمہ ہے۔ سود سے بچکر شرکت نفع و نقصان کے اصول پر تجارت کرنا اسلام کے اصول مضاربت کے عین مطابق ہے۔ ایسی اجتماعی چھوٹی چھوٹی بچتوں سے ملک کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا، غریب اور نادار صنعت کاروں کو گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا۔ سارے ہی بہترین سماجی کام ہیں۔ اس سکیم کے یہی چیدہ چیدہ اغراض و مقاصد ہیں۔

چیدہ چیدہ فوائد

- اس سکیم میں آپ پانچ روپے ماہانہ بچاتے ہوئے مقررہ مدت میں پانچسو روپے کی کثیر امدادی رقم ایک دفعہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔
- اس کے علاوہ آپ کو وہ بونس بھی ملتا ہے جو کمپنی ہذا اپنے منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبروں کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔
- اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں ضبط نہیں ہوتا۔ خواہ آپ نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔ وہ بہر صورت وقت مقررہ پر ادا ہوتا ہے۔
- اشد مجبوری یا ناگزیر حالات میں آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ پورے کا پورا یکمشت واپس بھی کیا جا سکتا ہے۔
- بوقت ضرورت اپنے ادا کئے ہوئے روپیہ پر قرض حسنہ بھی لے سکتے ہیں۔
- اگر آپ چاہیں تو اپنے حقوق ممبری کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کر کے اس سے اپنا ادا کیا ہوا روپیہ وصول کر سکتے ہیں

ایسا طریق کار، اتنی سہولتیں اور ایسی رعایتیں آپ کو "امدادی کمیٹیوں" میں نہیں مل سکتیں۔

انتباہ: مگر یاد رکھئے کہ پانچسو روپے کی امدادی رقم وصول کرنے کے بعد اگر آپ عہد شکنی کریں، اور اپنی ماہانہ اقساط ادا کرنا بند کر دیں تو آپکے تمام حقوق ممبری مستقل طور پر ضبط ہو جائیں گے۔

تفصیل کے لئے صدر دفتر سے قواعد و ضوابط اور فارم ممبری مفت حاصل کیجئے۔

نوٹ: کراچی اور دوسرے شہروں میں ایسے محنتی، دیانتدار، تعلیم یافتہ اور بارسوخ عورتوں اور مردوں کی ضرورت ہے جو بطور کمیشن ایجنٹ باوقار تنظیم کی اس سکیم کے لئے معقول معاوضہ پر ابتدائی ممبر سازی اور گروپ آرگنائزنگ کا کام کر سکیں۔ تفصیلات صدر دفتر سے مفت حاصل کریں

صدر دفتر: باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ بالمقابل ماما پارسی گرلز ہائی اسکول، بندر روڈ۔ کراچی ۱

(فون نمبر: ۷۹۲۳)

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۱۰

فاران

جنوری ۱۹۵۷ء

ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

نقشِ اوّل

عیش و راحت کے ہجوم میں تو آدمی آخرت فراموش اور خدا سے غافل ہو سکتا ہے، مگر جو قلب حوادث و مصائب میں گھر کر بھی خدا کو یاد نہ کرے اور غفلت و سرخوشی میں مُبتلا ہے، اُس کی پستی، بدتوفیقی اور بے حسی کی بھلا کوئی حد و نہایت ہے! اس قسم کے قلبِ غافل سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ ایسی غفلت حقیقت میں بیماری نہیں بلکہ دل کی موت ہے!

مصر میں جو حوادث و مصائب پیش آئے ہیں اور جن کا چکر اب تک چل رہا ہے، اُن کا سب سے زیادہ غمناک اور اندوہ انگیز پہلو یہ ہے کہ جب مصر کے شہروں پر برطانیہ اور فرانس کے جنگی طیارے بم برسا رہے تھے، تو اسکندریہ اور قاہرہ کے کلب گھروں اور رقص خانوں میں شراب کے دَور چل رہے تھے، رقاصائیں چھما چھم ناچ رہی تھیں اور عبدالوہاب اور ام کلثوم کے نغموں پر لوگ جھوم رہے تھے! مصر کے نامہ نگاروں نے اہلِ مصر کی اس غفلت، خدا فراموشی اور اخلاقی بے حسی کو مدح و ستائش اور فخر و ناز کے انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ باتیں مصریوں کی بہادری، جرأت، بے خوفی اور خود اعتمادی کی دلیل ہیں! ـــــ توبہ! نظر کی نامسلمانی سے فریاد!

اہلِ مصر کے اخلاق و کردار کی جو ایک جھلک اُوپر پیش کی گئی ہے وہ کسی اتفاقی واقعہ یا ناگہانی حادثہ کا سبب نہیں ہے۔ قوموں کی سیرتیں ایک دن یا چند مہینوں میں مسخ نہیں ہو جایا کرتیں۔ عشرت و تفریح کی بہت سی صُبحیں طلوع اور فسق و فجور کی سینکڑوں شامیں غروب ہو لیتی ہیں، تب کہیں جاکر دل سیاہ، نگاہیں بے نور، ضمیر بے حس اور کردار خراب ہوتے ہیں!

مصر میں اس اخلاقی گراوٹ کا آغاز عورتوں کے "تبرج" سے ہوا، پہلے عورتیں بُرقع پہن کر بازاروں میں خرید و فروخت اور باغیچوں اور تماشا گاہوں میں سیر و تفریح کے لئے جانے لگیں، مرد اپنا وقت ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں گزارنے لگے۔ مرد و زن کے اس شوق و مشاغل نے گھریلو زندگی میں انتشار پیدا کیا۔ پھر عورتوں نے نقابوں کو اُٹھایا اور مردوں نے اسے گوارا کر لیا تو نقابوں کے ساتھ بُرقعے بھی رخصت ہو گئے، اور عورتوں نے ایسی ایسی وضع قطع کے جدید ترین لباسوں سے اپنے جسموں کو آراستہ کیا جو دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف متوجہ

ہیں۔ اس نوبت پر اس فتنۂ توخیز کو دبایا جا سکتا تھا۔ مگر مصری مردوں کی "قوامیت" بناتِ نیل کے غمزہ ترکانہ اور نازِ دلربایانہ کو دیکھ کر نرم پڑ گئی۔ اس کے ساتھ اسکولوں، کالجوں، دفتروں اور صنعت گاہوں میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں مردوزن کے آزادانہ اختلاط کا دور شروع ہوا اور اخلاق کی دیواریں دیمک کھائے ہوئے ستون کی طرح جلد جلد گرنے لگیں!

ایک ایک بات میں یورپ کی نقالی بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی! یورپین لیڈیوں نے آدھی پنڈلیوں کو ننگا کیا تو مصری خواتین نے ساقوں کے تین چوتھائی حصہ کو برہنہ کر دیا۔ وہاں چار انگل گریبان کھلا تو یہاں چاکِ گریبان کا قطر ایک بالشت سے بھی بڑھ گیا! یورپ کے کلب گھروں کی طرح مصر کے عشرت خانوں میں بھی قمار بازی، شراب نوشی اور نیم برہنہ رقص کے منحوس مناظر نظر آنے لگے! ان تمام اخلاقی گراوٹوں کے ساتھ اخلاق سوز افسانوں، فحش ناولوں، اور بازاری فلموں کا ایک طوفان ملک کے طول و عرض میں دوڑنے لگا، درسگاہوں میں لڑکیوں کے رقص و نغمہ کے مقابلے ہونے لگے۔ ان بے حیائی کی باتوں پر "آرٹ" کی چھاپ لگائی گئی۔ ناچنے اور ناچنے والی دوشیزاؤں کو انعام دیئے جانے لگے اور اُن کی تصویریں اخباروں میں شائع ہونے لگیں! یونیورسٹیوں سے مسلمان لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گرانقدر وظیفے ملے اور وہ تن تنہا فرانس اور لندن پہنچیں۔ اور وہاں تعلیم کے ساتھ وہ سب کچھ حاصل کیا جو ان بے اخلاق بستیوں اور معصیت زدہ ملکوں میں ہوا کرتا ہے۔

حکومت چاہتی اور حکمت و تدبیر کے ساتھ طاقت سے بھی کام لیتی تو جاہلی تہذیب کا یہ شجرِ خبیث بارور ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ "الناس علیٰ دینِ ملوکھم" ایک تجربہ کی ہوئی حقیقت ہے! قصر و ایوان کا سایہ جھونپڑیوں تک پر پڑ کر رہتا ہے! مگر مصر کے اربابِ اقتدار نے ان بے اعتدالیوں، بد اخلاقیوں اور بدکاریوں کو چیک کرنے کے بجائے، کبھی اپنے سکوت اور بے پروائی سے اور کبھی اپنے پسندیدہ رجحانات سے ان تمام بُری باتوں کی حوصلہ افزائی کی! سعد زاغلول جیسے نیشنلسٹوں اور وطن پرستوں کا امام کہا جاتا ہے، وہ مصر میں مغرب زدہ رجحانات کا نقیب تھا۔

مصر کے علماء کی اکثریت خاموش تماشائی کی طرح عفت و عصمت کی پامالی اور اخلاق و کردار کی بے آبروئی کو دیکھتی رہی۔ ان میں سے بہت سے زمانہ ساز اور مصلحت شناس تھے! بعض نے رخصتوں اور شرعی حیلوں کی آڑ لے کر اخلاقی اور دینی نقطۂ نگاہ سے کتنی ناپسندیدہ باتوں پر "اباحیت" کی مُہر لگا دی۔ بعض علماء ان بد اخلاقیوں اور معصیت کوشیوں کو دیکھ کر دل میں چبھن تو ضرور محسوس کرتے تھے مگر اس خلش کو ظاہر کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے کہ کہیں اُن کی آواز بے اثر نہ ثابت ہو اور اس طرح اُن کی شہرت اور ناموری کو دھکا نہ لگ جائے اور اُن کی جماعت اس محاذ پر شکست کھا کر فنا نہ ہو جائے، ان میں وہ علماء جو اربابِ حکومت سے ربط ضبط رکھتے تھے اور سرکار دربار میں جن کی رسائی تھی اور اس رسوخ کی بدولت جو طرح طرح کے فائدے حاصل کرتے تھے، انہوں نے اہلِ نفاق کا پارٹ ادا کیا۔ ع

باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد!

محمد شاہ رنگیلے کے بارے میں تو یار لوگوں نے تو بعض مبالغہ آمیز افسانے تراش رکھے ہیں۔ اصلی "رنگیلے شاہ" تو مصر کا معزول فرمانروا فاروق تھا۔ کس قدر مقدس نام اور کتنے گندے کرتوت! سنکھیا کا نام تریاق رکھ دیا گیا اور مزبلہ پر گنگ کدے کے نام کی تختی لگا دی گئی تھی! عیش و تفریح کے اس رسیا کے زمانہ میں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ مصر کی زمین سے سچ مچ گناہ اُگ رہے ہیں۔ اس کم بخت شاہ فاروق سے مصر کو نجات ملی تو جمال ناصر نے اخلاقی گراوٹ کی رہی سہی کسر پوری کر دی!

کوئی شک نہیں کہ اہلِ مصر کے لئے ملوکیت ایک بلا تھی۔ شاہ فاروق کا مصر سے پتا کٹا تو وہ اپنے ساتھ اس بلا کو بھی لے گیا! ایک بہت بڑے فتنہ سے مصر کو نجات ملی۔ مگر جمال ناصر کی آمریت تو ایک مستقل عذاب ہے، جس نے ملوکیت کے ظلم و ستم کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا۔

اسلامی اُخوت کے مقابلہ میں "فرعونی قومیت" کو اسی جمال ناصر نے زندہ کیا ہے۔

وادیٔ نیل کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں حسن البنا شہید کے نفسِ گرم نے دین و اخلاق کی ایک شمع روشن کی تھی اور اس کے گرد ہزاروں پروانے جمع ہو گئے تھے۔ پوری عرب دنیا میں "اخوان المسلمون" سے زیادہ فعال، مخلص اور حوصلہ مند کوئی دینی جماعت نہ تھی۔ اُن کے دم سے مصر میں اسلامی اخلاق کی روایات زندہ تھیں۔ اور شام، عراق، اردن اور حجاز تک اس دینی تحریک کے اثرات پہنچ چکے تھے۔ مگر ملوکیت دین کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔ چنانچہ ملوکیت کے کارندوں نے حسن البناء کو آخر قتل کرا ہی دیا!!

یہ اخوان ہی کی ہمت و عزیمت تھی کہ اپنے لیڈر کی شہادت کے سانحۂ عظیم کو وہ سہہ گئے اور اُن میں ذرا سی بھی ابتری اور کم ہمتی پیدا نہیں ہوئی توقع تھی کہ ملوکیت کے خاتمہ کے بعد مصر میں اقامتِ دین کی تحریک کو عروج اور ترقی حاصل ہوگی۔ مگر جمال ناصر نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ "اخوان" کو ٹھکانے لگایا! جمال ناصر کا یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایک سویز کینال کیا، تمام بحرِ روم اور پورے بحرِ قلزم پر بھی اگر مصر کو اقتدار حاصل ہو جائے تو بھی اس دینی نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی!

یہ جو عرب ممالک کے قلب میں صیہونی حکومت وجود میں آئی ہے اور پھر اسکو استقلال نصیب ہوا ہے، اُس میں مصر، شام اور اُردن کے امیروں اور پاشاؤں کی عیش پرستیوں اور اونچے طبقہ کی سرمستیوں اور نفس کی درازدستیوں کا بھی کسی نہ کسی حد تک ہاتھ ہے! یہودی عورتوں کے ساتھ ان بڑے لوگوں کے اختلاط اور ہم نشینی نے اسرائیلی حکومت کے خلاف منظم جد و جہد کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ یہود کی فاحشہ عورتوں نے صاحبِ اثر عربوں کے ساتھ رہ کر حکومتوں کے راز معلوم کئے ہیں۔ مصر کے وہ فوجی افسر جو جمال ناصر کے ہم خیال اور ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہیں۔ یہودی عورتوں کے لالچ میں اسرائیلی حکومت کے خلاف نفرت و عداوت کے وہ جذبات نہیں رکھتے جو ہم پاکستانی رکھتے ہیں!

مصر کی معاشرت اس سطح تک آ چکی ہے کہ فحاشی اور قمار و خمر کے ساتھ لحمِ خنزیر تک سے نفرت اور بیزاری کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور ان تمام برائیوں کے جراثیم عراق، شام اور شرقِ اُردن تک پہنچ چکے ہیں!

کوئی شک نہیں مصر میں اچھے لوگ بھی ہیں جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے سخت بیزار ہیں اور اس ماحول میں وہ اپنا دم سا گھٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ مگر وہ بے دست و پا ہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ لفظی احتجاج کر سکتے ہیں۔ اور جمال ناصر کے عہدِ حکومت میں تو اس پر بھی قدغن ہے! جن کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہے اُن کی اکثریت اسلامی اخلاق سے بیگانہ ہے۔ یہ اونچا طبقہ کمیونزم تک کو گوارا کر سکتا ہے کہ کمیونزم اُن کی عیش پرستیوں کو اور سہارا دیتا ہے۔ اُنھیں سب سے بڑا خطرہ اسلامی نظامِ حیات سے ہے۔ جس میں انھیں اپنے جاہ و اقتدار کے ساتھ اپنی عیش پرستیوں کی بھی موت نظر آتی ہے!

مصر کے بارے میں یہ تفصیل ہم نے بڑی اذیت کے ساتھ پیش کی ہے۔ اپنے بھائی بندوں پر تنقید اور عیب چینی کسی شریف آدمی کا پسندیدہ مشغلہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اہلِ مصر ہمارے دینی بھائی ہیں۔ اُن کی اخلاقی پستی ہو یا سیاسی ابتری، ان کا ہر زیاں خود ہمارا اپنا زیاں ہے کہ ہم ایک ہی ملت کے فرد اور ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ کوئی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے اس لئے ہم صاف طور پر یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مصر کے ایک فاسق و فاجر مسلمان کو ہم یہودی قسیس اور عیسائی راہب پر بہرحال ترجیح دیتے ہیں۔ غیروں کے مقابلہ میں مصری مسلمان ہمیں ہر وقت اپنا ہمدرد، دمساز اور دست و بازو پائیں گے!

یہ پاکستان ہے!

مصر کے حالات کی تفصیل کو تو اس مقالہ کی تمہید سمجھئے۔ دکھانا یہ ہے کہ خود پاکستان کا معاشرہ ابھی

وط پر گامزن ہے، جن خطوط پر مصر کی سوسائٹی محوِ خرام ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے مصر کی جو اخلاقی حالت تھی، پاکستان کی
ریب قریب آج وہی حالت ہے!

اخلاق کے بند دھیرے دھیرے ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں اور جب ایک برائی کو لوگ گوارا کر لیتے ہیں اور اس پر کوئی احتجاج
یں ہوتا تو پھر دوسری برائی کی طرف بے محابا قدم بڑھتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا رخ اسلامی اخلاق کی مخالف سمت میں ہے۔
قافلہ ادھر جا رہا ہے، جہاں دور سے اسکندریہ اور قاہرہ کے کلب گھروں کی منڈیریں اور لندن و فرانس کے رقص خانوں کی برجیاں
ظر آ رہی ہیں!

شام کے وقت مسجدوں کو دیکھئے اور پھر سینما ہالوں، کلب گھروں اور ہوٹلوں کا جا کر جائزہ لیجئے۔ نمازیوں اور بے نمازیوں کے
اسب کا اندازہ ہو جائے گا۔ مسلمان اور بے نمازی! قرنِ اولیٰ کے مسلمان اس تضاد بلکہ نفاق کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔!
گر پاکستان میں اس تضاد کا مشاہدہ عام ہے! عورتوں کی بے نقابی، آزادانہ بے حجابی کی حد تک تیزی کے ساتھ پہنچ رہی ہے۔
د و زن کا بے باکانہ اختلاط بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اونچے طبقہ کی بیگمات میں شراب نوشی تک شروع ہو چکی ہے!
ریب زدگی اور آزادی شریف گھرانوں تک میں بار پا رہی ہے۔ اور غیرت و حیا جن خانوادوں کا سب سے بڑا شرف تھا، ان میں
ذیبِ حاضر کے ہر تقاضے کی پذیرائی کے لئے راہیں نکلتی آتی ہیں!

جوا ہے، سٹہ ہے، رشوت ہے، رقص و اداکاری ہے، لین دین میں خیانت اور ہیرا پھیری ہے۔ بدمعاملگی اور
ل سازی ہے، ہر شخص کو اپنی دنیا بنانے کی فکر! آخرت کا تصور دھندلا پڑتا جا رہا ہے۔ اور خشیتِ الٰہی سے دل
لی ہو رہے ہیں!

پاکستانی مسلمانوں کے زاویۂ فکر و نگاہ کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ سیاسی انقلاب کے بعد کرسیاں بدلتی ہیں تو اس طرف
ہت ہی کم لوگوں کا دھیان جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کے عہدوں اور منصبوں کے لئے جس دینی کردار کی ضرورت ہے، وہ کرسی نشین
ذات و شخصیت میں پایا جاتا ہے یا نہیں! حکومت کے بجٹ پر، پلاننگ بورڈ کی تجویزوں پر، خارجہ پالیسی اور تجارتی پالیسی
ہمارے اخبارات کس جرأت کے ساتھ تنقید کرتے ہیں۔ مگر بڑے آدمیوں کے شبستانوں اور عیش گاہوں پر نقد و احتساب
کسی کو ہمت نہیں ہوتی!

پاکستان کے "بڑے لوگ" ایسے اسلام کو چاہتے ہیں جو عیدگاہ میں ان کی نماز کے لئے نشستیں محفوظ کرا دے۔ سیرۃ النبی
ے کسی جلسہ میں ان سے پیام بھجوا دے، باہر کے آئے ہوئے مہمانوں سے قائدِ اعظم کی قبر پر پھول چڑھوا دے۔ اور جب قرآن
ی تلاوت ہو رہی ہو یا قومی ترانہ بج رہا ہو تو لوگ کھڑے ہو جائیں۔ وہ ایسے اسلام کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔
کے دائرۂ عمل میں زانیوں اور شرابیوں پر حد جاری ہوتی ہو۔ جہاں ایک بدوی امیر المومنین کا گریبان تھام کر ان سے
ناحق طلب کر سکے۔ اور جہاں کتاب و سنت کے احکام کے سامنے بڑے سے بڑے آدمی کی مرضی، رجحان اور ذوق کو
پر انداختہ ہونا پڑے!

کوئی شک نہیں کہ ہماری اخلاقی حالت بہت ابتر ہے۔ مگر ابھی پانی سر سے اونچا نہیں ہوا، مرض شدید ضرور ہے، لیکن
علاج نہیں ہے، متاعِ کارواں مانا کہ دھڑا دھڑ لٹ رہی ہے۔ مگر شکر ہے کہ احساسِ زیاں باقی ہے! ابھی اس طوفان
ی روک تھام ممکن ہے!

پاکستان کا معاشرہ اخلاق و نیکوکاری کی بنیادوں پر اُس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک حکومت کے تمام وسائل کو کام میں نہ لایا جائے اور اس کے لئے خود حکومت میں انقلاب کی ضرورت ہے! یہ انقلاب دو راہوں سے آسکتا ہے۔ ایک طاقت کے زور سے، دوسرے آئینی جدوجہد کے ذریعہ! کمیونسٹوں کے انداز پر طاقت کے زور سے پاکستان میں انقلاب لانا کسی طرح مناسب نہیں! یہ بند اگر ایک بار ٹوٹ گیا تو پھر یہ طوفان تھمے گا نہیں! یہاں پاکستان میں آئینی جدوجہد ہی کے ذریعہ انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ مانا کہ یہ بہت پھیر اور دور دراز کا راستہ ہے مگر سلامتی کا راستہ ہے۔ نو سال کی آئینی جدوجہد بیکار نہیں گئی۔ پاکستان کے دستور میں اسلام اور جمہوریت کی جتنی جھلک بھی پائی جاتی ہے یہ سب قوم کی آئینی جدوجہد کا طفیل ہے!

انقلابِ حکومت کے لئے آئینی جدوجہد پوری ہوشمندی اور فراست کے ساتھ جاری رہنی چاہیئے، مگر اس انقلاب کے انتظار میں اصلاحِ معاشرہ کے کام کو ملتوی تو نہیں کیا جا سکتا! آئینی انقلاب کی کوششیں بار آور تو ضرور ہو کر رہیں گی مگر اس کام میں بڑی سے بڑی مدت بھی صرف ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ مرتے دم تک کرسیوں سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ آسانی سے کرسیاں چھوڑ تھوڑی دیں گے، انتخاب کو جہاں تک ممکن ہو سکے گا ٹالا جائے گا، اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لئے نئی نئی سیاسی پارٹیاں بنوائی جائیں گی۔ اور پرانی پارٹیوں کے ارکان میں اختلاف پیدا کرایا جائے گا۔ قوم کے کسی مطالبہ کی شدت کا رُخ پھیرنے کے لئے کوئی اسٹنٹ (stunt) کھڑا کیا جائے گا، اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوگا کہ سویز کینال کے مسئلہ کی طرح کوئی بین الاقوامی قضیہ چھڑ جائے گا۔ جس کے سامنے کچھ دنوں کے لئے عوام کی جدوجہد دب جائے گی اور ذہن اس قضیہ میں الجھ جائیں گے۔

اصلاحِ معاشرہ کے کام کے لئے ....

..... تا ایں نشود، آں نشود!

کی شرط فرض سے گریز کی دلیل ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی کوششیں ہوتی رہنی چاہئیں۔ قوم میں اللہ کے فضل سے احساسِ غیرت موجود ہے، یہ مٹی بڑی زرخیز ہے، بس ذرا نم ہونے کی دیر ہے۔ زمانہ کی ناسازگاری سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ اس راہ کا ہر زخم آخرت کی کامیابی کے لئے ایک مستقل بشارت ہے!

اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر معاشرے کا مکمل انقلاب ہی یقیناً مقصود ہے۔ لیکن ہم بہت کچھ سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مکمل انقلاب کو ذہن میں رکھ کر کسی ایک متعین "منکر" کو بدلنے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ یہ جدوجہد بظاہر تو ایک بُرائی کے خلاف ہوگی۔ لیکن اس کی زد پورے نظامِ جاہلیت پر جا کر پڑے گی۔ مثلاً شراب کی بندش کے ساتھ صرف شراب ہی بند نہ ہوگی بلکہ شراب خواری کے ساتھ جو دوسری برائیاں الجھی ہوئی ہیں، ان کا زور بھی ٹوٹ جائے گا!

"معروف" کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ "منکرات" پر احتساب و قدغن بھی ضروری ہے۔ اس مریض کی حالت کے اور زیادہ بگڑ جانے کا خطرہ ہے، جسے دوا تو باقاعدگی کے ساتھ پلائی جاتی رہے مگر پرہیز کے معاملہ میں اسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جو چاہے کھائے پیئے اور اس کو اس بات کا احساس تک نہ ہو کہ کھانے پینے کی فلاں فلاں چیزیں اس کی صحت کے لئے مُضر ہیں۔ اور دوا کے ساتھ پرہیز بھی لازمی ہے۔ پرہیز کا معاملہ اس نوبت تک بھی پہنچ جاتا ہے کہ ضدی مریض کے ہاتھ سے وہ چیز چھین بھی لی جاتی ہے جس سے اُسے پرہیز کرنا چاہیئے۔ مریض پر اس قسم کی پابندی لگا دینے کو کوئی صاحبِ عقل "ظلم" نہیں کہہ سکتا اور

نہ یہ قدغن و احتساب اُس کے انسانی حقوق سے کوئی چیز چھینتی ہے!

پاکستان کے معاشرے کی آج یہی حالت ہے! قوم کی قوم اخلاقی مریض ہے۔ بُرائیاں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ اور بدی نے متعدی مرض کی صورت اختیار کرلی ہے۔ کسی محلہ میں ایک گھرانا بگڑتا ہے تو اُسے دیکھ کر آس پاس کے نہ جانے کتنے گھر خرابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں! بے حجاب عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ہی پردہ نشین عورتوں نے پردہ کو خیرباد کہا ہے۔ اور کلب گھروں اور ہوٹلوں میں شراب خواروں کی صحبت میں بیٹھ کر ہی اُن لوگوں نے شراب پینی سیکھی ہے۔ جو شراب کا نام سُن کر شدید نفرت و بیزاری اور اذیت محسوس کرتے تھے!

پاکستان کا اُونچا طبقہ یقیناً ان بُرائیوں کا بہت کچھ ذمہ دار ہے، ان کے طور طریق اور چال چلن کو دیکھ کر نچلے طبقہ نے اُن کی ریس کی ہے اور اُن کی نقل اُتاری ہے! مگر معاشرے کی خرابیوں کے ذمہ دار خود عوام بھی ہیں۔ سارے کا سارا الزام اُونچے طبقہ پر ہی نہیں ڈالا جاسکتا، سینما ہاؤسوں اور تھیٹر ہالوں میں عوام کو کیا پولیس کے سپاہی گھیر کر اور پکڑ کر لے جاتے ہیں؟ مردوزن کے اختلاط پر عوام کو کسی قانون کے ذریعہ مجبور نہیں کیا جاتا۔ ان تمام بُرائیوں، بے اعتدالیوں اور لغویتوں میں عوام خود اپنے شوق سے مُبتلا ہوئے ہیں۔ اور اُن کی عقلیں اتنی اوندھی ہوگئی ہیں کہ وہ ریلوں میں، لبوں میں، شادیوں اور سیرگاہوں میں دُوسروں کی بے پردہ عورتوں کو دیکھ کر تو خوب نظارہ کا لطف اُٹھاتے ہیں، مگر اپنی عورتوں کے بارے میں وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ دوسرے مرد اُن کی عورتوں کی بے حجابی سے بھی اسی طرح آنکھوں کو سینکتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں!

جب معاشرے کی حالت اتنی پست ہو جائے کہ مسجدوں کی دیواروں پر "اپنے جُوتے حفاظت سے رکھیئے" کی تختیاں لگی ہوئی ہوں اور ایک نمازی کو نماز پڑھتے میں اپنے جُوتوں کی حفاظت کا خیال بھی رہ رہ کر ستاتا ہو۔ تو ایسے معاشرے کو کیا انقلابِ حکومت کے انتظار میں آزاد چھوڑا جاسکتا ہے؟

مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ملوکیت کا خاتمہ، مصر کی سیاست کا کتنا بڑا انقلاب تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ساری بُرائیوں کا سرچشمہ صرف ملوکیت ہے! مگر اس انقلاب کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکلا کہ مصر کے خاندانی بادشاہ کی جگہ چند فوجی افسر تختِ حکومت پر متمکن ہوگئے۔ معاشرہ، ماحول، گردوپیش اور احوال و کوائف وہی رہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہوگئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ معاشرہ بگڑا ہوا تھا، اور ملوکیت کو بگڑے ہوئے معاشرے کے اُن افراد نے ختم کیا جو اخلاقی بگاڑ میں عوام سے اور آگے تھے۔ مصر کی حکومت میں بیشک انقلاب آیا مگر وہاں کی سوسائٹی جوں کی توں رہی بلکہ اور زیادہ بگڑ گئی۔

پاکستان میں معاشرے کی اصلاح میں کامیابی کے روشن امکانات اس وجہ سے ہیں کہ یہاں بُرائیوں کی جڑیں ابھی زمین کے اُوپر ہی اُوپر ہیں۔ جو معمولی سے جھٹکے سے اُکھڑ سکتی ہیں۔ ہم جیسے عوام تمام اخلاقی خرابیوں کے باوجود بُرائیوں کو پھیلتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور جی یہی چاہتا ہے۔ کہ ؎

اُٹھے اور اُٹھ کے پھر سے رُخِ زندگی بدل دے کوئی اک جواں مجاہد کوئی ایک مردِ غازی!

پاکستان میں بُرائی ابھی "محبوب" نہیں ہی، "مبغوض" ہی سمجھی جاتی ہے لیکن یہاں کی سوسائٹی پر اسی طرح کچھ مُدّت اور گزر گئی تو پھر خیر و شر کا یہ امتیاز بھی جاتا رہیگا اور اچھائی اور بُرائی کی یہ پہچان ہی مٹ جائے گی اور اخلاقی بگاڑ پر عوام شرمانے کے بجائے، اُلٹا فخر کریں گے۔ یہ وہ بدترین حالت ہوگی، جب معاشرے کی اصلاح کے لئے کوہکنی کرنی پڑے گی اور مُصلحین کو ایسا محسوس ہوگا جیسے پاکستان کے درودیوار تک اُن کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور یہاں کا ایک ایک فرد اُن کی دُشمنی اور مخالفت پر تُلا ہوا ہے!

ابھی اللہ کے فضل سے یہاں کے معاشرے کی یہ حالت ہے کہ کوئی اصلاح و درستی کے لئے آواز اُٹھاتا ہے تو اُسے اپنے ہم نوا اور مددگار بھی مل جاتے ہیں۔ لوگ حق بات کو سُن بھی لیتے ہیں اور پند و نصیحت کی تلخی کو عوام گوارا بھی کر لیتے ہیں! دل سخت تو بیشک ہو گئے ہیں مگر بالکل پتھر نہیں ہوئے، آنکھوں پر پردے تو پڑ گئے ہیں مگر پُتلیاں بے نور نہیں ہوئیں۔ زمین کی اوپر کی تہ بے شک شور ہو گئی ہے لیکن اس کی تہ کو کوئی اُلٹ پلٹ کر دے تو پھر روئیدگی کی قوتوں کی کوئی کمی نہیں!

اور پھر یہ روش تو سیاست بازوں کو زیب دیتی ہے کہ وہ حالات کا جائزہ لے کر اور یہ دیکھ کر کہ انھیں کامیابی ہوگی کہ نہیں، کسی انقلاب کے لئے قدم اُٹھاتے ہیں۔ داعیانِ حق اس سطح سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ ایسے اندیشے اُن کے پاس بھی نہیں پھٹکنے پاتے اُن کو اگر نو سو سال کی عمر بھی قسمت سے مل جائے تو وہ ساری عمر دعوتِ حق اور کوششِ اصلاح ہی میں صرف کر سکتے ہیں۔ چاہے ایک آدمی بھی اُن کو ہم نوائی کے لئے میسر نہ آئے، انھیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہوتا کہ اگر اُن کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو اُن کی شخصیت کو صدمہ پہنچے گا۔ اللہ کے راستہ میں جو کوئی نکلتا ہے تو اُس کے سامنے اُس کی اپنی شخصیت اور وجاہت نہیں ہوتی۔ اگر ان بُتوں کو ساتھ لے کر کوئی اللہ کے راستہ میں گامزن ہوتا ہے تو وہ پہلے قدم ہی پر اپنے مقصد سے بغاوت کرتا ہے۔ یہ اللہ کا راستہ کہاں ہوا، یہ تو اپنی شخصیت کا راستہ ہے! اللہ تعالیٰ کا راستہ وہ ہے جس کے مسافر کے پیشِ نظر ہر قدم پر اللہ کی رضا اور خوشنودی رہے! بس پھر کامیابی ہی کامیابی ہے! اگر شہر کے اوباش اُسے گلیوں میں گھسیٹتے ہوئے بھی پھریں اور ہر طرف سے اُس پر پتھروں کی بارش ہو رہی ہو تو بھی وہ کامیاب ہے!

بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
زما پیام رسانید ہر کجا ہستند

اور جن تک ہمارا یہ پیام پہنچ جائے وہ ہماری گزارشوں پر غور فرمانے کی زحمت گوارا کریں۔ اگر اُن کا ضمیر مطمئن ہو جائے تو پھر جو کوئی انفرادی اور اجتماعی طور پر جو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اُس سے دریغ نہ کرے۔ فرصت بہت کم ہے، کام بہت ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ اجل ہر وقت گھات میں ہے۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک سانس کی غفلت و سرشاری بھی ایک صدی کی غفلت سے کہیں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی!

اخلاص کیساتھ جد و جہد، رضائے الٰہی مقصود

فتح و نصرت اور فلاح و کامیابی اسی میں پوشیدہ ہے!

ماہر القادری

۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء

علامہ سید قطب (مصر) ترجمہ:- مظفر احسن (مدرسۃ الاصلاح سرائے میر)

پوری انسانیت ہماری محتاج ہے

آج زمین کا کوئی ایک خطہ نہیں، بلکہ پوری انسانیت دعوتِ اسلام کی شدید محتاج ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بحر اٹلانٹک کے سواحل سے، بحرِ ہند اور بحر پیسفک تک نیز یورپ وافریقہ اور ایشیا کے وسط تک پھیلا ہوا عالمِ اسلام سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسلام کا حاجتمند ہے۔ اور اس کے بغیر اس کی کوئی مستقل تہذیب ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دورِ رنج ومحن میں درحقیقت دنیا اسلام کے مقابلہ میں پوری انسانیت عام طریقہ سے ہدایتِ اسلام کی کچھ کم حاجتمند نہیں!

خواہ انسانیت اس حقیقت کا سچا احساس اور زندہ شعور رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ اس سے اس واضح حقیقت پر حرف نہیں آسکتا اور نہ اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار کی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مریض کی نفس احتیاجِ تشخیص وعلاج مریض کے اس ضرورت کے شعور اور احساس پر ہرگز نہیں موقوف ہوتی۔ بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ مریض قصداً دوا کا استعمال ترک کر دیتا ہے، طبیب اور ڈاکٹر سے بدکتا اور نفرت کرتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات نہایت بلند بانگی سے اپنی صحت اور توانائی کے دعوے تک کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کو طبیب اور دوا کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اتنی شدید کہ ذرا سی بے اعتنائی سے وہ لقمۂ اجل بن سکتا ہے۔ جے، ایچ، ڈینسون اپنی کتاب "Emotions as The basis of civilisation" میں زمانہ قبل از بعثت نبویؐ کے احوال وشئون پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:-

> "پس پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں متمدن دنیا انتشار اور فوضویت کے بوسیدہ کگر پر کھڑی تھی۔ کیونکہ عقاید جو حضارت وتمدن کے قصر کی تعمیر میں گارے اور پتھر کا کام دے رہے تھے، متزلزل ہو چکے تھے اور ان کا بدل کوئی ایسی شے نہ تھی جس کا کچھ اعتبار ہوتا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ حضارت وتمدن کے جس عظیم باغ کو انسان نے پورے چار ہزار سالوں میں اپنے خونِ جگر سے سینچکر تیار کیا تھا وہ اب جلد ہی خس وخاشاک میں تبدیل ہو جائے گا۔ تہذیب وتمدن کے سلئے اصول وضوابط تحلیل ہو کر ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر دوبارہ بشریت اپنی قدیم وحشت وبربریت، بدویت وبہیمیت کے دور میں داخل ہو جائے گی۔ کیونکہ پوری انسانیت آپس میں دست وگریباں تھی۔ قومیں قوموں سے ٹکرا رہی تھیں۔ قبائل قبائل سے سرگرم پیکار تھے۔ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ اور اس طرح پوری سطحِ ارضی کشت وخون انسانیت سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ اور پوری دنیا جنگ وجدل کی ہر آن دہکنے والی ایک بھٹی بن چکی تھی۔ ہر طرف تشتت اور تراج کا دور دورہ تھا۔ نہ کوئی جاندار قانون تھا اور نہ ہی کوئی زندہ نظام!
>
> مسیحیت نے جو مختلف اور متضاد نظام بنا رکھے تھے وہ بجائے اس کے کہ انسانوں کو متحد اور

منظم کرتے، مزید تفرقے اور انتشار کو جنم دے رہے تھے اور مجموعی طور پر پوری مدنیت کا حال اس تناور اور موٹے درخت کا سا تھا جس کی شاخیں تمام اقصائے عالم میں پھیل چکی ہوں۔ اور اس سے زمین کا تقریباً ہر حصہ سایہ حاصل کر رہا ہو۔ لیکن وہ اس طرح جھک رہا ہو کہ اب گرا چاہتا ہے اب گرا چاہتا ہے، اُس کا اندرونی گودا تک خشک ہو رہا ہو۔ فساد او بگاڑ کے انہی احوال و مظاہر کے دوران میں وہ عظیم انسان پیدا ہوا جس نے سارے عالم کو ایک لڑی میں پرو دیا۔"

اگرچہ انسانیت کے فساد اور بگاڑ کے اسباب آج کچھ دوسرے اور مختلف ہوں۔ لیکن مجموعی طور پر آج اس کا حال زمانہ سابق سے کچھ اچھا نہیں۔ آج ہر جگہ اور ہر خطۂ زمین حیرانی و قلق اور اضطراب و انتشار کا انسانی ضمیر پر پورا تسلّط ہے۔ اُن ممالک میں بھی جن کے باشندے کسی آسمانی دین پر اعتقاد رکھتے ہوں اور اُن میں بھی جن کے باشندوں کی گردنوں میں وطنیت نے اپنے پنجے گڑوئے ہوئے ہیں۔ دُنیا کے بازار میں تمام سستی اور گراں اجناس تو فراہم ہو سکتی ہیں۔ مگر جو جنس شاید قطعاً نایاب اور مفقود ہے وہ جنس "یقین" ہے۔ کسی چیز پر انسانوں کو ایسا یقین حاصل نہیں کہ جس کے سایہ میں وہ راحت، قرار، اطمینان اور سکون کی دولت گرانمایہ سے بہرہ ور ہو سکیں۔ آج کا ضمیر کسی عقیدہ، کسی اصول اور کسی وضع و نظام پر مطمئن نہیں۔ یورپ و امریکہ نے اپنے تمام اصول و مقدمات سولھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں ناکارہ سمجھ کر پس پشت ڈال دیئے تھے۔ اور اپنے خود ساختہ معبود "علم" پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ جدید مغربی اِلٰہ اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں کے دوران اپنے تقدس اور ترفع کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ عموماً لوگ اس خام خیالی کا شکار رہتے کہ اس معبود کے پاس ایسے اٹل قوانین اور قواعد ہیں کہ باطل کسی جہت سے بھی ان میں سرایت کرنے کی گنجائش نہیں پا سکتا۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی شروع ہونے کے بعد اپنی پانچ دہائیاں بھی پُوری نہ کر پائی تھی کہ اس ڈانواں ڈول اِلٰہ کا جو کبھی بھی ایک حال پر جم کر نہیں ٹھہرتا تختہ الٹ گیا!

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اس کے قواعد و اصول ردّ اور معطل کر دینے کے لائق ہیں۔ نیز یہ کہ یہ خدا خود ہی اپنے خود ساختہ اصولوں کو اپنے ہاتھوں باطل کرتا جا رہا ہے۔ بلکہ خود اس کی ذات ہی اپنے تصورات، وسائل اور مقائیس کے درمیان گم اور ضائع ہوتی نظر آ رہی ہے، اس لئے کہ اس کے کیسۂ فکر میں کوئی ایسا مستقل نظریہ اور مقیاس نہیں ہے جس کی طرف وہ ضرورت کے وقت رجوع کر سکے!

یہ جدید اِلٰہ مادّہ کے ایک خاص تصور اور اس کی ایک خاص تعبیر کی بناء پر وجود پذیر ہوا تھا اور جنم لیتے ہی صاف اعلان کر دیا تھا کہ مادّہ کے علاوہ جو کچھ ہے نرا وہم ہی وہم ہے۔ جس کے بارے میں بحث و نظر اور غور و خوض کرنے کی ذلت ہز میجسٹی کبھی بھی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن دفعتاً وہ اس کے بعد کہ اپنی قبر آپ تیار کر چکا تھا، اس نتیجہ پر پہنچا کہ خود مادّہ جیسا کہ اُس نے گمان کر رکھا تھا ایسی چیز ہے جس کا کوئی وجود نہیں اور اس کی کسی تعریف نو کے لئے وہ ایک صبر آزما مشقت کا محتاج ہے۔ اور یہیں سے یہ اِلٰہ خود اپنی مخلوقات کے درمیان حیران اور سرگرداں سر مارتا پھر رہا ہے۔ ان مخلوقات کے درمیان جو خود اس کے تصورات اور فروع کی تکذیب کر رہی ہیں۔ شاعرِ مشرق نے کتنا درست فرمایا ہے ؎

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں خود آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

چنانچہ انسانیت اس کے بعد سے اُس جدید اِلٰہ سے متعلق اپنے اطمینان اور یقین و اذعان کو کھو بیٹھی ہے جسے خود اپنی ذات

تصورات و وسائل اور مقائیس پر ایمان باقی نہیں رہا۔

انسانیت نے اپنے قدیم عقائد دینیہ کی جکڑ بندیوں سے نکل بھاگ کر کچھ جدید عبادات اختیار کر لی تھیں۔ مثلاً امریکہ نے ے مقدسات کو جن میں انسانیت اپنی پوری تاریخ میں معلوم و محسوس کر سکتی تھی۔ پس پشت ڈال کر اپنے لئے تین نئے معبود ئے ہیں۔ (۱) انتاج (۲) مال (۳) لذت۔ اور دوسری طرف روس نے اللہ واحد کا انکار کر کے دوسرے تین معبود گھڑ رکھے (۱) مادہ (۲) اقتصاد (۳) کارل مارکس۔ لیکن اب رفتہ رفتہ انسانیت پر یہ حقیقت آشکارا ہونے لگی ہے کہ یہ اور وہ قسم کے اِلٰہ پورے عالم کو صرف مہیب اور ہولناک جنگوں مبغوض استعمار اور ایسی حیوانیت و بہیمیت کی طرف ڈھکیل رہے ہیں بشریت اولیٰ کے پست مدارج تک پہنچا چاہتی ہے۔ نفسانیت کی یہ گرہیں، یہ عصبی امراض اور یہ انفرادی عائلی اجتماعی ونی اضطرابات یہ سب وہ برکات ہیں جن سے یہ نادہند معبود اپنے کٹر اور متشدد پجاریوں کو نوازتا رہتا ہے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ لوگ سوویٹ روس کی سرخ جنت میں آہنی پردوں کے پرے کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ اور قعی لوگ ایسے ہی مسرت و خوشی کے ساتھ زندگی کے مراحل طے کر رہے ہیں جیسے کہ اشتراکی پروپیگنڈسٹ دعویٰ کرتے ہیں ں آہنی پردے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ روسی حکومت ہر اس شخص کو خوش آمدید کہتی جو روس کی خوش حالیوں کو دیکھنے کے لئے اس کی ن کی تمنا کرتا اور روس کی پبلک کو اس بات کی عام اجازت ہوتی کہ عالم کے دوسرے نظاموں کا مطالعہ اور مشاہدہ کر سکتی۔ تا لیکہ حکومتِ روس کو پورا اطمینان ہوتا کہ روس کی پبلک ہر حال میں اشتراکی نظام ہی کو ترجیح دے گی اور دوسرے نظام ہائے ت کو ناقص قرار دے کر ان سے اعلان بیزاری کے ساتھ ان کی شدید مذمت کرے گی اور اس طرح اشتراکیت پر اس کا ایمان ختہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لوگ امریکہ میں کس طرح جی رہے ہیں جو بھاری پیداواروں، عظیم ثروتوں اور ں اور آسائشوں کا دیس ہے۔ میں نے بچشم خود ان کے احوالِ زندگی دیکھے ہیں۔ اعصابی اضطراب اور جنسی ہوس تمام مظاہر ثروت ت اور وسائلِ راحت کے علی الرغم ان کی زندگی کو کھائے جا رہی ہے، لے دے کے ان کی پوری متاعِ اعصابی ہیجان اور نی نشاط ہے۔ دیکھنے پر آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ لوگ ہمیشہ اور ہر آن ایسے سایوں سے بھاگ رہے ہیں جو مسلسل ان کا کئے رہتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ وہ مشین کے پرزے ہیں جو ایسے جنون و سرعت اور ہیجان و اضطراب کے عالم میں حرکت کرتے ہ پل بھر کے لئے بھی ان کو قرار نہیں۔ اور بسا اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہاں کے لوگ ایک مسلسل چکر کرنے والی یں پس رہے ہیں جو شب و روز میں کبھی نہیں ٹھہرتی۔ وہ چکی ان سے عبارت ہے اور یہ اس سے!

ان کو تھوڑی دیر کے لئے بھی سکون و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ نہ تو اپنے تئیں اطمینان محسوس کرتے ہیں اور نہ اپنے گرد و پیش کی زندگی ں ان کو اعتماد و اطمینان ہوتا ہے۔ اور اگر ان کے اندر اتنی صلاحیت ابھی باقی بھی ہو کہ اپنے ماحول کا وہ کچھ احساس بھی رکھتے ہیں را ٹھہر کر غور کرنے کی ان کو کچھ مہلت ہی نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ نفسِ حیات کے شعور اور اس کے احساس کی بھی فرصت ان کو میسر یں۔ اور یہ چکی ہر آن گردش کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے آرام کے اوقات میں بھی اور ان اوقات میں بھی جبکہ وہ گاہوں اور پارکوں، تالابوں اور ندیوں کے کنارے تفریحیں اور ورزشیں کر رہے ہوتے ہیں۔ تم ان کو دیکھ کر ایسا محسوس کروگے ہ کسی کام میں مشغول ہیں۔ بالکل کسی ایسے ہی سخت اور سنجیدہ کام میں جیسے کہ وہ کام کے اوقات میں کیا کرتے ہیں۔ بس صرف م اور نوعیت کا ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال ان کو کسی وقت بھی سکون، راحت اور تامل و اطمینان کی مہلت یں ملتی!!

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت زیادہ کماتے ہیں۔ لیکن یہ انتاج اور یہ کسب کس لئے ہوتا ہے۔ محض کسب برائے کسب اور انتاج برائے انتاج! عنصر انسانی کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ اس کسب و انتاج پر غور کرو اپنے فکر و احساس کی انتہائی گہرائیوں اور قلب کی پوری بیداری اور شعور کے ساتھ سوچو تو تم اس حقیقت کو آسانی سے سمجھ اور محسوس کر سکتے ہو مگر شرط حسِ انسانی ہے جو حسِ آلہ سے بالکل مختلف شے ہے ورنہ تم کو یہ چیزیں کسی چہرہ کے ایکسپریشنز (expressions) میں لکھی ہوئی یا کسی زبان سے ادا ہوتی کبھی نظر نہ آئیں گی۔ بس ایک چکی ہے جو دن رات چلتی رہتی ہے۔ پیستی ہے، پلسے ہوئے کو منتشر کرتی ہے، پھر اس کو از سرِ نو پیسنے کے لئے اکٹھا کرتی ہے آدمی۔ اشیاء اور زمان و مکان سب کے سب اسی ہر آن چکر کرنے والی چکی میں چکر کرتے اور پستے رہتے ہیں جو نہ کبھی تھکتی ہے اور نہ رکتی ہے!

ہر سُو اور ہر آن ایک گردش ہے کبھی نہ ختم ہونے والی گردش!!

قلب کا سکون، نفس کا اطمینان، ضمیر کی راحت، جہد و انتاج کے ثمرات سے حاصل ہونے والی جیتی جاگتی مسرت اور فرحت کی لذت و لطف، لوگوں کی باہم شیریں اور میٹھی مجلسیں۔ دوستوں کے مابین روحانی اور قلبی یگانگت اور مطابقت۔ خاندان و قبیلہ کے مضبوط رشتوں سے پیدا شدہ ہمدم و افکار۔ یہ وہ اسباب و محرکات ہیں جن کی بناء پر فرد کو ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ وہ تنہا اور اکیلا ہے۔ وہ سخت سے سخت جد و جہد، تکان اور صعوبت جھیلنے کے بعد اعتماد، اطمینان، سکون کی مٹھاس اور راحت و قرار کی شیرینی محسوس کرتا ہے!!

حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ اور یقین اپنی توانائیوں اور قوت و طاقت میں خارجی طاقتوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ عقیدہ ہی ہے جو فرد کو یہ حقیقت محسوس کراتا ہے کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات میں کوئی بے حقیقت اور بے بساط ذرہ نہیں ہے لیکن افسوس! کہ امریکی زندگی کے قاموس اور اس کے ماحول میں ان ساری چیزوں کا کوئی وجود نہیں!!

ہر سمت ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ جی ایک خلا سا! زندگی کے پھیلے ہوئے انواع و اقسام کے مشاغل اس کی ساری ہماہمی اور تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے باوجود! وہاں ہر طرف بہت زیادہ چہل پہل رہتی ہے اور نہ جاننے والے اسے سعادت اور خوشحالی تصور کریں گے۔ یہ نقرئی قہقہے جو ہر آن فضا میں کھنکتے رہتے ہیں اور فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ کلیلیں جو غزالان امریکی ہر طرف کرتے پھرتے ہیں۔ یہ نرم گرم بوسے جن کا سلسلہ طرفین کی طرف سے کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ یہ لذت اور حظ نفس حاصل کرنے پر مخاصمے اور مقابلے۔ یہ کھنکتے ہوئے جامہائے رنگین جو ہر آن لبالب ہوتے ہیں۔ یہ ہر وقت برپا رہنے والا شور و شغب۔ لیکن یہ درحقیقت ایک خالص حیوانی نشاط ہوا نہ کہ سعادت و فرحت۔ بدمستوں کی بے راہ روی اور بدکاری سعادت کبھی نہیں کہی جا سکتی۔ ایسے خالص حیوانی فرح کو فرح کبھی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بس ایک کمر توڑ کام ہے ہر آن انسانی وجود جُتا رہتا ہے اور آلات اور مشینی اوزار کی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہر طرف مشاغلِ حیات جاری ہیں!

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کہاں ہے؟ ان سارے گلّہ ہائے گوسفند و بُز میں وہ انسان کہاں ہے جو آلہ اور حیوان سے بالکل ایک الگ تھلگ شے ہے؟ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اس مادّی فلسفہ کے تحت روس میں لوگ اس سے بھی ابتر زندگی گزارتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ دولت و خوشحالی اور مطلق آزادی و اباحت پسندی کے بطن سے جنم لینے والا خالص حیوانی فرح و نشاط بھی روس میں امریکہ جیسا میسر نہ ہو گا!

غرضکہ آج پوری انسانیت اسی گہرے قعرِ مذلت میں پڑی ہوئی ہے۔ مشرق و مغرب ہر جہت میں اور ہر سمت میں آج بھی

اسی طرح اس کی تخریب و تذلیل کی جا رہی ہے۔ جس طرح نبی اکرم کی بعثت سے قبل ہو رہی تھی۔ پس لاریب آج پوری انسانیت ہماری محتاج ہے۔ کیونکہ آج اس کو ضمیر کے لئے ایک عقیدہ درکار ہے۔ ایسا عقیدہ جس کی چھاؤں میں دوپہر کی اس بادِ سموم سے بچ سکے جو اس کو ہر آن جھلسائے دے رہی ہے اور اس کی دھونس اور کشا کشوں میں اس عام قلق و اضطراب سے بھاگ کر پناہ لے سکے۔ اور جس کی نرم و نازک گود میں اس کو قرار اور سکون میسر آ سکے!

آدم کو ثبات کی طلب ہے، دستورِ حیات کی طلب ہے۔ دُنیا کی عشا ہو جس سے اشراق، مومن کی اذان ندائے آفاق

آج کا انسانی ضمیر ہر لحظہ ڈانواڈول اور ہر آن متغیر! علم کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک چکا ہے۔ وہ اِلٰہ جو خود اپنے ہاتھوں ہر آن اپنے معیاروں کو تباہ کرتا رہتا ہے اور جب جب وہ کوئی نیا شگوفہ کھلاتا اور کسی نئی بات اور جدید اصول کا انکشاف کرتا ہے۔ تو وہ اپنے پجاریوں سے اور اس کے پجاری اُس سے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

بلاشبہ عقل تو اس منقلب اِلٰہ کے پیچھے پیچھے چل سکتی ہے۔ اور اس کی ناہموار وادیوں کو طے کر سکتی ہے۔ لیکن ضمیرِ انسانی تو بہرحال سکون و ثبات اور اطمینان و قرار کا محتاج ہے جو اس کے ظلِ ربوبیت میں یکسر مفقود ہے۔

انسانیت غیر فطری لذائذ اور شہوات کی کیچڑ میں لت پت ہوتے ہوتے اب زچ آ چکی ہے۔ مادہ، لذت اور انتاج کی پرستش سے اب تھک چکی ہے۔ انتاج انسانیت کا خادم ہونا چاہیئے نہ کہ خود انسانیت اس کی خادم اور چاکر بن جائے لذت انسان کی مِلک ہونی چاہیئے نہ کہ خود انسان اسی کا مملوک ہو کر رہ جائے۔ ایک اللہ کا عقیدہ ہی وہ عظیم معنوی ثبوت ہے جو انسان کو لذائذ اور آلات دونوں کے سلسلہ میں اس کے اصلی مقامِ حریت سے نواز سکتا ہے۔ ایک اللہ کا عقیدہ ہی وہ ہمہ گیر شئے ہے جو ایک ہی وقت میں عقل کی حدود کی بھی تعیین کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ فطرتِ انسانی کے حق میں قید بے جا بھی نہیں۔ اور نہ زندگی میں صالح نشو و ارتقاء اور جائز انتاج سے روکتی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام اُبھرتا اور نکھرتا ہے اور یہیں سے اُس کی دُوسرے نظاموں سے الگ تھلگ اور نرالی دعوت نکھرتی ہے اور یہ حقیقت بالکل روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ آج پوری انسانیت ہماری محتاج ہے۔

۱- فرد کا ضمیر راحت، اعتماد اور اطمینان کا بشدت محتاج ہے۔

۲- عقلِ انسانی آزادی، حریت اور نشاط کی حاجتمند ہے۔

۳- خاندان حفاظت، صیانت اور ثبات کا ضرورت مند ہے۔

۴- پوری انسانی برادری تعارف، تعاون و تعاضد اور امن و سلام کی ضرورت مند ہے۔

۵- فرد اپنے مقامِ وجود، خصائص اور فطرت کے اعتراف اور ان کی صحیح شناخت کا حد درجہ محتاج ہے۔

۶- سوسائٹی حفاظت، توازن اور انتشار و اضطراب کی بجائے اتحاد و استقرار کی ضرورت مند ہے۔

آج بھی انسانی حضارت کا شجر اسی طرح زمین بوس ہو جانے کے لئے اِدھر اُدھر مائل ہو رہا ہے۔ جس طرح اس انسانِ عظیم کی پیدائش سے پہلے مائل ہو رہا تھا۔ جس نے تنہا پوری دُنیا کے اضطراب و انتشار کو ختم کر دیا۔ پس آج انسانیت دوبارہ جانبر ہونے کے لئے اس طبیبِ حاذق کے نسخۂ شفاء کی کس قدر محتاج ہو گی۔ اسے تھوڑی سی سمجھ بوجھ والا معمولی انسان بھی محسوس کر سکتا ہے۔ آج پھر انسانیت لبطل جلیل کے پیغام کو لبیک کہہ کر ہی ہلاکت اور پستی کے غار سے نکل سکتی ہے۔

لاریب آج پوری انسانیت ہماری محتاج ہے۔ ہمارے عقیدے کی محتاج ہے۔ ہمارے اصول و مبادی کی محتاج ہے

ہماری شریعت اور ہمارے قانون کی محتاج ہے۔ ہمارے نظامِ اجتماعی کی محتاج ہے۔ جو ہر فرد کے کفاف اور ہر انسان کی کرامت و شرافت کی کفیل ہے۔ نیز ضمیرِ انسانی سے لے کر گھر اور سوسائٹی کی اسی طرح کفیل اور ضامن ہے جس طرح عام دولی امن و سلامتی اور فلاح و صلاح کی۔

ہمارے دین کے شدید اور واضح تقاضے کے بعد یہ عظیم اور عام انسانی حاجت ہے جس سے ہم اسلام، اس کی شریعت اور اس کے خاص نظامِ اجتماعی کی طرف دعوت کی راہ میں قوت و طاقت اور توانائی و ثبات حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور اُس کی توفیق کے سہارے ہم اپنے مؤقف پر جمے رہیں گے، چاہے ہر سمت اور ہر جگہ سے شر و طغیان اور مصائب و آلام کی یورش ہو...... انشاء اللہ العزیز۔

آج پوری انسانیت ہماری حد درجہ محتاج ہے۔ اتنی محتاج کہ اگر بروقت اس کی احتیاج کی طرف توجہ نہ کی گئی تو اس کی ہلاکت اس کے سر پر کھنچی ہوئی تیغ دودم کی طرح منڈلا رہی ہے۔ اور یہیں اس جرم کی شدّت، شناعت اور قباحت واضح ہو جاتی ہے۔ جس کے وہ لوگ مرتکب ہوتے ہیں، جو گھناؤنی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کسی دوسری تحریک و تنظیم میں تحلیل ہو جائیں یا پھر اندرون یا بیرون بلادِ اسلامیہ کے کسی رائج الوقت عقیدہ اور نظریہ کے ہمنوا بن جائیں!

بلاشبہ جو لوگ اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ ہم کسی قومی تحریک یا کسی دولی محاذ یا کسی عالمی نظریہ میں ضم ہو جائیں۔ اس مفروضہ کے ساتھ کہ واقعی فی الوقت کسی عالمی اتجاہ کا وجود بھی ہے۔ وہ فی الحقیقت اسلام اور وطن اسلامی سے پہلے پوری انسانیت کے حق میں اپنے اس شدید اور گھناؤنے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ہماری مہم یہ ہے کہ ہم خود عام انسانوں سے عادات و اخلاق میں ممتاز اور فائق بنیں اور زمین کے مختلف حصّوں میں بھٹکنے والوں اور ضلالتوں میں سر مارنے والوں کے لئے مشعل برداری کا فریضہ انجام دیں۔ ہماری یہ ڈیوٹی ہے کہ ہم انسانیت کو اس گندی کیچڑ سے جلد از جلد نکالنے کی کوشش کریں جس میں وہ آج سر سے پیر تک ملوث ہے۔ نہ یہ کہ ہم بھی اس کے ساتھ اسی سڑی ہوئی کیچڑ میں ملوث ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ دیر سویر پوری انسانیت اس حقیقت کو اچھی طرح جان اور مان کر رہے گی کہ اللہ کی نبوّت حق ہے۔ اس کے پیغام کا ایک ایک حرف صداقت و عدالت کا مبداء اور منتہیٰ ہے!

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔

محمد حمید اللہ صدیقی (ایم اے)

انگریزی شاعری میں رومانویت پسند تحریک

انگریزی ادب میں اس پچاس سالہ تحریک کو جو ۱۷۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۸۳۰ء تک جاری رہی مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ کسی نے اسے "فطرت کی طرف واپسی" (Return To Nature) کہا تو کسی نے اسے عجائبات کی نشاۃ الثانیہ (Renaissance of Wander) قرار دیا۔ لیکن سارے نام اس تحریک کے محض ایک یا چند خصائص پر صادق آتے ہیں اور پوری تحریک کو اس طرح کا کوئی نام دینا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اس تحریک کو عام طور پر رومانویت پسند تحریک یا احیائے رومانیت پسندی (Romantic Movement or Revival of Romanticism) کہا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے مختلف اور متعدد عناصر ترکیبی پر اگر نگاہ رکھی جائے تو یہ نام اگر بالکل مناسب اور موزوں نہیں تو سب سے کم غیر موزوں ہے۔ اس لئے یہ تحریک اسی نام سے مشہور ہوئی اور آج اسے اسی نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

یہاں ابتداء ہی میں ایک غلط فہمی کا رفع کر دینا ضروری ہے۔ رومانویت پسندی جو کچھ بھی تھی اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ محض انہی پچاس سالوں میں پیدا ہو کر ختم ہو گئی صحیح نہیں ہے۔ رومانویت پسندی ایک مخصوص مزاج کا نام ہے جو ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ اس مزاج کی بعض جھلکیاں ہمیں اگر ایک طرف افلاطون کے مکالمات میں بھی ملتی ہیں تو دوسری طرف دورِ حاضر کے اکثر ادیبوں میں یہ مزاج کسی نہ کسی حد تک کارفرما نظر آتا ہے مگر اس تحریک کو اٹھارھویں صدی کے آخری بیس سال اور بیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال سے مختص اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ مزاج رفتہ رفتہ اس دور میں ایک تحریک بنا اور اس دور کی فضاء پر چھا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ایسے شاعر ادیب اور فنکار پیدا ہوئے جو بالکل رومانویت پسند تھے۔ پھر یہ بھی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ یہ تحریک انگلینڈ یا انگریزی ادب تک محدود رہی۔ نہیں۔ اس دور میں اس تحریک نے پورے مغربی یورپ کو متاثر کیا اور خاص طور پر جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کو۔ یہاں ہمارے پیشِ نظر صرف اس تحریک نے جو اثرات اس دور کی انگریزی شاعری پر چھوڑے اُن کا اجمالی جائزہ ہے۔ ورنہ اس تحریک کے کسی سیر حاصل جائزہ کے لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ پورے مغربی یورپ کے تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیا جائے، تاکہ بات واضح ہو سکے کہ اس کے اسباب و علل کیا تھے۔

رومانویت کیا تھی؟ بنیادی طور پر یہ تخیلی ذوق (Imaginative Sensibility) کی غیر معمولی نشو و نما اور ترقی کا دوسرا نام تھا۔ رومانویت آرٹ کے پیرائے میں ایک متنوع ذوق اور شدید تخیل کے اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک تخیلی نقطہ نظر ہے۔ اسی کی بدولت شعراء اور فن کاروں کے لئے خیالات اور احساسات کی دنیا کے بے شمار گوشے اجاگر ہو کر ایک نئی حیثیت اختیار کرنے لگے۔ پہاڑوں اور جھیلوں کی عظمت، سبزہ زاروں اور جنگلوں کا حسن، بچوں کی معصومیت، جاہل کسانوں کی سادگی، پریوں اور بھوتوں کی پُر اسراریت، قرونِ وسطیٰ کی تعمیرات۔ شاعری کے نیستان (Imagination) کے یہ سارے چشمے زور و شور سے اُبل پڑے اور پورے مغربی یورپ، بالخصوص جرمنی، فرانس اور انگلینڈ میں بہنے لگے!

لفظ رومانس (Romance) ایک فرسودہ اور عام لفظ ہو گیا ہے۔ پھر بھی اُس دلکشی اور اپیل کے لئے جو شاعروں کو فیضانِ شاعری کے ان سرچشموں میں نظر آرہی تھی شاید اس سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہے۔ یہ سب کی سب روزمرہ کے عام اور بے جان معمولات سے فرار کے ذرائع تھے۔ عجیب و غریب ذرائع لیکن وہ رومانس جس نے شاعری کو جنم دیا محض عجیب و غریب ہی نہ تھا۔ اُس میں "مُجرّبیت" کی جھلک نے ایک خاص دلکشی پیدا کردی۔ ایک طرف اُس نے شاعروں کو "ماورائیت" کی بلند سطح پر پہنچایا تو دوسری طرف انھیں حقیقت سے روشناس کرایا بلکہ اُن سے حقیقت کو دریافت کرایا۔ واقعیت کے زندان و سلاسل سے آزاد کرکے اُس نے خیالی دُنیا کے حقوق عطا کئے، ایک ایسی خیالی دُنیا کہ جہاں مادہ اور زمان و مکان کی کوئی قید نہ تھی۔ ماضی کی روح کو بیدار کرنا۔ ایک ایسی روح کو جسے اب تک چشم بینا نے دیکھا بھی نہ تھا، پہاڑوں اور جھیلوں کو ایک ایسے نور سے منور کرنا جو سمندر اور ساحل کہیں بھی میسّر نہ تھا۔ (The light That never was on sea and shore) ورڈسورتھ اور کولرج کی طرف فطرت کو مافوق الفطرت اور مافوق الفطرت کو فطرت بنا دینا رومانس کی دُنیا کی محض چند باتیں تھیں۔ رومانوی اسپرٹ جو تجسس اور دریافت کے جذبات سے معمور تھی، حقیقت سے متعلق اپنے دَور کی مروّج فلسفیانہ تاویلات پر رضامند نہ ہوسکی۔ ان کے نزدیک حقیقت محض ایک احساساتی تاثر (Sense Impression) نہ بن سکا۔ کائنات سے متعلق لاک اور نیوٹن کی میکانکی تشریحات بھی وہ قبول نہ کرسکے۔ رومانیت پسند ایک نئی زمین اور ایک نئے آسمان کی تلاش میں نکلے تھے۔ وہ زندگی کے ہر محاذ پر اپنے دَور کے مروّج عقائد و نظریات سے غیر مطمئن ہوکر خود اپنے عقائد و نظریات کی تشکیل پر مجبور ہوئے۔ جس کے نتیجے میں انھیں کبھی بغاوت اور انکار کرنا پڑا اور کبھی فرار۔ اسی لئے رومانی شاعری تمام ادبی تحریکات کے برعکس نظری اور خیالی عناصر سے پُر ہے۔ اس کے شعراء، مبلّغ اور پیغمبر، مصلح اور فلسفی بن کر سامنے آئے۔ یہی وجہ تھی کہ ورڈسورتھ کی حمایت کرتے ہوئے جب جولیس ہیئر (Julius Hare) نے کہا "شاعری فلسفہ ہے اور فلسفہ شاعری" تو یہ تعریف کچھ عجیب و غریب نہ معلوم ہوئی۔

رومانوی ادب کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں فارم سے زیادہ خیال کو اہمیت ہے۔ ورڈسورتھ اور شیلے جیسے رومان پسند شعراء میں شاعر کا آرٹ فیضان کی شدت اور کم مائیگی کے لحاظ سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں ملٹن اور ولیم واٹسن جیسے کلاسیکل شعراء فیضان کی کمی کو فارم کے پردوں میں چھپا لیتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کلاسیکی ادب محض فارم کی اہمیت کا دوسرا نام ہے۔ فارم پر محض فارم کی خاطر زور دینا ادب کے انحطاط کی نشانی ہے۔ کلاسیکی ادب کی ایک لازمی خصوصیت فارم اور مواد (matter) میں توازن ہے۔ دونوں کے اندر حُسن اور تناسب ضروری ہے۔ اور یہ تناسب اور حُسن قومی زندگی کے بعض ادوار میں زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔ یہ کسی انفرادی عقل کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ قوم کے سماجی اور ذہنی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے
فطری، حسین فارم، قومی اور اصلاحی Natural, beautiful in form, national and edifying
یہ برونیٹیر (Brunetiere) کے نزدیک کلاسیکی ادب کے اوصاف ہیں۔ کلاسیکی ادب ایک ایسی قوم اور نسل کی پیداوار ہوتا ہے جس نے اخلاقی، سیاسی اور ذہنی میدان میں شعوری طور پر ترقی کی ہو اور اُسے یقین ہو کہ زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر اس نقطۂ نظر کے مقابلہ میں جس سے اس نے نجات حاصل کی ہے زیادہ انسانی، آفاقی اور صحت مند ہے۔ اس میں فرد اس سماجی شعور کے تابع ہوتا ہے جو بے اعتدالی پر نگاہ رکھتا ہے۔ کلاسیکی اس لئے کلاسیکی ہوتا ہے کہ اس کے فن پارے میں تمام صلاحیتیں معقول اور مناسب طریقہ پر بروئے کار آتی ہیں۔ وہاں عقل تخیّل کو اور تخیّل عقل کو مجروح نہیں کرتی۔ وہاں شعور جذبات اور جذبات شعور کا گلا نہیں گھونٹتے۔ بلکہ ان سب میں مناسب امتزاج اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس رومانویت میں وہ اعتماد

ف گوئی - وہ متوازن انسان دوستی، وہ متناسب فارم اور وہ لطافت جو ادب میں اپنی روح عصر کے ادراک سے پیدا ہوتی ہے نہیں ملتی۔ اس میں خیالات اور احساسات کی عجیب و غریب حُسن کاریوں کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جس سے زبان مالامال ہوتی ہے کیونکہ الفاظ نشانات (symbols) بن جاتے ہیں۔ جس سے اُن میں بے پناہ حُسن اور رمزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نثر و نظم کا وزن اور روانی گوناگوں اور عہ ہو جاتی ہے۔ جس کی بدولت خیالات اور احساسات کے مبہم اور لطیف تر تاثرات کا اظہار ممکن ہوتا ہے۔ رومانوی تحریک نے اسیکی ادب کے قلب پر نشو و نما پائی۔ اس کے موضوعات بے پناہ ہیں۔ فطرت پرستی احیائے قرون وسطیٰ، سنہری دَور کے خواب یرہ وغیرہ۔ درحقیقت اگر دیکھا جائے تو ہم سب کسی نہ کسی حد تک رومانوی ہیں۔ جب کٹھن دن کی شام ہوتی ہے۔ جب رات کو ہم سودہ خواب ہوتے ہیں یا محبت کی کیفیات اُبھرتی ہیں اُس وقت "رومانویت" سے ہم قریب تر ہوتے ہیں۔ اس لئے رومانوی شاعر دَور میں ملتے ہیں۔ لیکن "رومانوی تحریک" ادب و خیال کی تاریخ میں ایک مُسلّم واقعہ ہے۔

قبل اس کے کہ انگریزی رومان پسند شعراء نے جس انداز سے رومانوی تحریک کے عناصر ترکیبی کو اپنایا ہے اُس کی نشاندہی کی جائے ں پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لینا بے حد ضروری ہے۔ جس نے ایک تحریک کے لئے راہیں ہموار کیں۔ ورنہ اس تحریک کو پروان ڑھانے والے شعراء مثلاً بلیک ورڈسورتھ، کولرج اور پھر شیلے، کیٹس اور بائرن وغیرہ کے کلام کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ ارھویں صدی سے قبل انگلینڈ میں کٹر مذہبیت (orthodoxy) اور منکرین وحی (Deists) کے درمیان مستقل کشمکش جاری تھی۔ بہت سے تثلیثی وحدت پرست (unitarian) بن گئے تھے۔ جو کٹر مذہبیت میں اعتقاد رکھنے والوں کے دیک منکرین وحی سے کچھ بہتر نہ تھے۔ اور پھر اس کے بعد گبن اور ہیوم جیسے متشککین اور ملحدین اور اُن کے ہم خیالوں کا گروہ تھا۔ کے علاوہ اس نام نہاد عقل پرستانہ دَور میں مستقل طور پر ایک احساس یہ بھی تقویت پکڑ رہا تھا کہ مذہب کی حیثیت بالکل ذاتی و انفرادی ہے اور انسان بذاتِ خود خدا کو جان اور پہچان سکتا ہے اور اسی کا نتیجہ وہ تحریک تھی جسے تحریک غیر مقلدین (Methodists) کہتے ہیں۔ ان چیزوں کا اثر ادب پر بہرحال ناگزیر تھا اور ادب میں پہلی بار یونان اور روما کے ادب کے بجائے ون وسطیٰ (Gothic) کے ادب میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ پھر کلاسیکیت (Classicism) نیو کلاسیکیوں — (Neo classicists) کے ہاتھوں تنزل کرتے کرتے سارا تنوع اور دلکشی کھو چکی تھی۔ کلاسیکیت صرف کلاسیکی فن کاروں کی ف بہ حرف تقلید کا نام رہ گیا تھا۔

یوں تو افکار و نظریات میں رفتہ رفتہ اور بتدریج ایک انقلاب مدت دراز سے ہو رہا تھا۔ اس انقلاب کے آثار ہمیں اس کشمکش میں بھی مل سکتے ہیں جو رومن کیتھولک چرچ کے خلاف صدیوں سے جاری تھی۔ اور پھر اس بے چینی اور اضطراب میں بھی جو گیردارانہ نظام کے خلاف پائی جاتی تھی۔ ایسا جاگیردارانہ نظام جو ہر نئے خیال اور اصلاح کا مخالف تھا۔ یہاں تک کہ غلاموں تجارت کو ختم کرنے کا بھی!

ایک طرف یہ صورت حال تھی جب ۱۷۶۲ء میں روسو کی دو کتابیں Social Contract اور Emile منظر عام ئیں۔ صدیوں سے مچلتا ہوا اضطراب جو راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کے مانند سُلگ رہا تھا۔ یکایک ایک شعلہ بن گیا۔ یہ شعلہ یکھتے دیکھتے ایک دہکتی آگ میں تبدیل ہونے لگا۔ ان دونوں کتابوں نے پورے یورپ میں حریتِ فکر کی ایک برقی رَو دوڑا دی۔ رچہ ان کتابوں میں جو نظریات پیش کئے گئے تھے۔ وہ تمام نئے نہ تھے۔ مگر روسو کے دماغ و قلم نے انھیں بے پناہ جاذبیت طا کر دی۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔" یہ سوشل کنٹریکٹ کا جملہ ہے۔ اسی طرح (Emile

"خدا نے ہر چیز کو اچھی بنایا ہے لیکن انسان اس میں مداخلت کر کے اُسے خراب کر دیتا ہے"۔ اس جملہ سے شروع ہوتی ہے اور یہی دو جملے روسو کی ساری تبلیغ کا نچوڑ ہیں۔

روسو نے سوشل کنٹریکٹ میں اس بات کو ثابت کرنے کی پُر زور کوشش کی کہ ریاست کوئی الوہی اور آسمانی ادارہ نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا تشکیل کردہ ہے۔ انسانوں نے محض اپنی فلاح و بہبود کے لئے اپنے کچھ حقوق سے اپنے کو دستبردار کیا۔ کچھ قوانین کا اپنے کو پابند کیا اور کچھ لوگوں کو با اختیار بنایا۔ کہ وہ ان کے فلاح و بہبود کے کام کریں۔ بادشاہ اُس ریاست کا وہ حاکمِ اعلیٰ ہے جسے رعیت نے خود منتخب کیا ہے۔ بادشاہ کے ظلِّ الٰہی ہونے کا نظریہ محض بکواس ہے اور نہ اس کے الوہی حقوق ہیں۔ آزادی بغیر مساوات کے خطرناک ہے۔ آزادی، مساوات، اور عوام کی بادشاہت سوشل کنٹریکٹ کے خاص نعرے تھے۔ روسو کا مقصد یہ بتانا نہ تھا کہ لوگ شہری کیونکر بنے۔ بلکہ یہ تھا کہ لوگوں کے لئے شہری بننا کیوں ضروری ہے۔ لیکن لوگوں نے اسے بالکل غلط سمجھا۔ عوام نے یہ سمجھا کہ کسی زمانے میں تمام انسان آزاد مساوی اور حکمران تھے۔ انہوں نے محض سر پرستی کے لئے بادشاہ چُنا اور بڑی اچھی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر بادشاہ خراب ہو گئے اور انہوں نے نظام بگاڑ ڈالا۔ انقلاب سے پہلے فرانس کا جو حال تھا اس میں یہ نظریہ لوگوں کو بغاوت پر اُکسانے کے لئے کافی تھا۔ بقول ہیگل یہی وہ غلط تصور تھا جس نے روسو کے افکار کو ہاتھ پاؤں عطا کئے اور دیکھتے دیکھتے اسے مسلح فوج بنا دیا!

"خدا نے ہر چیز اچھی بنائی مگر انسانی مداخلت نے اسے خراب کر دیا" اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ ہر چیز جیسی خدا نے بنائی ہے ویسی ہی اُسے چھوڑ دو۔ فطرت کی طرف رجوع کرو۔ نتیجہ یہ کہ شہر کے بجائے دیہات اہمیت حاصل کر گئے۔ کیونکہ خدا نے دیہات بنائے اور انسان نے شہر۔ پھر روسو کا خیال تھا کہ بچے کی تعلیم، اس کے احساسات اور جذبات سے ہم آہنگ ہونی چاہیئے۔ بچے کے احساسات کی پیرس کی مسموم اور دھوئیں سے گھٹی ہوئی فضا کے بجائے دیہات کی تازہ ہوا اور کھلی فضا میں نشو و نما ہونی چاہیئے۔ دوسرے روسو نے سادہ زندگی کو اہمیت دی۔ سادگی دیہاتیوں کا جزو حیات بلکہ سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ پیرس کی سوسائٹی گندی تھی۔ اس لئے کہ سادہ نہ تھی۔ مگر دیہات کی سوسائٹی صاف اور پاکیزہ تھی۔ اس لئے کہ وہاں سادگی تھی۔ فطرت سے روسو کی تیسری مُراد یہ تھی کہ بچے کو فطرت اور خود اس کی اپنی فطرت کے مطابق تعلیم دی جائے تاکہ خارجی فطرت اور انسان کی داخلی فطرت ہم آہنگ ہو جائے۔ بچہ محض ایک چھوٹا انسان نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک دور، ایک مرحلہ ہے۔ جس کے اپنے اصول و ضوابط ہیں۔ اور اُستاد کو چاہیئے کہ وہ ان اصول و ضوابط کو دریافت کرے۔ "خدا نے ہر چیز کو اچھا بنایا" محض ان چند الفاظ نے نظریہ کی شکل اختیار کر کے ادب کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس نظریہ نے انسان کے ازلی گناہگار ہونے کے نظریہ کا بطلان کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو حال سے نفرت ہو گئی اور ماضی سے محبت اور مستقبل کے لئے بڑی عجیب و غریب امیدیں پیدا ہو گئیں۔ اگر ظلِّ الٰہیت اور "ازلی گناہگاریت" محض خرافات ہیں۔ اگر انسانی فطرت کا سر چشمہ گندہ ہونے کے بجائے صاف اور شفاف ہے۔ اگر خدا نے ہر چیز کو اچھا بنایا کہ انسان اچھا اور خوش رہے۔ اور یہ محض حضرتِ انسان کی مداخلت ہے۔ جس سے یہ ساری خرابیاں وجود میں آئیں۔ تو پھر کیوں نہ ملوکیت کے شکنجوں کو توڑ دیا جائے اور کلیسائیت اور پاپائیت کے قلعوں کو مسمار کر دیا جائے۔ تاکہ ایک عالمِ نو پیدا ہو سکے۔ وہ عالمِ نو جو کبھی تھا اور اس کو غلط انسانوں نے بگاڑ دیا۔ ان انقلابی نظریات نے خود ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

فرانس کے ان نظریات کا انگلینڈ پر شدید اثر پڑا۔ برک نے اس کو صحیح طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ٹام پین نے اس کے جواب میں اپنی کتاب Rights of Man میں ۱۷۸۹ء کے فرانس کی جو منظر کشی کی، اس نے لوگوں کے دل ہلا دیئے۔

تاب جنگل کی آگ کی طرح پھیلی - لوگوں میں ہیجل پیدا ہوئی - حکومت گھبرائی - کچھ لوگوں کو لمبی سزائیں اور پھانسیاں دی گئیں - اسی زمانے میں
ڈون کی کتاب " سیاسی انصاف " (Political Justice) شائع ہوئی - گاڈون ایک انارکسٹ فلسفی تھا - اس کا
ل تھا کہ حکومت زیادہ سے زیادہ ایک ناگزیر برائی ہے - جس کی ایک مثالی معاشرے میں کوئی ضرورت نہ رہ جائے گی - اخلاقیات
ں وہ عقل پرست تھا - اس کا خیال تھا کہ افعال اور اعمال کا فیصلہ ان نتائج پر کرنا چاہیئے جو اس کے بعد ظاہر ہوں - اگر نتیجہ اچھا ہے
عمل اچھا ہے ورنہ خراب - انسان کی تخلیق کا اصل مقصد اس کی فلاح و بہبود ہے - مگر انسان نے ایسے ایسے سماجی ادارے
رکھے ہیں جنہوں نے اسے تباہ کر دیا ہے - ان اداروں کو مٹا دو - پھر ساری برائیاں دور ہو جائیں گی - اس طرح مختصر طور پر بیان کرنے
ں گاڈون کے یہ نظریات بالکل خرافات معلوم ہوتے ہیں - مگر اس دور کے مخصوص حالات نے ان میں بڑی جاذبیت پیدا کردی
ی اور اسی وجہ سے اس زمانہ کے بہترین ذہن و دماغ کو ان نظریات نے متاثر کیا !

انگریزی ادب میں رومانی شاعری اس شاعری کو کہتے ہیں جو ۱۷۸۹ء میں بلیک کے " معصومیت کے گیت " سے شروع ہو کر کیٹس
ر شیلے کی موت پر یعنی ۱۸۲۲ء میں ختم ہو گئی - روسو کی آواز ادب کے کلاسیکی معیار کے بجائے انسانی سماج کے خلاف تھی - اسے
یب کی آزادی نہیں بلکہ انسان کی آزادی مطلوب تھی - لیکن اس کا انداز نگارش ادب میں ایک نئی چیز تھا جس نے فرانسیسی ادب کے
لاوہ انگریزی ادب کو بھی متاثر کیا - درحقیقت انقلاب فرانس اور رومان پسندی کی تحریک ایک ہی ذہنی ساخت کی پیداوار تھے -

انگریزی ادب میں رومان پسندی کی تحریک نے پانچ بڑے شعراء کو جنم دیا - میری مراد بلیک ، کولرج ، ورڈسورتھ ، شیلے اور
کیٹس سے ہے - جو بہت سے اختلافات کے باوجود اس بات پر متفق تھے کہ تخلیقی تخیل (Creative Imagination)
س مخصوص بصیرت سے بڑا گہرا تعلق رکھتی ہے ، جو مظاہر فطرت کے پس پردہ ایک نظم و ضبط دیکھتی ہے - لیکن اس دور میں اور اسکے
عد بھی بہت سے ایسے شعراء ملتے ہیں جن کا نظریۂ تخیل اس سے جداگانہ تھا - ایک طرف بائرن تھا جو ان لوگوں سے بہت سے
وضوعات پر اتفاق اور ذوق میں بڑی حد تک یکسانیت کے باوجود نہ تو تخیل کی اس اہمیت کا قائل تھا اور نہ کسی ماورائی نظم
کا عتقاد رکھتا تھا - سوئن برن بھی ماورائیت کا سرے سے قائل ہی نہ تھا - ڈی جی راسٹی نے تخیل کو حسن سے مماثل قرار دیکر
س کے دائرے کو محدود کر دیا - اور کرسٹینا راسٹی مسیحی معتقدات کی آسمانی دنیا میں کھو کر رہ گئی -

انگریزی رومانی شاعری کے بہ آسانی دو حصے کئے جا سکتے ہیں - ایک طرف ایک نئے جاندار نظریہ کی نشو و نما کی جاتی ہے تو
دوسری طرف اس کی تنقید کی جاتی ہے - یا اسے مبالغہ سے پیش کیا جاتا ہے - یا اسے محدود کیا جاتا ہے یا چھوڑ دیا جاتا ہے - ایک
طرف اس کی نشو و نما بالکل سیدھے سادے خطوط پر ہوتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف کئی خطوط اور کئی موڑ نظر آتے ہیں - لیکن دونوں
عالم آشکارا کے مقابلہ میں کسی زیادہ مکمل اور قابل اطمینان دنیا کی تلاش کی صحیح خواہش نظر آتی ہے !

انگریزی رومان پسند شعراء کی نظر میں تخیل کی جو اہمیت ہے اس کی رو سے وہ دوسروں سے مختلف معلوم ہوتے ہیں - اٹھارویں
صدی کے دوسرے انگریزی شعراء کے لئے تخیل نظریۂ شاعری کا کوئی اہم جزو نہ تھا - وہ ایسی تخیل کو پسند کرتے تھے جس کی لگام عقل کے
ہاتھوں میں ہو - وہ شاعری کو احساسات اور جذبات کی سچی عکاسی کا دوسرا نام سمجھتے ہیں - ان کی نظر میں شاعر خالق کے بجائے محض شارح
ہوتا ہے - لیکن رومان پسند شاعر کو تخیل کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں - تخیل پر یہ ایمان درحقیقت اس دور میں انفرادیت پر ایمان کا ایک جزو
تھا - انھیں احساس تھا کہ وہ ایک بالکل خیالی دنیا کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں اور اس پر کسی طرح کی بندش یا قدغن کو غلط سمجھتے تھے
شعر کہنے کی شدید خواہش کے لئے قوت تخلیق پر کسی بندش کا نہ ہونا ان کے نزدیک ناگزیر تھا اور یہ آزاد قوت تخلیق ہی نئے عالم

جنم دے سکتی ہے۔

تخیل کے متعلق اس نظریہ کو مذہبی اور مابعد الطبیعاتی تقاضوں نے مزید تقویت پہنچائی ۔ لاک اور نیوٹن دونوں نے کائنات کی بالکل میکانکی تشریح کی تھی ۔ اور خدا کے وجود کو صرف اس لئے تسلیم کیا تھا کہ اس عظیم کارخانہ کا بلا کسی ایسے وجود کے جاری رہنا ادراک سے باہر تھا ۔ لیکن رومان پسندوں کیلئے دلائل اور براہین سے زیادہ یہ جذبات ، احساسات اور تجربات کا مسئلہ تھا ۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرح کی میکانکی تشریحات اُن کے داخلی معتقدات کی بالکل نفی کرتی ہیں !

بلیک کے لئے تخیل بالکل خدا کی حیثیت رکھتا ہے ۔ نتیجہ یہ کہ ہر تخیلی فعل جو تخیل کی مدد سے ہوتا ہے اُلوہی بن جاتا ہے اور یہ کہ تخیل میں انسان کی روحانی فطرت کی تکمیل ہوتی ہے ۔ کولرج کے نزدیک تخیل ایک زندہ قوت کا نام ہے ۔ جو تمام انسانی احساسات کی ایجنٹ ہے ۔ اس لئے کولرج بھی تخیل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے ۔ کیونکہ خدا کی تخلیق میں اسے تخیل ہی کارفرما نظر آتا ہے ۔ ورڈز ورتھ ، شیلے اور کیٹس کے نزدیک تخیل نہ صرف ان کا سب سے بیش بہا سرمایہ ہے بلکہ وہ بھی اسے کسی نہ کسی شکل میں ما فوق الفطرت نظم سے وابستہ سمجھتے ہیں ۔ انہی نظریات کی بدولت رومانی شاعری میں ایک ساحریت نظر آتی ہے ۔

رومان پسندوں کا عقیدہ تھا کہ تخیل کسی نہ کسی صورت میں حقیقت سے متعلق ہے ۔ اور اُن کی کوششیں بڑی حد تک اس کے اظہار میں صرف ہوئیں اس کوشش میں انھیں ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ۔ یعنی یہ کہ ایک شخص اگر تخیل کو بالکل بے لگام چھوڑ دے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ سب صحیح ہے ۔ رومان پسندوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تخیل ایک خاص قسم کی حقیقت اور سچائی کا اظہار کرتا ہے اس کا تعلق ایک خاص قسم کی بصیرت یا احساس یا وجدان سے ہے ۔ انہوں نے تخیل اور وجدان کو ایک ہی چیز سمجھا ۔ وجدان تخیل کو آمادہ کار کرتا ہے اور خود بھی اس سے جلاء پاتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ان کی تخلیقی صلاحیتیں مصروف کار ہوتی ہیں تو انھیں اشیاء کی حقیقت کا فیضان ہوتا ہے ۔ وہ اس میں غور و فکر کرتے ہیں اور پھر اس غور و فکر کے نتائج کو اشعار کے روپ میں پیش کرتے ہیں ۔

رومان پسندوں نے اپنی داخلی خواہش کے اتباع میں روحانی دُنیا کی تفتیش شروع کی ۔ وہ ایک لازوال حقیقت کو دریافت کر کے اس کے اسرار و رموز سمجھنا چاہتے تھے ۔ تاکہ وہ بالآخر یہ سمجھ سکیں کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور زندگی کس لائق ہے ۔ ؟ اُن کا عقیدہ تھا کہ مظاہر عالم حقیقت کی دریافت کا ایک وسیلہ ہیں ۔ خود مظاہر ہی سب کچھ نہیں ہیں ۔ اگر اُن کا تعلق کسی عظیم حقیقت سے نہیں ہے ۔ رومان پسند غیر مادی چیزوں سے متعلق تھے اور ان کا خیال تھا کہ تخیل اور وجدان کی مدد سے وہ نہ صرف روحانیت کو سمجھ لیں گے بلکہ اسے فن کے سانچے میں ڈھال دیں گے ۔ ایک اَن دیکھی دُنیا کی تلاش کی خواہش نے انھیں متحرک کیا ۔ اور شاعر بنا دیا ۔ اُن کے پیش نظر اشیاء کے اسرار و رموز کو آشکار کرنا اور اُن کا مفہوم واضح کرنا تھا ۔ وہ عقل کو اپیل نہیں کرتے بلکہ پُورے انسانی وجود کو اس کی تمام ذہنی اور دماغی صلاحیتوں اور احساسات و جذبات کو اپیل کرتے ہیں ۔ یہ کام صرف تخیل کی انفرادی پیشکش ہی کر سکتی ہے ۔ رومانی تخیل کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ایسی ہیئتیں اور اشکال بناتا ہے جو اُن کو اَن دیکھی قوتوں کو کام کرتا دکھاتا ہے اور انفرادی تخیل کے علاوہ انھیں دکھانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ تشریح اور تجزیہ کے سخت مخالف ہیں ۔ بلیک کہتا ہے :۔

" تعمیم (Generalization) حماقت ہے ۔ تخصیص ہی درحقیقت کمال ہے ۔ عام معلومات وہ معلومات ہیں جو صرف احمقوں کے پاس ہوتی ہیں ۔ "

بلیک کا یہ عقیدہ تھا اس لئے کہ وہ تخئیلات کی دُنیا میں رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے نزدیک کسی چیز کی اس وقت تک کوئی اہمیت
نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ ایک مخصوص شکل میں ظاہر نہ ہو۔ اور اس بات سے تقریباً تمام رومان پسندوں کو اتفاق تھا۔ "قبلاخاں" جیسی
نظم میں بھی ایک عجیب و غریب اور پُر اسرار تجربہ کو جو تخلیق کا مرکزی تجزیہ ہے انتہائی منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس تجربہ کو
و لرج پیش کرتا ہے وہ تخلیقی موڈ کی بالکل اصلی شکل ہے۔ اس طرح کے دور دراز، عجیب و غریب اور احساسات سے ماوراء تجربات
تھے۔ جنہیں رومان پسندوں نے شاعری کے لئے اختیار کیا اور محسوس کیا کہ اسے دُوسرے تک پہنچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ انھیں مخصوص
ساطیر امثال اور اشکال میں پیش کیا جائے۔ اس سے اُنھیں ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ غیر مرئی اور عام حقیقتوں سے نجات حاصل کر کے اپنے
حساسات کا استعمال کر سکے اور فطرت کا بلا کسی رسمی اور واقعی حُسنِ ظن یا سوئے ظن کے مشاہدہ کر سکے۔ تمام کے تمام رومان پسند
اشدید فطری ذوق رکھتے تھے اور کبھی کبھی اس کی بدولت اپنے مشاہدات سے اس قدر متاثر ہو جاتے تھے کہ اُن کی ساری شخصیت
جاتی تھی۔

تمام رومان پسند شاعروں کو مظاہر فطرت Nature سے فیضان (Inspiration) نصیب ہوا۔ مظاہر فطرت ہی اُن
کے لئے سب کچھ نہ تھے لیکن بغیر اس کے وہ کچھ بھی نہ ہوتے کیونکہ اسی کی بدولت انھیں وہ لمحات نصیب ہوئے جبکہ وہ مشاہدے سے
کاشفے تک پہنچے۔ اور کائنات کے اسرار و رموز اپنی دالست میں دیکھ آئے۔ اگرچہ تمام رومان پسند کسی پنہاں حقیقت پر ایمان رکھتے تھے۔
اسی پر انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن اس کی دریافت انہوں نے مختلف اشکال میں کی اور مختلف انداز سے اُسے
ظم کیا۔ ایک انتہا پر بلیک ہے جس کا عقیدہ تھا کہ تخئیل ایک اُلوہی قوت ہے اور ہر شئے در حقیقت اسی کی بدولت جنم لیتی ہے۔

"دُنیا کو ایک ذرّے میں دیکھنا اور کائنات کو ایک جنگلی پھول میں۔ اپنی ہتھیلی میں لامتناہیت
کو بند کر لیں اور ابدیت کو ایک لمحہ میں۔"

ظاہر کے توسط سے بلیک ماورائیت تک پہنچا جسے وہ ابدیت کہتا ہے۔ وہ صوفی نہ تھا بلکہ ایک خیال پرست جو اپنے متعلق
کہہ سکتا تھا:۔

"میں رات دن خدا کے سامنے ہوں اور وہ کبھی اپنا مُنہ مجھ سے نہیں پھیرتا۔"

تمام رومان پسندوں میں بلیک اپنے نظریۂ تخئیل میں سب سے زیادہ شدید ہے۔ اگرچہ عالم محسوسات کے لئے بھی اس
کے پاس ایک باریک بین نظر تھی مگر اس کی ساری دلچسپی ماورائیت میں تھی۔ اس کے نزدیک ہر جاندار شئے اس ابدی قوت کا مظہر
تھی اور وہ اسی ابدی قوت کو جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

کیٹس کو اس کے برعکس عالم محسوسات سے زیادہ گہرا لگاؤ تھا۔ اگرچہ وہ بھی بلیک سے اس حد تک متفق تھا کہ حقیقت کا
ادراک تخئیل ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ اس نے اس تخئیل کو دیکھا جو تخلیق بھی کرتا ہے شرح بھی بلکہ تخلیق ہی کے ذریعہ سے شرح کرتا
ہے۔ تخئیل کے ذریعہ کیٹس نے ایک حقیقتِ مطلق کی تلاش کی۔ احساسات کے ذریعہ سے حُسن کو سمجھنے کی کوشش نے اس کی راہ آسان
کر دی تھی۔ جب احساسات کے ذریعہ حُسن کا اُسے ادراک ہوتا تھا۔ تو وہ بالکل ایک دُوسری دُنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ کیٹس کو ظاہر
حُسن ہی مسحور کر دیتا تھا۔ حقیقت کے متعلق کیٹس کا نظریہ بلیک کے مقابلہ میں محدود تھا۔ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے
اس کی تشریح کرتا ہے جبکہ بلیک تخئیل میں ان تمام قوتوں کو شامل سمجھتا ہے۔ جو زندگی کی تخلیق کرتی ہیں۔ بلیک کے نزدیک تخئیل
ایک فعال قوت ہے۔ کیٹس کے نزدیک مفعول۔ لیکن جب کیٹس یہ کہتا ہے کہ تخئیل وہ شئے ہے جو انسان کو بلند کر کے روحانی

نظم تک پہنچا دیتا ہے تو وہ بلیک سے قریب معلوم ہوتا ہے۔

کولرج کے نزدیک اصل اہمیت تخئیل کے اندر اس کے اپنے اعتماد کی تھی۔ وہ بلیک کی حد تک نہیں جاتا۔ وہ بڑی حد تک ایک خارجی دُنیا کے وجود کے احساس سے رُک جاتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ اُسے اس کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لیکن جب اس کی تخلیقی صلاحیت زوروں پر ہوتی ہے تو وہ اس حد کو توڑ دیتا ہے اور حقیقت کو ایک غیر متشکل اور غیر ممیز سے مُشکل کر دیتا ہے آخر کار اس کا عقیدہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی اور کائنات کے وجود کا مفہوم در حقیقت اس تخلیقی قوّت کو بروئے کار لاکر دریافت کیا جا سکتا ہے جو خدا سے قریب ہے۔ کولرج نے حقیقتِ مطلق کے متعلق کوئی خاص نظریہ نہیں پیش کیا۔ "قدیم ملاح" (Ancient Mariner) اور کرسٹابل (Christabel) سے محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا مقصد زندگی کے اسرار کا اظہار ہے۔ بحیثیت ایک فلسفی کے اس کا نظریہ جو کچھ بھی ہو بحیثیت ایک شاعر کے اس کا خیال تھا کہ دُنیا میں غیر مرئی اور روحانی قوتیں کارفرما ہیں۔ اور اُنہی کے اثرات کو وہ اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ حقیقت کے متعلق اس کا تخئیلی تصور یہ تھا کہ انسانی اعمال کے پردہ میں خیر و شر کی جن کی بدولت کوئی واضح قوت ایسی ضرور ہے جو اس عالمِ محسوس سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ مجبوراً اس نظریہ تک پہنچا کہ زندگی پر ایسی قوتوں کا قبضہ ہے جن کا تمام تر ادراک ممکن نہیں ہے۔ اس کی شاعری دوسرے رومان پسندوں کے مقابلہ میں زیادہ پُر اسرار ہے۔

ورڈسورتھ بڑی حد تک کولرج کا ہم خیال تھا۔ اس کے نزدیک بھی شاعر کا اہم ترین سرمایہ تخئیل ہے۔ اپنی "تخئیلی نظمیں" میں اُس نے قوتِ تخلیق اور ایک مخصوص خیالی بصیرت کو ملا دیا۔ وہ کولرج سے متفق تھا کہ تخئیل کی کارکردگی خدا سے مشابہ ہے۔ لیکن اُسے احساس تھا کہ محض تخلیق کافی نہیں۔ اس کے ساتھ ایک مخصوص بصیرت لازمی ہے۔ اس لئے دُوسرے رومان پسندوں کی طرح عقل کا مذاق نہیں اُڑایا۔ وہ کولرج کے خارجی دُنیا کے نظریہ سے متفق نہ تھا۔ وہ اس کے آزاد وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ تخئیل کو کسی نہ کسی طرح اس کی مطابقت کرنی چاہیئے۔ اس کے نزدیک تخئیل کو خارجی دُنیا کا پابند ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ایک زندہ عالم ہے جس کی ایک روح ہے جو انسانی روح سے مختلف ہے۔ انسان کا کام اس روح سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فطرت کی اس روح کو انسان سے قریب تر لانے میں کامیاب ہوا۔

شاعر شیلے ایک فلسفی بھی تھا جسے حقیقت کی فطرت کے ادراک میں خاصہ درک تھا اور یہ حقیقت لازوال، ناقابلِ تبدیل اور مکمل حقیقت ہے۔ جس کا ایک ٹوٹا پھوٹا عکس یہ دُنیا ہے۔ شیلے نے افلاطون کے نظریۂ علم کو لے کر اُسے حُسن سے متعلق کر دیا شاعر کا کام اس حقیقتِ مطلق کو بے نقاب کرنا ہے اور اس کی تشریح کرنا ہے۔ اس کے نزدیک ابدی حقیقت عقلِ کل ہے۔ جو دُنیا کو یکجا رکھتی ہے۔ خیال و احساس میں شعور اور روح میں شیلے کو حقیقت نظر آئی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ تخئیل کا کام ایسی اشکال پیدا کرنا ہے جس سے حقیقت بے نقاب ہو سکے!

المختصر یہ کہ بڑے رومان پسند شعراء اس بات پر متفق تھے کہ اُن کا کام تخئیل کے ذریعہ کسی ایسے ماورائی نظم کی دریافت ہے جو اس ظاہری دُنیا کے مفہوم کو اجاگر کرے۔ اور نہ صرف یہ کہ ظاہری چیزوں کے وجود کی وجہ بتا سکے بلکہ اُن کے جو اثرات ہم پر مُرتب ہوتے ہیں اُنھیں بھی بتا سکے۔ جہاں تک تمام چیزوں کے ایک کُل کی حیثیت رکھنے کے نظریہ کا تعلق ہے یہ شعراء علماء الٰہیات نظر آتے ہیں۔ لیکن پیشہ ور عالم الٰہیات کے برعکس انہوں نے دلیل کے بجائے بصیرت پر بھروسہ کیا۔ رومانی تحریک ایک تنہا اور بے مدد و بے سہارا روح کی عالم ارواح کے دریافت کرنے کی ایک عجیب و غریب کوشش تھی۔ یہ فرد کی صلاحیت پر اعتماد کا

ایک مظاہرہ تھا۔ جسے اب فلسفی اور سیاستدان دُنیا کو سمجھا رہے ہیں۔

رومان پسندوں کی یہ شدّت پسندی خطرات سے خالی نہ تھی۔ ایک طرف وہ بڑی شدّت سے تخئیل کی اہمیت پر اصرار کرتے تھے اور دوسری طرف اُن کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ اس کی بنیاد سچائی اور حقیقت پر ہو۔ جہاں ورڈسورتھ اور کیٹس کو مناظر فطرت میں سکون مل گیا وہاں دُوسرے کمتر درجہ کے شعراء مثلاً ایڈگر ایلن پو میں فراریت کی شدید خواہش پیدا ہوگئی۔ پو کی آخر کار ناکامی پوری رومان پسند تحریک پر ایک تنقید ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس تحریک میں اس بات کے قوی امکانات تھے کہ انسان ماورائیت میں اس قدر کھو جائے کہ اسے حال اور ماحول کا احساس تک نہ رہ جائے۔ پھر اس تحریک نے خیال پرستوں (Vissionaries) کو جنم دیا۔ جن کا خیال تھا کہ انھیں کشف ہوتا ہے جبکہ درحقیقت انھیں کوئی کشف نہ ہوتا تھا۔ یہ چیز بائرن کے ساتھ ابتدائی شاعری میں پیش آئی۔ خواب ایک چیز ہے لیکن اس بات کا دعویٰ کہ کشف ہوتا ہے ایک دوسری چیز ہے۔ اور ان سب سے مُضر مغالطے اور خود فریبی کہ وہ کیفیت ہے جو تخئیل کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر اسے ذاتی تجزیہ اور احتساب سے درست نہ کیا جائے۔ رومان پسندی نے فرد کو جو اہمیت عطا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرد خود اپنی دُنیا میں کھو گیا اور اسے یہ بات یاد ہی نہ رہی کہ اس کے گرد وپیش بھی کچھ ہو رہا ہے۔ رومان پسندی اس لئے ایک خطرناک زہر ثابت ہوسکتی ہے اگر اُسے کھُلی چھوٹ دے دی جائے۔

ایک دوسرا خطرہ روایات کا مکمل بطلان تھا۔ رومان پسندی اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ انسان صرف اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے جو اُس کی اپنی ہیں اور خاص طور سے اپنے انفرادی مکاشفے اور فیضان کو استعمال کرے۔ یہ اس فارم اور ٹکنیک پر جسے دوسرے شعراء نے ایجاد کیا یا برتا ہے مطلق اعتماد نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے رومان پسند شعراء ملٹن اور ورجل جیسے شعراء کے مقابلے میں خسارے میں رہے۔ ملٹن اور ورجل کو روایات کا سہارا حاصل تھا۔ رومان پسندوں کے لئے ایسا کوئی سہارا نہ تھا۔ انھوں نے سارا بھروسہ فیضان پر کیا۔ اور فیضان کو اگر بے لگام کردیا جائے تو اس سے زیادہ ناقابلِ اعتماد شے اور کیا ہوسکتی ہے۔ جن لوگوں نے عام طور پر بھروسہ اسی پر کیا اور اپنی زندگی کی تشکیل اسی کے سہارے کی۔ انھیں یکایک احساس ہوا کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں سوکھ گئیں۔ یہ حادثہ ورڈسورتھ اور کولرج دونوں کے ساتھ ہوا۔ جس نے یہ ثابت کردیا کہ درحقیقت فیضان کی جڑیں کس قدر کمزور ہوتی ہیں۔ اگر ان کا تعلق جمی جمائی روایات سے ہوتا تو صورتِ حالات شاید مختلف ہوتی۔ اس لئے کہ روایات شاعر کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ رومان پسندوں نے صرف اس چیز پر بھروسہ کیا جو دُوسروں کے برعکس اُن کے اندر تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے کی بدولت انھوں نے اپنی قوتوں کو بہت جلد ختم کردیا۔ اور پھر اُن کی جگہ لینے کے لئے کوئی باقی نہ رہا۔

ایک تیسرا خطرہ اُن کے ماورائی نظریہ میں مضمر تھا۔ اُسے برتنے میں رومان پسندوں نے ہمیشہ ابہام سے کام لیا۔ یہ مسئلہ اس وقت تک پیدا نہ ہوا جب تک شعراء اپنی ضرورت کے مطابق مناسب اساطیر کا سہارا لیتے رہے۔ جو مسائل "قبلا خاں" (Kubla Khan) اور (Promethens unbound) اور (Hyperion) میں پیش کئے گئے ہیں وہ اپنی اہمیت اور وسعت کے باوجود دل پسند اور قابلِ فہم ہیں۔ اس لئے کہ انھیں ٹھوس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس سے اُن میں بڑی اپیل پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن خطرہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی اسطور (myth) کا استعمال کیا جاتا ہے اور شاعر سب کچھ صاف صاف بیانیہ انداز میں کہتا ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کا مفہوم خبط ہوجاتا ہے اور اُن کی رمزیت بالکل بے اثر ہوجاتی ہے۔ کیونکہ انھیں اس کی تمام تر اہمیت کی وضاحت کا

آرٹ نہیں آتا۔ کولرج اور پو دونوں کا خیال ہے کہ ابہام شاعری کے لئے ناگزیر ہے اور دونوں کے یہاں اس کی مضرتیں نظر آتی ہیں۔ اس ابہام میں دُوسرا خطرہ شاعری کے چیستان اور بکواس بن جانے کا تھا۔ پو اور لیر (Lear) نے اکثر بکواس کی ہے۔ لیر بکواس کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے رومانی ٹکنیک اُسے بالکل موزوں نظر آئی۔ ورڈسورتھ، کولرج اور شیلے بھی بکواس کے قریب قریب آجاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ الفاظ سے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ مفہوم پیدا کرنے میں ناکافی اور مبہم ہو جاتا ہے۔

ان کے علاوہ رومان پسندوں کے سامنے کچھ حدود و قیود بھی تھیں۔ جنہیں سامنے رکھ کر انھیں کام کرنا پڑا۔ اور اس وجہ سے وہ کافی کامیاب رہے۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ رومان پسندی کٹر مذہبیت کی منکر تھی۔ ہر شاعر کسی ایسے ماورائی نظم کا قائل تھا جو بالکل اُس کے اپنے دماغ کی اختراع تھی۔ انہوں نے روایات سے اس بُری طرح ناتہ توڑا تھا کہ پچھلی شاعری نے ماورائیت کو جس انداز میں برتا تھا اُسے بالکل نظر انداز کر گئے اور اس کی جگہ بالکل اپنے نظریات پیش کئے جو مذہب کے کٹر اصولوں سے مختلف تھے۔ اُن کی خیالی دُنیا بہت پُر اسرار تھی۔ یہ پُر اسراریت مذہب کے بجائے تخئیل کی پیداوار تھی۔

پھر رومان پسندوں کا نظریہ حُسن بھی محدود تھا۔ حُسن کا معیار اُن کے نزدیک یہ تھا کہ حسین شے کس حد تک انھیں متاثر کرتی ہے یہ معیار اس لحاظ سے خطرناک تھا کہ اس کی وجہ سے عین ممکن تھا کہ شاعر کی دُنیا دوسروں کی فہم سے بالاتر ہو جائے۔ رومان پسندوں کا خیال تھا کہ حُسن حقیقت کی آخری صفت ہے جو مظاہر سے آشکارا ہوتی ہے۔ اس کا دیکھنا اُن کا کام تھا۔ اور انھیں یقین تھا کہ وہ اُسے پہچانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُس سے مسحور ہوتے تھے۔

رومان پسندوں نے شاعری کو زندگی کے ایک محدود گوشے کے لئے وقف کر دیا۔ محض چند موضوعات پر اکتفا کر کے انہوں نے بہت سے ایسے موضوعات نظر انداز کر دیئے جن پر دوسروں نے بہتر ین نظمیں کہیں۔ مثلاً بائرن، جس نے انواع و اقسام کے موضوعات اختیار کئے۔ بائرن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُس نے زندگی کے بے شمار مظاہر میں سے ہر شے کو شاعری کا موضوع سمجھا۔ رومان پسندوں کے خلاف موجودہ احتجاج بڑی حد تک اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے حقیقت پسندانہ شاعری نہ کی۔ اپنی ذات میں گم ہو کر بعض مواقع پر رومان پسندوں کو عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ بہت سی عوامی باتیں چھوڑ گئے۔ جس سے عام لوگوں سے دُور ہو گئے۔ پھر بھی رومان پسندوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے زندگی کو یکسر نظر انداز کر دیا، صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اُن کا شمار ہومر اور شیکسپیئر جیسے آفاقی شعراء کی صف میں نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی وہ ڈرائیڈن اور پوپ کے مقابلہ میں عام زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔

ایک تیسری کمی رومان پسندوں کے یہاں خود اُن کے نظریۂ شاعری کی پیدا کردہ تھی۔ اس ساری تحریک کو پیدائشِ عجائبات کہا گیا ہے۔ درحقیقت تمام شاعری تحیّر اور اعجوبگی کی بنا پر زندہ رہتی ہے لیکن رومان پسندوں کے نزدیک، ان کا مطلب یہ تھا کہ شاعر ایک ایسی ہمدردی حاصل کرے جس کا ورڈسورتھ اور کولرج بچے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کولرج کہتا ہے:۔

"شاعر وہ ہے جو بچپن کی سادگیوں کو جوانی کی توانائیوں میں لے جائے۔ جو ایک ایسی روح کے ساتھ جسے عادات و اطوار نے دبایا نہ ہو اور رسم و رواج نے مسخ نہ کیا ہو۔ تمام اشیاء کے متعلق ایک بچے کی سادگی، تازگی اور تطہیر سے غور و فکر کرے۔"

اس نظریہ کو ورڈسورتھ نے جلا دی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنا نظریۂ عجائبات مُرتب کیا۔ تحیّر کی بدولت ورڈسورتھ کا خیال تھا کہ وہ خوف پیدا ہوتا ہے جو انسان کو فطرت کی پرستش پر مجبور کرتا ہے۔ اس اعتقاد نے رومان پسندوں کو عجیب و غریب چیزوں میں اپنے مظاہرِ تحیّر کی تلاش پر مجبور کیا۔ ان کی تمام کشش ان کی اعجوبگی میں ہے۔ عجیب و غریب چیزوں سے اس لئے کہ ان سے شاعری میں

...رت اور استعجاب پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کا اولین مقصد قرار پایا۔ اس کی وجہ سے انہوں نے لاک (Lock) کے میکانکی فلسفہ کو
...د کر دیا۔ اور اپنی مابعد الطبیعات کو ایسے نظریہ میں دریافت کیا جس میں دماغ حقیقت کی تخلیق کرتا ہے۔ رومان پسندوں کے
...متعلق یہ بات کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ ذہانت[1] کو بالکل غیر ضروری سمجھتے تھے اور خیال کو شاعری کے لئے زیادہ اہم نہ سمجھتے تھے
لیکن انھیں اس بات پر اصرار ضرور تھا کہ خیال تخیلی ہونا چاہیئے۔ مجرد نہیں اور اسے اشیاء کی تمام صفات پر محیط ہونا چاہیئے محض
...تمام ظاہری صفات پر نہیں۔

فلسفہ اور فطری سائنس کو رد کرنے کی بدولت رومان پسندوں نے شاعری کو اپنے دور کی ذہنی رو سے الگ کر دیا۔ غیر مرئی
...ردں اور تخیلی مکاشفات میں کوئی خاص فرق نہیں۔ عقل پر عدم اعتماد کی وجہ سے ان کے یہاں مستحکم خیالات کا فقدان ہو گیا۔
...رومان پسند بعض اوقات تخیل کی مدد سے بہت بلند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ذہن و دماغ کی مسلسل کاوش سے شاعری کو جو جلا
...تی ہے اس سے وہ محروم رہ گئے!

ان حدود و قیود کے اندر کام کر کے رومان پسند شاعری میں صرف تجربات اور مکاشفات ہی نہیں لائے بلکہ دوسری دنیا کا
...ایک خاکہ بھی لائے۔ وہ احساسات کے مقصود پر ایک اودی روشنی ڈالتے ہیں اور انھیں عجیب و غریب بنا دیتے ہیں۔ رومان
...پسند شاعری کا نچوڑ یہ ہے کہ ایک گزرتے ہوئے لمحہ کو پیش کرنے میں کبھی کبھی وہ ایک دوسری دنیا کے دروازے کھول دیتے
...ہیں۔ جو ان کے خیال میں ابدی اور لازوال حقیقت ہے!

(حلقۂ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

---

[1] شاعری میں ذہانت کو ضروری اور غیر ضروری سمجھنے کی بحث ہی اپنی جگہ عجیب و غریب ہے۔ اگر انگلستان میں اس ذہنیت
...کے شعراء گزرے ہیں کہ وہ "ذہانت" کے صرف و استعمال کو شاعری میں ضروری نہیں سمجھتے تھے تو یہ ایک عجیب بلکہ مضحکہ خیز
...انکشاف ہے۔ ذہانت، طباعی اور بلندیٔ فکر یہ تو شعر و ادب کے ایسے اجزاء ہیں جن کو کسی عنوان علیحدہ (منفک)
...نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا ذاتی قیاس یہ ہے کہ انگلستان کے شعراء تو ذہانت کے استعمال کو غیر ضروری ہرگز نہ سمجھتے ہوں گے۔
...یہ وہاں کے تنقید نگاروں کی نری اپج اور شوخیٔ فکر معلوم ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے ناقدین کو چاہیئے کہ وہ انگریز
...نقادوں کی ہر بات کو من و عن قبول کر کے کاغذ پر منتقل نہ کر دیں۔ بلکہ ان کی لغزشوں پر احتساب فرمائیں۔ یا کم سے کم
...ان کی "ادبی بدعتوں" سے بحث کر کے ان کے لئے سندِ جواز لائیں!

اس مقالہ میں اور بھی کہیں کہیں ابہام سا پیدا ہو گیا ہے۔ ہم اسلام پسند ناقدین کی خدمت میں خاص طور سے گزارش
کرنا چاہتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ مواد (Matter) اور معلومات سے کام لیں۔ مگر اظہار بیان میں حالی اور شبلی
...کا اسلوب و انداز اختیار کریں تا کہ جو بات ان کے قلم سے نکلے وہ جچی تلی، واضح اور سلجھی ہوئی ہو!

(م۔ق)

ماہرالقادری کے نام

ایک مکتوب!

ہمیں اس بات کا ہرگز دعویٰ نہیں ہے کہ ہم اتنے بے نفس ہو گئے ہیں کہ کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر ہم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ علماء، شاعروں اور ادیبوں کو شہرت کا جو چسکا ہوتا ہے، اُس کا کوئی ادنیٰ سا داعیہ بھی ہمارے اندر سرے سے نہیں رہا! ہم اپنے بارے میں نہ ایسا حسنِ ظن رکھتے ہیں اور نہ دوسروں کو کسی مغالطہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس اعتراف کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا بھی اظہار ضروری ہے کہ اُس نے ظرف میں اتنی گنجائش ضرور پیدا فرما دی ہے کہ اپنی تعریف و توصیف کی بڑی سے بڑی مبالغہ آرائی کو ہم ٹھنڈے دل سے ضبط کر سکتے ہیں اور مزاج اِترانے نہیں پاتا!

ہمارے مضامینِ نظم و نثر کی مدح و ستائش میں عوام ہی نے نہیں، کیسے کیسے خواص مشاہیر کے گرامی نامے ہمیں وصول ہوئے ہیں۔ مگر "فاران" کے صفحات پر اُن کا ذکر ہم نے نہیں کیا بلکہ اُن "منقبت ناموں" کو پڑھ کر چاک کر دیا کہ اُن کا محفوظ رکھنا نفس کے لئے ایک مستقل فتنہ بن جاتا!

یہ خط جو اس شمارے میں ہم شائع کر رہے ہیں، اس کی اشاعت افادۂ عام کے لئے ہم نے ضروری سمجھی۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہماری علمی بے مائگی اور تمام تر بے عملیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہماری تحریر کو اقامتِ دین، قبولِ حق اور اشاعتِ اخلاق کے لئے مفید بنا دیا ہے۔ دل و دماغ کو متاثر کرنا اور اُن کا بدلنا صرف اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ ہماری تحریروں نے اس سلسلہ میں جتنی بھی تھوڑی بہت خدمت انجام دی ہے۔ یہ سب اللہ تبارک تعالیٰ کے فضل کا ظہور ہے۔ وہ نہ چاہے تو دفتر کے دفتر پڑھ کر بھی کسی ایک دل کی گرہ نہیں کھل سکتی اور اس کے کرم کی تائید شامل ہو تو زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک حرف نفوذ و تاثیر کا اعجاز دکھا سکتا ہے!

ہمارے پاس اس طرح کے اور بھی خطوط آتے رہے ہیں کہ مسٹر پرویز کی کتابوں سے کچھ لوگوں نے اثر قبول کیا مگر حق پسند علماء کی کتابیں پڑھ کر یہ اثر زیادہ دیر تک جم نہ سکا۔ اور انشاء پردازی کا یہ طلسم ٹوٹ کر رہا۔ پاکستان کے سابق گورنر جنرل مسٹر غلام محمد مرحوم کے زمانہ میں دو ڈھائی سال تک پرویز صاحب کو خوب شہ ملتی رہی اور یہ اُن کی گمراہ تحریک کے شباب کا دور تھا۔ کیا طنطنے اور دعوے تھے، کیسے بڑے بول بولے جا رہے تھے۔ مگر اُدھر غلام محمد صاحب تختِ حکومت سے اُترے اور اِدھر پرویز صاحب کی جھوٹی عزت کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہونے لگے! یہ شخص جو علماء دین پر طرح طرح کی پھبتیاں چُست کرتا رہتا ہے خود اُس کے کردار کا یہ عالم ہے کہ مسٹر غلام محمد مرحوم کو "امیرالمومنین" بنانے کے لئے اُس نے اپنے قلم کا پورا زور صرف کر دیا۔ مگر "صاحب طلوعِ اسلام" نے اپنے "آقا" کے زوال کے ساتھ اپنی قسمت کے ستارے کا

غروب بھی بہت ہی جلد دیکھ لیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ "فتنۂ انکارِ حدیث" نے فضا میں جو تھوڑی سی دُھند پیدا کر دی تھی وہ تیزی کے ساتھ چھٹتی جا رہی ہے!

اس خط سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں بعض لوگوں نے جو طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں اُن کے دُور کرنے کی سب سے زیادہ مؤثر اور کارگر تدبیر یہ ہے کہ مولانا موصوف کی کتابوں کو عام کیا جائے کہ جو کوئی تلاشِ حق کی خاطر مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ لیتا ہے، پھر وہ کسی غلط فہمی میں مُبتلا نہیں رہتا اور اُس پر حق واضح ہو جاتا ہے! اس دَورِ انکار و معصیت میں مولانا مودودی کی تحریروں کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اُن سے متاثر ہو کر لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں اسلامی انقلاب پیدا ہوا ہے۔ مگر اُن نادانوں کو کیا کہیئے جو اتنے عظیم اسلامی مفکر اور داعی کو بدنام کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور اپنی اس غلط کاری پر اللہ سے اجر کی توقع بھی رکھتے ہیں! (ماہر القادری)

میرے محترم بزرگ ماہر القادری صاحب السلام علیکم!

میں آپ جیسے محسن کا شکریہ کیسے ادا کروں جس نے میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ شکریہ بہت بہت شکریہ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہوا جو رحمٰن رحیم ہے۔ وہ چاہے تو فرش نشین کو فلک نشین کر دے۔ وہ چاہے تو متقی کو گناہ گار کر دے اور گناہ گار کو متقی بنا دے۔ اس کی نوازشوں و عنایتوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ نہ معلوم اس کو میری کونسی نیکی اور کونسی ادا پسند آگئی جس نے مجھ جیسے بھٹکے ہوئے کو صراطِ مستقیم پر ڈال دیا۔ میری اصلاح آپ جیسے مصلح کے ذریعہ کرا دی۔

میرے لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ میرے دل و دماغ میں پشیمانی کا شدید طوفان برپا ہے۔ میری گزشتہ زندگی کس قدر گناہوں اور شرک سے آلودہ ہے۔ لیکن اب بھی اپنے ماضی کو یاد کر کے آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ باتوں کا جب خیال آجاتا ہے تو دل میں ایک ایسی بے چینی اور ایک ایسا اضطراب پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر اس کو کسی پہلو چین و سکون نہیں ملتا۔ خصوصاً اُن گستاخ الفاظوں کا جو آپ جیسے مصلح کی شان میں اور مفکرِ اعظم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے لئے اس گندی زبان سے نکلے ہیں۔ اب اللہ سے دعا اور توبہ کرتا ہوں اور یہ درخواست بھی کرتا ہوں کہ یا اللہ مجھے ان دونوں بزرگ ہستیوں سے ملا دے۔ تاکہ اُن سے عاجزی، انکساری کے ساتھ معافی مانگ لوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔ اس پُر آشوب زمانہ میں ایسی مومن ہستیاں مشکل سے ہی نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنا مقصد صرف اقامتِ دین بنا لیا ہو۔ اور خود سر دھڑ کی بازی بھی لگا دی ہو۔ دعا ہے کہ یا اللہ ان مومنوں کو جو اس نیرنگیٔ زمانہ اور انقلابِ دہر کا سرگرمی کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں، ظفریاب فرمائے!

میں نے پرویز کا کافی لٹریچر پڑھا ہے اور میں نے ان لوگوں کے بہت ہی نزدیک رہ کر تجربہ حاصل کیا ہے۔ یہ سب دُنیا پرست اور نفس پرست بنانے کے علاوہ کوئی دعوت نہیں دیتے۔ بزمِ قرآن وغیرہ سب دھوکا ہے۔ پہلے تو مجھے یہ نہیں بتایا کہ ہم منکرِ حدیث ہیں۔ رفتہ رفتہ صحبت کے اثر اور لٹریچر کے پڑھنے سے خیالات بدل گئے۔ وہ اس لئے ہوا کہ میں نے اس سے قبل کوئی دینی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ دین کی طرف سے بالکل صفر تھا۔ جو آج کل عام بات ہے کہ مسلمان باپ کے گھر پیدا ہو گئے لہٰذا مسلمان بن گئے۔ اس پرویز کی جماعت سے متاثر ہو کر آپ کا اور مولانا مودودی صاحب کا سخت مخالف بن گیا۔ وہ جو لکھتا اور کہتا میں صحیح سمجھ لیتا۔ پرویز ہر اتوار کی صبح آٹھ بجے اپنے مکان کے سامنے تقریر کرتا تھا اور میں ہر کام کو چھوڑ کر اُس کو سننے کے لئے ماری پور سے آتا تھا۔ ایک دن اُس نے مولانا مودودی صاحب کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے متعہ کو جائز قرار دے دیا ہے۔ یہ سُن کر اور زیادہ نفرت پیدا ہو گئی۔ اور آپ سے اس لئے

خلاف تھا کہ آپ مولانا مودودی صاحب کی جماعت اور تعلیم سے متاثر ہیں۔ اکثر "فاران" میں جماعتِ اسلامی کے متعلق مضامین دیکھے، اس لئے فاران کو نہ پڑھتا تھا!

حُسن اتفاق تو دیکھئے کہ ایک دن آپ ہی کی کتاب "کاروانِ حجاز" میرا ایک دوست بڑے جھوم جھوم کے پڑھ رہا تھا اور میں اُس کو سُن رہا تھا اس لئے کہ اس میں حج شریف کے واقعات تحریر تھے۔ اگر مصنف کا پتہ ہوتا تو شاید میں اس کو نہ سُنتا۔ جب اس نے یہ پڑھا کہ "مجھ سے معلم نے دریافت کیا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں تو میں نے بتایا کہ میں کیسیر کلاں ضلع بلند شہر یوپی کا رہنے والا ہوں" کیسیر کا نام سُن کر میں چونکا۔ تب میں نے دریافت کیا کہ اس کتاب کے لکھنے والے کون ہیں۔ اُس نے بتایا کہ ماہرالقادری صاحب ہیں۔ آپ کا نام سُن کر خاموش ہو گیا۔ غیر ارادی اور غیر دانستہ طور پر مُنہ سے یہ نکل گیا کہ خوب لکھا ہے۔ اس کو وطن کی محبت کہئیے یا صداقت کہئیے، یا حذاکی مصلحت کہئیے۔ کیونکہ آپ کے لئے اس دل میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان میں سے ایک نے اتنا کہنے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد اتنا بھی کہہ دیا کہ ماہرالقادری صاحب کو گمراہ کرنے والا مولانا مودودی ہے۔ اس لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا اور برابر پڑھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد لڑکا کتاب بند کر کے باہر چلا گیا۔ مگر واپس آتے وقت کتاب ساتھ لیتا آیا۔ گھر پر آکر میں نے کتاب کو شروع سے پڑھنا شروع کیا۔ دورانِ مطالعہ میں کئی جگہ دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے ایک جگہ تحریر کیا۔ "بھاولپور کے ایک جج صاحب بھی سفر کر رہے ہیں جو دوائیاں مفت تقسیم کرتے ہیں۔ دینی شغف رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی صاحب کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جو دیوبند کے علماء کے فتووں اور مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق کی تحریروں نے پھیلا رکھی ہیں۔ میں نے غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی تو بات بڑھنے لگی۔ میں نے آخر میں عرض کیا کہ آپ عالموں کے فتووں پر نہ جائیے اگر تحقیق مقصود ہے تو مولانا مودودی کی کتابیں پڑھئیے۔ اگر اُن میں آپ کو بے دینی کی باتیں نظر آئیں تو ان کتابوں کو بے تکلف جلا دیجئے اور اگر اُن میں دین کی باتیں ہوں تو پھر اپنی رائے بدل دیجئے ورنہ اس بدگمانی اور سوءِ ظن پر آپ سے خواہ مخواہ مواخذہ ہو گا۔"

یہ بات آپ نے کہی تو تھی جج صاحب کے لئے لیکن اصل میں یہ حق بات میرے دل پر اثر کر گئی اور میں نے یہ طے کر لیا کہ بغیر مولانا مودودی صاحب کی کتابیں پڑھے ہوئے اُن کے متعلق غلط رائے قائم کرنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ بات سچ تھی اس لئے تسلیم کرنی پڑی اور یہ طے کیا کہ مولانا مودودی صاحب کی کتابیں ضرور پڑھوں گا۔ یہ سب اللہ کی کرم فرمائیاں ہیں جس نے مجھ جیسے گناہ گار کو گمراہی کے راستے سے ہٹا کر راہِ راست پر ڈال دیا۔ مولانا صاحب کی کتابوں کی تلاش میں اُسی دوست کے پاس گیا۔ اس نے بتایا کہ مولانا صاحب کا لٹریچر پڑھنا جُرم ہے اس لئے میں چھپ کر پڑھتا ہوں۔ البتہ اس وقت میرے پاس صرف دو کتابیں ہیں۔ ایک تفہیمات۔ دُوسری دعوتِ اسلامی اور اس کا مطالبہ۔ تفہیمات کو بغور پڑھا۔ کئی جگہ ضمیر نے اپنے آپ کو ملامت کی اور دل بھر آیا۔ اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ جادو تو وہی جو سر پر چڑھ کر بولے۔ دل بے ساختہ پکار اُٹھا کہ واقعی مولانا مودودی ٹھیک کہتے ہیں۔ اور یہ بات اس لئے ٹھیک ہے کہ یہ بات خدا اور رسُول کی ہے۔ اب دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب کی یہ کتاب تفہیمات ایک طرف اور پرویز کا تمام لٹریچر ایک طرف۔ تب بھی تفہیمات کے برابر نہیں ہو سکتا۔ پرویز کی تصانیف۔ سلیم کے خطوط۔ انسان نے کیا سوچا۔ نظامِ ربوبیت وغیرہ وغیرہ قریب سَو روپے کا لٹریچر خریدا ہے۔ لیکن اب یہ سب میرے لئے بیکار ہے۔ اب اس کو جلا دینے کو جی چاہتا ہے۔

آج جمعہ کا دن ہے۔ نہا دھو کر کافی مدت کے بعد مسجد میں گیا۔ نماز پڑھی کیونکہ اب میرے دماغ میں عبادت کا مفہوم آ گیا ہے۔ کہ اصل عبادت اس کو کہتے ہیں۔ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد میں بیٹھا رہا۔ آج میرا دل مسجد میں ہی بیٹھے رہنے کو چاہتا تھا اور

ورو کر اللہ سے یہی دعا مانگی کہ یا اللہ میرے گزشتہ ۲۲ سال کے گناہوں کو معاف کردے۔ اور مجھ میں اقامتِ دین کے لئے توفیق عطا فرما۔
ور صحیح معنوں میں مسلمان بنادے۔ آج اللہ کے گھر سے جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ بار بار سر سجدے سے اٹھاتا تھا لیکن پھر پشیمانی کی
جہ سے سجدے میں گر جاتا تھا۔ روتا اور گڑگڑاتا کہ یا اللہ تو مجھے توفیق دے کہ میں دنیا میں تیرے نام کے بلند کرنے والوں کی جماعت
میں شامل ہو جاؤں۔ آمین ثمہ آمین۔

دو دن ہوگئے۔ لیکن آپ کا خط پوسٹ کرنے کا مطلق خیال نہ رہا۔ کیونکہ ان دنوں کافی مصروف رہا۔ رات میری بیوی رامپور سے
آئی ہیں۔ انہوں نے ابھی پوچھا کہ آپ یہ خط کس کو تحریر کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں یہ خط ماہر القادری صاحب کو تحریر کر رہا ہوں۔ بیوی
نے تعجب سے پوچھا کہ کس اعتراض پر خط تحریر کر رہے ہو۔ میں نے کہا یہ شکریہ کا خط تحریر کر رہا ہوں۔ "سبحان اللہ" کہہ کر پوچھا کہ آپ تو
پرویز کے دلدادہ ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اب میں مولانا مودودی صاحب کو حق پر سمجھتا ہوں۔ یہ حق ماہر القادری صاحب کی کتاب "کاروانِ
حجاز" کو پڑھ کر واضح ہوا ہے۔ اس لئے یہ شکریہ کا خط تحریر کر رہا ہوں۔ بیوی یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے بتایا کہ میں تو رامپور سے ہی
جماعت اسلامی سے متفق ہوں"...........!

آپ کا طالبِ خیر
عبد الوحید۔ سرگودھا

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولانا ظفر علی خاں مرحوم

پہلی جنگِ عظیم کا جب آغاز ہوا تو میرا بچپن تھا - اُس دور کے دو اخباروں کی یاد کے نقش اب تک دل پر باقی ہیں - ایک "سیارہ" جو بڑی دھوم اور طمطراق سے نکلا مگر انگریزی حکومت اُس کی بیباکی اور صاف گوئی کو چند ہفتہ بھی برداشت نہ کر سکی "سیارہ" کی اس نظم :-

اک جرمنی نے مجھ سے یہ پوچھا ازراہِ طنز .... بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم — اور اُس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں

نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی - دوسرا اخبار "زمیندار" تھا - جو ہمارے گاؤں میں انتہائی شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا - ہمارے پورے علاقہ میں اسی اخبار کی دھوم تھی کہ جنگ کی خبریں پہنچنے کا یہی اخبار واحد ذریعہ تھا - یوں سمجھئے کہ میرے شعور کا آغاز بھی پورے طور پر نہ ہوا تھا کہ "زمیندار" اور "ظفر علی خاں" کے نام سے کان آشنا ہو چکے تھے !

مکتب کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد اسکول میں جب میں داخل ہوا تو ساتویں جماعت کے اردو نصاب میں مولانا ظفر علی خاں کی دو نظمیں پڑھیں اور اتنی پسند آئیں کہ ازبر ہو گئیں - یہ نظمیں :-

(۱) ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی — تھی زمیں وردی ہری پہنے ہوئے بانات کی
(۲) اے نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا — توڑا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا

ایک طرف یہ "نقوش" دوسری طرف مولانا ظفر علی خاں کا نام اخباروں میں برابر چھپتا رہتا تھا - اور نہ صرف نام — اُن کی پُرجوش تقریریں، اُن کے دوروں اور جلوس و خیر مقدم کی تفصیلات اور اُن کے قید و بند کی خبریں بھی - غرض مولانا کی ذات سے بچپن میں جو لگاؤ پیدا ہوا تھا اُس کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا -

سنہ ۱۹۲۵ء میں میرا دہلی جانا ہوا - وہاں اخبار ہمدرد میں ایک غزل پڑھی - جس کا مقطع تھا :-

اُس کو آسکتا نہیں ہرگز بھی قوالی میں لطف
جس نے جوہر اور ظفر کی یہ غزل گائی نہ ہو

اس اعتبار سے یہ غزل اپنی آپ مثال تھی کہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم دونوں نے مل کر یہ غزل کہی تھی - انہی دنوں میں اخبارات میں اعلان پڑھا کہ مولانا ظفر علی خاں جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تقریر فرمائیں گے - مولانا مرحوم کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا - بہت سویرے جامع مسجد میں پہنچا کہ مکبّر کے آس پاس جگہ مل جائے اور وہ اس لئے کہ مکبّر کے

ب ہی سیڑھیوں پر مقررین جامع مسجد میں تقریر کیا کرتے تھے - لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد اُس وقت تک ہندوستان میں نہ آئی تھی - ہر شخص
کی آواز سننے کے لئے اسٹیج کی قربت چاہتا تھا -

اُن دنوں سہ روزہ "الامان" کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین مرحوم کا جامع مسجد کے نظم و نسق پر غلبہ تھا - اُن کے مسلک اور
روش کے مخالف لیڈروں کا جامع مسجد میں تقریر کرنا اور جلسہ کا کامیاب ہو جانا دشوار تھا - چنانچہ یہی ہوا کہ مولانا ظفر علی خاں
کرنے کھڑے ہوئے اور جلسہ میں شور مچ گیا - جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مولانا مرحوم نے سلطان ابن سعود کی حمایت میں کچھ کہا تھا
کے دو چار جملوں کے بعد ہی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ چپقلش اس نوبت تک پہنچی کہ مولانا مرحوم کو جامع مسجد کے ایک گوشہ میں
لینی پڑی !

دوسرے یا تیسرے دن روز نامہ "زمیندار" نظر سے گزرا - اُس میں اس جلسہ کی روداد عجیب انداز میں شائع ہوئی - عبارت
ے ذہن میں محفوظ نہیں رہی مگر مفہوم قریب قریب یہ تھا کہ جامع مسجد کے اس جلسہ میں مولانا ظفر علی خاں ہی کی فتح رہی اور جب وہ
سند دں کی ہنگامہ آرائی کے بعد جامع مسجد سے باہر آئے تو سیڑھیوں تک عقیدت مند دو رویہ صفوں میں کھڑے تھے - روز نامہ
ندار" میں اُس جلسہ کی جس کا میں خود عینی شاہد تھا - یہ روداد پڑھ کر مجھے زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ اس کا احساس ہوا کہ
ت اور صحافت کی دنیا میں ایسے شگوفے بھی چھوٹتے رہتے ہیں !

اس کے بعد (غالباً) ۱۹۳۱ء میں مولانا مرحوم کی حیدر آباد دکن میں زیارت نصیب ہوئی - یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں
ی کی تحریک خوب زوروں پر تھی - اور :-

"آزادی کے پروانے - بھر دو جیل خانے"

نقلابی نعروں سے ہندوستان کے در و دیوار گونج رہے تھے - مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے حیدر آباد دکن میں تشریف لانے اور ایک
منعقد ہونے کی اطلاع اخبارات میں شائع ہوئی - بلدہ حیدر آباد میں چوک کی مسجد کے قریب ہی ایک محلہ میں جلسہ کا انتظام تھا -
ے شوق کے ساتھ وہاں پہنچا - مگر اس جگہ پہنچکر کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک گلی میں دیوار کے سہارے کھڑے ہیں اور کچھ
ن اُن کے ارد گرد جمع ہیں - معلوم ہوا کہ شاہی فرمان کے ذریعہ جلسہ رکوا دیا گیا - اور مولانا کو بھی آج ہی بلدہ حیدر آباد چھوڑ دینے
ہوا ہے ! مجمع کی تعداد اب بڑھتی جا رہی تھی، لوگ جلسہ رہ کے جانے کی خبر سے کافی مشتعل تھے - نوجوانوں کا اصرار تھا کہ مولانا
لم کی خلاف ورزی فرمائیں اور یہاں گلی ہی میں تقریر کر ڈالیں - مگر مولانا نے حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں قانون شکنی کو مصلحتاً
نہیں فرمایا - انہوں نے اتنا کہا :-

"میں جانتا ہوں کہ ایسے "فرمان" کا اصل مرکز کہاں ہے اور کس کے
اشارے سے یہ نافذ ہوا کرتے ہیں "

اُن کا اشارہ ریزیڈنسی کی طرف تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں در اندازی کرتی رہتی تھی - مجھے خاصہ ملال ہوا کہ دہلی میں بھی مولانا کی
سننے کی حسرت جی کے جی ہی میں رہ گئی اور یہاں حیدر آباد میں ایک موقع میسّر ہوا تو عین وقت کے وقت جلسہ پر پابندی
گئی !

اُن دنوں ایک دیسی ریاست میں رہ کر کسی ایسے سیاسی لیڈر سے ملنا جلنا خطرے سے خالی نہ تھا - کہ جو سرکار انگریزی کا اس قدر
ب ہو کہ ریزیڈنسی نے اُس کے "ریاست بدر" کئے جانے کا فرمان تک جاری کرا دیا ہو - مگر اللہ کے فضل سے ایسے خطرات

کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ میں رات کو نام پلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا، مولانا کو "خدا حافظ" کہنے کے لئے۔ ہم کل بیس پچیس آدمی مولانا کی مشایعت کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ہم سب نے بڑی دل گرفتگی کے انداز میں مولانا کو رخصت کیا!

اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں اردو کانفرنس اور مشاعرہ تھا۔ میرے نام دعوت آئی۔ میری طبیعت اُن دنوں ناساز تھی۔ پھر رقمی شرائط بھی خاطر خواہ طے نہ ہو سکے۔ میں نے معذرت لکھ کر بھیجدی۔ مگر جلسے والوں نے اپنے ایک آدمی کو حیدر آباد میرے لانے کے لئے بھیج دیا اور ان صاحب نے شدید اصرار کیا کہ آپ کو چلنا پڑے گا۔ میں بیبا رہ گیا۔ بلدہ سے روانہ ہوا تو طبیعت خاصی مضمحل تھی مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ صبح سویرے کرشنا ندی کو پار کرتے ہی صوبہ مدراس کی سرحد جو آئی تو طبیعت خاصی شگفتہ ہو گئی۔ اسی ٹرین سے مولانا ظفر علی خاں مرحوم سفر کر رہے تھے۔ اردو کانفرنس کی صدارت کے لئے اُن کو تکلیف دی گئی تھی۔

مولانا مرحوم اور مجھے شہر مدراس کے محلہ ٹرپلیکین میں مولانا سلطان حسن بھمنی کے مکان پر ٹھہرایا گیا۔ یہ زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ مولانا کی قربت اور معیت مجھے نصیب ہوئی۔ اُس شاہین ادب و سیاست کے سامنے میری حیثیت ایک ممولے کی سی تھی۔ مگر اس "شتر گربگی" کے ذمہ دار جلسہ اور مشاعرے کے منتظمین تھے۔

شب میں کھانے کے بعد مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ یہ جو ہمارے میزبان "بھمنی" ہیں۔ اُن کی شان میں ایک آدھ شعر کیوں نہ ہو جائے؟ مگر شرط یہ ہے کہ قافیہ "بھمنی" رہے۔ میں کہنا چاہوں تو ہر وقت ارتجالاً شعر کہہ سکتا ہوں۔ "بھمنی" کے قافیہ کے لئے دوسرا قافیہ سوچ ہی رہا تھا کہ مولانا مرحوم نے حقہ میں کش لگاتے ہوئے ایک شعر برجستہ فرمایا اور "بھمنی" کے مقابلہ میں "دہ منی" قافیہ باندھا!

اردو کانفرنس کا افتتاح ہز ہائینس نواب صاحب بنگن پلی نے کیا۔ مولانا مرحوم نے پُر مغز اور پُر جوش صدارتی تقریر کی۔ میں نے نظم پڑھی، جس کا مطلع تھا:۔

موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اردو
طبعِ دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اردو

کانفرنس بہت کامیاب رہی مگر مشاعرہ اس سے بھی زیادہ کامیاب رہا۔

مولانا ظفر علی خاں کا سن اُس وقت ستر کے لگ بھگ تھا۔ مگر اُن کی مصروفیات کی ہماہمی ہم جیسے جوانوں کو شرماتی تھی صبح سویرے اٹھ کر وہ ٹھنڈے پانی سے غسل فرماتے۔ پھر نماز پڑھتے اور اس کے بعد ٹہلنے کے لئے نکل جاتے۔ صبح کا یہ گشت کئی کئی میل تک رہتا۔ چلتے اس قدر تیز تھے کہ اوسط رفتار والوں کو اُن کا ساتھ دینے کے لئے دوڑنا پڑتا۔ ٹہل کر واپس آتے ہی ناشتہ کرتے۔ خوراک جوانوں جیسی تھی۔ ایک دن ناشتہ کے وقت توس کو چھوتے ہوئے بولے:۔

"یہاں توس بھی ٹھکانے سے نہیں سینکے جاتے۔ کیا مدراس میں آگ بھی نہیں رہی"

ناشتہ کے بعد پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ ملنے والے آئے چلے جا رہے ہیں۔ ایک مل کر رخصت ہوا کہ دو اور آگئے۔ سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ مل رہے ہیں۔ سیاسیات پر بحث و مناظرہ تک کی نوبت آجاتی ہے۔ پھر اخبارات کے نمائندوں کی آمد شروع ہوئی۔ اُن کے سوالات کے جوابات دے رہے ہیں۔ ایک دن میں دو دو تین تین جگہ تقریریں! صبح ناشتہ کے بعد سے آدھی رات تک مسلسل مصروفیت۔ مگر اس پیر جواں عزم کے تیور تک میلے نہیں ہوتے تھے۔ ان مصروفیا

ڑا بہت وقت بچتا تو اُس میں اخبارات پڑھتے!

مدراس کے جلسوں، مشاعروں اور دعوتوں سے فارغ ہو کر ہم ویلور پہنچے۔ ویلور کے نام سے کان آشنا تھے۔ کہ سلطان
شہید کی شہادت کے بعد اُن کے لڑکے یہیں کے قلعہ میں رکھے گئے تھے۔ وہاں شب میں ایک جلسہ ہوا۔ مولانا مرحوم مسندِ
دارت پر فائز تھے۔ میں نظم پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا ہی تھا کہ کسی نے ایک پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پڑھا تو کلیجہ دھک
دھک کر رہ گیا۔ اُس میں لکھا تھا:۔

"میں نے ابھی ابھی ریڈیو سے سُنا ہے کہ فانی بدایونی کا انتقال ہو گیا۔"

اس خبر نے جلسہ میں افسردگی کی لہر دوڑا دی۔ میں نے اُس عالم میں تقریر کیا کی یوں سمجھیے کہ نثر میں فانی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا
خاں نے بھی اپنی تقریر میں اظہارِ غم فرمایا۔ مولانا مرحوم ویلور سے صوبہ مدراس کے کسی دوسرے شہر میں تشریف لے گئے
میں بنگلور پہنچا۔ تین چار دن کے بعد مولانا بھی بنگلور آ گئے۔ اور حُسنِ اتفاق کہ میں جن صاحب (عبدالغفور صاحب مودی)
کے بنگلہ میں ٹھہرا تھا۔ اُسی میں مولانا نے قیام فرمایا۔ اور کئی دن تک اُن کا ساتھ رہا۔

ہاں ایک بات تو رہی جاتی ہے۔ مدراس اور ویلور کے لوگوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ آؤ بھگت کی۔ اُن کے یہاں کی دعوتوں
کے کھانے بھی متنوع اور لذیذ ہوتے تھے۔ مگر ذائقہ کے اختلاف کو کیا کیجیے کہ زبان کسی اور چٹخارہ کا مطالبہ کرنے لگی۔ میں نے
میں مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ اگر پسند فرمائیں تو دال آپ کے مُلازم سے پکوانے کا بندوبست کیا جائے۔ مولانا نے
خوشدلی کے ساتھ میری رائے سے اتفاق کیا گویا میں نے اُن کے دل کی بات اپنی زبان سے کہہ دی۔ میں نے اپنے میزبان
سے کہا کہ آج دوپہر کے کھانے میں جو آپ کا مزاج چاہے تیار کرائیں مگر دال مولانا کا ملازم پکائے گا۔ آپ جنس لا کر
دے دیں۔ اُن صاحب نے اُس وقت تو شرماحضوری ہامی بھر لی مگر جنس لا کر نہ دی۔ غالباً انہوں نے اس میں اپنی سُبکی محسوس
کی کہ اُن کے یہاں کی دعوت میں کسی مہمان کا ملازم کوئی سالن پکائے۔ دوپہر کو دسترخوان پر کھانا چُنا گیا تو ایک بڑے
سے ڈونگے/رکابیہ میں دال بھی آئی۔ جس پر کئی کئی اُنگل گھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ جو انیونی کا قصہ بچپن میں سُنا کرتے تھے:۔

"اِدھر گھی اُدھر گھی، گھبرایا میرا جی۔"

تو اسی طرح کا سابقہ ہمیں بھی پیش آ رہا تھا۔ میں نے مولانا کو دیکھا اور انہوں نے مجھے۔ اور دونوں اپنی اس بے بسی
پر مسکرا کر رہ گئے!

بنگلور کے بعد ناگپور میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ اُن کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ اور
پٹھانوں کے دستہ کی سلامی کا منظر۔ وہ پنڈال میں مولانا کی صدارتی تقریر۔ ایک ایک بات حافظہ میں آج تک محفوظ ہے!
مسلم لیگ کا اجلاس ختم ہونے کے بعد گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے مولانا لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ اُن کے جانے کے کوئی دو گھنٹے کے
بعد یہ وحشت اثر خبر ملی کہ گرانڈ ایکسپریس ناگپور سے کچھ دور پہنچ کر اُلٹ گئی۔ میں ناگپور میں نواب محی الدین علی خاں مرحوم کے یہاں مہمان

سی پی کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے۔ انتہائی رنگین مزاج اور تفریح پسند۔ دہلی آتے تو "اربابِ نشاط" کے نصیبے جاگ اُٹھتے۔ ہزاروں نہیں
لاکھوں روپیہ خرچ کر کے گھر کو لَوٹتے۔ صوبہ متوسط (مدھیہ پردیش) میں اُن کی زمینداری کا علاقہ شیر کے شکار کیلئے مشہور تھا۔ بڑے اچھے قدر انداز
تھے۔ بیسیوں شیر شکار کئے۔ ناگپور میں کوئی مذہبی اور سیاسی جلسہ اور بڑا مشاعرہ ایسا نہ ہوتا جس میں نواب صاحب مرحوم دل کھول کر مالی معاونت

تھا - اس خبر کے سنتے ہی وہ اپنی موٹر کار میں مجھے لے کر دوڑے - راستہ میں نواب صدیق علی خاں اور مسلم لیگ کے دوسرے کارکن بھی ساتھ ہو لئے - ناگپور کی سڑک پر موٹروں، تانگوں اور سائیکلوں کا تانتا بندھا تھا - ایمبولینس گاڑیاں تیزی کے ساتھ جا رہی تھیں - ہم آدھ گھنٹہ میں موقعہ واردات پر پہنچ گئے - عجب منظر دیکھا - ریل کی پٹری جگہ جگہ سے بل کھا کر مڑ گئی تھی - پوری ٹرین ایک طرف کو جھکی ہوئی کھڑی تھی - حادثہ انتہائی ہولناک تھا - ٹرین کو الٹ جانا چاہیئے تھا مگر ساری بلا انجن سے جڑے ہوئے آموں کے ڈبہ پر آ کر رہ گئی - جانی نقصان ذرا سا بھی نہیں ہوا - بس ایک مسافر کے پہونچے میں بہت ہی معمولی چوٹ آئی - اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی اس شان کو بھی دکھا دیا کہ ہلاکت و تباہی کے بالکل کنارے پر پہنچا کر وہ بچا بھی سکتا ہے - ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر -

مولانا ظفر علی خاں اپنی نیلی قمیص پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے کھیت میں کھڑے تھے - ہم انھیں لے کر شہر آ گئے - دوسرے یا تیسرے دن کی گاڑی سے وہ لاہور روانہ ہوئے - اسی ٹرین سے حیدر آباد دکن کی سب سے بڑی پائیگاہ کے والی نواب معین الدولہ بہادر کی صاحبزادی بھوپال جا رہی تھیں - سرخ رنگ کا ساچوڑا پاجامہ اور کوٹ - سر کا جوڑا بندھا ہوا - مگر انداز میں مردانہ پن ! مولانا مرحوم نے برجستہ فرمایا :-

آسماں جاہ کی یہ پوتی ہیں

انقلابات ہیں زمانے کے !

ناگپور کے بعد مولانا سے ملاقات بمبئی میں ہوئی - کرافٹ مارکیٹ کے قریب شاہ جہاں ہوٹل میں قیام تھا - اپنے پوتے منصور علی خاں کی شادی کے سلسلہ میں حیدر آباد دکن جا رہے تھے - بڑے تپاک سے ملے اور معانقہ فرمایا - آخری بار میں نے انھیں سنہ ۱۹۵۰ء میں دیکھا - لاہور میں اسلام پسند طلباء نے ایک مشاعرے کا انتظام کیا تھا - مولانا مرحوم صدر مشاعرہ تھے - انھیں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ بڑھاپے کے آثار اعضاء پر ہی نہیں آواز اور ہوش و حواس تک پر طاری ہو چکے ہیں - ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا اسے دیکھ کر شعر پڑھ رہے تھے - اور ہاتھ تھر تھر کانپتا جاتا تھا - بس اس کے بعد پھر ملنا نہیں ہوا - یہاں تک کہ ان کے مرنے کی خبر سننی پڑی -

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام !

مولانا ظفر علی خاں مرحوم اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کے گریجوایٹ تھے - یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں بی اے خال خال ہی ہوتے تھے - اسی امتیاز اور علمی اعزاز کے سبب ان کے نام کے ساتھ برسوں تک "بی اے" لکھا جاتا رہا - علی گڑھ کالج کے وہ نہایت ذہین اور مقبول طالب علم تھے - ریاست حیدر آباد دکن سے کئی سال تک ملازمت کا تعلق رہا - یہ وہ دور تھا کہ حکومت دکن کے اہم محکموں پر انگریز افسر چھائے ہوئے تھے - مولانا مرحوم نے آزاد فطرت پائی تھی - طبیعت میں جوش تھا اور باطل سے الجھنے بلکہ ٹکر لینے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتے تھے - دکن میں وہ اس پارٹی کے سرگرم کارکن بن گئے جو انگریز افسروں کے اثر و اقتدار کو ختم کر دینا چاہتی تھی - واکر نام کا ایک انگریز ان دنوں ریاست حیدر آباد میں فینانس منسٹر تھا - اس ظالم نے لوٹ مچا رکھی تھی - دکن کے بڑے بڑے امراء اس سے دبتے تھے - مولانا ظفر علی خاں کی طبع خود دار اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکی - انہوں نے ایک نظم (واکر نامہ) کہی جو اس قدر مقبول اور مشہور ہوئی کہ اس کی ایک ایک کاپی جس کی اصل قیمت آنہ دو آنہ تھی ایک ایک روپے میں بکی - حکومت نے اس نظم کو ضبط کر لیا مگر لوگ چھپا چھپا کر اس کی نقلیں ایک دوسرے کے پاس بھیجتے تھے - میں جب سب سے پہلے حیدر آباد دکن گیا ہوں تو مولانا ظفر علی خاں مرحوم کو حیدر آباد چھوڑے ہوئے تقریباً اٹھارہ سال ہو چکے تھے مگر اس وقت بھی اس نظم کا چرچا تھا - تین شعر :-

نہ بنگائیے سے بالکل ڈر نہ مدراسی کی پروا کر — مگر سجدے میں جھٹ گر جا نظر آ جائے گر واکر

یہ کہہ دو ماہر الدولہ[1] سے تم تو نشتر عاری ہو   پلٹوں میں کر چکا ہے نظم[2] کو زیر و زبر واکر
پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت   اک اینگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتر واکر

دیسی ریاستوں کو تو انگریز افسر اپنی چراگاہ سمجھتے تھے۔ ظفر علی خاں جیسے آزاد فطرت، حق گو اور انگریز دشمن انسان کو وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کا شاہی فرمان کے ذریعہ ریاست سے اخراج عمل میں آیا!

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں آزادی کا جذبہ مسز اینی بیسنٹ کی تحریک "ہوم رول" سے بہت آگے پہنچ چکا تھا۔ گوکھلے اور تلک کی قیادت کا ہر طرف شہرہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے نہایت جوشیلی آزاد طبیعت پائی تھی۔ حیدر آباد دکن میں انگریز افسروں کے جابرانہ طرز عمل نے اُن میں غلامی کے خلاف اور زیادہ اُکساہٹ پیدا کر دی۔ پنجاب آکر اپنے والد کے نکالے ہوئے ہفتہ وار "زمیندار" کو روزنامہ کیا اور تھوڑی سی مدت میں اپنے قلم کے زور سے "زمیندار" جیسے فرسودہ اور نامقبول نام کے اخبار کو مقبول بنا دیا۔ اسی نقطہ سے اُن کی لیڈری کا آغاز ہوا۔

خلافت اور کانگرس کی تحریکوں کے صفِ اول کے قائدین میں مولانا مرحوم کا شمار ہوتا تھا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمتہ اللہ علیہ کے بعد بس انہی کا نام لیا جاتا تھا۔ نہ جانے کتنی بار آزادی کے جرم میں قید و بند کی سزا سے دوچار ہوئے۔ سب سے پہلی بار رینیسے چھوٹ کر جب دلی آئے تو عوام نے اس قدر پُرجوش استقبال کیا کہ مولانا کی اس ہر دلعزیزی سے انگریزی حکومت کو تشویش پیدا ہو گئی۔ نہرو رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد علی برادران تو کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔ مگر غالباً مولانا مرحوم کئی سال تک کانگرس کے ساتھ رہے۔ مگر جب ہندو ذہنیت کھُل کر سامنے آگئی تو انہوں نے کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر انہوں نے صرف کانگرس کو چھوڑا تھا۔ آزادی کی جدوجہد اور انگریز دشمنی میں کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے پیچھے نہ تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک جب شباب پر آئی تو مولانا پر بڑھاپا آگیا!

شریف حسین اور سلطان ابن سعود کے مابین کشمکش کیا باقاعدہ جنگ ہوئی تو مولانا نے سلطان ابن سعود کی پُرجوش حمایت کی۔ امیر امان اللہ خاں کی ذات سے اُن کو محبت نہیں عقیدت سی تھی۔ امان اللہ خاں کی حمایت اور نادر خاں کی مخالفت میں انہوں نے اپنے قلم و زبان کا پورا زور صرف کر دیا۔ اُن کی اُس زمانہ کی ایک نظم کا یہ مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے ع

درس غداری کا لینا ہے تو نادر خاں سے لے

کانگرس سے علیحدہ ہونے کے بعد نہ جانے کتنی تحریکیں شروع کیں اور کتنے مختلف محاذوں کو اپنے جذبات اور خیالات کی جولاں گاہ بنایا۔ عزم اور حوصلہ کا یہ عالم کہ نیلی پوشوں کی چھوٹی موٹی فوج بنا کر کھڑی کر دی!

اُردو صحافت میں مولانا مرحوم امامت کا درجہ رکھتے تھے۔ "زمیندار" نے صحافت اور قربانی دونوں چیزیں ملک کو سکھائیں اور عوام نے بھی ہر نازک موقع پر "زمیندار" کی دل کھول کر مدد کی۔

"ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ــــ رجعتِ قہقری ــــ نعرہ ہائے فلک شگاف"

اس قسم کی نہ جانے کتنی ترکیبیں صحافت کو "زمیندار" اخبار نے دی ہیں۔

---

[1] یہ محکمۂ فوج کے غالباً معتمد تھے۔ [2] ریاست دکن میں باقاعدہ فوج (Regular force) کے علاوہ "فوج بے قاعدہ" بھی تھی جس کا تعلق محکمہ "نظم جمعیت" سے تھا۔

ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Religion and Science) کا اردو ترجمہ ــــ
(معرکۂ مذہب و سائنس) اپنی جگہ زبان و بیان کا شاہکار ہے۔ مولانا مرحوم نے اُس زمانہ میں یہ ترجمہ کیا ہے جب کہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی ترجمہ کی
ہوئی کتابوں "تمدّنِ ہند" اور "تمدّنِ عرب" کے علاوہ کسی اور اچھے ترجمہ کا نمونہ اُردو زبان و ادب میں نہیں تھا۔ اس کتاب میں فلسفہ، ریاضی
تاریخ، علمِ کلام، فنِ تعمیر کی اصطلاحات جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مولانا نے ان کو جس خوبی سے اُردو کا قالب عطا کیا ہے وہ حقیقت میں ترجمہ
کا معجزہ ہے۔ اس کتاب پر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ بھی بڑے معرکہ کا ہے۔

مولانا مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُردو زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اُن کی تقریر اور گفتگو سُن کر اور ان کی نظم و نثر کو پڑھ کر کوئی اس کا
گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہ شخص پنجاب کی کسی کرم آباد نام کی بستی میں پیدا ہوا ہے۔ یوپی کی زبان ہی نہیں لہجہ تک کو انہوں نے اپنے اندر جذب کر لیا
اور وہاں کے ماحول سے جو کچھ سیکھا اُس کے وہ آخر دم تک قدر شناس اور معترف رہے!

شعر گوئی پر وہ قدرت کہ ذرا پلک جھپکائی اور شعر ڈھلا ڈھلایا تیار! قوافی کے تو وہ بادشاہ تھے مگر شعر و ادب کی یہ ٹریجڈی ہے
کہ صحافت و سیاست کی مصروفیات کے سبب وہ شاعری کو خاطر خواہ وقت نہ دے سکے۔ شاعری فرصت چاہتی ہے، غور و فکر چاہتی ہے
اس کے لئے مولانا مرحوم وقت کہاں سے لاتے۔ رفتہ رفتہ وہ خود چلتے ہوئے موضوعات پر زود گوئی کے عادی ہو گئے۔ اُن کے کلام میں جہاں:-

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول ... تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ بتولؑ!

جیسے غیر فانی شعر ملتے ہیں وہاں:-

"دھڑ دھڑ گڑا" ۔ اور "لشکر نیلی پوشوں کا، بھئی لشکر نیلی پوشوں کا"

جیسی سطحی نظمیں بھی پائی جاتی ہیں۔

مولانا مرحوم اُردو زبان کے خاصے اچھے مُقرر تھے۔ تقریر کرتے میں جوش میں آتے تو چہرہ تمتمانے لگتا۔ لباس سادہ پہنتے تھے۔ حقہ کا
شوق بلکہ لت کہ اُن کے نوکر کو چلتی ریل میں چلم بھرنی پڑتی۔ دین کے معاملہ میں بڑے غیرت مند اور حساس واقع ہوئے تھے۔ دین پر ذرا سی طنز بھی
کوئی کرتا تو آگ بگولا ہو جاتے۔ زمانہ کے بہت کچھ سرد و گرم دیکھے تھے۔ اپنی لیڈری کا چڑھاؤ بھی دیکھا اور اُس کا اُتار بھی!

عشقِ رسولؐ اُن کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ حضور خاتم النبیینؐ کے در کی غلامی ہی پر مرحوم نے ہمیشہ فخر کیا اور اسی مقدّس
نسبت کو سینہ سے لگائے رہے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا سب سے بڑا دینی کارنامہ "قادیانیت" کے خلاف اُن کا قلمی جہاد ہے۔ قادیان کے اس
جُھوٹے نبی اور اُس کے بیٹے مرزا بشیر محمود کو انہوں نے اپنی نظموں میں ننگا کر کے چوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔ قادیانیت کے خلاف اُن کی ایک
ایک نظم اُن کیلئے سندِ شفاعت اور مغفرت کا پروانہ ہے۔

مولانا نے بہت بڑی عمر پائی ۔ نوّے سال کے لگ بھگ! مگر آخر؟ فنا ......!

بہت سا رویئے اُن پر جو اس جینے پہ مرتے ہیں

زندگی کو کوئی وہم و خواب اور حکایت و افسانہ سمجھ لے تو سمجھ لے مگر موت کی واقعیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جس نے اس
زندگی ہی کو سب کچھ سمجھا اور آخرت کیلئے کچھ نہ کیا، وہ بڑے گھاٹے میں رہا۔ مشاہیر کی موت کی خبریں سُن کر بھی کسی کو عبرت نہ ہو تو ایسے غفلت
زدہ قلب کی بے حسی سے اللہ تعالیٰ کی ہزار بار پناہ!

جانے والے تجھے اعلیٰ علیین میں اُن نفوسِ قدسیہ کا قرب نصیب ہو جن کو قرآن میں "انعمت علیھم" کہا گیا ہے
اگر ارواح کو بارگاہِ احدیت میں عرض معروض کرنے کی اجازت ہو تو عرض کرنا ــــ اے معبود! دُنیا کے پردے پر تیرے

مجیب بنی کی امت ہی کو سب سے زیادہ پراگندہ اور پریشان روزگار چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہزار بداعمالیوں کے باوجود آج ساری دنیا میں کوئی قوم تجھ سے، تیرے نبیؐ سے، تیرے بھیجے ہوئے قرآن سے نسبت رکھتی ہے۔ تو وہ یہی مصیبت زدہ ملت ہے۔ چاروں طرف سے "ابرہوں" نے اس ملت پر ہجوم کر رکھا ہے۔ تیرے غضب کی ابابیلیں آخر کب آئیں گی۔ اور باطل کی قوتیں کس دن پاش پاش ہوں گی۔ وقت وہ آن پڑا ہے کہ سجدہ وجبین تک "متیٰ نصر اللہ" پکار رہی ہیں۔ مالک! اپنی نصرت جلد نازل فرما! بہت جلد! (آمین)

فریب وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے

وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اُجالا ہے

(نازش حیدری)

فضا ابنِ فیضی

ابرِ کرم

انسان ہے فطرت کی کریمی کا گلہ مند
نادان سمجھتا ہے کہ یہ بحر ہے پایاب

"توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے"
ذرّہ ہو کہ خورشید ستارہ ہو کہ مہتاب

بلبل کو چمن زار، پتنگوں کے لئے شمع
دریا کو صدف اور صدف کو گہرِ ناب

سوسن کو زباں، دیدۂ نرگس کو تحیّر
لالہ کو بھی بخشا گیا اک داغِ جگر تاب

یہ لطف و کرم دیکھ! کہ شبنم سے چمن میں
ہیں پھول جو سیراب تو کانٹے بھی ہیں سیراب

کرن نے کہا

سورج کی اک نازک کرن
تعبیرِ الماس و گہر
صبحِ ازل کی آبرو!
آئینہ طینت، شمع رُو
پہلوئے شبنم کی خلش
جس کی نگاہِ دلبری
وارفتۂ احساسِ ضو
جس کے تجسّس میں رہی
اُتری افق سے خاک پر
گویا ہوئی یوں پھول سے
تُو صبح کی ہے آرزو
پندارِ شبنم تجھ سے ہے
شاخِ سمن کا تاج ہے
مُشکیں نفس، رنگیں نظر
اے خاتمِ نزہت نگیں
آزاد ہے نکہت تری

گُل چہرہ و گُل پیرہن
شائستہ ذوقِ نظر
پھولوں کی معصوم آرزو
شعلہ صفت، کافور خُو
پروردۂ سوز و تپش!
پیرایۂ رامش گری!
تنویرِ شبنم جس کی لو
شبنم کی نا آسودگی!
لے کر نگاہِ دیدہ ور
اے میری جاں صدقے ترے
گلشن کو تیری جستجو
نکہت مجسّم تجھ سے ہے
تُو خاک کی معراج ہے
تُو فخرِ شب، نازِ سحر
لیکن بہ ایں طرزِ حسیں
پابند ہے فطرت تری

اے شاہکارِ رنگ و بو
اک بے سبب آزردگی
ہیں کس لئے تیرے قدم
کیوں ہے متاعِ رائیگاں
تُو خاک سے برپا ہوا
ناپے مری پرواز نے
تیری نزاکت بارہا
بن ایک "فردوسِ رواں"
کس دام میں ہے قید تُو
یہ دامِ رنگیں توڑ دے
قائم ہیں ہمت کے علَم
فکرِ بلندی شرط ہے
یہ کائناتِ گلستاں
قیدِ مقامی سے نکل

خالی ہے کیوں تیرا سبو
کیوں ہے شریکِ زندگی
نا آشنائے ذوقِ رم
تیرا جمالِ زرفشاں
اور خاک پیما ہی رہا
عرش و زمیں کے فاصلے
تجھ سے ہوئی گرمِ نوا
اے "جلوۂ خاک آشیاں"۔
صیاد ہے یا صید تُو
ماحول کا رُخ موڑ دے
صحرا بہ صحرا، یم بہ یم
عرفانِ ہستی شرط ہے
ہیں اس سے آگے بھی جہاں
ہاں اس غلامی سے نکل

نکہت سے لے کر بال و پر
اُٹھ اور ہو گرمِ سفر

زکی زاکانی

۱۹۵۷ء

مرا پرستار ایک عالم مرا ہوا خواہ اک زمانہ　　زمیں کے سینے میں یادمیری فلک کے لب پر مرا فسانہ

اگرچہ بزمِ جہاں میں میری نمود ہوتی ہے سو برس میں　　ہر ایک دورِ فلک سے لیکن مرا تعارف ہے غائبانہ

مری فضاؤں کے پیچ و خم میں ہیں ضَوفگن کچھ نئے ستارے　　مری نواؤں کے زیر و بم سے ہے تیز تر گردشِ زمانہ

مرے تہوّر سے ٹوٹ جاتے ہیں حوصلے اہلِ بتکدہ کے　　مرے تصوّر سے کانپ اُٹھتا ہے زندگی کا نگارخانہ

مرے خیالوں میں رقص فرما ہیں جنتِ بیخودی کی حُوریں　　مری نگاہوں میں موجزن ہے شباب کا بحرِ بیکرانہ

میں یم بہ یم ہوں میں جو بجو ہوں میں تیز رَو ہوں میں تُند خو ہوں　　جمال میرا ہے دلبرانہ مزاج میرا ہے قاہرانہ

کہیں میں بزمِ جہاں میں آتا ہوں لیکے آزادیوں کے تحفے　　کہیں میں اہلِ جہاں کے حق میں ہوں ایک عبرت کا تازیانہ

میں انقلابِ جہاں میں پاتا ہوں رازِ تعمیرِ زندگی کا　　میں خرمنِ زندگی کا آکر بکھیر دیتا ہوں دانہ دانہ

خبر کرو شہرِ بیخودی میں کہ جلد ہوں جمع پینے والے　　مری سحر کی لطافتوں سے ٹپک رہی ہے مئے شبانہ

مجھے کسی سے نہیں محبت مجھے نہیں ہے کسی سے رغبت　　میں اُس کا دمساز و ہمنوا ہوں طریق جس کا ہے غازیانہ

ہر ایک شے پر جہاں کی پڑتی ہے طائرانہ نگاہ میری　　ہر ایک منزل سے زندگی کی گزر رہا ہے مرا مُسافرانہ

میں آرہا ہوں میں آرہا ہوں جہاں میں سیلِ رواں کی صورت　　میں بڑھ رہا ہوں میں بڑھ رہا ہوں رہِ طلب میں مجاہدانہ

خزاں میں آسودگی ہے مجھ کو نہ چین مجھ کو بہار میں ہے

میں اُس کی خاطر تڑپ رہا ہوں جو دل مرے انتظار میں ہے

حکمت و عبرت

(مولانا عبدالمجید خاں افضل جے پوری)

کل اک اپنے شاگردِ بالغ نظر سے — اک استادِ کامل نے شفقت سے پوچھا
زمانے میں ہے تلخ تر سب سے کیا شئے — ادب سے جواباً ہوا یوں وہ گویا
کہ چکھنے کی چیزوں میں حنظل سے کڑوی — نہ کوئی غذا ہے، نہ سبزی نہ میوا[1]
جو محسوس کو لیجئے، مرگِ غربت — ہے، ہر تلخ سے تلخ تر کچھ زیادا[2]
جو معقول کو لیجئے تو عیاناً! — جہالت ہے تلخی میں بس فرد و یکتا
بیاں ہو چکا ختم شاگرد کا جب — تو اُستاد نے طنز سے سر ہلایا
اور اک آہِ دلدوز باچشمِ پُرنم — کچھ اس طرح کھینچی کہ بس دل بھر آیا
دُعا دے کے تلمیذِ معصوم دل کو — زباں پر حکیمانہ یہ نکتہ لایا!

زنِ غیر صالح سے دونوں جہاں ہیں
نہیں کوئی شے تلخ تر ربِّ حاشا!

دُو شعر

ماہر القادری

مہ و انجم کو ہم آواز کیا جاتا ہے — جب کہیں نغمہ کا آغاز کیا جاتا ہے
عشق ایسے بھی مراحل سے گزرتا ہے جہاں — حُسن کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے

عارف سنبھلی نے محسوس کیا:-

وہاں ضرور دلوں کا سکون لُٹتا ہے — جہاں لطیف اشارے فریب دیتے ہیں
مسافرانِ رہِ شوق باخبر رہنا! — قدم قدم پہ نظارے فریب دیتے ہیں

نہ اعتماد کرے ناخدا خدا کے لئے
کبھی کبھی یہ کنارے فریب دیتے ہیں

[1] میوہ ۔ [2] زیادہ

سکین قریشی

دو غزلیں

عزمِ طلب سے پہلے اے دل، پیدا کر وہ جذبۂ کامل
نام ہے مستی بدمستی کا، کون ہوا ایسی بزم میں شامل

علم و عمل کی یہ کوتاہی، قلب و نظر کی یہ گمراہی
جوشِ طلب میں ہمسفروں کی ہوگی تمنّا جن کو ہوگی

شغلِ جنوں اور صحرا صحرا، کس نے دیکھا کس نے جانا
ہو تو رہی ہے قافلہ سازی، خیر ہو یارب دشت و چمن کی

جب سے وہ دامن چھوٹ گیا ہے، دل کچھ ایسا ٹوٹ گیا ہے
اُن کی خوشی ہے جو وہ چاہیں، راز رکھیں، افسانہ بنائیں

گردشِ جام و شورشِ مستی، ساتھ کے پینے والوں تک تھی
شور ہو جس کا طوفاں طوفاں، ذکر ہو جس کا ساحل ساحل

ایک ذرا پیمانہ چھلکا، ٹوٹ پڑی محفل کی محفل
آج کا انساں، توبہ توبہ! کتنا ہے انجام سے غافل

ہم تو ہیں لیکن اس کے قائل، اپنی راہیں اپنی منزل
بات تو جب ہے ذکر ہو تیرا، گلشن گلشن، محفل محفل!

اور پھر ایسا قافلہ جس میں، سب کے سب ہیں رہبر منزل
اشک ہیں لیکن خشک ہیں آنکھیں، غم ہے مگر احساس ہے مشکل

آج نگاہِ شوق نے اُن سے کہہ تو دیا ہے حالِ غمِ دل
لاکھ ہو ذوقِ بادہ پرستی! غیر کی محفل، غیر کی محفل!

راہروانِ کوئے محبت، کیوں نہ رکھیں تسکیںؔ سے عقیدت
ہے تو یہ اک دیوانہ لیکن، اس کی نظر ہے منزل منزل

(۲)

مرحبا، بے خودیٔ روزافزوں!
نغمۂ زندگی و سازِ جنوں!

موت افسانہ، زندگی افسوں!
مجھ کو سمجھا گیا، یہ دورِ جنوں

عشق میں تازگی نہیں آتی
کیوں کہوں قصۂ غمِ دوراں

کیا بدلنے کو ہے فضائے چمن
حُسن ہی حُسن ہے جہاں میں ہوں

اب سکوں ہے نہ آرزوئے سکوں
اللہ اللہ مقامِ جذب و جنوں

زندگی، موت ہے اگر ہو، سکوں
ہو نہ جب تک ہر آرزو کا خوں

کیوں نہ ذکرِ جمالِ یار کروں
بڑھ چلی ہے رگوں میں گرمیٔ خوں

زندگی مرگِ ناتمام ہے آج
نہ تمنا نہ جستجو نہ سکوں

روحِ انتخاب

هُوَ الَّذِیٓ اَنزَلَ عَلَیکَ الکِتٰبَ مِنہُ اٰیٰتٌ مُّحکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِھِم

وہی خدا ہے جس نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے اس میں دو طرح کی آیات ہیں ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری

زَیغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَہَ مِنہُ ابتِغَآءَ الفِتنَۃِ وَابتِغَآءَ تَاوِیلِہٖ ج وَمَا یَعلَمُ تَاوِیلَہٗٓ اِلَّا اللہُ !

متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنہ کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ اُن کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (آلِ عمران)

محکم پکّی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ "آیاتِ محکمات" سے مراد وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنی مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں۔ جنہیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات "کتاب کی اصل بنیاد ہیں"۔ یعنی قرآن جس غرض کے لئے نازل ہوا ہے اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں، انہی میں اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے، انہی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں۔ انہی میں گمراہوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ انہی میں دین کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ انہی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور اوامر و نواہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔

پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کیلئے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے۔ اس کی پیاس بجھانے کے لئے آیاتِ محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرتاً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول ہوگا۔

متشابہات، یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جاسکتا، جب تک کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس میں انسان کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے بنیادی امور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں نہ آسکتی ہیں، جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا، نہ چھوا نہ چکھا۔ اُن کے لئے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انہی کے لئے وضع کئے گئے ہوں۔ اور نہ ایسے معروف اسالیب بیان مل سکتے ہیں۔ جن سے ہر سامع کے ذہن میں اُن کی صحیح تصویر کھنچ جائے، لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لئے الفاظ و اسالیب وہ بیان کئے جائیں جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لئے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں، چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

لیکن اس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے یا اُس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے، ایسی آیات کے مفہوم متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی اُتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ حتیٰ کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دُور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالبِ حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لئے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صرف کرتے ہیں۔ مگر جو لوگ بوالفضول یا فتنہ جُو ہوتے ہیں اُن کا تمام تر مشغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

(تفہیم القرآن ــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی اپنی ذات سے:-

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

واقع ہوئے ہیں۔ ایک زمانے میں آپ شعر بھی کہتے تھے، خیر! شعر کہنا تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے، جب نظامِ دکن میر عثمان علی خاں شعر کہنے کا حق رکھتے ہیں تو عنایت اللہ صاحب پھر "علامہ" اور "رنگیلا" ٹھہرے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے "خریطہ" نام کی ایک کتاب میں اپنے اشعار چھپوائے اور شاعری کے خلاف اسی کتاب میں ایک مبسوط اور طویل مقدمہ بھی لکھ کر چسپاں فرمادیا۔

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

مگر اردو شاعری کی قسمت اچھی تھی کہ مشرقی صاحب نے بہت جلد اپنا دستِ شفقت اس کے سر سے اٹھا لیا۔ اور بیلچہ برادران کی تنظیم میں مصروف ہوگئے اور یہ بیلچہ بردار —— ان کے مسلک کی رنگا رنگی نہ پوچھیے، جو گاندھی جی کو بھی سلامی دیتے تھے اور قائدِ اعظم کو بھی سیلیوٹ کرتے تھے۔ ایک دور وہ بھی چشمِ فلک نے دیکھ لیا کہ علامہ مشرقی کے حکم سے خاکساروں نے ٹوپی پہننا چھوڑ دی۔ اور ننگے سر رہنے لگے!

حال ہی میں انہی علامہ صاحب نے اسلام لیگ کا نام "مسلم لیگ" رکھ کر اپنی شوخیٔ طبع کے پچھلے ریکارڈ کو پلک جھپکاتے توڑ دیا۔ اسے "توارد" بھی نہیں کہہ سکتے کہ "توارد" میں بے خبری شریک ہوتی ہے۔ یہ "سرقہ" بھی نہیں ہے کہ مال والے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر سرقہ کیا جاتا ہے —— پھر یہ کیا ہے —— ! اس "فقید المثال نقل" کے لئے اہلِ لغت کو کوئی نیا لفظ بنانا ہوگا۔

ایک سردار جی دودھ والے کی ایک دکان پر پہنچے، دیکھا کہ حلوائی اپنے ہاتھ میں برتن لئے ہوئے خوب اونچا ہاتھ کرکے گاہک کیلئے دوسرے برتن میں دودھ ڈھال رہا ہے۔ سردار جی نے خاص انداز میں سر کھجایا اور حلوائی سے بولے:-

"مجھے بھی ڈیڑھ گز دودھ دینا"

ایک صاحب رات کو سوتے میں عینک لگا کر سوتے تھے، اُن سے پوچھا گیا کہ آپ سوتے میں عینک کاہیکو لگائے رہتے ہیں؟ فرمایا۔ تاکہ خواب صاف نظر آئیں۔

چند دن ہوئے کراچی شہر کی دیواروں پر ایک جہازی سائز کا اشتہار نظر سے گزرا تھا۔ جس میں بہ حروفِ جلی مرقوم تھا کہ فلاں تاریخ کو بیچ لکژری ہوٹل پر رقص و شراب کے خلاف پکٹنگ کیا جائے گا۔ اس خبر کو پڑھ کر تماشائی نے بھی ہلکی سی جھرجھری لی کہ ہماری قوم میں کچھ غیرت مند بھی اللہ کے فضل سے پیدا ہوگئے ہیں۔ مگر پھر کوئی خیر خبر نہیں لی۔ ظاہر ہے کچھ ہوتا تو اخبارات میں اطلاع ضرور آتی۔ لیکن اس "فراڈ" سے فائدہ! جی "فراڈ" کا فائدہ ہاتھ کے ہاتھ ظاہر نہیں ہوا کرتا —— ! کیا خبر داری کیا نکلتا ہے اور کیا چھپاتا ہے!

ہماری نظر میں

جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث

از:- مولانا محمد اسمٰعیل السلفی (گوجرانوالہ) ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- المکتبہ السلفیہ۔ شیش محل روڈ۔ لاہور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین اصلاحی نے "حدیث" کے موضوع پر جو مضامین لکھے ہیں اُن کے بعض اجزاء سے علماء اہلِ حدیث شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ اور خاص طور سے وہ سلفی المسلک علماء جو ہفتہ وار "الاعتصام" سے کسی نہ کسی عنوان سے متعلق ہیں، بہت زیادہ برہم ہیں۔

جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جماعت اہلِ حدیث کے ممتاز عالم ہیں جن کے علم وفضل کے اہلِ حدیث ہی نہیں دوسرے لوگ بھی معترف ہیں اور ہمارے دل میں بھی ان کے لئے احترام ومحبت کے جذبات موجود ہیں!

مولانا مودودی نے بہت دن ہوئے "مسلکِ اعتدال" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا تھا۔ پھر برکت علی محمڈن ہال لاہور میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اور ماہ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے ترجمان القرآن میں مولانا اصلاحی صاحب نے جو مضمون تحریر فرمایا تھا۔ اُن کے بارے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (گوجرانوالہ) کی یہ رائے ہے کہ ان مضامین نے "انکارِ حدیث" کے لئے بہت سے چور دروازے کھول دیئے ہیں اور اس قسم کے مباحث سے "انکارِ حدیث" کے فتنہ کو شہ بلکہ غذا ملتی ہے!

اس کتاب میں مولانا موصوف نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی تحریروں پر خوب کس کر تنقید کی ہے اور یہ تنقید نری جذباتی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ دلیلیں اور ثبوت بھی ہیں۔ اپنے مفہوم اور مسلک کو انہوں نے خاصے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ احاد حدیثوں کے بارے میں کب اختلاف رونما ہوا اور ان کے بارے میں کس گروہ نے اشتباہ پیدا کیا۔ اس کی پوری تاریخ فاضل ناقد نے قلمبند کردی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ احساس قوی تر ہو جاتا ہے کہ اس دورِ انکار والحاد میں دینی مسائل میں انتہائی احتیاط کے ساتھ زبان کھولنی چاہیئے۔ اور حدیثِ رسولؐ کا معاملہ تو بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اگر کسی حدیث کو کوئی پوری نیک نیتی کے ساتھ محض اس وجہ سے رد کردے کہ اس کی عقل سے وہ مطابقت نہیں کرتی، اور وہ حدیث ہو صحیح۔ تو ایسے شخص کے سر کتنا بڑا وبال آئے گا۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ کسی واہی تباہی اور نادرست قول کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے نسبت دینا بھی بڑے خسران کا باعث ہے!

"کذب ثلاثہ" اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ملک الموت کو تھپڑ مارنے کی دونوں حدیثوں کی صحت اور واقعیت پر لائق مصنف نے بڑی خوبی سے بحث کی ہے! یہ اس کتاب کا تابناک پہلو ہے۔ مگر دوسرے رُخ میں کتنے دھند لکے ہیں۔

مولانا حنیف بھوجیانی نے کتاب کی "تقریب" لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"جب محتاط لفظوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کے "مسلک اعتدال" سے انکارِ حدیث

کے لئے دروازہ کھلتا ہے تو جماعتِ اسلامی کے دوست گھبرا اُٹھتے اور سیخ پا ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ مسٹر غلام احمد صاحب پرویز نے اپنے نظریۂ انکارِ حدیث کے سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب کو اپنی شہادت میں بارہا پیش کیا ہے اور جماعتِ اسلامی کے اکابر و اصاغر اس الزام کے جواب سے اب تک عاجز ہیں۔" (صفحہ ۴)

" منکرینِ حدیث" نے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول "حسبنا کتاب اللہ" سے چور دروازے نکال لئے ہیں بلکہ اپنے فتنۂ انکارِ حدیث کی اساس حضرت عمرؓ کے اسی قول کو بنائے ہوئے ہیں اور اُن کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے اس قول کو جو ہم نے اپنے مسلک کی شہادت میں پیش کیا ہے تو اس کا جواب حدیث کے حامیوں سے نہیں بن پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عامل بالحدیث ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ اُن کے قول میں انکارِ حدیث کے لئے کوئی چور دروازہ نہیں ہے۔ یہ چور دروازہ تو منکرینِ حدیث کا نکالا ہوا ہے، اس قسم کی گمراہ ذہنیتوں نے خود قرآنِ پاک کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض علماء اہلِ حدیث، ان منکرینِ حدیث کے نکالے ہوئے چور دروازوں سے مودودی صاحب کے خلاف فردِ جرم مرتب فرما رہے ہیں۔ مولانا مودودی اللہ کے فضل سے عامل بالحدیث اور متبعِ سنت ہیں اور ہم اُن کو ایسا دو رُخا آدمی نہیں سمجھتے جو ایک طرف تو حدیث کی حمایت و تائید میں دلیلوں کے قلعے تعمیر کرے اور دوسری طرف منکرینِ حدیث کے لئے چور دروازے کھلے چھوڑ دے! یہ منکرینِ حدیث تو حدیثوں کا نام لے لے کر گناتے ہیں کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر حرف آتا ہے اور فلاں حدیث عجمی ذہنیت کی ترجمان ہے۔ تو کیا ان گمراہوں کے ان اعتراضات سے بچنے کے لئے اُن احادیث کو ترک کر دیا جائے۔ اور محدثینِ کرام پر یہ پھبتی چُست کر دی جائے کہ نہ یہ حضرات ایسی حدیثیں بیان کرتے اور نہ مخالفوں کو لب کشائی کا موقع ملتا۔ مقصود گزارش یہ ہے کہ چور دروازے نکالنے والوں نے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت میں کتنے چور دروازے نکالے ہیں!

آگے چل کر مولانا بھوجیانی صاحب لکھتے ہیں:۔

"اُن دنوں کی بات ہے جب تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب کو خواہ مخواہ جیل جانا پڑا۔" (ص ۵)

ساری دُنیا کو معلوم ہے کہ "قادیانی مسئلہ" لکھنے کے جرم میں مولانا مودودی کو سزائے موت کا حکم سُنایا گیا تھا۔ فوجی عدالت نے حکم سناتے ہی اُن کو پھانسی گھر میں پہنچا دیا۔ کتنا سخت امتحان تھا مگر مولانا موصوف اللہ کے فضل سے ثابت قدم رہے۔ اور انہوں نے رحم کی درخواست کے مشورے کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ پھر اُن کی سزائے موت حبسِ دوام میں تبدیل کر دی گئی اور اس کے بعد تقریباً دو سال تک انہیں قید و بند میں رہنا پڑا۔ یہ اُن کی زندگی کا بہت بڑا شرف ہے اور اس دورِ مصلحت شناس میں مثالی کردار ہے۔ اُن کے اس شرف پر اس طرح طنز کرنا:۔

"مولانا مودودی صاحب کو خواہ مخواہ جیل جانا پڑا۔"

کتنی بڑی ناانصافی اور واقعہ کی غلط ترجمانی ہے۔ خدا کے نیک بندو! اگر مودودی صاحب کی ذات سے تمہیں اتنی کد ہو گئی ہے تو بجائے اس کے کہ اُن کے کسی شرف و فضیلت پر پھبتیاں چُست کرو اور شبہات پیدا کرو۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو چھپا جاؤ اور اُس کا ذکر ہی نہ لاؤ!

جو لوگ ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے اس قدر کد رکھتے ہوں اور اُن کی رنجش اس حد تک پہنچ گئی ہو وہ مولانا موصوف

کے رائی برابر قصور کو اگر گناہوں کا پربت بنا کر پیش کر دیں۔ تو اُن سے کچھ بعید نہیں ہے!

مولانا بھوجیانی کی اس "تقریب" کے بعد فاضل مصنف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا "حرفِ گفتنی" ہے، اس کا رنگ یہ ہے:-

"اس اثناء میں جماعت اسلامی کے رفقاء مولانا مودودی کے ساتھ والہانہ عقیدت مندی میں قریباً اسی مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں اس وقت میاں بشیر الدین اور ہمارے قادیانی دوست پہنچ چکے ہیں" (صفحہ ۸)

اہلِ حدیث کے بعض پرچوں میں "مرزائے قادیان اور مودودی" جیسے ناموں سے بعض کتابوں کے اشتہارات ہماری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہمارا اب تک یہی خیال تھا کہ اہلِ حدیث کے بعض مجاہیل ایسی بازاری باتیں کر رہے ہیں۔ مگر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جیسے ثقہ اور سنجیدہ عالم سے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ وہ بھی احتیاط و ذمہ داری کے دامن کو اتنا ڈھیلا چھوڑ دیں گے!

اگر کوئی عالم جو کتاب و سنّت کو اساسِ دین مانتا ہو، یہ کہہ دے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ معصوم نہ تھے۔ بعض احادیث کے انتخاب و تدوین میں اُن سے بھول چوک ہو جانا ممکن ہے ــــــ تو جو کوئی جامع بخاری کے ایک ایک حرف کی قطعیت، عصمت صحت اور محفوظیت پر ایمان رکھتا ہے وہ اس عالم پر سخت سے سخت تنقید کر سکتا ہے ۔ مگر اس عالم کو ایک مُرتد اور رلیا ٹھپئے، کاذب نبی کا درجہ دے کر، اس کے رفقاء کو قادیانیوں کی سطح پر پہنچا دینا، تو قیاس مع الفارق کی بدترین مثال ہے، عام مسلمانوں کو قادیانی نبی اور قادیانیوں سے انتہائی نفرت ہے۔ اور غلام احمد کا نام سُنتے ہی مُسلمان کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے یہ اندازِ بیان جان کر اختیار کیا جاتا ہے۔

اور سنیئے:-

"تیسرا گروہ حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں فرق کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چودھری (غلام احمد پرویز ایڈیٹر طلوعِ اسلام) صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور میں ابتداء ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اُن کا مسلک حق سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اگرچہ تھوڑی سی غلطی اس میں ضرور ہے۔ لیکن الحمد للہ کہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچتی" (تفہیمات حصہ اوّل طبع چہارم صفحہ ۲۳۵-۲۳۶)

مولانا مودودی کی تحریر کے اس اقتباس کو زیرِ تنقید کتاب میں پڑھ کر خود ہماری طبیعت بہت منغض ہوئی کہ موصوف کے قلم سے ایسی غیر ذمہ دارانہ عبارت نکلی کیسے؟ اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جیسے عالم مودودی صاحب کی اصل تحریر میں کتربیونت بھی کر سکتے ہیں۔ احتیاطاً ہم نے مولانا مودودی کے اصل مضمون کو پڑھا تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ "مرکزی جمعیت اہلِ حدیث" کے باوقار ناظم کو یہ فن بھی آتا ہے۔ مولانا مودودی کی اصل عبارت یہ ہے:-

"ایک تیسرا گروہ ہے جو رسُول کی حیثیتِ رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصّہ پر حاوی سمجھتا ہے، اخلاق، معاشرت، معاملات، احکام و قضایا اور بہت سے معاملات میں اس کے قول و فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں اُمت کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں مگر وہ حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ رسُول کی زندگی کے کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیتِ رسالت

سے خارج ہیں اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں بیّن امتیاز کر دیتا ہو۔ اور ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچکر رسولؐ کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے، میں سمجھتا ہوں چودھری صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور میں ابتداء ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کا مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے، اگرچہ تھوڑی غلطی اس میں ضرور ہے لیکن الحمد للہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچتی۔"

ہم خواص وعوام کے جذبۂ انصاف سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے مثلہ کئے ہوئے اقتباس اور مولانا مودودی کی اصل تحریر کو پڑھ کر موازنہ کریں کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی کتر بیونت نے مودودی صاحب کے مفہوم کو کس قدر مغالطہ آمیز اور اُن کی بات کو کیا سے کیا بنا دیا۔ اور یہ نہیں ہے کہ صاحب ممدوح کو سہو ہو گیا ہے۔ انہوں نے بہ صحتِ ہوش وحواس مولانا مودودی کی اصل عبارت میں جان بوجھ کر یہ قطع وبرید کی ہے تاکہ پڑھنے والے آسانی کے ساتھ مبتلا ہو سکیں کہ مولانا مودودی تو مسٹر پرویز کو یہی نہیں کہ گمراہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اُن کے مسلک کو حق سے قریب سمجھتے ہیں!

مولانا مودودی کے مجموعۂ مضامین "تفہیمات" میں اسی مقالہ کے آخر میں — جولائی ۱۹۳۵ء بھی مرقوم ہے۔ کہ مولانا مودودی نے یہ مضمون اب سے اکیس ۲۱ سال پہلے لکھا تھا۔ جب پرویز نے انکارِ حدیث نہیں کیا تھا اور اس شخص کا وہی مسلک تھا جس کی تشریح مولانا مودودی نے خود اپنی اس تحریر میں کی ہے۔ اسی عبارت سے اوپر معاً متصل مودودی صاحب نے دوسرے گروہ میں مولانا اسلم جیراج پوری کو شمار کیا ہے۔ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس وقت پرویز صاحب کا مسلک حافظ اسلم جیراج پوری کے مسلک سے مختلف تھا!

نقل وروایت میں اہلِ حدیث کی احتیاط امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر جب اسی گروہ کے علماء نقل وروایت میں اتنے غیر محتاط اور بے پروا ہو جائیں تو ..... ! ع

پھر کسے رہنما کرے کوئی!

صفحہ ۴۶-اور ۴۷ پر اس کتاب میں اُن فرقوں (خوارج، شیعہ، معتزلہ وغیرہ) اور افراد کی ایک فہرست دی گئی ہے جو یا تو بالکلیہ منکرِ حدیث ہیں یا انہوں نے بعض احادیث کو قبول نہیں کیا۔ اس فہرست کے آخری نام یہ ہیں:-

۱۰- مولانا شبلی مرحوم - مولانا حمید الدین فراہی - مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی - اور عام فرزندانِ ندوہ - باستثنائے حضرت سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔	یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں۔ لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور طریقہ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔

احادیث پر جب بھی گفتگو کی جائے گی تو یہ مباحث ضرور آئیں گے، کہ محدثین نے حدیثوں کے قبول کرنے کے لئے کیا اصول وضع کئے، کن روایتوں کو کن وجوہ کی بنا پر رد کیا گیا۔ احادیث کے قبول کرنے میں کون متشدد تھا اور کون متساہل تھا۔ احادیث کی روایات زیادہ تر بالمعنیٰ ہیں یا باللفظ ہیں۔ راویوں کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے بارے میں محدثین میں کہاں اختلاف پایا جاتا ہے اور کہاں توافق؟ ان مباحث سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ اس طرح حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور اس طریقۂ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھلتے ہیں"۔ تو معترض کا یہ نرا وہم ہے! نقدِ احادیث تو مسلمانوں کا بہت بڑا علمی

اور دینی کارنامہ ہے۔ اس کو چھپا دینا خود فنِ حدیث کے ساتھ ناانصافی ہے!

صفحہ ۱۵ پر علامہ ابن حزم کے قول کے حوالے سے جو یہ لکھا گیا ہے:۔

"وہ فرماتے ہیں کہ دین کامل ہے جیسے آیت "الیوم اکملت لکم دینکم" الخ سے ظاہر ہے۔ پھر اس کی حفاظت کا ذمہ خدا تعالیٰ نے لیا جو "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" سے واضح ہے کہ اگر متاخرین فقہا کے خیال کے مطابق کامل دین پر ظنون واوہام غالب ہو جائیں اور حق و باطل اس طرح آمیز ہو جائیں کہ امتیاز ناممکن ہو تو حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا ہوا؟ کیونکہ کتاب "ذکر" کا لفظ کتاب اللہ اور سنت دونوں پر حاوی ہے۔"

اگر یہ علامہ ابن حزم کی رائے ہے کہ اس آیت میں لفظ "ذکر" کتاب اللہ اور سنت دونوں پر حاوی ہے تو جہاں تک ہماری محدود معلومات کا تعلق ہے وہ اس رائے میں منفرد ہیں۔ خود اسی رکوع میں اس آیت سے پہلے یہ آیت ملتی ہے:۔

"وقالوا یاایھا الذی نُزِّلَ علیہ الذکرُ انک لمجنون۔" (الحجر۔ پہلا رکوع)

اور اس میں "ذکر" سے صرف "کتاب اللہ" مراد ہے۔ اس کے بعد ہی تیسری آیت میں بھی "حفاظتِ ذکر" سے یقیناً "حفاظتِ قرآن" ہی مراد ہے کہ جس طرح یہ نازل ہوا ہے ٹھیک اسی طرح آج تک محفوظ ہے۔ اور اس کے ایک شوشہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع بیشک منصوص ہے اور اطاعتِ رسولؐ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی اور یہ بھی سو فیصدی درست ہے کہ سنتِ رسولؐ دین میں حجت ہے اور منکرینِ حدیث جو حدیث کو محض تاریخ سمجھتے ہیں، وہ دراصل نبوت کے منکر ہیں۔ مگر جہاں تک قرآن کی حرف بہ حرف محفوظیت اور اس کے "لاریب فیہ" ہونے کا تعلق ہے احادیث کو ٹھیک اس درجہ میں رکھنا ناپسندیدہ غلو ہے، خود صحیح بخاری کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہا گیا ہے۔ "الصحیح مثل کتاب اللہ" نہیں کہا گیا۔ فرقِ مراتب میں افراط و تفریط دونوں مضرت رساں ہیں۔

حضورؐ کے اقوال و افعال بیشک دین میں حجت ہیں۔ مگر حدیث کی حجیت ثابت کرنے کے لئے احادیث کو ہر حیثیت سے قرآن پاک کے بالکل ہم پایہ قرار دینا، کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔

"مولانا نے جن احادیث کا مثال کے طور پر ذکر فرمایا ہے، ان کے متعلق مختصراً گزارش مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حدیث "غرانیق" باتفاق محدثین اصولِ محدثین کے مطابق ساقط الاعتبار ہے اور جن الفاظ سے ائمہ حدیث نے اسے قابلِ استناد سمجھا ہے وہ نہ طبیعت کو کھٹکتی ہے، نہ عقل عام اس سے اباء کرتی ہے۔" (ص ۶۸)

یہ عجیب تضاد ہے کہ محدثین نے اس حدیث کو ساقط الاعتبار بھی ٹھہرایا ہے مگر جن الفاظ سے ائمہ حدیث نے اسے استناد کے قابل سمجھا ہے وہ لائق مضمون نگار کی طبیعت کو کھٹکتے بھی نہیں۔ خوب! اصحابِ حدیث کا یہ کمزور پہلو ہے کہ جو احادیث ساقط الاعتبار ہیں۔ ان کی جو ائمہ حدیث تاویلیں کرتے ہیں اور ان کو قابلِ استناد ٹھہراتے ہیں، ان کے سہو و اغلاط کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

"معتزلہ کے اس حملہ سے صرف اہلِ حدیث اور حنابلہ محفوظ تھے، احناف، موالک، شوافع، شیعہ سب بعض اہلِ علم اعتزال سے متاثر تھے۔" (ص ۹۰)

اگر حنفیوں، شافعیوں اور مالکیوں کی طرف سے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اپنی "تعمق فی الدین" کی کمزوری اور دینی مسائل

یں وقتِ نظری کی کوتاہی کو چھپانے کے لئے ہم پر اعتزال کی پھبتی چست کی جارہی ہے۔ تو پیشانی پر نہ جانے کتنی شکنیں پڑ جائیں گی۔

مولانا مودودی صاحب نے فقیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"اس کی روح، روحِ محمدی میں گم ہوجاتی ہے۔ اس کی نظر بصیرتِ نبوی کیساتھ متحد ہوجاتی ہے"

اس پر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے "قادیانی شاعری کا لبادہ زیب تن فرماتے ہیں" کی پھبتی کہی ہے۔ حالانکہ اس عبارت پر مناسب ترین طنز تصوّف آمیز "شاعری" ہوسکتی تھی۔ مگر جن لوگوں نے یہ طے کرلیا ہو کہ مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کا "قادیانیت" سے جوڑ ملاکر ہی چین سے بیٹھیں گے۔ اُن کو کوئی سمجھانے کے لئے فالتو عقل کہاں سے لائے!

مولانا مودودی صاحب کے جس مضمون (مسلکِ اعتدال) پر فاضل مصنف نے بہت لے دے کی ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

"کسی مسلمان کو اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امورِ دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وعمل واجب الاتباع ہے۔ اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے، وہ حضورؐ کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال یہ رہ جاتا ہے کہ طریقِ نبویؐ کے علم کی کیا کیا صورتیں ہیں اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے....."

مولانا مودودی حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے قول وعمل کو دین میں واجب الاتباع سمجھتے ہیں، اس لئے جہاں تک نفسِ مسئلہ کا تعلق ہے اُن میں اور اہلِ حدیث میں ذرّہ برابر اختلاف نہیں ہے۔ اب رہا احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کا سوال۔ تو خود ائمہ اہلِ حدیث کے درمیان ان میں اختلاف رہا ہے۔ بخاری کی اُس روایت میں کہ حضرت آدمؑ کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ خود حافظ ابن حجر کو اشکال نظر آیا۔ جس کی وہ کوئی مناسب توجیہ نہ کرسکے!

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو ایک روایت ہے اُس پر ابن بطّال نے اعتراض وارد کیا ہے۔ مگر احادیث پر اس قسم کے نقد ونظر کو کسی نے بھی "انکارِ حدیث" نہیں کہا اور نہ کہنا چاہیے۔

"راوی نہ معصوم ہیں، نہ آج تک کسی نے ان کی عصمت کا دعویٰ کیا۔ نہ ایسا ممکن ہے۔ البتہ مجموعی لحاظ سے فنِ حدیث پر عصمت کا ظن غالب ہے۔ جس طرح حفاظ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی کہ وہ قرآن کو محفوظ رکھ سکیں یعنی ہر حافظ معصوم نہیں۔ لیکن قرآن کے حفظ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی۔ اسی طرح حفاظِ حدیث کو اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی کہ وہ اس کی حفاظت فرماسکیں۔ اجماعِ اُمت میں ہر فرد معصوم نہیں۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی مجتہدین کو عصمت کا مقام حاصل ہوجاتا ہے"۔ (ص ۶۶)

"عصمت" نبی کی صفت ہے بلکہ اُس کے لئے مخصوص ہے۔ جب یہ کہا جاسکتا ہے کہ "اجماعِ امت میں ہر فرد معصوم نہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی مجتہدین کو عصمت کا مقام حاصل ہے"۔ ــــــ تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ "اجماعِ امت میں کوئی فرد بھی نبی نہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی صلحا اور علمار کو نبوت کا مقام حاصل ہوجاتا ہے"! کم از کم اہلِ حدیث کو یہ علمِ کلام زیب نہیں دیتا کہ اُن کی جماعت اس قسم کی نکتہ آفرینیوں کی تردید کے لئے وجود میں آئی ہے!

مولانا مودودی کی تمام کتابیں اور خود اُن کی زندگی اس پر گواہ ہے۔ وہ حدیث کو دین میں حجّت سمجھتے ہیں۔ اُن کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں مضامین حدیث کی حمایت میں چھپتے رہے ہیں۔ "فتنۂ انکارِ حدیث" کی رد میں پچھلے چھ سات سال میں اُن رسالوں نے جو جماعتِ اسلامی سے

قریب ہیں، سب سے زیادہ حدیث کی حمایت کی ہے۔ جماعتِ اسلامی کے متاثرہ مکتبوں سے حدیث کی تائید اور انکارِ حدیث کے رد میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جماعت اسلامی کے علماء پابندی کے ساتھ حدیث کا درس دیتے رہے ہیں، "کتاب وسنت" کو پاکستان کے دستور کی اساس منوانے کے لئے جماعتِ اسلامی نے برسوں مہم جاری رکھی ہے۔ مسٹر غلام محمد مرحوم کے زمانہ میں ایک وہ اسٹیج آگیا تھا کہ "کتاب اللہ" باقی رکھ کر "سنت" کا لفظ ہی دستور سے اُڑائے دے رہے تھے۔ اس کے بعد دُوسرا وہ دَور آیا کہ "کتاب وسنت" کی جگہ "اسلام" رکھنے کی مسکوٹ ہو رہی تھی، مگر علماء اہلِ حدیث کو کیا معلوم کہ دستور میں "کتاب وسنت" کے لفظ باقی رکھنے کے لئے کتنی خاموش تدبیریں کرنی پڑی ہیں۔ ایسی جماعت اور اس کے افراد واکابر کو مسئلہ حدیث میں اہلِ حدیث حضرات جس طرح مطعون کر رہے ہیں۔ اُس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے!

خطبۂ صدارت

خطبۂ صدارت زنانہ کانفرنس مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث۔ از:۔ محترمہ عطیہ بیگم۔ ضخامت ۲۰ صفحات (بڑا سائز) قیمت درج نہیں۔ "مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث" لاہور سے غالباً مفت مل سکتا ہے۔

ماہ اکتوبر ۵۶ء کے وسط میں گوجرانوالہ میں جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ جس میں شریک ہونے کے لئے مغربی پاکستان کے دُور دراز گوشوں سے اہلِ حدیث حضرات تشریف لائے تھے۔ کانفرنس کے صدر علامہ خلیل عرب اور زنانہ کانفرنس کی صدر اُن کی صاحبزادی عطیہ بیگم سلمہا تھیں۔ اللہ کے فضل سے یہ گھرانے کا گھرانا اشاعتِ دین کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہے (اللھم کثر امثالھم)

اس خطبہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فاضلہ صدر نے فقہی اختلافات کا ذکر نہیں چھیڑا۔ اس طرح اس خطبہ میں افادیت کے اعتبار سے عمومیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس فاضلانہ خطبہ میں اُن مسلم خواتین کی دینی اور علمی خدمات کا اجمالی تذکرہ ہے۔ جن سے اکابر علماء نے استفادہ کیا ہے۔ اس کے بعد دَورِ حاضر کی اُن خرابیوں کی نشاندہی کی ہے جن کے سبب اس زمانہ کی عورتیں دین واخلاق سے بیگانہ ہوتی چلی جا رہی ہیں! اندازِ بیان میں تاثیر اور اخلاص کی فراوانی ہے۔ یہ خطبہ اس کا مستحق ہے کہ کتابی شکل میں شائع ہو اور مسلمانوں کے ایک ایک گھر میں اسے پہنچایا جائے۔

مثنوی گلزارِ نسیم

(المعروف بہ قصہ گل بکاؤلی) مع تنقید وتبصرہ وتشریحات۔ مرتبہ:۔ ظہیر احمد صدیقی ایم اے (علیگ) ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن حامد علی بلڈنگ، یونیورسٹی ایریا۔ علی گڑھ (یو۔ پی)

جناب ظہیر احمد صدیقی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مثنوی گلزارِ نسیم کو ایڈٹ کیا ہے۔ اس مثنوی پر اُن کا مقدمہ اُن کی خوش ذوقی، شعر فہمی اور دقتِ نظر کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔ ایک اقتباس:۔

> "چکبست نے تو نسیم کے نقائص پر بھی محاسن کا پردہ ڈالنا چاہا ہے اور شرر نے ان محاسن کو بھی نقائص کے رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر جہاں تک حالی کا تعلق ہے ہم ان کے فیصلہ کو قولِ فیصل کی حیثیت دے سکتے ہیں۔ ان کے اعتراضات ہمدردانہ بھی ہیں اور سخن گسترانہ بھی۔ کسی بڑے شاعر کے یہاں اگر کوئی خامی ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کی عظمت میں کسی قسم کی کمی آگئی ہے اسی کے ساتھ "ہیرو ورشپ" کو ہمارا ادب کبھی معاف نہیں کر سکتا۔"

کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں اچھا اضافہ ہے۔ نوجوان ناقد سے اُردو ادب بڑی خوش آئند

مسنون دعائیں

تالیف:- مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری - ضخامت ۹۶ صفحات - قیمت چھ آنہ -

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ صدیقیہ - بیرون بوہڑ دروازہ - ملتان شہر -

یہ بڑے کام کی دینی کتاب منظر عام پر آئی ہے - اس میں تقریباً وہ تمام دعائیں اُردو ترجمہ کے ساتھ درج ہیں - جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے معمولات میں پڑھا کرتے تھے - آنکھ دُکھنے آجائے، بدن میں درد ہو - پتھری کا مرض ہو - نظر لگ جائے، بخار چڑھ آئے یا کوئی اور تکلیف ہو - تو آدمی کیا پڑھے؟ یہ مسنون دعائیں بھی اس کتاب میں ملتی ہیں - کتاب کے آخر میں چند قرآنی دعائیں درج ہیں - اگر ان میں سے چند دعائیں بھی کسی مسلمان کو یاد ہو جائیں اور وہ ان کو اپنا معمول بنالے تو یہ بہت بڑی سعادت اس کے حصہ میں آئے گی - مسنون دعا کے دُہرانے سے جو برکت حاصل ہوتی ہے اور اللہ اور رسولؐ کے ساتھ تعلق محکم تر ہوتا ہے، وہ اس کی تاثیر سے زیادہ فائدہ مند ہے -

قرآن اور اقبال

از:- ابو محمد مصلح - ضخامت ۹۲ صفحات - (مجلد) قیمت دو روپے -

ملنے کا پتہ:- اسلامک بُک سینٹر - مسجد چوک - حیدر آباد دکن (بھارت)

یہ کتاب اب سے سولہ سال (۱۳۵۹ھ) پہلے کی چھپی ہوئی ہے - جس کو فاضل مصنف نے سر اکبر حیدری مرحوم (صدر اعظم مملکت آصفیہ دکن) کی "نذر" کیا تھا - یہ کتاب اپنے موضوع پر اس اعتبار سے منفرد ہے کہ لائق مُرتب نے علامہ اقبال کے کلام سے وہ تمام کے تمام اشعار نکال کر یکجا کر دیئے ہیں - جن میں کسی نہ کسی عنوان سے "قرآن" کا ذکر آیا ہے -

علامہ اقبال کو قرآن کریم سے عشق تھا، قرآنی پیغام کی اشاعت اُن کی زندگی کا مشن تھا - اور اس کتاب کے مرتب مولانا ابو محمد مصلح صاحب نے بھی اشاعتِ قرآن کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے - اس لئے وہ "قرآن اور اقبال" مُرتب کرنے کا حق رکھتے ہیں - موصوف نے اشعارِ اقبال کی جہاں جہاں تشریح کی ہے اور نوٹ دیئے ہیں، وہ بڑے مفید اور اثر انگیز ہیں - کہیں کہیں تو اقبال کی چٹکی کو انہوں نے اپنی شرح و بیان سے اور تیز کر دیا ہے -

مولانا موصوف نے کتنی سچی اور تیکھی بات کہی ہے:-

"آج مشکل سے احباب کا کوئی ایسا اجتماع ہوگا، جس میں کسی نہ کسی طرح اقبال کا ذکر نہ آتا ہو - مگر ان لوگوں سے کون کہے کہ آخر آپ ہی تو ہیں جو سراسر اقبال کی تعلیمات کے خلاف قدم اُٹھا رہے ہیں اور سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گویا وہ کوئی دُوسرے لوگ ہیں جن سے اقبال کو شکایت ہے -"

صفحہ ۱۶ کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:-

"اگرچہ ڈاکٹر اقبال نہ تو کالج کی پروفیسری کے لئے پیدا کئے گئے تھے، نہ بیرسٹری کے لئے تخلیق کئے گئے تھے - اور نہ ہی کونسل کی ممبری کے لئے وضع ہوئے تھے ......"

حیرت ہے کہ ابو مصلح صاحب بھی "نہ ہی" لکھتے ہیں - اگر "ہی" کا "emphasis" پیدا کرنا ہی مقصود تھا تو جملہ کی ترکیب اس طرح ہو سکتی تھی - "اور نہ کونسل کی ممبری کے لئے ہی وضع ہوئے تھے" اس جملہ میں "وضع ہوئے تھے" بھی بہت کھٹکتا ہے - "کہا جا سکتا ہے کہ اقبال لحیم و شحیم تھے" (صفحہ ۲۶) ہم نے علامہ اقبال کو ۱۹۳۳ء میں دیکھا ہے بلکہ اُن کے ساتھ چائے پی ہے - مگر انھیں "لحیم و شحیم" نہیں پایا ——

"باطنی طور پر جو کچھ استفادہ اُن کو حاصل ہوا ہے" (صفحہ ۱۴۶) "استفادہ" کے ساتھ "حاصل" کا اضافہ غلط ہے -

کتاب اتنی دیدہ زیب چھپی ہے کہ برلن کے مطبع کاویانی ہی میں اتنی حسین طباعت ہو سکتی ہے، کاغذ بھی بہت خوب ہے اور کتابت تو اتنی اچھی ہے کہ میر پنجہ کش کے کسی نامور شاگرد کی خطاطی کا شاہکار معلوم ہوتی ہے!

عربی کا معلّم | حصہ اول - ضخامت ۱۱۲ صفحات - قیمت ایک روپیہ - کلید جدید (عربی معلم حصہ اول) ضخامت ۳۶ صفحات - قیمت پانچ آنہ - حصہ دوم - ضخامت ۱۱۲ صفحات - قیمت ایک روپیہ - اس کی کلید کی قیمت پانچ آنہ - حصہ سوئم، ضخامت ۲۲۴ صفحات - قیمت دو روپے - اس کی کلید کی قیمت دس آنہ - ضخامت ۷۲ صفحات - حصہ چہارم ضخامت ۲۹۶ صفحات - قیمت دو روپے آٹھ آنے - اس کی کلید (۹۵ صفحات) کی قیمت بارہ آنہ - ملنے کا پتہ :- عباسی بُک ڈپو - جوڑیا بازار کراچی - ہندوستان میں - مولوی عبدالستار خاں و ابناؤہ، ۸۰ باٹکامینش - بھنڈی بازار - بمبئی ۳ -

"عربی معلم" کی قبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ سترہ[17] بار - دوسرا حصہ بارہ[12] دفعہ - تیسرے حصہ کا گیارھواں اور چوتھے حصہ کا ساتواں ایڈیشن چھپ چکا ہے - مولوی عبدالستار خاں صاحب اس سلسلہ کے مولف و مصنف ہیں - عربی سیکھنے کے لئے یہ کتابیں خاصی مفید ہیں - ان چاروں کتابوں پر اگر کسی کو عبور ہو جائے تو قواعد کے اعتبار سے وہ صحیح عربی لکھ اور پڑھ سکتا ہے - "عربی معلم" کے اس سلسلہ کی تعلیم کے ساتھ عربی ادب کی دوسری کتابیں نظر سے گزرتی رہیں اور کسی عرب زبان داں کی صحبت بھی خوش قسمتی سے میسّر آجائے تو پھر عربی تقریر و تحریر میں خاصی مہارت حاصل ہو سکتی ہے !

فاضل مؤلف نے انتہائی سہل اور دل نشین انداز میں عربی قواعد کی تشریح کی ہے، مشقیں کتنی موزوں اور طالب علموں کی تدریجی ترقی کے مناسب ہیں !

"هَلُمَّ جرا" بہت مستعمل ہے، اس کے لفظی معنی ہیں "کھینچتا ہوا چلا چل" - مطلب یہ ہے کہ اسی طرح آگے کھینچتے چلے جاؤ" (ص ۲۸) اگر "هَلُمَّ جرا" کی شرح میں اُردو ترجمہ کے ساتھ "and so on" بھی لکھ دیا جاتا تو طالب علموں کو سمجھنے میں اور زیادہ آسانی ہوتی - افہام و تفہیم میں انگریزی سے جائز حدود میں فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے -

"عربی معلم" کی افادیت اپنی جگہ ثابت و مُسلم ہے - مولوی عبدالستار خاں صاحب نے اس سلسلہ کو مرتب فرما کر عربی اور اُردو دونوں زبانوں کی مفید خدمت انجام دی ہے -

علاق کے موتی بکھرے ہوئے ہیں

رچی نمبر ۱ سے منگائیے

دیر

از افضل حسین (بی اے، ایل ٹی) بچوں کیلئے چار کتابوں کا سیٹ، کردار سازی میں یہ کتابیں بہت مدد دیتی ہیں -

لاقی کہانیاں قیمت ایک روپیہ دس آنہ (علاوہ محصولڈاک)

یتِ دفاع - میجر جنرل اکبرخاں کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں جنگی نقطۂ نظر سے غزوات پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت پانچ روپے (علاوہ محصولڈاک)

خاتمۃ الانبیاء - مولانا مفتی محمد شفیع کی مشہور تالیف جس کی مقبولیت کا عالم ہے کہ اب تک دسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں - قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک -

ہی اختلافات کا حل - مولانا اصلاحی کی یہ کتاب پڑھ کر فکر و نظر میں تفقہ کی روشنی پیدا ہوتی ہے - قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ علاوہ محصولڈاک -

مد بن عبدالوہاب اس عظیم مصلح کیساتھ اہل بدعت نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے - مولانا مسعود عالم ندوی کی یہ کتاب اس ظلم کے خلاف مؤثر احتجاج ہے، غلط فہمیوں کے ایک ایک پردہ کو چاک کیا گیا ہے، قابلِ قدر تحقیق - قیمت دو روپے بارہ آنہ علاوہ محصولڈاک -

اشی ناہمواریوں کا اسلامی حل دورِ حاضر کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز موضوع پر نہایت ہی سنجیدہ، پُرمغز اور مطمئن کرنے والی کتاب - جناب نعیم صدیقی اس کے مصنف ہیں - قیمت تین روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک -

نتِ رسولؐ :- عرب کے مشہور عالم مصطفےٰ اسباعی کی بلندپایہ کتاب کا اردو ترجمہ - حدیث کی حمایت میں بڑی کامیاب تصنیف - قیمت دو روپے چار آنے - علاوہ محصولڈاک -

فتر بے معنی :- نعیم صدیقی کے قلم کی شوخیاں اپنے شباب پر - بڑی معنی خیز طنزیں - کتاب اٹھانے کے بعد آپ پڑھ کر دم لیں گے - قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک -

شتراکیت اور اسلام مولانا مسعود عالم ندوی نے بڑی بڑی غلط فہمیوں کو اس کتاب میں بے نقاب کر دیا ہے - اس کتاب کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ اشتراکیت اور اسلام اپنے مزاج کے اعتبار سے کس قدر مختلف اور متضاد واقع ہوئے ہیں - قیمت دو روپے آٹھ آنہ

حقیقاتی عدالت میں - مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی - اس تاریخی مقدمہ میں اس مردِ مجاہد نے جو تین بیان دیئے ہیں وہ دعوت و عزیمت کی ایک مکمل تاریخ انقلاب ہے - تینوں کتابوں (تینوں بیانوں پر مشتمل) کی قیمت دو روپے دس آنے (علاوہ محصولڈاک)

تازیانے :- علامہ زین القضاۃ احمد بن محمد کی عربی کتاب المنبہات کا دل نشین اردو ترجمہ - پند و موعظت سے ایک ایک سطر معمور - قیمت مجلد تین روپے - (علاوہ محصولڈاک)

الاخوان اور اس کی دعوت - عرب دنیا کی مخلص ترین دینی جماعت "اخوان المسلمون" کو جاننا ہے تو اسی جماعت کے بانی اور مرشد حضرت حسن البناء شہید کی یہ ولولہ انگیز کتاب ضرور پڑھیئے - قیمت ایک روپیہ چار آنہ (علاوہ محصولڈاک)

ذرِ گل :- کوثر نیازی کا پہلا مجموعہ کلام - جس کی تمام ادبی حلقوں میں دھوم ہے - مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے - جوان جذبات کا اسلامی پیرایہ میں دلکش اظہار - قیمت دو روپے بارہ آنہ - علاوہ محصولڈاک -

رحمان پرنٹنگ پریس کراچی ۱

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۸ — نمبر ۱۱

ماہنامہ

فاران

فروری ۱۹۵۷ء

ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... چھ روپے
فی پرچہ ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر "فاران"۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

مسجدوں کے ملّاؤں اور مدرسوں کے مولویوں نے نہیں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے "مسٹروں" اور "آنریبلوں" نے اس کا فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریت ہے، اس حکومت کا کوئی قانون "کتاب وسنّت کے خلاف نہیں بننے پائے گا اور یہاں اسلامی اخلاق کی بُنیادوں پر معاشرے کی تشکیل کی جائے گی۔" دستور ساز اسمبلی کا یہ فیصلہ ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوا، اخباروں میں چھپا اور سرکاری گزٹ میں شائع ہوا۔

یہ ایک عظیم الشان تاریخی بلکہ انقلابی فیصلہ اور ایک بہت بڑا اعلان تھا۔ اس فیصلہ پر اسلامی ممالک سے مبارکباد کے پیام آئے پاکستان کے عوام نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور ملک کے گوشہ گوشہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

عوام سے تو کسی معاملہ میں کوتاہی، غیر ذمہ داری اور بے پروائی ظہور میں آسکتی ہے مگر جو لوگ ملک کے نظم ونسق کا بارِگراں اپنے دوش پر لئے ہوتے ہیں۔ اور جن کے ہاتھوں میں حکومت کی زمام کار ہوتی ہے، اُن سے ایفاءِ عہد، پاسِ وفا اور احساسِ ذمہ داری کی زیادہ سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے، کتنا بدنصیب ہے وہ ملک اور کس قدر مظلوم ہے وہ قوم، جس کے "اربابِ کار" خود اپنے کئے ہوئے فیصلوں کو عملی طور پر نافذ کرنے سے گریز کریں جن کو اپنے قول و قرار کا پاس نہ ہو اور جو اُن خطوط پر جن پر چلنے کا وہ فیصلہ کرچکے ہوں ایک قدم بھی چل کر نہ دیں۔

اس حکومت، اُس ملّت اور اس ملک کی دنیا میں کیا ساکھ باقی رہ سکتی ہے، جس کے ذمہ دار اور بااختیار افراد اپنے بنائے ہوئے دستور اور ضابطہ کی عملی تشکیل کے لئے کوئی کام نہ کریں اور جن کا دستور بس کاغذ ہی پہ لکھا رہ جائے۔ عمل اور واقعہ کی دنیا میں اس کا کوئی نشان دکھائی نہ دے۔!

جو حکومت خود اپنے مسلک اور عقائد کی عزّت کرنا نہیں جانتی۔ وہ دنیا کی دوسری حکومتوں سے اگر اپنی عزت کئے جانے کی

توقع رکھتی ہے، تو وہ صحیح معنوں میں احمقوں کی جنت میں رہتی ہے۔ دنیا میں عزت اُن کو ملتی ہے جو اپنی، اپنے دستور کی، اپنے مسلک کی اور اپنے افکار و نظریات کی عزت کرنا جانتے ہیں۔

دنیا میں روس کی جو ساکھ قائم ہے، اس کا سبب صرف اس کی مادی قوت نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا سب سے بڑا سبب اُس کا اپنے مسلک پر جمے رہنا اور اپنے نظریوں کی خاطر مرنا اور جینا ہے۔ روسی حکومت میں کوئی ایسا آدمی جو اشتراکیت پر یقین نہ رکھتا ہو، چپراسی کی جگہ پر بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ سوویٹ حکومت کا ہر کارندہ اشتراکیت کا مظہر نظر آتا ہے۔ اُن کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں، اُس کو انہوں نے عملی دنیا میں بھی قائم کر رکھا ہے۔ "اہلِ نفاق" کو وہاں کسی عنوان برداشت ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بیریا اور اس کے ساتھیوں کا دردناک حشر اس پر گواہ ہے!

اگر دنیا میں کوئی حکومت، طاقت اور پروپیگنڈے میں روس کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ امریکہ ہے۔ ہماری آج کی گفتگو کا یہ موضوع نہیں ہے کہ روس اور امریکہ میں جو نظامِ حکومت چل رہے ہیں، وہ غلط ہیں یا صحیح ہیں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ ان حکومتوں میں کوئی ایسا شخص اقتدار و اختیار حاصل نہیں کر سکتا، جو ان حکومتوں کے اساسی معتقدات اور بنیادی نظریوں کا مخالف ہو۔ جس طرح روس میں جاگیردارانہ نظام پر یقین رکھنے والے کو کوئی منصب یا عہدہ نہیں مل سکتا، اسی طرح امریکہ کی حکومت کسی کمیونسٹ کو اپنے نظم و نسق میں شریکِ کار نہیں بنا سکتی!

کچھ لوگوں کے دماغ ہی بالکل اُلٹ گئے ہوں تو وہ جو چاہیں کہہ دیں اور جس حقیقت اور واقعیت کا انکار کر بیٹھیں مگر ہر وہ شخص جس کے پاس عقل و دیانت کی ایک رمق بھی پائی جاتی ہے، اس کے اعتراف میں تامل نہیں کر سکتا کہ پاکستان صرف "اسلام" کے نام پر بنا ہے، خود لفظ "پاکستان" اس کا شاہدِ ناطق ہے کہ مجھ میں ایمان کی تقدیس اور اسلام کی پاکی سموئی ہوئی ہے!

متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو دیویوں یا ہندو اور مسلمان ملی جلی عورتوں کا ناچ دیکھنا پڑے گا اور پاکستان میں خالص مسلمان خواتین کے رقص سے لطف اندوز ہونے کے زرّیں مواقع میسّر ہوں گے، ہندوستان میں کافروں کے ساتھ جوا کھیلا جائے گا اور گھوڑ دوڑ کی شرطیں بدنا پڑیں گی اور پاکستان میں اہلِ ایمان کے ساتھ قمار بازی ہوا کرے گی۔ اکھنڈ بھارت میں شراب کے نفع میں ہندو بھی شریک ہوں گے اور پاکستان میں محکمۂ آبکاری کی پوری کی پوری آمدنی ہماری اپنی اسلامی حکومت کے حصہ میں آئے گی، اور مسلمان مرد اپنی نظروں کو ہندو دیویوں کے قشقہ و عارض کے نظارے میں کیوں صرف کریں، یہ اپنی دینی بہنوں (؟) کے لب و رخسار کے نظارے میں کیوں نہ کام آئیں؟

اگر متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خواب و خیال میں بھی یہ خطرہ گزرتا کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں یہ کچھ ہوگا۔ تو چاہے انھیں آگ اور لہو کے دریا سے کیوں نہ گزرنا پڑتا، اس قسم کے "ناپاکستان" کی وہ مخالفت کرتے اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تمام کوششیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔

مسلمانوں نے اس اُمید پر اپنی عزت، ناموس اور جان و مال کی بازی لگائی تھی کہ پاکستان میں اللہ کا دین سربلند ہوگا۔ یہاں کتاب و سنّت کا قانون چلے گا۔ یہاں کا معاشرہ اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔ بدیاں دبیں گی اور نیکیاں اُبھریں گی صدیوں کے بعد دینِ فطرت کے شجرۂ طیبہ کو آزاد فضا میں برگ و بار لانے کا موقع ملے گا۔ شیطان کو اپنے مشن میں سب سے زیادہ مایوسی پاکستان سے ہوگی۔ یہ پاک خطہ اقامتِ دین کا ایک مثالی نمونہ بن جائے گا اور سچائی کی پیاسی دنیا اسی چشمہ سے سیراب ہوگی۔ مگر کیا قیامت ہے کہ جہاں نور کی شمعیں روشن ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے، وہاں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیر

دکھائی دیتا ہے!

دستور سازی کے بعد اس نو سال کی مدت میں پاکستان کے اُفق پر روشنی بس اُس رات کو دیکھی گئی، جس رات کو دستور سازی کا کام ختم ہوا ہے۔ مگر یہ روشنی بھی سیمیا کی سی نمود تھی۔ جیسے شب میں فوٹو کھینچتے وقت فوٹو گرافر کے کیمرے میں ایک دو لمحے کے لئے روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر تاریکی!

ہم پاکستان کے اربابِ اختیار سے یہ پوچھنے کا جائز حق رکھتے ہیں کہ تم نے آخر اس حکومت کو کیا سمجھ کر اتنی بڑی ذمہ داری قبول کی تھی۔ کیا تمہیں اس کا علم نہیں تھا کہ تم جس حکومت کی باگ ڈور سنبھال رہے ہو، وہ "اسلامی حکومت" ہے۔ اگر تمہیں اس کا علم نہیں تھا تو پھر ایسے بے خبر لوگوں کو فرمانروائی تو کیا گدائی کرنے کا بھی حق نہیں پہنچتا، اور اگر تم نے پورے علم و خبر کے ساتھ بہ صحتِ ہوش و حواس پاکستان کو اسلامی حکومت سمجھتے ہوئے، اس بارِ گراں کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا تھا تو پھر بتاؤ تم نے اس حکومت کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کیا کیا؟ اسلامی اخلاق کی طرف کوئی ایک قدم بڑھا۔ کوئی ایک نیکی قائم ہوئی۔ کسی ایک بدی کو تم نے مٹایا؟

اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لئے تمہارا ایک لمحہ بھی صرف ہوا؟ تمہاری چند ساعتیں بھی اس سوچ میں کام آئیں کہ پاکستان کے دستور نے جس اسلامی معاشرے کے قیام کی ذمہ داری اربابِ اختیار پر عائد کی ہے، وہ یہاں کس تدبیر سے قائم ہو سکتا ہے؟ اُس کے لئے کیا کرنا اور کیا ہونا چاہیئے؟

یہ بات اپنی جگہ درست اور بجا ہے کہ تم نے دستور بنتے وقت اسلامی دستور سازی کی مخالفت کی ہے۔ تمہیں یہ پسند نہیں تھا کہ یہ حکومت "اسلامی جمہوریہ" کہلائے۔ مگر جب تم نے حکومت کے مناصب کو قبول کر لیا تو تمہارا فرض تھا کہ تم اُس دستور کا اپنے قول و عمل سے احترام کرتے جس نے تمہیں کرسیاں عطا کی ہیں۔

ہم تم سے فرشتہ بننے کا مطالبہ نہیں کرتے مگر ہاں! اتنا پوچھتے ہیں کہ دستور سازی کے بعد خود تمہاری زندگی میں، تمہارے مشاغل میں اور تمہارے رجحانات میں کیا انقلاب پیدا ہوا؟ کیا تمہارا ضمیر واقعی اس پر مطمئن ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کار جن کو جن صفات (qualifications) کا حامل ہونا چاہیئے، وہ صفات تم میں موجود ہیں؟

دستور بننے کے بعد تم سے جو ظہور میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ تم نے اپنی کوشش سے، اپنے اثر سے اور اپنی تگ و دو سے پاکستان کے ایک حصہ کے لئے "مخلوط انتخاب" منظور کرایا ہے اور اس طرح وہ "دو قومی نظریہ" جس کی بنیاد پر پاکستان کی جنگ لڑی گئی ہے، تم اُسے باطل ٹھہرا چکے ہو!

مادّی وسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مردِ مومن کا سب سے بڑا ساز و سامان اُس کی اخلاقی اور ایمانی قوت ہے، یہی وہ قوت ہے جو دشمن کے مادّی ذرائع کی فراوانی کا مقابلہ کرتی ہے، اس قوت نے ایسے ایسے کرشمے دکھائے ہیں کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے جرار لشکروں کو گھانس کے تنکوں کی طرح منتشر اور گرد و غبار کی مانند پریشان کر دیا ہے! اے خداوندانِ حکومت! سچائی کے ساتھ بتاؤ کہ ملک کی اخلاقی قوت میں تمہارے اصولِ حکمرانی نے کتنا اضافہ کیا؟

وہ پاکستان جس پر اسلامی حکومت کا لیبل لگا ہوا ہے، باہر کے لوگ جب اُسے آکر دیکھتے ہیں، تو اُن کے ذہن و فکر میں یہ سوالات یقیناً اُبھرتے ہوں گے اور اُبھرنے چاہئیں![1]

(۱) یہ رقص و سرود، یہ قمار بازی اور شراب خواری، یہ عورتوں اور مردوں کا بے باکانہ اختلاط، سب کچھ ہمارے ملکوں میں بھی موجود ہے۔

اگر اسلام اسی قسم کا معاشرہ پیدا کرتا ہے تو پھر اُس کے اُن اخلاقی دعووں کی کیا قدر وقیمت باقی رہ جاتی ہے، جن کا شور مدت سے سُن رہے ہیں! ہم نے تو کراچی اور لاہور میں آکر یہ محسوس کیا ہے کہ ہم ایک "لندن خورد" یا "پیرس کوچک" میں آگئے ہیں۔ وہی لیل و نہار، وہی نفس کی دراز دستیاں اور وہی سوسائٹی کا رنگ! اسلامی معاشرے اور مغربی سوسائٹی میں ہمیں تو کوئی امتیازی چیز اور انفرادی خصوصیت نظر نہیں آتی!

(۲) جو لوگ قدرت واختیار رکھنے کے باوجود اپنے معتقدات اور نظریوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے، اُن کی دوستی کسی دوسرے ملک کیلئے کس طرح مفید ہو سکتی ہے، اس لئے کہ جو اپنے معتقدات کے ساتھ مخلص اور وفادار نہیں ہیں۔ وہ کسی غیر کے ساتھ مخلص اور وفادار کیا ہوں گے؟

(۳) اسلام کے قدیم اصول زمانہ کی ترقی کا آخر ساتھ نہ دے سکے، اس لئے خود مسلمانوں کو اپنے اصول بدل دینے پڑے، — دعوے تو یہ تھے اسلام کے اصول ابدی ہیں اور اسی دین کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی فلاح و رہنمائی کے لئے پسند فرمایا ہے، مگر.....!

پاکستان کے موجودہ حالات جو اسلام کی رُسوائی کا باعث بن رہے ہیں۔ اس کا ذمہ دار آخر کون ہے؟ پاکستان تو اسلام کی سربلندی کے لئے بنا تھا، نہ اس لئے کہ اُس کے حالات کا مشاہدہ دُوسروں کو "اسلام" ہی کے بارے میں بدگمان بنادے!

پچھلے "بڑے لوگوں" کا قصور یہ تھا کہ دستور سازی کے کام میں وہ ٹال مٹول کرتے رہے، مگر اے ملک کے سربراہ کارو! تمہارا قصور اُن سے زیادہ سنگین ہے کہ تم دستور کے تقاضوں کو پُورا نہیں کر رہے ہو اور تمہاری روش، پالیسی اور انداز حکومت میں وہ اسپرٹ نہیں ملتی، جو پاکستان کے دستور کی بنیاد ہے!

وہ ملک کس قدر خوش قسمت ہے، جس کے عوام نیکی کا چلن اور بھلائی کا قیام چاہتے ہوں اور جن کی یہ دلی تمنّا ہو کہ پاکستان کا گوشہ گوشہ اسلامی اخلاق سے معمور ہو جائے، جنہوں نے اس مقصد کے لئے برسوں جدوجہد جاری رکھی ہو اور اسلام کا نام سُن کر جن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہو!

اے عزت مآبو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ پاکستانی عوام کیا چاہتے ہیں؟ مگر اپنی طاقت کے نشہ میں تمہیں عوام کی پسند اور ناپسند کی پروا نہیں ہے! اُس ملک پر اتحاد و مسرّت کی کیا ایک صبح بھی طلوع ہو سکتی ہے، جس کے عوام اور ارباب حکومت کے درمیان نظریوں کی مستقل کشمکش برپا ہو۔ کیا تم ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم اپنی ذات، شخصیت، اعمال و کردار اور معتقدات و نظریات کے اعتبار سے وہی ہو، جیسے حکمران عوام کو مطلوب ہیں!

دستور سازی سے پہلے یہاں پاکستان میں نظریوں کی کشمکش تھی مگر دستور بننے کے بعد کم سے کم ارباب اختیار کو تو "دستور" سے پُورا پُورا تعاون کرنا چاہیئے تھا اور دستور کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ ایسا کرنے سے پاکستان متحد اور مستحکم ہوتا، اور نظریوں کی کشمکش میں پاکستانیوں کی اِنرجی صَرف نہ ہوتی! مگر تم نے یہ کیا کہ اختیار و اقتدار ملتے ہی سب سے پہلے اُس نظریہ پر ہاتھ صاف کیا، جس کی بُنیاد پر پاکستان وجود میں آیا ہے۔ "مخلوط انتخاب" جن ہتھکنڈوں، جوڑ توڑ اور سیاسی چالوں کے ذریعہ اسمبلی میں منظور کرایا گیا ہے۔ اُسے تم تو جانتے ہی ہو مگر عوام بھی اُس سے بے خبر نہیں ہیں! اس بھول میں نہ ہو کہ قصر و ایوان کے "اسرار" بس وہیں کے وہیں دفن ہو کر رہ جاتے ہیں اور کسی کو اُن کی ہوا تک نہیں لگتی، ایسا نہیں ہے، دُنیا میں ہر سازش کو، ہر جوڑ توڑ اور ہیت پھیری کو اور یا سویر حریم اسرار سے باہر آنا پڑتا ہے، پھر اسرار فضا کی تو ہوائیں تک غمّازی کرتی ہیں —!

"مخلوط انتخاب" حقیقت میں اسلامی دستور سازی کی اسپرٹ کے خلاف پہلا سنگین اقدام ہے۔ اور یہ پہل افسوس ہے کہ تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ تمہاری اس روش کے ظاہر ہونے کے بعد اگر عوام اسلامی دستور کے نفاذ و عمل کے بارے میں تم سے اندیشے رکھتے ہیں تو وہ کسی ناانصافی یا زیادتی کا ارتکاب نہیں کرتے!

حیرت ہے کہ تمہیں اُن "بڑے لوگوں" کے انجام سے کوئی عبرت نہیں ہوتی جو ایک دن تمہاری طرح اقتدار کی کرسیوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھے، انہوں نے حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے، مگر اللہ کے فضل سے عوام کے مقابلہ میں اُن کو بالآخر ہار ہی ماننا پڑی اور قدرت کے مخفی ہاتھ نے اُن کے اقتدار کی کرسیوں کو اس طرح اُلٹا کہ اُن کی تمام شان و شوکت دھری کی دھری ہی رہ گئی۔ ہماری تمنا ہے کہ تم ان بُری مثالوں کو تازہ نہ کرو اور اُس سبق کو پھر نہ دہراؤ۔ حکومت آج ہے کل نہ رہے گی، اقبال و یاوری نے سدا کس کا ساتھ دیا ہے جو تمہارا ساتھ دے گی ؎

ہمیں ہست رسمے سرائے فریب
گہے بر فراز و گہے بر نشیب

باقی رہنے والی چیز اعمال کی زشتی اور خوبی ہے۔ اللہ کی کتاب میں ہر انسان کا عمل لکھا جا رہا ہے، تم چاہو تو اپنے اعمالنامہ کو سیاہ بنانے کی بجائے سپید بنا سکتے ہو!

یاد رکھو کہ تم کسی سیکولر اسٹیٹ کے نہیں بلکہ ایک اسلامی حکومت کے سربراہ کار ہو۔ اُس دن سے ڈرو جب عوام زبانی احتجاج کی حد سے گزر کر تمہارا گریبان تھام کر تم سے محاسبہ کریں۔

حکمران طبقہ اور عوام کو بڑی حد تک ہم خیال اور ہم رنگ ہونا چاہیئے۔ اس یک رنگی کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو عوام اپنے کو تمہارے خیال کے مطابق بنالیں یا تم اُن کے ہم خیال بن جاؤ۔ اس میں سے پہلی صورت بہت دشوار ہے، کروڑوں آدمیوں کا اپنے معتقدات و نظریات سے دست بردار ہو کر چند مٹھی بھر انسانوں کا ہم خیال بن جانا جتنا مشکل ہے، اُتنا ہی آسان تھوڑے آدمیوں کا کروڑوں آدمیوں کے فکر و خیال سے ہم آہنگ ہو جانا ہے! اس وجہ سے اپنے دل و دماغ کو خالی کر دو کہ پاکستان کے عوام تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائیں گے، کوشش اس کی کرو کہ تم ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مصداق بن جاؤ۔ تمہارے اس نیک اقدام سے ساری نزاع اور کشمکش ختم ہو جائے گی!

اس خیال کو بھی اپنے دل سے نکال دو کہ کسی خارجی پالیسی میں تمہاری کامیابی یا ملک کی کوئی مادی ترقی پاکستانی عوام کے دلوں میں اقامتِ دین کے جذبہ کو سرد کر دے گی، اور وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ ملک کی ترقی کے لئے اتنا کچھ تو ہو رہا ہے۔ اب بیچارے "اسلام" کو خواہ مخواہ زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ تمہارے اندازے اور اندیشے ہیں تو غلط اندازے ہیں، دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی ترقی بھی "اسلام" کا بدل نہیں ہو سکتی اور مسلمان کو یہ کھلونے زیادہ دنوں تک بہلا نہیں سکتے۔ اگر پاکستان میں صرف "مادی ترقی" ہی یہاں کے عوام کا مقصد بن جائے، اور اُن کے سامنے نہ اُن کی آخرت ہو اور نہ اپنے خدا کی مرضی اور رسولؐ کی تعلیمات ہوں، تو پھر پاکستان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ امریکہ یا روس میں سے کسی ایک حکومت میں ضم ہو کر رہ جائے اور پھر اُسے تمہارے دستِ شفقت کی بھی ضرورت نہ رہے گی!

یہ کیا ہو رہا ہے؟

کشمیر کے مسئلہ میں عوام کی ہم نوائی سے یہ دھوکا نہ کھاؤ کہ وہ تمہاری قیادت پر ایمان لے آئے ہیں اور تمہارے سیاسی نظریوں میں بھی وہ تمہارا ساتھ دیں گے! کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان کو انشاءاللہ کامیابی

ضرور ہوگی کہ پاکستان حق پر ہے۔ یہ کامیابی اگر تمہارے دورِ حکومت ہی میں ہوگئی تو اس سے یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہاں کے عوام کشمیر کی خوشی میں اسلامی نظام کے مطالبہ ہی سے دست بردار ہو جائیں گے، ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ دنیا کی کوئی خوشی، کوئی منفعت اور کوئی کامیابی "اسلام" کا بدل نہیں ہو سکتی!

عوام کی ناخوشی اور بے اطمینانی ہی پچھلے حکمرانوں کے زوال کا باعث ہوئی ہے، تم نے کیا کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ عوام کی خوشی اور اطمینان کی کتنی مقدار کو تم اب تک حاصل کر چکے ہو۔ کیا تمہارا خفیہ محکمہ پبلک کی خوشی اور ناخوشی کی خبریں تم تک نہیں پہنچاتا۔ اگر یہ خبریں تملق اور چاپلوسی کی آمیزش کے بغیر اپنی اصلی کیفیت کے ساتھ تم تک پہنچتی ہیں تو حیرت ہے کہ تم اپنی روش کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، تم ایسا قدم کیوں نہیں اُٹھاتے جس سے عوام کا زیادہ سے زیادہ اعتماد تمہیں حاصل ہو اور اگر یہ اطلاعات تمہیں اس انداز میں پہنچائی جاتی ہیں کہ عوام میں نہ کوئی بے چینی ہے، نہ اضطراب ہے، ملک کے اِس گوشہ سے اُس گوشہ تک اعتماد و اطمینان کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے، تو تمہارے حالی موالی اور حاشیہ نشین تمہیں بڑی تاریکی اور شدید بے خبری میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اُس ذہنیت اور کردار کے لوگ ہیں کہ نادر شاہ کی فوجیں دہلی کی فصیل تک پہنچ گئیں اور "جی حضوری" رنگیلے شاہ کو یہی باور کراتے رہے کہ "جہاں پناہ کے اقبال سے سب کچھ ٹھیک ہے"!

پچھلے حکمرانوں کی بے عنوانیوں کی خبریں جس طرح عوام تک پہنچتی رہتی تھیں، وہ اب بھی پہنچ رہی ہیں۔ یہ نہیں کہ تمہارے کرسی نشین ہوتے ہی عوام بہرے اور گونگے ہو گئے ہیں اور ہواؤں نے خبر رسانی کا فرض انجام دینے سے اب انکار کر دیا ہے۔ دفتروں میں جو تقرر و تبدل ہوتا ہے، اُس میں صوبائی عصبیت کس تناسب سے کام کر رہی ہے؟ تجارتی لائسنس اور پرمٹ کن لوگوں کو کس طرح دیئے جاتے ہیں؟ کس افسر کو کس خصوصیت کی بنا پر دربار والا میں تقرب حاصل ہے؟ یہ سب اتے پتے عوام کو لگتے رہتے ہیں۔ ان میں مبالغہ آمیزی اور درمیان کے لوگوں کے نمک مرچ لگانے کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ مگر ایسی "سن گن" بے بنیاد نہیں ہوا کرتی۔ عوامی لیگ کو مالی اعتبار سے مضبوط بنانے کے لئے سرمایہ داروں کی طرف سے چندہ کی پیشکش میں کس کا اشارہ شریک ہے؟ یہ راز بھی اب سامعہ سے گزر کر لبِ گفتار تک آ پہنچا ہے!

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں تم بیشک زیادہ جرأت رکھتے ہو، اور تم جو چاہتے ہو کر گزرتے ہو۔ مگر تمہاری یہ جرأت خود تمہاری پارٹی کے مفاد اور تمہارے سیاسی اور وطنی رجحانات کے کام آ رہی ہے۔ مجموعی طور پر پاکستان کا اس سے فائدہ نہیں ہو رہا بلکہ کچھ نہ کچھ نقصان ہی پہنچ رہا ہے!

پاکستان کو درحقیقت وہ دماغ فائدہ پہنچا سکتا ہے جو پاکستان کے کسی حصّہ کو دُوسرے حصّہ پر ذرّہ برابر ترجیح نہ دے۔ جو پورے پاکستان کو ایک خاندان سمجھے، جس کے پیشِ نظر کسی مخصوص صوبہ، پارٹی اور گروہ کی ترقی اور بھلائی نہ ہو۔ جس کے پاس مسائل کے حُسن و قبح اور چیزوں کی قدر و قیمت پرکھنے کے لئے اسلام کے سوا اور کوئی کسوٹی اور پیمانہ نہ ہو۔ پاکستان اسی دل و دماغ، اسی فکر و نظر، اور اسی سیرت و کردار کے افراد کی تلاش میں ہے۔ نگاہیں کسی "عمر ابن عبدالعزیز" یا کم سے کم کسی صلاح الدین ایوبی اور ناصر الدین محمود کو ڈھونڈ رہی ہیں!

پاکستانی عوام اپنے اختیارات کا مظہر اُن افراد کو دیکھنا چاہتے ہیں جن کی پیشانیاں سجدوں سے معمور ہوں۔ جن کی خلوت و جلوت پر پاکبازی اور پرہیزگاری غالب ہو۔ جن کے دل اللہ کے خوف سے لبریز ہوں، جن کو بدی سے طبعاً نفرت اور بھلائی سے محبت ہو۔ جو ساغر بکف نہیں، ساغر شکن ہوں۔ جو ناچ گھروں اور شراب خانوں کو ویران بلکہ مسمار کرنے والے ہوں۔ اور جن کے

دم سے عبادت گاہیں اور دانش کدے آباد ہوں جن کی سیاسی بصیرت اور ایمانی فراست سے بڑے بڑے بین الاقوامی سیاست داں سہمے سہمے اور بھنچے بھنچے رہتے ہوں۔ جو اپنے اندر اسلام کو غالب کرنے کا داعیہ رکھتے ہوں۔ جو نہ کسی بلگانن اور چوین لائی سے دبتے ہوں اور نہ کسی میکملن اور آئزن ہوور کے چشم و ابرو کی طرف دیکھتے ہوں۔ اپنی جگہ خود ایک کوہ وقار، ایک جہانِ علم و آگہی، ایک طوفانِ جرأت و بے باکی۔ جس شبنم سے سچ مچ جگرِ لالہ کو ٹھنڈک نصیب ہو اور جس طوفان سے واقعی دریاؤں کے نہیں سمندروں کے دل دہل جائیں!

اسلام پسندوں سے!

اہلِ ایمان حالات سے خوف نہیں کھاتے، وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ حالات کے بدلنے کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے احوالِ عالم کو دگرگوں کیوں نہیں کر دیا؟ ہم سے سوال اس کا ہو گا کہ تم نے حالات کو بدلنے کے لئے اپنی توانائی کی کتنی مقدار کو صرف کیا؟

اللہ کی رضا مقصود ہو تو پھر کوئی خوف اور ہراس نہیں ؎

ملا رہا ہوں نگاہیں میں بجلیوں سے
نہ خوف ہے نہ خطر لا الٰہ الا اللہ!!

یہ وقت دینی جماعتوں سے اُلجھنے اور کٹنے کا نہیں، جڑے رہنے کا ہے۔ معصوم نہ کوئی فرد ہے اور نہ کوئی جماعت، بعض وقت اپنی ضرورت سے زیادہ "آزاد خیالی" کا وہم بھی اچھے خاصے آدمی کو "انارکسٹ" بنا دیتا ہے۔ دینی لوگوں پر یونہی عرصۂ حیات تنگ ہے اور بے دین طبقہ اُن کی رسوائی کے ہر وقت درپے ہے۔ اندازہ اس بات کا کرنا چاہیئے کہ کسی غلطی کی اصلاح اور نشِ مذہبی کا ڈھونڈورا پیٹنے سے دینی تحریک کے کسی نقصان کی تلافی کتنی ہو گی اور اس کے مقابلہ میں دین کے دشمنوں کی تخریبی کوششوں کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ بنانا مشکل ہے، ڈھانا آسان ہے، تعمیر کے لئے ایک مدت صرف ہوتی ہے اور تخریب کے لئے ذرا سی فرصت بھی بہت ہے! کسی جماعت کی ساکھ برسوں کے ایثار، فرض شناسی، خدمت و خلوص اور گرم و سرد دیکھنے کے بعد قائم ہوتی ہے۔ مگر اُسے معمولی شوشہ چھوڑ کر بٹہ لگایا جا سکتا ہے!

شیطان کے دھوکے بڑے پُر پیچ اور نفس کے فریب انتہائی نازک ہوتے ہیں، شیطان "اصلاح" اور "اعلانِ حق" کی آڑ میں بھی اپنا کام کر جاتا ہے ــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان فتنوں سے محفوظ رکھے اور ہماری ذات کسی دینی فساد کا سبب نہ بننے پائے! پاکستان کے جن حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے اُن کا تقاضا ہے کہ اسلام پسند اکٹھے ہو کر "بنیانِ مرصوص" بن جائیں۔ آپس کا اختلاف اور انتشار اسلام پسندوں کی ہوا اُکھاڑ دے گا اور پاکستان میں اقامتِ دین کی کوششیں کمزور ہو کر رہ جائیں گی۔ کسی اقدام سے پہلے یہ سوچیئے کہ آپ کا یہ فعل اغیار کے لبوں پر تبسم پیدا کرے گا یا اپنوں کی آنکھوں میں آنسو!!

ماہر القادری

۲۳ جنوری ۵۷ء

زاہد صدیقی
(سابق مبلغ دیندار انجمن)

بے نقاب!

"فاران" جب سے نکلنا شروع ہوا ہے، اپنی طرز کا یہ پہلا مضمون ہے جو "فاران" میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ مضمون فصاحت وادب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نہیں لکھا گیا اور نہ اس نقطۂ نگاہ سے ہم نے اسے جانچا ہے۔ صاحبِ تحریر کو نہ مضمون نگاری کا شوق اور مشق ہے اور نہ وہ شہرت کا داعیہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ موصوف ایک خاموش دینی خدمت گزار ہیں اور اپنے ہر نیک کام کا اجر اپنے اللہ سے چاہتے ہیں۔

یہ مضمون خاصہ طویل ہے مگر جب تک صراحت نہ کی جائے گی، بات پوری طرح کھلے گی نہیں! سنئے:۔

حیدرآباد دکن میں ایک صاحب کا نام صدیق حسن تھا، جو اپنے نام کے ساتھ "چن بسویشور" لکھتے تھے۔ عام طور پر اُن کا نام اور لقب اس طرح لکھا جاتا تھا۔

"صدیق دیندار چن بسویشور"

بلدہ حیدرآباد میں اُن کی خانقاہ کا نام "خانقاہ سرورِ عالم" تھا۔ اُن کے مُرید اور متبع گیروا رنگ کا نیچا کُرتہ اور اُس پر صدری پہنتے تھے۔ سر پر کلاہ اور کلاہ پر ہرے رنگ کا صافہ باندھتے تھے، لانبے بال! پاکستان میں بھی ان لوگوں کی یہی وضع اور حلیہ ہے۔ کراچی اُن کا مرکز ہے اور پاکستان کے شہروں میں اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے دَورے کرتے رہتے ہیں۔

ہاں! تو میں نے صدیق دین دار صاحب کے بارے میں یہ سُنا کہ یہ صاحب ہندوؤں کے فرقہ لنگایت میں تبلیغ کرتے ہیں اور بعض لنگایتوں کو مسلمان بھی بنا لیا ہے۔ یہ خبر میرے لئے ہر اعتبار سے دل خوش کن تھی۔

صاحبِ مذکور کی خانقاہ میں سیرت النبیؐ کے جلسے بھی ہوا کرتے تھے، دو تین بار مجھے بھی بلایا گیا۔ میں نے نظمیں پڑھیں۔ ایک بار نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم سے اس خانقاہ کا ذکر آیا تو وہ بولے۔ "اس شخص صدیق دیندار چن بسویشور کی میں نے بہت مالی مدد کی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ شخص غیر مسلموں کو دینِ حق کی راہ دکھا رہا ہے مگر جب سے یہ معلوم ہوا کہ ایک عدالت میں صدیق دیندار نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کو حق پر سمجھتا ہوں۔ اُس وقت سے مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی۔" میں نے چن بسویشور صاحب کے بارے میں اور زیادہ ٹوہ نہیں کی۔ نواب صاحب کو میں ہر اعتبار سے ثقہ راوی سمجھتا تھا۔

٭ حیدرآباد دکن میں اوّل تعلقدار (کلکٹر) تھے، بڑے خوددار اور سیر چشم! نماز روزے کے انتہائی پابند! داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ مزاج تخلص کرتے تھے۔ اُن کا مجموعہ کلام (کیفیات مزاج) شائع ہو چکا ہے۔ دکن میں سب سے زیادہ انہی سے میرے مراسم تھے۔ ایسے وضعدار اور ہمدرد دوست کسی کو کہاں میسر آتے ہیں۔ دکن کی بربادی کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور چار سال ہوئے کہ اسی خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے! (اللھم اغفرہٗ وانزل علیہ امطار الرحمۃ)

حیدر آباد دکن کے دوچار آدمیوں نے بھی اس کی تصدیق کی، بات آئی گئی ہو گئی۔ میں سنہ ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد دکن چھوڑ کر دلی چلا آیا۔ پھر تقسیم ہند کا واقعہ پیش آ گیا۔ اور سنہ ۱۹۴۷ء کے آخر میں دوسرے مصیبت زدوں کی طرح میں بھی پاکستان آ گیا۔

ہاں! یہ کہنا تو بھول گیا کہ یہ صدیق دیندار صاحب "مثیل یوسف" ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے، حالانکہ وہ ذرا بھی خوبصورت نہیں تھے اور آنکھوں میں آشوب کی سی کیفیت تھی جس سے حلیہ کچھ بگڑا ہوا ہی نظر آتا تھا!

یہاں کراچی میں اس جماعت کے کچھ لوگ کبھی کبھار دکھائی دیئے اور اُن میں سے ایک صاحب دفتر "فاران" میں تشریف لائے اور دبے لفظوں میں اپنے مسلک کا اظہار فرما بھی دیا، میں نے اُن صاحب کو بُری طرح جھاڑا، اُس دن کے بعد پھر ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ اس واقعہ کو بھی تقریباً سات سال ہونے کو آئے!

سال ڈیڑھ سال ہوا کہ ایک صاحب کی زبانی اطلاع ملی کہ دیندار جماعت کے لوگوں نے صدیق دیندار صاحب کا عرس کیا ہے ایک دو جلسوں میں ان لوگوں کے اشتہارات بھی نظر سے گزرے، یاد پڑتا ہے کہ انگریزی زبان میں بھی کوئی چھوٹا سا پمفلٹ انہوں نے چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔ غالباً اُس موقع پر جب کراچی میں بہت سے ملکوں کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی!

چند مہینے ہوئے کہ اس جماعت کی طرف سے ایک کتاب دفتر "فاران" میں تبصرہ کے لئے وصول ہوئی تھی۔ مجھے نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کی وہ بات یاد تھی کہ صدیق دیندار نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں مرزا غلام احمد قادیانی کو حق پر سمجھتا ہوں"۔ میں نے دیندار جماعت کے ناظم سے خط و کتابت کی۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی نہیں مانتے!

اس کے بعد "فاران" میں اس کتاب پر تبصرہ شائع ہوا اور ہم نے اس تبصرے میں قادیانیت کا ذکر نہیں چھیڑا اور اس باب میں احتیاط کو ملحوظ رکھا!

اسی سال ربیع الاول میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے میرے نام سیرۃ النبی کے جلسہ کا دعوت نامہ آیا اور ان لوگوں نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھے بلایا، سیرت النبی کا مبارک جلسہ، بلانے والوں کا پُر خلوص اصرار، پھر آزاد کشمیر دیکھنے کا مجھے شوق بھی تھا۔ اس شوق میں یہ حسرت بھی شریک تھی کہ مظفر آباد جانا ہو گیا تو وہاں سے شہید بالا کوٹ کیا دُور رہے ہیں؟ وہاں بھی ہو آؤں گا! بات طے پا گئی۔ کراچی سے چل کر راولپنڈی پہنچا اور وہاں سے بس کے ذریعہ مظفر آباد۔ راستہ بھر مناظر ہی مناظر فلم کے پردوں کی طرح نگاہ سے گزرتے رہے!

مظفر آباد کی سیرت کمیٹی نے گورنمنٹ کالج میں مہمانوں کے ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ سعید بن وحید صاحب بھی اس جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے کراچی سے آئے ہیں۔ کھانے کے وقت اُن سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا یہ تو صدیق دیندار صاحب کے چیلے ہیں۔ اُن کے ساتھ اُسی مخصوص لباس میں اس مضمون کے لکھنے والے (زاہد صدیقی صاحب) بھی تھے، جن کا نام اُس وقت تک معلوم نہ تھا۔

شب میں سیرت کا جلسہ ہوا۔ مظفر آباد کی آبادی کے تناسب سے یہ بہت بڑا مجمع تھا، نشستوں کا انتظام بھی معقول تھا۔ میں نے نعتیہ نظمیں پڑھیں۔ دو تین مولوی صاحبان نے تقریریں کیں۔ اُن کے بعد سعید صاحب نے خاصی دلچسپ تقریر کی۔ جس میں کوئی چیز کسی کو نہیں کھٹکی۔ سعید ابن وحید اور زاہد صدیقی دونوں صاحبان نماز ہمارے ساتھ ہی جماعت سے پڑھتے تھے۔ اس لئے میرے دل میں یہ حسنِ ظن پیدا ہونے لگا کہ ان لوگوں کے بارے میں شاید کچھ مبالغہ آمیز باتیں مشہور کر دی گئی ہیں، یا

ان کا کل بدوشوں نے پاکستان میں آنے کے بعد اپنے عقاید کو بدل دیا ہے یا کم سے کم ان میں اعتدال پیدا کر لیا ہے!

سعید بن وحید صاحب نے اپنے پیرو مرشد بانی سلسلہ صدیق دیندار صاحب کی ایک تصنیف مجھے دی، جس میں یہ پڑھ کر کہ صاحب تصنیف نے قادیانی فرقہ کو "اسلام[1] کا ایک فرقہ" کہا ہے۔ طبیعت کو بڑا انقباض ہوا۔

شب میں سیرت النبی کا آخری اجلاس تھا۔ اس جلسہ میں زاہد صدیقی صاحب نے تقریر کی اور اس کے بعد سعید بن وحید صاحب نے۔ پہلے دن اعلان کیا گیا تھا کہ صاحب موصوف دوسرے دن بھی تقریر کریں گے، کیونکہ اُن کی تقریر نامکمل رہ گئی ہے!

اُن کی تقریر خاصی طویل ہو گئی مگر مجمع نے اُسے دل چسپی کیساتھ سُنا۔ جلسے کے اناؤنسر جناب ہاشمی صاحب نے انھیں ٹوکا اور یہ اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر اسٹیج سے ہٹے تو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے چند لوگ اُٹھنے لگے۔ اس لئے ان کو پھر بلایا گیا۔ اور انہوں نے اپنی تقریر اب جو شروع کی ہے، تو کمیونسٹوں اور قادیانیوں کی طرح مجمع کی دل چسپی اور اپنی مقبولیت سے فایدہ اُٹھانے کی پوری کوشش کی!

اب کی بار اُن کا اندازِ بیان تصوف آمیز تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و منقبت کیساتھ حضور کے اُمتیوں کی تعریف اس طرح کی جس سے دوسرے انبیاء کرام کی تنقیص کا پہلو نکلتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ خیال یہ تھا کہ شاید تقریر کی رَو میں وہ ایسا کہہ گئے ہیں۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ وہ اپنی تقریر میں پوری طرح کھل گئے، اور اُن کے دل کی بات زبان تک آہی گئی۔ تانبے پر چاندی کے اس مُلمع کو ایک نہ ایک دن اُترنا ہی تھا۔ ملمع کو دوام نہیں یہ چھُٹ کر اور اُتر کر ہی رہتا ہے۔ سعید بن وحید صاحب نے اپنی تقریر میں ایسا رنگ اختیار کیا کہ جس میں اُمتِ محمدیہ کے اولیاء اور صالحین کو انبیاء کرام پر ترجیح دی گئی۔ وہی عجمی تصوف کے نکتے اور لطیفے۔ لفظی موشگافیاں۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا:-

"...... کہ جہاں سے نبوت ختم ہوتی ہے، وہاں سے تو مومن کے کمال کا آغاز ہوتا ہے۔ اور کوئی مومن اگر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنے مرتبہ سے نیچی بات کا دعویٰ کرتا ہے ......"

تقریر میں انبیاء کرام کی تنقیص کا رنگ غالب تھا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، میں تیزی کے ساتھ بڑھ کر مائیکروفون پر آیا۔ اور میں نے کہا کہ سیرت النبی کے اسٹیج سے یہ قادیانیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ مرزائے قادیان نے بھی حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تنقیص اور توہین کی ہے اور اس سے اُس کا مقصود اپنی جھوٹی نبوت پر دلیل لانا تھا۔ یہی انداز ان صاحب (سعید بن وحید) نے اختیار کیا ہے۔ نبی کی تنقیص کفر ہے۔ اور اولیاء تو ایک طرف رہے، کوئی بڑے سے بڑا صحابی بھی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے بعد جلسہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن مظفر آباد کی جامع مسجد میں نماز سے پہلے میں نے تقریر کی۔ "مقامِ نبوت" تقریر کا موضوع تھا۔ رات کی گمراہ کُن تقریر کے مالہ وما علیہ پر بھی روشنی ڈالی۔ شام کو کچھ حضرات مجھ سے ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے کہا۔ سیرت النبی کے جلسہ میں اُس شخص کو آپ کے بروقت ٹوکنے اور جامع مسجد کی تقریر کا شہر میں خاصہ چرچا ہے آپ نے ایک بڑے فتنہ کو بے نقاب کر دیا!

ہاں! یہ بات تو کہنے سے رہی جاتی ہے کہ اُس آخری جلسہ کی صبح کو جب ہم نے ناشتہ کیا تو دستر خوان سے اُٹھتے وقت میں نے زاہد صدیقی صاحب سے کہا کہ آپ کراچی جب لوٹ کر آئیں تو مجھ سے آکر ضرور ملیں۔ پھر میں دوسرے دن مظفر آباد

---

[1] "مسلمانوں کا ایک فرقہ" یا "اسلام کا ایک فرقہ"۔ ان میں سے کوئی ایک جملہ تھا۔ (م۔ ق)

سے راولپنڈی آیا، وہاں سے اُسی شب میں لاہور پہنچا، لاہور سے ملتان کے مشاعرے میں شرکت کرتا ہوا کراچی آ گیا۔

دسمبر کے شروع میں زاہد صدیقی دفتر "فاران" میں میرے پاس تشریف لائے، اس موضوع پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی میں نے محسوس کیا کہ اُن میں قبولِ حق کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ بیچارے محض ناواقفیت کے سبب اس جماعت کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ قادیانیت سے وہ انتہائی بیزار ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ پروفیسر الیاس برنی صاحب کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" کو پڑھ لیجئے۔ آپ کو صدیق دیندار چن بسویشور کے معتقدات کا پتہ چل جائیگا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کتاب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ مظفر آباد کے بعد میں نے اس جماعت کے معتقدات کا اپنے طور پر پتہ بھی لگایا ہے کہ یہ لوگ اصل میں کیا ہیں؟

اس واقعہ کے تیسرے یا چوتھے دن وہ پھر دفتر میں آئے، میں نے "قادیانی مذہب" کے وہ اوراق انہیں کھول کر بتائے، جن میں صدیق دیندار چن بسویشور کا ذکر تھا۔ انہوں نے کتاب لے لی اور پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔ میں دفتری ڈاک دیکھتا رہا۔ کتاب پڑھ کر وہ ایک خاص تاثر کے ساتھ بولے کہ مجھے تو اب تک ان باتوں کا پتہ ہی نہ تھا۔ آپ مجھے یہ کتاب گھر پر مطالعہ کے لئے دے دیجئے۔ چن بسویشور کی جن کتابوں کے اقتباس پروفیسر برنی صاحب نے دیئے ہیں۔ ان کتابوں کو میں اس جماعت کے لوگوں سے لے کر پڑھوں گا، میں نے اُن سے کہا کہ جناب الیاس برنی نے اس کتاب میں جو بات لکھی ہے صحیح حوالہ کے ساتھ لکھی ہے۔ خود قادیانی گروہ اس کتاب کے حوالوں (References) کی تردید نہیں کر سکا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اصل کتابیں آپ کو یہاں نہ مل سکیں یا یہ لوگ ان کتابوں کو چھپالیں۔ پھر میں نے اُن سے چائے پینے کے لئے کہا۔ وہ مسکرا کر ہچکچانے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ آج چائے تو آپ کو میں پلا کر چھوڑوں گا۔ صدیق دیندار کی اس گمراہ جماعت نے ایک حلال چیز کو اپنے اُوپر بلاوجہ حرام کر لیا ہے۔ چائے بہت سے آدمی نہیں پیتے۔ آپ کی طبیعت نہ چاہے تو آپ بھی نہ پیا کیجئے۔ اور اس کا کثرت سے استعمال صحت کے لئے کچھ اچھا ہے بھی نہیں۔ مگر ایک حلال چیز کو حرام سمجھنا دین میں زیادتی ہے۔ خیر! چائے آئی، انہوں نے چائے کی پیالی:

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

کہتے ہوئے اُٹھا لی۔

چند دنوں کے بعد وہ پھر تشریف لائے۔ بولے کہ حق پوری طرح واضح ہو گیا۔ چن بسویشور صاحب کی جن کتابوں کا "قادیانی مذہب" میں الیاس برنی صاحب نے حوالہ دیا ہے، وہ بھی مل گئیں۔ میں نے حوالوں کو اصل کتاب سے مقابلہ کر کے دیکھا تو نقل کو مطابق اصل پایا۔ بعض باتوں کی حقیقت تو خود میری اپنی تحقیق سے کھُل گئی تھی اور اب تو شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔

میرے دریافت کرنے پر کہ آپ اس جماعت سے متاثر کس طرح ہوئے؟ بولے کہ باسم ضلع آکولہ (برار) کا رہنے والا ہوں سعید بن وحید وہاں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ٹیچر تھے۔ اُن سے میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ یہاں پاکستان میں آنے کے بعد اُن کے لباس سے، اُن کی گفتگو سے اور اس سے کہ یہ لوگ سختی اُٹھا کر تبلیغی دورے بھی کرتے ہیں، متاثر ہو گیا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ جماعت قادیانیت ہی کی ایک انتہائی خطرناک شاخ ہے۔ اور آپ کی اس رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ یہ لوگ "تقیہ" بھی کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو چھپائے رہتے ہیں!

میں نے موصوف سے درخواست کی کہ آپ ایک مضمون کی صورت میں اپنے تاثرات قلمبند فرما دیں تو میں "فاران" میں

چھاپ دوں گا ۔ انہوں نے بطیب خاطر مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا اور اپنے وعدے کو پورا بھی کر دیا ۔ یہ مضمون اعتراف صداقت کا ایک قبالہ نامہ اور قبولِ حق کی ایک دستاویز ہے ۔ اس قدر انشراحِ صدر کے ساتھ قبولِ حق اور پھر اس کا جرأت آمیز اظہار قوتِ ایمانی کی دلیل ہے!

(ماہر القادری)

کتنی مبارک تھی وہ مجلس جس میں مجھے ایک مردِ قلندر کو دیکھنے اور نعتیہ اشعار سننے کا پہلی بار اتفاق ہوا ۔ یعنی عاشقِ رسولؐ جناب ماہر القادری کی زیارت سے جلسہ سیرت النبیؐ منعقدہ ۱۷۔۱۸۔ ماہ اکتوبر بمقام مظفر آباد آزاد کشمیر مشرف ہونے کا موقع ملا اور کیسی انقلابی تھیں وہ گھڑیاں جب میں نے اس شیر دل انسان کو ہزار ہا افراد کے مجمع میں عشقِ رسولؐ اور غیرتِ ایمانی کے بے پناہ تقاضوں سے مجبور ہو کر اسٹیج کے قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک منافق اور بے ضمیر مبلّغ اور مقرر سعید بن وحید بی اے (علیگ) کو محبتِ رسولؐ کے ملمع میں قادیانیت کا زہر سیدھے سادے مسلمانوں کو کھلاتے دیکھ کر گرجدار آواز میں مائک پر آکر ٹوکتے ہوئے دیکھا ۔ اس مردِ خدا کی بروقت مداخلت نے نہ صرف ہزار ہا افراد کے سامنے مقرر کو بے نقاب کر دیا بلکہ مجھ جیسے سادہ لوح اور جذباتی نوجوانوں کو ظلمت میں گھرنے سے قبل چونکا دیا ۔

کیونکہ راقم الحروف نے چار سال کا عرصہ ہوا جمعیت حزب اللہ دیندار انجمن کو ایک تبلیغی ادارہ تصور کرتے ہوئے زندگی وقف کر کے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں اس کے بعد سے مندرجہ بالا واقعہ تک میں ایک سرگرم مبلّغ کی حیثیت سے مغربی پاکستان میں دورہ کرتا رہا ۔ اور ہزار ہا افراد کے مجمع میں اس جماعت کا تعارف کراتا رہا ۔ لیکن یہ کسے خبر تھی کہ جنہیں میں نے خادم الدین سمجھا ہے وہ غارتگرِ ایمان اور منکرینِ ختمِ نبوت ہیں ۔ صوفیانہ حلیہ[1]، دیندارانہ وضع قطع ۔ فرقوں کے اتحاد کے متمنی ۔ غرض یہ کہ انھیں آپ دیکھ کر کبھی بھی یہ تصور نہیں کر سکتے کہ اس وضع قطع کے لوگ بھی دین داری کی آڑ لے کر بے دینی اور مشرکانہ عقائد کی در پردہ تبلیغ کرتے ہوں گے ۔ خدا بھلا کرے جناب ماہر القادری کا کہ انہوں نے بروقت اس جماعت کی اصلیت سے آگاہ فرما کر ہزار ہا افراد کو بھنور سے نکالا ۔

ہوا یوں کہ اس سال مظفر آباد سیرت کمیٹی نے سیرت النبیؐ کے جلسے میں دیندار انجمن کے ایک مبلّغ سعید بن وحید بی اے کو مدعو کیا ــــ سعید بن وحید صاحب نے جبکہ میں رحیم یار خاں میں دورہ پر تھا، مقررہ تاریخ تک مظفر آباد پہنچنے کو کہا ۔ میں ۱۳۔ اکتوبر کو مظفر آباد پہنچا ۔ اس وقت تک دیگر مقررین میں سے کوئی بھی نہ پہنچا تھا ۔ شام میں بعد عصر سیکرٹری سیرت کمیٹی نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا سعید بن وحید صاحب اور ماہر القادری صاحب میں کوئی اختلاف ہے؟ چونکہ میرے علم میں ان کا کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا میں نے نفی میں جواب دیا ۔ انھیں اطمینان ہو گیا کیونکہ انہوں نے ماہر القادری صاحب کو بھی دعوت دی تھی ۔ شاید ۱۶۔ اکتوبر کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سعید بن وحید صاحب اور ماہر القادری صاحب بھی مظفر آباد پہنچ گئے ۔ دونوں میں بظاہر کوئی اختلاف نظر نہ آیا ۔ میں نے سعید صاحب سے پوچھا کہ کیا ہمارے ادارہ سے ماہر القادری صاحب کو کوئی اختلاف ہے؟ سعید صاحب نے جواب دیا کہ "ہاں وہ تصوف کا دشمن ہے اور حضرت صاحب (صدیق دین دار چن بسویشور) کی کتاب معراج المومنین پر بے تکی تنقید کی ہے" یہ اختلاف خیر کوئی ایسا اختلاف نہ تھا میں خاموش ہو رہا ۔ دوسرے دن جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی، مقررین زیادہ تھے ۔ ماہر القادری صاحب کے لئے نعتیہ کلام کے علاوہ ایک گھنٹہ کا وقت مقرر تھا ۔ اور سعید صاحب کو بھی

---

[1] اس جماعت کا مخصوص لباس ہے ۔ گیروا کرتہ ۔ ہری پگڑی ۔ لمبے بال ۔ کراچی میں لارنس روڈ مقابل پاکستان کوارٹرز "جاوید ڈرائی کلینرز" اس جماعت کا دفتر ہے ۔ اور پشاور میں چوک یادگار میں ۔ پنجاب میں چک وجی ۵۷ اور لائلپور ۔

ایک گھنٹہ دیا گیا تھا۔ لیکن سعید صاحب کے مضمون کا پھیلاؤ دیکھتے ہوئے ماہر القادری صاحب نے اپنا ایک گھنٹہ بھی اُنہی کو دے دیا۔ اس طرح سعید بن وحید صاحب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بولتے رہے۔ تقریر اچھی رہی۔ دوسرے دن بھی ماہر القادری صاحب نے مجمع کے اصرار کے باوجود خود تقریر نہ کی اور ان کی سادگی اور نیک نیتی دیکھئے، آج بھی اپنا وقت سعید صاحب کو دے دیا۔ لیکن مجھے انتہائی رنج اور افسوس ہے کہ دُوسرے دن تقریر کے اثرات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سعید صاحب نے بہائیوں اور قادیانیوں کی طرح فلسفیانہ مغالطوں اور منطقی ہیچ پیچ رگیوں کا سہارا لیتے ہوئے تصوف کی چاشنی کے ساتھ نہ صرف قادیانی نبی کو مسیح موعود منوانے کی کوشش بیجا کی بلکہ انبیاء کرام کی توہین تک اُتر آئے۔ مجمع میں عام اضطراب نظر آنے لگا، لوگ حیران تھے کہ سیرت النبیؐ کے اسٹیج سے ہم کیا سُن رہے ہیں؟ اسٹیج سیکرٹری نے پریشان ہو کر سعید صاحب کو تنبیہاً ایک رقعہ بھی دیا۔ لیکن ایسا موقع اُنھیں پھر کب ملنے والا تھا، بے پروا کئے بغیر کہتے چلے گئے، میں مبہوت بنا بیٹھا تھا۔ ایسی باتیں پہلی بار اُن کی زبان سے میں نے سُنیں، اسی کشمکش کے عالم میں جبکہ میں سوچ رہا تھا کہ آج سعید صاحب کو کیا ہوگیا ہے؟ یہ کیسی اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہیں۔ ماہر القادری صاحب شاہین کی طرح جھپٹے اور مائک پر گرجدار آواز میں آپ نے سوال کیا۔ "سعید صاحب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" یہ مختصر سا سوال ایک بجلی تھا، جس نے خرمنِ باطل کو جلا کر رکھ دیا!

اس پر چند لوگ کھڑے ہوگئے اور ماہر صاحب پر آوازے کسنے شروع کردیئے۔ ایک طرف سے آواز آئی، "آپ بیٹھ جایئے ختم نبوت کی بہترین تشریح ہو رہی ہے۔ (یہ کسی قادیانی کی آواز تھی) دُوسری طرف سے شور اٹھا" یہ قادیانیوں کا اسٹیج نہیں ہے"! اسٹیج سیکرٹری کی انتظامی صلاحیتوں کی داد دینی چاہیئے کہ ایسے نازک لمحات میں انہوں نے چند منٹ میں مجمع پر قابو پالیا۔ اس کے بعد صرف دس منٹ میں ماہر صاحب نے سعید بن وحید صاحب اور دیندار انجمن کے گمراہ کن عقائد کی پول کھول کر رکھ دی۔ دُوسرے دن نماز جمعہ کے بعد سلطانی مسجد میں بھی اس مار آستین جماعت کے متعلق آپ نے مزید معلومات لوگوں تک پہنچائیں۔ نماز جمعہ کے بعد کئی لوگ ہماری قیام گاہ پر آئے اور سعید بن وحید صاحب سے اُن کے عقائد کی وضاحت طلب کی۔ لیکن موقع کی نزاکت کو بھانپ کر سعید بن وحید صاحب نے گول مول جواب دے کر سب کو ٹال دیا۔

ان ہنگاموں کے بعد میں ماہر القادری صاحب سے ملا اور پوچھا کہ کیا آپ کے پاس اس جماعت کے قادیانی ہونے کا کوئی تحریری ثبوت موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ "قادیانی مذہب" مصنفہ پروفیسر الیاس برنی پڑھ لیجئے۔ اور اگر آپ کو نہ ملے تو کراچی میں دفتر فاران آکر مجھ سے ملیئے"۔ اس کے بعد میں نے ماہر صاحب سے سوال کیا کہ "جب آپ ان کے عقائد سے واقف تھے تو پھر آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ اور تقریر کے لئے سعید صاحب کو اپنا وقت بھی کیوں دے دیا؟" ماہر القادری صاحب نے جواب دیا۔ "مولانا! یہی تو سب سے زیادہ خطرناک بات ہے کہ یہ لوگ تقیہ بھی کرتے ہیں۔ ان کی کتاب معراج المومنین پر تبصرہ سے پہلے میں نے ان لوگوں سے خط وکتابت میں مندرجہ ذیل سوال کئے:۔

۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

۲۔ صدیق دیندار چن بسویشور کی آپ کی نظر میں دینی پوزیشن کیا ہے؟

۳۔ یوسف موعود ہونے کا دعویٰ جو دیندار صاحب نے کیا تھا، اُس کی تفصیلات کیا ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ "ہم ہر مدعی نبوت کو کافر، کاذب، دجال سمجھتے ہیں۔ اور صدیق دیندار صاحب کو پیر طریقت سے زیادہ کچھ نہیں ملنتے"۔ معاملہ صاف تھا۔ میں نے ظن المومنین خیراً کے پیش نظر اس جواب سے مطمئن ہو کر نہایت نرم انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے تصوف کی بھول بھلیوں میں کھو جانے والی جماعت ان کو قرار دیا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ یہ اس قدر منافقانہ

انداز میں کام کرتے ہیں ۔ اور یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ آپ کو ان کے ساتھ چار سال کا عرصہ کام کرتے ہو گیا ۔ لیکن آپ سے بھی اس قدر اپنے عقائد چھپاتے رہے !"

ماہر القادری صاحب سے یہ تفصیلات معلوم کر کے میں نے ٹھان لی کہ چاہے مجھے دس سال اور اس جماعت کے ساتھ رہنا پڑے میں ضرور ان کی تمام تصانیف پر جو اب تک مجھے نہ دی گئی تھیں قبضہ کر دوں گا ۔ اور انھیں اس منافقت کا مزہ چکھاؤں گا ۔ چنانچہ میں نے سعید صاحب سے کشمیر میں علیحدگی کو خلاف مصلحت سمجھا اور ان کے ساتھ دورہ کرتے ہوئے کراچی لوٹا ۔ کراچی آکر سب سے پہلے مختلف ترکیبوں سے اس ادارہ کی انتہائی اہم اور خفیہ تصانیف حاصل کر لیں ۔ اس کے بعد ماہر القادری صاحب سے ملاقات کی ۔ کئی ملاقاتوں کے بعد جناب ماہر القادری کے اصرار پر اپنا فرض ادا کرنے کی خاطر پیش نظر مضمون لکھ رہا ہوں ۔ تاکہ مجھ جیسے ہزار ہا فریب خوردہ نوجوان اُن کے مکر و فریب سے واقف ہو جائیں ۔ اور جو لوگ میرے ذریعہ سے اس جماعت کا مالی تعاون کیا کرتے تھے ، وہ مجھے معاف فرماتے ہوئے علیحدگی اختیار کر لیں ۔

اگرچہ میں اس قابل نہ تھا کہ " فاران " جیسے معیاری پرچہ کے صفحات میرے بے ربط خیالات سے سیاہ ہوں ۔ لیکن پیش نظر مقصد کی اہمیت کے لحاظ سے مجبوراً اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑا ۔ امید ہے کہ ناظرین میری خامیوں کو نظر انداز فرما کر صرف اس بات کا خیال رکھیں گے کہ جس مقصد کے تحت یہ مضمون لکھا گیا وہ مقصد پورا ہوا یا نہیں ۔ اگر کوئی مزید وضاحت طلب بات رہ گئی ہو تو آئندہ اس کی بھی وضاحت کر دوں گا ۔ اس شمارہ میں فی الحال دیندار انجمن کی چند تصانیف کے اقتباس مع حوالہ بلا تبصرہ پیش کر رہا ہوں ، تاکہ علماء کرام اس طرف توجہ فرمائیں اور اس اٹھتے ہوئے فتنہ کو بڑھنے سے پہلے کچل دیں اور عوام اس سے خبردار ہو جائیں ۔

دیندار انجمن کا اجمالی تعارف

اس انجمن کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا ۔ اس کے بانی کا نام صدیق دیندار چن بسویشور رہی ۔ صدیق دیندار چن بسویشور کی تصانیف میں سے مجھے صرف " مہر نبوت ۔ خادم خاتم النبیین ، جامع البحرین ، معراج المومنین اور دعوت الی اللہ " دستیاب ہو سکی ہیں ۔ اس کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں ۔ مگر وہ بہائیوں کی کتاب اقدس کی طرح فضا ساز گار ہونے کے بعد میدان میں آئیں گی ۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چن بسویشور صاحب نے قادیان جا کر بشیر الدین محمود خلیفۂ قادیان کی بیعت کی ۔ پھر مولانا محمد علی لاہوری مرزائی سے قادیانی تفسیر پڑھی ۔ اور پھر حیدر آباد دکن آکر ہندوؤں کی کتابوں اور مرزا غلام احمد قادیانی کی پیشگوئیوں کو کھینچ تان کر اپنے پر چسپاں کرتے ہوئے ہندوؤں کا اوتار چن بسویشور ہونے کا دعویٰ کر دیا ۔ اس کے بعد ایک خانقاہ آصف نگر حیدر آباد دکن میں بنائی اور اس کا نام " خانقاہ سرور عالم " یا " جگت گرو آشرم " رکھا ۔ یوسف موعود اور مثیل موسیٰ کے دعوے کے علاوہ یہ بھی دعویٰ کیا کہ خانقاہ سرور عالم واقع آصف نگر میں حضرت محمد مصطفیٰ کی دوبارہ بعثت ہوئی ہے ۔ اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے جس طرح آیات قرآنی اور احادیث کا چہرہ مسخ کر کے تاویل در تاویل ، عجمی خرافات اور مشرکانہ عقائد کو اسلام میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ، اس دیدہ دلیری کی مثال نہیں ملتی ۔ یہیں ہر بات ختم نہیں ہوئی بلکہ آگے چل کر اپنے آپکو اللہ اور قیامت کا مالک ، شافع محشر بھی لکھا ۔ مریدوں کو فتوحات اور زمینی خزانے نکلنے کے سبز باغ دکھا کر لاکھوں روپیہ بٹورا ۔ اور آخر کار ایک دن اپنے متبعین کو دھوبی کے کتے کی مثال گھر کا نہ گھاٹ کا چھوڑ کر دوبارہ بار بار آنے کا وعدہ کر کے چل بسا ۔

آج کل اس جماعت کی تین تحریکیں تین مختلف ناموں سے چل رہی ہیں اور پورے ہند و پاک میں اس کے مبلغین پھیلے ہوئے ہیں — ہندوستان میں یہ تحریک " حزب اللہ دیندار انجمن " کہلاتی ہے ۔ اس کی ایک شاخ کراچی میں بھی ہے ۔ کراچی ہی میں سعید بن وحید صاحب بی اے (علیگ) کی امارت میں جمعیت مجاہدین فی سبیل اللہ دیندار انجمن کے مبلغین کا [illegible] تحریک مرکزی دیندار انجمن کے

نام سے چل رہی ہے۔ اس کے متعلقین پنجاب اور پشاور میں ظاہر اور پوشیدہ[1] طریقہ سے کام کر رہے ہیں۔

چن بسویشور اور قادیانیت

یہ ایک اجمالی تعارف تھا۔ اس کے بعد میں اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ چن بسویشور صاحب کی ایک منظوم تصنیف مع تشریح بنام "مہر نبوت" کے ص۲۵ پر درج ہے کہ:-

"نبیوں کے اسرار مجھ پر کھلنے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ کہ فقیر ۱۹۰۶ء میں فتنۂ دجال سے کما حقہ واقف ہو کر جستجوئے مسیح میں تھا۔ ۱۹۱۴ء میں مسیح کو (مرزا غلام احمد) پایا۔ اور نہایت مخلصانہ طور پر اٹھائیس سال کی عمر میں ترک دنیا کر کے مزید حصول "علم دین" کے لئے قادیان پہنچا۔ اور مرزا صاحب کے تحریر کردہ دس ہزار صفحات سے جن میں تین سو جگہ مسئلۂ نبوت کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پورا پورا واقف ہو گیا۔ اس طرح "اسرار نبوت" کے کھلنے کا اس فقیر پر یہ پہلا سبب ہے۔" (مہر نبوت ص۲۵)

مندرجہ بالا اقتباس سے چن بسویشور صاحب کا قادیان جانا۔ مرزا کو مسیح موعود ماننا اور اس کی تصانیف سے اسرار نبوت کا کھلنا ثابت ہوتا ہے۔

یوسف موعود

قادیان میں مرزا غلام احمد کی تصانیف سے اسرار نبوت چونکہ دیندار چن بسویشور صاحب پر مکشوف ہو چکے تھے اب دعویٰ نبوت میں کیا چیز مانع تھی۔ حیدر آباد پہنچ کر فوراً دعویٰ کر دیا کہ میں یوسف موعود مامور من اللہ چن بسویشور ہوں اور ایک کتاب "خادم خاتم النبیین" اپنے دعویٰ کی وضاحت کے لئے لکھی۔ جس میں جگہ جگہ مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات کے حوالے دے کر لکھا ہے کہ "اے بشیر الدین محمود آپ ایک متقی مرد ہیں، دیر لبسنت ہیں۔ میں یوسف موعود، مصلح موعود مامور من اللہ چن بسویشور ہوں۔" مثلاً خادم خاتم النبیین کے ص۹-۱۰ پر لکھا ہے کہ "اب حق آ گیا اس کی طرف حضرت صاحب (مرزا غلام احمد قادیانی) نے اشارہ کیا تھا کہ جب تک کوئی روح القدس سے تائید پا کر کوئی کھڑا نہ ہو تم سب مل کر کام کرو اور اس کے بعد اس کی اتباع کرنا۔ اسی میں نجات ہے، اس کام کے لئے اپنی جماعت میں رات دن دعا کرتے رہنے کے لئے کہا تھا ؎

عید مناؤ یارو اے احمدیو تم سب مل کر منتظر جس کے تھے تم آج وہ موعود آیا!

گزشتہ تین سال میں میاں صاحب کے نام میں نے متعدد خطوط بھیجے اور بار ہا لکھا کہ "دکن کے اولیاء اللہ" (ہندو وساد ھو وغیرہ) کے کتب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ایک شخص شمال میں دیر لبسنت (اولو العزم محمود) نامی پیدا ہو گا۔ وشنو (غلام احمد قادیانی) کی گادی پر بیٹھے گا۔" اس کے بعد اور بھی تفصیلی ذکر کر کے بشیر الدین محمود کو ہندوؤں کی کتابوں سے موعود انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے متعلق لکھا ہے کہ "اس کی اصلاح صدیق دیندار چن بسویشور کرے گا۔" (خادم خاتم النبیین ص۱۰)

دکن میں مامور

دعویٰ چن بسویشور کے متعلق لکھا ہے کہ "دکن میں ایک مامور کا انتظار تقریباً آٹھ سو سال سے چلا آ رہا ہے۔ اور اس دھوم سے کہ کرناٹک کا ہر بچہ بڑا واقف ہے۔ اتنا انتظار کسی مامور کا مسلمانوں میں نہیں، اس کثرت سے نشانات بیان کئے گئے ہیں کہ مہدی اور مسیح کے بھی نہیں۔" (خادم خاتم النبیین ص۱۱)

---

[1] ضلع لائلپور چک وحی ۵۷ میں سید عبد القیوم اور ابو العرفان عبد القادر صاحب پیر بنے بیٹھے ہیں اور اسی طرح لانڈھی میں قاری صاحب حیدر آبادی امامت کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اور بھی ہوں۔

دوسری تصنیف "دعوت الی اللہ" کے ص ۱۷-۱۸ پر اس دعویٰ کے متعلق پیشگوئیاں ہندوؤں کی کتابوں سے جمع کی گئی ہیں۔ مثلاً:۔

"شیو خود دنیا کی ایک سو ایک ذاتوں کو ایک کرنے آئے گا .... دمنی اوتار کے رنگ میں خود گھوڑے پر سوار ہو کر ملک ملک پھرے گا .... بسو پر بھا اس کو انسان سمجھ کر انکار کر کے اس سے بات مت کرو .... دائم قائم رہنے والا۔ پرماتما خود اترا ہے، معجزے دکھائے گا ...... ایشور کے روپ والا ...... دنیا میں ایشور آنا ہے کوئی دیر نہ ہوگی ...... دنیا کا ایشور جن بسو لیشور دنیا کے کھیل اور فریب فاش کرے گا، شنکر زمین پر اترے گا" (دعوۃ الی اللہ ص ۱۷-۱۸)

غور فرمایا آپ نے جن بسو لیشور دائم قائم رہنے والا۔ پرماتما۔ ایشور۔ شنکر اور معجزے دکھانے والا گویا یہی سب کچھ ہے۔ اسی قسم کی مختلف سادھوؤں، سنتوں، رشی لوگوں کی (جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں) مجذوبانہ بڑ سے فائدہ اٹھا کر اسرار حقیقت کے کھلنے کے بعد صدیق دیندار صاحب جن بسو لیشور اوتار بن بیٹھے!

نبی کریم پر تہمت

اگر مندرجہ بالا دعویٰ سادھوؤں اور غلام احمد قادیانی کے الہامات ہی پر مبنی ہوتا تو ہمیں کوئی زیادہ تردد نہ ہوتا۔ لیکن دیدہ دلیری کی حد ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:۔

"حضور نے جو تاریخ پیدائش میری بتائی ہے اور حالات بتائے ہیں۔ وہی اولیائے دکن (سادھوؤں) نے بتائے ہیں اور انہوں نے جو تاریخ پیدائش اور حالات بتائے ہیں، وہی حضرت مرزا صاحب کی کتب میں نظر آتے ہیں" (خادم خاتم النبیین ص ۱۶)

یہ نبی کریمؐ پر اتنی بڑی تہمت ہے کہ اللہ اس پر جس قدر مواخذہ کرے کم ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ صدیق دیندار صاحب نے مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود مانا۔ بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کو بھی ایک متقی اور موعود انسان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور خود بھی یوسف موعود، مصلح موعود، چن بسو لیشور، شنکر وغیرہ بننے کے خبط میں عمر گزاری۔ اس جماعت اور بانی جماعت کے چونکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دعوے اور عقائد ہیں۔ اس لئے میں مزید چند حوالے قادیانیوں سے تعلق رکھنے کے متعلق پیش کرنے کے بعد اصل مقصد کی طرف توجہ دلاؤں گا!

مرد متقی!

خلیفہ قادیان کے متعلق لکھا ہے کہ "اے خلیفہ جماعت احمدیہ میں آپ کو ایک زمانہ سے جانتا ہوں کہ آپ متقی ضرور ہو" (خادم خاتم النبیین ص ۲۳) اسی صفحہ پر مزید لکھا ہے:۔

"بھلا اس وقت کیا حال ہوگا جب ویر لبنت (اولوالعزم محمود) دکن کو تشریف لائیں گے۔ میں میاں محمود احمد صاحب کو دکن کے بشارتوں کی بناء پر خلیفہ جماعت احمدیہ مانتا ہوں۔ گو لاہور کی جماعت مخالف ہی کیوں نہ ہو"

واحسرتا کہ صدیق دیندار صاحب کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ ان تحریرات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قادیانی اور لاہوری بظاہر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں، ورنہ سب ایک ہی شجر کے برگ و بار ہیں۔ اور صدیق دیندار صاحب سے جہاں قادیانیت کو تقویت پہنچ رہی تھی وہیں لاہوریت کا پرچار بھی ہو رہا تھا۔ اسی لئے تو لکھا ہے کہ:۔

"حضرت مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ نے ایک خط سے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ سے ہماری جماعت کا ہر فرد خوش ہے" اور حال ہی میں ایک خط قادیان سے آیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:۔

"مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

عرض یہ ہے کہ مجلسِ مشاورت کے بعد آئندہ سال کے پروگرام میں دکن کی طرف وفد بھیجنے کی کوشش کی جائے گی .... بہرحال آپ کام کرتے رہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے اپنے وقت پر پورے ہوں گے۔ مزید برآں یہ عرض ہے کہ بوجہ مالی تنگی اس علاقہ کی طرف توجہ نہ ہو سکی ......

کام کی رپورٹ براہ کرام ضرور بھیجدیا کریں۔ اور مشکلات اور نتائج سے آگاہ فرماتے رہیں، والتسلیم"

دستخط عبدالرحیم نیّر

نائب ناظر دعوۃ وتبلیغ قادیان (مہر قادیان)

مندرجہ بالا خط خاتم النبیین ص ۷ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ دیندار انجمن باقاعدہ ایک شاخ کی حیثیت سے کام کی رپورٹ اور نتائج تبلیغ اپنے مرکز قادیان کو بھجوایا کرتی تھی۔ جن کتابوں سے حوالے دیئے جارہے ہیں وہ چونکہ بانیٔ جماعت کی ہیں اس لئے ممکن ہے جماعت کے افراد جواب دیں کہ بانی کے انتقال کے بعد ہم نے قطع تعلق کر لیا۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ حال ہی میں

قادیانی کے جنازے میں شرکت

۲۲۔یا ۲۳ نومبر کے لاہوری پرچہ "پیغام صلح" میں عبدالجبار شاہ لاہوری احمدی کے انتقال کی جو خبر شائع ہوئی ہے اس کی اطلاع دینے والے شخص اول سید سراج الدین امیر حزب اللہ دیندار انجمن ہیں اور انہوں نے صدر الدین لاہوری کو "محب الفقراء، رفیق الاتقیاء" کہہ کر خطاب کیا ہے اور سید عبدالجبار شاہ کی موت کا مفصل حال لکھ کر دلی رنج اور افسوس کا اظہار کیا ہے! کیا اسی کا نام "دینداری" اور "بے تعلقی" ہے کہ قادیانیوں کے جنازے میں دیندار انجمن کے حلقہ پشاور اور پنجاب کے تمام مبلغین شریک ہوں۔ خدا جانے درپردہ ان دشمنانِ اسلام نے کیا گٹھ جوڑ کر رکھا ہے!

دعویٔ یوسف موعود

اپنے دعویٔ یوسف موعود کے متعلق چن بسویشور صاحب لکھتے ہیں:۔

"یوں تو جلال کے لحاظ سے موسٰیؑ بھی ہیں اور داؤد علیہ السلام بھی، مسیح موعود کی بشارت میں ان دونوں کا نام کیوں نہیں آیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یوسفؑ مصر کے بادشاہ تھے، وہ جس قوم پر حکومت کرتے تھے وہ عربی النسل قوم تھی۔ قبل ظہور اسلام دو ہزار سال کے اندر اندر، وہ تمام قوم ہندوستان کے جنوبی علاقے میں پہنچ گئی تھی .... یہ بچھڑے کے پجاری اور شرک پر قائم رہے۔ ان میں ایک رسول کی بشارت چلی آرہی تھی، جس کو شمکھ اوتار کہتے ہیں۔ شمکھ کے اصلی معنی نفس امارہ کا مقابلہ کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ یوسفؑ کا تعریفی نام ہے۔ قوم لنگایت میں شمکھ کا مجھ سے پیشتر ۲۷ دفعہ آنا مانا جاتا ہے اور یہ آخری ظہور ہے۔ آج سے آٹھ سو سال پیشتر اولیاء اللہ (ہندو سادھو) نے اس کو دیندار چن بسویشور کے نام سے موسوم کیا ہے۔" (دعوۃ الی اللہ ص ۲۸)

آپ سمجھے! یوسفؑ صرف مصر میں ایک دفعہ ہی نہیں آئے بلکہ قوم لنگایت میں بقول صدیق دیندار صاحب ۲۷ مرتبہ آچکے ہیں اور اٹھائیسویں اور آخری مرتبہ صدیق دیندار چن بسویشور کے روپ میں ظہور ہوئے۔ نعوذ باللہ منہا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ چن بسویشور صاحب کی ہوسِ نبوت کی تسکین صرف دعویٔ یوسف موعود ہی سے نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کے بعد مختلف مقامات پر خود کو یوسف علیہ السلام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ استغفر اللہ!

مثیل موسیٰ

دعوت الی اللہ کے صفحہ ۲۱ پر مزید ارشاد ہے کہ "مسیح موعود نے بھی میری نسبت فرمایا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ ایک موسیٰ ہے میں اس کو ظاہر کروں گا۔"

ہوسِ نبوت

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کی ہوسِ نبوت بہت ترقی کر گئی تھی۔ انھیں صرف چن بسویشور، یوسف موعود، مثیل موسیٰ، مصلح موعود، شنکر کے دعوے سے تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے "الہامی اعزازی ناموں" کا اعلان کر دیا۔ فرماتے ہیں۔

"لہٰذا آج پچیس ۲۵ سال سے مجھے مکالمۂ الٰہیہ جاری ہے، میرے اعزازی نام حسب ذیل ہیں:۔
اے پیرانِ پیر، محمدؐ، امام الغیب، صدیق کلیم اللہ۔ سپہ سالار۔ محبوب، تو محمدؐ جلال ہے، مہدی آخر الزماں، دھن پتی۔ دیندار۔ محی الدین۔ صادق جنگ، سری پتی۔ اے تاج اولیاء۔ فاتح ہندوستان۔ نور محمدؐ، محمود صدیق۔ جری اللہ۔ اے نبی کے فرزند۔ سکندر اعظم۔ عبدالقادر۔ عبداللہ، موسیٰ۔ سلیمانؑ، مولانا، نگہبان۔ اے عیسیٰ۔ اے پہلوان، عادل میراں صاحب، اے میرے آسمان کے تارے۔ بی بی فاطمہ کے لعل۔ اِندر جیتی، میرے صابر۔ چراغ دہر، سلطان نصر الدولہ۔ کرد نیاتھ، یا منصور، اور بھی کئی نام ہیں۔" ان ناموں کے علاوہ مجھے بار بار یوسف پکارا گیا۔ اور کھلے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے کہا یوسف ہے یا با صدیق اور کہا تو ہی چن بسویشور ہے۔" (دعوت الی اللہ صفحہ ۳۵)

زمانہ جانتا ہے اور حیدر آباد دکن کے لوگ خصوصاً کہ جس قدر "الہامی اعزازی نام" پیش کئے گئے اُن میں سے ایک کے بھی مصداق دیندار چن بسویشور صاحب نہ تھے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے　　　ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں!

مہدی آخر الزماں

الہامی اعزازی ناموں میں ایک نام چونکہ "مہدی آخر الزماں" بھی تھا اور اس اعزازی نام کی تائید میں ایک خواب بھی نظر آ چکا تھا جو اس طرح درج ہے کہ:۔

"حضورؐ نے میری طرف انگلی سے اشارہ کر کے عوام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جب تک کوئی شخص اس میں فنا نہ ہوگا۔ وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔" (کتاب خادم خاتم النبیین صفحہ ۳)

اب دعوتِ مہدیت اور بیعتِ رضواں میں کون مانع ہو سکتا تھا۔ آسمان سے پروانہ تو مل ہی چکا تھا اب میرے آقا و مولا خاتم النبیین کے نام سے ایک جھوٹا خواب سُنا کر مسلمانوں کو دھوکا دینا آسان تھا۔ ذرا غور فرمائیے، مسلمانوں کے سامنے اللہ اور رسولؐ کا نام لے کر کوئی بات کہی جائے اور وہ اسے نہ مانیں۔ اسی کے لئے جیتے اور اسی کی محبت میں سب کچھ لُٹانے کو سعادت سمجھتے ہیں۔ جس سادہ لوح نے سُنا مہدی مان کر بیعت کر لی۔ لکھا ہے:۔

"ہبلی میں ایک عورت میرا وعظ سن رہی تھی۔ روحانیت کا اتنا اثر ہوا کہ جدھر دیکھے چن بسویشور نظر آ رہا ہے اور ہر ایک آواز چن بسویشور ہے۔ اگر مرغ بانگ دے تو چن بسویشور کہتا ہے۔ اور بچہ بھی روتا ہے تو چن بسویشور ہی کہتا ہے۔ بگھار چڑھا ہوا ہے چن بسویشور آواز آ رہی ہے۔ کئی دن ایسا رہا۔ اس معاملہ میں وہ عورت گھبرا گئی۔ اپنے خاوند کو لے کر میرے پاس آئی۔ میں نے بیعت لے کر دعا دی۔ اب تک اچھی ہے۔ بہت سے

لوگ ہیں جو لعد وعظوں کے پکار اٹھے کہ آپ مہدی ہیں۔ بعض نے مہدی مان کر بیعت کر لی۔"

(کتاب خادم خاتم النبیین ص۴۱)

ایسے ہی ایک اور واقعہ اپنی روحانیت کے اثر کا نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وہ (کوئی لڑکی) بن سنور کر رات میں مجھ سے آکر لپٹ گئی"
غور فرمائیے۔ یہ مہدی آخر الزماں کی روحانیت کے اثرات ہیں!!

حضور کی بعثت ثانی

لیکن آہ! اس قدر دریدہ دہنی اور گستاخیوں کے بعد جن بسویشور کے دل کی بھڑاس نہ نکلی اور اس نے آخر "محمد ثانی" ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اور اپنے ظہور کو حضرت محمد الرسول اللہ کی ہندوستان میں بعثت ثانی قرار دیا۔ آہ! کاش مدعی کے اس دعویٰ کی آواز مدعی کی زندگی میں بہرے کانوں تک پہنچتی۔ مسلمانوں کی غیرت کو یہ آخری چیلنج تھا۔ اس سے زیادہ بدبخت کون ہوگا جو حضور کی شان میں ایسی گستاخی سنے اور خاموش رہے۔ مدعی دیندار جن بسویشور کو خود اس کا احساس تھا۔ اس لئے اس نے بہائیوں کی طرح اس دور کو "قیامت" کہنا شروع کیا۔ مختلف نئی نئی اصطلاحیں وضع کیں، آیات قرآنی کے "مرادی معنی" پر زور دینا شروع کیا۔ اس طرح جب کم از کم مریدوں کا حلقہ اس بے غیرتی کا متحمل ہوگیا تو دعویٰ کر دیا۔ ہاں! تو مہدی سے قبل چونکہ مسیح کا آنا لازمی تھا لہٰذا مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ثابت کیا گیا اور چونکہ ان دو وجودوں کے بعد قیامت کا تصور چلا آرہا تھا، اس لئے اپنے دور کو قیامت کہا گیا۔ جنت، دوزخ اور آخرت کا جو عام تصور ساڑھے تیرہ سو سال سے قرآن و احادیث سے ثابت شدہ چلا آرہا ہے، اسے غلط قرار دیا گیا۔ اور اس طرح "محمد ثانی" کہلوانے کے خبط میں راستہ ہموار ہونے لگا۔ انسان کامل بعد از مرگ کے عنوان کے تحت لکھا ہے:۔

"چونکہ اس کے قوائے ظاہری اور باطنی کمال کو پہنچ چکے ہیں اس وجہ سے وہ جنت میں ہے یعنی وہ اہل اللہ ہو چکا ہے۔ چونکہ اللہ خود اپنا ظہور وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے، ایک وقت واحد میں اس کے کئی لاکھ مظہر دنیا میں آتے ہیں تو وہ جنت کا سرمایہ خود یہاں آگیا۔ تو پھر جنت والے کہاں رہے، وہ بھی ساتھ ہی دنیا میں آتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے خود کو جب مزکی کہا ہے تو ہم بظاہر تو انسان کو مزکی دیکھتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ مزکی اس طرح ہوا کہ وہ انسان کے اندر سے بولا، اثر ڈالا اور کمال دکھایا۔ . . . . . . جب دنیا میں گناہوں کا زور ہوتا ہے تو جنتی ارواح کو غیرت ہوتی ہے۔ اللہ کے اذن سے بصورت اولیا، آکر کام کرتے ہیں۔ ورنہ یہ خیال کیا جائے کہ جنتی لوگ ہمیشہ جنت میں پڑے رہتے ہیں۔ اس سے جنت نہ ہوئی بیکار خانہ ہوا بیکاری انسان کی بیکاری کا باعث ہوا کرتی ہے۔ بیزار انسان جنتی نہیں کہلا سکتا۔"

(حوالہ از کتاب معراج المومنین مصنفہ دیندار جن بسویشور ص۵۶)

برادران اسلام! مندرجہ بالا عبارت کو بار بار پڑھیے۔ سرسری نظر کرتے ہوئے نہ گزر جائیے۔ آپ سمجھے! انسان کامل بعد از مرگ کہاں جاتے ہیں؟ وہ دوبارہ اسی گناہوں کی دنیا میں لوٹ آتے ہیں۔ لیکن لوٹنے سے پہلے وہ کہاں تھے؟ جنت ٹھہری بیکار خانہ! اور دیندار صاحب کے عقیدہ کے مطابق حضور کی یہ بعثت ثانی ہے! تو کیا حضور معاذ اللہ ساڑھے تیرہ سو سال تک "بیکار خانہ" میں رہے؟ اگر نہیں تو پھر براہ کرم ہمیں آگاہ کیا جائے کہ حضور اس بعثت ثانی اور بعثت اول کے درمیانی وقفہ میں کہاں رہے؟

ہاں ہاں! سنو! اے مسلمانو! دیندار صاحب فرماتے ہیں۔ تصور آخرت غلط، جنت بیکار خانہ۔ اور بیکار خانہ میں جنتی ارواح رہ نہیں سکتیں۔ اور جب جنت کا سرمایہ مع جنتیوں کے اس گناہوں کی دنیا میں لوٹ آنا ہے۔ آہ! آہ! تاجدار مدینہ شافع محشر حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دوبارہ گناہوں کی دنیا میں "بشکل دیگر در لباس امتی" لایا جا رہا ہے! دل و دماغ جذبات سے بے قابو ہوئے جا رہے ہیں

ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ آؤ اے خاتم النبیین کے شیدائیو! جن تصانیف میں تمہارا روپیہ خرچ ہوتا ہے، اُن تصانیف نے جو میرے سینہ کو چھلنی کیا ہے اور جو زخم مجھے پہنچائے ہیں، اُن نیزوں کی انی کی چبھن تمہیں بھی محسوس کرا دوں۔ اے خاکِ پاکِ طیبہ تیری رونق لوٹنے کے درپے ہیں، فریاد کر رب کعبہ سے فریاد کر! اللہ ہمیں وہ دن نہ دکھائے جس دن لوگ ایک جھوٹے اور نفس کے بندہ کی قبر پر حاضر ہو کر یا رسول اللہ کہیں! اے اپنے گھر کی حفاظت میں ابرہہ کو تباہ کرنے والے تیرے جلال کی دُہائی! ابرہہ کی ذریت نئے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے تیرے گھر کو ڈھانے کے لئے ہاتھیوں کا لشکر نہیں بھیجا بلکہ بیت اللہ کے مقابلہ پر ایسے مقامات بنا لئے جہاں ایک لکڑی کی چوکھٹ سے گزرنے پر حج کا ثواب ملتا ہے۔ انہوں نے تیرے حبیبؐ کے قتل کے منصوبے دوسرے رنگ میں تیار کئے۔ اے روضۂ اقدس پر برکتوں کا نزول فرمانے والے! ان دشمنانِ دین اور روضۂ اقدس کے مقابل "خانقاہ سرورِ عالم" بنانے والوں پر لعنتیں اور بلائیں نازل فرما!

اے مسلمانو! شاید تم نے نہیں سنا! چن بسویشور نے جنت اور تصورِ آخرت کا اس طرح مذاق اڑایا اور اپنے دور، کو "قیامت" ثابت کرنے کے لئے مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود مانا۔ دیکھو لکھا ہے:۔

> "مسلمانوں پر قیامت آئی، اس کی شناخت کے بھی قرآن اور احادیث کے سینکڑوں نشانات دنیا پر ظاہر ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ خرِ دجال تمام روئے زمین میں پھر رہا ہے، جو قیامت کا ایک بیّن نشان ہے۔ اور فتنۂ دجال سے ہر کس و ناکس واقف ہو گیا ہے۔ مگر باوجود اپنی آنکھوں سے نشاناتِ قیامت دیکھنے کے اس زمانہ کو قیامت کا زمانہ نہیں کہتا۔ مسلمانوں کے سامنے ابھی ابھی مسیح یعنی عیسیٰ "وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ" بن کر حسبِ وعدہ قرآن کریم "وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا" قادیان میں ظاہر ہوئے۔ اگر مرزا صاحب کی اس قدر شہرت نہ ہوتی تو ہم کو قیامت کی شناخت کروانے کے لئے کوئی سامان ہی نہ تھا۔ صرف مجھے بوجہ مظہر اللہ ہونے کے اس قیامت کا علم کما حقہٗ ہوا کیونکہ اصول "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ" تھا اور یہ مسیح موعود کی شہرت کام آئی۔ اور مرزا صاحب کی نبوت کے متعلق چند اصطلاحات قائم کر کے مسئلہ کو پیچیدہ بنانا کام آیا" (کتاب مہرِ نبوت مصنفہ چن بسویشور صـ۵۱)

اس کے بعد مزید تشریح ان الفاظ میں ہے:۔

> "الحمد للہ! اعلانِ نبوت منجانب احمدیان مسیح موعود کی شہرت کا باعث بنا اور یہ شہرت قیامت کے قائم ہونے کی ایک عظیم الشان حجت بنی۔ یہی ایقانِ قیامت "بعثتِ ثانی" کے ثبوت میں بیّنات بن کر ہمالیہ کے پہاڑ کی طرح سربلند اور مستحکم کھڑا ہے۔" (مہرِ نبوت صـ۵۶)

یہ کسی مجذوب کی بڑ نہیں۔ رموز و ابہام نہیں۔ سکرات کے عالم میں بے ساختہ نکلے ہوئے جملے نہیں۔ اس ادارہ کی کوئی تصنیف اس قسم کی لغویات سے خالی نہیں۔ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ماننے، چن بسویشور کا دعویٰ کرنے، ہندوؤں کو اولیاء اللہ کہنے، مثیلِ موسیٰؑ اور یوسف موعود بننے، جنت کو بیکار خانہ کہنے، اور اپنی خانقاہ کا نام "خانقاہ سرورِ عالم" رکھنے، غرضکہ اسی قسم کی پیش بندیوں کے پس پردہ کیا جذبہ اور کونسی آرزو کام کر رہی تھی، مندرجہ اقتباس سے صاف طور پر ظاہر ہو گئی۔ کیونکہ اس کے فوری بعد چن بسویشور صاحب لکھتے ہیں:۔

> "جب "بعثتِ ثانی" میں اُن کے باپ حضرت محمد مصطفےٰ تشریف لائے اُن کو چھوڑ احمدیوں نے ولد اللہ کی حقیقت کو قائم رکھنا چاہا تو ان کو فتنوں میں مبتلا کر دیا گیا۔" (مہرِ نبوت صـ۳۶)

آپ اب بھی سمجھے یا نہیں! چونکہ عیسیٰؑ کے بعد نبی کریمؐ تشریف لائے تھے اور اکثر عیسائیوں نے انھیں نہ مانا تھا۔ یہاں بھی مسیح موعود

(مرزا غلام احمد) کے بعد نبی کریمؐ دوبارہ تشریف لائے، بشکل چن بسویشور۔ مگر احمدیوں نے چن بسویشور کو جو اصل میں حضور نبی کریمؐ تھے، تسلیم نہ کیا۔ معاذ اللہ! استغفر اللہ!

ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ یہ مفہوم میں نے پیدا کر لیا ہے۔ چن بسویشور صاحب خود اسی کتاب کے صفحہ ۴۳ پر رقمطراز ہیں کہ :۔

"دوسرے الفاظ میں اس ولی کے وجود میں بزمانۂ قیامت حضورؐ منبع انوار خود تشریف لاتے ہیں۔ اس حقیقت کی وجہ سے یہ وجود بروز محمدؐ کہلاتا ہے۔ اسی وجود کی نشاندہی میں مسیح ظاہر ہوتا ہے — جو اِنَّہٗ لعلم للساعۃ کی حقیقت منکشف کرنے کے لئے بچّہ کی طرح کچھ نہ کچھ کہہ دے کر عقائدی طوفان مچاتا ہے، قیامت کا علم دینے کے لئے اس کی بدنامی مقدر ہوتی ہے۔" (مہر نبوت صفحہ ۴۳)

یہ "بروز محمدؐ" کیا ہے؟ ممکن ہے اہلِ تصوف کہیں کہ "بروز محمدؐ" فنا فی الرسولؐ کو کہا جاتا ہے اور ایسے "بروز محمدؐ" یا فنا فی الرسولؐ کئی گزرے ہیں۔ اس لئے چن بسویشور کا اپنے آپ کو "بروز محمدؐ" کہنا قابلِ گرفت نہیں! لیکن معاف فرمائیے چن بسویشور کی نظر میں "بروز محمدؐ" کی تشریح کچھ اور ہے۔ اگرچہ مندرجہ بالا اقتباس ہی میں صاف طور پر لکھا ہے۔ "اس ولی کے وجود میں حضورؐ منبع انوار خود آتے ہیں" لیکن مزید اس سے بڑھ کر اور دیکھیئے۔ "بروز محمدؐ" کی تشریح اشعار میں درج ہے ؎

بروز محمدؐ ہے نبیوں کا حاکم
ہے مظہر خدا کا قرآں داہے عالم ہے قاضی حشر، حوضِ کوثر کا قاسم (مہر نبوت صفحہ ۴۳)

جہاں تک مجھے معلوم ہے نبیؐ کریم نے بھی کبھی خود کو نبیوں کا حاکم اور قاضی حشر نہیں کہا۔ یہ نئے اختیارات صرف چن بسویشور ہی کے لئے ہیں کیونکہ "خانقاہ سرورِ عالم" میں بقول دیندار صاحب تمام انبیاء جمع ہوئے تھے، اور انہوں نے دیندار صاحب کو پیر تسلیم کیا تھا۔ اس لحاظ سے دیندار صاحب نبیوں کے حاکم ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں! العجب ثم العجب!

دیندار انجمن میں انبیاء کا اجتماع

فرماتے ہیں: "بروز محمدؐ" سے مطلب بعثت ثانی ہیں "آخرین منہم" کے مالک اور آقا ہیں۔ ...... یہی وقت اجتماع انبیاء کا ہوگا، جب کل انبیاء جمع رہیں گے، ان پر حاکم ایک اُمتی فنا فی الرسولؐ ہوگا۔ جو "بروز محمدؐ" کہلائے گا۔" (مہر نبوت صفحہ ۴۴)

مزید ارشاد ہوتا ہے "علم قرآن جب خلیج عروج میں اولیاء کی بعثت کے زمانہ میں بتدریج ایک ہزار سال کے اندر آسمان پر چڑھ جائے تو دوبارہ وہ ذات بابرکت تشریف لائیں گے، ان پر ہی علم قرآن نازل ہوگا۔" (مہر نبوت صفحہ ۴۴)

غور فرمایئے۔ گویا "خانقاہ سرورِ عالم" میں دوبارہ قرآن نازل ہوا۔ اور یہ آسمان پر قرآن کا ایک ہزار سال میں چڑھ جانا اور پھر نازل ہونا! یہ بالکل وہی بہائیوں والی بات ہوئی۔ اُن کا بھی طرز استدلال ایسا ہی ہے!

بروز محمدؐ کی مزید تشریح

خاص طور سے اہلِ تصوف یاد کر لیں۔ فرماتے ہیں: "صوفیانہ اصطلاح میں "بروز محمدؐ" بعثت ثانی کو کہا گیا ہے۔ جب آپ کی ذات اپنی قدسی طاقت سے ظہور پذیر ہوتی ہے تو حسب سنت سابقہ کل انبیاء کو اپنے دربار میں جمع کرتی ہے۔" (مہر نبوت صفحہ ۶۲)

ایک سوال

اس کے بعد چن بسویشور صاحب نے ایک ایسا سوال فرمایا ہے کہ تاریخ جس کا جواب دینے سے عاجز ہے اور ہمیں بھی اعتراف ہے کہ آج تک کوئی بدبخت ایسا نہیں گزرا جس نے خم ٹھونک کر ایسے دعوے کئے ہوں۔ یہ سہرا صرف آپ ہی کے سر بندھنے والا تھا! ملاحظہ ہو، پوچھتے ہیں۔ "ہے کوئی دُنیا میں نبی ایسا جس کے دربار میں انبیاء جمع ہوں، آدمؑ سے لے کر عیسٰیؑ تک کل انبیاء ...... اور

مچھ اوتار سے لے کر گوتم بدھ اوتار تک، کل انبیاء جمع ہیں۔" (مہر نبوت ص ۶۲)

اس کے بعد صاف صاف الفاظ میں صدیق دیندار چن بسویشور صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ فقیر فنا فی الرسولؐ اپنے اندر سے حضورؐ منبع انوار کی قدسی طاقت کو ظاہر کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے میرے سامنے نہیں بلکہ حضورؐ منبع انوار کے سامنے کُل انبیاء زانوئے ادب طے کئے بیٹھے ہیں۔" (مہر نبوت ص ۶۲)

یہ "میرے سامنے نہیں بلکہ حضورؐ منبع انوار کے سامنے" بھی عجیب منطقی جملہ ہے، یہ وہی وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کی خطرناک گھاٹیاں ہیں اور ہم جیسے سیدھے سادے مسلمانوں کی فہم سے بالا! یہ "من تو شدم تو من شدی" والے نظریہ کے ثمرات ہیں۔ مسلمانوں کو اس دور میں اس قسم کے پیچیدہ اور انتہائی خطرناک راستوں کی طرف دعوت دینے والے سوچیں۔ یہ اسلام کی خدمت نہیں، یہ حضورؐ سے محبت نہیں، عداوت ہے!

انبیاء کی توہین

دل پر انتہائی جبر کر کے یہ تمام عبارتیں نقل کر رہا ہوں۔ نقل کی جرأت نہیں ہوتی، روح کانپ جاتی ہے، ان عقائد کے رکھنے اور ان کی تبلیغ و اشاعت کرنے والوں کی مسلمیت اور بوجہلیت میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔ چن بسویشور نے اپنے مریدوں کی بھی آخرت خراب کی اور اپنے ساتھ انھیں باطل آرزوؤں میں مبتلا کر دیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ پیر صاحب تو "محمد ثانی" بن جائیں اور بیچارے مرید مُنہ ہی تکتے رہ جائیں۔ چنانچہ اپنے مریدوں کو بھی "انبیاء" کا معزز خطاب دیا جاتا ہے۔ غلام احمد کے مرید تو صرف "صحابی" کہلاتے ہیں لیکن یہاں "ایں خانہ تمام آفتاب است" کا منظر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ شعر ؎

بروزِ محمدؐ فنا فی الرسولؐ ہم انبیاء را رفیقہا می بینم!

ہاں صاحب! مبلغین دیندار انجمن انبیاء ہیں!! لیکن اس سے تو عام مسلمانوں کے ناراض ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لئے انھیں بھی کچھ نہ کچھ بتا دینا چاہیئے۔ چاہے وہ اسے قبول کریں یا نہ کریں! شاید اسی "دلجوئی" کے خیال سے عام مسلمانوں کو اپنے زمرہ کی طرح "بے ادب" تصور کرتے ہوئے انبیاء کرام سے افضل ثابت کر دکھانے کی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:۔

"جو مسلمان پیدا ہوتا ہے یا مسلمان ہوتا ہے وہ پہلے ہی قدم میں کسی نہ کسی نبی کا مثیل بننے کی بالقوۃ طاقت رکھتا ہے اور دوسرا تصرف حضرت منبع انوارؐ کا مسلمانوں میں یہ چل رہا ہے کہ کسی مسلمان کو خیال تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کسی بچّہ کا نام کسی نبی کی غلامی میں رکھے۔ جیسے عام طور پر غلام محمد، غلام احمد، غلام علی، غلام دستگیر نام رکھتے ہیں۔ اس طرح غلام ابراہیم، غلام موسیٰؑ، غلام عیسیٰؑ رکھنے کا کسی مسلمان کو خیال نہیں ہوتا۔" کیونکہ۔ ؏

"نہیں کوئی مسلم ہے نبیوں سے کچھ کم!" (مہر نبوت ص ۶۰-۶۱)

اس دلیل افضلیت پر بے ساختہ اُن کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے اور میں اس قسم کی تحریر کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کا دلائل سے رد کیا جائے۔ یہ تو خود ردی ہے اور ردی کی ٹوکری کے نذر کے لائق ہے! اسی دلیل کو ناقابلِ تردید خیال کرتے ہوئے سعید صاحب نے کشمیر میں دُہرایا تھا۔ جس پر بجا طور پر ماہر صاحب نے ٹوکا کہ اس سے انبیاء کی توہین کے علاوہ اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ چن بسویشور صاحب اپنی تصانیف میں بار بار "مقام مسلم" کو "مقام نبوت" سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اُن کی تصنیف "مہر نبوت" کے شروع کے شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

نبوت کے اسرار بے انتہا ہیں بفضلِ خدا اس کے در مجھ پہ وا ہیں!

کہوں راز داری کے اصحاب کیا ہیں — ہیں اُن کی جگہ ہوں وہ میری جگہ ہیں

کہ عیسیٰؑ تلک جس قدر انبیاء ہیں — وہ رفقاءِ کارِ رسولِ خدا ہیں

فنا فی الرسولِ خدا جو ہوا ہے — وہ لاریب حق میں فنا ہو گیا ہے

کہ نبیوں سے دربار اس کا بھرا ہے — ہیں رفقاء نبی یہ عجب ماجرا ہے

نیز :- "ہے فائق ہمارا ولی ہر نبی پر"

فائق ہی نہیں بلکہ کسی نبی کا اُمتی بن کر دوبارہ دُنیا میں آنا اس کے لئے باعثِ معراج ہے۔ سنئے :-

محمدؐ کی اُمت میں پھر اُن کا آنا — نبیوں کا گویا ہے معراج پانا (شمس الضحیٰ ص ۶۲)

"مہر نبوت" میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے انبیاء کی توہین کرنے کی قسم کھا کر قلم اُٹھایا ہے۔ لکھا ہے :-

"ان کا ایک وجود کئی کئی انبیاء کو اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی وسیلہ سے انبیاء اقوام عالم جن پر صرف مسلام تھا "رحمۃ اللہ" اور "رضی اللہ" کے حقدار ہوئے"۔ (مہر نبوت ص ۳۴)

یہ عقیدت صرف صحابہؓ کی شان ہی میں نہیں بلکہ صحابہؓ کو صرف سامنے رکھ کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا ہے۔ دیندار چن بسویشور چونکہ "خاتم سرورِ عالم" میں بیٹھے بیٹھے نبی کریمؐ کی بعثت ثانی کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اپنے آپ کو "بروز محمدؐ"۔ یا "محمد ثانی" یا "حضور سرورِ عالم بہ لباس چن بسویشور" کہا کرتے تھے اور اپنے مُریدوں کو "انبیاء، صحابہ اور جنتی ارواح، دوسرے جنم میں آنے والے ثابت کرنا اُن کا مقصد تھا۔ اس لئے پہلے عام مسلمانوں کے دلوں میں صحابہؓ کی محبت اور آنکھوں پر غلو کی پٹی باندھ کر اپنا مقصد حاصل کیا جاتا تھا۔ صحابہؓ کی شان کئی کئی انبیاء کے برابر بتانے کے بعد لکھتے ہیں۔ "اب تک یہ وعدہ دو دفعہ پورا ہو چکا۔ (۱) زجاجہ قرنِ اولیٰ (۲) زجاجہ قرنِ اُخریٰ"۔ (مہر نبوت ص ۳۴)

چن بسویشور صاحب کے ایک مرید خاص اپنی منظوم کتاب مع حاشیہ بنام شمس الضحیٰ کے ص ۸۷ پر اپنے بزرگ کی آواز میں آواز ملا کر فرماتے ہیں :-

"جہاں قرنِ اولیٰ میں تھی اُن کی کثرت — عیاں قرنِ اُخریٰ میں ہی اُن کی قلت"

سابقہ حوالہ جو ابھی ابھی دیا گیا، چن بسویشور صاحب مُرید خاص ابو الکلام عبد الغنی صاحب کی منظوم تصنیف بنام شمس الضحیٰ مع حاشیہ شاید ۱۹۵۰ء میں چھپی۔ اس پر صدیق دیندار صاحب نے مندرجہ ذیل الفاظ میں تقریظ لکھی ہے، اس وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی :-

"مصنف کتاب ہذا مولوی غازی ابو الکلام عبد الغنی صاحب مصنف میثاق الانبیاء نے مضامین تبلیغ کو مسدس کی صورت میں منضبط کیا ہے۔ وہ کتاب میری نظر سے گزری، انتہائی معقولیت سے کام لیا ہے، ہماری انجمن کے جذبات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جو در حقیقت وہ جذبات کیا ہیں قرآن کریم عمل میں ہے، یہ کتاب ہر مسلم کو ہدایت کا باعث ہوگی، شفاعت کا باعث ہوگی۔ پڑھنے والوں کو صراطِ مستقیم پر لائے گی"۔ فقط۔

(دستخط صدیق دیندار چن بسویشور المرقوم ۲۵۔ رجب ۱۳۶۹ھ)

گویا بقول صاحبِ تقریظ یہ کتاب مسلمانوں کی ہدایت اور اُن کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لئے لکھی گئی۔ اور وہ صراطِ مستقیم اور

ہدایت کیا ہے؟ صدیق دیندار صاحب کو چن بسویشور، یوسف موعود، مثیل موسیٰ، مصلح موعود، امام الناس، حاشر، مالک قیامت، بروز محمد، اللہ بشکل غیر مان لینا!!! استغفراللہ۔ اگر نہ مانئے تو مخالف کی نسل خراب اور شفاعت سے محرومی کا ٹھپہ!

انبیاء کرام کی توہین کرنے میں ابوالکلام عبدالغنی اپنے گرو سے بھی سبقت کر گئے، ملاحظہ فرمائیے:-

"جماعت دیندار ان کو خطابات من جانب اللہ ملے ہیں۔ دو سو سے زیادہ مرد ممبران، اکثروں نے نبیوں کے منازل طے کئے وہ متعدد انبیاء کے ناموں سے پکارے گئے، وہ دربار بروز محمد (خانقاہ سرور عالم آصف نگر دکن) میں جمع ہیں۔ صرف رام اور کرشن اوتار ہی ایک درجن سے زیادہ ہیں" (شمس الضحیٰ مصنفہ ابوالکلام عبدالغنی ص۹۱)

غور فرمائیے! معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا۔ ماہرالقادری صاحب نے تو صرف مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود ماننے پر مخالفت کی تھی۔ لیکن یہاں تو قادیانیت بھی شرمارہی ہے۔ وہاں تو صرف ایک شخص نبی بنا تھا۔ یہاں کا ہر شخص نبی ہے۔ صرف نبی ہی نہیں، "ترقی پا یا ہوا نبی"۔ پناہ بخدا! خانقاہ سرور عالم میں حضور سرور عالم دوبارہ مبعوث ہوئے ہیں۔ اور اُن کی یہ بعثت "مقام محمود" والی بعثت ہے اور تمام سابقہ انبیاء کا بھی دوسرا جنم ہے۔ اور وہ بھی یہیں آکر "درود و سلام" کے مستحق ہوئے، ورنہ (نعوذ باللہ) پہلے جنم میں وہ "درود و سلام" کے بھی مستحق نہ تھے۔

اے عظمت انبیاء اور ختم نبوت کے دعویدارو! سنو! اگر تم نے اب بھی نہ سنا اور نہ مانا اور مخالفت کی تو وعید ہے!!! یہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اس میں اپنی طرف سے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ مخالفین کے بارے میں اس جماعت کے عزائم انتہائی خطرناک اور ظالمانہ ہیں۔ کیونکہ صدیق دیندار چن بسویشور کی وصیت ہے کہ "مخالفت کرنے والے مولویوں کو چار مینار پر کھڑا کرکے گولی ماردینا، مخالفت دب جائے گی"۔

دُنیا میں کون ایسا حق پسند ہو جو قاسم رضوی صاحب اور رضا کاروں کی خدمت کا معترف نہ ہو اور پولیس ایکشن میں جس بہیمانہ طریقہ سے رضا کاروں کو قتل کیا گیا، مسلمان دوشیزاؤں کی عصمتیں لٹیں، بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ غرضکہ اس قیامت صغرا کو دیکھ کر کونسی ایسی آنکھ ہے جو روئی نہ ہو۔ مگر آپ یقین جانئے ایسی بھی منحوس اور مسلم کش، کافر پناہ ایک خانقاہ موجود ہے۔ جس میں حیدرآباد کی شکست — سید قاسم رضوی صاحب کی گرفتاری، اور مسلمانوں کے قتل عام پر رنج کی بجائے خوشی کا اظہار کیا گیا اور قاسم رضوی صاحب کو اپنی قیادت کے ماننے کا سب سے بڑا روڑا سمجھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ جب نواب بہادر یار جنگ (مرحوم) کی زہر خورانی سے شہادت واقع ہوئی تو اُسے بھی ان "روحانی النسانوں" نے صدیق دیندار چن بسویشور کی مخالفت میں عذاب کی موت قرار دیا۔ اور اُس منحوس ترین گھڑی کو جب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو پھانسی دی جانے والی تھی، دین کے کام کے لئے ایک "فال نیک" قرار دیا گیا۔ میں نے خود سنا اور میرے چند معزز دوست بھی گواہ ہیں کہ دیندار انجمن کا ہر فرد کہہ رہا تھا "نصرت دشمن اور مامور من اللہ کی مخالفت کی یہی سزا ہوتی ہے"۔ اور صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کا یہ قول بھی دُہرایا جارہا تھا کہ "اب جماعت اسلامی تنکوں کی طرح بہہ جائے گی"۔ میں چونکہ اُس وقت مودودی صاحب کے خلاف عام پروپیگنڈہ سے متاثر تھا۔ اور دیندار انجمن کے لوگوں کو اسلام کے سچے خادم سمجھتا تھا۔ اس لئے خاموش رہا۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اُن کی زبان سے ایسے کلمات سُن کر کوفت ہوئی۔ نہ جانے مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے خلاف اس قسم کے غلط پروپیگنڈہ سے میری مانند کتنے نوجوان بدظن اور بدگمانی میں مبتلا ہوں گے۔ حالانکہ اس فتنہ کے دَور میں دینی معاملات میں اس قدر احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا شاید ہی کوئی دوسرا مفکر ہو۔ میں اس قسم کے تمام لوگوں سے

درخواست کروں گا کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں۔ اور جماعتِ اسلامی کا لٹریچر تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے خود پڑھیں۔ اور بقول ماہر القادری صاحب اگر کوئی بات خلاف دین نظر آئے تو ٹھکرا دیں۔

جذبات کی رَو میں بہت ساری باتیں میں بلا حوالہ لکھ گیا۔ ناظرین کرام نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ابھی تک جو کچھ بھی لکھا گیا بلا حوالہ نہ لکھا گیا اور نہ ہی دُم کٹے جملے دیئے گئے۔ بلکہ ہر بات پورے پورے سیاق و سباق کے ساتھ درج کی گئی۔ میں زیادتی کو جرم سمجھتا ہوں۔ دیندار انجمن میں میرے دوست بھی ہیں، ہم وطن اور تعلیمی زندگی میں ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں۔ وہ میری صلح پسند طبیعت سے خوب واقف ہیں۔ میں اُن ہی سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ان عقائد اور نظریات کے ساتھ آپ کا عالمِ اسلامی کے اتحاد اور فرقوں کے ملاپ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے؟ کیا مسلمان ایسی جماعت کو اپنا ہمدرد مان لیں گے؟ اور کیا یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس میں ذرّہ برابر بھی زیادتی یا تحریف اور توڑ مروڑ کی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں! تو میں اپنے ان احباب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس جماعت سے علیحدہ ہو جائیں، اور اپنی آخرت کو تباہی سے بچا لیں۔ صبح کا بھولا اگر شام لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ اگر آپ کا خدمتِ دین کا جذبہ واقعی خلوص پر مبنی ہو تو مسلمان آپ کی ہر قسم کی امداد کو تیار رہوں گے۔ ہمارے لئے نبیؐ کریم کا اسوہ کافی ہے۔ آپ کے بعد کسی مثیل اور موعود کے گرد تکمیلِ ایمان کی خاطر جمع ہونا کمزوریٔ ایمان کی دلیل ہے!

نمونۂ تفسیر ہاں تو میں نے اُوپر لکھا ہے کہ سید قاسم رضوی کی گرفتاری اور رضا کاروں کے قتل عام پر دیندار انجمن میں گھی کے چراغ جلے تھے۔ لیکن ایسا کیوں ہوا؟ ایک مجاہد اور اسلام کی خاطر جان دینے والوں سے "دیندار صاحب" کو کیا دشمنی تھی؟ اس سوال کا جواب صاحب شمس الضحیٰ نے سورۃ بلد کی تفسیر فرماتے ہوئے دیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اس کے علاوہ اس سورۃ میں ایک متقیوں کی جماعت کا بھی ذکر ہے، جو اسلام کے لئے مصائب جھیلنے والی ہے اور اپنے عمل سے صبر اور رحمت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ انہی کو اصحاب میمنہ یعنی غازیانِ اسلام کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ان کی مخالفت میں آنے والی قوت کو اصحاب مشئمہ یعنی بدبخت گروہ بتایا گیا۔ ان کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک ایسی آگ میں ڈھکیل دیئے جائیں گے جس کو نارٌ مُوصَدَۃٌ کہا گیا ہے۔ یعنی اس آگ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ سب سے پہلے اللہ پاک نے لَا اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ کہہ کر اُمّ القریٰ والے بلد امین کی قسم کھائی ہے۔ اَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ کہہ کر حضورؐ کے ایک دوسرے بلد میں مزید اُترنے کی بشارت دی گئی ہے۔ جو اَنْتَ حِلٌّ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ میں بَلَدٌ اَمین کو باپ قرار دے کر بعثت ثانی میں دوسرے بَلدہ کو اس کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ جو روئے زمین میں شہر حیدر آباد ہی بلدہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہی اپنے بلدہ کا بیٹا ہے، جس میں بعثت ثانی کے لئے حضورؐ سرورِ عالم نے بھی اس آنے والے موعود کو رَجُلٌ مِنْ اُمَّتِی اور "مِنْ وَّلَدِ ابن" ہی کہا ہے۔ اور وہ وجود حضرت مولانا صدیق دیندار چن بسویشور کا ہے۔ جنہوں نے جسمانی ۵۶۔ اور اخلاقی ۹۶ نشانات کے ساتھ ایک دوسرے بلدہ میں نزول فرمایا۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ میں ایک ایسے انسان کو حجت پیش کی جا رہی ہے جو اپنے مقصد کے حصول میں انتہائی مشقت اٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن وہ لقاء اللہ سے محروم ہے۔ وہ دل و گردہ رکھنے کے باوجود روحانیت سے بے بہرہ ہے۔ حضورؐ سرور عالم کے بہ لباسِ دیگر دوسرے بلدہ میں نزول کو نہیں مانتا اور وہ وجود قاسم رضوی کا ہے۔ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْہِ اَحَدٌ یعنی

انسان پر یہ حجت پیش کی گئی ہے۔ کہ وہ کیوں اپنے اقتدار میں اس قدر نازاں ہے، کیا اسے یہ خیال نہیں ہوتا کہ شاید کسی اور کو اس پر قدرت حاصل ہو؟ یہ وہ عالم بتایا گیا ہے جبکہ سید قاسم رضوی پوری حیدر آباد ریاست پر حکومت و اقتدار کے نشہ میں چور تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اس کی سیاست اور قوت ہمیشہ رہے گی، حضرت صدیق دیندار اور ان کے فقراء کو نظر میں بھی نہ لاتا تھا۔ لیکن آگے بتلایا گیا ہے۔ یقولُ اھلکتُ مالاً لُبدا۔ یعنی بالآخر وہ شخص اپنے ہاتھوں اپنا بہت سامان برباد کرے گا، قوم کی ساری دولت کو اپنی غلط رہبری سے ہلاکت کے گڑھے میں اتار دے گا۔" (حوالہ از کتاب شمس الضحیٰ۔ مصنفہ ابو الکلام عبد الغنی ص۸۵)

برادران! غور فرمایا آپ نے اس علم قرآن اور تفسیر قرآنی پر! یہ نہ بھولیئے کہ یہ علم قرآن صدیق دیندار چن بسویشور صاحب پر آسمان سے دوبارہ نازل ہوا۔ ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ سید قاسم رضوی صاحب، صدیق دیندار چن بسویشور کے لباس میں حضور کے دوسرے بلدہ یعنی حیدر آباد میں نزول کو نہ ماننے کی پاداش میں گرفتار رہے ہیں!

مزید گالیاں

صاحب شمس الضحیٰ اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ آگے چل کر اُن کی نسل کو غلط قرار دے کر انتہائی ذلت آمیز الفاظ میں اُن کا ذکر کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:-

"اولیاء اللہ کی مخالفت میں دو ہی قسم کے لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جن کی نسل صحیح نہ ہو یا پھر وہ جو نسل کا تو اچھا ہے لیکن گنہگار رہے۔ سید قاسم رضوی نے بحیثیت صدر اتحاد المسلمین ہمارے متعلق صدر ناظم کوتوالی کو حکم دیا ہے کہ دیندار چور اور ڈاکو ہیں، گداگری کرتے پھرتے ہیں۔ اب کمیونسٹوں کے حملہ کے موقع پر لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ یہ عیسائی ہیں نہ مسلمان اور نہ پارسی ہیں۔ یہ بے دین ہیں۔ ان کو بہادر یار جنگ مرحوم ختم کرنا چاہتے تھے، افسوس وہ ختم نہ کر سکے، میں ان کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ میں حکم دیتا ہوں کہ اُن کو ختم کر ڈالو۔ جہاں پاؤ پکڑ لو، سختی سے سخت سزا دو، یہ دو سو کے قریب ہیں۔ یہ ختم ہو گئے تو دوسرے نہیں۔" (شمس الضحیٰ ص۱۰۳)

اسی صفحہ پر ایک شعر قاسم رضوی صاحب کے متعلق نازل ہوتا ہے، آپ بھی سنئے:-

"کٹی بزم میں خود ہی خرطوم تیری گئی حیف بیکار ہر بوم تیری"

مصنف نے جس نیت سے سید قاسم رضوی صاحب کے اس حکم کو نقل کیا ہے، وہ ظاہر ہے، لیکن ہمیں اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس جماعت کے عقائد اور کارگزاریوں کے متعلق بہادر یار جنگ مرحوم اور سید قاسم رضوی کی رائے معلوم ہو گئی!

نزولِ قرآن

ابو الکلام عبد الغنی صاحب چونکہ صدیق دیندار صاحب کے منظور نظر ہیں۔ اس لئے جو وہ کہتے ہیں وہی یہ کہتے ہیں۔ جو اُن پر نازل ہوتا ہے اِن پر وارد ہوتا ہے۔ پیر جی "نزولِ قرآن" فرما ہی چکے تھے، اب اس کا جمع کرنا باقی تھا۔ اس کسر کو انہوں نے پورا کر دیا۔ ملاحظہ ہو:-

"اِنَّا علینا جمعہٗ وقرآنہٗ۔ یعنی قرآن کا جمع ہونا اور اس کا پڑھنا ایک خاص وقت پر ہوتا ہے اور وہ وقت معین ہے۔ یہ عمل یا تو حضور سرور عالم کے ظہور پر ہوا یا پھر حضرت مولانا صدیق دیندار قدس سرہ العزیز کے وجود نے اس عمل کو پیش کیا۔" (شمس الضحیٰ ص۶)

گویا حضور کے بعد سے صدیق دیندار کے ظہور تک لوگ قرآن کی بجائے پوتھی پُران پڑھتے رہے! کیوں مولانا یہی مقصد ہے نہ آپ کا!

ماشاء اللہ کیا خوب تشریح فرمائی آپ نے!

رسول اللہ کی زبان

ان لغویات کا کہاں تک شمار کراؤں، ایک دو باتیں ہوں تو لکھی بھی جائیں، یہاں تو شیطان کی آنت والا سلسلہ ہے، ختم ہونے ہی نہیں پاتا - دوسری جگہ لکھا ہے:-

"وہ اس خانقاہ میں کیسے آسکتے ہیں جن کے سینہ میں قرآن پڑھنے کا جذبہ نہ ہو - مبارک ہیں وہ جنہوں نے آسان زبان میں یعنی صدیق کی زبان سے قرآن کریم کے رموز سیکھے - صدیق کی زبان دراصل محمدؐ کی زبان ہے کہ جس سے ہم پر قرآن آسان ہوا - قرآن کریم نے محمدؐ کی زبان سے پڑھنے کی قید لگائی ہے فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ اور آگے ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا لُّدًّا - یعنی آپ آخر زمانے میں قرآن آسان کرنے کے لئے تشریف لائیں گے۔" (شمس الضحیٰ ص ۴۲)

بجا فرمایا آپ نے! چن بسویشور، دھن پتی، سری پتی، راند رجیوتی، گرو نانک کی زبان واقعی آپ کی نظر میں محمد الرسول اللہ کی زبان ہو سکتی ہے! اللہ ہم مسلمانوں کو ان خرافات سے محفوظ رکھے آمین! یہ تو ہندوستان کے دوسرے جنم میں آنے والے اوتاروں ہی کے لئے موزوں ہے - مسلمان کے کان میں تو پیدا ہوتے ہی الحمد للہ نبی کریم پر نازل شدہ قرآن کے کلمات پہنچا دیے جاتے ہیں!

مخالفین ڈسٹ ہیں

اپنی نبوت کا مزید سکہ جمانے کے لئے ارشاد ہوتا ہے:-

"ہم ہیں تقریباً تمام ہندوستان کے اوتار ہیں - ہم سے ہندوستان کو امن ہوگا - ڈسٹوں کے نبیر میں مت آؤ۔" (شمس الضحیٰ دیباچہ)

اسی کتاب کے دیباچہ میں آئندہ ساڑھے تیرہ سو سال کے لئے تبلیغ، ہجرت، غزوات کو حرام قرار دیا گیا - جہاد کو شاید اس لئے حرام قرار نہ دیا کہ ان کے پیشرو غلام احمد مرزا قادیانی یہ کام کر چکے تھے - ملاحظہ فرمائیے:-

"اب ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ ہمارا ماضی موعودہ اور بشارتوں کی بنا پر گزر گیا، مستقبل بھی موعود ہے وہ بھی گزر جائے گا - آئندہ اس قسم کی تبلیغ، ہجرت اور غزوات تیرہ سو سال تک نہیں ہونگے۔"

بجا ارشاد فرمایا آپ نے! جب تک اس کار سعید کے لئے آپ دوبارہ تشریف نہ لائیں بھلا کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ تبلیغ کرے! تبلیغی احکام قرآن پاک میں صرف آپ ہی کی شان میں نازل ہوئے تھے!!! استغفر اللہ!

انتہائی گستاخی بلکہ کلمۂ کفر

مصنف ایسا کیوں نہ لکھتا - جب صدیق دیندار چن بسویشور کا خود قول ہے کہ:-

"حضور (صدیق دیندار) نے فرمایا - میرا کام ختم ہو گیا - میں ایک طوفانی دورہ پر جانے والا ہوں - میں ہمیشہ آتا جاتا رہوں گا - اللہ بڑا "گھن چکر" ہے - وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا - اگر وہ کسی کی سمجھ میں آگیا تو وہ خدا ہی نہیں۔" (شمس الضحیٰ ص۱)

برادران! پڑھتے پڑھتے کھو نہ جائیے! یہ کسی شخص عالم خواب کی باتیں نہیں - کسی مجذوب کی بڑ نہیں - ہر دعویٰ دلیل کے ساتھ کیا گیا ہے! ہم نے آج تک چرسی، گداگروں اور نشۂ شراب میں چور بدمعاشوں کی زبان سے بھی ایسے کلمات نہ سنے تھے - صاحب شمس الضحیٰ کی قساوتِ قلبی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے گرو کا کوئی لفظ چاہے وہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو، نقل کئے بغیر نہ چھوڑا

وحدت الوجود کے قائلین عبرت حاصل کریں - اس قسم کی لغویات اسی نظریہ وحدت الوجود کی بھول بھلیاں ہیں - جہاں من تو شدم تو من شدی کے خیالِ باطل میں اپنے گھن چکر پن اور دماغی فتور کو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف منسوب اور اس کی ذات پر محمول

کرکے جھوما جاتا ہے۔ سبحان اللہ عما یصفون!

اس کتاب اور صاحبِ کتاب کی اسلام دشمنی میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ دیباچہ کا آخری جملہ بھی دل کڑا کرکے پڑھ لیجئے:۔

"آہ! ایسی عظیم المرتبت شخصیت کہ جس کے احسانات کو عالمِ انسانیت کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی، ساڑھے تیرہ سو سال بعد اپنا حقیقی چہرہ انور دکھلا کر راہ سفر اختیار کر گئی" (شمس الضحیٰ ص۳)

مقام محمود جس کتاب کی ابتداء ایسی ہو اس کی انتہا جس قدر بھی کفر و الحاد سے پر ہو کم ہے۔ ایک شعر مع تشریح ملاحظہ ہو۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

زمانے میں قرآن مشہود ہے اب — کہ ذاتِ محمد ہی محمود ہے اب

حاشیہ میں اس کی تشریح مضمون کے پھیلاؤ کی وجہ سے بقیہ ص۳۰-۳۱ پر پہنچی ہے۔ یہ تاویلوں پر تاویلیں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"چونکہ سارے اولیاء اللہ حضورؐ کی مدح میں گم تھے لیکن کسی ولی کو "مقام محمود" حاصل نہیں ہوا، اس لئے کہ وہ دور آگے تھا۔ جیسے کہ اس آیت سے روشن ہے "عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" آیت کے اس تیسرے حصہ میں حضورؐ کی ذات کو مقام محمود پر لانے کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ دورِ آخر ہے جو موعود ہے۔ حضورؐ نے اسی مقام محمود والی بعثت کے لئے مسلمانوں کو بعد اذان، دعا سکھائی جس کی تعمیل میں ہر مسلمان وابعثہ مقاماً محمودا کے الفاظ دہراتا ہے۔ ادھر نماز کے قعدہ میں شہادت کی انگلی اسی بعثت ثانی کی شہادت میں اٹھائی جاتی ہے جس کا انتظار مسلمانوں میں ہے۔ وہی بعثت مقام محمود والی بعثت ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ محمد الرسول اللہ ہر تیرہ سو سال کے بعد ایک امتی کی قبا پہن کر جلوہ گر ہوں گے۔ اسی لئے قعدہ میں السلام علیک ایھا النبی کہا جاتا ہے۔ کہ جس میں حضورؐ سے مخاطبت ہوتی ہے۔ "ایھا النبی" کی مخاطبت غائب کی نہیں ہے بلکہ آنکھوں سے دیکھنے کی حجت پیش کرتی ہے۔...... بہر صورت یہ بعثت ثانی کس رنگ میں ہوگی، بعثت ثانی میں وہ اپنا نام کیا پائے گی۔ اس کے لئے خود اللہ پاک نے قرآن میں حضورؐ سے دعا کرنے کے لئے کہا ہے۔ وہ یہ ہے "قل رب ادخلنی مدخل صدق...... سلطاناً نصیرا" حضورؐ کے سارے کمالات روحانی کا اگر کوئی وجود متحمل ہو سکتا ہے تو وہ وجود صدیق اکبرؓ کا ہے۔ بعثت اول میں بھی صدیق تھے بعثت ثانی میں بھی صدیق ہی ہیں۔...... پس اب ظاہر ہوا کہ حضورؐ شاہد و مشہود بھی ہیں اور روزِ قیامت میں محمود بھی۔ اور اس طرح جب آپؐ کا **اعادہ** ہوتا ہے تو **موعود** بھی ہیں۔...... حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری بعثت جس کو والبعث بعد الموت بھی کہا گیا ہے، حضورؐ کے سوا کوئی دوسرا وجود اس امت کی اصلاح کے لئے کھڑا نہ ہوگا۔ یعنی اس امت میں ہی ایک کامل انسان بروزِ محمدؐ کی شکل میں مبعوث ہوگا" (اقتباس از کتاب شمس الضحیٰ۔ مصنفہ عبدالغنی ص۳۰-۳۱)

اعادہ حضورؐ کا اعادہ کی بھی تشریح فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

یہ خود عود کر آئے موعود ہو کر — شہادت میں خود اپنی مشہود ہو کر (شمس الضحیٰ ص۱۲)

اور
نثر بن کے قرآن کے مشہود آئے   قیامت کی بعثت میں محمود آئے
اعادہ میں اپنے وہ موعود آئے   غرض دَور آخر کے مقصود آئے
(شمس الضحیٰ ص ۱۵)

تصورِ قیامت

تصورِ قیامت بھی ذرا ملاحظہ فرمائیے :-

"قیامت صغریٰ مسیح محمدی (مرزا غلام احمد) کا ظہور ہے۔ جیسے نفخ اوّل کہا گیا ہے۔ نفخ ثانی قیامتِ کبریٰ کو مختص ہے، جو حضورؐ کی ذات کو مختص کرتی ہے۔ اسی کو نشأۃِ اُخریٰ کہا گیا ہے وان علیہ النشأۃ الاُخریٰ یعنی دوسری بعثت لازم قرار دی گئی۔ جس طرح اوّل میں ہوا آخر میں ہوگا۔" (شمس الضحیٰ ص ۱۹)

موعود کون؟

میں نے یہ سب کچھ دل پر انتہائی جبر کرکے نقل کر دیا ہے۔ میرے لئے یہ انتہائی دشوار گزار مرحلہ تھا۔ کافی گزر چکا تھوڑا ہے، وہ بھی سن لیجئے :-

"یہ موعود ہستی حضرت مولانا صدیق دیندار قدس سرہ العزیز کی ہے۔ پس حضور کا معاد ہر تیرہ سو سال کے بعد ہوتا رہے گا۔" (شمس الضحیٰ ص ۱۴) اور "قرن اولیٰ میں ہلاکت کسریٰ والی پیشگوئی حضرت عمرؓ سے پوری ہوئی اور ہلاکت قیصر والی پیشگوئی ساڑھے تیرہ سو سال بعد حضرت صدیق کے ذریعہ سے پوری ہوئی۔ وہ اس طرح کہ قوم انگریز جو قیصر ہند کہلاتی تھی آپ کی حجت سے وہ اپنے مشرقی جزائر کھو بیٹھی۔ آج نہیں تو کل آنے والی نسلیں ضرور اس بین حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکیں گی۔ جیسے کہ "یوم الجمعہ" میں تمام انبیاء کا اجتماع حضورؐ کے دربار میں ہوا تھا۔ وہی اعادہ اسلام کی صورت میں بوقت یوم الجمعہ وارث انبیاء کی جماعت کے ساتھ لوٹ آیا۔" (شمس الضحیٰ ص ۲۱)

رحمۃ للعٰلمین

برادران! مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے، اختصار کی خاطر بلا تبصرہ اقتباسات پیش کر رہا ہوں، سب کچھ دیندار چن بسویشور بننے کے بعد "رحمۃ للعٰلمین" کا خطاب بھی دے دیا گیا۔ ملاحظہ ہو :-

"پہلی دفعہ آپ مخلوق پر رحم فرما کر رحمۃ للعٰلمین بن کر تشریف لائے اور مخلوق کو ہر بلا سے بچایا۔ اب دوبارہ آپ ہی تشریف لائے ہیں۔" (شمس الضحیٰ ص ۲۷)

کتنے حوالے دوں، کیا کیا لکھوں! اس شخص کے جذبہ جاہ پرستی اور شہوت کی ہوس کی کوئی انتہا تو ہو! کہیں چن بسویشور، شنکر، دھن پتی گرو ناتھ ہے تو کہیں یوسف موعود، مثیل موسیٰ، مہدی آخر الزماں اور بروز محمدؐ ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور کبھی شہنشاہیت کے خواب نظر آتے ہیں تو سکندر اعظم کا خطاب بھی مل جاتا ہے۔ کہیں جنت کو بیکار خانہ لکھا جاتا ہے تو کہیں شہر حیدر آباد کو بلد امین (مکہ) کے مقابل لایا جاتا ہے۔ اور مرید اور معتقد تو روضۂ اقدس کے مقابلہ پر "خانقاہ سرورِ عالم" ہی کو سب کچھ تصور کئے بیٹھے ہیں۔ ستم ظریفی کی حد تو ہے کہ معاذ اللہ، اللہ سبحانہ تعالیٰ کو "گھن چکر" لکھا جاتا ہے!

شفاعت

لیجئے قیامت میں شفاعت بھی اب یہی دھن پتی چن بسویشور مہاراج فرمائیں گے۔ لکھتے ہیں :-

"قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت میں اللہ قاضی کی حیثیت سے آئے گا اور سزا و جزا کے فیصلے سنائے گا۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ بروز حشر حضور اکرم امت کی شفاعت فرمائیں گے یہ بعثت ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ اسلام میں ختم نبوت کا مسئلہ مسلّم ہے، اس لئے کوئی شخص حضورؐ کے

بعد دعویٰ نبوت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اُمت کی شفاعت آپؐ ہی کریں گے، وہ بعثت بہ لباس دیگر ہوگی، وہی بعثت بروز محمدؐ کہلائے گی، وہ قیامت کے نشان مسیح موعود کے بعد ہوگی، آپ قیامت کے مالک بن کر آئیں گے، وہ وجود حضرت مولانا صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کا ہے۔" (شمس الضحیٰ ص۷)

سُن لیا آپ نے۔ یہ دَورِ قیامت ہی، چن بسویشور بہ لباس دیگر (نعوذ باللہ) حضورؐ ہیں۔ شفاعت اب اُن کے کہنے سے ہوگی۔ استغفر اللہ۔

اس مغالطہ پر بھی غور فرمایئے کہ "اسلام میں ختم نبوت کا مسئلہ مسلّم ہے، اس لئے آپؐ کے بعد کوئی دعویٰ نبوت نہیں کر سکتا۔" لیکن کوئی دعویٰ نبوت کرتا ہے تو وہ کافر، کاذب، دجّال نہیں ہے بلکہ وہ حضورؐ ہی بہ لباسِ دیگر یا در بعثتِ ثانی ہیں۔ بریں عقل و دانش گریست! یہ کیا اندازِ فکر ہے؟ آگے ہم کیا سُن رہے ہیں!!!

حشر

یہ آخری جملے بھی چاہے آپ کو کتنے ہی ناگوار گزریں، پڑھ لیجئے۔ ایسا نہ ہو آپ "قاضیٔ حشر" اور "اللہ" کے عرفان سے محروم رہ جائیں! ابو الکلام عبد الغنی صاحب "شمس الضحیٰ" میں ایک خواب بھی صدیق دیندار چن بسویشور کا نقل فرماتے ہیں فرمایئے:۔

"میں نے خواب میں دیکھا حشر برپا ہے، اللہ قاضی کی حیثیت سے آیا ہے، ایک بلند تخت پر بیٹھا ہے، جزا و سزا کے فیصلے دے رہا ہے، میں نے دیکھا کہ وہ میری صورت میں ہے۔" (شمس الضحیٰ ص۷)

سُنا آپ نے! قاضیٔ حشر آیا بھی! جزا و سزا کے فیصلے دیکر چلا بھی گیا۔ اور آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔! استغفر اللہ! استغفر اللہ!!

برادران! یہ ہے وہ جماعت جو آپ کے پاکستان میں آپ سے چندہ وصول کرکے آپ کے دین و ایمان پر کلہاڑا چلا رہی ہے! میں ہوں کہ میں نے چار سال فریب خوردگی میں گزار دیئے اور نہ جانے کب تک راہِ کفر و ضلالت کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ سیرۃ النبی کے جلسے میں جناب ماہر القادری سے ملاقات ہوئی اور اس مردِ قلندر کی ایک ہی ضرب سے کفر و ضلالت کی تمام زنجیریں جو مجھے جکڑے ہوئے تھیں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ میں مکرر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قابل ہرگز نہ تھا کہ اس مضمون کی ذمہ داری لے کر تا۔ لیکن محض عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خدمتِ دین کے جذبہ سے مجبور ہو کر جو کچھ بن پڑا پیش کر دیا۔ ان مسائل پر مزید علماء کرام کا حق اور فرض ہے۔ میں عاجزانہ درخواست کروں گا کہ عاشقانِ محمدؐ مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس فتنہ سے خبردار رہیں! اس سلسلہ میں مجھ سے جو کچھ مزید خدمت ہو سکے گی، اس کے لئے میں ہمیشہ تیار اور سربکف ہوں۔ والسلام!

احقر العباد زاہد صدیقی

سابق مبلغ دیندار انجمن۔ کراچی۔

الیکٹرک ولڈنگ دکان ۵ مقابل باغ طارق بلڈنگ

لارنس روڈ۔ کراچی

ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری
پی ایچ ڈی۔ ڈی ایس سی (علیگ)
پی ایچ ڈی (کینٹب)، کراچی یونیورسٹی۔

اسلامی تعلیم و تربیت

مسلمانوں کے لئے بالخصوص پاکستان کے واسطے نظام تعلیم و تربیت بنانے سے قبل تعلیم حاضر پر ایک نظر ڈالنا ہمارے لئے لازم ہے۔ ہمیں موجودہ دور کی تعلیم پر غور کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہم یہ اندازہ کر لیں کہ کس حد تک وہ موجودہ زندگی کے مسائل کا مقابلہ کر سکی اور اس کو کن وجوہات کی بنا پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی!

موجودہ تعلیم کو بہت سی زبردست قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ان میں سب سے زیادہ بڑی قوت سائنس کی ہے، جو نہ صرف نظری سائنس پر مشتمل ہے بلکہ اس میں عملی سائنس (applied science) بھی شامل ہے۔ ان دونوں قسم کی سائنس نے انسان کی دنیا اور ماحول کو کیفیت اور کمیت مزاج اور مقدار دونوں کے اعتبار سے بدل ڈالا ہے۔ اور ساری نوع انسان کی سماجی زندگی کے جملہ پہلوؤں میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ گلیلیو کے زمانہ سے سائنسی علوم تصورات اور قیاسات سے آزاد ہو کر تجربہ و مشاہدہ آلات اور دیگر خارجی ذرائع کے استعمال سے حاصل ہونا شروع ہوئے اور سائنس ایک ذاتی محسوسات، شمار اور ناپ تول کا علم بن گیا۔ چنانچہ مشاہدات و محسوسات کو بہتر سے بہتر بنانے کیلئے اور معلومات و نظریات کو آلات و اسباب سے واضح اور بیّن کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ مگر بہ ایں ہمہ یہ تمام مشاہدات ابھی تک غیر مربوط ہیں۔ اور کسی ایک تجربہ کی بنیاد ابھی تک صرف ایک یا معدودے چند واقعات و مشاہدات کی حد سے زیادہ نہیں بڑھنے پائی ہے۔ اس محدود تجرباتی یا محسوساتی کیفیت نے مختلف سائنسوں میں باہمدگر اور سائنس اور دوسرے قسم کے علوم میں ایک اجنبیت اور مغائرت پیدا کر رکھی ہے، چنانچہ سائنس، سماجی علوم اور انسان کے دیگر ذہنی اور روحانی تصورات نہ صرف ایک دوسرے سے اجنبی اور غیر ہیں بلکہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان کی شخصیت، اس کا تخیل، اس کے جذبات اور امنگیں، اس کے اخلاق و کردار میں ایک اندرونی و بیرونی تصادم برپا ہے اور انسان کل زندگی کو کسی مقصد و غایت، کسی کیف و ذوق، کسی آرزو اور امنگ کے لئے ہم آہنگ اور مجتمع نہیں کر سکتا۔

منفعتی یا عملی سائنس نے نئی نئی ایجادیں کر کے انسانی دنیا کو محدود و یکجا کر دیا ہے، اب ساری دنیا کا گوشہ گوشہ ایک دوسرے سے متاثر ہو رہا ہے اور جملہ انسانوں کے خیالات، کردار، زندگی اور اس کے محرکات و رجحانات ایک دوسرے سے شدت کے ساتھ اثر پذیر ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سائنس کی ایجادوں نے اس قدر مختلف قسم کے آرام، آسائش، تفریحات اور مصنوعات پیدا کر دی ہیں کہ سادہ اور سخت کوش زندگی کا تخیل ہی بدلتا جا رہا ہے۔ اور انسانی معاشرت، تمدن اور معاشیات کے متعدد مشکل اور دشوار مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ عملی سائنس نے ایسے مہلک اور خطرناک حربے اور ہتھیار ایجاد کر لئے ہیں کہ جن سے نہ صرف امن عالم کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے بلکہ خود اس بات کا احتمال قوی طور پر پیدا ہو گیا ہے کہ ساری کی ساری نوع انسانی ہی کہیں فنا اور ناپید نہ ہو جائے!

ایسے حالات اور مسائل کا موجودہ تعلیم کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکی، اور ان کے روبرو اس وقت اس قدر بے بس اور لاچار نظر آتی ہے کہ عالم کے مبصرین اور ماہرین تعلیم سخت پریشان اور متفکر ہیں۔ ہمارے علماء سلف نے اپنے دور کے علوم کو باہمدگر مربوط کر دیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ یہ کہ علوم کو زندگی بلکہ روحانیت سے بھی مربوط کرکے، انسان کے ذہن کو جلا، انسان کے قلب کو تسکین اور روح کو تزکیہ عطا فرمادیا تھا۔ آج اس چیز کی کمی کا شدت ترین احساس عالم گیر ہے۔ چنانچہ برٹرنڈرسل، پروفیسر کلارک، پروفیسر کینڈل نے خاص طور پر اس بات کی توجہ دلائی ہے کہ تعلیم کو زندگی سے مربوط کیا جائے۔ اور درس و تدریس کو سوسائٹی کے نصب العین اور غایات کے حصول کے لئے مفید مطلب بنا کر "مثالی نمونہ" انسانوں کے وضع کئے جائیں۔ یہ مثالی نمونے قومی تاریخ، ثقافت اور روایات ہی سے متاثر اور فیضیاب ہو کر انسان کو نہ صرف اُن کے ماضی سے افادہ حاصل کرنے کے قابل بنائیں گے بلکہ اُن میں ایک تخلیقی قوت اور ایک ماحول پر غالب آجانے کی پُوری لیاقت پیدا کرسکتے ہیں!

غرض یہ کہ اب جبکہ عالم ایک اچھے نظام تعلیم کے لئے محتاج اور درماندہ نظر آرہا ہے، ہمیں لازم ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایک نئے نظام تعلیم کو وضع اور پیش کرنے کی کوشش کریں۔

اسلام کا نظریہ علم

اسلام نے علم کے حصول و اکتساب کو جو شرف و منزلت عطا کی ہے اس کا اندازہ قرآن پاک سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ "جاننے والے جاننے والوں کے برابر نہیں ہوسکتے۔ (زمر۔ ۱۹) نیز یہ کہ قرآن میں جو مثالیں دی ہیں انھیں اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔" (عنکبوت۔ ۱۰) قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ قرآن پر وہی انصاف، صحت کے ساتھ عمل کرسکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں — (آل عمران) امام غزالیؒ نے احیاء علوم میں علم کے سلسلہ میں متعدد احادیث کا حوالہ دیا ہے:۔

۱۔ عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جتنی رسولؐ کو فضیلت ہے عام ترین انسان پر۔ (بخاری اور مشکوٰۃ)

۲۔ آدمی کو علم کا کوئی باب سیکھنا اس کے حق میں دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

۳۔ قرآن بدون علم کے کب مفید ہے!

اقبال نے علم کی قدر و منزلت اور ضرورت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

خواجۂ ما صاحب ام الکتاب   پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب

آں کہ عین ذات را بے پردہ دید   "رب زدنی" از زبانِ او چکید

اسلام کا فلسفہ یا نظریۂ علم ایک وسعت، ہمہ گیری اور ایک خاص معنی رکھتا ہے، بدقسمتی سے اسلامی نظریۂ علم دورِ حاضر کے پس منظر میں واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی، دین و ثقافت، تہذیب و تمدن، سب کے سب علم و فکر سے ایک گہرا ربط رکھتے ہیں۔ قدیم علماء اسلام نے اپنے دور میں علم کی تشریح اور ضرورت پر تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ جن میں خاص طور پر امام ابوالحسن الغزالیؒ کی وہ بحث ہے جو احیاء علوم میں علم کی ضرورت اور اس کے مختلف اجزاء سے متعلق ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں علم کی وسعت اور اس کے تنوع کا اندازہ اس آیت سے ہوسکتا ہے۔ علم الادم اسماء کلھا۔ اس آیت شریفہ کی تفسیر مولانا عبدالحق نے تفسیر حقانی میں یوں فرمائی ہے:۔

"خدائے تعالیٰ نے آدمؑ کے دل میں یہ القا کردیا کہ فلاں شئے کا یہ نام ہے، فلاں کا یہ، یعنی آدم کی سرشت میں وہ اجزائے مختلفہ و قوائے متباینہ رکھے کہ جن سے اس کو طرح طرح کے معقولات اور محسوسات و متخیلات و متوہمات اور حقائق اشیاء اور اُن کے خواص اور نام اور اصول علم و قوانین صفت اور اُن کے آلات کی کیفیت کا علم حاصل ہوسکے۔"

الغرض علم الادم اسماء کلھا سے تمام محققین نے یہ مراد لی ہے کہ اسماء سے مراد صرف نام نہیں بلکہ اشیاء کی حقیقت اور خواص و ادصاف ہیں۔ اسلام نے تحصیل علم و معرفت کے سلسلہ میں انسان کو خاص طور پر اس کی دعوت دی ہے کہ وہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء کا مطالعہ کرے

جو کہ اس کے گرد و پیش ہیں، یوں تو قرآن پاک میں اس بات کے لئے بہت سی آیتیں موجود ہیں۔ لیکن تخلیق کے مطالعہ کا ایک خاص انداز اور طریقہ اور اس کے فوائد اس آیت کریمہ سے واضح ہیں:-

الَّذِین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض، ربنا ما خلقت ھذا باطلا، سبحٰنک فقنا عذاب النار۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان جب حقیقت عالم اور حقیقت کبریٰ کی تلاش میں نکلے تو پہلے ذکر الٰہی (یعنی خدائے تعالیٰ کی تسبیح، اس سے استغفار اور اس سے عاجزانہ دعا اور التجا و مدد سے اپنے آپ کو علم و معرفت کے نفوذ کے قابل بنائے، اس کے بعد وہ کائنات، زمین اور آسمان کی تخلیق پر پورے طور سے غور کرے) ظاہر ہے کہ کائنات کی تخلیق و ترکیب پر غور کرنے کے لئے اس کو وہ تمام علوم درکار ہوں گے جن سے خارج کا احساس، مشاہدہ، تجربہ، تنقید و تنقیح کی جا سکتی ہو، اس لئے اس کو طبعی اور حیاتیاتی سائنس پر جن میں طبعیات، کیمیا، نباتات، حیوانات، ارضیات، جغرافیہ، ریاضی وغیرہ ہیں پوری دسترس ہونی چاہیئے!

پس ان علوم کا حاصل کرنا ایک کامل اور متبحر عالم کے لئے ضروری اور لازمی ہے اور اگر ان علوم کو صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے حاصل کیا جائے تو اگرچہ معرفت کے درجہ تک انسان نہ بھی پہنچ سکے مگر اپنی حقیقت اور کائنات کی حقیقت کا صحیح اندازہ اور اس کے مقصد و معنی کا احساس meaning appreciation تو یقیناً پیدا ہو جائے گا اور وہ اس منزل پر پہنچکر بر ضرور کہیگا۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔

اس طرح جماعتی علوم سیاست، مدنیت، تاریخ، علم النفس وغیرہ کی ضرورت اور اس کے حصول کی تحریص و ترغیب بھی قرآن میں موجود ہے۔ مفسرین قرآن نے لکھا ہے کہ طالوت کو جس علم میں فراخی و وسعت دے کر بنی اسرائیل کی قیادت عطا کی گئی تھی، وہ علم سیاست وغیرہ سے متعلق تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ طالوت کی قوم میں نہ صرف دولت وجاہ والے اُن سے بہت زیادہ موجود تھے، بلکہ اس کے علاوہ ان کے نبی حضرت شموئیل علیہ السلام اُن میں موجود تھے۔ اور انہوں نے خود طالوت کی قیادت کی تجویز و تائید کی۔ الغرض اسلام نے علم کے حدود اور اس کے متعلقات کو بہت وسیع و بسیط کر دیا ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ علم کو اس طرح حاصل کیا جائے کہ اس سے ایک صحیح شخصیت، ایک مفید انسان اور اسلامی فکر، جذبات و کردار پیدا کر سکیں!

مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ کار

تعلیم میں اسلامی رنگ اور نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لئے اور اس سے اسلامی غائیت حاصل کرنے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ مختلف علوم کے طریقۂ تعلیم میں اور اُن کے نصاب میں اصولی طور پر تبدیلیاں کی جائیں۔ مثال کے طور پر ہمارے عہد سلف کے علماء بو علی سینا، علامہ ادریسی، امام فخر الدین رازی، ابن بطوطہ وغیرہ کی تعلیمات پر غور کیجئے، انہوں نے اپنے زمانہ کے جملہ علوم مثلاً سائنس، فلسفہ، ادب اور تاریخ کو پڑھا، لیکن ہر ایک علم کی تعلیم اپنے نتیجہ کے طور پر نہ صرف اُن کی علمی اور ذہنی ترقی کی موجب ہوئی بلکہ اُن کے دل و دماغ کو اسلام کے قریب تر لے آئی۔ لہٰذا یہی صورت اب بھی اختیار کرنی چاہیئے۔ یعنی مسلمان علوم کو اس طرح پڑھیں کہ علاوہ تعلیمی انجلاء کے یہی تعلیم ان کو صحیح مسلمان بنائے، اس سلسلہ میں پہلے جماعتی علوم پر غور کرنا چاہیئے۔ جماعتی علوم میں دینی تعلیم کے علاوہ ادب، تاریخ، شہریت، معاشیات، اور فلسفہ اہم علوم ہیں۔ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ جذبات کی تعمیر کرتا ہے۔ ہمارے ادب کی غایت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اسلامی زندگی کا آئینہ دار ہو سکے۔ اس کے واسطہ سے اسلام کی اخلاقی اور دوسری جماعتی غایات سے محبت پیدا ہو۔ ہمارے ادب سے غیر اسلامی زندگی اور غایات سے نفرت اور دوری پیدا ہونی چاہیئے تاریخ صرف واقعات نگاری تک محدود نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ اس کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کی مسلسل اور متحرک تحریک نظر آئے۔ غیر مسلم اقوام کی تاریخ پڑھانے میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم ایک جانب دنیا کی مختلف قوموں پر اسلام کے اثر کو

بیان کریں اور دوسری جانب جملہ قوموں کی تاریخ یا اُن کے عروج و زوال کو اسلام کی روشنی میں معلوم کریں۔ اسلامی تاریخ کو اس طرح پڑھایا جائے کہ اس سے اسلامی غایات، محرکات اور فکری رجحانات اور اُن کے تغیر و تبدل کے اثر کو پورے طور سے سمجھا دیا جائے برِ اعظم ہند و پاکستان کی تاریخ کو اس طرح پڑھایا جائے کہ یہاں اسلام ایک انقلاب انگیز اور زندگی بخش تحریک کے طور پر آیا اور یہاں کی ساری زندگی، عقائد اور کیفیات پر حاوی اور طاری ہو گیا۔ علاوہ ازیں اس برِ اعظم میں ہمیں جو کامیابیاں و ناکامیاں ہوئیں۔ اُن کے اسباب و وجوہ پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ علمِ شہریت، سیاسیات، معاشیات وغیرہ کی تعلیم میں اسلامی اصولوں کو اصل قرار دے دیا جائے اور دوسرے اصولوں کو بطور موازنہ اور مقابلہ پڑھایا جائے۔ گویا تعلیم کا اسلوب ایسا ہونا چاہیئے کہ علوم مذکورہ کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات و رجحانات معلوم ہونے کے بعد طلباء کو دوسرے مختلف نظریوں کا بھی پورا علم ہو جائے اور اسلامی نظامِ اجتماعی کی برتری اور فوقیت اُن پر عقلی طور پر ثابت اور مسلّم ہو جائے!

سائنس کے سلسلہ میں اولاً یہ ضروری ہے کہ طلباء کو سائنس کا کام، اُس کے حدود اور اس کی تحقیق کا صحیح طریقہ معلوم ہو جائے۔ سائنس کے دیگر علوم اور دین سے تعلق اور رابطہ کو واضح طور پر پڑھایا جائے۔ اور دین و سائنس کے درمیان جو نظریاتی تصادم ہے، اس کو پوری کوشش اور ذہنی جد و جہد سے رفع کر دیا جائے۔ نیز دورِ حاضر میں سائنس کی تعلیم کا غایاتی یا اخلاقی نقطۂ نظر جو خود علمِ سائنس کے لئے مُضر اور اس کے استعمال سے انسان کُش نتائج پیدا کر رہا ہے، اس کو از سر تا پا بدلنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً یہ کہ حیاتیاتی علوم سے مابعد طبعیاتی نظریئے بنائے جانے کا رجحان یا اُن علوم سے اخلاقی اصولوں کی تعمیر کرنے کی کوشش جو انسانیت کے لئے بھی مضرت رساں کام ہیں اور خود ان سائنسوں کی ترقی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، اس کو روکنا لازم ہے۔ فلسفہ کی تعلیم ہماری تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ فلسفہ کی غایت کائنات کے بنیادی مسائل پر صحیح اسلوب فکر پیدا کرنا ہے۔ یعنی اخلاق اور علم کے جو بنیادی تصورات ہیں، اُن کو واضح کرکے اور اُن کے تعلقات کو معلوم کرنا فلسفہ کے حیطۂ عمل میں شامل ہے اس علم میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو داخل کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ اور غیر اسلامی خیالات اور تصورات کو زائل کرنے کا عمدہ اور آسان طریقہ بھی ہے کہ فلسفہ پر اسلامی رنگ طاری کیا جائے۔ دینیات یا اسلامیات کی تعلیم کے سلسلہ میں اولاً قرآن پاک کی تعلیم ضروری ہے۔ قرآن پاک کی جو تفسیر پڑھائی جائے، وہ مباحثِ کلام پر مبنی نہ ہو، بلکہ زندگی کے حقائق پر مبنی کی جائے۔ ثانیاً سیرتِ نبوی کی تعلیم بالاستقلال اور تفصیل کے ساتھ دی جائے۔ پھر اس کے ساتھ تاریخ اسلام دورِ اوّل، عہدِ خلافت، اسلامی اخلاق، حقوق و فرائض، ارکان و عقائد سے بالاستیعاب آشنا کرنا چاہیئے۔ دینیات کے سلسلہ میں عربی کی تعلیم بھی نہایت ضروری ہے اور کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہمارے اعلیٰ درجوں کے طلباء قرآن و حدیث و فقہ کی بنیادی کتابوں سے خود اپنے آپ ہدایت و روشنی حاصل کر سکیں۔ اور اُن کے معنی اور مفہوم کو بذاتِ خود معلوم کر سکیں!

اسلامیات کی تعلیم کے دو پہلو ہونے چاہئیں۔ اوّل وہ جو کہ عام تعلیمی نصاب میں لازمی ہو۔ پھر اس کے علاوہ وہ نصاب تعلیم جو ثانوی کے بعد اختیاری قرار دے دیا جائے اور جس میں اس کا بی اے پاس اور بی اے آنرز کے مساوی معیارِ تعلیم رکھا جائے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں دینی تعلیم کی اعلیٰ کلاسوں اور ریسرچ کا پورا انتظام رکھتی ہیں۔ بلکہ اب تو آکسفورڈ میں یہ چیز بھی شروع کی جا رہی ہے کہ آنرز کلاسوں کے ایسے کورس بنائے جائیں، جن میں سائنس اور عیسائیت کے مضامین مشترکہ طور پر شامل کئے جائیں۔ لہٰذا یہ ایک لازمی چیز ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے بی اے اور بی اے آنرز کے کورس ایسے بنائے جائیں جن میں اسلامیات بحیثیت خاص یا معاونی مضمون کے شامل کی جائے۔ اس

سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کے گزشتہ نصابات و دیگر اسلامی اداروں کے نصابات کا خاص طور پر مطالعہ کرنا ضروری ہے !

لازمی اسلامیات کی تعلیم ابتدائی دور ہی سے شروع کر دینی چاہیئے - ابتدائی پانچ سالوں میں فقہ کے عام مسائل نماز اور عملی اخلاق کی تعلیم ہونی چاہیئے - تیسری، چوتھی جماعت میں قرآن کریم ناظرہ عربی کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ شروع کرائی جائے - چوتھی، پانچویں جماعتوں میں متعدد قرآنی سورتیں حفظ یاد کرائی جائیں - اور اُن کی تفسیر ذہن نشین کرادی جائے - اسلامی تاریخ ابتدائی جماعتوں میں نہایت اہم ہے - قرآنی قصص، سیرت نبویؐ اور مشاہیر اسلام کے حالات دلکش شکل میں مرتب کر کے پڑھائے جائیں !

ادنیٰ ثانوی یعنی چھٹے سال سے نویں یا دسویں سال کی تعلیم میں اسلامیات کے نصاب کو حسب ذیل طریقوں سے مرتب کیا جائے ،-

(۱) اسلامی شعائر و اخلاق جن کی تعلیم ابتدائی جماعتوں میں عملی اور زبانی طور سے ہوئی تھی اب علمی حیثیت سے پڑھائی جائیں - نماز کے پورے معنی اور اس کی روحانی قدر و قیمت سے آگاہ کیا جائے -

(۲) ارکان اسلام (کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد) کے نصاب کو خاص طور پر مرتب کر کے پڑھایا جائے اور اس کو اسلام کے عالمی، عالمگیر نصب العین، اجتماعی اور انفرادی اخلاق کی روشنی میں واضح کیا جائے -

(۳) عربی زبان کی مختصر سی تعلیم لازمی قرار دی جائے، عربی زبان کے سلسلہ میں یہ پیش نظر رہے کہ قرآنی الفاظ و لغات ہی سے عربی کی صرف ضروری تعلیم دی جائے -

(۴) قرآن کی تعلیم با متن ہو اور اس کی تفسیر واضح کی جائے -

(۵) سیرۃ نبویؐ کو بحیثیت ایک مستقل مضمون کے پڑھایا جائے -

اعلیٰ تعلیمی دور میں اسلامیات کے بی اے آنرز اور بی اے پاس کے نصابات مرتب کئے جائیں - بی اے پاس کورس کی اسلامیات کا جو کسی آنرز میں بحیثیت subsidiary یا معاون مضمون کے پڑھائی جائیں گی - حسب ذیل اصولوں کے ماتحت نصاب وضع کیا جائے :-

(۱) فقہ (معمولی ضروریات سے متعلق چھوٹی سی کتاب)

(۲) حدیث - مسلمانوں کی روحانی، اجتماعی زندگی کے ماخذ کی حیثیت سے -

(۳) سیرت نبوی اور عہد خلافت -

(۴) اسلام کا سیاسی، معاشی اور اخلاقی فلسفہ اور تعلیمات، اس نصاب میں قرآن کریم سے خاص طور پر مدد لی جائے اور قرآنی متعلقہ آیات بتائی جائیں -

(۵) تاریخ مذاہب کی تفسیر، اصول تفسیر کی بنیاد پر پڑھائی جائے -

(۶) اسلامی تہذیب کا اثر عالمی تہذیب پر واضح کیا جائے -

اس کے علاوہ جماعتی علوم مثلاً تاریخ، فلسفہ، معاشیات، قانون وغیرہ کے کورسوں میں بی اے پاس میں ایک پرچہ کا نصف جزو اور آنرز میں ایک پورا پرچہ اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ - اسلامی معاشیات اور اسلامی قانون کا ضرور ہونا چاہیئے -

بی اے (آنرز) اعزازی - اسلامیات خاص کا نصاب خاص طور پر نہایت غور و خوض سے مرتب کرنا چاہیئے - اس نصاب میں اسلامیات میں خاص نظر پیدا کر دینی چاہیئے - علاوہ ازیں عربی زبان میں کافی مہارت بھی حاصل ہونی چاہیئے - اسلامیات کا بی اے آنرز میں بھی کوئی معاون مضمون شامل کیا جا سکتا ہے، مگر عام طور پر جو مضامین معاونی طور پر پڑھائے جائیں - اُن میں فلسفہ، تاریخ، معاشیات، انگریزی زبان، علم النفس اور سائنس کو خاص ترجیح دینی چاہیئے -

اسی طور پر متذکرہ مضامین کے خاص کورسوں کے ساتھ اسلامیات کے معاون مضمون بھی لینے کی اجازت دینی چاہیئے۔ اسلامیات کے آنرز کورس میں حسب ذیل مضامین سے اسلامیات کا نصاب وضع کیا جائے:۔

۱ - تاریخ اسلام (عربی، ترکی، فارسی ماخذ سے)

۲ - فقہ (اسلامی اور غیر اسلامی فقہ اور قوانین کا متقابل نصاب)

۳ - اسلامی ادب فارسی، عربی زبان میں۔

۴ - تفسیر قرآنی مع تاریخ نزول و جمع قرآنی۔

۵ - حدیث مع اصول تنقید اور تاریخ جمع حدیث۔

۶ - تقابلی ادیان مع دَورِ حاضر کے لادینی اصول اخلاق کے۔

نوٹ:۔ یہ امر ناگزیر ہے کہ اسلامیات کے پاس شدہ طلبار کو سرکاری ملازمتوں اور دیگر امور میں وہی حیثیت دی جائے جو دُوسرے مضامین میں پاس شدہ طلبار کو دی جاتی ہے۔

اسلامیات کی تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری ہو کہ اساتذہ صحیح اور ضروری اسلامیاتی تعلیم و تربیت کے حامل ہوں۔ جو اساتذہ اسلامیات کو ابتدائی درجوں میں پڑھائیں اُن کے لئے اسلامیات کا حسب ذیل نصاب ضروری ہونی چاہیئے۔ یہ نصاب بھی دیگر نصابات تعلیم کے ساتھ مربوط کر کے ہمارے ٹرئننگ کالجوں میں پڑھانے چاہئیں:۔

۱ - اسلامی اخلاق و عادات۔

۲ - سیرت و تاریخ عہد خلافت۔

۳ - نماز اور اس سے متعلقہ دعاؤں، تسبیحات، استغفار، سُورتوں وغیرہ کی کتاب۔

۴ - ایف اے تک کی لازمی اسلامیات۔

۵ - عربی زبان کی تعلیم قرآن وحدیث کی بنیاد پر۔

۶ - اسلام کا اخلاقی وجماعتی فلسفہ!

وہ اساتذہ جو ثانوی اسلامیات کی تعلیم دیں، اُن کے لئے علاوہ مذکورہ بالا مضامین کے حسب ذیل مضامین کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔

۱ - تعلیم و تربیت کا اسلامی نقطہ نظر۔

۲ - اسلامیات کو دیگر مضامین سے مربوط کرنے کے اصول۔

۳ - تعلیم کی تاریخ۔ جس میں مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا عنصر شامل ہو۔

اسلامی علمار و مبلّغین کی تعلیم و تربیت

اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک ضروری امر یہ بھی ہے کہ اسلامیات آنرز کی تعلیم کے بعد اس میں عالم و فاضل نیز محققین تیار کئے جائیں۔ ان کے علاوہ اسلامی مبلّغین کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص انتظام کیا جائے۔ یہ بات اچھی طرح سے ہمارے ذہنوں میں صاف ہوجانی چاہیئے کہ اسلامیات کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اسلامیات کے متبحر علماء اور اعلیٰ محققین پیدا کریں اور علمار و محققین کی تعلیم و تربیت اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ثانوی مدارج ہی سے اسلامیات کی تعلیم اور اسلامیات میں بی اے پاس اور بی اے آنرز کی ڈگریاں لینے والوں کی خاص تعلیم اور تعلیم سے بڑھ کر ایک خاص قسم کی تربیت کا تسلی بخش اور مناسب انتظام کریں۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ لازم ہے کہ ہماری جملہ یونیورسٹیوں سے ملحق ڈھاکہ، کراچی، لاہور اور پشاور میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی طرح مشنری یا تبلیغی ہال، یا اقامتی درسگاہیں بنائی جائیں۔ مثلاً یہ کہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں سے متعدد ایسے ادارے ملحق کئے گئے ہیں۔ جہاں عیسائیت کی خاص تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ اور جن کے طلباء عیسائیت کی تبلیغ کے لئے افریقہ، ایشیا اور دیگر براعظموں میں سال بہ سال بھیجے جاتے ہیں۔ ان اداروں کا اقامتی یا رہائشی ہونا لازمی ہے۔ درسیات کے لئے ان کا الحاق وفاقی یونیورسٹیوں سے ہونا چاہیئے۔ لیکن ان میں وہی طلباء رہنے چاہئیں جو اسلامیات کے کورس بی اے پاس یا بی اے آنرز میں پڑھ رہے ہوں۔ ایسے طلباء کے لئے یہ ادارے ایک خاص تربیت، معاونی درسیات اور ٹیوٹوریل سسٹم کا انتظام کریں۔ تربیت کے لئے جو انتظام ہو وہ ان اداروں کی انجمنوں، تقریری کلاسوں، مذہبی زندگی اور ماحول کی شکل میں منظم ہونا چاہیئے۔ ٹیوٹوریل سسٹم میں یہاں کے ہر طالب علم کو عربی زبان، دینی علوم، علم الادیان، فلسفہ اور اجتماعیات کے لئے موزوں اور قابل اساتذہ کے ساتھ انفرادی طور پر منسلک کردیا جائے۔ جو باقاعدہ ہر طالب علم کے علمی رجحانات کی اسلامی نظر سے پرورش کریں۔

علاوہ ازیں ایسے اداروں میں اسلامیات کی تحقیق کے لئے فیلوشپ اور وظائف و رہائش کی خاص امداد دینی چاہیئے۔ اور یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایسے اداروں سے چند ایسے معتبر علماء کو منسلک کردیا جائے جو نہ صرف اسلامی تحقیق کے ماہر و مبصر ہوں، بلکہ جن کی زندگیاں اسلامی اخلاق و جذبات کا عملی نمونہ پیش کرسکیں۔

ایسے اداروں میں تبلیغ اسلام کے لئے ہر سال چند خاص خاص طلباء کو عملی طور پر اسلامیات کی تبلیغ کے لئے افریقہ، جزائر شرق الہند، یورپ، امریکہ وغیرہ بھیجنا چاہیئے۔ اور تبلیغ کے متعلق تمام معلومات، تربیت اور عالمی کیفیت و مسائل پر غور و فکر کرنے کا مناسب انتظام رہنا چاہیئے۔

مذکورہ بالا اداروں کا معرضِ وجود میں آنا پاکستان کے استقلال و ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔ ایسے ادارے، پاکستان کے مقاصد کے حصول کے لئے لازمی ہیں اور یہی عہد حاضر میں اسلام کو عالمگیر ہدایت اور فلاح کی شکل میں پیش کرنے کی صحیح صورت اور تدبیر کو بروئے کار لاسکتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ صحیح اسلامی تربیت کا خاص انتظام اور اہتمام کیا جائے!

اسلامی تربیت اور اسکی تدبیر

اسلامی تربیت سے یہ مراد ہے کہ انسانی وجود کی جملہ حرکات اور افعال اسلام سے متاثر ہوں۔ وجود انسان کی ترتیب، اس کی تعلیم اور بالآخر تزکیہ اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ انسان کا ذہن (Intellect)، کردار (Behaviour) اور جذبات (Emotion) سب کے سب اسلام سے سیراب اور متاثر ہوں۔ ذہن کی تعلیم و تربیت، تعلیمی مواد اور اس کے متعلقات سے کی جاسکتی ہے اور یہ چیز سب سے زیادہ آسان ہے۔ اخلاق یعنی سیرت و کردار، جذبات اور امنگوں کے لئے مزید ذرائع اور وسائل درکار ہیں۔

اسلامی جذبات اور اخلاق درحقیقت فطرتِ انسانی کے صحیح اور صالح فطری جذبات اور اعمال ہیں۔ ان کی صحت و صالحیت کے تعین کے دو طریقے ہیں۔ اولاً قرآن۔ اور ثانیاً رسول اکرمؐ اور اکابر صحابہؓ کی زندگیاں اور ان کے اقوال و اعمال۔ کسی عمل یا کسی جذبہ کو محض قیاس اور ظن کی بنیاد پر اسلامی قرار دے دینا۔ ایک بڑی غلطی ہے۔ اور اس بات کے فیصلے کے لئے قرآن اور رسول پاک کی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا لازمی طریقہ کار ہے۔ مسلمانوں کی تربیت گاہوں اور ان کے کاربرداز یا متاثر کرنے والے عناصر کا اسلامی مقاصد اور غایت سے ہم آہنگ ہونا اسلامی تربیت کے لئے ناگزیر شئے ہے۔ ہماری تربیت گاہیں حسب ذیل ہیں:۔

۱- گھر :- جس کے کارپرداز ماں باپ خاص طور پر انسانی تربیت کے ذمہ دار ہیں - حضرت شیخ عبدالقادرؒ - شیخ نظام الدینؒ - سر سید احمد خاں مرحوم اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم گھر ہی کی تربیت سے فیض پاکر منصۂ شہود پر آئے -

۲ - مدرسہ :- جس کے کارپرداز اساتذہ ہوتے ہیں - مدرسہ فکری انداز اور شعور ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ جذبات اور اُمنگوں کو پیدا کر کے آئیڈیل یا غایات متعین کرتا ہے - چنانچہ علی گڑھ اور دیوبند نے اپنے طلباء میں ذہنی اور فکری انداز اور شعور کے علاوہ ایک جذباتی کیفیت اور ایک مقصد یا نصب العین بھی پیدا کیا ہے -

۳ - سوسائٹی :- سوسائٹی کا اثر اجتماعی اخلاص پر خاص گہرا ہوتا ہے - سوسائٹی کے کارپرداز قومی قائدین، حکومت کے سربراہ اور جماعت کے ممتاز افراد ہوتے ہیں - ان کے اعمال اور اخلاق، جماعت اور افراد دونوں کے اخلاق اور کردار کو متاثر کرتے ہیں - انہی لوگوں سے قومی غایات، قومی کلچر اور قومی کردار بنتا اور بگڑتا ہے - چنانچہ اسلامی سوسائٹی کے کارپردازوں کو اپنی ساری زندگی پر ہر وقت ایک خاص نظر رکھنی لازم ہے !

اسلامی تربیت کا پہلا اور اساسی اصول ایمان ہے - یعنی اسلام اپنے پیروؤں میں ایک یقین یا اعتقاد پیدا کرتا ہے، اسلام کا مطالبہ ہے کہ مسلمان کا ایمان پختہ رہے اور اس کو خدا، رسولؐ، قرآن اور اپنے مقصدِ زندگی اور لائحہ عمل میں یقین و اعتماد ہو - تربیت یا تعلیم کے بارے میں تمام تر ممتاز ماہرین تعلیم کا یہی خیال ہے کہ جب تک ایک یقین اور اعتماد کو زندگی کی بنیاد قرار نہ دیا جائے، تعلیم و تربیت کسی قسم کے قابلِ اعتبار اور مستحکم نظامِ زندگی یا نظامِ اخلاق کو پیدا کرنے یا سنوارنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی !

تربیت کے سلسلہ میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ مسلمان بچوں کے سامنے اسلامی سیرت و کردار، جذبات و تخیلات کے عملی نمونے پیش کئے جائیں - تربیت ایک شخصی تاثرات سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے اُستاد کو نہ صرف علم بلکہ سیرت و کردار کا عملی نمونہ پیش کرنا لازمی ہے - طلباء کے لئے اُستاد ایک فکری اور جذباتی قائد کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس کی زندگی کا ہر پہلو اس کے لئے نشانِ راہ اور سبق آموز ہوتا ہے، چنانچہ ایک مدرسہ کا اُستاد صرف تعلیمی درس ہی نہیں دیتا بلکہ طلباء کی زندگیاں ڈھالتا اور سنوارتا ہے - ہمارے مدارس کے تمام تر اساتذہ کو "Idealism" یا نصب العینی اور عملی پاکردار زندگی گزارنی اور برتنی لازم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ہر پہلو سے طالب علم کو متاثر کرنا ضروری ہے !

تربیت کے طریقوں میں ایک مفید طریقہ یہ بھی ہے کہ طلباء کو ذہنی اور جذباتی دَور کے اوّلین زمانہ میں ہی معیاری شخصیتوں سے متاثر اور آشنا کیا جائے اور شروع ہی سے قومی غایات اور قومی کردار سے متاثر شدہ مثالی افراد کی زندگیاں اُن کے پیشِ نظر کر دی جائیں - چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی چیز سیرت نبویؐ کی ترویج و تعلیم ہے، نبی اکرمؐ کی سادی زندگی مثالی اور معیاری اعتبار سے انتہائی مفید مطلب ثابت ہوگی اور وہ نہ صرف غایت اور مقصود کے اعتبار سے مفید ہے بلکہ طریقہ اور ٹیکنیک کے لحاظ سے تربیت کے لئے دیگر انسانی زندگیوں سے بدرجہا کامیاب تر اور دیرپا اثر ثابت ہوگی - سیرت نبویؐ کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ اور دیگر مشاہیرِ اسلام کی زندگیاں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر اور تربیت یافتہ بنانے میں نہایت ضروری حیثیت رکھتی ہیں - سیرت نبوی اور دیگر مشاہیر کی زندگیوں میں زیادہ تر زور عملی زندگی اور بشری کردار و اخلاق پر ہونا چاہیئے - تاکہ زندگی براہ راست متاثر ہو سکے - مشاہیرِ اسلام کی زندگیوں میں مسلمان بچوں کی تربیت کے لئے وہ بھی پہلو خاص طور پر اُجاگر کرنے چاہئیں جن سے عالمگیر محبت، وسعتِ قلب اور انسانی مسائل کو حل کرنے کی جد وجہد شامل ہے -

جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں مسلمان مشاہیروں کے دلوں میں انسانی محبت اور خدمت، اسلام کی سربلندی اور غلبہ اور

باطل و گمراہی، ظلم و ضلالت سے شدت آمیز نفرت کو خاص طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان مشاہیر کی زندگیوں میں علاوہ ظاہری کیفیت، ذہنی اور فکری رجحانات اور سیرت و کردار کی خصوصیات کے ایک خاص قسم کی روحانیت ملتی ہے۔ اس روحانیت میں ہندوانہ یوگ اور عیسائیانہ رہبانیت سے مختلف کیفیات اور تاثرات کار فرما ہیں۔ اسلامی روحانیت ایک بھرپور زندگی، ایک مکمل بشریت اور ایک صحیح اور ترقی یافتہ انسانیت کے ساتھ ایک روحانی قوت، ایک قلبی انجلا اور پاکیزگی اور ایک پُر شعور للّٰہیت ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان ایک کائناتی منصب، ایک انسانی خدمت اور ایک (Objective and idealistic) غایاتی جدوجہد پر فائز ہو جاتا ہے اور اپنی سیرت اور کردار اور خیال و فکر سے انسانیت کی اعلیٰ ترین خدمات انجام دیتا ہے!

خیالات اور کردار دونوں میں اسلامیت پیدا کرنے اور اس کو پختہ بنانے کے لئے مسلمان بچّوں کے لئے اسلام کے کسی عملی پہلو کو نصب العین کا رنگ دینا لازمی ہے۔ یعنی ہر فرد کی زندگی میں اسلام یا اس کے متعلقہ کسی بات کو جو آئیڈیل سے پیدا ہو کر خواہ بات یا کام کی شکل میں پیدا ہو سکے بحیثیت ایک غایت کے شامل کر دینا ضروری ہے۔ اسلامی غایات کے حصول میں جو زندگی گزرے گی اور جو اس کے متعلقہ اعمال سرزد ہوں گے وہ خود انفرادی اور جماعتی زندگی کی اسلامی تربیت کرتے رہیں گے۔ مثلاً اگر کسی فرد کو اس بات پر آمادہ کر دیا جائے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد اسلام کے مشن کو عالم کے روبرو پیش کرنا بنائے یا یہ کہ عالمِ اسلامی میں اتحادِ فکر و عمل پیدا کرے یا یہ کہ ایک اسلامی نظامِ تعلیم یا نظامِ اخلاق کو جاری اور ساری کرے۔ یا یہ کہ عالم کے معاشی یا معاشرتی مسائل کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات اور رجحانات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرے تو یہ غایاتی پروگرام ایسے مفید اور مؤثر ہیں کہ انسان کی زندگی، اس کی فکر، اُس کی سیرت، کردار اور جذبات کو اسلامی بنانے میں نہایت مفید ثابت ہوں گے!

سیرت و اخلاق کے سلسلہ میں ایک اور کوشش بھی کرنا لازم ہے۔ اسلامی نظامِ اخلاقیات کے وہ پہلو جو دوسرے اخلاقی نظاموں سے منفرد اور ممتاز ہیں اور جن میں نہ صرف خالصتاً اسلامی رنگ ہے بلکہ اسلام کی روحانی اور فکری تربیت کے لئے اُن کی خاص ضرورت ہے اُن کو فرد و قوم کے عمل میں خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسے چند پہلوؤں کا ہمیشہ ہر جماعتی اور انفرادی عمل میں مظاہرہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ اسلامی اخلاق کا طرۂ امتیاز قرار دیئے جا سکیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان کے اخلاق کی بنیاد اور حمایت ظاہر اور واضح طور پر للّٰہیت پر ہونی چاہیئے۔ یعنی اس کے عمل کا مقصد تقرب الی اللہ، ماسوا سے بے غرض، رضاءِ الٰہی اور خشیت اللہ ہونا چاہیئے۔ للّٰہیت کے یہ ظاہری پہلو جتنے بھی نمایاں ہو سکیں، نمایاں کرنے چاہئیں۔ اسی طرح سے عدل، اعتدال، احسان، خیر، پاکیزگی، خودداری اور حریت خالصتاً اسلامی محرکات ہیں۔ جن کو پیدا کر کے اسلامی رنگ کو ہم پختہ اور رمیز کر سکتے ہیں۔ چنانچہ قومی اخلاق اور کردار میں ان چیزوں کی صاف جھلک نمایاں ہونی چاہیئے۔

عملی تربیت یا سیرت و کردار کی عملی تعلیم کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ طلبا، اور نوجوان بلکہ بالغوں کے لئے بھی مناسب اور موزوں جماعتی تجربات اور مشقیں کروانی چاہئیں۔ یعنی ہر عمر کے لوگوں کے لئے تربیت کے اعتبار سے مفید جماعتی خدمتیں (سوشل سروس)، جماعتی تجربات (Social Experiments) اور جماعتی مشقیں (Social Exercises) عملی کورس کی شکل میں منتخب اور مرتب کی جائیں۔ اور اُن کو باقاعدہ بروئے کار لایا جائے۔ اس طرح سے ہر فرد اپنے عمل کو خود دیکھ سکے گا۔ اس کی بابت سیکھ سکے گا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سنوار سکے گا۔

مسلمان کے لئے طبعی، جغرافیائی، لسانی اور لونی محرکات نہ صرف بے فائدہ ہیں بلکہ مہلک طور پر مضر ہیں۔ چنانچہ مسلمان بچّوں کی داغ بیل اسلام کی اعلیٰ غایات و مقاصد کی دل نشینی سے ڈالنی چاہیئے۔ مثال کے طور پر اسلام کی عالمگیریت، مومنانہ اخوت،

انسانی وحدت و آزادی پراثر اور بے چین کرنے والے مقاصد ہیں۔ ان غایات و مقاصد کو دل کی گہرائیوں میں اُتارنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ غیر اسلامی یا مخالف اسلامی تحریکوں سے ایک عاقلانہ بیزاری اور ایک اصولی اور عملی مخالفت پیدا کی جائے۔ مثلاً مادیت، اشتراکیت سرمایہ داری، شہنشاہیت، فسطائیت وغیرہ سے متنفر، عاقلانہ مقابلہ اور عملی اور اعلیٰ ترین جدوجہد کی تربیت دینی ضروری ہے۔

اسلامی تربیت کے لئے ایک اور لازم چیز یہ ہے کہ دوسری غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں میں مخصوص اور جداگانہ کلچرل، فکری اور روحانی امتیازات پیدا کرنے چاہئیں۔ تاکہ مسلمان قوم دیگر اقوام سے تمیز کی جاسکے۔ مثلاً مسلمانوں کے رہنے بسنے کا طریقہ، کھانا اور پہننا، تفریحات، آرٹ و عمارت، فکری اور روحانی تصورات اور طور طریقہ غیر مسلموں سے مختلف بنانے اور قائم رکھنے چاہئیں! ادب اور فنون لطیفہ بھی اس قبیل کی چیزیں ہیں۔ افراد کی تربیت میں ادب اور فنون لطیفہ کا ایک گہرا اثر پڑتا ہے۔ موجودہ ادبیات اگرچہ ٹھوس زندگی سے قریب تر لاکر پیش کی جاتی ہیں۔ مگر اُن کے پیش نظر صرف انسان کی جسمانی اور طبعی لذت و انبساط اور مادی لطف و کیف کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ یہی حال مصوری، صناعی اور دیگر فنون لطیفہ کا ہے۔ اقبال کا ایک شعر ہے

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے رقص کلیم اللہی۔

اسلام کا ادب ایک روحانی وجدان۔ ایک ذہنی انجلا، ایک پاکیزہ زندگی اور ایک پُر شعور اور پُر زور کردار پیدا کرتا ہے اسلامی آرٹ کے نتیجہ میں مسجد قرطبہ، تاج محل، غرناطہ، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد کے نمونے، مسلمانوں کی خطاطی و جدول کاری، کشمیریوں کی فطرت کی تصویر کشی۔ ڈھاکہ کی ململ، دلی اور مصر کی کشیدہ کاری، کشمیر اور ملتان کی میناکاری۔ دُنیا کو ایک اچھا آرٹ بخش سکتے ہیں۔

اسلامی تربیت کے سلسلہ میں ایک یہ بھی ضروری بات ہے کہ قومی اجتماعات میں نئی نسلوں کی تربیت اور کردار کا خاص اہتمام کیا جائے۔ مثلاً تمام اجتماعی تقریبات، ملکی اور شہری جماعتی اجتماع۔ جلسے اور جلوس، اسلام کے اصولوں، اسلامی رنگ اور اسلامی تمدن و تہذیب کے آئینہ دار اور ممد اور معاون ہوں۔ مثال کے طور پر تمام ایسے جلسوں میں خدا اور رسول کے فرمان۔ اسلام کے کارنامے، اسلامی اخلاق کے زرین اصول نمایاں طور پر لوگوں کے سامنے الفاظ اور عمل دونوں کے پیرایہ میں پیش کئے جائیں۔ مسلمانوں کے میلوں اور تفریحات میں اسلامی رنگ نمایاں ہونا چاہیئے!

مسلمانوں کے نشانات، اشارات، نعرے، مقولے وغیرہ Mottoes, Emblems, Symbols, slogans۔ خالصتاً اسلامی ہونے چاہئیں!

غرض یہ کہ ان صورتوں سے مسلمان بچوں کی زندگی کے ہر پہلو کی اسلامی تربیت کرنی چاہیئے!!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

کا

ایک مکتوب

[میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے قبولِ حق کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے، حق اگر اُن پر واضح ہو جائے تو اُس کے ماننے میں وہ تامل نہیں کرتے اور اس سے نہیں گھبراتے کہ اس طرح وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہے ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے بھی مولانا کی تحریر میں جہاں مجھے جھول دکھائی دیا ہے اور طبیعت نے کھٹک محسوس کی ہے، تو میں نے اُن پر اُس کا اظہار کر دیا ہے۔ اور مولانا نے میری بات مان بھی لی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی اُن سے وابستگی اور اخلاص و محبت کے باوجود اس فرض سے میں غافل نہیں رہا۔

"تفہیم القرآن" کئی بار پڑھنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی ہے۔ مگر گزشتہ دسمبر (۵۶ء) میں جب مطالعہ کی پھر نوبت آئی۔ تو تفہیم القرآن جلد (۱) کے صفحہ ۲۵۶ پر اُن کی عبارت میں ایک لفظ (شریک) بُری طرح کھٹکا۔ اور میں نے اُسی دن مولانا مودودی کو خط لکھا کہ اس لفظ کو ضرور بدل دیجئے!

اس کے جواب میں مولانا موصوف کا جو خط[1] میرے نام آیا ہے، اُسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ میں نے مولانا کو ایک لفظ کی اُونچ نیچ

---

[1] حکیم نصیر الدین ندوی (مالک نظامی دواخانہ، فریئر روڈ، کراچی) کے مولانا مودودی بہت دنوں سے زیر علاج ہیں۔ طبیب اور مریض دونوں خوب ہیں۔

میانِ پختہ کاراں بود بحثِ خویشتن داری!

حکیم صاحب علاج معالجہ میں انتہائی مستعدی دکھاتے اور کمال ہمدردی سے کام لیتے ہیں، دوا بھیجنے میں ایک دن کی تاخیر بھی روا نہیں رکھتے۔ مولانا پرہیز کرنے اور دوا کے استعمال کی باقاعدگی میں ایک مثالی مریض ہیں۔ نظامی دواخانہ کے ایک "مرکب" سے مولانا مودودی کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ میرے نام کے اسی خط کا آخری حصہ یہ ہے:۔

"ایک ذاتی کام کیلئے آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔ جناب حکیم نصیر الدین صاحب کے نام ایک خط چودھری غلام محمد صاحب کے ذریعہ بھیج چکا ہوں اس سلسلہ میں آپ پہلی فرصت میں حکیم صاحب تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ اُن کی عطا کردہ دواؤں کی آخری خوراک کل ختم ہو جائے گی۔ آگے جو کچھ بھی کرنا ہو اُس کے متعلق مجھے جلدی سے جلدی ہدایت بھیجدیں۔ دُوسری بات اُن کی خدمت میں یہ عرض کرنی ہے کہ کھانے کے بعد گھی اور مکھن کے ساتھ کھانے کیلئے جو دوا اُنہوں نے عنایت فرمائی تھی (جس کے اندر ہینگ بھی شامل تھی) وہ مجھے بہت مفید ثابت ہوئی ہے، اس کی بدولت میرے معدہ اور آنتوں کا فعل بڑی حد تک درست ہو گیا ہے اور بہت سی تکلیفیں جو برسوں سے مجھے ستا رہی تھیں رفع ہو گئی ہیں۔ اس کا نسخہ اگر مجھے عنایت فرما دیں

کی طرف توجہ دلائی تھی ۔ انہوں نے عبارت میں ایک دوسرے لفظ کی بھی کھٹک محسوس کی اور اپنی عبارت میں مناسب ردوبدل کر دی!

مولانا مودودی انسان ہیں، فرشتہ نہیں ہیں۔ اُن سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ خطاؤں سے اُنھیں ہم معصوم تو کیا "محفوظ" بھی نہیں سمجھتے ۔ اس اعتراف کے باوجود ہم پُوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دَور میں مولانا موصوف کے قلم نے دین کی جتنی شاندار خدمت انجام دی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے ۔ شباب کا زمانہ آج کل کے اہلِ قلم کے لئے کتنے ابتلاء کا ہوتا ہے، کیسی کیسی وادیوں میں قلم بھٹکتے ہیں۔ مگر اللہ کے فضل سے مودودی صاحب کے قلم نے آغازِ شباب ہی سے سنجیدہ صحافت اور باوقار ادب کی ترجمانی کی ہے، اور جب سے اُن پر دین کا رنگ چڑھا۔ اُس وقت سے تو اُن کے فکر و عمل کی تمام توتیں اور ادب و انشاء کی پُوری صلاحیتیں دین کے لئے وقف ہو گئی ہیں!

مولانا مودودی کی تحریر میں اللہ تعالیٰ نے ادبی محاسن کے ساتھ نفوذ و اثر کی قابلیت بھی پیدا کر دی ہے ۔ لاکھوں انسانوں نے اُن کی تحریروں سے اثر قبول کر کے اپنی زندگیوں کو اسلامی قالب میں ڈھالا ہے ۔ پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر گوشہ میں اس کی محسوس شہادتیں ملیں گی ۔۔۔!

جن علماء نے مولانا مودودی کو مطعون کرنے اور مسلمانوں کی نگاہ میں اُنھیں مشتبہ بنانے کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے ۔ وہ رشک و حسد کے مریض ہیں اور اپنی شخصیت اور اپنے خانوادوں اور جماعتوں کے مفاد کی راہ میں مودودی صاحب کی ہر دلعزیزی اور قبولیت کو بہت بڑی رُکاوٹ سمجھتے ہیں ۔ دلوں کا یہی بُغض ہے جو اُن کے منہ سے نکلا پڑتا ہے ۔ نہ جانے کس قسم کا زہد و تقویٰ (؟) ہے جو مودودی صاحب کی تحریروں میں تحریف کی اجازت دے سکتا ہے! مولانا کے مضامین کی عبارت سے یہ مقدس گروہ (؟) وہ وہ معنی نکالتا اور مفہوم پیدا کرتا ہے کہ جس کا نہ اُس عبارت میں کوئی قرینہ ہوتا ہے اور نہ لکھنے والے کے قلب و ذہن میں اُس قسم کا کوئی تصور ہوتا ہے ۔ عناد و عداوت کی حد ہو گئی کہ بعض مدعیانِ زہد و تقویٰ نے حرم کعبہ اور مسجدِ نبوی تک میں مولانا مودودی پر جھوٹی تہمتیں جوڑی ہیں اور اُن کو ساری دُنیا کے مسلمانوں میں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے!

ایک "شیخ العرب والعجم" کے بارے میں متعدد ثقہ راویوں نے ہم سے بیان کیا ہے کہ حضرت مولانا .... صاحب، مودودی صاحب کی کتابوں کو خود نہیں پڑھتے ۔ اُن کے حاشیہ نشین جو عبارت اُن کو سُنا دیتے اور اُن کے کان میں جو بات ڈال دیتے ہیں اُسی پر مودودی صاحب کی بے دینی اور گمراہی کا فتویٰ صادر فرما دیا جاتا ہے ۔ کیا ایسے غیر ذمہ دار مُفتیانِ کرام سے قیامت کے دن اُن کے فتووں پر باز پُرس نہیں ہو گی؟

جس شخص کی تحریریں پڑھ پڑھ کر ملحدوں اور منکروں کو دین کی طرف آنے کی توفیق نصیب ہوئی ہو ۔ اُس کی تحریروں پر بے دینی کی تہمت لگانا کتنا سفید جھوٹ ہے ۔ کیا کوئی ایک مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ کسی نمازی نے مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر نماز پڑھنا چھوڑ دی ہو ۔ یا کوئی صاحبِ تقویٰ مودودی صاحب سے متاثر ہو کر آوارہ مزاج ہو گیا ہو؟

فاتوا برھانکم ان کنتم صادقین!

کیا جماعتِ اسلامی کا کوئی رُکن یا متفق خدا، رسول، کتاب اللہ، آخرت، جنت و دوزخ، کے بارے میں کوئی ایسا عقیدہ رکھتا ہے جو جمہور مسلمین کے عقیدہ سے مختلف ہے؟ کیا جماعتِ اسلامی کسی ایسے نظریہ اور عقیدہ کی طرف لوگوں کو بلا رہی ہے جس کی بنیاد ضلالت و گمراہی پر ہے؟

مولانا مودودی صاحب کا ذکر آیا تو یہ باتیں بے اختیار قلم سے نکل گئیں!۔۔۔ اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں ۔ مولانا

کا مکتوب نیچے حاضر ہے:- (م۔ق)

"جماعتِ اسلامی پاکستان

اچھرہ، لاہور، مغربی پاکستان

مورخہ ۱۶۔ نومبر ۱۹۵۶ء

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

فاران کے توحید نمبر کے لئے آپ کی نئی تجویز کا ذکر چودھری غلام محمد صاحب نے مجلسِ شوریٰ کے درمیان میں مجھ سے کیا تھا۔ اور میں بس ایک آہِ سرد بھر کر رہ گیا تھا۔ خط انہوں نے مجھے نہیں دیا۔ ورنہ جواب ضرور دیتا۔

اب آپ کا تازہ عنایت نامہ ملا تو احساس ہوا کہ آپ کو اس تجویز کا جواب ملنا چاہیئے تھا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے، سوالنامہ بھیجدیں۔ اسے دیکھ کر ہی عرض کر سکوں گا کہ اس کا جواب لکھنا میرے لئے ممکن ہے یا نہیں! اگر یہ خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہو تو انشاءاللہ دانستہ اس سے فرار نہ کروں گا۔ اور اس صورت میں بہر حال فاران کا حق مقدم ہو گا۔

تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۲۵۶ کی جس عبارت کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے اس کو نکال کر دیکھا تو اُس میں مجھے ایک کے بجائے دو مقامات کھٹکے۔ "شریک" کا لفظ ناموزوں ہے ہی، اللہ تعالیٰ کے لئے "کوشش کرنے" کے الفاظ بھی نامناسب ہیں۔ اب میں نے اس پوری عبارت کو بدل کر یوں کر دیا ہے۔

"اس کے بجائے وہ دلیل اور نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے..... اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہ راست پر لانے کی تدبیر کرنا .... اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں۔"

آپ کا بہت شکریہ کہ ایک فروگزاشت کی طرف توجہ دلا کر آپ نے مجھے دو فروگزاشتوں کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔ جزاکم اللہ! آپ چاہیں تو اس تصحیح کو شائع بھی فرما سکتے ہیں۔

خاکسار۔ ابوالاعلیٰ

ابوالبیان حمّاد

قرآن

دنیا کے لئے تحفۂ رحمان ہے قرآن
تبیان ہے برہان ہے فرقان ہے قرآن
ہوگا نہ گزر جس میں کسی وقت خزاں کا
لاریب وہ شاداب گلستان ہے قرآن
اکسیر ہدایت ہے وہ رحمت ہے شفا ہے
یعنی مرے دکھ درد کا درمان ہے قرآن
اعمال کا معیار عقائد کی "کسوٹی"
انسان کے کردار کی میزان ہے قرآن
مشکل نہیں قرآن کی آیات کا ادراک
دل میں جو ہو ایمان تو آسان ہے قرآن
قرآن کا مقصود ہے تذکیر و نصیحت
ارشاد و ہدایت کا سر و سامان ہے قرآن
ہر مرحلۂ شوق میں ہر راہ گزر میں
فانوس یقیں مشعل عرفان ہے قرآن
اللہ ہے قرآن کا نگہبان و محافظ
ایمانِ مسلمان کا نگہبان ہے قرآن
حمّاد زمانے کے مصائب کا مداوا
قرآن ہے قرآن ہے قرآن ہے قرآن

اسد ملتانی

زمزمۂ بقا

ہے خاک تغیّر کے سوا بادِ فنا میں
پانی جو سمندر سے اڑا، ہے وہ گھٹا میں
دنیا ہے تماشا گہِ نیرنگِ تغیّر
طوفانِ فنا موج ہے دریائے بقا میں
قانونِ فنا ڈھالتا رہتا ہے ہمیشہ!
قوّت کو حرارت میں، حرارت کو ضیا میں
اے دوست! بظاہر جو فنا ہو گئی جل کر
موجود ہیں اُس شمع کے ذرّات ہوا میں
سورج نہیں معدوم، اگر ڈوب چکا ہے
اس وقت بھی ہے نصف جہاں اسکی ضیا میں
شبنم کے وہ قطرے جو اڑے دامنِ گل سے
روپوش ہوئے پردۂ آغوشِ صبا میں
اشعار جو نکلے کسی شاعر کی زباں سے
محفوظ ہوئے سینۂ اربابِ صفا میں
ضائع نہ گئی قوّتِ انگشتِ مُغنّی
تبدیل ہوئی جنبشِ مضراب صدا میں
خامی ہے سماعت کی جو ہم سُن نہیں سکتے
پھرتا ہے ابھی نغمۂ داؤدؑ ہوا میں
طے کرتے ہوئے عرصۂ ہستی کے منازل
ہم چھوڑتے جاتے ہیں نقوش اپنے فضا میں
اک بار پھر اس زیست کی تقدیر مکمّل
آئے گی نظر آئینۂ روزِ جزا میں

☆

تغزّل

شفیق جونپوری

کہیں مرکز سے کوئی دُور ہوکر شاد ہوتا ہے
جو پتّا ٹوٹتا ہے شاخ سے برباد ہوتا ہے

فلک تو نے نہ میری خاک کے ذرّوں کو پہچانا
اِنہی تاروں سے روشن عالمِ ایجاد ہوتا ہے

دیا کرتی ہے ساری رات شبنم خونِ دل اپنا
سحر کا پھول تب جاکر گلستاں زاد ہوتا ہے

کمالِ عاشقی ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا
ہزاروں میں کوئی مجنوں کوئی فرہاد ہوتا ہے

یہاں تو ایک لمحہ بھی نہ اطمینان سے گزرا
خدا جانے کوئی دُنیا میں کیونکر شاد ہوتا ہے

اگر ساقی مجھے آنے نہیں دیتا نہ آنے دے
ذرا دیکھوں تو کیونکر میکدہ آباد ہوتا ہے

زہے وہ رات کا پچھلا پہر، مانوس تنہائی
دلِ دیوانہ جب ہر فکر سے آزاد ہوتا ہے

خدا جانے مرے گلشن ترا انجام کیا ہوگا
جسے مالی بناتا ہوں وہی صیّاد ہوتا ہے

فضلی

عشق کی کوئی حد ہی نہیں ہے
عشق میں کیسا حد سے گزرنا

محشر بدایونی

سبھی صحنِ چمن میں پھول چُننے کو نہیں آتے
کچھ اپنے دامنوں میں خار اُلجھانے بھی آتے ہیں

قمر جلالوی

عدو لالا کے کلیاں چُن رہے ہیں اُن کے داماں پر
اب ایسے میں کوئی بجلی نہیں گرتی گلستاں پر

ماہر القادری

ساقی کی نگاہوں کا پرستار نہ چونکا
دیں قلقلِ مینا نے صداؤں پہ صدائیں

☆

روحِ انتخاب

کون نہیں جانتا کہ قرآن و سنّت نے جا بجا عقل کی تعریف فرمائی ہے۔ بلکہ اپنی دعوت کا مخاطب ہی صرف اہلِ فہم اور اہلِ عقل کو قرار دیا ہے۔ مجنوں اور بچے اس کی دعوت کے احاطہ سے باہر ہیں۔ لیکن جب بعض اہلِ بدعت نے بعض کلامی مسائل کو جو دراصل قرآن و سنّت کے خلاف تھے، اصولِ دین میں داخل کر دیا اور اس کا نام عقلیات رکھا تو اب اہلِ شرع کو عقلیات کے نام ہی سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی کہ جو شخص بھی عقلی استدلال کرتا نظر آتا، اُن کے نزدیک بدعتی اور باطل پرست سمجھا جاتا۔

دُوسری طرف جب عقلاء نے اہلِ شرع سے وہ مسائل سُنے جو صریح عقل اور یقینی تاریخ کے خلاف تھے، اُس پر اُن کا یہ دعویٰ سُنا کہ وہ قرآن و حدیث کے بیان کردہ ہیں تو اُن کے دلوں میں نفسِ قرآن و سنت ہی کے متعلق خلافِ عقل ہونے کی بدگمانی بیٹھ گئی۔ حتیٰ کہ اب جو قرآن و سنّت سے استدلال کرتا، اُن کے نزدیک قانونِ فطرت اور تقاضۂ عقل کا مخالف ہوتا۔

یہاں غلطی دونوں فریق کی ہے۔ عقلاء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق کئے بغیر ہر خلاف بات کا نام شرع کیوں رکھ دیا؟ اور علماء کی کوتاہی یہ ہے کہ انہوں نے جو عقلِ صحیح کا تقاضا نہ تھا اُس کو شرع کے مفہوم میں کیسے داخل کر دیا؟ حالانکہ شریعت کا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو عقلِ سلیم کے نزدیک قابلِ انکار ہو۔ یا محالات کی تعریف میں آتا ہو۔ لیکن جب کسی ابتدائی غلطی پر کچھ مدّت گزر جاتی ہے تو وہ غلطی راسخ ہوتے ہوتے عقائد کا رنگ پیدا کر لیتی ہے۔ اور جو کسی حقیقت پر نتائج و آثار مرتب ہوتے ہیں وہی اس غلطی پر مُرتب ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے اگر مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل ہی عقل و شرع کا صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے تو عقلاء اور علماء کے درمیان بحث و جدال کا یہ وسیع میدان بہت تنگ ہو سکتا ہے!

علماء ہر خلافِ عقل بات کو شرع کے مفہوم میں داخل کرنے کی سعی کرنا ترک کر دیں۔ اور عقلاء شرع کی ہر بات پر خلافِ عقل ہونے کی بدگمانی دل سے نکال ڈالیں۔ اور عقل و فکر کا کوئی صحیح معیار مقرر کر لیں!

(کتاب النبوت امام حافظ ابن تیمیہؒ

اقتباس از "ترجمان السنہ")

☆

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

اُس بھولے بھالے ہرن کو کیا کہیئے، جسے ریچھوں نے گھیر رکھا ہو۔ اس طرح کہ وہ بیچارہ ہرن ان ریچھوں کی مرضی کے بغیر تنکا بھی نہ توڑ سکے! مولانا بھاشانی کا ٹھیک یہی حال ہے، اس بیارھے سادے مولوی کو کمیونسٹوں نے اپنے جال میں پھانس رکھا ہے۔ اور "زبانِ فیض ترجمان" سے وہی نکلتا ہے، جو کمیونسٹوں کے دل میں ہوتا ہے!

اور پھر بھاشانی صاحب چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک جیسے "صحافتی مولانا" بھی نہیں ہیں بلکہ چہرۂ مبارک اچھی خاصی گھنی ڈاڑھی سے مزین ہے، نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ سال میں ایک دو چلّے بھی کھینچ لیتے ہوں۔ مگر جب کبھی سیاست پر لبہائے مبارک کو جنبش دیں گے تو ایسا محسوس ہو گا جیسے ماؤزی تنگ اور بلگانن کی روحیں مولانا کے جسم میں حلول کر گئی ہیں! مذہبیت کو کیمونزم کے ساتھ نباہ دینا بس مولانا بھاشانی ہی کا حصّہ ہے۔ حق و باطل کا یہ امتزاج تاریخ کا ایک اعجوبہ ہے! "زندہ باد سُرخ مولانا!"۔

"ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ" کو تمام ڈھولک بجانے والوں، طبلچیوں، بچکیوں اور گانے اور گانے والیوں کی طرف سے مبارکباد کہ "اسلام اور موسیقی" جیسی معرکہ آرا کتاب تصنیف فرمادی بلکہ چھپوادی۔ ان قدامت زدہ مُلاؤں (؟) کے خلاف یہ اتنا بڑا قلمی جہاد ہے کہ اچھے اچھوں کو دانتوں پسینہ آگیا ہے! اور نہ پُوچھیئے دلدادگانِ تہذیبِ مغرب کی خوشی کا عالم! جیسے اُن کی دیرینہ اُمید بر آئی۔

کسی کے گھر میں ماتم ہے کسی کے گھر چراغاں ہے!

اگر یہ "لے" اسی طرح بڑھتی رہی تو وہ دن دُور نہیں ہے کہ بیگم بُلبل چودھری کے رقص کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے کوئی خاندانی مولانا اور پُشتینی مولوی اور صوفی سندِ جواز عطا فرمادیں گے اور یہ پُرانی چال کے مولانا بس کلیجہ مسوس مسوس کر رہ جائیں گے ـــــ ہائے!

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

اُس وقت کی ذہنی اذیت کا اندازہ کیجئے۔

جب شاعر کو مشاعرے میں داد اور مولوی کو وعظ کہنے کے بعد چندہ نہ ملے۔ جب ایک حسین عورت کو آئینہ میں چہرہ دیکھتے ہوئے اپنی زلفوں میں پہلی بار ایک سفید بال نظر آئے۔ اور جب ایک مغرب زدہ لڑکی سے کوئی ٹیلیفون پر یہ کہہ رہا ہو:-

"میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا، آپ ہی خود کسی ڈاکٹر سے ملئے"!

رسالہ کے ایڈیٹر کے نام:-

"مجھے شہرت سے نفرت ہے! اپنی ایک غزل آپ کے پرچہ میں چھپنے کے لئے بھیج رہا ہوں۔ جس پرچہ میں یہ غزل چھپے اُس کی بارہ۱۲ عدد کا پیاں میرے نام وی پی فرما دیجئے۔ اور ہاں! آپ کا بڑا کرم ہوگا، اگر آپ اس خاکسار کا تعارف بھی کرا دیں۔ اشلے۔-

"عمر ۲۵ سال تین ماہ چار دن۔ قد درمیانہ۔ رنگ گندمی۔ ہندو ایگزامنروں کے تعصب کے سبب میٹرک میں دو سال ناکامی ہوئی۔ ایک سال ٹیلر ماسٹری کا پیشہ کیا۔ اب پاکستان بننے کے بعد ہومیو پیتھی کی ڈاکٹری کی دکان کر رکھی ہے۔ شاعروں کا علاج مفت کرتا ہوں، باہر کے مشاعروں میں بھی مجھے بُلایا جاتا ہے۔ میں پرسوں ہی سندھ کے ایک شہر میں مشاعرہ پڑھ کر سیکنڈ کلاس میں واپس آیا ہوں۔ میری دو غزلیں "مشہور عالم جنتری" میں چھپ چکی ہیں۔ شاید ملاحظہ سے گزری ہوں۔"

ہماری نظر میں

صلوٰۃ الرسول از:- مولانا محمد صادق سیالکوٹی - ضخامت ۳۴۲ صفحات - لکھائی چھپائی اور کاغذ بدہ زیب - سرورق رنگین - قیمت مجلد تین روپے - غیر مجلد ڈھائی روپے - (محصولڈاک آٹھ آنے) ملنے کا پتہ:- حکیم محمد صادق سیالکوٹی - منیجر مکتبہ کتاب و سنت، بازار دھارووال - سیالکوٹ شہر -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

صَلُّوا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ (بخاری)

"نماز ٹھیک اُس طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے"۔

اس حکم کی تعمیل میں مولانا محمد صادق سیالکوٹی نے یہ کتاب بڑی محنت، کاوش اور خلوص کے ساتھ مُرتب فرمائی ہے - اور غُسل و وضو اور مسواک و تیمم سے لے کر نماز کی آخری ہیئت تک کی تفصیل درج کردی ہے - مقصود یہ ہے کہ مسلمان اُس ہیئت کے ساتھ نماز ادا کریں جو "صلوٰۃ رسولؐ" سے زیادہ سے زیادہ مشابہت رکھتی ہو - فاضل مؤلف نے کتاب کے ہر باب کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا صحابہ کے اثر سے کیا ہے اور قیاس کو دخل نہیں دیا - جو اہلِ حدیث کا طرۂ امتیاز ہے!

صاحبِ تالیف اہلِ حدیث مسلک رکھتے ہیں - اس لئے اس کتاب میں اسی مسلک کی تائید اور تصویب ہر جگہ نظر آتی ہے - مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ موصوف فقہ کے مختلف فیہ مسائل میں شدّت اور غلو سے بچتے ہیں - اُن کی تحریر کا مندرجہ ذیل اقتباس اُن کی اس نرم روش کی شہادت دیتا ہے:-

"...... اس سے معلوم ہوا کہ رسولِ خدا تین وتر بھی پڑھتے تھے، تو جو لوگ تین وتر پڑھتے ہیں وہ بھی حق پر ہیں اور ایک وتر پڑھنے والے بھی سند رکھتے ہیں - اس لئے ایک اور تین کے موضوع پر بحث و تکرار کرنا فضول ہے اور اس بات پر علماء کے اکھاڑے لگانا فضول تر!" (صفحہ ۳۳۶)

کتاب کا ایک ذیلی عنوان ہے:- "ہدایہ کی تائید"۔

"ہدایہ حنفیوں کی بہت مقبول اور بلند پایہ کتاب ہے، اُس کی پہلی جلد فصل فی القرأۃ میں فاتحہ خلف الامام کے متعلق یہ فتویٰ ہے۔ "ویُستحسن علیٰ سبیل الاحتیاط" یعنی احتیاطاً سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھ لینا ہی بہتر ہے (ہدایہ) (صفحہ ۱۹۶)

اس اقتباس سے نہ جاننے والے مغالطہ میں مبتلا ہوسکتے ہیں - یہ صاحبِ ہدایہ کا فتویٰ نہیں ہے - بلکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے جس کی تردید اُن کے دوسرے اقوال سے ہوتی ہے - اور صاحبِ ہدایہ نے بھی اس قول کو "فیما یُروی عن محمد" بصیغہ مجہول روایت کیا ہے - جو اس قول کے ضعف پر دلالت کرتا ہے -

صفحہ ۲۲۷ پر "رفع الیدین" کی تائید میں علامہ مجد الدین فیروزآبادی کی "سفر السعادۃ" سے جو عبارت نقل کی گئی ہے، اُس کی شرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمائی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "رفع یدین" اور "عدم رفع یدین" یہ دونوں فعل حضورؐ سے ثابت ہیں اور چونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل عدم رفع پر تھا اور وہی حدیث "رفع یدین" کے راوی ہیں۔ لہٰذا قرین غالب ہے کہ "رفع یدین" منسوخ ہو گیا۔

صفحہ ۳۲۵ پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے جو حدیث نقل کی گئی ہے۔ اُس حدیث کے آخر میں طحاوی میں آتا ہے:۔

"ومن غلب الی ان یومی فلیومی"

(جو اشارہ ہی کرنا چاہے وہ اشارہ کرلے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت کا معاملہ ہے جب نمازِ وتر کی رکعتیں اور اُس کی تفصیلات متعین نہیں ہوئی تھیں۔

صفحہ ۳۴۶ پر "رسولِ خدا نے تراویح گیارہ رکعت پڑھائی" کے عنوان کے بعد جو حدیث بہ روایت ابن خزیمہ اور ابن حبان نقل کی ہے، اُس کی سند میں بعض راوی متکلم فیہ ہیں۔ جس کی بناء پر یہ روایت شبہ سے خالی نہیں۔ فاضل مؤلف نے اس حدیث کو "غیر مجروح" جو کہا ہے، وہ درست نہیں ہے!

"حضرت عمرؓ نے گیارہ رکعت تراویح کا حکم دیا"۔ اس ذیلی عنوان کے تحت صفحہ ۳۴۷ پر موطا امام مالک کی جو روایت سند میں پیش کی ہے، اُس کی تصریح خود مالکی مذہب کے مشہور امام علامہ ابن عبدالبر نے کی ہے:۔

"ان مالکاً تفرد بقولہ احدی عشرۃ انہ وھم"

(تحقیق مالک اس گیارہ کی روایت میں تنہا ہیں اور ان کو وہم ہو گیا)

اصل صحیح روایت میں خود موطا میں اس روایت کے بعد یہ الفاظ موجود ہیں:۔

"قال ..... کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلث وعشرین رکعۃ۔"

(لوگ حضرت عمرؓ ابن الخطاب کے زمانہ میں تیئیس ۲۳ رکعتیں (تراویح) پڑھتے تھے)

عیدین کی بارہ تکبیروں کی سند میں کثیر بن عبداللہ سے جو روایت نقل کی گئی ہے، تو یہ راوی مجروح ہیں۔ تہذیب التہذیب میں انہی کثیر بن عبداللہ کے بارے میں امام شافعی کا یہ قول ملتا ہے کہ وہ "ارکانِ کذب" میں سے ہے! اور بہت سے اہلِ نقد و نظر نے اسے "لیس بشیٔ" کہا ہے!

"پھر سر اُٹھتے ہی دستِ حوائج بابِ اجابت کو دستک دینے لگتا ہے" (صفحہ ۱۷۲) یہ اندازِ بیان ہی عجیب ہے ——

"کم از کم صغیرے گناہ سرزد نہ ہوں" (صفحہ ۱۳۲) "صغیرہ" کی جمع "صغیرے"، سامعہ کے لئے کتنی تکلیف دہ ہے!

چاروں فقہی مسلکوں کے علاوہ اہلِ حدیث کا مسلک بھی حق ہے۔ جس کسی کا جس مسلک پر اطمینان ہو وہ اُسے اختیار کر سکتا ہے۔ فقہی مسائل کا اختلاف ایمان پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ائمہ فقہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) احکامِ شریعت کے شارح تھے، خود شارع نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع منصوص ہے۔ یہ معاملہ کسی فقہ کے امام کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قول و عمل ثابت ہو جائے، پھر اس کے مقابلہ میں کسی صاحبِ مذہب امام اور مجتہد کے قیاس و رائے کی کوئی وقعت نہیں رہتی! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو غلو سے محفوظ رکھے!!

دیث نمبر ماہنامہ "صبحِ صادق"

ادارۂ تحریر :- محمد اویس ندوی نگرامی، ارشد حسین ندوی - ضخامت دو سو صفحات - قیمت دو روپے - سالانہ چندہ چار روپے - فی پرچہ چھ آنے - ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ صبح صادق" مکارم نگر لکھنؤ - پاکستان میں - مولانا محمد ناظم ندوی شیخ الجامعۃ العباسیہ، بہاولپور -

مجلہ "صبح صادق" کا مقصد اشاعت ہی دین و اخلاق کی خدمت اور حق کی تبلیغ ہے۔ "قرآن نمبر" کے بعد اس کا حدیث نمبر" خاصے اہتمام سے منظرِ عام پر آیا ہے - مضامین وقیع و سنجیدہ اور اپنے موضوع پر مدلل ہیں - امام بخاری، امام سلم، امام مالک، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، امام نسائی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے سوانح حیات نے اس نمبر کو تاریخی حیثیت سے بھی ممتاز کردیا ہے!

اس دور میں جبکہ احادیث نبوی پر اہلِ نفاق شب خوں مار رہے ہیں - حدیث کی حمایت میں ایسی تمام کتابیں اور رسالوں کے خاص شمارے مسلمانوں کے ہر ممکنہ تعاون اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں -

ماہنامہ "شعور"

طابع و ناشر :- عنایت اللہ آذر، آرائش :- آذر زوبی - ضخامت ۱۰۲ صفحات - قیمت دو روپے آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- مکتبہ شعور، مانڈی والا، بریڈی اسٹریٹ - صدر کراچی -

بڑا سائز، پورا رسالہ خوشنما ٹائپ پر چھپا ہوا - جگہ جگہ دیدہ زیب بیلیں اور خاکہ نما تصویریں بھی ہیں - سرورق اپنے طرز اور ڈزائن کے اعتبار سے منفرد - اس اہتمام سے اردو میں یہ پہلا رسالہ ہے جو منظرِ عام پر آیا ہے - ادارۂ "شعور" کو اعداد (numbers) سے بیدچڑ معلوم ہوتی ہے کہ صفحوں کے نمبر بھی لفظوں میں لکھے ہیں - اس طرح :-

"شعور صفحہ اڑسٹھ"

پہلے ہی شمارہ کیلئے سات صفحوں کے اشتہار کا مل جانا مالی اعتبار سے رسالہ کے منفعت بخش ہونے کی فال نیک ہے، اسی نام کا ماہنامہ (شعور) حیدرآباد سندھ سے بھی حمایت علی شاعر کی ادارت میں نکل رہا ہے، اسے توارد سمجھا جائے یا تقابل!

پورے رسالہ میں صرف ایک تنقیدی مقالہ ہے - وہ بھی "منٹو کے افسانوں" پر - اس سے "شعور" کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - منٹو نے اردو ادب میں افسانہ کی صنف کو چاہے فلک الافلاک تک بلند کردیا ہو - مگر یہ واقعہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے افسانہ کو اس نے اتنا پست کیا کہ پاتال میں پہنچا دیا!

غلام عباس کا افسانہ "وہ عظیم فن کار" ہر اعتبار سے کامیاب، شائستہ اور مہذب ہے!

عندلیب شادانی کے یہ چند شعر رسالہ کی جان ہیں :-

یا خلوتِ ناز تھے، یا کچھ بھی نہیں ہم　　اس طرح بھی اللہ! بدل جاتی ہے دنیا
ہوتی ہے دل سے دل کو راہ، جس نے کہا غلط کہا　　ہم تو تمام ہو چکے اور انھیں خبر نہیں
میرے آنسو انتے ارزاں، ہائے تری بیگانہ وشی　　سچ ہے جانے والا سورج کس کی خاطر ٹھہرا ہے

"مصوّر" جس نظم کا عنوان ہے، اس میں کہیں کہیں "شعریت" جھلکتی ہے - نظم کا زیادہ حصہ سپاٹ ہے - "بلینک ورس" اردو میں ناکام ہو چکی ہے، اسے قبولِ عام حاصل نہیں ہوا - اردو زبان و ادب کے مزاج پر یہ "ہتھوڑے" آخر کب تک پڑتے رہیں گے!

(صفحہ ۲۳) "اکھاڑوں پر چہل پہل تھی" - "پر" یہاں غلط استعمال ہوا ہے - "میں" کا محل تھا - (صفحہ ۲۶) "چراغوں کی ننھی ننھی روشنی میں" - "دھیمی" لکھنا چاہیے تھا - "کرن" یا "لو" کو تو "ننھی" کہہ سکتے ہیں مگر "روشنی" کو ننھا یا موٹا نہیں کہتے -

(صفحہ ۳۸) "سارا غرہ ڈیہ نکل جائے گا" یہ کیا زبان ہے؟

(صفحہ ۵۴) "دنیا کے بڑے بڑے ادبار کے محاسن مجتمع ہو گئے تھے" جملہ کی ساخت کے اعتبار سے "اُدبار" کی جگہ "ادیبوں" لکھنا تھا۔

(صفحہ ۶۴) "جسم کے رواں رواں میں گدگدیاں سی اُٹھ رہی تھیں" ہوک اور درد کے لئے تو "اُٹھنا" بولتے ہیں۔ مگر "گدگدی ہونے" کو "اُٹھنا" نہیں بولتے۔ پھر "رواں رواں" نہیں "روئیں روئیں" لکھنا چاہیئے تھا۔

ظہورِ زر نہیں فنکار کی ہنرمندی ۔۔۔ سفارشات سے سوزِ نہاں نہیں ملتا (صفحہ ۶۲)

"ظہورِ زر" ۔ آخر کیا بات ہوئی؟ دوسرے مصرعہ کو "سفارشات" نے عجیب بنا دیا۔

انیس اجاب حریفِ شیخ و نکتہ نواز ۔۔۔ سفینۂ غزل است و صراحیٔ مے ناب
یہی ہے مرغوب خاطر سپہر کبود ۔۔۔ حباب تاج سر موج ہو صدف تہ آب (ص ۶۳)

ان شعروں کے پہلے دونوں مصرعے بحر سے خارج معلوم ہوتے ہیں اور اگر ان میں "عروض" کی کوئی کاری گری اور باریکی جان کر رکھی گئی ہے تو

جب پگھلتا ہے جواں ریشمی راتوں کا گداز ۔۔۔ چیخ چیخ اُٹھتے ہیں سینہ میں سُلگتے ہوئے راز (ص ۹۲)

راتوں کو اس طرح سوچنا کہ وہ "سُوتی" اور "ریشمی" بھی ہوتی ہیں۔ ذہن کے "غیر معمولی تیز" (؟) ہونے کا اتا پتا دیتا ہے۔ پھر یہ سوچیئے کہ وہ "ریشمیں راتیں" بوڑھی نہیں ہیں، جوان بھی ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ ان "ریشمیں جوان راتوں" کا "گداز" پگھلتا بھی ہے!! توبہ! یہ کیا فکر اور اندازِ بیان ہے؟

رحمن پرنٹنگ پریس کراچی

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد (۸) ماہنامہ نمبر (۱۲)

فاران

مارچ ۱۹۵۷ء ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ ... چھ روپے

فی پرچہ ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

کمیونزم اپنی ذات سے فتنۂ دین و ایمان اور آشوبِ روزگار ہے، کمیونزم کا مزاج درشت، دل سنگین، طبیعت شورش پسند، فکر کج اور دماغ حق ناشناس واقع ہوا ہے۔ کمیونزم کی لغت میں مہر و مروّت کے لفظ ہی سرے سے غائب ہیں، شکست و ریخت کمیونزم کا مسلک اور فتنہ انگیزی اُس کا شیوہ ہے۔ یہودیت جو اپنے آغاز ظہور ہی سے سچائی کی دشمن رہی ہے اُسی کے ایک فرد — کارل مارکس — نے اس شجرِ خبیث کو لگایا ہے۔ کمیونزم کی بنیاد انکار اور بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ خدا سے، مذہب و اخلاق اور نیکوکاری سے کمیونزم کو جتنی دشمنی ہے، اتنی دشمنی اُسے سرمایہ داری اور ملوکیت سے بھی نہیں ہے۔ مادیت کمیونزم کا اوڑھنا بچھونا اور اخلاقی اصولوں سے بغاوت اُس کا مشن ہے!

کمیونزم کو بڑا ناز اس پر ہے کہ وہ سرمایہ داری اور ملوکیت کا دشمن ہے۔ مگر اس فخر و ناز کی حقیقت بھی ایک خوش نما فریب سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اس لئے کہ سرمایہ داری اور ملوکیت کی تمام مجموعی بُرائیوں کا جوہر کمیونزم کی فطرت میں موجود ہے! کمیونسٹوں نے زار کی شہنشاہی کا تختہ اُلٹنے کے بعد، روس میں جو خونیں مظالم کئے ہیں، اُن کے سامنے روس کے بادشاہوں کے ظلم و ستم گرد ہو کر رہ گئے۔ وہاں صدیوں میں جو کچھ ہوا تھا، کمیونسٹوں کے عمل دخل کے بعد یہاں چند سالوں میں اُس سے بڑھ کر ہوا۔ اگر سائبیریا کے میدانوں کی خاک کو کسی آلہ کے ذریعہ نچوڑا جا سکے، تو وہاں کی خاک سے مظلوموں اور ناکردہ گناہوں کے خون کے فوّارے اُبل پڑیں گے۔ بادشاہوں کے یہاں اُن کے تمام جبر و تعدی کے باوجود پھر بھی مراحم خسروانہ اور شاہانہ معافی کی گنجائش اور تھوڑی بہت لچک ملتی ہے مگر کمیونزم کے منشور کے اوراق عفو و کرم اور رحم و درگزر سے یکسر معرّا ہیں۔ بیریا اور اُس کے ساتھیوں کا دردناک انجام اس پر شاہد ہے کہ سوویٹ روس میں پالیسی کے معمولی سے اختلاف کے لئے "موت" سے کم کسی سزا کا تصور نہیں کیا جا سکتا!

کمیونسٹ راج میں آدمی مشین کا بے اختیار پُرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جو اپنی مرضی سے نہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ ٹھہر سکتا ہے۔

انسان کی "خودی" کی اتنی توہین سرمایہ داری اور ملوکیت کے جابرانہ نظام میں بھی نہیں ہوتی۔ جتنی کمیونسٹ نظام میں ہوتی ہے!

سوویٹ روس میں عوام کی بے اختیاری، مجبوری اور بے اثری کا یہ عالم ہے کہ حکومت کے کسی فیصلہ اور اقدام پر پبلک کا کوئی آدمی تنقید نہیں کر سکتا۔ وہاں کے اربابِ اختیار، جو حقیقت میں عوام کے "خداوند" بنے ہوئے ہیں، چاہے کسی حکومت سے رشتہ جوڑ دیں، یا توڑ دیں۔ صلح کا اعلان کریں یا جنگ کا الٹی میٹم دیں۔ حکومت کے خزانہ کو جس مد میں چاہیں جتنا خرچ فرما دیں۔ کس کی مجال ہے جو "چوں" بھی کر سکے، سوویٹ حکمرانوں کے ہر فیصلہ اور حکم پر عوام کو "سرِ تسلیم" خم کرنا ہی چاہیئے۔ جو "سر" اس کے لئے تیار نہ ہو، اُس کی خیر نہیں۔ روس کے رہنے والے دُوسرے ملکوں کے باشندوں سے آزادانہ طور پر خط و کتابت تک نہیں کر سکتے۔ وہاں کے اخبارات بھی گورنمنٹ کے آرگن ہوتے ہیں، عوام کے ترجمان نہیں ہوتے!

کمیونسٹوں نے جو سوویٹ روس کی مساوات کا سارے جہان میں غلغلہ بلند کر رکھا ہے تو یہ دُور کے ڈھول ہیں۔ جو لوگوں کو سُہانے لگ رہے ہیں۔ یہ بہت بڑا فریب ہے جو دُنیا کو دیا جا رہا ہے۔ روس میں بھی عزت، منصب، آمدنی اور معیشت و معاشرت کا خاصہ فرق اور نمایاں تفاوت پایا جاتا ہے۔ وہاں بھی آسودہ حالی اور تنگی کی یہ اُونچ نیچ ملتی ہے کہ ایک شخص اپنے دو چار آدمیوں کے ساتھ ایک وسیع و کشادہ بنگلہ میں رہتا ہے اور دُوسری طرف بیس بیس نفر کا ایک بدنصیب کُنبہ صرف ایک کمرے میں زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ روس کی حکومت حقیقت میں سرمایہ داری، ملوکیت، آمریت اور سیکولرزم کی تمام بُرائیوں کا مجموعہ ہے۔ اپنے عوام کے لئے وہاں کی حکومت نے "روٹی" کا بیشک انتظام کیا ہے۔ مگر "روٹی" دے کر اُس نے اُن کے دین و ایمان، خودی اور آزادی کو چھین بھی تو لیا ہے!

دُنیا کے جس خطّہ میں بھی کمیونسٹ پائے جاتے ہیں اُن کا پروگرام اور پالیسی یہی ہے کہ:-

"ہنگامے کراؤ، گڑبڑ اور بے چینی پھیلاؤ اور کمیونزم کے لئے راستہ ہموار کرو۔"

اُن کا مشن ہی یہ ہے کہ دُنیا کے ہر ملک میں حکومت اور عوام کے درمیان زیادہ سے زیادہ بے اعتمادی، تناتنی اور کھنچاؤ پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کرو! اپنے مقصد کے حصول کے لئے کمیونسٹ ہر بے انصافی، دھوکہ بازی، سازش اور خوفناک سے خوفناک ظلم و تعدی کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اُن کے مذہب میں اصل اعتبار "حصولِ مقصد" کا ہے۔ اُس کیلئے جو مکر و فریب، سازش اور تخریب و ہلاکت بھی انھیں اختیار کرنی پڑے، وہ جائز ہے۔ بلکہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ کسی ملک یا شہر میں گڑبڑ پھیلانے کے لئے مسافروں کی بھری ہوئی ٹرین کو اُلٹ سکتے ہیں اور عوام کے جلسہ میں بم پھینک سکتے ہیں، انتشار اور بدامنی کے خارزار ہی سے اشتراکیت (Communism) کی راہ نکلتی ہے۔ کمیونسٹ [illegible] قسم کا بہروپیا ہوتا ہے جو ہر رُوپ دھار سکتا ہے۔ ضرورت پڑے تو خود کوشش کر کے مسجد بنوا دے اور حالات کا کچھ اور تقاضا ہو تو وہ مسجد کی اینٹ سے اینٹ بھی بجا سکتا ہے!

پاکستان میں!

متحدہ ہندوستان میں کمیونسٹ ہر جگہ پائے جاتے تھے، پاکستان بننے کے بعد جو کمیونسٹ پاکستان میں پہلے ہی سے موجود تھے، اُن میں کے بہت سے یہاں بدستور رہے اور صفِ اوّل کے چند کمیونسٹ بھارت سے پاکستان بھیجے گئے۔ لیاقت علی خاں مرحوم کے زمانہ میں جو خوفناک فوجی سازش پکڑی گئی تھی، اُس میں ان کمیونسٹوں کا خاصہ ہاتھ تھا اور کیا عجب ہے کہ وہ "پلان" ہی ان "سُرخوں" نے بنایا ہو۔ اس لئے کہ جس اسکیم اور مسکوٹ میں کمیونسٹ شریک ہوتے ہیں، اُس میں اپنی قلّتِ تعداد کے باوجود، غلبہ انہی کے فکر و عمل کا رہتا ہے!

انہی کمیونسٹوں نے ہندوؤں سے ساز باز کر کے اور بعض بنگالی قوم پرست مسلمانوں کو شیشہ میں اُتار کر مشرقی پاکستان میں اُردو اور بنگلہ کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ اسی فتنہ کی آڑ میں ان موقع شناسوں نے بنگالی اور غیر بنگالی کی تفریق پیدا کی بلکہ اس آتشِ سوزاں کو ہوا دی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کو انہوں نے اپنے سکھائے پڑھائے اشتراکی طلبار کی شورشوں کا گڑھ بنا لیا اور کچھ دن تک تو مشرقی پاکستان کی یہ حالت رہی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے "سُرخ پلانوں" سے مُسلم لیگ کی بے تدبیر وزارت خوف کھاتی تھی اور ان فتنہ سازیوں کو چیک کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔

دستور سازی کے بعد پاکستان کے سیاسی مدوجزر میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ لوگ خوش تھے کہ یہ مرحلہ تو خدا خدا کر کے ختم ہوا اب اس کے بعد ملک میں تعمیری دَور آئے گا۔ مگر اس بدنصیبی کو کیا کیجئے کہ دستور میں "طریقِ انتخاب" کے مسئلہ کو طے کئے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ یہ ایسی بات تھی جیسے مِل جُل کر کشتی بنائیں اور اُس کشتی میں ایک سُوراخ رہنے دیں۔

کامیاب وہ دشمن ہوتا ہے جو اپنے حریفِ مقابل کی غفلت، بے دانشی اور حرص و خود غرضی سے بروقت فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کمیونسٹوں اور مہاسبھائی ہندوؤں نے مل کر عہدوں اور منصبوں کے بھُوکے مُسلمانوں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اس ٹپ ٹاپ ہندوآنے کے سامنے بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ ری پبلکن پارٹی تو شاید چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہی اپنے قول و قرار اور عہد و پیمان سے پھر گئی۔ اس عہد شکن پارٹی کی قلابازی میں اُن "بڑے لوگوں" کا ایماء بلکہ دباؤ بھی شریک تھا جو اپنی بلند و بالا کرسیوں کے استحکام کے لئے اپنی ڈھب کی پارٹیوں کو پاکستان میں مضبوط بنانا چاہتے ہیں، ایک طرف یہ لالچ اور خود غرضی، دُوسری طرف ہندوؤں کی "پاکستان دشمن سرگرمیاں" اور ان سب سے زیادہ خطرناک کمیونسٹوں کی موقع شناس سازشیں! اس گٹھ جوڑ کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسمبلی میں "مخلوط انتخاب" کی تجویز منظور ہو گئی!

مشرقی پاکستان میں جو شروع ہی سے انتشار و اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے، اُس میں مسلم لیگی حکومت کی بے تدبیریوں کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ لوگ پُوری طرح مخلص اور صاحبِ تدبیر ہوتے تو شورش پسندوں، منافقوں اور افترا پردازوں کو دراندازی کا موقع ہی کا ہیکو ملتا۔ مگر مُسلم لیگ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتی ہے:- ع

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق!

مشرقی پاکستان کے مہاسبھائی ہندوؤں نے پاکستان کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ شروع ہی سے پاکستان کی سالمیت کو مجروح کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ کمیونسٹوں نے اس آگ کو اور ہوا دی بلکہ ایسے "پلان" برابر تیار کرتے رہے جن کے ذریعہ پاکستان کے مشرق اور مغرب میں بیزاری، منافرت اور کشیدگی بڑھتی ہی چلی جائے! اُردو اور بنگلہ کی نزاع ان کیمونسٹوں ہی کی برپا کی ہوئی ہے! ان "سُرخوں" نے مشرقی پاکستان میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مُسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا، جن کی اسلامی اسپرٹ اور دینی احساس پر "بنگالیت" غالب تھی!

(۱) مہاسبھائی ہندو۔

(۲) کمیونسٹ۔ اور۔

(۳) صوبائی عصبیت کے مارے ہوئے مُسلمان۔

ان تین عناصر نے مل جُل کر مشرقی پاکستان میں اس احساس کو اُبھارا کہ مشرقی پاکستان اپنی آبادی کی برتری کے باوجود مغربی پاکستان کا زیردست بنا ہوا ہے۔ یہ کتنی شرم اور کم ہمتی کی بات ہے کہ جس کو غالب ہونا چاہیئے وہ مغلوب ہے، کیمونسٹوں نے

[ب]ڑی ہوشیاری اور فراست و تدبیر کے ساتھ مشرقی پاکستان میں یہ خیالات پھیلائے، "مخلوط انتخاب" کی منظوری اُن کے لگائے ہوئے شجر [خ]بیث کا پہلا پھل تھا۔ اس کے بعد اُن کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ اُن کے منصوبوں کے لئے میدان وسیع تر ہو گیا۔ انہوں نے دُنیا کو یہ بھی دکھا دیا کہ [م]شرقی پاکستان میں اُن کی چالبازیاں مسلمانوں کی اسلامی غیرت اور دینی حمیت کو اس سطح تک لے آئی ہیں کہ ڈھاکہ کے جلسۂ عام میں [م]سلمانوں کی ڈاڑھیاں نوچی جا سکتی ہیں اور اُن کے اکابر پر پتھراؤ کیا جا سکتا ہے!

اس المیہ پر بھی صبر کیا جا سکتا تھا کہ "مخلوط انتخاب" منظور ہو گیا، چلو چھٹی ہوئی ــــ مگر چھٹی کہاں ہوئی۔ "مخلوط انتخاب" کے پیچھے تو سالمیت پاکستان کی تباہی کی منظم فکر کام کر رہی تھی۔ اس خوفناک منصوبہ کا چند مہینہ کے اندر ہی اندر نتیجہ بھی دکھائی دے گیا۔ وہ پاکستان جہاں فاروقؓ و حیدرؓ اور طارقؒ و صلاحؒ الدین کے ناموں پر دروازے بننے چاہیئے تھے، وہاں "گاندھی" "بوس" اور "لینن" کے ناموں پر دروازے بنے ہیں اور بھاشانی صاحب سے کمیونسٹ یہ تک کہلوا دیتے ہیں کہ:-

"مشرقی پاکستان کے ساتھ اگر انصاف نہیں کیا گیا تو وہ مغربی پاکستان کو "سلام علیکم" کہہ دیں گے"۔

"مخلوط انتخاب" کی جن اربابِ فکر نے مخالفت کی تھی، تو قوم پرستوں کی طرف سے اُن پر طنز کی جاتی تھی کہ یہ تو خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ "اسلام" کا اس مسئلہ سے جوڑ کیوں ملایا جاتا ہے اور "مخلوط انتخاب" سے پاکستان کی سالمیت پر بھلا کیا آنچ آ سکتی ہے۔ مگر واقعات و شواہد بول رہے ہیں کہ "مخلوط انتخاب" کے بعد وہ تمام جاہلانہ تصورات ایک ایک کر کے اُبھرتے چلے آ رہے ہیں، جو اسلام اور پاکستان کے لئے مستقل خطرہ ہیں اور جن کی اگر روک تھام نہ کی گئی تو پھر یہاں "کالی دیوی" کی جے پکارنے والوں اور "سُرخ سویرے" کے خواب دیکھنے والوں کے لئے میدانِ فکر و عمل وسیع تر ہو گا۔ مگر اذان و تکبیر بلند کرنے والے زندگی کے ہر شعبہ میں بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ یہاں "کلچر" کی ترقی اور سماجی دلچسپیوں کے نام پر رقص و نغمہ، لہو و لعب اور ہر قسم کی جائز و ناجائز تفریح کو اس قدر عام کیا جائے گا کہ اسلامی معاشرے کی پاکیزگی کو لوگ ایک مضحکہ سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں کے قوم پرست مغرب زدہ حکمرانوں کے رجحان اور ذوق و پسندیدگی نے وادیٔ نیل کو رنگینیوں، تفریحوں اور لذتوں میں ڈبو دیا ہے اور اسلامی اخلاق کے حدودِ عمل روز بروز تنگ تر ہوتے چلے جا رہے ہیں!

"مخلوط انتخاب" کی منظوری کے بعد ان کمیونسٹوں کو پاکستان کے ساتھ ذرا بھی لگاؤ اور ہمدردی ہوتی تو عوامی لیگ کی حکومت کو کام کرنے کے لئے وہ موقع دیتے اور دیکھتے کہ یہ نئے حکمران کیا کرتے ہیں؟ مگر وہ کمیونسٹ ہی کیا جو امن و اطمینان کو گوارا کرے۔ یہ دیکھ کر کہ سہروردی صاحب کی خارجہ پالیسی اُن کی مقبولیت کو بڑھا رہی ہے۔ اور کشمیر کے مسئلہ میں بین الاقوامی دُنیا کی رائے عامہ پاکستان کے کیس کو مضبوط بنا رہی ہے۔ ان "سرخوں" نے سہروردی صاحب کے خلاف مشرقی پاکستان میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ اور ایک بے مغز ڈاڑھی والا جو نہ مولانا ہے اور نہ مُلّا ہے، اُن کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اُس سے یہ لوگ جو چاہتے ہیں کہلوا دیتے ہیں!

پاکستان کے مقصد وجود پر ضرب لگانے کے لئے ان کمیونسٹوں نے سہروردی صاحب اور اُن کی پارٹی کا "مخلوط انتخاب" میں ساتھ دیا۔ جب یہ مرحلہ سر ہو گیا تو اب حکومت کی خارجہ پالیسی پر نزاع برپا کر دی ہے۔ مقصود ملک میں انتشار پیدا کرنا اور ہلڑ مچانا ہے! ملکی مسائل پر احتساب سے ان کمیونسٹوں کا مقصود ملک کی بہتری اور اصلاح کبھی نہیں رہا ــــ!

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہروردی صاحب کی حکومت سے کمیونسٹ پچھلی حکومتوں

کے مقابلہ میں خوش ہیں۔ کیونکہ پاکستان میں "سیکولرزم" اور لادینیت کا رجحان پیدا کرنے میں وہ سہروردی صاحب کی حکومت سے کام لے چکے ہیں اور لے رہے ہیں۔ اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ سہروردی صاحب نے جس قدر کھل کر اپنی خارجہ پالیسی کا اظہار کیا ہے اور مغربی ممالک سے دوستی کی پینگیں بڑھائی ہیں۔ اگر سہروردی صاحب کی جگہ کوئی دوسرا وزیراعظم ہوتا تو کم سے کم مشرقی پاکستان میں ایک پُرشور ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوتا!

ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ والے کمیونزم کو پسند نہیں کرتے اور نہ کمیونسٹوں کا پاکستان میں طاقتور ہونا انھیں گوارا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ جس توڑ جوڑ کے ذریعہ انہوں نے کرسیاں حاصل کی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کمیونسٹوں کا زور پاکستان میں بڑھ گیا ہے اور بڑھ رہا ہے!

ان کمیونسٹوں کی جرأتوں کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ وہ کھل کر پاکستان اور ملّتِ اسلامیہ پر تنقیدیں بلکہ حملے کر رہے ہیں! پہلے وہ دبے دبے سے رہتے تھے۔ مگر اب ان نئے حکمرانوں کے عہد حکومت میں اُن کی جرأتیں بڑھ گئی ہیں ــــ!

"نوائے فردا" نام کی ایک کتاب پر کمیونسٹوں کا مشہور آرگن "امروز" (کراچی) تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اقبال جس ملّت کا پیغمبر تھا وہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے دن ختم ہو گئی اور اس کی جگہ اب پاکستان کی قومیت نے لے لی ہے ...."

اس اخبار نے ایک ہی سانس میں کتنے بہت سے جھوٹ بولے ہیں۔ کتنے مغالطے دیئے ہیں۔ واقعات کی کس قدر تلبیس کی ہے اور اُس کے ان لفظوں سے علامہ اقبال کے مقدس پیام کی، پاکستان کے مقصدِ وجود کی اور ملّتِ اسلامیہ کی جو توہین ہوئی ہے اُس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا:۔ ع

وہ تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے!

جو لوگ اتنا کھلا ہوا جھوٹ بول سکتے ہیں اور اس طرح نڈر ہو کر دنیا کی آنکھ میں خاک جھونک سکتے ہیں۔ اُن سے اگر کوئی شخص انصاف اور بھلمنساہت کی توقع رکھتا ہے تو اُسے اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیئے۔ یہی وہ ظالمانہ فطرت اور جابرانہ ذہنیت ہے جس نے ہنگری میں ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ کر فتح کا قہقہہ بلند کیا ہے!

ساری دنیا جانتی ہے کہ اقبال اسلام کا ترجمان تھا اور اُس کی یہ ترجمانی اور پیامبری آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ پھر وہ ملّتِ اسلامیہ جس کا اقبال بھی ایک فرد تھا اور جس کو بیدار کرنے کے لئے اُس نے شاعری کا صور پھونکا تھا، وہ ملّت اللہ کے فضل سے آج بھی قائم و باقی ہے۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو (خاک بدہن گستاخ) وہ ختم کہاں ہو گئی۔ تقسیم ہند کے بعد اسی ملّت نے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے برسوں جدوجہد کر کے اپنی زندگی اور بیداری کا ثبوت دیا ہے اور اُسی کی جدوجہد کا یہ اثر بلکہ کرامت ہے کہ کتاب و سنّت کو پاکستان کے دستور کی اساس قرار دیا گیا ہے اور "اسلامیہ جمہوریہ" اس حکومت کا نام رکھا گیا ہے۔ اس گستاخ روزنامہ کی شقاوت تو دیکھئے کہ وہ "ملّتِ اسلامیہ" کے (معاذ اللہ) ارتداد کا اعلان کر رہا ہے۔ حالانکہ اللہ کے فضل سے سات کروڑ فرزندانِ توحید اور غلامانِ نبیؐ خاتم اپنے دینی معتقدات اور اسلامی تصورات کے ساتھ بدستور حیّ و قائم ہیں! جس ملّت نے تقسیم ہند کا مطالبہ کیا تھا اور اپنی جدوجہد سے پاکستان بنوایا تھا۔ تو کیا سب کچھ اُس نے اس لئے کیا تھا کہ ادھر تقسیم ہند کا اعلان

ہو اور اُدھر وہ ملت اپنے کو ختم کر دے!

"امروز" نے جس "پاکستانی قومیت" کا شوشہ چھوڑا ہے۔ آخر یہ ہے کیا بلا؟ ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ کب مطالبہ کیا تھا کہ "پاکستانی قومیت" کو وجود میں لانے کے لئے ہمیں ایک خطہ چاہیئے۔ اور جس دن ملک بٹے گا اور پاکستان وجود میں آئے گا، بس اسی دن ہم اپنی گزشتہ دینی روایات، مذہبی معتقدات اور اسلامی تصورات کو تیاگ کر "پاکستانی قومیت" میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کو اگر "پاکستانی قومیت" ہی میں اپنے کو تبدیل کرنا تھا، تو پھر "ہندوستانی قومیت" آخر کیا بُری تھی؟ "قومیت و وطنیت" کے اس جاہلانہ نظریے کے توڑ پر ہی تو پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، جہاں مسلمان خالص اسلامی طرز پر زندگی بسر کر سکیں! ہندوؤں سے نزاع ہی اس بنیاد پر تھی کہ ہندوستان کے مسلمان وطن کی بنیاد پر کسی "قومیت" کو تسلیم نہیں کرتے، اُن کو اسلام نے قوم و ملت بنایا ہے، وطن نے نہیں بنایا۔

"۱۷۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ملت کے ختم ہونے کا اعلان" — درحقیقت یہ وہ بغض ہے جو "امروز" کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا ہے۔ یہ کمیونسٹ ملتِ اسلامیہ کے بارے میں ایسے ہی خوفناک عزائم رکھتے ہیں۔ مگر صدیوں کی تاریخ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کو مٹانے کی جس ظالم نے بھی کوشش کی، وہ خود مٹ گیا۔ ملتِ اسلامی اللہ کے فضل سے باقی رہی اور باقی رہے گی۔ اب کارل مارکس کے اُمتی بھی یہ کوشش کر کے دیکھ لیں! روس کے ایٹم بموں سے خوف وہ کرے گا، جو اسی دُنیوی زندگی کو سب کچھ سمجھتا ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ربوبیت پر اُس کا ایمان نہ ہو گا۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کو نہ موت کی دھمکی ڈگمگا سکتی ہے اور نہ کوئی لالچ اُنھیں رام کر سکتا ہے! "امروز" بیچارے کو کیا معلوم کہ مسلمان کے غم و مسرت، سود و زیاں اور کامیابی و ناکامی کا پیمانہ ہی سب سے الگ ہے۔ یہاں حسینؑ گھر بار لٹا کر اور سر کٹا کر "کامیاب" اور یزید فتح پاکر "ناکامیاب" رہتا ہے۔ بیشک سوویٹ روس دُنیا کی بہت بڑی حکومت ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس سے بھی بڑا ہے۔ بلکہ بڑائی اور کبریائی صرف اسی کے لئے زیبا اور سزاوار ہے۔ روس جیسی نہ جانے کتنی جابر حکومتیں اور عظیم سلطنتیں اللہ کے حکم سے مٹ کر فنا ہو چکی ہیں۔ نمرود اور فرعون نے اللہ کی دشمنی مول لی اور اپنی جھوٹی خدائی کا نعرہ بلند کیا۔ مگر جب ڈھیل کی مدت ختم ہو گئی اور پکڑ کا وقت آیا تو اپنے زمانہ کے سب سے بڑے باجبروت شہنشاہوں کو کوئی طاقت فنا ہونے سے نہ بچا سکی! روس کی حکومت جس کی بنیاد خدا کی بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ اپنا حشر اسی دُنیا میں دیکھ لے گی۔ ظلم کی ناؤ زیادہ دن تک نہیں چل سکتی اور پاپ کا گھڑا بھرتے ہی ڈوب جاتا ہے!

کرنا کیا چاہیئے؟

کمیونسٹوں کو جس جگہ جتنا موقع ملتا ہے۔ انتشار پیدا کرنے اور فتنے اُٹھاتے ہیں۔ رقص و غنا، ڈرامہ، سینما شو، لہو و لعب کے ہنگامے، غرض جن باتوں سے اخلاق کی قدروں پر زد پڑتی ہے، اُن کی اشاعت میں یہ لوگ ہمیشہ سرگرم نظر آئیں گے۔ جس طرح "روٹی" کے نام پر عوام متاثر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نفسانی لذتوں اور خواہشوں کا جادو عوام کیا خواص تک پر بڑی آسانی سے چل جاتا ہے۔ یہ کمیونسٹ آدمی کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا خوب جانتے ہیں۔ اخلاق اور نیکوکاری کا بہت کچھ تعلق مذہب سے ہے۔ اس لئے یہ لوگ لٹریچر، میلوں ٹھیلوں، ڈراموں، ناچ گانے کی محفلوں اور مظاہروں کے ذریعہ اخلاق و حیا پر ضرب لگا کر بہت خوش ہوتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے مذہب کو زک پہنچا دی۔ فحاشی، بے حیائی اور فسق و فجور کی کثرت اور گرم بازاری ان "سُرخوں" کی عین تمنا ہے۔ کہ ان بُرائیوں میں مبتلا رہ کر، خدا اور آخرت کا تصور دھندلا پڑتا اور آدمی مذہب سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پاکستان میں

ان لوگوں نے اب لٹریچر کے ذریعہ یہاں کے نسوانی طبقہ کو بہکانے اور گمراہ کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اُن کے اندر یہ احساس پیدا کیا جا رہا ہے کہ ان مردوں نے تمہیں غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خود جس لذت میں مبتلا ہوتے ہیں، اُس سے تمہیں دُور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رنگینی و لذت سے آخر عورت کیوں محروم رہے"!

پاکستان کے ان "بڑے آدمیوں" سے ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ لہو و لعب، رنگینیوں اور عشرت آفرینیوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ "یہ بڑے آدمی" کمیونسٹوں سے مختلف نہیں ہیں۔ اور ان بے اعتدالیوں پر ٹوکنے والوں کو وہ بھی قدامت پرست اور ملّا ہی سمجھتے ہیں۔ ہمارا اصل خطاب پاکستان کے عوام سے ہے!

اگر ملّت کے اندر احساسِ غیرت باقی ہے تو پھر اس فتنہ کی روک تھام بھی ملّت کے غیور افراد ہی کر سکتے ہیں۔ ابھی پانی سر سے اُونچا نہیں ہوا ہے۔ حالات اتنے نہیں بگڑے ہیں کہ سنبھالے نہ جا سکیں! فحاشی اور عریانی کا جہاں پبلک مظاہرہ ہو۔ اس کو ناکام بنانے کی سب سے آسان اور سہل تدبیر یہ ہے کہ عوام اُس میں دلچسپی نہ لیں اور بس چند گنتی کے بے غیرت لوگ گا بجا کر اور ناچ کر اور تھرک رہ جائیں۔ بُرائی کو دیکھ کر مردِ مومن کے اندر شدید قسم کی جھنجلاہٹ پیدا ہونی چاہیئے۔ اسی احساس کو عوام کے اندر اُبھارنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے گلی گلی اور کوچہ کوچہ جلسے ہوں۔ اور قریہ قریہ میں اس کی منادی کی جائے کہ شرم و غیرت اور نیکوکاری ہی ملّت کی سب سے بڑی متاع ہے! اسلام پسند طلبا اسکولوں اور کالجوں میں، اسلام پسند اہلکار دفتروں میں۔ اسلام پسند تاجر بازاروں اور منڈیوں میں۔ اسلام پسند عہدہ دار اُونچی سوسائٹی اور قصر و ایوان میں۔ غرض ہر طبقہ اور حلقہ میں اخلاق کی مسلسل تبلیغ ہوتی رہنی چاہیئے۔ ملّت کی اخلاقی بنیاد مضبوط ہوگی تو پاکستان بھی صحیح معنی میں بنیانِ مرصوص بن جائے گا۔ پاکستان میں کمیونزم، قوم پرستی اور مغرب زدگی کو شکست صرف اسلامی اخلاق سے دی جا سکتی ہے اور اہلِ ایمان کے پاس یہی وہ طاقت ہے جس نے آج تک کسی قوت سے شکست نہیں کھائی۔ اسی طاقت کے رکھنے والوں کو:-

"انتم الاعلون"

کی بشارت دی گئی۔ آؤ ہم اس بشارت کے مستحق اور مصداق بن جائیں!!

ماہر القادری

۲۸ فروری ۱۹۵۷ء

ونا حافظ محمد ایوب دہلوی

"کیا کتاب" کے علاوہ بھی "وحی" ہو سکتی ہے؟

سوال:- کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف کے علاوہ بھی وحی کی جاتی تھی یا وحی صرف کتاب اللہ میں منحصر ہے، کیا ہر وہ نبی جس پر کتاب نازل ہوئی، علاوہ کتاب کے اس پر وحی نازل کی گئی یا نہیں؟

جواب:- ہر نبی پر وحی آئی اور ہر نبی صاحبِ کتاب پر علاوہ کتاب کے بھی وحی آئی - **بالخصوص** ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر علاوہ قرآن شریف کے بارہا بکثرت وحی آئی -

ثبوت:- اس بات کا ثبوت کہ وحی کتاب کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ کتاب کے علاوہ بھی ہر صاحبِ کتاب نبی پر وحی آتی رہی یہ ہے کہ:- ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے، مگر صاحبِ وحی ہے، یعنی نبی وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور کتاب کے بغیر نبی ہو سکتا ہے - اب اگر وحی کتاب کے ساتھ مختص ہو گی، تو ہر نبی کو صاحبِ کتاب ہونا چاہیئے - حالانکہ اس بات پر اجماع ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے اور صاحبِ وحی ہے - اللہ تعالیٰ نے فرمایا - قل انا بشر مثلکم یوحی الیّ - کہہ دے کہ میں تمہارے جیسا آدمی ہوں - یعنی بشریت میں تم جیسا ہوں - فرق یہ ہے کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے - اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی غیر نبی سے صرف وحی میں ممتاز ہے، بغیر وحی کے نبی ہو ہی نہیں سکتا - وحی کیا چیز ہے؟ اللہ کا بشر سے کلام کرنا وحی ہے - اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء

یعنی اللہ تعالیٰ بشر سے صرف تین طریقوں سے کلام کرتا ہے (۱) وحی سے (۲) پردہ کے پیچھے سے (۳) یا ایک رسول (فرشتہ) کو بھیجتا ہے - وہ اس کی اجازت سے اس کی مشیت کے موافق اس انسان پر وحی کر دیتا ہے - یہ تین طریقے ہیں وحی کے - اور یہ تینوں وحی ہیں - (الا وحیا) میں وحی صاف ہے (من وراء حجاب) جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا - یہ بھی جیسا ارشاد فرمایا (وانا اخترتک فاستمع لما یوحیٰ) میں نے تجھ کو پسند کر لیا، تو سن جو وحی کی جا رہی ہے" حضرت موسیٰ سے جو کلام کیا، اس کو اللہ نے وحی سے تعبیر کیا - (او یرسل رسولا فیوحی) میں وحی موجود ہے - الغرض اللہ تعالیٰ کا بشر سے کلام کرنا وحی ہے - اور جس پر وحی ہو وہ نبی ہے - کیونکہ فرق نبی اور غیر نبی کا صرف وحی ہے -

اب ہم کو یہ سمجھانا ہے کہ قرآن شریف جبریل روح الامین لے کر آئے ہیں - اللہ تعالیٰ نے فرمایا "نزل به الروح الامین" (قرآن کو روح الامین لے کر آئے ہیں) "فانه نزله علیٰ قلبک" (جبریل نے تیرے دل پر قرآن اتارا) اس سے صاف واضح ہو گیا کہ "یرسل رسولا" میں جس وحی کی طرف اشارہ ہے، وہ قرآن مجید ہے، وہ رسول اور فرشتہ جو باذن الٰہی وحی کرتا ہے، وہ صرف قرآن ہے - اور واضح ہو گیا کہ وحی کا انحصار قرآن ہی میں نہیں ہے، بلکہ قرآن سے علیحدہ دو وحیاں اور ہیں، جن کی طرف "الا وحیا" اور "او من وراء حجاب" میں اشارہ ہے - خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کی تین قسمیں بتائیں - اور قرآن شریف تیسری قسم یعنی "او یرسل رسولا" میں شامل ہے - "الا وحیا" اور "او من وراء حجاب" یہ دونوں قرآن کے

علاوہ ہیں۔ کیونکہ قرآن کو روح الامین (جن کو آیت میں رسول سے تعبیر فرمایا ہے لے کر آئے ہیں۔ اس سے صاف واضح ہو گیا کہ وحی کا انحصار صرف قرآن شریف میں نہیں ہے، بلکہ وحی علاوہ قرآن شریف کے ان دو طریقوں پر (یعنی "الا وحیا" اور "او من وراء حجاب") بھی ہوتی ہے!

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ انبیاء سابقین پر وحی ہوئی اور وہ وحی "کتاب" نہیں تھی:۔

حضرت آدمؑ سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا "قلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ" (اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو سہو) "یا آدم انبئهم" (اے آدم ان کو یعنی فرشتوں کو ان اشیاء کے نام بتا دے) "ونادا ھما ربھما الم انھکما" (ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تم کو منع نہیں کیا تھا) اللہ تعالیٰ نے آدم سے بار بار کلام کیا اور یہ کلام کتاب نہ تھا۔

حضرت نوحؑ پر وحی کی (واوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومک الا من قد امن، نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا، جو ایمان لانے والے تھے وہ لا چکے۔ (فاذا استویت انت ومن معک علی الفلک) جب تو اور تیرے ساتھی کشتی پر سوار ہو جائیں (یا نوح انه لیس من اھلک) اے نوح وہ (یعنی تیرا بیٹا) تیرے اہل میں سے ہی نہیں۔

الغرض متعدد کلام حضرت نوحؑ سے ہوئے، یہ سب وحی تھے اور کتاب نہ تھے، کیونکہ مایوسی کے وقت، ڈوبنے کے وقت، اور نجات پانے کے وقت کتاب کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب کا نزول بشارت انذار اور رفع اختلاف کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اس وقت مفقود تھا۔

حضرت ابراہیمؑ پر وحی ہوئی "یا ابراھیم اعرض عن ھذا" (اے ابراہیم چھوڑ بھی اس خیال کو) یہ وحی تھی اور کتاب نہ تھی۔ "تلک حجتنا اتینھا ابراھیم علی قومه" (حضرت ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلہ کے لئے یہ حجت ہم نے دی تھی) حضرت ابراہیمؑ نے کواکب اور شمس و قمر کے غروب اور غائب ہونے سے ان کے حدوث پر استدلال کیا۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے اس طرح ذکر فرمایا۔ کہ یہ حجت ہم نے ابراہیمؑ کو سکھائی تھی۔ یہ وحی تو تھی مگر کتاب نہ تھی۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا "انی لاجد ریح یوسف" (مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے) حاضرین نے کہا کہ آپ تو وہی پرانے خیالات میں ہیں۔ پھر جس وقت آپ بینا ہو گئے تو فرمایا "انی اعلم من اللہ مالا تعلمون" (مجھے اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو تمہیں معلوم نہیں ہوتیں) بس یہی وحی ہے مگر کتاب نہیں ہے۔ کتاب ہوتی تو بیٹوں کو اور تمام حاضرین کو معلوم ہو جاتی۔ اس کی تو تبلیغ فرض تھی۔

حضرت یوسفؑ کو وحی ہوئی "واوحینا الیه لتنبئنهم بامرهم ھذا" (ہم نے یوسفؑ کو وحی کی کہ تو ان کی اس غلطی پر ان کو متنبہ کرے گا) چنانچہ انہوں نے ان کو متنبہ کیا "ھل علمتم مافعلتم بیوسف واخیه" (تمہیں کچھ پتہ ہے کہ یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ تم نے کیسا (برا) برتاؤ کیا تھا) بہرحال یہ وحی کنوئیں میں ڈالتے وقت ہوئی تھی۔ اور یہ وحی کتاب نہ تھی۔

حضرت موسیٰؑ کو طور پر وحی ہوئی "یا موسیٰ انی انا اللہ" (اے موسیٰ میں ہی معبود ہوں) یہ وحی تھی۔ کیونکہ فرمایا "فاستمع لما یوحی" (سن جو وحی (تیری طرف) کی جاری ہے) بہرحال طور کا کلام وحی ہے۔ مگر کتاب نہیں ہے۔ "واوحینا الی موسیٰ ان الق عصاک" (ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ اپنا عصا پھینک دے) یہ وحی ہے اور کتاب نہیں ہے۔ کیونکہ توریت ان وحیوں کے بہت عرصہ بعد نازل کی گئی تھی۔ "واوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی" (ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا) یہ وحی ہے اور کتاب نہیں ہے۔

الغرض متعدد وحیاں ان حضرت کو ہوئیں اور یہ وحیاں کتابیں نہ تھیں۔

حضرت لوطؑ سے ملائکہ نے کہا "یا لوط انا رسل ربک" (اے لوط ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں) یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ کیونکہ

عذاب کے وقت کتاب کیسی؟ عذاب کے وقت کتاب بے سود چیز ہے۔ بنی اسرائیل کے نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔ "وقال لھم نبیّھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا" یہ وحی ہے کتاب نہیں ہے حضرت سلیمانؑ پر وحی ہوئی "ففھمنٰھا سلیمٰن" (ہم نے اس فیصلے کو سلیمان کو سمجھا دیا) یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ کتاب ہوتی تو حضرت داؤدؑ اسے جانتے۔

حضرت زکریاؑ پر وحی ہوئی "یا زکریا انا نبشرک بغلام" (اے زکریا ہم تجھے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں) "فنادتہ الملائکۃ و ھو قائم یصلی" (فرشتوں نے اُن کو آواز دی جس وقت وہ نماز پڑھنے محراب میں کھڑے ہوئے تھے) "ان اللہ یبشرک بیحییٰ" کہ اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے) یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ اگر کتاب میں یہ مضمون ہوتا تو نہ دعا مانگتے، نہ تعجب کرتے۔

حضرت عیسٰیؑ پر وحی ہوئی "قال اللہ انی منزلھا علیکم" (اللہ نے کہا میں تمہارے اُوپر خوان اُتاروں گا) یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ کیونکہ اگر یہ کتاب ہوتی تو حواری مطالبہ کرتے نہ ضد بحث ہوتی۔ یعنی کتاب میں یہ مضمون ہوتا کہ اللہ خوان اُتار سکتا ہے اور اُتارے گا۔ تو اس صورت میں مطالبہ ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ انجیل، توریت وغیرہ سب دفعتاً نازل ہو چکی تھیں۔

الغرض جو نبی صاحبِ کتاب نہیں تھے، اُن پر تو صرف وحی ہی وحی نازل ہوئی اور جو صاحبِ کتاب تھے اُن پر کتاب سے پہلے اور کتاب کے بعد برابر وحی ہوتی رہی اور قرآن شریف میں بکثرت یہ وحیاں مذکور ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی بشر سے کلام کرنا ہی وحی ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں اور کتاب اس کی ایک قسم "او یرسل رسولاً" میں مشتمل ہے۔ وحی عین کتاب نہیں ہے۔ وحی کبھی کتاب ہو گی، کبھی "من وراء حجاب" ہو گی، کبھی خالص وحی ہو گی۔

اب خاص طور سے سمجھئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی علاوہ قرآن شریف کے بھی آئی تھی۔

پہلی دلیل

"واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا فلما نبات بہ واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض فلما نباءھا بہ قالت من انباک ھذا قال نبانی العلیم الخبیر" (جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے چپکے سے ایک حدیث بیان کی پھر اس بیوی نے اس کو (کسی دوسری سے) کہہ دیا اور اللہ نے نبی پر اس واقعہ کو ظاہر کر دیا ہے)

یعنی اللہ نے نبی پر یہ ظاہر کر دیا کہ تیری بیوی نے اس بات کو دوسری بیوی پر ظاہر کر دیا ہے۔ تو نبی نے اس بیوی سے کچھ حصّہ بیان کیا اور کچھ نہیں بیان کیا۔ جب نبی نے بیوی کو اس واقعہ کی خبر دی تو بیوی نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی۔ تو نبی نے کہا کہ مجھے علیم خبیر نے خبر دی ہے۔ اللہ نے نبی پر یہ واقعہ ظاہر کیا۔ "اظھرہ اللہ" اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ نے اس کا اظہار جو نبی پر کیا ہے یہ وحی تھی اور نبی نے جو یہ کہا کہ علیم وخبیر نے خبر دی، یہ وحی تھی۔ اس آیت کے دونوں ٹکڑے وحی غیر قرآن پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ نے نبی پر جو اس واقعہ کو ظاہر کیا یہ قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے، اور نبی نے جو یہ کہا کہ مجھے علیم وخبیر نے خبر دی ہے تو علیم وخبیر کا یہ خبر دینا کہیں قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ قرآن کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ہوئی۔

دوسری دلیل

"ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علیٰ اصولھا فباذن اللہ" (کھجور کے درخت جو تم نے کاٹ دیئے یا اُن کی جڑوں پر باقی رہنے دیئے تو یہ (جو کچھ تم نے کیا ہے) اللہ کی اجازت سے کیا ہے)

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ وحی ہوئی۔ کیونکہ جس حکم کے ذریعہ ان درختوں کو کاٹا گیا وہ حکم قرآن شریف میں کہیں نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ اذنِ الٰہی کس جگہ ہے، قرآن میں ہے یا قرآن سے باہر ہے۔ اگر قرآن میں ہے تو دکھاؤ کہاں ہے۔ ہرگز قرآن میں ان درختوں کے کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن قرآن سے اجازت ثابت ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ اجازت دُوسری وحی سے ہے۔

جو علاوہ قرآن شریف کے ہوئی۔

تیسری دلیل سورۂ بقرہ، آلِ عمران وغیرہ یہ سب سورتیں مدنی ہیں جو تقریباً دس سال بعد نازل ہوئی ہیں۔ تو جس طرح یہ نازل ہوئی تھیں، اسی طرح ان کو کیوں ترتیب نہیں دیا گیا۔ جو سورۃ پہلے نازل ہوئی وہ پہلے لکھی جاتی۔ جو پیچھے نازل ہوئی وہ پیچھے لکھی جاتی۔ لیکن ایسا نہیں کیا بلکہ پہلے نازل شدہ سورتیں پیچھے لکھی گئیں اور پیچھے والی پہلے لکھی گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :۔

"قال الذین لا یرجون لقاءنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی"

(جو لوگ ہماری ملاقات کے آرزومند نہیں وہ کہنے لگے کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لا۔ یا اس کو بدل دے۔ کہہ دے مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف وحی کا پابند ہوں)

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ تبدیلی بغیر وحی کے نہیں ہو سکتی۔ یہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیلی تنزیلی ترتیب میں کی ہے، یہ وحی سے کی ہے اور یہ وحی قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ یعنی کہیں قرآن میں یہ نہیں ہے کہ اے نبی! یہ سورۃ یہاں لکھواؤ اور یہ وہاں۔ لہذا قرآن کے علاوہ وحی ہوئی۔

چوتھی دلیل اللہ تعالیٰ نے فرمایا " ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و آباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان " (یہ صرف اسماء ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ کی منظوری کے بغیر) اس سے ظاہر ہو گیا کہ اللہ کی منظوری کے بغیر نام رکھنا ناجائز ہے۔ لہذا یہ جو سورتوں کے نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھے ہیں۔ سورۃ بقرہ، سورۃ آلِ عمران۔ وغیرہ۔ یہ قطعی اللہ کی منظوری سے رکھے ہیں۔ اور یہ منظوری قرآن میں کہیں نہیں دی۔ بلکہ قرآن کے علاوہ منظوری دی گئی۔ یہ وہ وحی ہے جو قرآن کے علاوہ ہے۔

پانچویں دلیل اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ " واذا قرئ القرآن فاستمعوا " (جب قرآن پڑھا جائے تو سنو) " اذا قرأناہ فاتبع قرآنہ " (جب ہم قرآن پڑھیں تو اس کی پیروی کرو) مگر قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اے نبی! جب قرآن نازل ہوا کرے تو لکھ لیا کرو۔ یہ جو نبی صلعم نے قرآن کو لکھوایا یہ کس وحی سے۔ آیا یہ وحی قرآنی سے! تو وحی قرآنی تو ساکت ہے۔ لہذا وحی غیر قرآنی سے اس کو لکھوایا۔

چھٹی دلیل اللہ تعالیٰ نے فرمایا " فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلٰث و رباع " (دو دو تین تین چار چار جو عورتیں اچھی لگیں اُن سے نکاح کر سکتے ہو) ہم پوچھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چار سے زیادہ نکاح کئے یہ کس وحی سے کئے؟ وحی قرآن میں تو صرف چار تک کا حکم ہے۔ نبی صلعم کا یہ فعل ضرور بالضرور وحی غیر قرآنی سے ہوا۔

ساتویں دلیل اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ " فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ " (جب ہم قرآن کی تلاوت کریں تو اس کی پیروی کرو۔ یعنی سنو) پھر (اس کے بعد) اس کا سمجھانا ہمارے ذمہ ہے۔ یعنی قرآن کے نازل ہونے کے بعد قرآن کا بیان کرنا اور واضح کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ یہ بیانِ قرآن قرآن ہے یا قرآن سے علیحدہ ہے۔ اگر قرآن ہے تو اس قرآن کے لئے پھر بیان کی ضرورت ہے۔ اگر قرآن کے علاوہ ہے تو بیانِ قرآن قرآن سے علیحدہ منزل

من اللہ ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ بیانِ قرآن ہمارے ذمہ ہے اور بیانِ قرآن غیر قرآن ہے۔ کیونکہ اگر بیانِ قرآن قرآن ہوگا تو تسلسل لازم آئے گا۔ لہٰذا بیانِ قرآن غیر قرآن ہے اور وہ اللہ کے ذمہ ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے ہے۔ لہٰذا اللہ کی جانب سے ایسی وحی ثابت ہو گئی جو قرآن سے علیحدہ ہے۔

آٹھویں دلیل بیت المقدس کو قریباً سترہ مہینے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ بنائے رکھا۔ یہ کس وحی سے بنایا۔ وحی قرآن تو ساکت ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبی تم بیت المقدس کو قبلہ بناؤ۔ اور نبی صرف وحی کا پیرو ہے۔ لہٰذا بیت المقدس کو جس وحی سے قبلہ بنایا وہ وحی، وحی غیر قرآن ہے۔

نویں دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ تین ہزار فرشتوں کی امداد تمہیں کافی نہیں ہے۔ "الن یکفیکم ان یمدکم بثلاثۃ الاف من الملٰئکۃ"۔ یعنی اللہ نے ان کے قول کو نقل کیا ہے۔ نبی کے اس قول سے قبل یہ قول کہیں قرآن میں نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ نبی کو اس قول کی وحی قرآن سے الگ ہوئی تھی!

دسویں دلیل "یوصی بھا او دین" اس آیت میں وصیت مقدم ہے دین پر۔ لیکن نبی نے دین کو وصیت پر مقدم کر دیا۔ اور نبی وحی کے خلاف نہیں کر سکتا۔ اور وحی قرآنی میں اس تبدیلی کا حکم موجود نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن کے علاوہ وحی ہوئی تھی۔

گیارھویں دلیل "لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم" (اللہ نے تم کو جس طرح ہدایت کی ہے اس طرح تکبیر کرو) اللہ نے قرآن میں کہیں تکبیر کا طریقہ نہیں بیان کیا، صرف نبی نے بیان کیا ہے۔ اللہ نے نبی کے بتلائے ہوئے طریقہ کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی کو وحی کی گئی کہ اس طرح تکبیر کہو یا تکبیر پڑھو۔ اور یہ وحی کہ اس طرح تکبیر کہو، قرآن شریف میں نہیں پائی جاتی۔

بارھویں دلیل "فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" اللہ نے اپنے بندہ کو جو وحی کرنی تھی کی)۔ یہ صاف دلیل ہے کہ کچھ وحی ہوئی۔ اور وہ وحی قطعاً قرآن نہیں ہے۔ اس لئے کہ وحی قرآنی سب کو معلوم ہے اور اس وحی کا کسی کو صحیح پتہ نہیں۔ نیز قرآن یا مکی ہے یا مدنی، اور یہ وحی نہ مکی ہے نہ مدنی،

غرض بے شمار دلالتیں موجود ہیں قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر۔ "ما ینطق عن الھویٰ، ان ھو الا وحی یوحیٰ" (وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ اس کا نطق صرف وحی ہے) اب اگر کوئی کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تو یہ غلط ہے اس لئے کہ قرآن کو آیت میں محذوف نکالنا پڑے گا۔ اور حذف خلافِ اصل ہے۔ دوسرے ھو کی ضمیر کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ سیدھے راستہ سے رکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔ عمل کی صفائی "ما ضل صاحبکم و ما غویٰ" سے کر دی اور قول کی صفائی "ما ینطق عن الھویٰ" سے کر دی۔ یعنی اس کا قول من جانب اللہ ہے۔ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ مطلقاً اس "نطق" کی نفی ہے جو "ھوا" یعنی بیان کرنے والے کی اپنی خواہش سے ہو!

جب نبی یہ کہیگا کہ "یہ اللہ کا قول ہے" یعنی یہ کہیگا کہ "الٓمٓ ذٰلک الکتاب"۔ اللہ کا قول ہے۔ تو نبی کا یہ قول اگر "ھوا" سے ہوگا تو اللہ کا قول اس "ھوائی قول" سے ثابت نہیں ہوگا۔ پس قرآن جس نطق نے ادا کیا ہے، اسے بھی "ھوا" کی آمیزش سے پاک ہونا چاہیئے۔ لہٰذا نبی کا ہر قول "غیر ھوائی" ہے اور "وحی" ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ نبیؐ کا ہر قول و فعل جو قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اس کی بابت کیا کہتے ہو؟ اگر وحی سے ہے تو قرآن کے علاوہ وحی ثابت ہو گئی اور اگر وحی سے نہیں ہے تو یہ اس آیت کے خلاف ہوا جاتا ہے کہ "ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ" (میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں)، اگر کوئی کہے کہ نبی کا ہر قول و فعل وحی سے ہے اور وحی قرآنی سے ہے، بعض اقوال و افعال نص سے ہیں۔ بعض

استنباط سے ہیں، تو یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " لتحکم بین الناس بما اراک اللہ " اللہ جو معنی دکھاتا تھا اس پر حکم صادر فرماتے تھے، استنباط نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ استنباط کے لئے اشتراکِ علت ضروری ہے۔ جہاں علت مشترک نہیں ہے، وہاں استنباط نہیں ہو سکتا۔ اب دیکھئے:۔

شدید القویٰ۔ " علمه شدید القویٰ " میں۔

روح الامین " نزل به الروح الامین۔ فارسلنا الیها روحنا " میں۔

رسول الکریم " انه لقول رسول کریم " میں۔

ان سب سے مراد جبرئیل ہیں۔

دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی استنباط نہیں کر سکتیں کہ ان الفاظ کے معنی جبرئیل ہیں۔ جب تک کہ متکلم خبر نہ دے۔ کہ ان الفاظ سے جبرئیل مراد ہے۔

قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ ان الفاظ سے جبریل سمجھ لینا۔

اس طرح " ذوالنون " اور " صاحب حوت " سے مراد یونس علیہ السلام ہیں کہیں سے بھی مستنبط نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال اور ایسے افعال موجود ہیں جن کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہے۔

بتاؤ کہ یہ اقوال و افعال بالوحی ہیں یا نہیں؟

اگر بالوحی ہیں تو یہ وہی وحی ہے، جس کے ہم درپے ہیں۔ اگر بالوحی نہیں ہیں تو قطعی " ان اتبع الا ما یوحیٰ الی " کے خلاف ہیں۔ اور ایسا کہنا کفر ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے پیرو نہ تھے۔ معاذ اللہ!

بہر حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل بالوحی تھا۔

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی

صبحِ صادق

(دُنیا کے گوشہ گوشہ میں حضورِ پُرنور کے غلام اجتماعوں، جلسوں اور محفلوں میں جمع ہو کر آپؐ کے ذکر سے اپنے قلوب کے لئے سرمایۂ تسکین و ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ لندن کی ایک ایسی جماعت کے لئے سال ۱۹۵۱ء میں ایک محتاجِ شفاعت نے جو مضمون سپردِ قلم کیا تھا وہ درج ذیل ہے:۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ — کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ

حَسُنَتْ جَمِیعُ خِصَالِہٖ — صَلُّوا عَلَیہِ وَآلِہٖ

مبارک تھی وہ ساعتِ صبح جو عالمِ رنگ و بو میں بہار جاوداں کا پیغام لے کر آئی اور آفتابِ ہدایت کی لازوال شعاعوں سے شبستانِ عالم کے گوشہ گوشہ کو منور کر گئی۔

آیئے دیکھیں کہ انسانیت کے لئے اس صبح جاں نواز کی اہمیت کیا تھی؟ تاریخِ عالم پر نظر ڈالئے تو صاف نظر آئے گا کہ مظاہرِ قدرت کی عظمت اور بزرگی کے احساس سے لے کر ایک وحدہٗ لاشریک کی عبادتِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے انسانیت کے موڑ پر تاریکیوں کے بادل چھائے ہیں اور اس ظلمت کو دُور کرنے کے لئے اقتضائے زمانہ کے مطابق کسی نہ کسی برگزیدہ نبیؑ کے ذریعہ دُنیا کو ہدایت اور روشنی کی راہوں سے روشناس کیا گیا ہے۔ انسانیت یُوں ہی افتاں و خیزاں ترقی کی راہ پر گامزن رہی ہے۔ لیکن اسی راہ میں ایک وہ سخت مقام بھی آیا جبکہ بظاہر اس کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ ظلم و ستم، جبر و تشدد، جہالت و بداخلاقی کے بادل گھر آئے اور ایک گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرا جس نے دُنیا کے گوشہ گوشہ کو اپنے دامن میں لے لیا۔ یوں تو ہر طرف تاریکی تھی لیکن دشتِ عرب میں جو اندھیرا چھایا تھا اس کی مثال خود اس تاریک دُنیا میں بھی نہ ملتی تھی!

لیکن خیر پر ہمیشہ کے لئے شر کا تسلط نہیں ہو سکتا۔ آخر اس بھیانک رات کے بعد پھر کارسازِ عالم کی رحمت جوش میں آئی اور اس بار اسے یہ منظور ہوا کہ جس مقصد کے لئے انسانیت کو رفتہ رفتہ خیر سے آشنا کیا جا رہا تھا۔ اس کی تکمیل کچھ اس انداز سے کر دی جائے کہ پھر کسی چراغِ ہدایت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ دُنیا کو اس محبوب نبیؐ کی آمد آمد کا مژدہ سنا دیا جائے جس کی ذاتِ گرامی کسی خاص قبیلہ یا کسی خاص مقام کے لئے نہیں بلکہ جس کا وجود تمام کائنات کے لئے باعثِ رحمت بن جائے۔ جو انسانیت کے لئے ایک مکمل نظام کا پیغامبر ہو۔ جس کا خُلق آئینۂ انسانی میں پرتوِ قدس کی تصویر ہو۔ جو انسانیت کو اُس مقام سے آشنا کر دے جہاں امتیازِ رنگ و نسل باقی نہیں رہتا جہاں ہر جبینِ نیاز ایک آستانۂ بے نیاز پر جھک جائے۔ جہاں ہر متنفس قومی اور جغرافیائی حدود سے بلند تر ہو کر صرف رضائے الٰہی کے لئے سرگرمِ عمل نظر آئے۔ جہاں عبد اور معبود کے رشتے کچھ اس انداز سے استوار ہو جائیں کہ عبد کا ہر فعل عملِ عبادت اور معبود کی ہر نظر منظرِ التفات بن جائے!

رحمتِ الٰہی نے ۱۲۔ ربیع الاوّل دوشنبہ کے دن دُنیا پر وہ احسان فرمایا جس کے لیل و نہار برسہا برس سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ صلوٰۃ اللہ علیہ و علی آلہٖ و اصحابہٖ وسلم!

انسانیت پر اس عظیم الشان احسان کا ذکر کلامِ الٰہی میں ان الفاظ میں ہوتا ہے:۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلو علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمت وان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین!

(اللہ نے واقعی ایمان والوں پر احسان کیا جب انہی میں سے ایک رسُول بھیجا۔ جو اُن کو اُس کے احکام سناتا ہے اور اُن کے نفوس کو پاک کرتا اور اُنھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور یقیناً اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے)

کلامِ الٰہی کی زبان میں مومن یا ایمان والے وہ لوگ ہیں جو حقیقت سے آشنا ہونے اور راہ رضا پر چلنے کے لئے بیتاب رہا کرتے ہیں وہی اس احسان کی قدر کر سکتے تھے اور وہی کلامِ الٰہی میں اس احسان کے مستحق قرار پائے۔ اور اُنہی کی خاطر گمراہ شدہ انسانیت کو وہ چراغ روشن میسّر آیا جس کو پھر طاغوتی طاقتیں بُجھا نہ سکیں۔ چنانچہ کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

یا ایھا النبی انا ارسلنک شاھداً و مبشراً و نذیراً۔ و داعیاً الی اللہ باذنہ و سراجاً منیراً۔

(اے نبی ہم نے آپ کو شاہد، خوش خبری دینے اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور اُس کے حکم کے بموجب آپ (لوگوں کو) اللہ کی طرف پکارنے والے اور ایک روشن چراغ ہیں)

یہ کس حقیقت کی شہادت تھی۔ یہ مژدہ کن انعامات کا تھا۔ یہ ڈرانا کن چیزوں سے تھا۔ کس صراطِ مستقیم کی طرف دعوتِ علم و عمل تھی۔ رسالت کی یہ نورانی شعاعیں کس نور کی جانب ذہنِ انسانی کو منتقل کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا جواب کلامِ الٰہی کا ہر ہر نکتہ اور سرورِ کائنات کی زندگی کا ہر ہر لمحہ دے گا!

یہ شہادت ارض و سما، ماہ و انجم، ثوابت اور سیارے، شمس و قمر یا کسی اور مادّی چیز کی نہ تھی جو نظرِ انسانی کو بارہا اپنا گرویدہ بنا چکی ہیں بلکہ یہ شہادت تھی اس حقیقت کی جس کی جانب قلوبِ انسانی پھرنے کو تیار نہ تھے۔ یہ شہادت تھی اس خالقِ ارض و سما کی جس نے متعدد عالم پیدا کر کے اُنھیں ایک نظامِ قدرت کے تحت منسلک کر دیا تھا۔ یہ شہادت تھی اس قادرِ مطلق کی جس کے حکم کے بموجب عالمِ امکانی کے ذرّہ ذرّہ نے ترتیب پائی تھی۔ یہ شہادت تھی اُس شاہدِ حقیقی کی جو اپنی تخلیق کی ہوئی ہر چیز کا خود شاہد تھا۔ اور یہی وہ شہادت تھی جو ایک پیکرِ صدق و صفا، ایک مجسمۂ خُلق و احسان، ایک معلمِ حکمت نے باوجود بے شمار مخالفتوں اور اذیتوں کے فاران کی چوٹیوں پر کچھ اس یقین اور ایمان کے ساتھ دی کہ کائناتِ عالم کا گوشہ گوشہ اس کی شہادت سے گونج اُٹھا۔

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔

(میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی ذات لائقِ عبادت نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں)

یہی وہ شہادت تھی جو سرورِ کائنات کے غلاموں نے ہر حال میں دی۔ تلواروں کی چھاؤں میں دی۔ دہکتے انگاروں پر دی۔ تپتی ریت پر خشک ہونٹوں سے دی۔ یہ ایک شاہد کا اندازِ شہادت تھا۔ جس نے ہر تشنۂ سعادت کو ذوقِ شہادت سے سرشار کر دیا تھا۔ یہ اُس حقیقت کی شہادت تھی جس پر افراد اور جماعت کی خودی کی تشکیل منظور تھی۔ اور اسی بنیادی اصول پر اقوامِ عالم کیلئے دعوتِ فکر و عمل تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہر قول وفعل سے یہ ثابت کرنا تھا کہ فلاح کے راستے اعترافِ حقیقت کے ساتھ عملی اقدام سے کھلتے ہیں۔ اور اگر صرف اسی ایک ذات پر کامل یقین رکھنے کے بعد خیر محض کے تابع رہ کر جد وجہد کی جائے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی فلاح کی راہوں پر منضبط ہو سکتی ہے۔ اور دُنیا اور دُنیا کے بعد کی سچی اور اصلی زندگی کی نعمتیں اور سعادتیں انسان کو میسر آسکتی ہیں۔ لیکن جب تک انسان اپنی خود ساختہ چیزوں کی پرستش میں لگا ہے۔ خواہ اس کی صورت مادّی ہے یا کسی اصولِ حیات کی شکل میں۔ وہ حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اسی بُنیادی نقطہ سے دعوتِ اسلام کا کام شروع ہوا۔ زندگی کا مقصد رضائے الٰہی کے لئے جدوجہد قرار پایا اور یہ دُنیا میدانِ عمل بن گئی!

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اگر افرادِ انسانی پر نظر ڈالیئے تو آپ کو دو ہی قسم کے لوگ ملیں گے:۔

(۱) ایک وہ جنہوں نے اس حقیقت کو ایسا ہی سمجھا جیسا کہ اس کے سمجھنے کا حق تھا اور اس پر عمل کرنا اپنے لئے فلاح و بہبود کا باعث تصور کیا۔ جنہوں نے اپنی زندگی کی تشکیل اسی کلمۂ توحید پر کی۔ جن کے پیشِ نظر زندگی کا پہلا اور آخری مقصد رضائے الٰہی کی تلاش رہی جو کسی زمانہ اور کسی حال میں، کسی مادّی یا اصولی الٰہ کی طرف نہ جُھکے۔ خواہ اس نے دُنیا کی نظروں کو کتنا ہی خیرہ کیوں نہ کر دیا۔ جنہوں نے مصیبت میں ثابت قدم رہ کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لیا، بیشک وہی لوگ ہیں جو بشارت کے مستحق قرار پائے اور پروردگارِ عالم کے برگزیدہ نبیؐ اُنہی کے لئے دین و دُنیا کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی بشارت لائے!

(۲) دوسرا گروہ وہ نظر آئے گا۔ جنہوں نے اس حقیقت کو جُھٹلایا۔ جنہوں نے اپنے مقاصدِ حیات آپ متعین کئے۔ اور زندگی کی بُنیاد ذاتی اغراض اور خود ساختہ اصولوں پر رکھی۔ گویا اپنی روزانہ کی ذہنی اور عملی جدوجہد میں اُنہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو گمراہ قرار پائے اور اُنہی کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کرنے اور ڈرانے کے لئے زمانہ کو ایک ڈرانے والے کی ضرورت پیش آئی۔

غرض خواہ نظرِ التفات کا مقصد بشارت ہو یا چشمِ عنایت کا منشاء اعمالِ مُضر کے نتائج سے ڈرانا ہو۔ دونوں ہی رحمتِ الٰہی کے وہ پرتو تھے جن کا مقصد خیر کی ترقی اور شر کا انسداد تھا۔ اور یہی وہ دعوتِ اسلام تھی جس پر اللہ کے اذن اور حکم سے بُلانے اور اسی معبودِ حقیقی کے نام پر زندہ رہنے اور جان دینے کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سراجاً منیرا بنا کر بھیجا گیا تھا۔ آپؐ کی زندگی کے ہر لمحہ میں اہلِ بصیرت کیلئے بے شمار تجلیاں موجود ہیں۔ یہاں وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ دُنیا کی مادّی آنکھوں نے وہ حقائق دیکھے جو کسی اور روشنی سے نظر نہ آسکتے تھے۔ دُنیا نے اسی روشنی سے اس نور کو سمجھا جس کے بارے میں کلام اللہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اللہ نور السمٰوات والارض ۔ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے!

ظاہر ہے کہ اس نور کی جمالیاتی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک ایسے ہی چراغ کی ضرورت تھی، جس کے افعال و اعمال میں ہمیں اسی اصل حقیقت کی روشنی نظر آئے۔ ہم ایک ایسی ذات کے محتاج تھے جو خود چراغِ ہدایت بن کر ہمیں صراطِ مستقیم پر گامزن کرے۔ جو انسانیت کو انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام سے آشنا کرے، اُس ذات کا تعلق اس معبودِ حقیقی سے ایک انتہائی فرمانبردار بندے اور رسولؐ کا ہے۔ "عبدہٗ و رسولہٗ" اور اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑی عزت اُسی کو سزاوار ہے!

اگر ہمیں آج بھی ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو ہماری معاشرتی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو اس انداز سے منضبط کرے کہ دین دُنیا کی فلاح ہمارا حصہ رہے تو ہمیں اسی سراجاً منیرا، اسی نورِ محمدیؐ کی نورانی شعاعوں سے بصیرت حاصل کرنے کے لئے مستعد ہو جانا چاہیئے۔ اگر ہم صرف زبان سے نہیں بلکہ دل سے آپؐ کے پیش کردہ اصولِ حیات پر ایمان رکھیں، اور عمل سے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیں تو رحمتِ الٰہی کی اتنی فراوانی ہو کہ شاید حسرتِ کوتاہیٔ داماں کے سوا اور کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے!

ڈاکٹر مصطفٰے سباعی (شام) ترجمہ:- ادارۂ "فاران"

مَنْ هُوَ الْمُسْلِمُ؟[1]

آج دُنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس کروڑ سے بھی زائد ہے اور وہ دُنیا کے بیشتر گوشوں اور حصّوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اُن کے بارے میں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ دُنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ طاقتور اور بھلائی کی طرف دُنیا کی قیادت اور رہبری کرنے والے ہوں گے! اس لئے کہ وہ دینِ مبین کے حامل اور اعلیٰ اخلاق کے وارث ہیں۔ اور جب سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو :-

"خیر اُمّۃ اُخرجت للناس......"

کا شرف بخشا ہے، اُن کے عالمِ انسانیت پر احسانات بھی ہیں۔!

مگر نظر کیا آ رہا ہے؟...... وہ پریشان اور منتشر ہیں۔ اُن کے ملک دوسروں کی جنگ و نزاع کی جولانگاہ بنے ہوئے ہیں۔ اُنکی خوشحالی لُوٹی جا رہی ہے۔ وہ تہذیب و تمدّن کے قافلہ سے بچھڑ کر بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ کل تک دُنیا اُن سے علم اور روشنی حاصل کرتی تھی اور وہ قوموں کے درمیان فیصلے صادر کرتے تھے اور دُنیا کو آزادی اور تنویرِ فکر کی دولت بانٹتے تھے!

آخر ایسا کیوں ہے؟؟ اس لئے کہ اسلام تو عزت (غلبہ) اور علم کا دین ہے اور بھلائی اور آزادی کے میدانوں میں سب سے پیش پیش رہنا اسلام ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔

مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور پستی کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ اُن کی اسلام سے دُوری ہے۔ اور حالت اب اس نوبت تک پہنچ چکی ہے کہ مسلمان اور اسلام جدا جدا منزلوں میں نظر آتے ہیں۔

جانتے ہو اسلام کی نگاہ میں "مُسلم" کون ہے؟

وہ جو دُنیا میں ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اُسے اور کوئی لائقِ بندگی نظر نہ آئے۔ جس نے نفسانی خواہشات کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہو۔ یہاں تک کہ اُسے زندگی میں مجد و فضیلت کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہ دے۔ وہ جو باطل سے آزاد ہو۔ یہاں تک کہ اُسے زمانہ میں "حق" کے سوا اور کوئی مقصود نظر نہ آئے!

"مُسلم" وہ ہے؟

جس نے دین اور دُنیا کو ایک جگہ جمع کر دیا ہو۔ اور جو دین میں عابد و زاہد ہو اور دُنیا کے کاموں میں پُوری طرح جد و جہد کرنے والا۔ جس کا عمل اپنے نفس اور دُوسرے لوگوں کے لئے ہو۔ اور جو اپنے نفس کے لئے نصیحت کرنے والا اور دُوسروں کے لئے دلیلِ رشد و ہدایت ہو۔ جس نے روح اور جسم کے درمیان وہ تعلق قائم کیا ہو جس کی بُنیاد صلح و خیر پر ہو اور جو زمین میں انسان ہو اور آسمان کا فرشتہ!

"مُسلم" وہ ہے؟

---

[1] مسلمان کون ہے؟ (اور کسے کہتے ہیں)

جس کی زندگی میں ایمان اور عمل و حرکت کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آئے۔ اور جس کے ایمان کے سامنے اُخوت اور محبت کے سوا اور کوئی شے نہ ہو اور جس کے عمل سے خود اُس کی ذات کو اور دُنیا کو نفع پہنچتا ہو۔

مُسلم وہ ہے؟

جس نے اللہ کی زمین کو بھلائی اور انصاف سے بھر دیا ہو۔ اور انسانی عقول کو علم و حکمت سے اور انسانوں کو رحمت و احسان سے معمور کر دیا ہو۔

مُسلم وہ ہے؟

جس کے دونوں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ حق سے مصافحہ کرتا ہو اور دُوسرا ہاتھ باطل کو دفع کرتا ہو۔ جس کی آنکھیں روشنی کو دیکھتی ہوں اور جس کے کان رشد و ہدایت پر لگے رہتے ہوں جس کے دونوں پیروں میں سے ایک پاؤں ہدایت کی طرف دوڑتا ہو اور دوسرا گمراہی کی طرف سے پھرا ہوا ہو۔ جس کے اخلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ظالموں پر احتساب اور سختی کرے اور دُوسری وہ کہ انسانوں کے ساتھ نرمی برتے۔

مُسلم وہ ہے؟

جو علم و فراست کا ثبوت دے، جہالت کی باتیں نہ کرے۔ جو زندگی کے میدان میں پیہم رواں دواں رہے اور ناامیدی کو پاس بھی نہ پھٹکنے دے۔ جو انصاف کرے تو اُس میں ذرہ برابر ظلم کو روا نہ رکھے۔ جو سراپا حُسن و اخلاص ہو اور ملاوٹ اور ہیر پھیری سے کام نہ لے۔ اور جو بات کرے تو جھوٹ نہ بولے اور لوگوں کے ساتھ اُس کی معاشرت اس طرح کی ہو کہ تمام لوگ اُس کی زبان اور ہاتھ سے امن و سلامتی میں رہیں۔

مُسلم وہ ہے؟

جس کا دل تمام انسانوں کے دلوں سے زیادہ پاک و صاف ہو۔ جس کا ضمیر سب سے زیادہ بیدار۔ جس کا نفس سب سے زیادہ تزکیہ یافتہ۔ جو سب سے زیادہ ہاتھ کا سچا۔ سب سے زیادہ سخاوت میں جلد باز۔ سب سے زیادہ عالم، سب سے زیادہ صادق القول اور عقوبت و محاسبہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا۔ اور سب سے زیادہ جنت اور ثواب کی رغبت رکھنے والا ہو۔

ایسا ہوتا ہے "مُسلم"۔ یہ ہے مُسلمان کی شان اور اس کی صفات۔ مگر مُسلمان ہیں کہاں؟

اے مسلم نوجوانو!

ظہور اسلام سے قبل فلسفیوں کے ذہن "مُسلم" کا خواب دیکھتے تھے۔ اور علم و حکمت کی کتابوں میں اُس کا ذکر تھا۔ اور ظہور اسلام کے بعد ایک وہ "حقیقت" تھا جسے زبانِ نبوت سے لوگوں نے سُنا۔ وہ ایک انسان تھا جو زمین پر قدسیوں کی پاکیزگی کے جلو میں چلتا تھا۔ وہ حرارتِ آفتاب کی مانند زمین کی روح اور جان اور نسیم صبح کی طرح نرم و لطیف تھا — اُس میں آندھیوں کی طرح قوت تھی اور اُس میں پھولوں کی مانند خوشبو تھی۔ اور ساتھ ہی وہ آفتاب کی طرح تھا جو سدا بلند ہی رہتا ہے، کبھی پست نہیں ہوتا۔ وہ ہوا جیسا تھا جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ مرنا جانتی ہی نہیں۔ وہ اُن ہواؤں کی مانند تھا جو مینہ برسانے والے بادلوں کو لئے ہوتی ہیں۔ وہ اُن پھولوں کی طرح تھا جو دلوں میں انتعاش پیدا کرتے ہیں اور آنکھوں کو فرحت بخشتے ہیں اور زندگی کو جمال و شگفتگی دیتے ہیں —!

یہ تھا وہ مردِ مومن کہ خود "زندگی" اُسے پیار کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اُس کا سب سے زیادہ پیارا فرزند تھا۔ اور انسانیت اُس سے محبت کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی سب سے زیادہ معزز اولاد تھی۔ اور دنیا کی قومیں اُس کو چاہتی تھیں کیونکہ وہ اُن کا سب سے زیادہ مخلص رہنما تھا ۔۔!

اور ...... آہ! ...... آج حیران انسانیت اُس حقیقت کی تلاش کر رہی ہے۔ مگر اُسے نہیں پا رہی ہے۔ اے مُسلم نوجوانو! آواز دو تم کہاں ہو؟؟ خدا کے لئے اس دُنیا میں پھر سے لوٹ آؤ اور زمین کے لئے بارش، ہوا، کھیتی، پھل پھول اور چاند، سورج بن جاؤ!

"الشہاب"

مُدیرِ فاران

کے نام

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج گرامی!

— جنوری ۵۷ء کے فاران میں "جماعتِ اسلامی کے نظریہ حدیث" پر جناب کا تبصرہ پڑھا۔ مجھے مسرت ہے کہ جناب نے اپنا ما فی الضمیر کھُل کر کہا اور پُوری جرأت سے کہا۔

— لیکن فاران کے صفحہ ۴۶ میں جناب نے جس خیانت یا مثلہ کی نسبت میری طرف کی ہے بحمد اللہ پُورے وثوق سے عرض کر رہا ہوں کہ میرا دامن اس سے آلودہ نہیں بلکہ وہ کاتب کی غلطی ہے جسے میری طرف منسوب فرمانے میں آپ نے ضرورت سے زیادہ جرأت فرمائی۔ آپ ایسا ذہین آدمی اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔

— تفہیمات حصہ اوّل سے جو اقتباس دیا گیا ہے، اُس کی اُوپر کی سطر اقتباس کا حصہ نہیں ہے کاتب نے غلطی سے اسے اقتباس کے ساتھ ختم کر دیا۔ اصل اقتباس "میں سمجھتا ہوں" سے شروع ہوتا ہے پہلی سطر مولانا کے خیالات کا اختصار اور ترجمانی ہے اسے میری گزارشات کے ساتھ لکھنا چاہیے تھا۔ یہ الفاظ مولانا کی عبارت میں کہیں یکجا نہیں۔ البتہ اُن کا مفہوم مولانا کے کلام میں ہے۔

— یہ سمجھنا مشکل نہ تھا مگر غصہ اور انتقام سے پیدا شدہ جذبات کے سامنے قوتِ فکر کی درماندگی بالکل قدرتی ہے۔ عفا اللہ عنک۔

— مجھے یہ قطعاً بدگمانی نہیں کہ آپ نے یہ عمداً کیا مگر قوتِ فکر سے یہ بے انصافی ضرور ہوئی کہ اسے عمل کا موقع نہیں دیا گیا۔ وما ھی باول قارورۃ کسرت۔ مجھے اپنی گنہگاری کا پُورا پُورا اعتراف ہے لیکن اس قسم کی خیانت کو لعنت سمجھتا ہوں۔ وما اُبرِی نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء۔

— مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کے اس تجزیہ کی ذمہ داری پرویز صاحب لیتے ہیں یا نہیں۔ اگر واقعی یہ تجزیہ درست ہے تو یہ مضحکہ خیز جہالت ہے، اسے گمراہی نہ سمجھنا علم و دیانت کے ساتھ ذلیل ترین مذاق ہے۔ کسی فرصت کے وقت اس کے متعلق مفصل عرض کرنے کا خیال ہے۔ "حرف گفتنی" میں اس بحث کا موقع نہ تھا نہ ہے۔ اس وقت مولانا کی ساری تحریرات پر تبصرہ پیشِ نظر تھا۔

وللناس فیما یعشقون مذاھب۔

— پرویز صاحب ۱۹۳۵ء میں حدیث کے منکر نہ تھے مگر اس کے متعلق جناب نے ان کا کوئی حوالہ نہیں دیا اس کے متعلق اگر کچھ معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔ جناب کی وسعتِ قلبی سے امید ہے کہ "فاران" میں اس عریضہ کو مناسب جگہ دے دیں گے۔ والسلام۔

(محمد اسمٰعیل مدرس چاہ شاہاں والا گوجرانوالہ)

مُدیر فاران :۔

● "فاران" میں ہم نے ہمیشہ اپنے مافی الضمیر کو کھل کر ہی ظاہر کیا ہے، ہم لگ لپیٹ سے بات کہنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس کو فاضل مکتوب نگار نے "جرأت" سے تعبیر فرما کر جو اظہارِ مسرت کیا ہے، اُس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کی داد و ستائش پر فریبِ نفس سے محفوظ رکھے!

● اگر جناب مولانا محمد اسمٰعیل مدظلہ کی کتاب (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث) میں کتابت کی غلطیاں رہ جائیں تو مدیر "فاران" اُسے کاتب کی غلطی سمجھ سکتا تھا۔ مگر اُس غریب کی ذہانت یہ فرض کس طرح انجام دے سکتی تھی کہ مولانا مودودی کی اصل عبارت کے اقتباس کی "کتر بیونت" کی ذمہ داری بیچارے کاتب کے سر ڈال دے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی اس کتاب کا کاتب یا تو موصوف کا انتہائی مزاج شناس واقع ہوا ہے یا پھر اُسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے حد درجہ کا عناد و عداوت ہے کہ اُس نے جان بوجھ کر مودودی صاحب کی اصل عبارت میں اس طرح تصرف کیا کہ مصنف کے وارد کئے ہوئے اعتراضات کو تو تقویت پہنچ گئی۔ اور مودودی صاحب کو مطعون اور بدنام کرنے کی سبیل نکل آئی۔ پھر حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب قبلہ کو اپنے کاتب پر اس قدر اعتماد ہے کہ نہ تو اُس کی لکھی ہوئی کاپیوں کی تصحیح فرمائی اور نہ کتاب کے پروف کو پڑھا۔ ؏

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

"تصنیف و کتابت" کا ایک "اعجوبہ" ہے، جو پہلی بار ہمارے علم و اطلاع میں آیا ہے!

● اگر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے بقول یہ کاتب کی غلطی اور فروگزاشت ہے کہ اس نے مصنف کی تحریر کے ایک جملہ کو مودودی صاحب کی اصل عبارت کے اقتباس کے ساتھ درج کر دیا — مگر اس کا تو خود مولانا موصوف اس اپنے مکتوب گرامی میں اعتراف فرما رہے ہیں کہ :۔

"اصل اقتباس "میں سمجھتا ہوں" سے شروع ہوتا ہے۔"

تو اس ایک ابتدائی جملہ (تیسرا گروہ حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں فرق کرتا ہے) کو چھوڑ کر "میں سمجھتا ہوں" سے لے کر اقتباس کے آخری لفظوں (نہیں پہنچتی) تک کے اقتباس کی ذمہ داری کا مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اقرار ہے!

اس پورے مقدمہ کو ذہن میں رکھ کر ان اقتباسات کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمایئے :۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے اپنی کتاب میں مولانا مودودی کی تحریر کے جس اقتباس کو درج فرمایا :۔

"میں سمجھتا ہوں کہ چودھری (غلام احمد پرویز ایڈیٹر طلوعِ اسلام) صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور میں ابتداء ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اُن کا مسلک حق سے بہت زیادہ قریب ہے اگرچہ تھوڑی سی غلطی اس میں ضرور ہے۔ لیکن الحمد للہ کہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچتی۔"

(تفہیمات حصہ اول، طبع چہارم ص ۲۳۵-۲۳۶)

مولانا مودودی کی اصل عبارت :-

"ایک تیسرا گروہ ہے جو رسول کی حیثیتِ رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصّہ پر حاوی سمجھتا ہے۔ اخلاق، معاشرت، معاملات، احکامات و قضایا اور بہت سے معاملات میں اس کے قول و فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں اُمّت کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں۔ مگر وہ حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیتِ رسالت سے خارج ہیں اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں بیّن امتیاز کردیتا ہو۔ اور ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچکر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں چودھری صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور میں ابتداء ہی میں یہ امر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ان کا مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے اگرچہ تھوڑی غلطی اس میں ضرور ہے۔ لیکن الحمد للہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچتی!"

ہم ناظرین "فاران" کے جذبہ انصاف سے پھر اپیل کرتے ہیں کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے مودودی صاحب کی اصل تحریر سے جس آخری ٹکڑے کو علیحدہ فرما کر اپنی کتاب میں درج کیا ہے، کیا اس سے مودودی صاحب کی تحریر کا مفہوم بالکل اُلٹ نہیں جاتا اور جن لوگوں نے مودودی صاحب کی اصل کتاب نہیں پڑھی اور پڑھی ہے تو انہوں نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے دیئے ہوئے اقتباس پر اعتماد کر کے اصل تحریر سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کیا وہ اس گمراہ کن مغالطہ میں مبتلا ہونے سے کسی طرح بچ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب "طلوعِ اسلام" کے ایڈیٹر مسٹر غلام احمد پرویز کے "مسلک انکارِ حدیث" کو حق سے بہت زیادہ قریب جانتے ہیں ——— افسوس!

پھر مولانا مودودی کی اسی کتاب میں، جس سے یہ اقتباس لیا گیا ہے، اسی مقالہ کے آخر میں ۱۹۳۵ء بھی مرقوم ہے۔ کہ مولانا مودودی صاحب کا یہ مضمون آج سے اکیس ۲۱ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو بھی چھپا دیا گیا ہے!

- مدیر "فاران" پر "قوتِ فکر کی درماندگی" "غصّہ اور انتقام" کی یہ پھبتیاں کیا "جماعتِ اسلامی کے نظریۂ حدیث" کے مصنّف کی لغزش کو ہلکا کر سکتی ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ مدیر "فاران" کو "غلطی کا مرتکب" فرض کر کے مولانا نے ازراہِ کرم اپنی طرف سے معافی کا پروانہ بھی عنایت فرما دیا —— خیر! مولانا موصوف نے مجھے معاف فرما دیا۔ شکریہ! میں بھی اُن کی طنز و تعریض پر اُن کو "عفا اللہ عنک" کہتا ہوں! مگر مودودی غریب کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اُسے کون معاف کرے گا؟؟

- حضرتِ والا! میں نے آپ کی کتاب پر جو تنقید کی تھی تو میں کسی ذہول و نسیان میں خدانخواستہ مبتلا نہیں ہو گیا تھا۔ میں نے بصحت ہوش و حواس اپنے کامل ارادہ کیساتھ وہ "تبصرہ" کیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی اصل عبارت میں "کتر بیونت" آپ فرماتے ہیں۔ اور میں اُسے ظاہر کرتا ہوں تو اس اظہار واقعہ اور انکشافِ حقیقت کو میری قوتِ فکر کی بے انصافی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ع

بندہ پرور! منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر!

آپ آخر کس "خیانت" سے اپنی برأت کا اظہار فرما رہے ہیں۔ جبکہ آپ کو خود اس کا اقرار ہے کہ مولانا مودودی کی اصل

عبارت کا صرف وہ حصہ آپ نے بطور اقتباس درج فرمایا ہے، جس سے مولانا مودودی پر یہ تہمت لگتی ہے کہ وہ پرویز کے موجودہ مسلک انکارِ حدیث کو حق سے قریب سمجھتے ہیں۔

آپ نے مولانا مودودی کی تحریر کا ادھورا اقتباس جو اپنی کتاب میں درج کیا ہے، وہ اس نیت سے اور اسی غرض کیلئے درج کیا ہے کہ آپ کے وارد کئے ہوئے اعتراضات کے درست اور وزنی ہونے کے لئے مودودی صاحب ہی کی تحریر سے دلیل مل جائے!

آپ "خیانت" کو لعنت سمجھتے ہیں تو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ہر مسلمان کے نزدیک "خیانت" مبغوض اور ملعون ہی ہے۔ مگر آپ نے مولانا مودودی صاحب کی تحریر کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اُسے آخر کس لفظ، صفت، اصطلاح اور تعریف سے منسوب کیا جائے۔ خاکسار نے اپنے تبصرے میں "کتربیونت" کا لفظ استعمال کیا ہے، "خیانت" کا لفظ تو آپ نے تحریر فرما کر ذہن کو اس طرف متوجہ فرمایا ہے!

- یہ تو پرویز صاحب ہی کو معلوم ہوگا کہ مودودی صاحب کے اس تجزیہ کی ذمہ داری وہ لیتے ہیں یا نہیں؟؟ اب رہا یہ کہ اس "تجزیہ" کو گمراہی نہ سمجھنا بقول آپ کے علم و دیانت کے ساتھ ذلیل ترین مذاق ہے — تو آپ جب اس پر اظہارِ خیال فرمائیں گے اُسے پڑھ کر ہی کہا جاسکیگا کہ کس کا کیا موقف ہے؟
- حیرت ہے کہ آپ منکرینِ حدیث کا رد فرماتے ہیں۔ اور اُن کے لیڈر مسٹر پرویز کے حالات سے واقف تک نہیں ہیں کہ اس شخص نے کس تدریج کے ساتھ "انکارِ حدیث" کیا ہے! اگر کہیں سے "طلوعِ اسلام" کے پُرانے فائل آپ کو دستیاب ہوسکیں تو آپ پر حقیقت واضح ہوجائے گی۔
- آپ کے حکم کی تعمیل میں آپ کے گرامی نامہ کو "فاران" میں درج کردیا گیا۔ اپنی گزارشوں کے بارے میں یہ عرض ہے کہ آپ کی طرف سے "جواب الجواب" کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے خوف ہے کہ آپ کے اس مکتوب کی طرح آپ کا مؤقف اور زیادہ کمزور نہ ہوجائے۔

والسلام مع الاحترام۔

طالبِ دعا — ماہر القادری

مدیر "فاران"

پروفیسر الیاس برنی
(حیدر آباد۔ دکن)

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

صدیق دیندار چن بسویشور

یک نہ شد ۲ دو شد

[ماہ فروری کے "فاران" میں زاہد صدیقی صاحب کا مضمون (بے نقاب) پڑھ کر جناب پروفیسر محمد الیاس برنی نے ایک مختصر مقالہ مرتب فرمایا اور اسے "فاران" میں اشاعت کیلئے بھیج دیا۔ اس نوازش بے طلب کیلئے ہم صاحب موصوف کے سپاس گزار ہیں۔ اس مضمون کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھئے اسے ہم اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتے کہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آگئی ہے اور اب کسی مزید کتابی حوالہ اور شرح وبیان کی ضرورت باقی نہیں رہی!

صدیق دیندار چن بسویشور کے اقوال پڑھ کر غیرت ایمانی لرز لرز جاتی ہے، اس شخص کے ہفوات کو مجذوب کی بڑ کہنا۔ گویا ان ہفوات کی شان کو بڑھانا ہے اور یہ معاملہ صرف ہفوات اور کذب و باطل کی حد پر پہنچکر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس شخص نے کہیں کہیں تو کھل کر کفر بکا ہے! اور یہ دیکھ کر کہ ایسے ہوائی ہناتی لوگوں کو بھی کچھ عقیدت مند اور مقلد مل جاتے ہیں۔ شیطان کی چالوں کی کامیابی کو ماننا پڑتا ہے (اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم)

انسانی تاریخ میں وہ دن کتنا منحوس تھا جس دن مرزا غلام احمد قادیانی نے جنم لیا تھا۔ اس شخص نے اپنے خود ساختہ "علم کلام" سے کتنے "مسیلمہ کذابوں" کے ظہور کیلئے راہ ہموار کر دی ہے۔ دین وایمان کا یہ کتنا عظیم فتنہ تھا۔ جو "قادیان" سے ظاہر ہوا اور جس نے کفر وارتداد کی راہ کھول دی۔ اُن سادہ لوح مسلمانوں کو احتیاط، توسع اور رواداری کا شیطان نے فریب دے رکھا ہے جو اس کھلے ہوئے کفر وارتداد کو صرف "گمراہی اور ضلالت" کہہ کر رہ جاتے ہیں اور اپنی اس روش پر ناز بھی فرماتے ہیں کہ وہ اس طرح ملتِ اسلامیہ کو پراگندگی اور تشتت سے بچا رہے ہیں! خوب!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

ہمارے پاس "دیندار جماعت" کے کسی رکن یا متوسل کا ایک خط آیا تھا کہ وہ "بے نقاب" کے جواب میں "نقاب پوش" کے عنوان سے کوئی مقالہ ترتیب دے کر "فاران" میں اشاعت کیلئے بھیجنا چاہتے ہیں! اُن کی اور اُن کے دوسرے بھائی بندوں کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ "بے نقاب" اور "یک نہ شد دو شد" — ان دونوں مقالوں کے جواب کی بس یہی دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ — یا تو ان کتابوں کو جو چن بسویشور کی لکھی ہوئی ہیں

جعلی اور موضوع ثابت کیا جائے یا پھر "دیندار جماعت" ان ہفوات اور کفریات سے اپنی برأت کا کھل کر اعلان کرے! اب رہا جواب اور تردید و تاویل تو ایسی باتوں سے یہ نجاست اور زیادہ پھیل جائے گی! قادیانی یہ کھیل کھیل کر دیکھ چکے ہیں۔ نام نہاد "دیندار جماعت" بھی اپنے موقف کی حمایت کیلئے یہی لائین اختیار کرے گی تو "بناء فاسد علی الفاسد" کی مکروہ تاریخ کو دہرائے گی! کوئی ہٹ دھرمی پر ہی اُتر آئے تو اپنی لفظوں اور عقلی موشگافیوں سے "شیطان" کو "خاصانِ خدا" میں شامل کرنے کیلئے دلیلیں لا سکتا ہے اور ان دلیلوں کی ایک کتاب بن سکتی ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" ٹھہرانے پر مکمل "علم کلام" تصنیف کر ڈالا مگر ان لغویات کا وزن کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دین و ایمان کے ہر فتنے سے محفوظ رکھے۔ (م۔ق)

تعارف

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی جو تحریک "احمدیت" کے نام سے جاری کی اور جو آجکل بالعموم "قادیانیت" کہلاتی ہے احمدیت کے نام سے دھوکا دیتی ہے۔ اس تحریک میں ایک صاحب صدیق حسین نے بھی شرکت فرمائی اور بڑا کمال دکھایا کہ گویا آپ شریکِ غالب بن بیٹھے۔ حتیٰ کہ خود مرزا قادیانی ان کے ذیل دار قرار پائے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کتاب "دعوۃ الی اللہ":-

"الداعی۔ تقدس مآب حضرت قبلہ مولانا صدیق دیندار چن بسویشور یوسف موعود سردار آخرین۔ جو باہتمام اراکین دیندار انجمن رزاقی پریس مغل پورہ میں طبع ہو کر ربیع آخر ۱۳۵۹ھ ہجری میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔"

یہ کتاب گویا چن بسویشور تحریک کی سنگ بنیاد ہے اور اس کے سوا جو کتابیں بانیٔ تحریک اور اس کے مریدوں کی طرف سے شائع ہوئیں۔ وہ اس کی تفصیل و تصدیق ہیں۔

قادیانیت کے پہلو بہ پہلو یہ تحریک بھی ہندوستان و پاکستان میں پیر پھیلا رہی ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ "قادیانیت" کی طرح اس کی حقیقت بھی کھول دی جائے، مدّت سے احباب کا تقاضا تھا۔ بالآخر ماہنامہ "فاران" کراچی کی تحریک پر یہ خلاصہ تیار ہوا۔ جس میں مسلمانوں کے انتباہ کے خیال سے بطور نمونہ چند اقتباسات کتاب "دعوۃ الی اللہ" کے پیش ہیں۔ عبارت کی خامی خود اس کی خصوصیت ہے۔ جو صاحب چاہیں پوری کتاب ملاحظہ فرمائیں۔ شاید اس کی دستیابی دشوار ہو۔ تاہم اراکین دیندار انجمن حیدر آباد اس کے ناشر ہیں۔ اس کی سر براہی ان کے ذمہ ہے!

خدا رسی کیلئے شرط لازم

"بعد حمد و نعت کے میں (یعنی صدیق دیندار چن بسویشور۔ للبرنی) تمام بنی نوع انسان خصوصاً مسلمانوں کو جن کی گردن پر تبلیغ کا جوا ہے، وہ کسی صورت سے نکل نہیں سکتا۔ اس کتاب (دعوت الی اللہ) کے ذریعہ سے مطلع کرتا ہوں کہ کوئی گروہ اور کوئی فردِ واحد موجودہ زمانہ میں اللہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ جب تک وہ مجھ میں فنا نہ ہو۔ یہ میرے منہ کی بات نہیں ہے۔ یہ تو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔ لاکھ لاکھ درود اس ذات احدیت مآب پر۔ سولہ سال پیشتر آپ نے اس فقیر کی رویا میں تشریف لا کر اس فقیر کو یہ مرتبہ عطا فرمایا سُننے والوں کو یہ بات شاق گزرتی ہو گی — خفگی اور برہمی کی کوئی بات نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ کوئی تعلّی اور فخر نہیں۔ کوئی خود غرضی و خودنمائی نہیں۔ ایسے مقام والے وجود انسان ہی ہوتے ہیں۔" (ص۲۔ دعوۃ الی اللہ)

(حاشیہ برنی) لیکن بنظر تعلقات کم از کم میاں محمود احمد خلیفہ قادیان کو تو اس شرط سے مستثنیٰ کرنا چاہیے تھا۔

مزعومہ شان کی مزید تفصیلات قادیانی کتب مثلاً تریاق القلوب۔ تبلیغ رسالت اور قادیانی اخبار "الفضل" قادیان میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔ نیز ان کا ایک مجموعہ ہماری کتاب "قادیانی مذہب" کی فصل ۱۵ میں بھی درج ہے۔ اس شان کے سامنے صدیق

دار چن بسویشور صاحب کی بیشتہ شان ماند معلوم ہوتی ہے اور ظاہری آثار میں بھی یہی تناسب نظر آتا ہے۔ اس کا لحاظ رہتا تو
سب تھا۔

اللہ کا مظہر

"یہ کُل بے نوری اور خدا سے دُوری اس وجہ سے ہے کہ انفرادیت اور انتشار کی حالت والا تقسیم نعمت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ وہ جامع الناس دین کا مالک قیامت قایم کرنے والا، حشر برپا کرنے والا تیسری دفعہ (لا تثریب علیکم الیوم) کہنے کے لئے یوسفؑ کے لباس میں جیل بھگتا ہوا۔ بیڑیاں پکڑا ہوا، ثور کے بطن سے صدیق عمونایل نام پر زمین و آسمان کے ۹۶ نشانوں کی شہادت کے ساتھ جسمانی اور اخلاقی ۵۶ نشانوں کے ساتھ غیر کی صورت ظاہر ہوا ہے۔ یہ کامل متبع رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرکے "ان الذین یعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم" کی بشارت کے ساتھ دوبارہ شانِ اسلام کو دنیا کے کناروں تک پہنچانے کے لئے کامل بشارتوں کے ساتھ "اللہ کا مظہر صدیق دیندار چن بسویشور" آیا ہے۔ اب اس کی صحبت میں حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتے ہیں۔" (ص۲ دعوۃ الی اللہ) — (چن بسویشور صاحب سزا یافتہ ہیں۔ جیل اور بیڑیوں کا اسی طرف اشارہ ہے۔ للبرنی)

(حاشیہ برنی) اللہ کا مظہر بنانے کی ترکیب چن بسویشور صاحب کو ٹھیک معلوم نہیں۔ ٹھیک ترکیب مرزا قادیانی صاحب کی زبانی میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کی شان میں سنئے۔ وھو ھذا۔" فرزند دلبند گرامی ارجمند مظہر الاول و الآخر مظہر الحق والعلا کہ ان اللہ نزل من السماء" (تبلیغ رسالت جلد اول ص۵۹) سچ تو یہ ہے کہ چن بسویشور صاحب مرزا قادیانی صاحب کی ہزار نقل اُتاریں۔" مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!"

نعوذ باللہ منک

"حدیث رویت اللہ میں آیا ہے کہ اللہ محشر کرنے آئے گا، وہ غیر کی صورت میں رہیگا۔ اس سے مراد یہ کہ اللہ غیر مسلم کے نام و لباس سے آئے گا۔ یعنی چن بسویشور کے نام سے آئے گا۔ مسلمان "نعوذ باللہ منک" کہیں گے۔ واقعی میرے دعوے چن بسویشور پر مسلمانوں نے بدعقیدہ اور گمراہ سمجھ کر "نعوذ باللہ منک" کہا۔ پندرہ سال کے بعد اب اُن کے امام اور احمدیوں کے موعود یوسف کی صورت میں ظاہر ہورہا ہوں۔ اس سے خوش ہیں۔ اب ضرور "انتوبنا" کہیں گے (ص۱۴ دعوۃ الی اللہ)۔ (اس نکتہ کو قادیانی صاحبان بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا یوسف موعود کون ہے۔ للبرنی)

قادیانیت کا جواب

"اسلام کے آخری خلیفہ مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی۔ للبرنی) نے آخری فرقہ بنایا (احمدی یعنی قادیانی۔ للبرنی) اس طرح دین قیم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ...... چونکہ پھل اپنی شاخوں کا مصدق ہوتا ہے لہذا وہ آخرین کا سردار (صدیق دیندار چن بسویشور۔ للبرنی) جملہ فرقہ ہائے اسلام کی تصدیق کرنے والا ہونا ضروری ہے، جس طرح اولین کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری فرقہ کے سردار مسیح ناصری کی تصدیق کرنے پر آپ کی قوم نے آپ پر تالیاں بجائی تھیں اور کہا تھا کہ یہ عیسائی ہوگیا ہے۔ اسی طرح آخرین کے سردار کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ آخری فرقہ کے سردار مسیح موعود (مرزا قادیانی۔ للبرنی) کی تصدیق کرنے پر اس کی قوم تالیاں بجائے اور کہے کہ یہ (صدیق دیندار چن بسویشور۔ للبرنی) احمدی (قادیانی) ہوگیا ہے (ص۶ دعوۃ الی اللہ)۔ (آخرین کے سردار اور آخری فرقہ کے سردار کا فرق جدت میں قابلِ داد ہے خوب راہ نکالی۔ للبرنی)

قادیانی تعلقات قدیم

"غرض یہ کہ یوسف موعود (صدیق دیندار چن بسویشور۔ للبرنی) اُس وقت موجود تھا جس وقت جماعتِ قادیان اور جماعتِ لاہور کی مخالفت کا بازار گرم تھا۔ جس نے مئی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۲ء تک یعنی تقریباً آٹھ سال

بہترین سرگرم مبلغ بن کر مرزا صاحب (قادیانی - للبرنی) کی محبت میں کام کیا (محبت میں کیا کلام ہے - للبرنی) تقریباً تمام اضلاع پنجاب کے احمدی جماعتوں کا دورہ کیا - اس زمانہ میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ اس قدر جوش صدیق (دیندار چن بسویشور - للبرنی) میں کیوں ہے - اس راز کا علم خود صدیق کو بھی نہیں تھا (البتہ بعد کو راز کھلا - للبرنی) جب صدیق کی چالیس سال کی عمر پہنچی یعنی ۱۹۲۴ء میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے بشارت دی کہ "اے یوسف! تو ہی چن بسویشور ہے"۔ پھر الہام ہوا "یوسف ہے با صدیق"۔ غرض بار بار یوسف اور صدیق کا نام الہامات میں آنے لگا (فہو المراد - للبرنی)۔ (ص۴۳ دعوۃ الی اللہ)

قادیانیوں کی عقیدت

"اہلِ بصیرت کے لئے میرا دعویٰ سورج کی طرح روشن ہے - سعید ارواح کو جب میری خبر پہنچ جاتی ہے تو سرِ تسلیم خم کرتے ہیں - آمنا وصدقنا کہتے ہیں - حسب ارشاد مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی - للبرنی) سلسلہ احمدیہ کے بڑی عمر پانے والوں میں سے جن لوگوں نے میری تصدیق کی ہے اُن میں سے مشہور اور ذی اثر اشخاص کے چند نام ذیل میں دیئے جاتے ہیں:-

(۱) زبدۃ الحکماء مرزا خدا بخش صاحب مصنف عسل مصفیٰ نے میری تصدیق کی - (ص۵۶ دعوۃ الی اللہ)

(۲) سلسلۂ احمدیہ کے دوسرے مشہور ذی اثر ایثار میں مشہور انسان ڈاکٹر سید حسین شاہ صاحب جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ لاہور ہیں - شاہ صاحب نے کہا کہ "میں نے سنا ہے کہ آپ کا دعویٰ مصلح موعود کا ہے - میں نے کہا - ہاں - کہا میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں - اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہوں ...... میں آپ کے اصول و عقائد کو امت مرحومہ کے لئے باعث برکت سمجھتا ہوں"۔ میں نے مولوی محمد علی صاحب (امیر قادیانی جماعت لاہور - للبرنی) کو بھی آپ کی نسبت میرے ہم عقیدہ پایا ...." (ص۵۷ دعوۃ الی اللہ)

(اس سلسلہ میں بعض دیگر مستند قادیانی صاحبان کی بھی عقیدت مندی درج ہے - للبرنی)

خلیفۂ قادیان

"اولیاء اللہ دکن نے آج سے تقریباً آٹھ سو سال پیشتر فیصلہ کیا ہے کہ خلیفہ قادیان کے عقاید غلط رہیں گے - وہ اس طرح کہ میاں محمود احمد صاحب کو "ویر لبنت" کہا گیا ہے اور "دیر لبنت" کے متعلق لکھا ہے کہ وہ غلط عقائد پھیلاتا رہیگا - اس کے عقائد کی اصلاح کے لئے چن بسویشور آئے گا" (ص۵۴ دعوۃ الی اللہ)

(حاشیہ برنی) لیکن عقائد کی کیا اصلاح کی - کچھ معلوم نہ ہوا - البتہ یہ کیا کہ خلیفہ قادیان سے اپنے آپ کو بڑھا دیا - بلکہ مرزا قادیانی سے بھی بڑھا دیا کہ بقول خویش مرزا صاحب آخری فرقہ قادیانی کے سردار تھے اور خود آخرین کے سردار بنے - جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولین کے سردار تھے - ع

بربیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجاست!

قادیانی اختلافات

"عیسائیوں کے آپس کے اختلافات کا فیصلہ آسمانی محکمہ سے ہوا - احمدیوں کے آپس کے اختلافات کا فیصلہ بھی آسمانی حکم یوسف موعود (صدیق دیندار چن بسویشور - للبرنی) سے ہی ہوگا جس کی آمد کو قرآن کریم اور احادیث اور بشارات مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی - للبرنی) اور بشارات اولیاء اللہ دکن اور خود یوسف موعود کے الہامات میں اللہ کا آنا کہا گیا ہے - "ما اختلفتم فیہ من شئ فحکمہ الی اللہ"۔ (ص۵۳ دعوۃ الی اللہ)

لنگایت اور قادیانی

"اس وقت میں اپنے موعود کی منتظر جماعتوں یعنی "لنگایت" اور "احمدیوں" میں پوری طاقت سے جو پیش ہو رہا ہوں - وہ بھی ایک بشارت کی بنا پر ہے - اس میں کامیابی دکھائی گئی ہے - اس میں

یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ "لنگایت" ہندوؤں میں اور "احمدی" مسلمانوں میں یہ دونوں ہر حیثیت سے زبردست جماعتیں ہیں۔ ان کی توجہ بڑے زوروں سے خصوص ہندوستان کے مختلف مذہبوں کی طرف ہونی چاہیئے۔" (ص۴۵ دعوۃ الی اللہ)

دو کتابیں

"اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں میں نے ایک کتاب "خادم خاتم النبیین" لکھی، جو اس کتاب کا مقدمہ تھا جس کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۵۸ - ۵۹ پر ہے۔ اس زمانہ سے اب تک ۲۵۷ - ۴ الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کلام کیا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث سے بھی اس دعوے کا تاریخی، قدرتی و شہادتی ثبوت ملا۔ یہ کتاب "دعوۃ الی اللہ" سنت انبیاء کے مطابق "انی مغلوب فانتصر" کے زمانہ میں لکھی جا رہی ہے۔" (ص۴۴ دعوۃ الی اللہ)

مسیح گر اور اسکی خانقاہ کے کمالات

(الف) "جب بشارت گمنام مقام سے اہیوں میں ایک ایسی طاقت (صدیق دیندار چن بسویشور۔ للبرنی) کو کھڑا کیا گیا جو مسیح گر ہے (یعنی مسیح بناتا ہے۔ مثلاً زرگر۔ آہنگر۔ للبرنی) اور وہ وجود رسولوں کو جمع کرنے والا ہے۔ جس کی خانقاہ میں وارث انبیاء پیدا ہوتے ہیں۔ مریم بن کر آ بیٹھتے ہیں۔ مسیح بن کر نکلتے ہیں۔ چوتھے آسمان سے ساتویں آسمان تک سیر کرائی جاتی ہے۔ (پہلے تین آسمان کی سیر کیوں ترک کی جاتی ہے۔ شاید وہاں کوئی سیر کی چیز نہ ہو۔ للبرنی) کوئی نوح علیہ السلام اور کوئی ابراہیم علیہ السلام ہے۔ کوئی یحییٰ اور کوئی نارو ہے۔ کوئی موسیٰ علیہ السلام اور کوئی جامع جمیع کمالات کا خطاب پایا ہوا ہے۔ کوئی ہر لیا اور کوئی بسویشور اور کوئی نرسمہیون ہے (حتیٰ کہ خود چن بسویشور ہیں۔ للبرنی) چونکہ اولین میں یہ روحانیت تھی، آخرین میں بھی وہی روحانیت ہے، تاکہ مماثلت پوری ہو۔ کیا دنیا میں ایسا کوئی شخص ہے کہ جس کی خانقاہ کا یہ حال ہو۔ کیا کوئی روحانیت کے دعویدار گدی نشین کو "مسیح گر" ہونے کا دعویٰ ہے۔ (خدا نخواستہ۔ للبرنی) کیا ان کی خانقاہوں میں مثیل انبیاء پیدا ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہر گدی اور خانقاہ کا رخ زمین کی طرف ہے (ص۳ دعوۃ الی اللہ)۔ (لیکن قادیانی گدی اور خانقاہ کی بابت کیا ارشاد ہے؟ للبرنی)

(ب) "حدیثوں میں بشارت ہے کہ ہر دور نسل انسانی مسلم میں تین سو اٹھارہ (۳۱۸) قلب انبیاء ماسبق کے رہتے ہیں۔ قرن اولیٰ میں ان کا مجموعہ تھا۔ فیج اعوج کے زمانہ میں بوجہ فرقہ بازی قلوب منتشر تھے۔ قرن آخری چونکہ حشر کا زمانہ ہے۔ اس وجہ سے وہ تمام قلوب انبیاء ماسبق آخری امیین کی صورت میں خانقاہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم حیدر آباد دکن میں جمع ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کے سردار صدیق (دیندار چن بسویشور۔ للبرنی) کی پیدائش کا مقام اس ریاست میں ہے (مقام کا نام ظاہر نہ کرنے میں کیا مصلحت ہوگی۔ للبرنی) یہ شہر جامع جمیع کمالات ہے اور جلال و جمال کا کافی سامان یہیں ہے۔" (ص۱۰ دعوۃ الی اللہ)

(ت) "آخرین کے سردار صدیق دیندار (چن بسویشور۔ للبرنی) کی صحبت سے کئی مثیل انبیاء بنے اور بن رہے ہیں جو خانقاہ میں زندگی وقف کر کے بیٹھتا ہے۔ وہ مریم بن جاتا ہے۔ جب وہ میدان میں نکلتا ہے تو مسیح بن کر نکلتا ہے۔ اس طرح مردوں کو زندہ کرنے والے ہماری خانقاہ سے نکل رہے ہیں۔ گونگے بول رہے ہیں۔ جن کو اللہ نے یحییٰ۔ نوح اور موسیٰ پکارا وہ بھی میرے بیعت کردہ ہیں اور قاسم صاحب جن کی مماثلت "نوح" کی ہے وہ بھی میری بیعت میں ہیں ...... الخ (ص۱۹ دعوۃ الی اللہ)

(ث) "صراط الذین انعمت علیہم" کی دعا یہاں سنی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے نبیوں کو نہیں دیکھا ہے وہ آئے یہاں دیکھے۔ ہر بات کا آرام و اطمینان یہاں ہے۔ بہشت یہاں ہے۔ مقربان یہاں ہیں۔ گلشن اولیاء یہی ہے۔ یہاں سب سے بڑی نعمت خدا کا دیدار ہے۔ اے طالبان حق آؤ۔ اے عاشقان رسول آؤ۔ اے محبان علیؓ آؤ۔ بڑے انتظار کے

بعد یہ روحانی دربار کھلا ہے۔ اپنے وقت مقررہ پر کھلا ہے۔ نشانات دیکھ کر برکات دورِ آخرین سے فیضیاب ہو جا ——
وما علینا الا البلاغ۔ صدیق دیندار چن بسویشور۔ (ص ۹۴ دعوۃ الی اللہ)

تبصرہ برنی | مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ صدیق دیندار چن بسویشور کے دعووں میں کس درجہ یک رنگی ہے کہ گویا ع
آں بادہ صبا ایں ہمہ آوردہ تست

تاہم مرزا قادیانی کو صرف آخری فرقہ کا سردار قرار دے کر اپنے آپ کو اس طرح آخرین کا سردار قرار دیا ہے، جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین کا سردار بتایا ہے۔ پس مرزا قادیانی پر خود اپنی فوقیت کا ادعا صاف ظاہر ہے اور رسول اللہ کے ساتھ تقابل سردار اولین و سردار آخرین کے حوالہ سے ظاہر ہے!

فاعتبروا یا اولی الابصار!

حبیب احمد صدیقی
ایم اے، ایل ایل بی۔ لکھنؤ

نعتِ مصطفےٰ

سرچشمۂ علم و یقیں ہے ذاتِ پاک مصطفےٰ
اسرارِ عالم کی امیں ہے ذاتِ پاک مصطفےٰ

حق آشنا و حق نما آئینۂ صدق و صفا
توحید کی شمعِ مبیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

جس کی تمنا جانفزا جس کا تصور غم رُبا
وہ مدعائے دل نشیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

اِک پیکرِ مہر و وفا۔ غمخوارِ دیارِ بے نوا
تسکیں دہِ قلبِ حزیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

کردار میں حُسنِ عمل، گفتار میں حُسنِ محل
تہذیبِ انساں کی امیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

دل میں لئے صدہا گماں تھے منتظر اہلِ جہاں
تعبیرِ صد خوابِ حسیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

اک مظہرِ انسانیت، پیغمبرِ وحدانیت!
سرمایۂ دنیا و دیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

با ایں وقار و برتری اقرارِ عجز و بندگی
کیا لائقِ صد آفریں ہے ذاتِ پاک مصطفےٰ

جس کا لقب خیر البشر جس کی شفاعت معتبر
وہ رحمۃ للعٰلمیں ہے ذاتِ پاکِ مصطفےٰ

☆

اسد ملتانی

نکتۂ توحید

اک حُسن رہے پیشِ نظر، دید یہی ہے
اس دید سے مسرور رہیں، عید یہی ہے

ہر حال میں حاصل رہے یکسوئی خاطر
انسان کے لئے دولتِ جاوید یہی ہے

دلدار بھی ہو ایک جو سینہ میں ہے دل ایک
فطرت کی طرف سے ہمیں تاکید یہی ہے

ہر امر میں حق ایک سے بڑھ کر نہیں ممکن
از رُوئے خرد شرک کی تردید یہی ہے!

کتنے بھی ستارے ہوں نگاہوں سے ہیں اوجھل
ان پر اثرِ جلوۂ خورشید یہی ہے

تدریج و ترقی کا نتیجہ نہیں توحید
خود عالمِ تخلیق کی تمہید یہی ہے

راہیں تو ہزاروں ہیں، رہِ راست فقط ایک
اس سے نہ ہٹیں۔ مقصدِ تقلید یہی ہے

جو بھی قدم اُٹھے وہ اُسی کی طرف اُٹھے!
اس راہ میں اللہ کی تائید یہی ہے

اسباب و ذرائع متفرق سہی لیکن
مقصود وہی ایک ہو، توحید یہی ہے

توحید و رسالت سے ہے انسان کی وحدت
دُنیا کے لئے آخری اُمید یہی ہے!

اللہ کو اسدؔ ایک جو مانا تو ہوا کیا
ہم ایک رہیں، نکتۂ توحید یہی ہے

فردوسِ تغزّل

ماجد ادیب بریلوی (علیگ)

بنائے بزمِ چمن سے پہلے ظہورِ شمس و قمر سے پہلے — جمالِ محبوب ہر طرف تھا ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے
اگر تمنّا ہے برتری کی، اگر ضرورت ہے زندگی کی — مسافتِ راہِ عشق طے کر سیاحتِ بحر و بر سے پہلے
خلوصِ جوشِ عمل کے قرباں کہیں نہ ٹھہری نظر ہماری — ہزار دیر و حرم نے روکا کسی کی نیچی نظر سے پہلے

کل تک تری تلاش میں ہم سرگراں رہے — اب پالیا تجھے تو وہ جذبے کہاں رہے
یہ زیست یہ خلش یہ محبّت یہ کشمکش! — ہر غم مجھے قبول اگر جاوداں رہے
تیری نوازشوں سے زمانہ ہے بہرہ مند — ساقی مگر خیالِ دلِ دوستاں رہے
ایسے بھی کچھ مقام محبّت میں آئے ہیں — ہم اپنے آپ سے بھی جہاں بدگماں رہے

شفقت کاظمی

وہ زندگی کہ رہی صرفِ بیکسی اے دوست — ترے بغیر بھی ہم نے گزار دی اے دوست
کہاں وہ مجمعِ یاراں کہاں وہ ذکرِ وفا — گزر گئی وہ محبّت کی زندگی اے دوست
تصوّرات میں تجھ کو بسا کے دیکھ لیا — وہی ہے اپنے مقدّر کی تیرگی اے دوست
تری ادائے تلوّن کو اس میں دخل نہیں — غمِ فراق تھا انجامِ دوستی اے دوست
چھٹا جو تجھ سے تعلق تو ہم کو بھول گئی — ترے زمانۂ ماضی کی یاد بھی اے دوست
ہوا کرے جو ہے دُنیا کو بیر بھی ہم سے — کہ اپنے دل کا ہے مقصد تری خوشی اے دوست
قدم قدم پہ ملے نامرادیوں کے ہجوم — رہِ وفا میں جہاں تک نظر گئی اے دوست

وہ دن بھی یاد ہیں اب تک غریب شفقت کو
جب اُس کے حال پہ تیری نظر نہ تھی اے دوست

سیّد احسان علی عرشی (شاہ آبادی)

بتا دے شان و شوکت کے پرستار — کوئی شے اِن میں ہے کیا جاوداں بھی
نہ گھبرا زندگی کی مشکلوں سے — کہ ان کے بعد ہیں آسانیاں بھی
اُنھیں ہے جس قدر مجھ سے محبّت — اُسی نسبت سے ہیں وہ بدگماں بھی
شکایت کیا کریں اُس کی سرِ حشر — وہی قاتل وہی ہے جانِ جاں بھی

تابش الوری

کہاں سکھئے بنائے آشیاں صحنِ گلستاں میں — جہاں بجلی نہیں گرتی وہاں صیاد ہوتا ہے

نہیں نہیں یہ کسی بوالہوس کا کام نہیں — بڑا خلوص ہے درکار دوستی کے لئے
شفق لہو میں نہائی فضا اُداس ہوئی — کلی نے جان گنوا دی شگفتگی کے لئے
ازل کے روز غمِ دو جہاں سمیٹ لیا — یہ اہتمام کیا ہم نے زندگی کے لئے
[illegible] — [illegible] اندھیروں میں روشنی کے لئے

روحِ انتخاب

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ (الانعام)

ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے - اور اُن کے کانوں میں گرانی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے[1]) وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو اُن میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ (ساری باتیں سننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستانِ پارینہ کے سوا کچھ نہیں ![2]

---

[1] یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قانونِ فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرماتا ہے کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں، وہ سب حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے اذن و ارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرینِ حق کا سب کچھ سننے پر کچھ نہ سننا اور داعیِ حق کی کسی بات کا اُن کے دل میں نہ اُترنا، اُن کی ہٹ دھرمی اور تعصب و جمود کا فطری نتیجہ ہے۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اُتر آتا ہے اور بے تعصبی کیساتھ صداقت پسند انسانوں کا سا رویہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کے دل کے دروازے ہر اُس صداقت کیلئے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو - اس بات کو جب ہم بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں اور اسی بات کو جب اللہ تعالیٰ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیئے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ حقیقتِ واقعہ کا اظہار فرماتا ہے۔

[2] نادان لوگوں کا عموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انھیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی۔ یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لئے اس کا نیا ہونا ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے۔ حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہیگا۔ خدا کے دیئے ہوئے علم کی بناء پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانے سے ایک ہی امرِ حق پیش کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی جو اس منبعِ علم سے فائدہ اُٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اُسی پرانی بات کو دُہرائے گا۔ البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم ہو کر ازلی و ابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کی اپج سے کچھ نظریات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرہ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو اُن سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

(تفہیم القرآن جلد اول) سید ابوالاعلیٰ مودودی

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

پاکستان کے حالیہ بجٹ کو بعض اہل الرائے نے "کالا بجٹ" (Black Budget) کہہ کر اس پر طنز کی ہے۔ تماشائی عرض کرتا ہے کہ اس "بجٹ" کا کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔ یہ تو "بے رنگ بجٹ" ہے اور سپاٹ بھی! اور یہ بجٹ" اُن اکابر کے عہدِ حکومت میں مرتب ہوا ہے جن کو قوم و ملک کی حالت کو بہتر بنانے کے بڑے دعوے تھے۔ اور وہ جب تک "حزبِ مخالف" میں تھے تو اس دور کے اربابِ اختیار پر اس انداز میں پھبتیاں کستے تھے جیسے دنیا بھر کے ناکارہ لوگ حکومت میں جمع ہو گئے ہیں۔ بس ان لوگوں کے کرسیوں سے ہٹنے اور زمامِ کار "حزبِ مخالف" کے ہاتھوں میں آنے کی دیر ہے، پاکستان کے سارے دلدر ہی تو دور ہو جائیں گے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جن کو "ناکارہ" بتایا جاتا تھا، اُن کے ہاتھوں سے ملک کی باگ ڈور نکل کر ان "کار آمد لوگوں" (؟) کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اور اس کے بعد سے پاکستان کے دلدر جو دور ہونے شروع ہوئے تو خوشحالی اور فارغ البالی (؟) کے اس قافلہ نے بھاگم بھاگ ۱۹۵۷ء کے بجٹ کی چھاؤں میں آ کر دم لیا ہے۔ اے عوامی لیگ اور ری پبلکن کے "نیتاؤ"! زندہ باد! جگ جگ جیو، دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو! یہ پاکستان کے عوام جو چیزوں کی گرانی کے لئے واویلا کر رہے ہیں، بڑے نادان اور کودن واقع ہوئے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ "بجٹ" کی چھپی ہوئی کاپیاں مول لے کر پہلے اپنے جسموں اور خاص طور سے پیٹوں پر پھیریں اور پھر اُس کی دھونی دے کر اپنے مکانوں کی آب و ہوا کو پاک و صاف بنائیں۔ بس پھر راوی چین ہی چین لکھے گا۔ فاقہ کی شام بھی اس "بجٹ" کی برکت سے "صبحِ عید" نظر آئے گی۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں بھی جسم ایسے دکھائی دیں گے جیسے نسیمِ صبح کی سوزن شوخ و شنگ نے پھولوں کی تنگ قباؤں کو جگہ جگہ سے مسکا دیا ہے!

عوام بیچارے اس موجودہ دور کو دیکھ کر پچھلے زمانہ کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔ مگر تماشائی عرض کرتا ہے کہ آہیں بھرنے اور نالے کھینچنے سے بیتے ہوئے دن تو لوٹ کر آنے سے رہے، خدا کے لئے "مستقبل" کی فکر کرو۔ اگر قوم نے "کل" کی "آج" ہی فکر نہ کی اور حالات کو بگڑنے سے نہ بچایا تو پھر آنے والی تباہیوں کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جاگنے کا وقت اب ہے، اگر تباہی کے بعد قوم جاگی بھی تو ایسی بیداری "مُشتے بعد از جنگ" بن کر رہ جائے گی!

وقت پر کافی ہے قطرہ ابرِ خوش ہنگام کا
جب کہ کھیتی جل چکی برسا تو پھر کس کام کا

مشاعرے میں ... کوئی شاعر سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور داد لینے کے لئے مسخرہ پن پر اُتر آئے۔ اُس وقت "شعر و ادب" کی بیکسی اور متانت و سنجیدگی کی بے دست و پائی کا حال نہ پوچھیئے کہ لوگ تو "ہی ہی" کرتے ہوتے ہیں اور شاعر صاحب کی باچھیں بھی کھل جاتی ہیں مگر شعر و ادب اور متانت و شائستگی کو شرم و غیرت کے مارے پسینہ آ جاتا ہے ~

رو مسخرگی پیشہ کن مطربی آموز   تا داد زہر کہتر و مہتر بستانی
مطربی و مسخرگی کی یہ وہ سطح ہے جہاں شاعر گویا نہیں ڈوم، ڈھاڑی اور بھانڈ بن جاتا ہے!

ایک مولوی صاحب کی خفیہ ڈائری اور نجی روزنامچے کے کچھ منتشر اوراق "تماشائی" کو ہاتھ لگ گئے ہیں، ان میں پڑھنے والوں کیلئے دلچسپی بھی ہے اور عبرت بھی! تنہا لطف اٹھانا اور اکیلے اکیلے مزے کرنا اہل ظرف کا شیوہ نہیں، اس لئے تماشائی بھی اس لطف میں ناظرین "فاران" کو برابر کا شریک کرنا چاہتا ہے۔ سنئے:-

"بیوی نے آج پھر سینما جانے کے لئے فقیر سے اجازت چاہی۔ فقیر نے جواب دیا کہ تم سینما کے لئے فقیر سے اجازت نہ لیا کرو۔ فقیر اس طرح گنہگار ہوتا ہے۔ تم جانو اور تمہارا سینما جانے، فقیر کے علم و اطلاع میں یہ باتیں کیوں لاتی ہو...... اور (اس کے بعد کی چند سطروں پر پان کی پیک نے "خط نسخ" کھینچ دیا ہے)....

سیٹھ باوے یہاں بڑے صاحب خیر بزرگ ہیں۔ فقیر کا بہت خیال رکھتے ہیں وہ کئی دن سے "بنک کے سود" کے بارے میں فقیر سے دریافت کر رہے ہیں کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل! فقیر نے آج ان سے کہہ دیا کہ مصر کے بعض علماء کا رجحان اس کے جواز میں ہے۔ سیٹھ صاحب نے پھر پوچھا کہ پاکستانی علماء کا اس بارے میں کیا مسلک ہے؟ میں نے عرض کیا کہ شرعی مسائل میں ضرورت سے زیادہ چھان پھٹک ٹھیک نہیں۔ میں نے جو "اشارہ" کر دیا ہے، اس کی نزاکت کو آپ جب سمجھ لیں گے تو فقیر کی ذہانت کی داد دیں گے......!

آج فقیر کو اتنی بڑی فتح حاصل ہوئی کہ اس پر فقیر جتنا ناز کرے کم ہے۔ سیرۃ النبیؐ کے ایک جلسہ میں جہاں "دیوبندی" اور "وہابی علماء" بھی موجود تھے، فقیر نے سارے مجمع سے "قیام" کرا کے چھوڑا۔ وہ نعت خوانوں کا لہک لہک کر صلوٰۃ و سلام پڑھنا اور پوری محفل کا با ادب کھڑے ہو کر اسے سننا، دین کی کتنی عظیم الشان فتح ہے۔ فقیر تو ان معاملات میں اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان دیوبندیوں اور وہابیوں کو جلانے کے لئے اگر پٹاخے اور پھلجھڑیاں بھی کوئی چھوڑتا ہے تو بہت بڑا ثواب کماتا ہے۔!

فقیر کے نام آج ایک لفافہ موصول ہوا۔ لفافہ کھولا تو اس پر یہ شعر لکھا تھا۔ ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؒ و چادر زہراؓ

ہو نہ ہو یہ خط کسی نجدی عالم کے چیلے چانٹے کا ہے۔!...... خیر...... دکئی سطریں پڑھی نہیں جا رہی ہیں...... صفحہ کے آخر پر...... پرمٹ کا نمبر لکھا ہوا ہے..... اور اس کے بعد اللہ بس باقی ہوس)

ہماری نظر میں

قاموس القرآن (قرآنی ڈکشنری) تالیف:- قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی - ضخامت ۸۰۰ صفحات - قیمت غیر مجلد سات روپے - مجلد آٹھ روپے - ملنے کا پتہ:- مکتبہ علمیہ قاضی منزل میرٹھ - پاکستان میں:- ہاشمی بکڈپو ۹۶۲ پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی ۵

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی عربی اُردو ڈکشنری — بیان اللسان — مقبول ہو چکی ہے - اب انہوں نے قرآن پاک کے تمام الفاظ کا صحیح اُردو ترجمہ اور اُن کی مکمل صرفی و نحوی تشریح "قاموس القرآن" کے نام سے مرتب فرمائی ہے - اس قرآنی لغت کی ترتیب میں فاضل مرتب نے امام راغب اصفہانی کی "مفردات غریب القرآن" سے لے کر مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے "فوائد القرآن" تک سے فائدہ اٹھایا ہے — نمونہ:-

اِئْتُوْا:- تم آؤ (ب) تم لاؤ - اتیان سے امر جمع حاضر مذکر "اتیان" کے اصل معنی آنے کے ہیں - باء کے صلہ سے اس کے معنی "لانا" ہو جاتے ہیں -

اَبَابِیْل:- چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ - واحد اِبَّالہ - اِبَّالہ کے اصل معنی لکڑیوں وغیرہ کے گٹھر ہیں - پرندوں کے جھنڈ پر گٹھا ہوا ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے - بعض کے نزدیک اَبابیل کا کوئی مفرد نہیں ہے -

"حَنِیْف":- سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار - سب کی طرف سے کٹ کر خدا کا ہو جانے والا - "حنف" سے صفت مشبہ - امام راغب فرماتے ہیں - "جنف" کے معنی ہیں راہِ راست چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹک جانا اور "حنف" کے معنی ہیں ہر گمراہی کو چھوڑ کر راہِ راست اختیار کرنا - اساس میں ہے "حنیف" وہ ہے جو ہر باطل مذہب سے روگرداں ہو جائے - علامہ رشید رضا لکھتے ہیں "کسی غلط راستہ سے روگرداں ہو جانے والے کو "حنیف" نہیں کہتے بلکہ "حنیف" اُسے کہیں گے جو اُس راہِ کج سے مُنہ پھیر کر سیدھے راستہ پر آئے - جس پر ساری دُنیا چل رہی ہو - حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ و السلام) کو اسی لئے اس وصف سے موصوف کیا گیا ہے کہ اُن کے زمانہ میں ساری دُنیا کفر کے راستہ پر دوڑ رہی تھی مگر انہوں نے سب سے یہاں تک کہ اپنے قریب ترین عزیزوں سے علیحدہ ہو کر راہِ حق کو اختیار کیا اور ہر قسم کی ترغیب و ترہیب کے باوجود اس پر ثابت قدم رہے - (تفسیر المنار جلد ۱)

شریعتِ محمدیہ چونکہ اصولِ دین توحید و رسالت و بعث و جزاء کے علاوہ ان کلیاتِ دین میں بھی، جن سے شریعت کے احکامِ جزئیہ مُستنبط ہوتے ہیں - شریعتِ ابراہیمیہ کے موافق ہے اس لئے اسے "ملتِ ابراہیمیہ" اور "حنیفیہ" کہا گیا -

ایک حدیث میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ترکت فیکم الحنیفۃ البیضاء السمحۃ لیلھا کنھارھا (میں تمہارے درمیان ملتِ حنیفیہ کو چھوڑ رہا ہوں جو سپید اور سہل ہے اور اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے) غالباً حنیفیہ کی صفت بیضاء (سپید) اسی لئے لائی گئی کہ جس طرح سپید رنگ اصل رنگ ہے اور اس میں کسی اور رنگ کی ملاوٹ نہیں ہوتی - برخلاف دُوسرے رنگوں کے کہ وہ سپیدی پر طاری کئے جاتے ہیں، نیز ایک میں

دوسرے کی آمیزش ہوتی ہے، اسی طرح ملتِ حنیفیہ بھی فطرتِ انسانی کا اصل مذہب ہے اس کی شاہراہ تمام باطل پگڈنڈیوں سے علیحدہ اور ممتاز ہے۔"

قرآن پاک میں شخصیتوں، قوموں اور مقامات کے جو نام آئے ہیں۔ اُن کی صراحت بلکہ اُن کی تاریخ اس لغت میں ملتی ہے اور احکام میں جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں فقہی مسائل کی تشریح بھی کردی گئی ہے۔ قرآنی الفاظ کی شرح میں علماء سلف کا مسلک اشہب خامہ کے ساتھ عناں گیر رہا ہے۔ اور یہ دلیل ہے فاضل مؤلف کے احساسِ ذمہ داری کی۔

ظاہری حسن (get up) کے اعتبار سے بھی کتاب دیدہ زیب ہے۔ اُردو جاننے والوں کے لئے تو یہ لغت نعمتِ غیر مترقبہ ہے ہی۔ مگر عربی داں طبقہ کو بھی اس کے مطالعہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اس "لغت" کی تدوین و تالیف پر علمی دُنیا کی طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائے (آمین)

مُعلم القرآن

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی نے قرآن پاک کی تعلیم و اشاعت کو اپنی زندگی کا موضوع اور مقصد بنا لیا ہے۔ اور اس کے لئے موصوف پوری تن دہی اور خلوص کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اُن کی متعدد کتابیں ہمارے سامنے ہیں:-

(۱) "عربی زبان کو عالمگیر بنانے کا پروگرام"۔ اس کتابچہ میں مولانا موصوف نے بتایا ہے کہ احیاءِ دین کی عالمگیر تحریک اور عالمِ اسلامی کے اتحاد کے لئے عربی زبان سب سے زیادہ مؤثر اور کامیاب ذریعہ ہے اور عربی کے بغیر دین کے اصلی سرچشموں "قرآن و حدیث" تک (کماحقہ) رسائی نہیں ہوسکتی۔

(۲) "دینی تعلیم کا مسئلہ اور اس کا صحیح و کامیاب ترین حل"۔ اس کتابچہ میں مولانا نامی نے تعلیم قرآن کا مکمل نصاب پیش کیا ہے۔ جس کی تصویب میں بعض مشاہیر علماء کے آراء بھی کتابچہ کے آخر میں درج ہیں۔

(۳) "رحمانی قاعدہ اُردو" (بالتصویر) ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ بچوں کی نفسیات اور فہم کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے بچوں کو عربی زبان سے بھی مناسبت پیدا ہوجاتی ہے۔ اُردو کے ساتھ عربی زبان کا امتزاج اس قاعدہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

(۴) "رحمانی قاعدہ عربی" (بالتصویر) ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ یہ عربی کا باتصویر قاعدہ ہے۔ جو قرآنی تعلیم کی طرف پہلا قدم ہے۔ بچوں کی دلچسپی اور افہام و تفہیم میں آسانی کے لئے غیر ذی روح اشیاء کی تصویریں بھی دے دی ہیں۔ دو نمونے:-

ج	جِدَارٌ	ث	كَاسٌ
	دیوار		پیالہ

(۵) "مفتاح القرآن" (حصہ اول) ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔ اس میں قرآن پاک کے بہت سے الفاظ کا ترجمہ۔ آسان آیات، کلمہ، تشہد، اذان، التحیات، درود شریف، دعاءِ قنوت، نماز جنازہ کی تعلیم اور عربی قواعد کی ضروری اور ابتدائی معلومات درج ہیں۔

(۶) "مفتاح القرآن" (حصہ دوم) ضخامت ۴۶ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔ اس کتاب سے عربی گرامر کا آغاز ہوتا ہے اور ساتھ ہی قرآن کی آیتوں کی ترجمانی ہوتی جاتی ہے۔

(۷) "مفتاح القرآن" (حصہ سوم) ضخامت ۱۱۶ صفحات - قیمت ایک روپیہ - اس میں عربی صرف و نحو کے ضروری قواعد کا خلاصہ درج ہے اور قرآن پاک کی بنیادی تعلیمات کو قرآنی آیات سے واضح کیا گیا ہے۔

(۸) "مفتاح القرآن" (حصہ چہارم) ضخامت ۱۳۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ چار آنہ - اس میں فن صرف اور فن نحو کے ضروری قواعد اور مشقیں درج ہیں - جن پر اگر عبور ہو جائے تو قرآن کریم کے ترجمہ کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

(۹) "مفتاح القرآن" (حصہ پنجم) ضخامت ۱۶۸ صفحات - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ - اس میں بھی قرآنی آیتوں کی مثالوں کے ذریعہ نحو کے مسائل سمجھائے گئے ہیں - قرآن کے وہ الفاظ جو پچھلے چار حصوں میں آنے سے رہ گئے ہیں - وہ سب کے سب اس پانچویں حصہ میں آ گئے ہیں۔

(۱۰) "معلم القرآن" ضخامت ۱۲۸ صفحات - قیمت ایک روپیہ چار آنہ - اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کم سے کم مدت میں عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کیوں کر دی جا سکتی ہے؟ اس کے لئے کیا طریقۂ تعلیم اختیار کرنا چاہیئے - نحوی قواعد کی مشق کس طرح کرائی جائے؟ قرآن کے حروف کو صحیح مخارج سے کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے - "تجوید" کے ضروری مسائل کو باتوں باتوں میں سمجھا دیا ہے۔

قرآنی تعلیم کا یہ پورا سلسلہ اس قابل ہے کہ اسے مسلمانوں کے اردو داں گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلا دیا جائے - ان چند کتابوں کے مطالعہ سے قرآن فہمی کی خاصی استعداد پیدا ہو سکتی ہے - قرآن پاک کا یہ آسان ترین مکمل نصاب ہے - اور اپنے اسلوب میں ممتاز و منفرد ہے - جناب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی نے یہ کام انجام دے کر اپنے لئے آخرت میں اجر عظیم محفوظ کرا لیا ہے فاضل مولف کو قرآن سے، دین سے، اللہ اور رسولؐ سے جو لگاؤ ہے - وہ کتاب کی ایک ایک سطر سے نمایاں ہے - ان کی یہ حرص کہ مسلمانوں کے دل و دماغ قرآنی انوار سے معمور ہو جائیں - قابل رشک ہے - ان کتابوں کی کتابت جلی - دیدہ زیب اور طباعت خوشنما ہے۔

یہ تمام کتابیں مدرسۃ المعلمین نور العلوم بہرائچ (یوپی - بھارت) سے مل سکتی ہیں - پاکستان کے علمی اداروں اور دینی جماعتوں کو اس سلسلہ سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

مسلم خواتین کی تعلیم | از و - منشی محمد امین زبیری - ضخامت ۲۰۸ صفحات - مجلد گرد پوش کے ساتھ - (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ - ادارہ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، سعیدہ منزل، ناظم آباد، بی روڈ - کراچی۔

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں "مسلم خواتین کی تعلیم" کی کیا حالت رہی؟ یہ کتاب اسی کیفیت پر مشتمل ہے - عہد رسالت، عہد صحابہ اور بعد کے زمانہ کے تاریخی حالات بہت ہی سرسری ہیں - کتاب کا اصل موضوع "ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیم" ہے مولف نے اس موضوع پر خاصی معلومات جمع کر دی ہیں - انداز بیان سادہ ہے - مگر دفتری زبان کی جھلک جگہ جگہ ملتی ہے!

حیدر آباد دکن میں مسلم خواتین کی تعلیمی ترقیوں کا جو تذکرہ ہے اس میں مولوی محب حسین مرحوم کے نام ضرور آنا چاہیئے تھا - کہ دکن میں تعلیم نسواں کے یہ بہت بڑے محرک تھے۔

"یورپ میں مخلوط تعلیم بہت کچھ رائج ہے - لیکن اس کے تجربات نے اب جداگانہ تعلیم کی طرف مائل کر دیا ہے انگلستان میں بھی ۱۹۴۳ء میں اس مسئلہ پر غور کیا گیا اور کاؤنٹی ایجوکیشن کمیٹی کی رپورٹ میں اس طریقہ کو ختم کر دینے کی تجویز پیش کی گئی" (صفحہ ۱۸۳)

کاش! پاکستان کے اربابِ اقتدار اس اطلاع سے عبرت حاصل کریں اور پاکستان کی تعلیم کو "اختلاطِ مرد و زن" کی آلائش سے پاک کر کے یہاں کے تعلیمی ماحول کو پاکیزہ اور بے داغ بنادیں۔ یورپ زبانِ حال سے چیخ رہا ہے ؎

من نہ کردم شما حذر بکنید

مگر ہمارا مغرب زدہ طبقہ ہے کہ یورپ کی اخلاقی تباہی سے سبق حاصل نہیں کرتا اور اس پر تُلا ہوا ہے کہ یورپ اخلاق و تہذیب کی جن پستیوں میں پہنچ چکا ہے، وہاں پہنچنا ہی "ترقی" اور "روشن خیالی" کی سب سے بڑی نشانی ہے! یا اللہ! اس ذہن و فکر کے لوگوں سے اُمتِ مسلمہ کو کب نجات ملے گی؟

اسلامی روایات

از:- محمد حفیظ اللہ۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مسلم اکاڈیمی، پھلواری شریف (پٹنہ)

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور بعد کے مسلمان فرمانرواؤں کے عدل و انصاف، عفو و درگزر، مہمان نوازی، ایثار و ہمدردی، امانت و وفا، دادرسی اور رعایا پروری کو تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ بادشاہ جن کو جابر کہا جاتا ہے، اس متمدن دَور کے حاکموں سے زیادہ خدا ترس اور رعیت چشم تھے۔ آج بھی ہندو راج میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے اور پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ یہاں کی حکومت کا جو برتاؤ ہے اس کا موازنہ کیا جاسکتا ہے کہ "ظلم" کہاں ہے اور صلح و رواداری کس جگہ ہے!

اس کتاب کی افادیت کسی زمانہ میں بھی کم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ فاضل مولف کو اجرِ دارین عطا فرمائے!

اسلام اور غیر مسلم

از:- محمد حفیظ اللہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات (مجلد) قیمت قسم اول مجلد دو روپے آٹھ آنہ۔ قسم دوم بغیر جلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- مسلم اکاڈمی۔ پھلواری شریف (پٹنہ — بھارت)

مغربی مورخین نے اسلام اور مسلمانوں کو دُنیا کی نگاہ میں قابلِ نفرت ٹھہرانے کے لئے اسلام پر بڑی بے سرو پا تہمتیں جوڑی ہیں اور لوگوں میں شدید غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" ہے اس جھوٹ کو یورپ ہی نے تصنیف کیا ہے!

اس کتاب میں تاریخی حوالوں کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اسلام نورِ سحر اور بوئے گُل کی طرح پھیلا ہے کہ وہ اپنی ذات سے عینِ رحمت واقع ہوا ہے۔ اسلام کی اشاعت میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا گیا۔

"چین جہاں مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہیں کی، آج کم و بیش سات کروڑ مسلمان بستے ہیں اور چینی دار السلطنت میں ۴۹ مساجد ہیں"

"حبشہ پر مسلمانوں نے حملہ نہیں کیا اور نہ کسی نے خون کا ایک قطرہ ہی بہایا۔ مگر اس ملک میں آج نصف آبادی مسلمانوں کی نظر آتی ہے"

"جزیرہ مالدیپ پر مسلمانوں نے چڑھائی نہیں کی۔ لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں وہاں کا راجہ شنوارزہ مسلمان ہوگیا، یہی نہیں، وہاں کی ساری آبادی بھی مسلمان ہوگئی۔ ملایا میں اسلامی فوج کا گزر کبھی نہیں ہوا۔ لیکن آج وہاں چار کروڑ مسلمان بستے ہیں"

"جزائر شرق الہند" (جاوا، سماترا وغیرہ) کبھی اسلامی اقتدار کے ماتحت نہیں آئے

لیکن یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ انڈونیشیا تین ہزار جزیروں کا مجموعہ ہے اور اس کی آبادی سات کروڑ نوّے لاکھ اسّی ہزار ہے، اس میں کم و بیش نوّے ۹۰ فیصد مسلمان ہیں۔" (ص ۱۲۷)

خود ہندوستان میں مسلم بادشاہوں نے ہندوؤں کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا ہے اور انسانی رواداری کو کس قدر ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی بیسیوں مثالیں تاریخی حوالوں کے ساتھ اس کتاب میں ملتی ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سی غلط فہمیاں دُور ہوتی ہیں اور واقعات اپنے اصلی روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جن سنگھی ہندوؤں تک یہ کتاب ضرور پہنچائی جانی چاہیئے۔ کیا عجب ہے ان راکشسوں کے دلوں میں دیا دھرم اور مینائے کی جوت جاگ جائے!

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں	از:- مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات، مجلد خوبصورت گردپوش کے ساتھ۔ (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- ادارۂ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

تعصب اور ہٹ دھرمی کی دوسری بات ہے ورنہ یہ حقیقت ہے جس کا کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کی معاشرت، تہذیب، فکر و خیال اور ذہن و دماغ کی تربیت ہوئی ہے۔

اس کتاب میں ہندو مورخین، ہندو شعراء، ہندو نعت نویسوں، ہندو طبیبوں، ہندو صوفیوں، دانشوروں اور موسیقاروں کا نام بہ نام مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ اس موضوع پر یہ خاصی معلومات آفریں تالیف ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے بلکہ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں نے بہت کچھ سیکھا اور زنار بدوشوں کی گردنوں میں مسلمانوں نے ودیا اور گیان کی انمول مالائیں ڈال دیں!

صفحہ ۵ اپر جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" کو کاتب صاحب کی نوازش نے "والتبعین" بنا دیا۔ صفحہ ۸۴ پر مہاراجہ چندو لال شاداں کو مہاراجہ کشن پرشاد کا پردادا لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ چندو لال آنجہانی مہاراجہ کشن پرشاد کے نانا تھے۔

کتاب کا ابتدائی حصہ علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت وقیع اور معلومات آفریں ہے۔ ایک نمونہ:-

> "قبہ ارین" اصطلاحِ ہیئت میں اُس نقطہ کو کہتے ہیں جو خطِ نصف النہار اور خطِ استواء کو تقاطع کرتا ہے۔ اس لفظ کی تاریخ عجیب و غریب ہے۔ یہ لفظ اصل میں "اُجین" ہے جو صوبہ مالوہ کا مشہور شہر ہے۔ منجمانِ ہند نے اس کو نقطۂ تقاطع فرض کیا تھا۔ عربی میں "اُجین" "ازین" ہو گیا۔ بعد میں نقطہ اڑ کر "ارین" رہ گیا۔" (ص ۱۶)

سدرہ وطوبیٰ	از:- اَلم مظفر نگری۔ ضخامت دو سو صفحات۔ مجلد دیدہ زیب گردپوش کے ساتھ۔ قیمت ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان، جامع مسجد، اُردو بازار دہلی۔

جناب اَلم مظفر نگری کا یہ تیسرا "مجموعہ کلام" ہے جسے مکتبہ برہان نے خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اَلم صاحب کی شاعری میں قدامت اور جدت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اُن کے یہ چند منتخب اشعار اہلِ ذوق کے وجدان کی تواضع کے لئے حاضر ہیں:-

جور و استبداد کے تو ذکر ہی کو چھوڑیئے — ہر کرم میں سینکڑوں فتنے ہیں پنہاں دیکھئے

کوئی دل بھی نہیں محفوظ اس کی زد سے ہستی میں — تنگ و نازِ حوادث ہم سمجھتے تھے ہمیں تک ہے!

روکتا کون مجھے فصلِ بہار آنے پر — اپنی نظروں سے بھی بچ بچ کے میں زنداں سے چلا

نزع میں ہچکی سی آئی ہے مریضِ عشق کو — یہ پیامِ آخری شاید انھیں کے نام ہے

تمہیں کس طرح سمجھا دوں شبِ عشرت کے دیوانو! — ہر اک لمحہ سے شامِ غم کے ہوتی ہے سحر پیدا!

کسی سے رو کے ہنگامِ سحر کہتی ہے یوں شبنم　　میں بزمِ گل میں کیا اک رات ہی رہنے کے قابل ہوں

بہاروں میں حفاظت کرنے والے جیب و داماں کے　　کبھی تو نے گلوں کے بھی گریبانوں کو دیکھا ہے

کمالِ کفر سے تکمیلِ ایماں ہوتی آئی ہے　　مذاقِ آزرِ صاحب گر بھی ہے اور بت شکن بھی ہے

سفر سے زندگی ہے گرمِ رفتارِ تن و مرں کی　　سرِ فانوس کیوں پروانۂ آتش بجاں ٹھہرے

نہ پایا کس سکوں اے ناخدا! اس بحرِ ہستی میں　　سفینہ کس طرح ٹھہرے، نہ جب موجِ رواں ٹھہرے

ہو بوئے گل کہ رنگِ نغمہ ساز　　سبک رَو ہے یہاں ہر صاحبِ راز

کبھی صحنِ چمن کی وسعتوں میں　　نظر آئی تجھے شبنم کی پرواز

دُوسرا رُخ :-

غمِ سوزِ وفا کو نا ہو عمرِ جاوداں حاصل　　جو ہو وجہ سکونِ دردِ دل وہ بیقراری دے　　(صفحہ ۵)

شعر میں خیال و اظہار کا یوں بھی کوئی لطف نہ تھا، مصرعہ اولیٰ میں "نا" نے لفظوں کے دروبست کو اور غارت کر دیا۔

آپ ہی بن جائے گی صبحِ قیامت کی نمود　　لے کے اک انگڑائی سی مستیٔ شامِ زندگی　　(صفحہ ۸)

"مستیٔ شام" کی "ی" کھینچ کر پڑھنے میں وجدان کتنی ناگواری محسوس کرتا ہے اور یہ عیب آثم صاحب کے کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

مشربِ موسیٰ کی کرنی ہے تو یوں تقلید کر　　آ کے ہو طورِ خودی پر ہم کلامِ زندگی　　(صفحہ ۸)

"مشرب" میں کسی ایک ہی کام اور عادت کے تکرار کا مفہوم شامل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ہی بار طور پر اللہ تعالیٰ سے کلام کیا تھا۔ تو اسے اُن کا "مشرب" کہنا ایک عجیب سی بات ہے۔ اس کے علاوہ لفظ "مشرب" تقدیس و احترام کے اعتبار سے بھی [illegible]

نغمہ سازِ عراقی ہو کہ آہنگِ حجاز　　سب ہیں وابستۂ یک جلوۂ آوازِ سروش　　(صفحہ ۹)

"شعلۂ آواز" تو سُنا ہے اور پڑھا ہے مگر "جلوۂ آواز" پہلی بار نظر سے گزرا۔ پھر یہاں "یک جلوۂ آواز" کا نہیں — "یک جنبشِ آواز" کا محل تھا۔

حُسنِ انجام کا ضامن ہے وجودِ آغاز　　صبحِ فردا کی ہے خالق رگِ ہر جلوۂ دوش　　(صفحہ ۹)

"جلوۂ دوش" کی "رگ" کیا ہوتی ہے؟ مصرعہ اولیٰ میں "حُسن" زاید ہے۔ ہر آغاز کا وجود "انجام" کا ضامن تو ہوتا ہے مگر "حُسنِ انجام" کا ضامن نہیں ہوتا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر آغاز کا انجام لازمی طور پر اچھا ہی ہو

نالۂ عشق کی ہر گونج کے آگے ساقی　　نغمہ ساز ہے خاموش مغنی روپوش　　(صفحہ ۱۰)

نالۂ عشق کی گونج سُن کر مغنی کا روپوش ہو جانا، ایک مضحکہ سے کم نہیں۔

آگ برسانے کو ہے سوزِ وفا کی داستاں　　منزلِ دل میں خرا ہو تو سہی خونِ فغاں　　(صفحہ ۱۱)

بالکل نو مشقوں کا سا اندازِ بیان ہے!

آج لیکن زندگی کی رہ میں تو ناکام ہے　　ہے غلامِ نفسِ دوں ناواقفِ انجام ہے　　(صفحہ ۱۳)

یہ شعر بھی بالکل بچکانہ ہے!

سراسر بدعتِ ناقص ہے یہ تجدیدِ مے نوشی　　ہیں رندانِ ازل تو تشنۂ جامِ کہن ساقی　　(صفحہ ۱۵)

بعض لوگ بدعت کی دو قسمیں بتلاتے ہیں "حسنہ" اور "سیئہ"۔ مگر آثم صاحب کے اس شعر سے معلوم ہوا کہ بدعت کی دو قسمیں

اور بھی ہیں "بدعتِ ناقص" اور "بدعت کامل"!

(صہ ۲۳) یردۂ پردہ لا اس جلوۂ تاثیر نغمہ کو! جیسے اک مہدی نسبت ہی ساز ماہ کامل سے

"تاثیر نغمہ" کا "جلوہ" کیا بات ہوئی؟ "سازِ ماہ کامل" اس سے عجیب تر! اس قسم کے سپاٹ، اور بے مزہ شعروں کی اس مجموعہ کلام میں کمی نہیں ہے!

(صہ ۲۵) جامۂ ہستی میں ہوں خود ذمہ دار عیش و غم صبح منزل اور کہیں شام سرِ منزل ہوں میں

یہ عیش و غم کی "ذمہ داری" کیا چیز ہے؟ اس قسم کے حشو و زوائد اور گرانبار ترکیبوں کی اس کتاب میں بھرمار ہے:۔

"سازِ نیرنگِ وفا" — "صد جہنم زار در دامن" — "ضبط و اقدام" — "سرگرمی آواز ہو"۔

"باجلالِ عشق" — "حسنِ تحمل" — "ارتکابِ خودسری" — "شبابِ رنگِ گلستانِ زندگانی"۔

"بامِ ہویت" — "کلفتوں کی شراب" — "یہ عزمِ نوجواں" — "جذبۂ عرفاں نواز" —

"جلالِ محترم" — "شباب و مستیٔ مُل" — "نازشِ گلبانگ ہو" — "نشاتین" —

"جذبۂ فطرتِ دل" ....!

(صہ ۳۱) فیض اور اکِ صفاتی پردہ ہو کیوں مجھ کو ناز عالمِ جبروت کو حیرت فزا رکھتا ہوں

کیا اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے کو شعر کہہ سکتے ہیں۔

(صہ ۳۹) وہ اختراعِ ازل جس کی زندگی جواں ہے اپنے مرکزِ ہستی پہ مثلِ کوہِ گراں

کوئی لطف؟ کسی نازک مفہوم کی کھل کر ترجمانی نہیں تو کوئی لطیف اشارہ ہی ہوتا! توبہ!

(صہ ۶۱) بحرِ عرفاں موج زن ہی یا خطابت کا ظہور ہے عیاں الفاظ سے تبلیغِ فطرت کا شعور

"تبلیغ فطرت کا شعور" آخر کیا بات ہوئی؟

(صہ ۶۴) ایکہ ترے وجود سے بزمِ جہاں ضیا فروش نیر القدس حسیں جنتِ زندگی بدوش

مصرعہ ثانی میں صرف لفظوں کو نظم کر دیا ہے "تقدسِ حسیں" میں "حسیں" زائد ہے۔

(صہ ۶۷) نقشِ لافانی ہے اُردو کا تجمل بالیقیں صفحۂ ہستی سے یہ مٹ جائے ممکن ہی نہیں

"اُردو کا تجمل" اور پھر "بالیقیں" ایک مشاق شاعر اور ایسے مصرعے!

(صہ ۷۳) اے غلام نفس لے تائید مذہب کے حریف ہے شکار جذبۂ باطل ترا ذہن کثیف

شاعر نے "مذہب کے حریف" کہہ کر کچھ لفظ سوچے اور مصرعہ پورا کرنے کے لئے ایک لفظ کی کمی پڑ گئی تو "تائید" سے اس کمی کو پورا کر دیا۔ دوسرا مصرعہ بھی آورد ہی آورد ہے! اس قسم کی بے جان اور بے کیف لفظوں سے "مذہب کے باغیوں" کا مقابلہ کرنا خود "مذہب" کے موقف کو کمزور بنانا ہے!

(صہ ۷۴) واجباتِ مذہبی اک مستقل تعلیم ہیں اس لئے احکام اس کے قابلِ تعظیم ہیں

"اکھتر، بہتر، تہتر، چوہتر" کی طرح بس لفظوں کو جوڑ دیا! نہ کوئی لطف اور نہ دلکشی!

(صہ ۱۱۲) جب بتائید جنوں اپنے بیاباں سے چلا بچ کے میں شورشِ ہر جلوۂ امکاں سے چلا

"جلوۂ امکاں کی شورش کیا چیز ہے؟ ایک خیال ذہن میں آیا اور لفظوں سے وزن پورا کرتے چلے گئے۔

ہیں یوں جلووں کا اپنے آپ ہی مدِ مقابل ہوں گلِ رنگیں کے پردے میں حریفِ ماہِ کامل ہوں (ص ۱۲۰)

شعر کیا ہے نری چیستان ہے! پھول کو ماہِ کامل کا حریف کہنا عجیب انتقالِ ذہنی ہے!

اگر فلک سے کوئی بجلیاں نہ برسائے تو جذبہ نشو و نما کا چمن سے مٹ جائے (ص ۱۴۲)

"آشیاں بندی کا جذبہ اہلِ چمن کے اندر باقی نہ رہے" اگر مصرعِ ثانی میں اس خیال کو نظم کیا جاتا تو ایک بات بھی تھی! مگر چمن کے نشو و نما کا بجلیوں کے برسنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حالت افسردہ ہی کچھ بزمِ جنوں پرواز کی ہے محبت ہی تو ضامن حُسن کے اعزاز کی (ص ۱۴۶)

"بزمِ جنوں پرواز" یہ کیا ترکیب ہے؟ "پرواز" کا قافیہ "اعزاز" ذہن میں آیا اور دوسرا مصرعہ جوڑ جاڑ کر تیار کر دیا۔

یہ اشارہ کر رہا ہے شبنمِ تر کا صعود دیکھ لا محدود ہیں گنجائشیں پرواز کی (ص ۱۴۷)

مصرعِ ثانی جاندار ہے مگر "صعود" نے پورے شعر کے آہنگ کو ٹھس بنا دیا! ہبوط و صعود "غزل" کی نزاکت پر بار ہیں —!

نہیں ہوتا گزر برقِ تپاں کا جس گلستاں میں وہاں پھولوں میں رنگِ جاوداں باقی نہیں رہتا (ص ۱۵۰)

آخر گلستاں کا کون پھول ایسا ہے جو رنگ جاوداں لئے ہوئے ہے۔ جاودانی اور خلود کس پھول کو حاصل ہے۔ پھر "برقِ تپاں" کے گزرنے کو رنگِ جاوداں کی "علت" قرار دینا ایک اعجوبہ سے کم نہیں!

تائیدِ وفا میں کرم عام ہمارے سب عشق کے پیغام ہیں پیغام ہمارے (ص ۱۵۶)

مصرعہ اولیٰ ایک گورکھ دھندے کے سوا اور کیا ہے؟

اس وادیٔ تکلیف میں ہم گرمِ سفر ہیں ہے ساتھ جہاں منزلِ آرام ہمارے (ص ۱۵۷)

یہ "وادیٔ تکلیف" کیا بلا ہے؟ پھر شعر کس درجہ بے روح اور سپاٹ ہے۔ توبہ!

اپنی حقیقتوں سے ابھی آشنا نہیں عارف تو ہے تو عارفِ باطل ہوا نہیں (ص ۱۵۹)

مصرعہ ثانی کا "construction" نو مشقوں کا سا ہے۔ مشاق شاعر کو تو سوتے میں بھی ایسا کمزور مصرعہ نہیں کہنا چاہیئے!

لئے جاتا ہوں خود کشتیٔ دل کو اپنی منزل پر اشاراتِ ہوائے دامنِ ساحل سمجھتا ہوں (ص ۱۶۲)

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟ "اشارات" نے شعر کو اور بوجھل بنا دیا۔

جنونِ عشق کی جب حد سے بڑھتی ہے گلو گیری گریباں کو گریبانِ کفن کہنا ہی پڑتا ہے (ص ۱۷۴)

"جنونِ عشق کی گلو گیری بھی ہوتی ہے"! اس کا پہلی بار علم ہوا۔ پورا شعر اس کی شہادت ہے کہ شاعر کو اپنے خیال کے ٹھیک طرح اظہار و بیان کا سلیقہ نہیں ہے!

قفس اور تا نشیمن صفیرو! یہ نہ تھا ممکن کیا تھا خود ہی شاخِ آشیاں کو سرنگوں میں نے (ص ۱۸۰)

"اہمال و ابہام" وجدان کے لئے تکلیف دہ!

پنجے میں عندلیبوں کے ہیں دامانِ جہاں کو صد پارہ بعنوانِ دگر دیکھ رہا ہوں! (ص ۱۸۸)

یہ کلامِ منظوم تو ہے مگر اس میں شاعری کی کوئی خوبی نہیں پائی جاتی!

صبا ٹھہرے نہ گل ٹھہرے نہ بوئے نغمہ خواں ٹھہرے — خدا جانے کہاں یہ کاروانِ گلستاں ٹھہرے (صـ ۱۹۱)

"نہ گل ٹھہرے" کی جگہ "نہ بوئے گل ٹھہرے" ہونا چاہیئے تھا۔

بڑھے توقیر اُن کی اہلِ عالم کی نگاہوں میں — مذاقِ عجز پرور بھی اگر ہو کج کلاہوں میں (صـ ۱۹۳)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر بادشاہوں میں عاجزوں اور خاک نشینوں کو نوازنے کی خو بھی ہو تو دنیا والوں کی نگاہوں میں اُن کی عزت توقیر بڑھ جائے — مگر "مذاقِ عجز پرور" نے اس خیال کے "اظہار کو بجھارت بنا دیا۔ پھر خود یہ "خیال" انتہائی سطحی ہے!

نہ تو زاہد حرمتِ بادہ پر یوں دلیل و بحث کو طول دے — کسی اہلِ ظرف سے پوچھ لے یہ حلال بھی ہے حرام بھی (صـ ۱۹۶)

تقطیع میں "زاہد" "زاد" رہ جاتا ہے؟ یہ کتنی فاحش غلطی ہے!!

تھیں وہ تجلیاں نفور کتنی ظہورِ جلوہ سے — جو بہ حدِ بہارِ گل آئیں اور آکے رہ گئیں (صـ ۱۹۶)

ایک تو "نفور" ہی نے شعر کی ریڑھ مار دی، پھر مفہوم کے اعتبار سے شعر انتہائی گنجلک ہے!

شاعر کے مجموعہ کلام کے نام — سدرہ و طوبیٰ — میں اتنی بلندی اور شگفتگی اور کلام میں اس قدر سطحیت، آورد اور بے کیفی —!

حدیث کا مقام قرآن کی روشنی میں

از: شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (گوجرانوالہ) ضخامت تیس صفحات۔ قیمت چار آنہ۔
ملنے کا پتہ: ناظم جمعیتہ طلبہ اہلِ حدیث مغربی پاکستان شیش محل روڈ لاہور۔

اس کتابچہ میں فاضل مصنف نے قرآن کریم کی آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات محض تاریخی سرمایہ نہیں بلکہ واجب التعمیل اور حقیقتِ ناطقہ ہیں"

یہ چند صفحوں کا کتابچہ اپنی افادیت اور اصابت کے اعتبار سے ایک "دفتر" ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک حقیقت پسند انسان یہ ماننے پر مجبور ہے کہ قرآن کا مفہوم سمجھنے کے لئے احادیث سے استفادہ ناگزیر ہے۔ حدیث دین میں حجت ہے اور حضور کی اطاعت کے بغیر نہ ایمان معتبر ہے اور نہ اسلام!

صفحہ ۱۸ پر یہ مشہور مصرعہ "بلبل ہمیں کہ قافیہ گل بود بس است" کتابت کی غلطی کے سبب "بلبل کہ کافیہ گل بود بس است" درج ہوگیا ہے —!

امام بخاری رح کا مسلک

از: مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (گوجرانوالہ) ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ: محمد اسلم صاحب ناظم جمعیتہ الطلبہ اہلِ حدیث مغربی پاکستان شیش محل روڈ۔ لاہور۔

اس کتاب کے مصنف اہلِ حدیث کے مشہور عالم اور اپنے مسلک کے پُرجوش مبلغ ہیں۔ اُن کا خیال ہے:-

"مسلک اہلِ حدیث اسلامی تعلیمات کی صحیح ترین تعبیر ہے اور تحریک اہلِ حدیث کے داعیوں نے ہر دور میں اپنے فرائض کو سرانجام دیا ہے۔ دشمن بھی اسے سراہنے پر مجبور ہیں۔ فتنوں میں جس قدر اعتدال ائمہ اہلِ حدیث نے قائم رکھا، اس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی بناء پر میں مسلک اہلِ حدیث کو ترجیح دیتا ہوں ......" (صک)

"ایمان اور عمل کا تعلق" — "اجتہاد کی شرط" — "قیاس" — "خبر واحد"۔ ان مسائل میں فاضل مصنف نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے درست اور اقرب الی الصواب ہونے کو دلائل سے ثابت کیا ہے! اس کتاب میں یہ بھی ملتا ہے کہ امام بخاری

...ند تعالیٰ کی اُن پر رحمتیں نازل ہوں) نہ تو شافعی تھے اور نہ کسی دوسرے فقہی مسلک کے مقلد تھے بلکہ خود "مجتہد" تھے! ـــ مگر حضرات
...حدیث جو امام بخاری کو :-

"اقلیم علومِ عقلیہ و نقلیہ کا شاہنشاہ اعظم[ف] ـــ آسمانِ اجتہاد و فقاہت علم و عمل اور تفسیر قرآن
کا آفتاب و ماہتاب خاتمۃ المحدثین اور آیۃ من آیات اللہ ...." (ص۷)

...تے ہیں اور جن کے مسلک کی تائید میں یہ کتاب لکھی گئی ہے کیا "تقلید" کے الزام سے بچ سکتے ہیں؟ تقلید نہ "شرک" ہے اور نہ "واجب" یہ
افراط و تفریط کی دو "انتہائیں" ہیں۔ واقعہ، مشاہدہ، تجربہ اور حقیقت یہی ہے کہ "تقلید" سے مفر ممکن نہیں!

اس کتاب میں مولانا انور شاہ صاحب مرحوم کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"حضرت کے مقام کا بے حد احترام ہے۔ لیکن حنفیت کی محبت میں اپنے مقام سے کہیں نیچے اتر گئے ہیں"۔

لیکن اسی کتاب میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے :-

"ساری مصیبت غالباً اس سے پیدا ہوئی کہ اصولِ فقہ کے مصنفین اور واضعین میں اربابِ اعتزال
کو بہت حد تک دخل ہے۔" (ص۴۱) "فقہاء احناف رحمہم اللہ تعالیٰ نے قیاس کو اس بے اعتدالی سے
استعمال فرمایا کہ اس پر پابندی لگانا اہلِ حق کے لئے ضروری ہو گیا۔ لیکن اہلِ ظاہر کی راہ بھی اتنی ہی غیر معتدل
ہے جس طرح فقہا احناف کی ...." (ص۳۶)

تو مولانا موصوف کی اس رائے اور فہم و فکر پر کوئی ٹھیک وہی اعتراض وارد کرے جو انہوں نے مولانا انور شاہ صاحب پر کیا
ـــ تو ....!

اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے :-

"...... امام موصوف (بخاری) پر عدم فقاہت و اجتہاد وغیرہ کے بیسیوں الزام لگاتے ہیں"۔

مگر اس کا بھی تو اعتراف کیجئے کہ دوسری طرف سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی "حدیث دانی" پر بھی تو چوٹیں کی جاتی ہیں۔
تمام فقہی مذاہب اور اہلِ حدیث، یہ سب حق پر ہیں۔ ان کے درمیان فقہی نزاعیں بھی رہی ہیں اور رہیں گی۔ تحریر اور گفتگو کی خاصی شدید
...یاں بھی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ائمہ اور اکابر پر چوٹیں بھی کی گئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر وہ لوگ جو کسی ایک طرف پورے جھکے
...ے نہیں ہیں۔ اور حق کسی ایک گروہ اور مذہب اور جماعت میں محدود نہیں سمجھتے۔ آج بھی افراط و تفریط سے بچ کر "سواء السبیل"
...یتہ لگا سکتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہو سکتی ہے کہ طنز و تعریض میں کس نے حدِ اعتدال سے کس قدر تجاوز کیا ہے۔

"اس تحریک کے مقدس داعی اور قافلہ سالار، امام محمد بن اسمٰعیل بخاری ہیں۔ جن کی مایۂ ناز
تصنیف صحیح بخاری ہمارے سامنے ہے......." (ص۹)

"صحیح بخاری" کو امام بخاری کی "تصنیف" کہہ کر مصنف نے بڑی خطرناک بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ امام بخاری "صحیح
...ی" کے مدون، جامع اور مولف (compiler) تھے، مصنف (author) نہ تھے۔

"سکول ہائے فکر......." (ص۲۳) "اسکول" (school) انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی فارسی کے قاعدہ کے مطابق

ف حالانکہ حدیث میں بندوں کے لئے اس لفظ کے کہنے کی ممانعت آئی ہے۔ (م-ق)

جمع (سکولز) بنانا اچھا خاصا مضحکہ ہے۔ جب کہ "مدرسہ ہائے فکر" اور "مکاتیبِ خیال" اُردو میں لکھتے اور بولتے ہیں۔

"چہرے پر جھُریاں شروع ہو جائیں گی" (ص۵۱) یہ کیا زبان ہے؟

"کبر مقتا عند اللہ ..... " (ص۱۱) کا یہ ترجمہ "اللہ کے یہاں یہ بہت ہی رنجش کی بات ہے" درست نہیں۔ "مقتا" کا ترجمہ "سخت ناپسندیدہ بات" زیادہ صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی سے کد اور "رنجش" نہیں رکھتا۔ یہ تو انسانی صفت ہے، اللہ تعالیٰ سے اس کی نسبت درست نہیں۔

حدیث کی تدوین عہدِ صحابہ اور تابعین میں

از مولانا حکیم عبدالشکور صاحب۔ ضخامت ۸۴ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد اسلم سیف ناظم جمعیۃ طلباء اہل حدیث مغربی پاکستان شیش محل روڈ، لاہور۔

منکرینِ حدیث جو احادیث کی کتابت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے اور شبہات کو اُبھارتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب اُن کا مدلّل جواب ہے! صفحہ ۴۱ پر اس عبارت کو پڑھ کر طبیعت سخت منقبض ہوئی:۔

> "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا "حسبنا کتاب اللہ" فرمانا چنداں مضائقہ نہیں رکھتا۔ حضرت عمرؓ کے دل ودماغ پر مرض الموت کا بہت اثر تھا۔ اور وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے احساسات کا ایک سمندرِ عظیم لئے ہوئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نے تو انھیں خطائے فکری میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں یہ کہتے ہوئے پھرتے نظر آ رہے تھے کہ جو کوئی یہ کہیگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو میں اُس کا سر تلوار سے جُدا کر دوں گا ....."

حدیث کی حمایت و تائید کا یہ کس قدر غیر محتاط اور مکروہ پہلو ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "حسبنا کتاب اللہ" کی تاویل اور تضعیف کے لئے اُن کے "دل ودماغ" کے اعتدال وصحت پر کوئی بہت ہی خفیف سی طنز کر دی جائے تو بہ! معاذ اللہ! جو لوگ ادب و انشاء کا صحیح ذوق اور سلیقہ نہیں رکھتے اور نہ اپنے مفہوم کے اظہار پر پوری طرح قادر اور مشاق ہیں۔ اُن کی تحریریں دین کے موقف کو کمزور بنا دیتی ہیں ــــ!

ISLAM VERSUS MARXISM

از:۔ مولانا فضل الرحمٰن انصاری۔ ضخامت سولہ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ آل پاکستان اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن ۱۲ دولت منزل، گڈوانی اسٹریٹ۔ قریب جوبلی سینما کراچی ۳۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے علمی اور عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ کمیونزم ایک لادینی اور غیر فطری نظام ہے اور اس کے مقابلہ میں اسلام ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے اور جو سرمایہ و محنت کے درمیان تصادم نہیں ہونے دیتا۔ روح اور جسم کے تمام تقاضوں کی تکمیل اور ترقی کے لئے اسلام میں گنجائش موجود ہے اور اسی نظام سے انسانیت کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔

THEOCRACY AND THE ISLAMIC STATE

از:۔ عبدالحمید (ایم اے) ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ (ایک شلنگ)
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ چراغِ راہ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی۔

جناب عبدالحمید (ایم اے) نے اپنے قلم کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اُن کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اقامتِ دین اُن کی تمام جدوجہد کا مقصود اور مطلوب ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مغرب زدہ طبقہ "اسلامی اسٹیٹ" پر جو "تھیاکریسی" کی طنز کرتا ہے وہ نہایت ہی بے دانشی

کی بات ہے اور اُن کی اس طنز میں علمی اور عقلی اعتبار سے کوئی معقولیت اور وزن نہیں ہے !

کتاب اس عبارت پر ختم ہوتی ہے :-

"تھیا کریسی اور اسلامی اسٹیٹ میں "نام کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے ، اور یہ لفظی اشتراک بھی صرف اس مجبوری کے سبب ہے کہ انگریزی زبان میں "خلافت" کا مترادف کوئی لفظ نہیں ملتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ مگر مقام افسوس ہے کہ ان بنیادی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی "اسلامی اسٹیٹ" کو تھیا کریسی کے ساتھ الجھایا جاتا ہے اور پوری قوت کے ساتھ اس راگ کو الاپا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اس کا احساس ہونا چاہئے کہ اُلجھی ہوئی گفتگو، سیاسی قابلیت کی دلیل نہیں ہے۔" (ترجمہ)

یہ کتاب انگریزی داں طبقہ میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے۔

حج کیا ہے ؟

از:- سید حامد علی - ضخامت ۹۶ صفحات - قیمت آٹھ آنہ -
ملنے کا پتہ :- مکتبہ جماعت اسلامی ہند - رام پور (یو پی)

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مناسب ترمیم اور ضروری اضافہ کے بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔ "حج کے موضوع پر" یہ کتاب دوسری کتابوں سے منفرد اور ممتاز ہے! اس میں حج کے ضروری مسائل بھی ہیں، توحید کی اہمیت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ شرک سے نفرت بھی دلائی گئی ہے۔ حج اور کعبہ کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حج کی غرض و غایت کیا ہے ؟ طواف میں، سعی میں، رمی جمار میں قیام مزدلفہ اور وقوفِ عرفات میں کس خضوع و خشوع کی ضرورت ہے۔ تقویٰ اقامتِ دین اور صبر و استقامت کے کیا تقاضے ہیں ؟ اللہ کی خشیت کے بغیر عبادت میں اخلاص پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان معارف و حکم اور نصائح سے یہ کتاب لبریز ہے !

اندازِ بیان بڑا دلنشین اور جاندار ہے! کتاب ختم بھی ہو گئی اور مدینہ منورہ کی حاضری کا کہیں ذکر ہی نہیں۔ یہ بات کھٹکی مگر قدرے تامل کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ کتاب کا عنوان ہے ــــ "حج کیا ہے ؟" اس لئے اپنے موضوع پر کتاب نامکمل نہیں ہے۔ یعنی حج کے مناسک وارکان میں سے کوئی ایسی بات کہنے سے نہیں رہ گئی۔ جس کے چھوٹ جانے سے فریضہ حج ادا نہ ہوتا یا جس کے بغیر حج ادھورا رہ جائے !

حضرت ابو عبیدہؓ - حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت خالد جرّارؓ

کی مختصر سوانح حیات - از:- ابو الفضل غلام دستگیر نامی - یہ کتابیں پانچ پیسہ کے ٹکٹ بھیجکر مؤلف سے (محلہ چلہ بیبیان اندرون اکبری دروازہ لاہور) سے مفت حاصل کی جاسکتی ہیں -

ان دو کتابچوں میں ان تینوں صحابیوں کی زندگیوں کے مختصر حالات درج ہیں۔ یہ وہ اولوالعزم ہستیاں تھیں۔ جن کے بازوئے قلعہ کشا کو خود شجاعت چومتی تھی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، مؤلف مشاق انشا پرداز اور نغز گو شاعر نہ سہی۔ مگر بہرحال بھلائی کی بات تتلاتی ہوئی زبان اور کانپتے ہوئے قلم سے نکلے گی، تو بھی وہ اچھا اثر پیدا کرے گی !

تعارف القرآن

از:- ڈاکٹر محمد احمد صدیقی (ایم اے، ڈی، فل) ریڈر شعبہ فارسی و عربی الہ آباد یونیورسٹی -
ضخامت ۱۲۸ صفحات - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ - ملنے کا پتہ :- مطبع اسرار کریمی - الہ آباد (بھارت)

علامہ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور گرانقدر کتاب ـــ "الاتقان" کے طرز پر ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے یہ کتاب لکھی ہے ـــ چند عنوانات :-

ـــ تاریخ نزولِ قرآن ـــ ربط اور شانِ نزول ـــ مکی و مدنی آیات ـــ ترتیب آیات و سور ـــ ناسخ و منسوخ ـــ حدیث سبعہ احرف ـــ اقسام القرآن ـــ علم تفسیر و طبقات المفسرین ـــ قرآن کے وہ کلمات جن کے پڑھنے میں اکثر غلطی ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے قرآن کے جمع و ترتیب، ناسخ و منسوخ، مقطعات و متشابہات وغیرہ جیسے اہم اور نازک موضوعات کی (جو بہت تفصیل و اطناب چاہتے ہیں) چند صفحات میں کمال ایجاز کے ساتھ شرح فرما کر سچ مچ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اقسام القرآن، آیتوں کے عمود اور اُن کے باہمی ربط و ترتیب کے سلسلہ میں اگر صاحب موصوف علامہ حمید الدین فراہی کی تفسیر سے استفادہ کر لیتے تو اُن کے بیان میں اور نکھار پیدا ہو جاتا۔ کتاب میں کہیں کہیں ایسی روایتیں بھی ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے!

کتاب اپنے موضوع پر معلومات آفریں ہے۔ اس سے نہ صرف عوام بلکہ اہلِ علم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فضائلِ قرآن آدابِ تلاوت اور رموز القرآن کے ساتھ قرآن پر عمل کرنے کی ضرورت کا احساس دلانے کے لئے ایک مستقل باب لکھنے کی ضرورت تھی۔ کہ عام طور پر مسلمانوں نے اسے صرف "صحیفۂ تبریک" ہی سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ قرآن ایک مستقل ضابطۂ حیات بھی ہے ـــ!

ماہنامہ "تہذیب و ادب" زیر سرپرستی:- خواجہ دل محمد (ایم اے) ادارہ تحریر:- نصیر کوٹی اور شفیق بانو۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ۔ سالانہ چار روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- تہذیب و ادب ۱۹ چیمبرلین روڈ لاہور۔

ماہنامہ "تہذیب و ادب" کے چند شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ مقامِ مسرت و اطمینان ہے کہ ہر آنے والے شمارے نے پچھلے شمارے کے مقابلہ میں ترقی کی ہے۔ فروری کا شمارہ تو ہر اعتبار سے بھی گزشتہ پرچوں سے بہتر ہے ـــ ترتیب کی ہیئت یہ ہے:-

ـــ پہلی نظر ـــ غزلیں، مقالات، نظمیں، افسانے، مکاتیب، بچوں کی انجمن۔

مضامین دلکش اور منظومات دلچسپ ہیں۔ نام نہاد ترقی پسندی کے جراثیم سے اب تک تو یہ رسالہ محفوظ ہے۔ البتہ نظم "منجدھار" پڑھ کر اس کا اندیشہ ہے کہ یہ جراثیم اس رسالہ میں بھی کہیں سرایت نہ کر جائیں!

اگر سستے ادب سے دامن بچاتے ہوئے یہ رسالہ ڈیڑھ دو سال تک پابندی کے ساتھ نکلتا رہا تو توقع ہے کہ دُنیائے ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کرے گا۔ مضامین اور نظموں کے انتخاب میں ادارہ کو دقّتِ نظر سے کام لینا چاہیئے۔ دینی افکار کو بھی واعظانہ نہیں خالص ادبی رنگ میں سمونے کی ضرورت ہے!

خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات از:- علامہ جار اللہ زمخشری۔ ترجمہ:- مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی۔ ضخامت ۱۰۶ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔

یہ کتاب علامہ ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری صاحبِ تفسیر کشاف کی کتاب المواقعۃ بین اہل البیت والصحابہ

کا اُردو ترجمہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں بعض ایسے مبالغہ آمیز واقعات بھی ملتے ہیں۔ جن سے مترشح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور اہلِ بیت عظام (معاذاللہ) دو مستقل گروہ تھے۔ جن کے درمیان نزاع وخصومت اور کشاکش رہتی تھی۔ صحابہ اور اہلِ بیت انسان تھے فرشتے نہ تھے۔ اُن کے درمیان کبھی کبھار اختلاف اور ناخوشگواری کا پایا جانا تقاضائے بشریت کے منافی نہ تھا۔ مگر:۔

"تعصب اور تنگ نظری سے یکسو ہوکر صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ عظام کے تعلقات اور حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح روشن اور واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات میں کسی قسم کا نزاع اور افتراق نہ تھا۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کا ہم نوا، رفیق، جان نثار تھا اور یہ سب کے سب کانھم بنیان مرصوص کا اصل نمونہ تھے" (مترجم)

"حضرت علیؓ کے مناقب، حضرت ابوبکرؓ کی زبانی ـــ حضرت ابوبکرؓ کے مناقب حضرت علیؓ کی زبانی ـــ وہ احادیث جن کو حضرت ابوبکرؓ سے، حضرت علیؓ نے روایت کیا ـــ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے مناقب حضرت ابوبکرؓ کی زبانی ـــ حضرت علیؓ کا اُن لوگوں کی تردید کرنا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بُرا کہتے ہیں یا حضرت علیؓ کو اُن پر فوقیت دیتے ہیں ـــ وہ احادیث جو حضرت علیؓ سے بواسطہ حضرت عثمانؓ مروی ہیں ـــ بعض مسائل میں حضرت عمرؓ کا حضرت علیؓ کی رائے کی طرف اور حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا ـــ"

اس کتاب کے یہ چند عنوانات ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ اور اہلِ بیت کے درمیان بڑی موافقت اور یگانگت تھی۔ اُن لوگوں پر خدا کی رحمت ہو جو اہلِ بیت اور صحابہ دونوں سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اور اُن کے دل میں کسی کی طرف سے غبار اور کدورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ صحابہ کرام اور اہلِ بیت عظام کی محبت پر ہمارا خاتمہ کرے (آمین)

بستان الاربعین
تالیف:۔ حکیم مولانا محمد صادق سیالکوٹی۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ کتاب وسنت بازار دھارووال سیالکوٹ شہر۔

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس حدیثیں ترجمہ اور تشریح کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔ جن کا پڑھنا اور عمل کرنا ہر مسلمان کے لئے موجب سعادت ونجات ہے۔ فاضل مؤلف نے اُن چالیس حدیثوں کو چھانٹ کر اس کتاب میں درج کیا ہے" جن سے شرک و بدعت کی نفی ہوتی ہے۔ جو نیک اعمال کے لئے پڑھنے والے کو ابھارتی اور برائیوں سے روکتی ہیں اور جن کو کوئی اہلِ ایمان اپنا نصب العین بنالے تو دُنیا اور آخرت میں اُس کے لئے فلاح ہی فلاح اور نجات ہی نجات ہے۔ مؤلف کا خلوص اور دینی شغف ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے!

اسلام کا فلسفۂ تاریخ
از:۔ عبدالحمید صدیقی (ایم اے) ضخامت ۱۳۴ صفحات۔ کتابت، طباعت اور کاغذ دیدہ زیب مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ چراغِ راہ۔ لاہور ـــ

یہ کتاب ایک مردِ مومن کی فراست اور فہم ودانش کی اصابت کی گواہی دیتی ہے۔ کہ جو آنکھیں کتاب وسنت کے سرمہ سے روشن ہوں اُن میں نہ تو تہذیب وتمدن کی برقپاشیاں چکاچوند پیدا کرتی ہیں اور نہ مادیت کے اندھیروں میں اُسے ٹھوکریں لگتی ہیں۔ اس کتاب میں تاریخ کے حیاتیاتی اور مادی فلسفوں کی تشریح وتوضیح کے ساتھ ساتھ اُن کی فکری لغزشوں کی نشاندہی کرکے اسلامی فلسفہ کے ساتھ اُن کا تقابل کیا گیا ہے۔ کتاب کے پانچ ابواب ہیں:۔

مقدمہ ـــ تاریخ کا جیاتیاتی نظریہ ـــ تاریخ کی مادی تعبیر ـــ اسلام کا فلسفۂ تاریخ ـــ کتابیات!

اس کتاب میں ڈارون ـ کارل مارکس اور سپنگلر کے افکار و نظریات کا عقلی استدلال کے ساتھ پُر زور رد کیا گیا ہے ـ فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ یہ خدا ناشناس تمدّن جس پر آج کی دُنیا فخر کر رہی ہے، نیکی، صداقت، راست بازی اور انسانیت کی ضد ہے ـ قرونِ اولیٰ میں جاہلیت پتھروں اور تیروں سے جنگ کرتی تھی ـ اور آج ایٹم بموں اور کاسمک ریز (Cosmic-Rays) کو انسانوں کی ہلاکت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ـ سائنس اور تمدّن کی ترقی نے آدمی کی شقاوت کو پہلے کی بہ نسبت کچھ اور بڑھا ہی دیا ہے ـــ!

اس کتاب کو پڑھ کر اسلام کی حقانیت اور اُس کے اصول و ضوابط کا انسانیت کے لئے مفید بلکہ ناگزیر ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے ـ اور مادّی تہذیب کی ساری چمک دمک نگاہوں سے گر جاتی ہے ـ جناب عبدالحمید صدیقی کو اس تصنیف پر ہم مبارکباد دیتے ہیں ـــ!

اُردو کے بہترین انشاپرداز مولانا شبلیؔ

از :- سعید انصاری ـ ضخامت ۱۲۰ صفحات ـ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ـ
ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ (ہندوستان)

اس کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے ـ جس میں مولانا ظفر الملک علوی مرحوم کا مقدمہ ـ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا دیباچہ ہے ـ فاضل مصنف نے محمد حسین آزاد ـ حالی پانی پتی ـ ڈپٹی نذیر احمد ـ اور شبلی نعمانی کو "اُردو کے عناصرِ اربعہ" قرار دیا ہے اور پھر ان چاروں مشاہیر کی نثر نگاری کا موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو کے بہترین انشا پرداز مولانا شبلی نعمانی تھے ـ

کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے ـ ان عنوانات کو چھیڑ کر اُن کو خوبی کے ساتھ نباہ دینا، مصنف کی ژرف نگاہی، صحتِ وجدان اور خوش ذوقی کی دلیل ہے ـ وہ عنوانات :ـ

خطابت ـ شاعری اور انشا پردازی کا فرق ـــ فصاحت اور اُس کے جزئیات ـ الفاظ و معانی ـــ بلاغت اور اس کے جزئیات!

کوئی شک نہیں شبلی نعمانی اُردو زبان کے محسنِ اعظم ہیں ـ تاریخی اور علمی مواد (Matter) کو لے کر اُسے مضمون میں سلیقے سے پھیلانا ـ مضامین کی تبویب ـ عبارت کی تزئین ـــ ان محاسن کے شبلی موجد ہیں ـ اور شعر کا جیسا پاکیزہ ذوق اور پرکھ شبلی رکھتے تھے اُس کی پرچھائیں بھی کسی پر پڑ جائے گی تو وہ خوش مذاق ہو جائے گا ـ شعوری اور غیر شعوری طور پر آج اُردو کے تمام انشاء پرداز کسی نہ کسی حیثیت سے شبلی کے طرزِ نگارش کی تقلید کر رہے ہیں ـــ!

شبلی نعمانی نے نہ صرف یہ کہ اُردو کو سجایا اور سنوارا ہے ـ بلکہ اُن کی گرانقدر اور بلند پایہ تصنیفات نے اُردو کی شان، وزن اور رتبہ کو بڑھایا ہے ـ جناب سعید انصاری نے یہ کتاب لکھ کر شبلی نعمانی کے ادبی مرتبہ کا صحیح تعین کیا ہے ـــ!

خاصانِ خدا کی نماز

از :- ابو محمد امام الدین رام نگری ـ ضخامت چوراسی صفحات (سرورق رنگین) قیمت بارہ آنہ ـ ملنے کا پتہ :- مکتبہ تحفظ ملت ـ رام نگر، بنارس (بھارت) ـ پاکستان میں ـ مکتبہ تعمیرِ انسانیت ـ فریر روڈ ـ سکھر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ـ صحابہ کرام کی نماز اور خشوع و خضوع ـ شوق و اہتمام ـ تابعین اور ائمہ کی نماز اور خشوع و خضوع ـ اہتمام جماعت ـ اولیاء اللہ کی نماز ـــ یہ اس کتاب کے عنوانات ہیں ـ

آج ہماری نمازیں کیوں بے روح ہیں؟ سجدے کس لئے کیف سے خالی ہیں؟ نماز سے وہ خیر و برکت کیوں حاصل نہیں ہوتی جو

قرونِ اولیٰ کے اہلِ ایمان کو حاصل ہوتی تھی — اس کتاب میں اس کا جواب ملے گا۔
یہ جو ہم جیسے مسلمانوں کو عام شکایت ہے کہ نماز میں جی کیوں نہیں لگتا اور نیت باندھتے ہی تمام دنیا کے خیالات و اوہام کی یورش دل و دماغ پر ہونے لگتی ہے۔ اس کتاب میں اس کا جواب بھی ہے اور طریقِ علاج بھی درج ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور اولیاء اللہ کی نماز میں خضوع و خشوع کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے اپنی بے دلی، بے حسی اور غفلت پر ندامت ہوتی ہے، اور دل خوف سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کہیں ہماری نمازیں ہمارے منہ پر نہ مار دی جائیں (یا اللہ! تیری رحمت و مغفرت کی دہائی!)
یہ کتاب اس قابل ہے کہ مساجد میں اسے سبقاً سبقاً نمازیوں کو سنایا جائے، تاکہ ٹھونگیں مارنے والے نمازیوں کو عبرت و ندامت ہو اور کم سے کم ارکان میں تعدیل کی صفت تو پیدا ہو جائے! کتاب کی افادیت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے (آمین)

پن چکی اورنگ آباد دکن — از:- سید مبارز الدین رفعت (ایم اے عثمانیہ) ضخامت چالیس صفحات (بڑا سائز) قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اُردو۔ سیف آباد۔ حیدر آباد دکن۔

اورنگ آباد اپنی تاریخی عظمت اور قدیم یادگاروں کے اعتبار سے بڑی اہمیت اور مجد و شرف کا حامل ہے۔ دولت آباد کا قلعہ۔ خلد آباد اور اجنتا، ایلورہ کے محیر العقول غار (caves) اورنگ آباد ہی کے سواد میں واقع ہیں۔
اورنگ آباد کی پن چکی بھی بڑی تاریخی چیز ہے اور فنِ آب رسانی کے اس ترقی یافتہ عہد میں بھی وہ نادر و عجیب ہی سمجھی جاتی ہے۔ جناب سید مبارز الدین رفعت نے اسی "پن چکی" کی تاریخ لکھی ہے اور بڑی تحقیق و کاوش سے لکھی ہے۔
کتاب کے عنوانات:-
اورنگ آباد کی تاریخ — پن چکی کا محلِ وقوع — حضرت بابا محمد سعیدؒ پلنگ پوش نقشبندی۔ حضرت محمد عاشورؒ بابا شاہ مسافرؒ۔ بابا شاہ محمودؒ — بابا شاہ محمود کے جانشین — پن چکی کی نہر اور عمارتیں۔ پن چکی کے بارے میں بعض مشاہیر کی رائیں — !
صفحہ ۱۷ — "اورنگ آباد کے محلہ مغل پورہ میں واصل بیگ قندیل نامی ایک صاحب جمال لڑکا رہتا تھا۔ اس لڑکے پر شاہ عبد اللہ کا بے اختیار دل آ گیا ...."
"امرد پرستی" کے اسی قسم کے رکیک واقعات نے صوفیوں کو بدنام کیا ہے اور سب سے زیادہ حیرت تو ان سیرت نگاروں پر ہے جو اس قسم کے واقعات کو بے دھڑک نقل کر دیتے ہیں!
صفحہ ۱۷ پر "حسن ابدال" کو "کشمیر" میں دکھایا گیا ہے۔ حسن ابدال مغربی پنجاب میں ہے۔ راولپنڈی اور کیمبل پور کے درمیان — !
مشاہیر کی فہرست میں ایک میوزک ڈائرکٹر کو شامل کر کے اس کی رائے کو کتاب میں درج کرنا حیرت انگیز ہے! یہ بازاری لوگ ان ایکٹروں، ایکٹرسوں، گویّوں، نقالوں اور مسخروں اور "استاد جیوں" کو جو چاہیں سمجھ لیں۔ مگر اہلِ علم کی نظر بلند اُن کی رائے ثقہ اور سنجیدہ ہوتی ہے — !

اشتراکی چین اور مذہب

از:- ارشاد احمد (ایڈیٹر روزنامہ تسنیم) ضخامت ۴۳ صفحات۔ قیمت چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ جماعت اسلامی کانپور (بھارت)

ماہ جون ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے اخبار نویسوں کا ایک وفد کمیونسٹ چین گیا تھا۔ روزنامہ تسنیم کے جواں سال اور جواں ہمت ایڈیٹر جناب ارشاد احمد صاحب اس وفد کے ایک رکن تھے۔ موصوف نے اس دَورے کے تاثرات قلمبند کئے تھے۔ جو روزنامہ تسنیم میں مسلسل قسطوں میں شائع ہوتے رہے! مکتبۂ جماعت اسلامی کانپور نے ان تاثرات کے ایک حصہ کو جو "مذہب" سے متعلق ہے کتابی صورت میں چھاپ کر علم و ادب اور دین کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

پاکستان سے غیر ممالک کو آئے دن وفود جاتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں سے کتنے ہیں جو دینی نقطۂ نگاہ سے وہاں کے حالات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں اُڑ کر دوسرے ملکوں میں پہنچے، دعوتیں اُڑائیں، تفریحی پروگراموں میں حصہ لیا۔ سیر سپاٹا کیا اور پاکستان واپس چلے آئے۔ مگر جناب ارشاد احمد، چین صرف تفریح کرنے اور گھومنے کے لئے نہیں گئے تھے۔ اُن کی دینی بصیرت اور ایمانی فراست نے وہاں کی ہر چیز کو غور و فکر کی نگاہ سے دیکھا اور جو کچھ دیکھا اُسے جوں کا توں کاغذ پر منتقل کر دیا۔

"اشتراکی چین اور مذہب" کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے — کہ چین کی کمیونسٹ حکومت نے مسلمانوں کی مذہبی عبادات و رسوم میں کوئی مداخلت نہیں کی، مسلمانوں کو مسجدوں میں نماز پڑھنے، رمضان کے روزے رکھنے اور قربانی کرنے سے نہیں روکا جاتا۔ بلکہ حکومت نے اپنے خرچ سے بعض قدیم مسجدوں کی مرمت کرائی ہے۔ مسجدوں کے اماموں کی ٹریننگ کے لئے پیکنگ میں ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ صوبہ سنکیانگ کے مشہور شہر کاشغر کے ایک دینی ادارہ میں مسلمان طلباء تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم پاتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے — مگر چین کی حکومت کی پالیسی کا دُوسرا جزو یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو اشتراکیت کی آغوش میں پہنچا دیا جائے۔ مدرسوں میں اشتراکی لیڈروں کا تعارف نجات دہندوں کی حیثیت سے کرایا جاتا ہے۔ تاریخ، اقتصادیات، فلسفہ وغیرہ تمام عمرانی علوم کی تعلیم خالص اشتراکی نقطۂ نگاہ سے دی جاتی ہے۔ اشتراکی حکومت کی پالیسی کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ کلچر کے نام پر مسلمانوں کے اندر سے رہی سہی اخلاقی قدریں اور دین کا احترام ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلمان لڑکیاں ناچ گانے کے پروگراموں میں شوق و آزادی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ چین کے ایک شہر ارمچی میں خود فاضل صحافی نے دیکھا کہ مرد و زن کی ایک مخلوط محفل میں مسلمان مردوں اور عورتوں نے شراب پی اور ایسی ناپسندیدہ حرکتیں کیں کہ جن کی تفصیل پیش کرنے سے غیرت روکتی ہے۔ آل چائنا اسلامک ایسوسی ایشن جو مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اُس کا کام یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی احکام کی ایسی تعبیر کرے کہ وہ حکومت کی پالیسی سے ہم آہنگ ہوں!

ان تاثرات کا ماحصل یہ ہے کہ کمیونسٹ چین میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل بڑا تاریک ہے۔ پاکستان کے ایک "مولانا صاحب" نے بھی چین کا دورہ کیا تھا۔ ان کے سفرنامہ کی پاکستان کے چینی سفارت خانہ نے قدر افزائی کی!

ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کجا!

وہ کتابیں جن میں ایمان اسلام اور اخلاق کے موتی بکھرے ہوئے ہیں

مکتبہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے منگائیے

مشکوٰۃ شریف:- کا اُردو ترجمہ عربی کے اصل متن کیساتھ - حدیث شریف کی گیارہ کتابوں (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، موطا، مسند امام احمد، شافعی، بیہقی اور دارمی) کا بیش بہا انتخاب ہے - قیمت فی حصہ مجلد آٹھ روپے - جملہ قیمت کامل تین حصے (مجلد) چوبیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

تجرید بخاری اردو:- صحیح بخاری کی تین ہزار تین سو چھبتر احادیث سے علامہ حسین بن مبارک نے دو ہزار ایک سو اسی احادیث کا انتخاب فرمایا جن میں مکرر احادیث شامل نہیں ہیں - تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق احادیث اس مجموعہ کی زینت ہیں - قیمت مجلد پانچ روپے (علاوہ محصولڈاک)

شمائل ترمذی:- (اُردو ترجمہ مع شرح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و خصائل اور رات دن کے معمولات کا بے نظیر مرقع! ایک ایک حدیث حرزِ جان اور معمولِ زندگی بنانے کے قابل - ایمان افروز اور زندگی بخش - قیمت مجلد آٹھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

تبلیغ دین:- امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "اربعین" کا اُردو ترجمہ - جس میں اسلامی تعلیمات کی حکمتیں - ظاہری و باطنی فوائد - عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں - اس کے مطالعہ سے اسلامی فکر میں جلا پیدا ہوتی ہے - قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے - (علاوہ محصولڈاک)

اسباب زوالِ امت:- علامہ امیر شکیب ارسلان کی شہرۂ آفاق اور معرکۃ الآراء تصنیف کا اُردو ترجمہ - فکر و عمل کی شاہراہ میں یہ کتاب رہنما کا فرض انجام دیتی ہے - موجودہ صدی کی ممتاز ترین علمی تصنیف - قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ - (علاوہ محصولڈاک)

حجۃ اللہ البالغہ:- (اُردو ترجمہ) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مقبول عام تصنیف جس کا شہرہ عرب و عجم میں ہے - اسلامی علوم کا شاہکار - فکر و نظر کو دینی انداز پر تربیت دینے والی کتاب - اصل عربی کے مقابل آسان اُردو ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ - قیمت ہر دو جلد بیس روپے - ایک جلد دس روپے (علاوہ محصولڈاک)

مجموعہ تفاسیر فراہیؒ:- مولانا حمید الدین فراہی کی اس بلند پایہ تالیف کو مولانا امین احسن اصلاحی نے اُردو کا لباس عطا کیا ہے - انتہائی شگفتہ اور دل نشین ترجمہ - تفسیری حقائق و معارف کا ایمان افروز ترجمہ - قرآنی مشکلات کے حل کے لئے بہترین کلید - ضخامت ۵۲۰ صفحات - کپڑے کی عمدہ جلد - قیمت چودہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

حقوق الزوجین:- مولانا مودودی کی یہ تصنیف فقہی اور دینی فکر کے اعتبار سے اپنی آپ مثال ہے - معاشرے کی بہت سی گھریلو الجھنوں کا قابلِ عمل حل - قیمت دو روپے - (علاوہ محصول ڈاک)

اخلاقی کہانیاں:- از افضل حسین (ایم اے، ایل ٹی) بچوں کے لئے چار کتابوں کا سیٹ - کردار سازی میں یہ کتابیں بہت مدد دیتی ہیں - قیمت ایک روپیہ دس آنہ - (علاوہ محصول ڈاک)